شوکت صدّیقی

# جانگلوس

یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ جاگیروں اور نجی جائیدادوں کے موجودہ حقوق کس بنیاد پر جائز ہیں۔ سب سے پہلی دستاویز تو تلوار کی نوک سے تحریر کی گئی جسے جرنیلوں اور سپاہیوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور قیمت کے عوض تلوار، خنجر اور نیزے کی ضربیں لگا کے انسانی خون کی مہریں ثبت کی گئیں۔ وہ حضرات جو یہ فرماتے ہیں کہ وقت ہی ناجائز کو جائز بنا دیتا ہے ازراہ کرم اس سوال کا تسلی بخش جواب دیں کہ کسی گناہ کو نیکی بننے کے لئے کتنا وقت درکار ہوتا ہے اور کس سالانہ شرح سے ایک غیر قانونی اور ناجائز سودا قانونی اور جائز بن جاتا ہے؟

کارل مارکس

# ۱

ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ خزاں رسیدہ پتے درختوں سے ٹوٹ کر گرے اور دور دور تک بکھر گئے۔ یہ ۱۹۵۴ء کے موسم خزاں کی ایک ویران رات تھی۔ لاری اسٹینڈ سنسان تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ دونوں اندھیرے میں دم بخود کھڑے تھے۔ ڈرائیور ہوٹل کے سامنے لکڑی کی بنچ پر کوئی چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ قریب ہی ایک آوارہ کتا ہڈی چبا رہا تھا۔ ہڈی اس کے دانتوں تلے رک رک کر ایک ہی انداز سے بجتی اور اس کی آواز سناٹے میں تحلیل ہو جاتی۔

دونوں سایوں کی مانند تاریکی میں دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ ایک کا قد کسی قدر نکلتا ہوا تھا۔ چھریرا بدن تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور اندر دبی ہوئی تھیں۔ رنگ گندمی تھا۔ یہ رحیم داد تھا۔ دوسرا لال دین تھا۔ مگر سب اسے لالی کہتے تھے۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا مضبوط جوان تھا۔ دونوں کی حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ سروں کے بال خشک اور بے ترتیب تھے۔ لالی بنچ پر لیٹے ہوئے آدمی کی چادر اتار لینا چاہتا تھا۔ اس نے چادر کا کونا پکڑ کر آہستہ سے کھینچا۔ وہ چونک پڑا۔ کروٹ بدلی اور نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔

"اوئے تنگ نہ کر۔"

اب وہ خاموش لیٹا تھا۔ رحیم داد اور لالی کو مطلق اندازہ نہ تھا کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے دونوں سراسیمگی کے عالم میں کچھ دیر دم سادھے کھڑے رہے۔ جب نہ کوئی آہٹ ہوئی نہ آواز تو وہ بے دبے قدموں چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

رحیم داد نے چلتے چلتے لالی سے پوچھا۔ "رات کتنی رہتی ہے؟" اس کے لہجے سے تھکن اور بے

زاری جھلک رہی تھی۔

"ابھی بہت رہتی ہے۔" لالی نے گردن اٹھا کر آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھا۔ چند لمحے خاموش رہا، پھر قدموں کی رفتار تیز کرتے ہوئے اس نے رحیم داد کی جانب تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "اڑیل کھوتی نہ بن۔ مرداں والی چال چل۔"

"تونے فیر تھانیداری شروع کر دی۔" رحیم داد نے احتجاج کیا۔

"ایسا کر یہیں لیٹ جا۔" لالی نے ایک بار پھر مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ "میں بیٹھ کر تیرے پاؤں دباتا ہوں۔ یہی چاہتا ہے نا۔"

رحیم داد نے زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر جھنجلا کر لالی کو دیکھا اور چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

آدھی رات تک دونوں منٹگمری جیل میں قیدی تھے۔ رحیم داد کو بلوے اور اقدام قتل کے جرم میں تین سال قید بامشقت ہوئی تھی۔ جیل ہی میں اس کی ملاقات لالی سے ہوئی۔ وہ پہلے سے وہاں موجود تھا اور ڈیڑھ سال کی سزا بھگت رہا تھا۔ ایک روز لالی نے رحیم داد کو اعتماد میں لیا اور جیل سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ رحیم داد کچا تھا۔ پہلے ذرا جھجکا اور انکار میں گردن ہلانے لگا۔ مگر جب لالی نے حوصلہ بڑھایا اور قید کی گھٹن سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینے کی تمنا خوف و ہراس پر غالب آ گئی تو وہ لالی کے ساتھ فرار ہونے پر آمادہ ہو گیا۔ جیل کے گھڑیال نے رات کے بارہ بجائے۔ پہرہ بدلا۔ نئے پہرے دار بیرکوں اور چکیوں کے تالے بجا، بجا کر "کانٹا" تالا سب ٹھیک ہے۔" کی صدائیں بلند کر چکے تو لالی نے اپنا کام دکھایا۔ وہ رحیم داد کے ہم راہ نہایت صفائی سے جیل کی اونچی اونچی فصیلوں سے باہر نکلا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

جیل سے بھاگے ہوئے دو گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ صبح گنتی ہونے سے پہلے کسی کو ان کے فرار کی خبر نہ ہو گی۔ ان کے پاس چند گھنٹے اور تھے۔ اس عرصے میں وہ جلد سے جلد بہت دور نکل جانا چاہتے تھے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد وہ کچھ دیر ایک ویرانے میں بھٹکتے رہے، پھر عارف والا روڈ پر آ گئے اور چلتے چلتے لاری اسٹینڈ پر پہنچ گئے۔

لاری اسٹینڈ اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ جیل اس سے بھی پیچھے تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ستارے اجلے اجلے کنول بن گئے تھے۔ سڑک ویران تھی۔ دونوں جانب درخت تھے۔ پت جھڑ کے دن تھے۔ ہوا میں تیزی کے ساتھ ہلکی ہلکی خنکی بھی تھی۔ سڑک پر بکھرے ہوئے خشک پتے تیز جھونکوں سے خاموشی میں کھڑکھڑا رہے تھے۔



لالی اور رحیم داد ننگے پیر تھے۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل چل رہے تھے اور تھکن کے باوجود تیز تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں اس علاقے کے بارے میں کوئی اندازہ نہ تھا۔ نہ راستوں کا پتہ تھا اور نہ کوئی ایسا ٹھکانا جانتے تھے، جہاں وہ روپوش ہو سکتے۔ وہ منزل سے بے خبر آگے اور آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ رحیم داد کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"لالی، یہ تو بتا ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"یہ تو مجھے بھی پتہ نہیں۔" لالی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"مخول نہ کر۔ ٹھیک، ٹھیک گل کر۔ اس طرح ہم نے کب تک چلتے رہنا ہے۔"

لالی نے رحیم داد کا بازو تھام کر انگلیوں سے گوشت ٹٹولا۔ "دیکھنے میں تو تکڑا لگتا ہے، پر باتیں زنانیوں کی سی کرتا ہے۔ رحیمے! حوصلے سے کام لے۔ ایسے تو اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دے گا۔"

رحیم داد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عقب سے ہارن کی تیز آواز ابھری۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔ سڑک کے موڑ سے روشنی ابھری اور خزاں رسیدہ درختوں کی برہنہ شاخوں سے چھن چھن کر ہر طرف بکھرنے لگی۔ وہ جھٹ سڑک سے نیچے اترے اور ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گئے۔ رحیم داد زیادہ سہا ہوا تھا۔ وہ گہری گہری سانس بھر رہا تھا۔ لالی بھی خوف زدہ تھا۔ مگر چوکس نظر آتا تھا۔ روشنی قریب آتی گئی۔ سڑک پر پہیوں کے تیزی سے دوڑنے کی آواز بڑھتی گئی۔

ذرا دیر بعد ایک جیپ عین ان کے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔ جیپ میں چار مسلح رینجرز سوار تھے۔ ایک ڈرائیور کے برابر بیٹھا تھا۔ تین پچھلی نشست پر تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں دبی تھیں۔ جیپ کے رکتے ہی اگلی نشست سے ایک شخص نیچے اترا۔ وضع قطع سے ڈرائیور معلوم ہوتا تھا۔ اس کے باہر آتے ہی ایک رینجر بھی جیپ سے اتر کر سڑک پر آ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا نشیب میں اترا۔ جھاڑی کے قریب پہنچا اور اطمینان سے پیشاب کرنے لگا۔

رحیم داد اور لالی سانس روکے بیٹھے رہے۔ سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ ہوا کے تھپیڑوں سے چھینٹے، اڑ اڑ کر ان کے چہروں پر گرتے رہے۔ مگر ڈر کے مارے انھوں نے ذرا بھی جنبش نہ کی۔

سڑک پر ڈرائیور جھک جھک کر جیپ کے پہیے دیکھ رہا تھا۔ رحیم داد کو کھانسی کا ٹھسکا محسوس ہوا۔ اس کے حلق کے اندر خر خر ہونے لگی۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کا منہ دبوچ لیا۔ اسی اثناء میں ڈرائیور کی آواز ابھری۔

"پنکچر تو نہیں لگتا جی، پر ایک پہیے میں ہوا ضرور کم ہے۔"

جھاڑی کے قریب کھڑے ہوئے رینجر نے گردن موڑ کر اونچی آواز سے کہا۔ "سٹیشن تک تو پہنچ ہی جائے گی۔ وہیں پیٹرول پمپ سے پہیئے میں ہوا بھروالینا۔" وہ پتلون کے بٹن لگاتا ہوا مڑا اور جیپ کی جانب بڑھنے لگا۔

لالی اور رحیم داد جھاڑی کی اوٹ سے اسے دیکھتے رہے۔ ڈرائیور اور رینجر جیپ میں داخل ہوئے اور اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ رات کے سناٹے میں جیپ کا انجن زور زور سے گھڑگھڑایا۔ جیپ آگے بڑھی اور تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ ذرا دیر بعد نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ لالی گردن اٹھائے اسے دور تک دیکھتا رہا۔ پھر رحیم داد کی پیٹھ پر زور سے دھپ مار کر بے تکلفی سے بولا۔

"تو نے تو مروا ہی دیا تھا رحیمے۔"

"سور دا پتر بالکل منہ پر کھڑا موت رہا تھا۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر بے زاری سے کہا۔

"پر تیری کھانسی سے تو بیڑا ہی غرک ہو جاتا۔ وہ تو میں نے جھٹ تیرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ورنہ دونوں فیر جیل کی ہوا کھاتے۔" لالی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ "اب یہیں بیٹھا رہے گا؟ جھیتی کر۔ ابھی تو بہت چلنا ہے۔"

رحیم داد بھی کھڑا ہوگیا۔ لیکن خاموش رہا۔ لالی نے دریافت کیا۔ "کس سوچ میں پڑ گیا رحیمے۔"

"سوچ رہا ہوں۔ یہ پولسئے ادھر کیسے آگئے۔ کہیں انھیں ہمارے جیل سے فرار ہونے کا تو پتہ نہیں چل گیا؟"

"پولسئے تو نہیں تھے۔ وردی سے تو رینجر لگتے تھے۔ پر ہمیں یہاں سے جلد ہی دور نکل جانا چاہیے۔"

"ہم نے جانا کہاں ہے؟" رحیم داد نے ایک بار پھر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ لالی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ "پروا نہ کر۔ بس ذرا کدم بڑھا کے چل۔"

دونوں جھاڑی سے نکل کر سڑک پر آگئے اور خشک پتّوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

انھوں نے دو ڈھائی میل راستہ طے کیا ہوگا کہ بنجر اور اجاڑ علاقہ ختم ہوگیا۔ اب کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ سڑک پر چلنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ دونوں سڑک سے اتر کر کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والے کچے راستے پر چلنے لگے۔ یہ پیہا تھا۔ یہ اتنا کشادہ کچا راستہ تھا کہ دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔

پہے کے دونوں طرف گندم اور جو کی فصلیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی



چلتی۔ گندم اور جو کی بالیاں جھومنے لگتیں۔ کھیتوں میں دور تک لہریں ابھرتی اور ڈوبتی نظر آتیں۔ ہوا کی سرسراہٹ سے فصلوں میں سیٹیاں بجتیں۔ لالی اور رحیم داد ہر آواز پر چونک پڑتے۔ ان کے قدم ڈگمگا جاتے۔

یکایک ان آوازوں میں ایک نئی آواز ابھری۔ یہ گیدڑوں کا بے ہنگم شور تھا۔ وہ زور زور سے چیخ رہے تھے۔ ذرا ہی دیر بعد گیدڑوں کا ایک غول کھیتوں سے نکل کر ان کے قریب سے گزرا۔ رحیم داد اور لالی جھجک کر کھڑے ہوگئے۔

دونوں کچھ دیر بعد آگے بڑھے۔ پیہا زیادہ طویل نہ تھا۔ مشکل سے دو ڈھائی فرلانگ کا راستہ تھا۔ دونوں بہت چوکنا تھے اور کسی انجانے خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ پیہا ختم ہوگیا۔ وہ کھیتوں سے نکل کر باہر آگئے۔ سامنے رڑ تھا۔ اس کھلے میدان کے اس پار درختوں کا جھنڈ تھا۔ جھنڈ کے پیچھے مٹی کے بنے ہوئے کچے مکانات تھے۔ مکانوں کے بیچ سے گلی گزرتی تھی۔ گلی کے نکڑ پر دو منزلہ پختہ ماڑی تھی۔ اس کے پہلو میں پھوس کی چھت کا لمبا ڈھارا تھا۔ ڈھارے میں مویشی تھے، جن کی گردنوں میں پڑی ہوئی گھنٹیاں رک رک کر سناٹے میں بج رہی تھیں۔

وہ آگے بڑھے۔ رڑ عبور کیا اور درختوں کے نیچے پہنچ کر اندھیرے میں کھڑے ہوگئے۔ ماڑی کی ایک کھڑکی سے روشنی ابھر کر اندھیرے میں بکھر رہی تھی۔ وہ دھندلی روشنی میں گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے۔ دفعتاً قدموں کی آہٹ ابھری۔ ایک شخص نہایت مشتبہ حالت میں ان کے سامنے سے گزرا۔ اس کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا ڈھارے کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا۔ لالی اور رحیم داد آنکھیں پھاڑے اسے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہ آگے بڑھا اور اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ رحیم داد کچھ دیر تو حیرت سے گم صم رہا، پھر اس نے لالی کے کان کے قریب منہ لے جا کر دھیرے سے پوچھا۔

"لالی، یار یہ چکر کیا ہے؟"

"مویشی چور جان پڑتا ہے۔"

لال کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ کچھ دیر بعد وہ شخص مویشیوں کے ڈھارے سے باہر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رسی دبی تھی۔ وہ آگے آیا تو پیچھے سے ایک بھینس بھی نمودار ہوئی۔ وہ کسی اور سمت جانے کے بجائے سیدھا درختوں کے جھنڈ کی جانب بڑھا۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر لالی ایک درخت کے تنے کی آڑ میں دبک گیا اور ہاتھ پکڑ کر رحیم داد کو اپنی پشت پر کر لیا۔ وہ شخص آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آتا گیا۔ قریب اور قریب۔ جب وہ بالکل ان کے نزدیک پہنچ گیا تو لالی نے

جھپٹ کر بائیں ہاتھ سے اس کا منہ دبوچ لیا۔ اس شخص نے نہایت پھرتی سے دھوتی کے ڈب سے چاقو نکالا۔ لیکن لالی نے چاقو کھولنے کی مہلت نہ دی۔ جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیا۔ چاقو زمین پر گر پڑا۔

رحیم داد حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ لالی نے چاقو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈپٹ کر رحیم داد سے کہا۔ "کھڑا منہ کیا تک رہا ہے۔ اٹھا اور کھول لے اسے۔"

رحیم داد نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ جھک کر چاقو اٹھایا۔ اسے کھولا اور اس شخص کے قریب پہنچ گیا۔ اب رحیم داد کے ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو کی نوک اس کی کمر سے لگی ہوئی تھی۔ لالی نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

وہ سراسیمہ ہو کر دونوں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ دونوں جیل کے قیدیوں کی وردی میں اس کے سامنے اس طرح کھڑے تھے کہ اندھیرے میں بھوتوں کی مانند ڈراؤنے نظر آتے تھے۔ وہ چند لمحے ہکا بکا رہنے کے بعد اٹکتے ہوئے بولا۔ "تسیں ہو کون؟" لالی نے تڑاق سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔

"سیدھی طرح گل کر۔ تیرا نام کیا ہے؟"

"بھجا۔" اس نے آہستہ سے اپنا نام بتایا۔

لالی نے قریب کھڑی بھینس کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "یہ مج اٹھا کر لایا ہے نا؟ سچ سچ بتا۔"

"ہاں جی۔" اس نے دھیرے دھیرے اپنی گردن ہلائی۔

"یار بھجے! تُو تو اونچا کاریگر لگتا ہے۔" لالی نے بے تکلفی سے کہا۔ "صاف اڑا لایا مج۔ ذرا بھی کھٹکا نہ ہوا۔"

"بس جی اوپر والے کی مہربانی ہے۔" وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر فخریہ لہجے میں بولا۔ "جس ڈنگر پر ہاتھ پھیر دیا، سمجھ لے اپنا ہو گیا۔" وہ بھینس کی گردن اور پیٹھ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔

لالی نے رحیم داد کے ہاتھ سے چاقو لے کر اپنے قبضے میں کیا۔ بھجے سے پوچھا۔ "تیں نوں اب کتھے جانا ہے؟"

اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا لالی سے سوال کیا۔ "تسیں یہ کیوں جاننا چاہتا ہو؟"

لالی جل کر بولا۔ "تھانے میں تیرے خلاف پرچہ چاک کرانا ہے نا۔"



بھجے نے دونوں کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔ دھندلی دھندلی روشنی میں وہ شلوکے جیسے آدھی آستینوں کے کرتے اور گھٹنوں تک اونچے اونچے جانگیا نما پاجامے پہنے ہوئے تھے۔ کرتوں پر جیل کے نمبر نظر آ رہے تھے۔

"تسیں تھانے کیسے جا سکتے ہو؟" بھجا انھیں مشتبہ نظروں سے گھورنے لگا۔

"توں نے فیر ٹیڑھی گل بات کی۔" لالی نے کھلا چاقو اس کے سامنے کر دیا۔

بھجا ڈر گیا۔ عاجزی سے بولا۔ "مجھے اب جانے دے۔ جاگ ہو گئی تو سارا کام گڑبڑ ہو جائے گا۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "غلطی شلطی ہو گئی تو معاف کر دے۔ میں نوں ابھی بہت دور جانا ہے۔"

"یہی تو پوچھ رہا ہوں تیں نوں کتھے جانا ہے؟" اس دفعہ لالی کا لہجہ نرم تھا۔

"میں نے جی پہلے اہر جانا ہے۔" بھجے نے شمال کی جانب ہاتھ اٹھایا۔ "اہر ۵ میل ادھر جھنگر میں ہے۔ تیں نوں تو پتہ ہی ہوگا، چوری کے ڈنگر اٹھانے کے بعد اہر ہی میں چھپا کے رکھے جاتے ہیں۔ اگے میں نوں بھی ایسا ہی کرنا ہے۔ مج اہر میں لے جا کر رکھوں گا۔"

"ایہہ گل اے تو فیر ہاتھ ملا۔" لالی نے چہک کر کہا اور گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "جا، ایک مج اور اڑا لا۔"

بھجا انکار میں گردن ہلانے لگا۔ "ناجی نا، ایک ہی بہت ہے۔ میں دو مجیں اکیلے لے کر جا بھی تو نہیں سکتا۔ لما رستہ ہے۔ اگے نہر ہے۔"

"پروا نہ کر۔ ہم دونوں جو تیری مدد کو موجود ہیں۔ اہر تک تیرے ساتھ ہی چلیں گے۔" لالی نے اسے ہولے سے ٹھوکا دیا۔ "فٹافٹ جا، دیری نہ کر۔"

"مج یہیں چھوڑ دوں؟"

"چھوڑ دے، چھوڑ دے، کہیں نہیں جائے گی۔" لالی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "ہم نے رسا گیری یا مویشی چوری نہیں کرنی۔ ہم ایسا گھٹیا دھندا نہیں کرتے۔ فکر نہ کر۔ واپسی پر مج تجھے یہیں ملے گی۔"

بھجا کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے ڈھارے کی سمت بڑھا اور ایک بار پھر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ رحیم داد اب تک خاموش کھڑا تھا۔ دل ہی دل میں لالی کی حرکتوں پر کڑھ رہا تھا۔ جب ضبط نہ ہو سکا تو جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یار لالی، تو نے یہ کیا چکر چلایا ہے۔ خاما خا اتنا وکھت خراب کیا۔ اب تک تو ہم بہت دور نکل

جاتے۔"

"کہاں نکل جاتے؟ نہ رستہ معلوم نہ جگہ کا کوئی اتا پتہ۔" لالی نے رحیم داد کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "رحیمے تو بیکار میں اپنا مغز خراب نہ کر۔ تو یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ تیں نوں پتہ نہیں بھجا اپنے بہت کام آئے گا۔"

"کیا کام آئے گا؟" رحیم داد کے لہجے میں ابھی تک جھنجلاہٹ تھی۔

"اہر میں بھجا جہاں مویشی چھپاتا ہے وہیں ہم بھی چھپ سکتے ہیں۔ پہلے کہیں چھپنے کا ٹھکانا ملنا چاہئے۔ اس کا بندوبست بھجا کر دے گا۔ آگے بھی وہ کام آئے گا۔ وہ بھی مجرم ہم بھی مجرم۔ اور مجرم کی مدد مجرم ہی کر سکتا ہے۔ کیا سمجھا؟"

رحیم داد کی سمجھ میں لالی کی بات آگئی۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ بھینس ان سے چند قدم کے فاصلے پر چپ چاپ کھڑی جگالی کر رہی تھی۔ دم ہلا ہلا کر مچھر اڑا رہی تھی۔ رحیم داد اور لالی اس سمت گردن اٹھائے دیکھ رہے تھے جدھر بھجا گیا تھا۔

لیکن اس بار بھجا جلدی نہ لوٹا۔ اسے دیر ہوئی تو رحیم داد کو تشویش ہوئی۔ اس نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"بھجا ابھی تک نہیں آیا۔ ایسا نہ ہو کوئی گڑبڑ ہو جائے۔"

"حوصلے سے کام لے' حوصلے سے۔" لالی نے رحیم داد کو تسلی دی۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ دونوں بھجے کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے درختوں کے خشک پتے کھڑکھڑاہٹ پیدا کر رہے تھے۔ اب لالی بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اچانک ڈھارے کی طرف کوئی زور سے کھنکارا۔ ساتھ ہی آواز ابھری۔

"اوئے' کون ہے؟"

لالی اور رحیم داد نے گھبرا کر دیکھا۔ بھجا' ڈھارے کے چھپر سے باہر نکلا۔ اندھیرے میں اس کی سفید دھوتی اور قمیص دور سے نظر آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے' پیچھے مویشیوں کا رکھوالا بھی ڈھارے سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی ڈانگ تھی۔ وہ ڈانگ سنبھالے بھجا کے تعاقب میں دوڑا اور اونچی آواز سے "چور' چور" کی صدا بھی بلند کرتا رہا۔

لالی اور رحیم داد اس سے زیادہ کچھ نہ دیکھ سکے۔ وہ سراسیمہ ہو کر جدھر منہ اٹھا' سرپٹ بھاگے۔ نہ انھوں نے قریب کھڑی ہوئی چوری کی بھینس پر توجہ دی اور نہ بھجا کی طرف کوئی دھیان دیا۔ وہ جلد سے جلد گاؤں سے نکل جانا چاہتے تھے۔



☆

مشرقی افق پر ہلکا ہلکا دودھیا اجالا پھیل رہا تھا۔ رات رخصت ہو رہی تھی۔ صبح کی آمد آمد تھی۔ لیکن صبح کی آمد کے ساتھ لالی اور رحیم داد کے لیے خطرہ بھی قریب آتا جا رہا تھا۔ دن کی روشنی میں وہ گھوم پھر نہ سکتے تھے۔ ان کے جسموں پر جیل کی مخصوص وردی تھی' جو دور سے چغلی کھاتی تھی کہ وہ مفرور قیدی ہیں۔

وقت کم تھا اور انھیں جلد سے جلد چھپنے کے لیے کسی ٹھکانے کی تلاش تھی۔ لالی نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اسے نشیب میں کچھ فاصلے پر سکنالا نظر آیا۔ یہ برساتی نالا اب خشک اور اجاڑ تھا۔ اس کے ایک کنارے پر فراش اور سرس کے گھنے درخت تھے جو بلندی پر دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ لالی درختوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ اسے یہ جگہ چھپنے کے لیے مناسب معلوم ہوئی۔ اس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ وہ زمین پر بے سدھ پڑا تھا اور گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ لالی نے جھک کر اسے جھنجوڑا۔

"بہت آرام کر چکا۔ اب اٹھ کے بیٹھ۔"

رحیم داد نے کروٹ بدلی اور تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "مجھے تو اونگھ لگ رہی ہے۔"

لالی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ "نہیں اٹھا تو میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔"

رحیم داد جھٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔ "یہ تو بتا' جانا کدھر ہے؟ سویرا ہو رہا ہے۔ اجالا پھیلتا جا رہا ہے۔"

لالی نے نشیب میں اترتے ہوئے کہا۔ "میرے پیچھے' پیچھے چلا آ۔ سکنالے کے اس پار جو جھل ہے' دن وہیں گزاریں گے۔" اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر درختوں کے دور تک پھیلے ہوئے سلسلے کی جانب اشارہ کیا۔ یہ گھنا جنگل تھا اور قریب بھی تھا۔

رحیم داد چپ چاپ لالی کے ہم راہ نشیب میں اترنے لگا۔ دونوں آگے بڑھے۔ سکنالے پر پہنچے۔ کچھ دور جانے کے بعد ٹوبا ملا۔ اس میں ابھی تک پچھلی برسات کا پانی موجود تھا مگر زیادہ گدلا نہ تھا۔ دونوں ٹوبے کے کنارے بیٹھ گئے۔ چلو بھر بھر کر پانی پیا۔ منہ دھویا' ہاتھ دھوئے اور تر و تازہ ہو کر درختوں کی جانب بڑھے۔

اب مشرق میں روشنی کا سرخ الاؤ دہکنے لگا تھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ مگر جھل کے درختوں کے نیچے ابھی تک اندھیرا تھا۔ وہ آگے اور آگے بڑھتے گئے۔ اجالا پھیلتا گیا۔ انھیں ایک پرانا درخت نظر آیا۔ اس کا تنا خوب چوڑا تھا اور اندر سے کھوکھلا بھی تھا۔ لیکن اس میں صرف ایک

آدمی کے چھپنے کی گنجائش تھی۔

دونوں دیر تک ادھر ادھر گھومتے رہے۔ اب درختوں کے پتوں سے دھوپ چھن چھن کر نیچے بکھرنے لگی تھی۔ ہر طرف پرندے چہچہا رہے تھے۔ تھکن سے دونوں کا برا حال تھا۔ انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ نیند غالب تھی اور بھوک بھی ستا رہی تھی۔ انھیں ایک پگڈنڈی نظر آئی۔ وہ آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر چلنے لگے۔

کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ ان کی نظر لکڑی کے تختوں کی بنی ہوئی بوسیدہ جھونپڑی پر پڑی۔ پہلے تو وہ قریب جاتے ہوئے ڈرے۔ مگر لالی نے اس دفعہ بھی ہمت سے کام لیا۔ اس نے جھونپڑی کے نزدیک پہنچ کر دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔

دروازہ چرچراتا ہوا کھل گیا۔ دونوں نے اندر جھانکا۔ جھونپڑی بالکل خالی تھی۔ فرش پر خشک گھاس بچھی تھی۔ جگہ جگہ گھوڑے کی لید بکھری ہوئی تھی۔ وہ اندر داخل ہوئے اور نڈھال ہو کر فرش پر گر پڑے۔

لالی کچھ دیر خاموش لیٹا رہا، پھر اٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ رحیم داد آنکھیں بند کئے خاموش پڑا تھا۔ لالی نے دروازہ کھلا رکھا اور چوکنا نظروں سے باہر دیکھتا رہا۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر جاگتا رہا۔ پھر نیند نے شب خون مارا۔ وہ جھومتے جھومتے ایک طرف لڑھک گیا۔

دروازہ کھلا تھا۔ لالی اور رحیم داد بے خبر سو رہے تھے۔

دوپہر ہوئی، سہ پہر ہوئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سائے طویل ہو گئے۔ یکایک سناٹے میں پگڈنڈی پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ خطرے کا احساس خوف بن کر اس کے چہرے پر منڈلانے لگا۔ اس نے آہستہ سے رحیم داد کو جھنجوڑا۔ وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آہٹ اس نے بھی سن لی تھی۔

دونوں بالکل خاموش تھے۔ انجانے خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ لالی کے پاس چچا کا چاقو موجود تھا۔ اس نے چاقو کھولا اور دروازے کی اوٹ میں چوکس ہو کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔

آہٹ قریب ہوتی گئی۔ اتنی قریب کہ انھیں یہ اندازہ ہو گیا کہ آنے والا تنہا ہے اور بھاری بھاری بوٹ پہنے ہوئے ہے۔ مگر وہ ان کی طرف نہ آیا۔ آگے نکل گیا۔ اس کی چاپ خشک پتوں پر دیر تک ابھرتی رہی، اور جب سناٹے میں ڈوب کر ختم ہو گئی تو دونوں کے چہروں پر چھایا ہوا خوف



مٹ گیا۔ وہ تھکے ہوئے سے فرش پر بیٹھ گئے۔ ذرا سکون نصیب ہوا تو بھوک نے پریشان کیا۔

گھاس پر ادھر ادھر چنے کے دانے بکھرے ہوئے تھے۔ رحیم داد کی ان پر نظر پڑی تو چن چن کر کھانے لگا۔ لالی بھی کھانے لگا۔ انھوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک ایک دانہ کھا لیا۔ چنے خشک اور کیلے تھے۔ مٹھی بھر بھی نہ تھے۔ بھوک تو کیا مٹتی، البتہ پیاس شدت سے بڑھی۔ مگر وہ دروازے سے باہر نہ نکل سکتے تھے۔ دن کی روشنی ابھی تک پھیلی تھی۔ اور روشنی میں نکلنا خطرے کو دعوت دینا تھا۔

سورج ڈوب گیا۔ شام کا دھندلکا ہر طرف پھیل گیا۔ پیاس سے لالی اور رحیم داد کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ جب اندھیرا کسی قدر گہرا ہو گیا تو دونوں جھونپڑی سے باہر آئے۔ ہوا تیز تھی اور درختوں میں سنسناتی ہوئی گزر رہی تھی۔ خشک پتے اڑ اڑ کر شور مچا رہے تھے۔ دونوں خاموشی سے پگڈنڈی پر چلتے رہے۔ وہ ٹوبے کی جانب جا رہے تھے۔ لیکن لالی نے اس دفعہ نشیب میں پہنچنے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

میل، سوا میل فاصلہ طے کر کے دونوں ڈھلان سے نیچے اترنے لگے۔ ٹوبا زیادہ دور نہ تھا۔ مگر راستہ خراب تھا۔ نشیب میں اترتے ہوئے رحیم داد کا پیر پھسلا۔ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ چوٹ زیادہ نہیں آئی۔ لیکن وہ لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ ٹوبے پر پہنچ کر انھوں نے اس بے قراری سے پانی پیا کہ ان کے پیٹ پھول گئے۔ دونوں ٹوبے کے کنارے ہی لیٹ گئے اور دیر تک بے سدھ پڑے رہے۔

اس دفعہ ٹوبے کا پانی پی کر لالی کا جی متلانے لگا۔ مگر اس نے خود کو سنبھالا، اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ دونوں آگے بڑھے۔ لیکن وہ زیادہ دور نہ جا سکے۔ لالی کی طبیعت پھر بگڑی۔ وہ ابکائیاں لینے لگا اور ایک جھاڑی کے قریب نڈھال ہو کر گر پڑا۔ اس پر غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔

ذرا دیر وہ زمین پر لیٹا گہری گہری سانسیں بھرتا رہا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کیں اور سو گیا۔ رحیم داد اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ لالی کا سر دبانے لگا۔

کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ اجالا پھیلنے لگا۔ چاند درختوں کے عقب سے دھیرے دھیرے طلوع ہو رہا تھا۔ دیکھتے، دیکھتے چاندنی ہر طرف پھیل گئی۔ ٹوبے کا پانی جھلملانے لگا۔ لیکن چاندنی جس قدر نکھرتی جا رہی تھی رحیم داد اسی قدر خوف زدہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر دیکھا فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ قطعی غیر محفوظ جگہ بیٹھا ہے۔ ہر طرف کھلا رتیلا میدان تھا۔

جھاڑی بھی زیادہ گھنی نہ تھی۔ اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر لالی ہر خطرے اور ہر خدشے سے بے نیاز گہری نیند سو رہا تھا۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ چاند چڑھ کر درختوں کے اوپر آگیا۔ ریت کے ذرے جھلملانے لگے۔ سائے سمٹ گئے۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ ناگاہ رات کے گہرے سناٹے میں کوئی زور سے کھنکارا۔ ساتھ ہی خشک پتوں پر آہٹ ہوئی اور رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ کوئی ڈھلان سے نیچے اتر رہا تھا۔ مگر وہ ایک نہیں دو تھے۔

رحیم داد نے انھیں دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ جب وہ اسی سمت آنے لگے تو رحیم داد سخت گھبرایا۔ اس نے لالی کو آنے والے خطرے سے خبردار کرنے کی غرض سے زور زور سے جھنجھوڑا۔ مگر لالی بیدار نہ ہوا۔ کروٹ بدل کر بے خبر سوتا رہا۔

آنے والے نزدیک آتے گئے۔ وہ دھیرے' دھیرے آگے بڑھنے لگے۔ رحیم داد اور زیادہ بدحواس ہوگیا۔ ایک لمحہ ایسا بھی آیا' جب اس نے اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ لیکن وہ ایسا نہ کرسکا۔ اپنی جگہ دم بخود بیٹھا رہا۔ اس نے دیکھا' ان میں ایک مرد ہے اور دوسری عورت۔ مرد آگے' آگے چل رہا تھا۔ اس کے سر پر بڑی سی گٹھری تھی۔ عورت کی گود میں بچہ تھا۔ دونوں نے رحیم داد کو دیکھ لیا تھا۔ مگر وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ جب وہ بالکل نزدیک پہنچ گئے تو عورت لمحے بھر کو ٹھٹکی۔ اس نے گردن موڑ کر رحیم داد کو دیکھا اور اس کے قریب پڑے ہوئے لالی کو بھی دیکھا۔ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"کوئی بندہ جان پڑتا ہے۔"

"ہوگا کوئی۔ سدھی' سدھی چل۔" مرد نے اسے ڈانٹا۔

دونوں نے مزید بات چیت نہ کی۔ چپ چاپ رحیم داد اور لالی کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔ البتہ عورت مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔ دونوں دور ہوتے ہوتے اندھیرے میں گم ہوگئے۔ ان کی چاپ دیر تک خشک پتوں پر ابھرتی رہی۔ ان کے جانے کے بعد بھی رحیم داد کا خوف رفع نہ ہوا۔ وہ چوکنا نظروں سے بار بار اس سمت دیکھتا رہا جدھر وہ گئے تھے۔ ہر آہٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔

بہت دیر ہوگئی۔ کوئی نہ آیا۔ چاند چڑھتے چڑھتے آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ گیا۔ رات پوری طرح جاگ رہی تھی اور لالی سو رہا تھا۔ وہ آدھی رات کے بعد جاگا۔ اٹھ کر بیٹھا تو رحیم داد نے پوچھا۔

"اب تیرا جی کیسا ہے؟"



لالی نے انگڑائی لے کر جواب دیا۔ "ٹھیک ہی ہے۔" اس نے آنکھیں پھاڑ کر چاند کو دیکھا۔ "بہت رات ہوگئی۔ مجھے جگایا بھی نہیں۔"

"بہت جگایا' تجھے اپنا ہوش ہی کب تھا۔"

"طبیعت بہت گڑبڑ ہوگئی تھی۔" لالی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "رحیمے' کھڑا ہو جا۔ اپنے پاس تو چلنے کے لیے رات ہی ہے۔ دن میں کہیں چھپ کر آرام کریں گے۔"

رحیم داد چپ چاپ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ دونوں آگے بڑھے' اور کہیں ٹھہرے بغیر مسلسل چلتے رہے۔ چاند ڈوب گیا۔ اندھیرا چھا گیا۔ راستہ دشوار ہوگیا۔ وہ سکنالے کی گزر گاہ پر چل رہے تھے۔ زمین ریتلی اور ناہموار تھی۔ دونوں طرف اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبے تھے۔ کہیں کہیں ببول اور بیری کے درخت تھے۔ جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔

انھوں نے ستانے کی مطلق کوشش نہ کی۔ آگے' اور آگے بڑھتے گئے۔ جب صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلا اور اندھیر چھٹا تو وہ ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں گھاس اور سرکنڈوں کے اونچے اونچے پودے تھے۔ زمین دلدلی تھی' اس قدر نرم اور پولی کہ پیر اندر دھنستے تھے۔ ان میں دلدل عبور کرنے کی ہمت نہ تھی۔ دونوں تھکن سے نڈھال ہو رہے تھے۔ سورج بھی طلوع ہونے والا تھا۔

انھوں نے آگے جانے کا ارادہ ترک کردیا اور ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گئے۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔

دونوں نے بلندی سے دیکھا کہ دلدل کے اس پار بہت بڑا ٹوبا ہے' جو صبح کی روشنی میں شفاف جھیل کی طرح جھلملاتا دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ کچھ دور آگے سکنالے پر پل تھا جس پر سڑک گزرتی تھی۔ یہ پاک پتن روڈ تھی۔

لالی کچھ دیر رحیم داد کے ساتھ ٹیلے پر خاموش کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے ساتھ' ساتھ اطمینان بھی جھلک رہا تھا۔ اسے کسی ایسے ہی مقام کی تلاش تھی جو سڑک سے نزدیک ہو اور محفوظ بھی۔ یہ ایسا ہی محفوظ علاقہ تھا۔ دور' دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ نہ کوئی پگڈنڈی تھی نہ راستہ تھا۔ ہر طرف ٹیلے اور ٹبے تھے۔ جنگلی پودوں کی جھاڑیاں تھیں۔ کہیں کہیں فراش کے اکا دکا درخت بھی تھے۔

دونوں نے ادھر ادھر گھوم پھر کر ٹیلوں کے درمیان چھپنے کا ٹھکانا تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جلد ہی انھیں ایک ٹھکانا مل گیا۔ یہ کشادہ اور قد آدم گہرا غار تھا۔ انھوں نے باہر سے غار کا جائزہ لیا۔ اندر داخل ہوئے اور چٹیل زمین پر آنکھیں بند کرکے لیٹ گئے۔

وہ دن بھر گہری نیند سوتے رہے۔ آنکھ کھلی تو شام آہستہ آہستہ ٹیلوں اور ٹبوں پر اتر رہی تھی۔ دلدل پر اگی ہوئی اونچی اونچی گھاس اور سرکنڈوں کے پودے دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ غار سے نکل کر دونوں باہر آئے۔

سورج، ٹیلوں کے دور تک پھیلے ہوئے ناہموار سلسلے کے پیچھے ڈوب چکا تھا۔ مغرب میں گہری سرخ روشنی پھیلی تھی۔ اس روشنی میں رحیم داد بجّو کی مانند ڈراؤنا نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں کے اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر کر نمایاں ہوگئی تھیں۔ بھوک کے مارے اس کا برا حال تھا۔

لالی بھی بھوک سے نڈھال تھا۔ مگر اس ویرانے میں کھانے کے لیے کیا ملتا۔ اس وقت انھیں پیٹ کی آگ سرد کرنے کی فکر دامن گیر تھی۔ دلدل عبور کرنا خطرناک تھا اور ٹیلوں کے درمیان راستہ بنانا بھی آسان نہ تھا۔ مگر اندھیرا بڑھنے سے پہلے وہ آگے نکل جانا چاہتے تھے۔ جھٹ پٹے میں چلنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ انھیں ٹیلوں کی بلندی پر دور ہی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ سڑک پر گزرنے والی گاڑیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھیں۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد انھوں نے کہیں جانے کا ارادہ ملتوی کردیا اور غار کے دہانے پر بیٹھ کر چاند کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

رات کا ایک پہر گزرا۔ چاند طلوع ہوا تو دونوں غار سے باہر نکلے اور چھٹکی ہوئی چاندنی میں ٹیلوں اور ٹبوں کے درمیان چلنے لگے۔ وہ رفتہ رفتہ سڑک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مگر راستہ اس قدر پیچیدہ اور دشوار تھا کہ انھیں سنبھل سنبھل کر، ٹھہر ٹھہر کر چلنا پڑتا۔ آخر وہ اونچے نیچے ٹیلے عبور کرنے کے بعد نشیب میں اترے۔

سامنے چاندنی میں جھلکتا ہوا ٹوبا تھا۔ اس کے ایک کنارے پر اونچی اونچی گھاس تھی۔ عقب میں دلدل تھی۔ ٹوبے سے کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے پر پل تھا۔ سڑک پر آمد و رفت قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

دونوں پل کی جانب بڑھنے لگے۔ چند ہی قدم آگے گئے تھے کہ سناٹے میں دور سے ہارن کی آواز ابھری۔ وہ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ سڑک کے موڑ پر تیز روشنی جھلملائی۔ ذرا دیر بعد کار کی دونوں بتیاں نظر آنے لگیں۔ کار بہت تیز رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ پلک جھپکتے ہی پل پر پہنچ گئی۔ پھر زوردار دھماکہ ہوا۔

لالی اور رحیم داد نے خوف اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ کار بے قابو ہوئی۔ پل کے جنگلے سے ٹکرائی۔ اچھلی اور ڈھلان پر تیزی سے لڑھکتی ہوئی نیچے آنے لگی۔ ساتھ ہی انسانی چیخیں



بھی ابھریں۔

ایک اور دھماکہ ہوا۔ یہ پہلے دھماکے سے زیادہ بڑا اور ہولناک تھا۔ لڑھکتی ہوئی کار سے اونچے، اونچے شعلے بلند ہوئے۔ کار ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی۔ اس کے بعد گہری خاموشی چھاگئی۔ لالی اور رحیم داد بت بنے کھڑے رہے۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ اجلی چاندنی میں جلی ہوئی کار کا ڈھانچہ سیاہ دھبے کی مانند نظر آرہا تھا۔ یکایک خاموشی میں رک رک کر ایسی آواز ابھری جیسے کوئی شدید درد سے کراہ رہا ہو۔

لالی خاموشی سے کراہ سنتا رہا۔ مگر زیادہ دیر اسے سن نہ سکا۔ وہ آواز کی سمت بڑھا۔ رحیم داد بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ بہت سہما ہوا نظر آرہا تھا۔ دونوں کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ کراہ بند ہوگئی۔ مگر وہ رکے نہیں۔ آگے ہی بڑھتے گئے۔

قریب جا کر انھوں نے دیکھا، کار کے جھلسے ہوئے ڈھانچے کے نیچے ایک لاش دبی ہے۔ آدھا دھڑ الٹی ہوئی کار کے نیچے سے باہر نکلا ہوا ہے۔ چہرہ اور ہاتھ جل کر سیاہ پڑ گئے ہیں۔ ہر طرف جلے ہوئے گوشت کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ ڈھانچے کے آس پاس کار کے ٹوٹے ہوئے دروازے، دو پہیے اور دوسرے حصے ادھر ادھر بکھرے تھے۔ چاندنی میں رحیم داد نے کوئی چیز دیکھی اور اس پر بلی کی طرح تیزی سے جھپٹا۔ یہ ایک مڑی تڑی روٹی تھی۔ رحیم داد نے اسے جھٹ اٹھایا۔ اس میں لگی ہوئی ریت اور مٹی صاف کئے بغیر بے صبری سے ہبڑ ہبڑ کھانے لگا۔ ریت کے ذرے اس کے دانتوں تلے کرکراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ مگر وہ جلدی جلدی ایک کے بعد دوسرا لقمہ نگلتا چلا گیا۔ لالی بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔ رحیم داد نے روٹی کا ٹکڑا اسے بھی دیا۔ روٹی باسی اور ٹھنڈی تھی۔ لیکن وہ اسے مزے سے کھاتے رہے۔

روٹی کھانے کے بعد انھوں نے ٹوبے پر جا کر پانی پیا۔ اب ان کے جسموں میں توانائی اور چستی آگئی تھی۔ انھوں نے کار کے ٹوٹے پھوٹے ڈھانچے کے آس پاس کھانے کی اشیاء تلاش کرنا شروع کردیں۔ جلد ہی انھیں بید کی الٹی ہوئی ٹوکری میں کھلا ہوا ناشتا دان مل گیا۔ اس میں بھنا گوشت تھا۔ ابلے ہوئے انڈے تھے۔ تین موٹے موٹے پراٹھے تھے۔ ٹوکری میں ایک ڈبل روٹی تھی اور بسکٹوں کے دو پیکٹ بھی تھے۔

کھانے کی اشیاء دیکھ کی ان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ دونوں ٹوکری کے قریب بیٹھ گئے۔ رحیم داد نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ایک پراٹھا اٹھایا۔ لالی نے فوراً اسے ٹوکا۔

"سب نہ کھا جانا' کئی روز کا راشن ہے یہ۔"

رحیم داد نے مسکرا کر آدھا پراٹھا لالی کو دیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آگے کی فکر ضرور کرنی چاہیے۔"

دونوں نے پراٹھوں کے آدھے آدھے ٹکڑوں پر تھوڑا سا بھنا ہوا گوشت رکھا اور اطمینان سے کھانے لگے۔ کھانے سے فارغ ہو کر انھوں نے ناشتا دان بند کیا جو ایک طرف سے ٹیڑھا پڑ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے بند ہوا۔ رحیم داد نے اسے ٹوکری میں ڈالا۔ ڈبل روٹی اور بسکٹوں کے پیکٹ بھی رکھے۔

دونوں نے ایک بار پھر ٹوبے پر جا کر پانی پیا۔ پانی پی کر لالی زور زور سے ڈکاریں لینے لگا۔ رحیم داد کو خطرے کے احساس نے خوف زدہ کیا۔

"یار' روٹی تو کھالی' اب چلنا چاہیے۔"

"کہاں چلیں؟" لالی نے پوچھا۔

"آگے چلتے ہیں سڑک کا رستہ ٹھیک رہے گا۔"

لالی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "سڑک کا رستہ ٹھیک نہیں رہے گا۔ آگے خطرہ ہے۔ یہ ٹھکانا ابھی چھوڑنا ٹھیک نہیں۔" وہ لمحے بھر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "یار روٹی کا تو بندوبست ہو گیا۔ پانی کا بھی راشن رکھنا ہو گا۔"

لالی کار کے ڈھانچے کی جانب چل دیا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ ڈھانچے کے قریب ابھی تک جلے ہوئے گوشت کی بو پھیلی تھی۔ یہ بو اس قدر تیز اور ہولناک تھی کہ رحیم داد دور ہی ٹھہر گیا۔ لالی چند قدم آگے بڑھا پھر وہ بھی ٹھہر گیا۔ ڈھانچے میں اسے اپنے کام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ اس نے ڈھانچے کے ادھر ادھر جھک کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر اسے ایک چمکتا ہوا ڈبا نظر آیا۔ لالی کو اسی کی تلاش تھی۔ یہ ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے کا ڈبا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈبا اٹھا لیا اور رحیم داد کو دے کر بولا۔

"لے یار! اپنا کام تو بن گیا۔ اس میں پانی بھر لے۔ کئی دن چلے گا۔"

رحیم داد نے ڈبا سنبھالا اور ٹوبے پر چلا گیا۔ اس نے ڈبا اندر اور باہر سے کئی بار دھویا اور پانی بھر کر اوپر سے ڈھکنا بند کر دیا۔ پانی سے بھرا ہوا ٹین کا ڈبا خاصا وزنی تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ٹوکری تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لالی کے پاس پہنچا۔ وہ ڈھانچے سے ہٹ کر کوئی بیس قدم دور ایک تودے



ے قریب کھڑا تھا۔ اس کے سامنے زمین پر ایک آدمی پڑا تھا۔ رحیم داد نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ دمی کا چہرہ اور بال خاک سے لتھڑے ہوئے تھے۔ داہنا ہاتھ کہنی کے پاس سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا ا۔ وہ سفید بش شرٹ اور گہری نیلی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ پیروں میں سیاہ جوتے تھے۔ اجلی چاندنی ں ایک ایک چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ وضع قطع سے وہ سرکاری افسر لگتا تھا۔ رحیم داد نے آہستہ ے کہا۔

"مر گیا؟"

لالی نے پلٹ کر رحیم داد کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر جھک کر زمین پر پڑے ہوئے آدمی کے ہاتھ سے ھڑی اتاری اور اپنی کلائی پر باندھ لی۔ پھر اس کے پیروں سے جلدی جلدی جوتے اتارنے لگا۔ ں کے بعد اس نے پتلون کے بٹن کھولے اور دونوں پائنچے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ پتلون اتر کر ں کے ہاتھ میں آ گئی۔ لالی نے فوراً پتلون کی جیبیں ٹٹولیں۔ پچھلی جیب سے چمڑے کا بٹوہ نکلا۔ لالی نے بٹوہ کھول کر اندر نظر ڈالی۔ بٹوے میں نوٹ تھے۔ اس نے بٹوہ ٹوبے کی جانب اچھال دیا اور ٹ جیب میں رکھ لیے۔ جب وہ بش شرٹ اتارنے لگا تو لاش میں ہلکی سی حرکت ہوئی۔ ساتھ ہی ھڑی ہوئی سانس لینے کی آواز ابھری۔ رحیم داد چیخا۔

"ابھی زندہ ہے۔"

لالی نے گھوم کر اس کی جانب قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "چپ کر کے کھڑا رہ۔" ں نے بش شرٹ اس طرح اتاری جیسے قصائی بکرے کی کھال اتارتا ہے۔ پھر بنیان اور انڈرویر ارے۔ بنیان اور انڈرویر خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بش شرٹ پر بھی خون کے دھبے تھے۔ مگر یادہ بڑے نہیں تھے۔

زخمی آدمی کے جسم میں دوبارہ حرکت نہیں ہوئی۔ اس کے کٹے ہوئے ہاتھ سے خون بہنے کے ث ریت پر بڑا سا سیاہ دھبا بن گیا تھا۔

لالی نے سارے کپڑے لپیٹے اور ٹوبے کی جانب چل دیا۔ اس نے سب سے پہلے بش شرٹ پانی ں ڈال کر دھوئی' بنیان اور انڈرویئر ایک طرف پھینک دیے۔ لالی نے پتلون الٹ پلٹ کر دیکھی۔ ں پر بھی خون کے دھبے تھے۔

وہ پتلون دھونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اوپر سڑک پر آہٹ سنائی دی۔ لالی اور رحیم داد نے نک کر اس طرف دیکھا۔ یہ سڑک پر کسی گاڑی کے دوڑنے کی آواز تھی۔ دونوں کو خطرے کا ساس ہوا۔

لالی نے کپڑے سمیٹ کر بغل میں دبالیے اور رحیم داد کے ہاتھ سے ٹوکری لے لی۔ دونوں آگے پیچھے تیزی سے ٹیلوں کی جانب دوڑے۔ لیکن وہ ٹیلوں پر چڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ بریک لگنے کی تیز آواز ابھری۔

یہ ٹرک تھا اور پل پر ٹھہر گیا تھا۔ دونوں نے سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا۔ ٹرک ڈرائیور دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی ٹرک سے باہر آیا۔ دونوں پل کے قریب کھڑے ہو کر نیچے جھانکنے لگے۔ ذرا ہی دیر بعد دونوں آگے پیچھے ڈھلان سے نیچے اترنے لگے۔

رحیم داد اور لالی نے انھیں نشیب میں اترتے دیکھا تو ایک ابھرے ہوئے اونچے تودے کی آڑ میں دبک گئے۔ مگر یہ جگہ قطعی غیر محفوظ تھی۔ چاند پوری تابانی سے ان کے سروں پر چمک رہا تھا۔ اجلی چاندنی میں ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ ان سے قریب تر گھنی جھاڑی بھی خاصی دور اور بلندی پر تھی۔ جھاڑی تک پہنچنے کی کوشش کرتے تو دونوں دور سے صاف نظر آجاتے۔

آنے والے رفتہ رفتہ قریب آرہے تھے۔ وہ نیچے پہنچ کر پہلے ٹوٹی پھوٹی کار کے جھلسے ہوئے ڈھانچے کے پاس گئے۔ لیکن انھوں نے ڈھانچے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ادھر ادھر جھک جھک کر دیکھتے رہے۔ انھوں نے ڈھانچے کے نیچے دبی ہوئی لاش بھی دیکھی۔ چند منٹ تک وہ ڈھانچے کے آس پاس منڈلاتے رہے۔ ایک بار وہ اس تودے کے بہت قریب پہنچ گئے جس کے عقب میں رحیم داد اور لالی دبکے بیٹھے تھے۔

دونوں ان کی چاپ صاف سن رہے تھے۔ لالی نے چاقو کھول لیا تھا اور آنے والے خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے چوکس تھا۔ رحیم داد نے بھی ایک پتھر ہاتھ میں اٹھا لیا تھا۔

لیکن آنے والے زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ انھوں نے جلی ہوئی کار سے ٹوٹ کر علیحدہ ہو جانے والے دونوں پہیے اٹھائے اور آہستہ آہستہ چڑھائی پر چڑھنے لگے۔ لالی اور رحیم داد نے دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔

وہ بھی آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے بلندی کی جانب بڑھنے لگے۔ جب گھنی جھاڑی کے عقب میں پہنچ گئے تو انھوں نے پل کی جانب دیکھا۔ ٹرک ابھی تک کھڑا تھا۔ وہ ٹرک کے اسٹارٹ ہونے اور آگے جانے کا انتظار کرنے لگے۔ مگر ٹرک اسٹارٹ نہیں ہوا۔ ذرا ہی دیر بعد دونوں پھر نشیب میں اترتے نظر آئے۔ وہ سیدھے ڈھانچے کے پاس گئے اور اس میں جڑے ہوئے پہیے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔



لالی اور رحیم داد بلندی سے انھیں پوری طرح دیکھ رہے تھے۔ اب وہ اس جگہ ٹھہرنے کے بجائے جلد سے جلد غار میں پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن جھاڑی سے نکل کر آگے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

وہ خاموش بیٹھے دونوں کو دیکھتے رہے۔ خاصی دیر ہو گئی۔ چاند آہستہ آہستہ مغرب میں اترتا جارہا تھا۔ سائے طویل ہو گئے تھے۔ چاند غروب ہو جانے کے بعد اندھیرے میں چلنا اور غار تک پہنچنا بہت دشوار ہوتا۔ ان کی بے چینی لحہ بہ لحہ بڑھتی جارہی تھی۔ ادھر وہ دونوں کھسکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

چاند جب مغربی افق کے قریب پہنچ گیا اور ٹبوں کے نشیب میں اندھیرا پھیلنے لگا تو لالی اور بے چین ہو گیا۔ اس نے بڑا سا پتھر اٹھایا اور پوری قوت کے ساتھ ڈھانچے کی جانب پھینکا۔ پتھر کار کے آہنی ڈھانچے سے ٹکرایا۔ سناٹے میں ٹن سے آواز ہوئی۔ ڈھانچے پر جھکے ہوئے دونوں آدمی فوراً سیدھے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے گھبرائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ ان میں سے ایک پل کی جانب سرپٹ بھاگا۔ دوسرا بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ دونوں تیزی سے چڑھائی عبور کر کے پل پر پہنچے اور ٹرک پر سوار ہو گئے۔ فوراً ہی انجن کا شور خاموشی میں ابھرا۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

ٹرک کے جانے کے بعد لالی ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ رحیم داد بھی مسکرانے لگا۔ لالی نے اس کی پیٹھ پر بے تکلفی سے دھپ مارا۔ ''کہو استاد! کیسی رہی ترکیب نمبر ۱۴؟'' وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ اس نے چاقو بند کیا۔ ٹوکری اٹھائی اور کپڑے بغل میں دبالیے۔ دونوں سنبھل سنبھل کر ٹیلوں پر چڑھنے لگے۔ رحیم داد ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا ٹین کا ڈبا اٹھائے لالی کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

دونوں غار کے قریب پہنچے تو اندھیرا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ رحیم داد بہت تھکا ہوا تھا۔ وہ پانی کا ڈبا کونے میں رکھ کر لیٹ گیا۔

لیکن لالی ٹوکری اور بغل میں دبے ہوئے کپڑے رکھنے کے بعد بھی نہیں لیٹا۔ اس نے گیلی بش شرٹ اٹھائی۔ جھٹکا دے کر پانی جھاڑا۔ غار کے دہانے پر پہنچا۔ بش شرٹ ایک تودے پر پھیلا دی اور اس کے کناروں پر بھاری بھاری پتھر رکھ دیئے تاکہ تیز ہوا سے اڑ نہ جائے۔

ہوا سیٹیاں بجاتی ٹیلوں اور ٹبوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ چاند بہت دور ایک اونچے ٹبے کے پیچھے آہستہ آہستہ اتر رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ دہکتا ہوا الاؤ رہ گیا۔ بڑا دل آویز منظر تھا۔ لالی کھوئی کھوئی نظروں سے چاند کی الوداعی روشنی دیکھتا رہا۔ چاند ڈوب گیا۔ ٹیلے اور ٹبے تاریکی میں

ڈوب گئے۔ لالی مڑا اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا غار کے اندر چلا گیا۔

☆

لالی اور رحیم داد کے پاس اب صرف بسکٹوں کا ایک پیکٹ رہ گیا تھا۔ اس میں سے بھی وہ چار بسکٹ شام کو کھا چکے تھے۔ ڈبا بھی پانی سے قریب قریب خالی ہو چکا تھا۔ وہ ڈبے سے منہ لگا کر گھونٹ' گھونٹ پانی پیتے۔ اگر کوئی زیادہ پانی پینے کی کوشش کرتا تو دوسرا جھٹ ڈبا اس کے ہاتھ سے چھین لیتا۔ دوپہر کو دھوپ تیز ہو جاتی۔ بنجر اور پتھریلے ٹیلے گرمی سے دہکنے لگتے۔ دونوں کو بار بار پیاس لگتی۔

شروع میں تو وہ اطمینان سے پانی پیتے رہے۔ مگر جب ڈبے میں پانی چوتھائی سے بھی کم رہ گیا تو دونوں کی خود غرضی بیدار ہوئی۔ وہ پانی پیتے وقت ایک دوسرے کو ٹوکتے' غصے سے گھورتے۔ زیادہ جھنجلاتے تو چھینا جھپٹی سے بھی دریغ نہ کرتے۔ لالی ہر بار زیادتی کرتا۔ رحیم داد ٹوکتا اور غصے سے بڑبڑاتا تو وہ بے غیرتی سے دانت نکال کر کھسیانی ہنسی ہنستا۔

اس شام انھوں نے دو دو بسکٹ کھائے اور ایک ایک گھونٹ پانی پیا۔ آپس میں یہ سمجھوتا ہوا کہ صبح تک نہ کوئی بسکٹ کھائے گا نہ پانی پیئے گا۔ اس سمجھوتے پر سختی سے عمل کرنے کا عہد کر کے دونوں پڑ کر سو گئے۔

رات گئے رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ اسے سخت بھوک لگی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش لیٹا بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ جب قرار نہ آیا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لالی گہری نیند سو رہا تھا۔ باہر اجلی چاندنی چھٹکی تھی۔

رحیم داد آہستہ سے غار کے باہر نکلا اور اس کے دہانے پر کھڑا چاندنی میں ڈوبے ہوئے ٹیلوں اور ٹبوں کو دیکھتا رہا۔ وہ کئی منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ اس عرصے میں لالی نے نہ کروٹ بدلی نہ ہی جسم کو حرکت دی' بے خبر سوتا رہا۔

رحیم داد گردن موڑے اسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ پھر ہولے ہولے چلتا ہوا غار کے اندر گیا۔ ٹٹول کر بسکٹ کا پیکٹ اٹھایا اور آہستہ آہستہ بسکٹ کھانے لگا۔ اس نے ایک بسکٹ ختم کیا' ٹین کا ڈبا اٹھایا۔ اس کا ڈھکنا کھولا اور جیسے ہی گردن اونچی کی۔ ڈبا منہ سے لگایا۔ اچانک کسی نے اس کی گردن دبوچ لی۔

یہ لالی تھا اور اسے خون خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ لمحے بھر خاموش رہ کر وہ غصے سے دھاڑا۔

"اوئے کنجر' یہ چار سو بیسی۔" رحیم داد کھسیانا ہو کر بولا۔



"یار میری گردن تو چھوڑ۔"

لالی نے زور سے دھکا دیا۔ رحیم داد لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اس کا سر غار کی پتھریلی دیوار کے ساتھ کھٹاک سے ٹکرایا۔ آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ چند لمحے خاموش پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پانی کا ڈبا اٹھایا اور غار کے باہر پھینک دیا۔ بسکٹوں کا پیکٹ بھی اٹھا کے غصے سے پھینک دیا۔ اور غضب ناک ہو کر بولا۔

"لے جا' سب کچھ لے جا۔ میں نوں کچھ نہیں لینا۔"

لالی اس حرکت پر اور جھنجلایا۔ دانت پیس کر رحیم داد پر جھپٹا اور گھونسوں اور لاتوں سے اس کی مرمت کرنے لگا۔ رحیم داد کچھ دیر تو خاموشی سے پٹتا رہا' پھر جھپاک سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گردن جھکا کر اس نے لالی کے منہ پر زور سے ٹکر ماری۔ چوٹ کراری آئی۔ لالی کا جبڑا ہل گیا۔ وہ تکلیف سے بلبلا کر رحیم داد کو مارنے کے لیے پل پڑا۔ رحیم داد بھی پسپا نہ ہوا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

لالی کو جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ رحیم داد کو جس قدر کمزور اور بودا سمجھتا تھا ہرگز ایسا نہ تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں خاصا کس بل تھا۔ ایک بار اس نے زور لگا کر لالی کو گرا دیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ لالی بے بس ہو گیا۔

وہ ذرا دیر تک زمین پر پڑا بے بسی سے ادھر' ادھر گردن ہلاتا رہا اور رحیم داد تابڑ توڑ مکے لگاتا رہا۔ آخر لالی نے ہاتھ بڑھا کر رحیم داد کا منہ دبوچ لیا اور دانت بھینچ کر پوری قوت سے دھکا دیا۔ رحیم داد کا سر زور سے پتھریلی دیوار سے ٹکرایا۔ وہ کراہتا ہوا وہیں ڈھے گیا۔

لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد دیوار کے پاس بے سدھ پڑا تھا۔ لالی خاموش بیٹھا اسے گھورتا رہا' اور ہونٹوں سے رستا ہوا خون ہاتھ سے بار بار پونچھتا رہا۔ وہ کھسکتا ہوا رحیم داد کے پاس گیا۔

رحیم داد آنکھیں بند کیے چت لیٹا تھا اور رک رک کر سانس بھر رہا تھا۔ لالی نے آہستہ سے جھنجھوڑا' مگر وہ بے سدھ پڑا رہا۔ لالی نے کئی بار جھنجھوڑا' لیکن رحیم داد نے آنکھ نہ کھولی۔ لالی کا سارا غصہ جھاگ کی مانند بیٹھ گیا۔ وہ پریشان ہو گیا اور رحیم داد کی پیشانی اور کنپٹیوں کو ہولے ہولے سہلانے لگا۔

بہت دیر بعد رحیم داد نے آنکھ کھولی۔ اس کے سر میں ابھی تک درد تھا۔ اس نے دیکھا' لالی اس کے سرہانے بیٹھا ہے۔ رحیم داد نے کروٹ بدلی اور اٹھنے کی کوشش کی۔ لالی نے پیار سے ڈانٹا۔

"لیٹا رہ۔ طبیعت کیسی ہے؟"

رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش لیٹا رہا۔ لالی نے پوچھا۔ "بول، بولتا کیوں نہیں؟ طبیعت تو اب ٹھیک ہے نا؟"

اس دفعہ بھی رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی نے نرم لہجے میں کہا۔ "یار! زیادتی ہوگئی۔ معاف کردے۔ یہ غصہ بہت حرام کا تخم ہوتا ہے۔" اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ "لے' اب تو اٹھ جا پیارے!" رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ لالی چپ چاپ اٹھا اور غار سے باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد واپس آیا۔ اس نے بسکٹ کا پیکٹ اور پانی کا ڈبا رحیم داد کے سامنے رکھ دیا' چمکار کر گویا ہوا۔

"سارے بسکٹ کھالے۔ پانی بھی سارا پی لے۔ میری پروا نہ کر۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔" اس نے ایک بسکٹ اٹھایا اور رحیم داد کے ہونٹوں سے لگا کر بولا۔ "لے اب تو کھالے۔ زیادہ نخرا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

رحیم داد نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ "میں نے کچھ نہیں کھانا۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا اور آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگا۔

لالی نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "توں تو زنانیوں کی طرح ٹسوے بہانے لگا۔ یار! اس میں رونے کی کون سی گل ہے۔" رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا خاموش بیٹھا سسکیاں بھرتا رہا۔ لالی نے پانی کا ڈبا اٹھا کر رحیم داد کے سامنے کردیا۔

"لے گھونٹ بھر پانی پی لے۔"

"لالی! مجھے تنگ نہ کر۔ جی بھر کے رو لینے دے۔"

"مگر توں رو کیوں رہا ہے؟"

رحیم داد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اٹھا اور غار سے باہر جانے لگا۔

لالی اسے باہر جاتے دیکھ کر بولا۔ "کہاں جارہا ہے؟"

"جیل!" رحیم داد نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

لالی اس کی جانب لپکا اور ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "تیرا مگز چل گیا ہے؟"

رحیم داد نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ "مجھے جانے دے۔ لالی! میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ ایسی زندگی سے تو جیل بھلی۔" لالی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ "اتنی جلدی گھبرا گیا۔ یار! چند روز کی بات ہے۔ فیر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" رحیم داد بے زاری سے بولا۔ "مجھے نہ روک۔ میں تیرے رستے پر نہیں چل سکتا۔ میرے نصیب میں جتنے دن کی جیل لکھی ہے' کاٹ لوں گا۔"



"مگر اب تو دگنی کاٹنی پڑے گی۔ مشقت بھی زیادہ کرنی پڑے گی۔ کید تنہائی بھی ہوگی۔ جیل سے بھاگنا مخول نہیں ہے۔ کیا سمجھا؟"

"سب کچھ سمجھ گیا۔ مگر اب میں یہاں رہوں گا نہیں۔"

لالی نے ہلکا سا قہقہہ بلند کیا۔ "میرے ساتھ بھی نہیں رہے گا؟ جان من! یہ بے وفائی؟" وہ لمحے بھر رک کر بولا۔ "مگر میں تجھے اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے۔ لے اب تو مان جا۔"

لالی نے رحیم داد کا بازو پکڑا اور کھینچ کر اندر لے آیا۔ رحیم داد خاموشی سے زمین پر بیٹھ گیا۔ لالی بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا دیوار سے ٹیک لگا کر بولا۔ "اب آرام نال گل بات ہوگی۔ بول کیا کہتا ہے؟"

"گل ایہہ ہے لالی! مجھے یہ زندگی بالکل پسند نہیں۔"

"تو کیا مجھے چنگی لگتی ہے۔ ایک دم واہیات ہے۔ پر اب میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتا۔"

"یہ تو سوچ' اس طرح کب تک کام چلے گا؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہے' کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا اور جھیتی کرنا پڑے گا۔" لالی ذرا دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "تیار ہو جا! ابھی تو رات رہتی ہے۔ چاندنی بھی ہے۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکا۔ "بسکٹ کھا کر پانی پی لے۔ دیکھ انکار نہ کرنا۔"

رحیم داد نے کچھ کہے بغیر پیکٹ سے بسکٹ نکال کر کھانا شروع کر دیئے۔ وہ بسکٹ کھاتا رہا اور لالی اپنی جیل کی وردی اتارنے لگا۔ وردی اتار کر اس نے پتلون پہنی۔ پتلون ذرا تنگ تھی' البتہ بش شرٹ اس کے جسم پر ٹھیک رہی۔ لیکن جوتے ڈھیلے تھے۔ لالی نے جیل کا کرتا پھاڑا اور اس کی دھجیاں بھر کر جوتے پہن لیے۔ جب وہ کپڑے بدل چکا تو ہنس کر بولا۔

"کیسا لگ رہا ہوں؟"

"بالکل صاحب بہادر لگ رہا ہے۔"

"پروا نہ کر' تجھے بھی صاحب بہادر بنا دوں گا۔" لالی نے جیب سے نوٹ نکالے۔ انھیں فضا میں لہرایا۔ "ایک سو چالی سے اوپر ہیں۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے افسردہ ہوگیا۔ "پتہ نہیں مرنے والا کون تھا۔ چنگا ہی بندہ تھا۔ اپنے لیے تو پتلون کی جیب میں یہ روپے چھوڑ گیا۔ کام بن گیا۔"

"اوپر سے راشن پانی کا بندوبست بھی ہوگیا۔ یار! میں کہتا ہوں' اس روز روٹی ٹکر نہ ملتا تو کیا ہوتا۔ ذرا سوچ' کیا ہوتا؟ چلا تک تو جا نہیں رہا تھا۔" رحیم داد نے بسکٹ کا پیکٹ لالی کی طرف

بڑھادیا اور بار بار انکار کے باوجود اصرار کر کے بچے ہوئے بسکٹ اسے کھلا دیئے۔

مگر جب لالی نے پانی پینے کے لیے ڈبا اٹھا کر منہ سے لگایا تو مشکل سے چند قطرے نکلے۔ سخت کوفت ہوئی۔

بسکٹ کھانے سے گلا خشک پڑ گیا تھا۔ پیاس اچانک بڑھ گئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی جیل کی وردی بھاری پتھر کے نیچے چھپائی۔ ٹین کا ڈبا اٹھا کر دور پھینکا اور رحیم داد کے ہم راہ غار سے نکل کر ناہموار ٹیلوں پر چلنے لگا۔

دونوں ایک بار پھر نشیب میں اتر رہے تھے۔ سامنے چاندنی میں جھلکتا ہوا ٹوبا تھا۔ آگے پل تھا اور سڑک ویران تھی۔ ٹوبے کے پاس پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ حادثے میں ہلاک ہونے والوں کی لاشیں اٹھائی جا چکی ہیں۔ البتہ کار کا جلا ہوا ڈھانچہ بدستور اپنی جگہ موجود ہے۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ اجلی چاندنی میں سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ لالی اور رحیم داد نے جھک کر ٹوبے سے پانی پیا' منہ ہاتھ دھوئے اور تر و تازہ ہو کر آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتے ہوئے پل پر پہنچ گئے۔ دونوں کچھ دیر پل پر خاموش کھڑے رہے اور سوچتے رہے کہ انھیں کس سمت جانا چاہئے۔ مگر یہ فیصلہ لالی ہی کر سکتا تھا۔ رحیم داد ایسے موقعوں پر خاموش رہتا تھا۔ جدھر لالی چلتا' بغیر حیل و حجت اس کے پیچھے پیچھے چل دیتا۔ لیکن لالی بھی اس وقت تذبذب میں مبتلا تھا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ کہاں ہے؟ نہ یہ اندازہ تھا کہ کون سا راستہ دونوں کے لیے محفوظ رہے گا؟ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ چاند کی رنگت میں زردی آ گئی تھی۔ پاک پتن روڈ بالکل سنسان تھی۔ کئی منٹ گزر گئے۔ لالی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ اس نے رحیم داد سے مشورہ کیا۔

"رحیمے! اپنا تو مگز کام نہیں کر رہا' تو بتا کدھر چلیں؟"

"میں نے کیا بتانا۔ جدھر کہے گا' تیرے سنگ چل دوں گا۔"

"پر تیں نوں کہیں تو جانا ہی ہو گا۔ تیرا تو گھر بار بھی ہے۔"

"ہے تو' تجھے بتا بھی چکا ہوں۔ گھر والی ہے۔ ایک چھوہری ہے۔ دو پت ہیں۔ چھوہری مجھے بہت پیار کرتی ہے۔ یاد بھی بہت آتی ہے۔" رحیم داد اپنی بات کہتے کہتے غم زدہ ہو گیا۔ "مگر میں اس کے پاس کیسے جا سکتا ہوں۔ گھر جانے کے سارے رستے تو میں نے خود ہی بند کر دیئے۔"

"یار تیرا تو پورا ٹبر ہے۔ میں نے یہ جھنجٹ ہی نہیں پالا۔ تیری طرح کچھ یار دوست ہیں' انھی کے ساتھ گزرتی رہی۔"

یار دوستوں کے ذکر پر لالی کو شادو یاد آ گیا۔ اس کا بہت اچھا دوست تھا۔ عرصہ ہوا' وہ بھی اس کی



طرح جرائم پیشہ تھا۔ چوری اور رہزنی کرتا۔ کبھی اکیلے' کبھی لالی یا دوسروں کے ساتھ مل کر۔ ان کا باقاعدہ گروہ بن گیا۔ لالی بھی شادو کے ساتھ گروہ میں شامل تھا۔ انھوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ بے جگری سے ڈاکے ڈالے۔ خوب گل چھرے اڑائے۔ مگر ایک تانگے والے کی مخبری پر پکڑے گئے۔ مقدمہ چلا۔ سزائیں ہوئیں۔ جیل سے نکلے تو گروہ تتر بتر ہو چکا تھا۔ شادو نے جیل کاٹنے کے بعد ایسی توبہ کی کہ پھر ادھر کا رخ نہ کیا۔ لیکن پولیس اسے برابر پریشان کرتی رہی۔ علاقے میں چوری' ڈاکہ زنی کی کوئی واردات ہوتی اسے ضرور تھانے میں بلایا جاتا۔ پوچھ گچھ ہوتی۔ ڈرایا' دھمکایا جاتا۔

اب شادو لائل پور میں رہتا تھا اور سائیکلوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ اس نے شادی کر لی تھی۔ دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ لالی اس سے برسوں نہ ملتا۔ مگر جب بھی ملتا' وہ ہمیشہ لالی کے ساتھ محبت سے پیش آتا۔ ایک بار لالی ڈاکے کی ایک واردات کے بعد دو ہفتے شادو کے گھر میں روپوش رہا۔ حالانکہ اس کی بیوی گھر میں لالی کے رہنے پر خوش نہیں تھی۔ ہر وقت کڑکڑ کرتی رہتی۔ شادو کبھی اسے پیار سے سمجھاتا' کبھی ناراض ہوتا۔ آئے دن جھگڑا رہتا۔ لیکن شادو کی آنکھوں میں کبھی میل نہ آیا۔ وہ لالی کا ہر طرح سے خیال رکھتا۔

لالی پل پر کھڑا شادو کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ کسی نہ کسی طرح شادو کے پاس لائل پور پہنچ جانا چاہتا تھا۔ لائل پور جانے کے لیے لاری کے اڈے یا ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا ضروری تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جیل سے فرار ہوئے اتنے دن ضرور ہو چکے ہیں کہ پولیس نے راستوں کی ناکہ بندی اور اسٹیشنوں کی نگرانی ختم کر دی ہو گی۔ لیکن سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ لباس تبدیل کرنے کے بعد لالی تو ہر جگہ پہنچ سکتا تھا مگر رحیم داد کی جیل کی وردی مسلسل خطرہ تھی۔ لالی کہیں جانے سے پہلے رحیم داد کو اس خطرناک وردی سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ صرف اسی صورت میں دونوں سفر کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ لالی کو یہ کام جلد سے جلد کرنا تھا۔

رحیم داد بھی کچھ دیر بھولی بسری یادوں میں کھویا رہا۔ مگر جب لالی گم صم کھڑا رہا اور آگے نہ بڑھا تو رحیم داد نے ٹوکا۔ "تو کس سوچ میں پڑ گیا؟ رات کم رہ گئی ہے۔"

لالی اس کی بات سن کر چونک پڑا۔ "ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"پر توں کب تک یہاں کھڑا رہے گا؟" رحیم داد نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

"کہیں تو چلنا ہی ہو گا۔ یہاں اس طرح کھڑا رہنا بھی خطرناک ہے۔"

لالی آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ چلا۔ دونوں پاک پتن روڈ پر کچھ دور تک چلتے رہے' پھر

نشیب میں اتر گئے اور جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ علاقہ بنجر اور ویران تھا۔ جگہ' جگہ پھوگ اور لانا کے پودوں کے جھنڈ تھے۔ دونوں مغرب کی سمت بڑھ رہے تھے۔ اب وہ پاک پتن روڈ سے بہت دور جا چکے تھے۔



## ۳

درختوں کے پیچھے کہیں کہیں روشنی جھلملا رہی تھی۔ کوئی بستی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ لالی اور رحیم داد آگے بڑھے۔ اب بستی کے نشان واضح ہوتے جا رہے تھے۔ چراغوں کی ٹمٹماہٹ بڑھ گئی تھی۔ اکا دکا مکان صاف دکھائی دے رہے تھے۔

دونوں نے نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے رڑ عبور کیا اور گاؤں میں داخل ہو گئے۔ گاؤں خاصا بڑا تھا۔ دور تک مکانوں کا سلسلہ پھیلا تھا۔ بیشتر مکانات مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ اکا دکا پختہ اور نیم پختہ تھے۔ مگر وہ مکانوں کے قریب نہ گئے۔

رحیم داد خوف سے سہما ہوا تھا۔ لیکن لالی چاق چوبند نظر آ رہا تھا۔ اس نے گردن گھما پھرا کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ رحیم داد کے ہم راہ دبے دبے قدموں چلتا ہوا آگے بڑھا اور ایک گھنے درخت کے نیچے پہنچ کر رک گیا۔ سامنے کچا مکان تھا جو گاؤں کے نکڑ پر تھا' اور دوسرے مکانوں سے الگ تھلگ بھی تھا۔

لالی چند لمحے ٹھہر کر آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں اس مکان کے نزدیک پہنچے اور دیوار سے لگ کر اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ لالی نے جھک کر اپنے جوتے اتارے اور رحیم داد کے حوالے کر دیئے۔ اس نے گردن اٹھا کر دیوار کی بلندی کا اندازہ لگایا۔ دیوار زیادہ اونچی نہ تھی۔ لالی نے دونوں ہاتھ بلند کئے۔ اچھلا اور ہاتھوں سے دیوار کا بالائی حصہ تھام لیا۔ وہ پیروں سے سہارا لیتا ہوا' دھیرے دھیرے اوپر پہنچ گیا۔ دیوار پر پہنچ کر اس نے اندر کا جائزہ لیا۔ ؛۔ا۔۔ دیوار سے چمٹا ہوا جھانکتا رہا' پھر خاموشی سے صحن میں اتر گیا اور دیوار کے ساتھ دبک

کر بیٹھ گیا۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ دیر تک جب کوئی کھٹکا نہ ہوا تو لالی اٹھا اور اس دروازے کی جانب بڑھا جو باہر گلی میں کھلتا تھا۔

لالی نے دروازہ کھولا۔ گردن باہر نکالی۔ آہستہ سے سیٹی بجائی اور ہاتھ کے اشارے سے رحیم داد کو اپنے قریب بلایا۔ رحیم داد اس کے پاس گیا اور گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ لالی نے دروازہ بند کر دیا' مگر کنڈی نہیں لگائی۔ دروازے کے سامنے صحن تھا۔ ایک طرف شیشم کا پیڑ تھا۔ اس کے نیچے پتل تھا جس میں ایک بھینس بندھی تھی۔ صحن سے ملا ہوا دالان تھا۔ اس پر پھوس کی خمیدہ چھت تھی۔ دالان کے عقب میں دروازہ تھا۔ اس کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا۔ روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔

لالی نے رحیم داد کو بیرونی دروازے پر ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ خود ہولے ہولے چلتا ہوا دالان میں پہنچا اور دروازے سے لگ کر اندر جھانکنے لگا۔ کچھ دیر وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

چھت سے لالٹین لٹک رہی تھی۔ مگر اس کی روشنی دھیمی تھی۔ لالی نے ہلکی ہلکی روشنی میں دیکھا۔ دیوار کے پاس چارپائی تھی۔ اس پر بستر بچھا تھا۔ مگر بستر خالی تھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ ایک اور دروازہ بھی تھا۔ یہ ملحقہ کوٹھری میں کھلتا تھا۔ اس دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اندر ہلکی ہلکی روشنی تھی۔

کمرے میں عجب نامانوس سی بو پھیلی تھی۔ ایسی بو' جو اس سے پہلے لالی نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس پراسرار بو نے کمرے کا ماحول آسیب زدہ بنا دیا تھا۔ کسی ان جانے خوف سے لالی کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ واپس چلا جائے۔ عین اسی وقت کوٹھری کے اندر گہری گہری سانسیں بھرنے کی سرسراہٹ ابھری۔ لالی نے آہستہ سے چاقو نکال کر کھولا اور کوٹھری کے دروازے کی جانب چوکنا نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایک منٹ گزرا' دوسرا گزرا۔ کوئی نہیں آیا۔ گہری گہری سانسوں کی سرسراہٹ بھی بند ہو گئی۔ لالی کی نگاہ لکڑی کے اس صندوق پر پڑی جو چارپائی سے ذرا ہٹ کر رکھا تھا۔

لالی نے صندوق دیکھتے ہی واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے ہاتھ اونچا کیا۔ لالٹین کی لو اور دھیمی کر دی۔ آگے بڑھا اور صندوق کے قریب جا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ صندوق کے کنڈے میں تالا پڑا تھا' مگر تالا کھلا تھا۔ اس میں کنجی بھی لگی ہوئی تھی۔ لالی کو کسی قدر حیرت بھی ہوئی۔ لیکن اس پر توجہ صرف کرنے کے بجائے اس نے آہستہ سے ایک ہاتھ سے ڈھکنا اٹھایا اور دوسرا ہاتھ



اندر ڈال کر کپڑے تلاش کرنے لگا۔ کپڑے نیچے تھے۔ اوپر ایک موٹی کھیس تہہ کر کے رکھی گئی تھی۔

لالی نے ایک کپڑا نیچے سے نکالنے کی کوشش کی' اچانک اسے اپنی پشت پر آہٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی آواز آئی۔

"وے کون ہے؟"

لالی نے پلٹ کر دیکھا' کوٹھری کے دروازے کے بیچوں بیچ ایک عورت کھڑی ہے۔ اس کے بال بکھر کر چہرے پر آ گئے تھے۔ آنکھیں جنگلی کبوتر کی مانند گہری سرخ تھیں۔ اس کے داہنے ہاتھ میں چھری تھی اور خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ دھندلی روشنی میں عورت خوں خوار اور ڈراؤنی نظر آ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ لالی کی جانب بڑھی۔ لالی اسے دیکھ کر سخت حواس باختہ ہو گیا۔ صندوق کے اندر پڑا ہوا ہاتھ بھی باہر نہ نکال سکا۔ جس حالت میں تھا' اسی حالت میں دم بخود بیٹھا رہا۔ لالی کو خاموش دیکھ کر عورت گرجی۔

"سور دے پتر' چوری کرنے آیا تھا؟"

لالی کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی جانب دیکھ بھی نہ سکا۔ اس نے گردن جھکا لی اور خاموشی سے فرش تکنے لگا۔ عورت اس کے سر پر آ کر کھڑی ہو گئی اور اسی درشت لہجے میں بولی۔ "تیرے بھی ٹوٹے کر کے اسی کے برابر لٹا دوں گی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کوٹھری کی جانب اشارہ کیا۔

"دیکھے گا؟ چل دیکھ لے' کھڑا ہو۔"

لالی چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ عورت نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا اور کوٹھری کے دروازے کی جانب انگلی اٹھا کر بولی۔ "اتھے چل۔" لالی اس کی ہدایت پر سرکس کے سدھے ہوئے جانور کی طرح لڑکھڑاتے قدموں دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچا تو عورت نے ڈپٹ کر کہا۔

"اندر ٹر جا۔"

لالی خاموشی سے اندر چلا گیا۔ عورت بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گئی۔ کوٹھری صاف ستھری تھی۔ طاق میں چراغ بھی جل رہا تھا۔ اس کی زرد زرد روشنی میں سامنے چٹائی پر کوئی لیٹا تھا۔ اس کا پورا جسم چادر سے ڈھکا تھا۔ عورت نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ لالی نے دہشت زدہ ہو کر دیکھا' اس کی گردن کٹی ہوئی ہے۔ ہلکی ہلکی نامانوس بو اچانک تیز ہو گئی۔ مقتول کی آنکھیں' کھلی ہوئی تھیں اور اس قدر ڈراؤنی تھیں کہ لالی نظر بھر کر نہ دیکھ سکا۔ عورت' لاش کے

سرہانے بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپ رہی تھی۔ لالی سہما ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"اسے کس نے کتل کر دیا؟"

"کون کرے گا اسے کتل؟" عورت نے لالی کو سرخ سرخ آنکھوں سے گھورا اور پاگلوں کی طرح سینے پر ہاتھ مار کر بولی۔ "اسے میں نے کتل کیا ہے' ہاں میں نے کیا ہے۔" اس نے خون سے آلودہ چھری لالی کے سامنے کر دی۔ اس نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "یہ بھی پچھ۔ یہ کون ہے؟" اس نے قدرے توقف کیا۔ "یہ میرا یار ہے۔"

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ عورت نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ وہ ابھی تک گہری گہری سانسیں بھر رہی تھی۔ لالی اسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنی عمر کی اس سرحد پر تھی جب جوانی کی دوپہر کا سورج ڈھلنے لگتا ہے۔ اس کے ہاتھ سخت اور کھردرے تھے۔ جسم کسا ہوا اور مضبوط تھا۔ چہرہ کڑی محنت اور تیز دھوپ سے سنولا کر صندلیں ہو گیا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں بجھ کر دھندلا گئی تھیں۔ چراغ کی دھندلی دھندلی روشنی میں لالی کو اب وہ نڈھال اور تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ کوٹھری کے ایک کونے میں مٹکا رکھا تھا اور اس پر المونیم کا گلاس بھی تھا۔ لالی نے رسان سے کہا۔

"پانی پی لے۔"

"پلا دے۔" عورت نے لالی کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ اس دفعہ اس کے لہجے میں پہلے جیسی درشتی نہیں تھی۔

لالی نے مٹکے کا ڈھکنا اٹھا کر گلاس اندر ڈالا اور پانی سے بھرا ہوا گلاس بڑھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ پورا گلاس اس طرح غٹاغٹ پی گئی گویا بہت دیر سے پیاسی ہو۔ پانی پینے کے بعد اس کے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت کم پڑ گئی۔ اس نے دیوار سے پیٹھ ٹکالی اور چند لمحوں تک آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی۔ مگر جلد ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور کھوئی کھوئی نظروں سے لاش کو دیکھنے لگی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ "دیکھ تو کیسا گبھرو ہے۔"

لالی نے لاش کے چہرے کی جانب ایک بار پھر دیکھا۔ گھونگر والے لمبے لمبے بال' کھلتی ہوئی رنگت' تیکھے نقش و نگار اور مڑی ہوئی طرح دار مونچھیں۔ واقعی وہ بڑا وجیہہ اور بانکا جوان تھا۔ عورت رک رک کر کہتی رہی۔ "اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ پہلے اتنا سوہنا تھا۔ ایسا رنگ روپ تھا' ہاتھ لگاؤ تو میلا پڑ جائے۔ کوئی دیکھے تو دیکھتا رہ جائے۔" عورت اس کے ذکر میں لذت محسوس کر



رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی رفتہ رفتہ ہلکی پڑتی جا رہی تھی۔ "اس کی میری یاری آشنائی ہو گئی۔ جانے کیسے ہو گئی۔ بس ہو گئی' فیر سب ہی کچھ ہوا' وہی جو ہوتا ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جب بہت بدنامی ہوئی تب میں ایک رات اس کے ساتھ گھر سے نکل گئی۔ ہائے کیسی کالی رات تھی۔ اسی رات میں جہانگیرہ آ گئی۔ اس پنڈ کا نام جہانگیرہ ہے۔" وہ لاش کو دیکھتی رہی اور اس طرح ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ بولتی رہی جیسے خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔

لالی نے اس کا بدلا ہوا انداز اور دھیما لہجہ محسوس کیا۔ "توں نے اس کا خون کیوں کر دیا؟"

عورت نے چونک کر اس طرح حیرت سے لالی کو دیکھا جیسے اسے یکسر فراموش کر چکی ہو۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے لالی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر لالی نے اسے خاموش نہیں رہنے دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ عورت سب کچھ کہہ ڈالے۔ وہ ساری باتیں کہہ دیتی تو ٹھنڈی پڑ جاتی۔ نہ اس کی آنکھیں خون خوار رہتیں نہ چہرہ ویران نظر آتا۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک بار حوالات میں اس کے ساتھ ایک قاتل بھی بند تھا۔ وہ ساری رات جاگتا تھا۔ کھا جانے والی نظروں سے گھورتا تھا۔ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرتا تھا۔ دوسرے ملزموں کا گلا گھونٹنے کے لیے جھپٹتا تھا۔ مگر جب اس نے پولیس کے سامنے سب کچھ اگل دیا تو واپسی پر حوالات میں آ کر دھڑام سے فرش پر گر گیا۔ مردے کی طرح ٹھنڈا پڑا رہا۔ ایسی گہری نیند سویا کہ دوسرے روز' زور زور سے جھنجھوڑنے پر جاگا۔

لالی نے اصرار کر کے عورت سے پوچھا۔ "بولتی کیوں نہیں؟ توں نے اس کا خون کیوں کر دیا؟"

"یہ نہ پچھ۔" عورت کی آنکھوں میں ایک بار پھر شعلے بھڑکنے لگے۔ وہ زور زور سے ہانپنے لگی۔ "اس نے میری طرف سے آنکھیں بند کر لیں' مجھے دھوکا دیا۔" وہ گلہ کرنے کے انداز میں کہنے لگی۔ "میں نے اس کے کارن گھر بار چھوڑا۔ اپنے دونوں نکے چھوڑے۔ گھر والے کو چھوڑا۔ وہ برا بندہ نہیں تھا۔ جان چھڑکتا تھا مجھ پر۔ جو کہتی کرتا تھا۔ بس ذرا..." اس نے نہایت بے باکی سے گالی دی اور سامنے پڑی ہوئی لاش کی جانب اشارہ کر کے نفرت اور غصے سے منہ بگاڑا۔ "یہ دھوکے باز نکلا۔ ایک دم ہڈ حرام' نہ کام کا نہ کاج کا۔ ہر وکھت مانگ کاڑھتا' مونچھیں مروڑتا' آڑا ترچھا ہو کر آئینہ دیکھتا۔ گلیوں میں اینڈتا پھرتا۔ شہر جا کر روز سنیما دیکھتا۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اپنے زیور اور کپڑے لتے بیچ کر ایک مجّ خرید لی۔ دن رات محنت کرتی۔ لمبردار کی حویلی میں کام کاج کرتی۔ اپنا پیٹ پالتی اور اس کے نکھرے بھی پورے کرتی۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "اس کے لیے میں نے کیا نہیں کیا۔ اپنی ذرا بھی پروا نہ کی۔ میں ایسی نہ تھی۔ میرا ایسا روپ رنگ

نہ تھا۔ سب کچھ جل کر کوئلہ ہو گیا اور اس نے مجھے کیا دیا؟ میرا خانہ خراب کر کے کہیں اور آنکھ لڑا لی۔"

عورت بات کرتے کرتے رک گئی۔ لاش کو گھورنے لگی۔ اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "کہتا تھا شاداں! تیرے بنا زندہ نہیں رہ سکتا۔ ریل کے نیچے لیٹ جاؤں گا۔ گلے میں پھندا ڈال کر مر جاؤں گا۔" عورت کے لہجے میں تلخی بڑھتی گئی۔ اس کا چہرہ وحشت ناک ہو گیا۔ "جھوٹا' مکار۔ مجھے چھوڑ کے اس کنجری کے ساتھ چپکے سے نکاح کر لیا۔ ہفتوں نہ آتا۔ جب آتا' ہتھ پھیلائے ہوئے۔ کچھ لیے بنا نہ ٹلتا۔ میں جان بوجھ کر دھوکا کھاتی رہی۔"

وہ خاموش ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود چھری ابھی تک دبی ہوئی تھی۔ مگر لالی کو اب اس سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ عورت اپنا خول توڑ کر آہستہ آہستہ باہر آ رہی تھی۔

لالی چاہتا تھا کہ وہ کچھ بھی اپنے دل میں نہ رکھے۔ ہر بات کہہ ڈالے۔ کھرے سکے کی طرح ٹن ٹن بولنے لگے۔ لالی نے اسے کریدا۔

"یہ تو بتا' آج کیا ہوا؟"

وہ کھوئی کھوئی نظروں سے لالی کو دیکھتی رہی' پھر دھیرے دھیرے کہنے لگی۔ "آج شام' پورے تین مہینے بعد آیا تھا۔ پہلے تو ڈھیر سارا پیار جتایا۔ وہی ایکٹروں والی فلمی باتیں۔ روز روز سنیما جو دیکھتا تھا۔ کہنے لگا' اپنی نُج بیچ دے۔ اسے ادھار چکانا تھا۔ میں نے بار بار انکار کیا۔ وہ نہ مانا۔ اپنی ہی کہتا رہا۔ مجھے ایک دم غصہ آگیا۔ اٹھی اور جھلیانی سے چھری نکال لائی۔ چھری اس کے سامنے ڈال کر بولی۔ توں نے میرا خانہ خراب ہی کرنا ہے تو یہ چھری لے اور میرے گلے پر چلا دے۔ میں جیتے جی تو اپنی نُج بیچوں گی نہیں۔" وہ لمحے بھر رک کر بولی۔ "ایمان نال بتا' اپنی نُج بیچ دوں گی تو میرا کیا بنے گا۔"

بات ادھوری ہی چھوڑ کے وہ پھر خاموش ہو گئی۔

لالی نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔ "شاداں! تیرا نام شاداں ہی ہے نا؟ تو چبا چبا کر کیوں بات کرتی ہے۔ یہ بتا' اس کا خون کیوں کر دیا؟" وہ رفتہ رفتہ بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔

"اس نے ایک ایسی بات کہی' میں غصے سے پاگل ہو گئی۔" شاداں اپنی بات کہتے کہتے ایک بار پھر بہکی۔

"میں نے تجھے اس کا نام تو بتایا ہی نہیں۔"



لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "ہو گا کوئی نام۔"

"بالا۔" اس نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ پڑا ہے بالا۔ اب تو بس نام ہی رہ گیا ہے۔"

لالی بیزاری سے بولا۔ "اس کا منہ ڈھک دے۔ آگے بتا۔"

شاداں نے جھک کر بالا کی لاش کا چہرہ چادر سے ڈھک دیا۔ "ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ چھری دیکھ کر وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ جب ہنس چکا تو منہ ٹیڑھا کر کے بولا۔ بوڑھی ڈھگی کے گلے پر تو کسائی چھری چلاتا ہے۔ میں ایسا کام نہیں کرتا۔ کسائی کے پاس چلی جا۔ نُج میرے حوالے کر دے۔ سنا توں نے' اس نے کیا کہا؟" وہ لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "اس نے مجھے بوڑھی ڈھگی کہا۔ کیا میں بوڑھی ڈھگی لگتی ہوں؟" اس کا چہرہ بجھ کر دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے گہری سانس بھری اور تڑپ کر بولی۔

"ہاں میں بوڑھی ڈھگی ہی لگتی ہوں۔ پر بوڑھی ڈھگی بھی تو میں اسی کے ہاتھوں بنی۔ اس نے میرا سب کچھ چھین لیا اور آنکھیں بھی پھیر لیں۔ ایک نمبر کنجر نکلا۔"

شاداں کی آنکھیں پھر خونخوار ہو گئیں۔ اس نے چھری مضبوطی سے پکڑ لی۔ "میں کچھ نہ بولی۔ چھری اٹھائی اور روتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس نے مجھے روکا بھی نہیں۔ آئینہ اٹھا کر اپنا حسن دیکھنے لگا' مونچھیں مروڑنے لگا۔ میں دیر تک اندھیرے میں بیٹھی روتی رہی۔ نہ وہ باہر آیا نہ میرے آنسو پونچھے۔ واپس آئی تو بستر خالی تھا۔ کوٹھری میں جا کر دیکھا تو آرام سے سو رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ سونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ بوڑھی ڈھگی کے ساتھ کیوں سوتا؟"

"فیر کیا ہوا؟" لالی نے بے قراری سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔ میں کھڑی اسے گھورتی رہی۔ فیر دھیرے دھیرے اس کے پاس گئی اور سرہانے بیٹھ گئی۔ وہ اسی طرح آرام نال سوتا رہا۔ میں نے جل کر چاہا اس کے منہ پر تھوک دوں' پر میں نے تھوکا نہیں۔ چھری ہاتھ میں دبی تھی۔ اس کی گردن پر پھیر دی۔ پورا گلا کاٹ دیا۔" یہ کہہ کر جیسے اس پر غشی طاری ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سر دیوار سے ٹکا لیا۔ وہ بے سدھ پڑی ہولے ہولے سانسیں لے رہی تھی۔

کوٹھری میں گہری خاموشی چھا گئی۔ فضا میں خون کی بو بسی ہوئی تھی۔

لالی جلد ہی اس خاموشی سے اکتا گیا۔ "اب تیں نوں کیہ کرنا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" شاداں آنکھیں کھول کر رسان سے بولی۔ اس کی آواز اس قدر مبہم تھی' جیسے گھڑے کی اندر منہ ڈال کر بول رہی ہو۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"بتا، کیا کروں؟"

لالی نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ شاداں کی بڑی بڑی آنکھوں پر لمبی لمبی پلکوں کے سائے چھائے ہوئے تھے۔ چہرہ پچھلی رات کا چاند بن گیا تھا۔ اس وقت وہ اس شاداں سے قطعی مختلف تھی، جو کچھ دیر پہلے لالی کے سر پر خون سے لتھڑی ہوئی چھری تانے کھڑی تھی۔ جس کی آنکھوں میں شعلے دہکتے تھے، چہرے پر دہشت برستی تھی۔ لالی کو اب وہ ایسی عورت نظر آئی جو جوان تھی، سرکش تھی اور اپنی سفاکی کے باوجود قابل رحم بھی تھی۔ اسے شاداں سے لگاوٹ کی حد تک ہمدردی پیدا ہو گئی۔

"ایک بات کہوں، مان لے گی؟"

"بول۔" شاداں نے آہستہ سے کہا۔

"میرے ساتھ بھاگ چل۔"

"تیرے ساتھ بھاگ چلوں؟" شاداں نے غصے سے اسے گھورا۔ "صورت دیکھی ہے اپنی۔ آخ تھو۔" اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

لالی کھسیانا ہو کر بولا۔ "اتنا برا کیوں مانتی ہے؟ میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا تھا۔"

وہ اسے قہر آلود نظروں سے گھورتی رہی، پھر تیوری پر بل ڈال کر بولی "وے دلّے، توں نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ میں کوئی کنجری ہوں؟" اس نے چھری لالی کے سامنے کر دی۔ "یہ چھری دیکھی ہے؟"

مگر لالی اس کی دھمکی سے مرعوب نہیں ہوا۔ "زیادہ اکڑ نہ دکھا۔ یوں بیٹھی رہے گی تو سیدھی جیل جائے گی۔"

وہ اسی طرح تیکھے لہجے میں بولی۔ "جیل چلی جاؤں گی پر تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

"نہ جا، ہرگز نہ جا۔ بھول جا یہ بات۔ اپنے یار بالے کو بھی بھول جا۔ آگے کی سوچ۔"

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔ توں جا یہاں سے۔"

لالی ڈھٹائی سے بولا۔ "میں تو نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں جائے گا؟" وہ چھری تان کر غصے سے لالی پر جھپٹی۔ "آنکھیں نکال لوں گی تیری۔" لالی نے جھٹ اس کی کلائی زور سے دبوچ لی۔ وہ بلبلا کر بولی۔ "کنجر! میرا ہتھ چھوڑ۔"

لالی نے چھری چھین لی، اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "بول اب کیا کہتی ہے؟" شاداں نے کوئی جواب



میں دیا۔ وہ اپنی ہزیمت پر غصے سے ہانپنے لگی۔

"دل سے میل نکال دے۔ میں اتنا برا بندہ نہیں ہوں جتنا تو سمجھ رہی ہے۔" لالی نے توقف کیا۔ "جو ہونا تھا، ہو گیا، آگے کی سوچ، آگے کی۔"

"میں نے ٹھیک نہیں کیا۔" وہ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ "مُنج بیچ دیتی تو کیا ہو جاتا؟"

"تو خود کو بھی بیچ دیتی، تب بھی وہ تیرا نہ بنتا۔"

"سچ کہہ رہا ہے۔ پر میں اب کیا کروں۔ مجھے اب کچھ بھی چنگا نہیں لگتا۔ سب کچھ مک گیا۔ سارا کھیل ختم ہو گیا۔"

لالی نے اس کی دکھتی رگ چھیڑی۔ "تجھے اپنے بچے یاد نہیں آتے؟"

"آتے ہیں، بہت یاد آتے ہیں۔" مامتا کا جذبہ جاگ اٹھا۔ وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اب تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئے۔ جو نصیب میں لکھا ہے، پورا ہو گا۔"

"نصیب کو چھوڑ۔ ہوش سے کام لے۔"

وہ بے بسی سے بولی۔ "کچھ سمجھ نہیں آتی، کیا کروں؟"

"میرا کہا مان۔" لالی نے بالے کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "زمین کھود کر اسے میں دبا دے۔" لالی نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ دور سے اذان بلند ہوئی۔ لالی گھبرا کر بڑبڑایا۔ "صبح ہو گئی۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

شاداں نے ٹوکا۔ "کہاں جائے گا؟ یہیں ٹھہر جا۔ میں اکیلے زمین کیسے کھودوں گی۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ رحیم داد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ چند لمحے خاموش کھڑا رہا، پھر وہ دروازے کی جانب لپکا۔ شاداں نے پوچھا۔ "نہیں رکے گا؟ اب تو اجالا ہو گیا۔" اس نے کوٹھری کے روشن دان سے پھوٹتی ہوئی ہلکی ہلکی روشنی کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ "رات کو اندھیرے میں چلا جانا۔" اس کے انداز میں دبی دبی عاجزی تھی۔

"تو کہتی ہے تو نہیں جاؤں گا۔ باہر میرا ساتھی بیٹھا ہے۔ اسے لے کر آتا ہوں۔"

لالی باہر چلا گیا۔ کمرے سے گزر کر آنگن میں پہنچا۔ اس نے دیکھا، رحیم داد دروازے کے برابر دیوار سے پیٹھ ٹکائے گہری نیند سو رہا ہے۔ لالی نے قریب پہنچ کر اسے جھنجوڑا۔ رحیم داد نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ کھسیانا ہو کر بولا۔ "یار! اونگھ آ گئی تھی۔ توں نے دیر بھی تو کتنی لگا دی۔" اس نے صبح کی ہلکی ہلکی روشنی دیکھی تو ایک دم گھبرا گیا۔

"صبح ہو گئی۔ اب کیا ہو گا؟"

"ٹھیک ہی ہوگا۔ ہم نے اب کہیں نہیں جانا۔ یہیں ٹھہریں گے۔"

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر لالی کو دیکھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

لالی نے ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔ "میرے ساتھ آ۔"

دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کوٹھری کے دروازے پر پہنچے۔ شاداں ابھی تک اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ لاش کے چہرے سے اس نے چادر اٹھا دی تھی اور کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

رحیم داد نے لاش دیکھی اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھیں تو سراسیمہ ہو کر دروازے پر ٹھہر گیا۔ حیران و پریشان ہو کر بولا۔ "یار! یہ کیا چکر ہے؟"

لالی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑھ کر چادر اور سرکا دی۔ رحیم داد نے دھندلی روشنی میں لاش کا کٹا ہوا گلا دیکھا تو خوف سے آنکھیں اور پھٹ گئیں۔ لالی نے لاش کا چہرہ چادر سے ڈھکتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ "دیکھ لیا تو نے؟ یہ چکر ہے۔" رحیم داد کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ دم بخود کھڑا رہا۔ لالی نے شاداں کی طرف نظریں اٹھائیں۔

"کھڑی ہو۔ بہت ہو چکا سیاپا۔"

مگر شاداں وہیں بیٹھی رہی۔ "مجھے یہیں بیٹھا رہنے دے۔ تو باہر جا۔" اس نے لاش کے چہرے سے پھر چادر ہٹا دی۔ رحیم داد اس کی ڈراؤنی آنکھیں نہ دیکھ سکا۔ پریشان ہو کر کوٹھری سے باہر چلا گیا۔

لیکن لالی اپنی جگہ کھڑا رہا۔ شاداں بڑبڑانے لگی۔ "وہی آنکھیں، وہی چمکتا متھا، وہی چھلے دار بال۔" وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھا کرنے لگی اور لالی کی جانب دیکھے بغیر بولی۔ "لگتا ہے ابھی ابھی سویا ہے۔" وہ جھکی ہوئی اس کا چہرہ تکتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور بالے کے بے جان چہرے پر بکھرنے لگے۔ وہ بے قرار ہو کر اس کا ماتھا، اس کے ہونٹ چومنے لگی۔ اس نے سینے پر دوہتڑ مارا اور دل دوز آہ بھر کر زور سے چیخی۔ "ہائے ربا! میں مرگئی۔" وہ لاش کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کوٹھری کی دھندلی روشنی میں گھٹی گھٹی سسکیاں ابھرنے لگیں۔

یکایک چراغ زور سے بھڑکا۔ کوٹھری کی دیواروں پر پرچھائیاں لہرائیں اور چراغ بجھ گیا۔ اندھیرا ہوتے ہی لالی اس طرح چونکا گویا سوتے سوتے آنکھ کھل گئی ہو۔ اس نے بوجھل آواز سے شاداں کو مخاطب کیا۔ "شاداں! اب اٹھ جا۔ بہت کر چکی پٹنی۔ وقت کم ہے، ابھی بہت کام کرنا ہے۔"



شاداں پھر بھی نہ اٹھی۔ سسکیاں بھرتی رہی۔ لالی نے ڈپٹ کر کہا۔ "اٹھتی ہے کہ نہیں۔" شاداں چپ چاپ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لالی نے جھک کر بالے کے مردہ چہرے پر چادر ڈال دی۔ دونوں کوٹھری سے باہر آ گئے۔

رحیم داد کمرے میں گم صم کھڑا تھا۔ اس نے دونوں کو دیکھا مگر کوئی بات نہیں کی۔ لالی نے کوٹھری کا دروازہ بند کیا، کنڈی لگائی۔ شاداں کمرے کے ایک گوشے میں دیوار سے پیٹھ ٹکا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں اور کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ راکھ بن گیا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں اور ابھی تک سرخ تھیں۔ لالی نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ کمرے سے نکل کر باہر آنگن میں گیا اور بیرونی دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ اب ہر سو صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ گھروں سے ملی جلی آوازوں کا شور آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ رات بھر کا سویا ہوا گاؤں بیدار ہو رہا تھا۔

لالی کمرے میں واپس آیا۔ رحیم داد خاموش کھڑا تھا اور شاداں اسی طرح کھوئی کھوئی بیٹھی تھی۔ اس نے لالی کی جانب نظر نہ اٹھائی۔ مگر لالی خاموش نہ رہا۔ اس نے شاداں کو مخاطب کیا۔

"یہ کپڑے تو بدل۔ جانفٹ نہا لے۔"

لیکن شاداں اٹھنے پر آمادہ نہیں ہوئی۔ بیزاری سے بولی۔ "میں نوں کہیں نہیں جانا۔ یہیں بیٹھا رہنے دے۔ بہت تھک گئی ہوں۔"

"کیا چاہتی ہے؟ اگر تجھے جیل ہی جانا ہے تو مجھے کیوں روکا؟" شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی نے ڈپٹ کر کہا۔ "بولتی کیوں نہیں؟"

شاداں نے گردن اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ "کیا بولوں؟"

"جو کہہ رہا ہوں، وہ کر۔ کپڑے بدل لے۔ مُ کو پٹھا دتھا دے۔ ہمیں بھی روٹی کھلا۔ سخت بھوک لگی ہے۔ پہلے پانی پلا۔"

شاداں نے اس کی ساری باتیں خاموشی سے سنیں۔ اٹھی، باہر گئی اور کٹورے میں پانی بھر کر لائی۔ لالی نے کٹورا لیا اور غٹا غٹ پانی پینے لگا۔ شاداں نے صندوق سے کپڑے نکالے اور بغل میں دبا کر کمرے سے چلی گئی۔ رحیم داد کھسک کر لالی کے قریب پہنچا اور آہستہ سے پوچھا۔ "یار! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" وہ سخت پریشان تھا۔

"وہی جو دیکھ رہا ہے۔"

رحیم داد بے زاری سے بولا۔ "مخول نہ کر۔ صاف صاف بتا، معاملہ کیا ہے؟ کچھ سمجھ نہیں

آتی۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کو رکا اور کوٹھری کے دروازے کی جانب اشارہ کر کے بولا۔

"اسے تو نے قتل کیا ہے؟"

"گھاس تو نہیں کھا گیا؟ میں کیوں قتل کرنے لگا۔ خون کس کے ہاتھ اور کپڑوں پر لگا ہے؟ تجھے اتنا بھی دکھائی نہیں دیتا؟"

"تیرا مطلب ہے' اس زنانی نے کیا ہے؟" اس نے گردن موڑ کر باہر آنگن کی جانب دیکھا۔ شاداں وہاں نہیں تھی۔ رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔

"یہ تو بہت ظالم ہے۔"

"وہ اس سے بھی زیادہ ظالم تھا۔"

"ہوگا' مجھے تو یہ بہت خطرناک لگتی ہے۔ آنکھیں دیکھیں ہیں' کیسی لال لال انگارا ہیں۔"

"ڈر مت۔ ابھی اس کے سر پر خون سوار ہے۔ نہالے گی تو اتر جائے گا۔"

"گھر والا تھا اس کا؟"

"نہیں' اس کا یار تھا۔" لالی نے تفصیل سے ایک ایک بات رحیم داد کو بتا دی۔

وہ سب کچھ سن چکا تو پریشان ہو کر گویا ہوا۔ "یہ بتا' اب کرنا کیا ہے؟"

"زمین کھود کر لاش دبانی ہے۔"

رحیم داد سہا ہوا تھا۔ "یار! کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ شاداں مجھے ٹھیک نہیں لگتی۔"

"تو اسے نہیں جانتا۔ وہ ایسی ویسی زنانی نہیں ہے اور اگر بری ہے بھی تو اپنا کیا لے گی۔ اب تو اس کی ٹانگ بھی ہمارے ہی ساتھ بندھی ہے۔ چند روز یہاں چھپے رہیں گے۔ فیر آگے جانے کا پروگرام بنائیں گے۔ اس غار سے تو چنگی ہی جگہ ہے۔ روٹی بھی کھانے کو مل جائے گی اور کپڑے لتے بھی آرام سے مل جائیں گے۔"

دونوں چارپائی پر بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کرنے لگے۔

شاداں کمرے میں واپس آگئی۔ وہ ابھی ابھی نہا کر آئی تھی۔ اس کے گیلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر تازگی تھی۔ اجلے لباس میں وہ رات والی شاداں سے مختلف لگ رہی تھی۔ نہ آنکھوں میں خون خوار چمک تھی نہ چہرے پر وحشت۔ اس کے ایک ہاتھ میں خون آلود کپڑے دبے تھے۔ لالی نے کپڑے اس سے لیے اور کوٹھری کی کنڈی کھول کر سارے کپڑے اندر ڈال دیئے۔ جب وہ کوٹھری کا دروازہ بند کر کے دوبارہ کنڈی لگا رہا تھا تو شاداں نے پوچھا۔



"میرے کپڑے لتے وہاں کیوں ڈال دیئے؟"

"لاش کے ساتھ ہی انھیں بھی دبا دوں گا۔ چھری بھی رکھ دوں گا۔"

شاداں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟" پھر ذرا توقف سے بولی۔ "چھری تو دے دے۔ مجھے اس ضرورت ہوگی۔"

لالی بے پروائی سے بولا۔ "دوسری لے آنا۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں' کرنے دے۔ بیچ میں اپنی ل نہ اڑا۔"

شاداں نے خاموشی سے اس کی بات مان لی۔ "جیسی تیری مرضی" وہ دروازے کی جانب مڑی۔ یں تم دونوں کے لیے روٹی ٹکر لے آؤں۔"

لالی نے پوچھا۔ "تیں نوں کہیں دودھ تو نہیں پہنچانا؟"

"دودھی کو پہنچانا تو ہے۔ بعد میں پہنچا دوں گی۔ فکر نہ کر۔"

"نہیں' پہلے دودھ پہنچا دے۔ ہر کام ویسے ہی کر جیسے روز کرتی ہے۔ ہماری پروا نہ کر۔ ہم بعد ں بھی روٹی کھا لیں گے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کے لیے رکا۔ "گھر میں کوئی کدال گی؟"

"کدال تو ہے۔"

"بیلچا بھی ہوگا؟"

"نہیں' بیلچا نہیں ہے۔ پڑوس سے لے آؤں گی۔ ابھی لائی۔" شاداں دروازے کی جانب ھی۔

لالی نے فوراً ٹوکا۔ "ٹھیر جا شاداں! رہنے دے' بیلچے کے بغیر ہی کام چل جائے گا۔"

"پر اس میں ہرج کیا ہے!"

"بہت ہرج ہے۔ تو یہ باتیں نہیں سمجھتی۔ جیسا کہتا ہوں' ویسا کر۔ میرا کام مجھ پر چھوڑ دے۔ ں اپنا کام کر۔ منہ کیا تک رہی ہے میرا؟ جا کدال اور ایک ٹوکری لے آ۔"

شاداں باہر چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد کدال اور ٹوکری لے کر واپس آگئی۔ لالی نے کدال اور کری سنبھال کر رحیم داد سے کہا۔ "آ یار! تھوڑی سی کھدائی کر لیں۔ فیر اطمینان سے روٹی کھائیں گے۔"

"پہلے کچھ کھا پی تو لے۔" شاداں نے اصرار کیا۔

"کھا لیں گے' تو پہلے اپنا روز کا کام نمٹا لے۔ اور ہاں باہر جانا تو دروازے میں تالا ضرور ڈال

دینا۔" لالی نے چھت سے لٹکی ہوئی لالٹین اتاری، جو ابھی تک روشن تھی۔ اس نے لالٹین ہاتھ میں سنبھالی اور رحیم داد کے ہم راہ کوٹھری میں چلا گیا۔

اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ لالٹین کی بتی اونچی کر دی۔ روشنی بڑھی اور پھیلی تو فرش پر چادر سے ڈھکی ہوئی لاش نظر آئی۔ رحیم داد خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ مگر لالی نے لاش کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔ اطمینان سے کدال اٹھا کر آہستہ آہستہ زمین کھودنے لگا۔ رحیم داد ٹوکری میں مٹی بھر کر ایک طرف ڈالنے لگا۔

زمین توقع کے خلاف اندر سے سخت نکلی۔ ایک بار لالی نے کدال چلائی تو زور سے ٹن کی آواز آئی۔ لالی نے ہاتھ روک لیا۔ جھک کر دیکھا تو ایک بھاری پتھر اڑا تھا۔ اسے نکالنے میں لالی اور رحیم داد پسینے پسینے ہو گئے۔ ذرا دم لینے کو رکے تھے کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ساتھ ہی شاداں کی آواز ابھری۔

"دروازہ کھول۔ میں ہوں شاداں۔"

لالی نے دروازہ کھول دیا۔ رحیم داد کے ہم راہ باہر آگیا۔ دونوں بہت تھکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

شاداں نے آہستہ سے پوچھا۔ "ہو گیا کام؟"

لالی منہ بگاڑ کر بولا۔ "اتنی جلدی کیسے ہو جائے گا کام۔ کیا تو نے ہمیں گورکن سمجھ رکھا ہے؟"

"منہ ہاتھ دھو لو۔ میں ابھی تمہارے لیے روٹی لاتی ہوں۔"

دونوں باہر آنگن میں گئے اور کنوئیں سے پانی نکال کر منہ ہاتھ دھونے لگے۔ اب ہر طرف زرد زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ گلی میں بچے شور مچا رہے تھے۔ کہیں قریب دو عورتیں چیخ چیخ کر لڑ رہی تھیں۔

رحیم داد نے یہ آوازیں سن کر بیرونی دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازہ بند تھا اور زنجیر چڑھی ہوئی تھی۔ دونوں آنگن میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ کمرے کے اندر آ کر چٹائی پر بیٹھ گئے۔

انھیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شاداں ناشتا لے کر آگئی۔ ناشتے میں روٹی تھی، ساگ تھا۔ مٹی کی ٹھوٹھی میں تازہ تازہ مکھن تھا اور دو گلاسوں میں لسی تھی۔ دونوں کو سخت بھوک لگی تھی۔ وہ کھانے پر پل پڑے۔ شاداں ان کے قریب ہی بیٹھ گئی اور اصرار کر کے کھانا کھلانے لگی۔ بار بار مکھن نکال کر روٹی پر ڈال دیتی۔ اپنی بھینس کی اور اس کے دودھ کی تعریف کرتی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بال سنوار لیے تھے۔ اس کے چہرے پر ہلکا ہلکا دکھ کا سایہ تھا۔ آنکھوں میں جلتے بجھتے



اغ روشن تھے۔ اس کے جسم سے پسینے کی ہلکی ہلکی مہک اٹھ رہی تھی۔ وہ لالی کے بالکل قریب ی تھی۔ اتنے قریب کہ لالی اس کے جسم کی مہک محسوس کر سکتا تھا۔ لالی کو اس کا اس طرح منے بیٹھ کر چاؤ سے کھانا کھلانا بہت اچھا لگا۔ وہ کچھ زیادہ ہی کھا گیا۔

اس نے لسی کا پورا گلاس چڑھایا اور زور سے ڈکار لی۔ "مزا آگیا۔" اس نے مڑ کر شاداں کو کھا۔ وہ بڑی طرح دار عورت تھی۔ اس کے چہرے پر ڈھلتی دھوپ کی جگمگاہٹ تھی۔ شاداں نے ردن کو خم دے کر دروازے کی جانب دیکھا۔ لالی کو شاداں کا یہ انداز بھا گیا۔ مسکرا کر اس سے طب ہوا۔ "شاداں! تو بہت زور آور ہے۔ سوہنی بھی ہے۔ کیا بات ہے تیری۔" وہ اپنی بات کہتے تے رکا۔ "سچ جان۔ بالا تجھے پہچان نہیں سکا۔ بچ اور گھٹیا تھا۔"

شاداں نے جھٹ لالی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسی بات مت کر۔" اس کا ہاتھ کھردرا اور ت تھا، لہجہ بھی کھردرا تھا۔

"توں میرے سامنے ایسی گل نہیں کہہ سکتا۔"

"وہ تجھے بھی مُ سمجھتا تھا۔ دودھ دینے والی مُ۔ بوڑھی ہو جائے تو کسائی کے کھونٹے سے باندھ ۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

شاداں کو اس کی بات پسند نہیں آئی۔ تلملا کر چیخی۔ "یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ توں کون تا ہے بولنے والا؟ تھانے دار ہے؟"

لالی کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ انگلی سے سر کھجاتے ہوئے نرمی سے گویا ہوا۔ "یہ بتا....."

شاداں بات کاٹ کر بے زاری سے بولی۔ "مجھ سے کچھ نہ پوچھ۔" وہ ابھی تک ناراض تھی۔ نے کوئی بات نہیں کی۔ چپ بیٹھا رہا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔

رحیم داد خاموشی سے اکتا کر بولا۔ "مجھے تو اونگھ آ رہی ہے۔ لالی! تیرا کیا ارادہ ہے؟"

لالی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شاداں بول پڑی۔ "سو جاؤ کچھ دیر۔ رات بھر کے جاگے ہوئے ۔"

شاداں کے لہجے میں پہلے جیسی تلخی نہیں تھی۔ لالی نے اس کا بدلا ہوا انداز دیکھا تو اسے مخاطب با۔ "تجھے بھی تو نیند آ رہی ہو گی۔ تو سوئی کب۔"

"میری فکر نہ کر۔ میری آنکھوں میں بالکل نیند نہیں۔ دودھی کو دودھ پہنچانا ہے۔ ملک کی حویلی کام کرنے جانا ہے۔ اور بھی بہت کام دھندا کرنا ہے۔" وہ کھڑی ہو گئی۔ "دروازہ اندر سے بند کر ا۔ ویسے جب میں باہر جاؤں گی تو تالا ڈال جاؤں گی۔" شاداں کمرے سے باہر چلی گئی۔

رحیم داد نے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔ دونوں وہیں چٹائی پر ٹانگیں پسار کے لیٹ گئے۔ رحیم داد کچھ دیر جاگتا رہا اور بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ لالی لیٹتے ہی سو گیا۔ کچھ دیر بعد رحیم داد کو بھی نیند آ گئی۔

دونوں تھکے ہوئے اور رات بھر کے جاگے ہوئے تھے' بے خبر ہو کر سو گئے۔ انھیں کچھ بھی خبر نہ ہوئی کہ شاداں کب گھر سے باہر گئی۔

☆

کمرے میں ہلکا' ہلکا اندھیرا چھایا تھا۔ باہر آنگن میں گہری خاموشی تھی۔ شاداں ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ دونوں اٹھ کر کوٹھری میں چلے گئے۔ دن کی دھندلی دھندلی روشنی میں کھدائی کرتے رہے۔ جب اندھیرا بڑھ گیا تو لالی نے لالٹین روشن کر لی۔ کھدائی مشکل تھی۔ بار بار کدال پتھروں سے ٹکرا کر پلٹ جاتی۔ مگر انھوں نے ہاتھ نہیں روکا۔ لالی تھک جاتا تو رحیم داد کدال سنبھال لیتا۔ دونوں باری باری ڈیوٹی بدلتے رہے۔

بہت دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ لالی نے دروازہ کھولا۔ سامنے شاداں کھڑی تھی۔ لالی اور رحیم داد کوٹھری سے نکل کر کمرے میں آ گئے۔ انھوں نے دیکھا' باہر آنگن میں اندھیرا پھیلا ہے۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ گاؤں پر بھی سناٹا چھا گیا تھا۔ شاداں نے آہستہ سے پوچھا۔

"کتنا کام رہ گیا ہے؟"

"ابھی بہت کام ہے۔ میں زمین زیادہ گہری کھودنا چاہتا ہوں۔"

"روٹی کھا لے۔"

لالی آمادہ نہ ہوا۔ "ابھی نہیں' کام ختم کرنے کے بعد۔" رحیم داد نے بھی لالی سے اتفاق کیا۔ دونوں جلد سے جلد کام نمٹا دینا چاہتے تھے۔

شاداں نے جھک کر سرگوشی کی۔ "کدال آہستہ چلا۔ آواز سنائی پڑتی ہے۔"

لالی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "ڈھول بجانا شروع کر دے۔"

"مسکری نہ کر۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"تجھے ڈر بھی لگتا ہے؟"

شاداں جھینپ کر رہ گئی۔ لالی نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ وہ رحیم داد کے ہم راہ کوٹھری میں چلا گیا۔ کھدائی شروع ہو گئی۔ اس دفعہ دونوں سنبھال سنبھال کر کدال چلا رہے تھے تاکہ آواز پیدا نہ ہو۔ مگر اس طرح کھدائی کی رفتار سست پڑ گئی۔ آدھی رات سے کچھ پہلے انھوں نے خوب گہری' قبر



ھودلی۔ دونوں نے لاش اٹھائی اور نیچے اتارنے لگے۔

اسی وقت شاداں دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ اس نے آتے ہی لاش کے چہرے سے چادر اٹھا ی اور گہری نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ بالے کا بے جان چہرہ مٹیالا پڑ چکا تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی یں اور پہلے سے زیادہ ہی بے نور ہو گئی تھیں۔ لاش سے ہلکی ہلکی بدبو اٹھ رہی تھی۔ لالی نے اداں کو زیادہ دیر وہاں ٹھہرنے نہیں دیا۔ اس بار شاداں نے اپنے سینے پر نہ دوہتڑ مارا' نہ چیخی' نہ وئی چپ چاپ باہر چلی گئی۔

لالی اور رحیم داد نے اس کے جاتے ہی لاش بستر میں لپیٹ کر نیچے لڑھکا دی۔ شاداں کے خون لود کپڑے اور چھری بھی ڈال دی اور جلدی جلدی پتھر اور مٹی ڈال کر گڑھا بھرنے لگے۔ گڑھا رنے کے بعد جو مٹی بچ گئی' وہ انھوں نے کوٹھری میں پھیلا کر برابر کر دی۔ رحیم داد بالٹی میں پانی لے آیا۔

لالی نے کوٹھری کے فرش پر پانی چھڑک دیا۔ جب ہر کام لالی کی مرضی کے مطابق ہو گیا تو وہ وٹھری کا دروازہ بند کر کے رحیم داد کی ساتھ باہر آ گیا۔

شاداں دالان میں چپ بیٹھی تھی۔ لالی نے آتے ہی کہا۔ "فٹافٹ روٹی لا۔ بہت بھوک لگی ہے۔"

شاداں خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ جب وہ جانے لگی تو لالی نے ٹوکا۔ "کل کوٹھری میں لڑیاں یا بھوسا بھر دینا اور اس میں تالا لگا دینا۔ تجھ سے یہ کام نہ ہو تو ہم دونوں کر دیں گے۔ فکر نہ ر۔ سب کام ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔"

شاداں کھوئی کھوئی کھڑی رہی پھر خاموشی سے چلی گئی۔

☆

موسم اچانک بدل گیا۔ رات کسی قدر گرم تھی۔ ہوا بھی بند تھی۔ فضا غبار آلود تھی۔ شاداں نے اصرار بھی کیا مگر رحیم داد اور لالی چارپائی پر نہ لیٹے۔ چارپائی دالان میں پڑی تھی۔ شاداں نے لا ڈال دی تھی۔

دونوں اس پر نہ لیٹے تو شاداں خود لیٹ گئی۔ لالی اور رحیم داد جلدی سو گئے۔ صبح بہت تڑکے اداں نے دونوں کو بیدار کیا۔ مگر دونوں پر نیند کا غلبہ تھا۔ وہ دالان سے اٹھ کر کمرے میں جا کر سو ئے اور دیر تک بے خبر سوتے رہے۔

...ھ' شاداں نے آ کر پھر انھیں جگایا۔ لالی کو اشارے سے دالان میں بلایا۔ وہ گھبرائی ہوئی

نظر آ رہی تھی۔ "یہ جو تیرا ساتھی رحیمے ہے' جیل سے بھاگا ہوا کیدی تو نہیں ہے؟"

لالی انکار نہ کر سکا۔ "ہے تو۔ توں نے اس کی جیل کی وردی نہیں دیکھی؟"

"اور تو بھی جیل سے بھاگا ہے؟"

لالی کو تشویش ہوئی۔ "تجھے کیسے پتہ چلا؟"

"میں ملک کی حویلی میں گئی تھی۔"

لالی نے اسے اپنی بات مکمل نہ کرنے دی۔ بیچ میں بول پڑا۔ "یہ ملک کون ہے؟"

"پنڈ کا لمبردار ہے۔ اس کا نام ملک اللہ نواز ہے۔ ملک کی حویلی میں تھانیدار بیٹھا تھا۔"

لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "تھانیدار اس کی حویلی میں کس لیے آیا تھا؟"

"جب سے ادھر تھانیدار لگا ہے' روز ہی ملک کے پاس آتا ہے۔ وہ ملک کا بھائی جو ہے۔"

شاداں نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ "تھانیدار کہتا تھا۔ دو کیدی جیل سے بھاگ گئے۔ ابھی تک پکڑے نہیں گئے۔ پولیس ان کی کھوج میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔" شاداں نے لالی کے چہرے کی جانب دیکھا جس پر پریشانی چھا رہی تھی۔ "اس کی گلاں سن کر میرا متھا ٹھنکا۔ مجھے جھٹ تم دونوں کی یاد آئی۔ رحیمے پر تو مجھے پہلے ہی کچھ شبہ ہوا تھا۔"

"تجھ سے تو تھانیدار نے کچھ نہیں پوچھا۔"

"مجھ سے کیوں پوچھتا؟ پر یہ ضرور کہتا تھا' ہر تھانے میں تم دونوں کی تصویریں لگا دی گئی ہیں۔ پورے دو ہزار پکڑوانے والے کو انعام ملے گا۔"

"پہلے روٹی ٹکر دے' فیر گل بات ہو گی۔"

لالی کمرے میں آ گیا۔ اس نے رحیم داد کو ہر بات بتا دی۔ تھوڑی دیر بعد شاداں لسی لے آئی۔ لسی کے ساتھ رات کی باسی روٹی بھی تھی۔ شاداں اس وقت بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ لالی نے لسی پیتے پیتے پوچھا۔

"بالے کے کپڑے لتے تو تیرے پاس ہوں گے؟"

"ایک ایک لتا لے گیا تھا۔ وہ اپنی ہر چیز لے گیا۔ اس کنجری کے لیے میرے راکھواں کپڑے لتے تک چرا لے گیا۔ جادو کر دیا تھا اس پر۔ میلے سے ڈھیروں چیزیں میرے لیے لاتا تھا' پر یہ بہت پہلے کی گل ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ بات کرتے کرتے یادوں کے سہارے بہت دور چلی گئی۔

"چھوڑ یہ باتیں۔ کام کی بات سن۔ تجھے رحیمے کے لیے کمیس اور دھوتی لانی ہے۔ جوتا بھی لانا



ہو گا۔ جوتا تو مجھے بھی چاہئے۔ یہ سب کچھ آج ہی کرنا ہو گا۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا بالے کے لیے چاہئے ہے۔"

لالی نے اپنی ڈاڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "اس پنڈ میں داڑھی مونڈنے کے لیے بلیڈ شلیڈ بھی مل جائے گا؟ یہ تو بہت وڈا پنڈ ہے۔ موضع لگتا ہے۔ یہاں تو سب کچھ ملتا ہو گا۔"

"پنڈ میں نائی بھی ہے۔ اسے بلا لاؤں؟" شاداں نے نہایت سادگی سے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "نہیں' نائی کا یہاں آنا ٹھیک نہیں۔ میں نے تمہارے بارے میں کسی کو بتایا بھی نہیں۔"

رحیم داد نے تاکید کی۔ "بتانا بھی نہیں۔ کوئی پوچھے تب بھی نہ بتانا۔"

شاداں ہاتھ ہلا کر بولی۔ "فکر نہ کر' کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

لالی نے اسے ٹوکا۔ "جو کام میں نے بتایا ہے' فٹافٹ کرنا ہے۔ اب تو جا۔"

اس کے جانے کے بعد دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے' آخر کمرے کا دروازہ بند کر کے فرش پر لیٹے اور سو گئے۔ دن ڈھلے شاداں واپس آئی۔ اس نے آتے ہی لالی اور رحیم داد کو اپنی کارگزاری سنائی۔ قمیص کا کپڑا خرید کر اس نے گاؤں کے درزی کو سلنے کے لیے دے دیا تھا اور اس سے دوسرے روز سہ پہر تک قمیص تیار رلینے کا وعدہ بھی لے لیا۔ جوتوں کے بارے میں اس نے بتایا کہ بدھ کو بازار میں ملیں گے۔ بازار لگنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ دھوتی کے بارے میں اس نے بتایا کہ اسے بھی بازار سے خرید لے گی۔ البتہ وہ گاؤں کی دکان سے ایک عدد بلیڈ خرید لائی تھی۔

لالی اس کی کارگزاری سن کر بہت خوش ہوا۔ جیب سے نوٹ نکال کر بولا۔ "میں نے پیسے تو تجھے دیئے ہی نہیں تھے۔ بھول گیا تھا۔ بول کتنے دے دوں؟"

وہ منہ بگاڑ کر بولی۔ "رہنے دے اپنے روپے۔ رکھ لے' آگے کام آئیں گے۔ میں ملک کی گھر والی سے کچھ روپے لے آئی تھی۔ کام چل جائے گا' فکر نہ کر۔"

شاداں زیادہ دیر ان کے پاس نہ ٹھہری۔

ابھی اسے گھر کا بہت کام کاج کرنا تھا۔ وہ بڑی جفاکش اور محنتی عورت تھی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی۔ کہیں ٹک کر نہ بیٹھتی۔ کبھی یہاں' کبھی وہاں' کبھی ادھر' کبھی ادھر' کسی لمحے قرار نہ تھا۔ جاتے ہی وہ بھینس کے لیے چارہ کاٹنے بیٹھ گئی۔

بلیڈ ہاتھ آیا تو لالی کو ڈاڑھی کے بال صاف کرنے کی سوجھی۔ رحیم داد کو ایسا شوق نہیں چرآیا۔ ویسے اس کی ڈاڑھی کے بال اتنے بڑھ گئے تھے کہ بلیڈ سے مونڈنا آسان نہیں تھا۔ مگر اس نے کپڑے دھونے کا صابن اور پانی ملا کر لالی کی ڈاڑھی کے بال کسی نہ کسی طور صاف کر دیئے۔

ڈاڑھی ٹھیک سے نہیں منڈی تھی۔ چہرے پر کئی جگہ بلیڈ کے چر کے بھی لگ گئے تھے' مگر لالی خوش تھا۔ آئینہ ہاتھ میں لے کر بار بار اپنی صورت دیکھتا تھا۔

شام ہوتے ہی دونوں لالٹین لے کر کوٹھری میں گھس گئے۔ مٹی خشک ہو کر جم گئی تھی۔ انھوں نے معائنہ کرنے کے بعد لکڑیاں اور دوسرا کاٹھ کباڑ کوٹھری میں بھر دیا۔ دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ شاداں کوٹھری خالی رکھنا چاہتی تھی۔ مگر لالی نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ جو مرضی میں آیا وہی کیا۔

رات کو کھانا کھاتے ہوئے لالی نے شاداں کے سامنے بالے کا پھر ذکر چھیڑ دیا۔ اس مرتبہ بھی اس نے بالے کو اچھے الفاظ سے یاد نہیں کیا۔ شاداں ایک دم بھڑک اٹھی۔

"توں چاہتا کیا ہے؟"

لالی نے اپنے صفاچٹ رخساروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں توں اسے بھول جا۔ اس سے نفرت کرنے لگے۔"

شاداں جل کر بولی۔ "اور تیرے ساتھ بھاگ جاؤں؟" اس نے حقارت سے اپنا منہ بگاڑا۔ "توں سمجھتا کیا ہے داڑھی منڈوا کر تو گبھرو بن گیا۔ جا' باہر چاندنی میں پیشاپ کر کے اپنی شکل دیکھ لے۔"

وہ اس کی بات کی تلخی نظرانداز کر گیا۔ "میرا کہا مان' اپنے بال بچوں کے پاس چلی جا۔ بہت یاری آشنائی کر لی۔"

"میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ بیزاری سے بولی۔

لالی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا ہوا۔ "تو کیسی ماں ہے' ایک میری ماں تھی۔ میرے پیؤ نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ مجھ سے ملنے راتوں کو چھپ چھپ کر آتی تھی۔ گھر کے راستوں پر دن دن بھر میرا انتظار کرتی تھی۔ کئی بار میرے پیؤ نے اسے بالوں سے پکڑ کر مارا پر وہ باز نہ آئی۔ ایک بار اس کے سر پر ایسا گھما کر سوٹا مارا' وہیں ڈھیر ہو گئی۔ سانس بھی نہ لی۔ پیؤ کو لمبی جیل ہوئی۔ جانے زندہ ہے کہ مر گیا۔" لالی آہستہ آہستہ یادوں کے چراغ جلاتا رہا۔ اس نے گہری سانس بھر کر کہا۔

"مگر وہ ماں تھی۔"

شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی بھی نہ بولا۔ رحیم داد بھی خاموش تھا۔ تینوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ آنگن میں چاندنی اتر آئی تھی۔ اس کی رنگت کفن کی طرح سفید تھی۔ رات



نڈھال کھڑی تھی۔

تینوں اپنے اپنے دکھوں کی پگڈنڈیوں پر بھٹک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد شاداں اٹھی اور خاموشی سے بستر پر جا کر سو گئی۔

لالی اور رحیم داد بھی اپنی اپنی جگہ سو گئے۔

نہ جانے رات کتنی گزر چکی تھی۔ اچانک لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا' شاداں اس کے سرہانے بیٹھی ہے۔

لالی نے کچھ کہنا چاہا تو شاداں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور آنگن کے آخری سرے پر لے گئی۔ اجلی چاندنی میں اس کا چہرہ نکھر گیا تھا۔ آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ وہ گردن کو خم دے کر ایسے زاویئے سے کھڑی تھی کہ بھرپور عورت نظر آ رہی تھی۔ لالی چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ آہستہ سے بولی۔

"میری ایک گل مان لے گا؟"

"بول کیا کہتی ہے؟"

شاداں نے اس کا ایک ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ شاداں کا ہاتھ گرم بھی تھا اور گداز بھی۔ لالی کو اس وقت ایسا ہی محسوس ہوا۔ اس کی سانس تیز ہو گئی۔

شاداں کھسک کر لالی کے قریب آ گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بے ساختہ لالی سے چمٹ جائے گی۔ مگر شاداں نے ایسا نہیں کیا۔ جھکی اور جھک کر پیر سے جوتی نکالی۔ جوتی لالی کے ہاتھ میں دی اور تیکھے لہجے میں گویا ہوئی۔

"مجھے اس سے مار۔"

لالی گھبرا گیا۔ "کیوں؟"

"پہلے مجھے مار' فیر بتاؤں گی۔"

لالی خفا ہو کر بولا۔ "صاف صاف بتا۔"

"دھیرے بول۔"

لالی نے آہستہ سے استفسار کیا۔ "تو چاہتی کیا ہے؟"

وہ تڑپ کر بولی۔ "ہائے میں مر گئی۔ میں نے ملک سے صاف صاف بتا دیا' تم دونوں میرے گھر میں چھپے ہو۔" اس نے نظریں جھکا کر ٹھنڈی سانس بھری۔ "دو ہزار کے لالچ نے مجھے اندھا کر دیا۔

سوچا ایک جُ اور خرید لوں گی۔ میں نے ٹھیک نہیں کیا۔" یہ کہتے کہتے وہ بے قرار ہو گئی۔ "لالی مجھے مار۔ مارتا کیوں نہیں؟ میں تیرے آگے ہتھ جوڑتی ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ لالی کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر وہ اس سے صرف اتنا کہہ سکا۔

"توں نے جو کرنا تھا' کر چکی۔ اب مجھے بتا کیوں رہی ہے؟" اس نے شاداں کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "توں نے یہ نہیں سوچا' مجھے اور رحیمے کو پکڑوا کر تو بھی تو پھنس جائے گی۔ توں نے بالے کا خون جو کیا ہے۔ یہ بھول گئی؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اب آگے کی سوچ۔ ملک اپنی گھوڑی پر تھانے گیا ہے۔" شاداں نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا اور سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "پولسے آتے ہی ہوں گے۔ تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔ جہانگیرہ سے دور نکل جاؤ۔"

لالی نے خطرہ سر پر منڈلاتا محسوس کیا۔ وہ سخت پریشان ہو گیا۔ لپک کر رحیم داد کے پاس گیا۔ اسے جھنجھوڑ کر گہری نیند سے بیدار کیا۔ صورت حال سے آگاہ کیا۔

رحیم داد بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں فوراً چلنے پر کمربستہ ہو گئے۔ شاداں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلی۔ لالی کے منع کرنے کے باوجود چلی۔ تینوں گھر سے باہر نکلے۔ شاداں آگے' آگے چل رہی تھی۔ لالی چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا جا رہا تھا۔

گاؤں سنسان تھا۔ انھوں نے مشکل سے دو فرلانگ فاصلہ طے کیا ہو گا کہ رات سناٹے میں بھاری' بھاری بوٹوں کی آواز ابھری۔ لالی فوراً بھانپ گیا کہ یہ پولیس والوں کے قدموں کی آہٹ ہے۔ اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ تیزی سے آگے بڑھا اور جھپاک سے قریب کے کھیتوں میں گھس گیا۔

لالی اور رحیم داد اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے' پودوں سے الجھتے' گندم اور جو کی فصلوں کے درمیان راستہ بناتے۔ آگے اور آگے بڑھتے گئے۔



## ۳

دور سے ریل کے انجن کی چنگھاڑ سناٹے میں ابھری۔ ساتھ ہی لوہے کی پٹڑیاں کھٹ کھٹ بجنے لگیں۔ رحیم داد اور لالی سراسیمہ ہو کر ٹھہر گئے۔ پلٹ کر ادھر دیکھنے لگے جدھر سے ریل گاڑی آ رہی تھی۔ اب ریل کی پٹڑی پر کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ دونوں نشیب میں اترے اور ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ پٹڑیوں پر ریل گاڑی دوڑنے کی آواز رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔

ذرا ہی دیر بعد سرمئی دھند لکے میں انجن کی تیز روشنی ابھری۔ دیکھتے دیکھتے ریل گاڑی ان کے سامنے آ گئی۔ دونوں چپ چاپ کھڑے اسے گزرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پہلے انجن دھاڑتا ہوا گزرا' پھر ایک ڈبا' دوسرا ڈبا' تیسرا ڈبا گزرا۔ پھر فرسٹ کلاس کا ڈبا سامنے آیا۔ ایک کھڑکی کھلی۔ دو ہاتھ ایک سوٹ کیس اٹھائے باہر نکلے۔

سوٹ کیس کھڑکی سے نیچے گرا اور پٹڑی کے نشیب میں دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ریل گاڑی کھٹ کھٹ کرتی تیزی سے آگے نکل گئی۔

سب کچھ آناً "فاناً" ہوا۔ دونوں حیران و پریشان جہاں تھے' وہیں کھڑے رہے۔ سوٹ کیس چند گز کے فاصلے پر ان کے سامنے پڑا تھا۔ وہ چند لمحے تک اسے حیرت سے تکتے رہے' پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ سیاہ چمڑے کا سوٹ کیس تھا۔ رحیم داد نے بے صبری سے جھک کر اسے اٹھانا چاہا۔

لالی نے روک دیا۔ "ٹھہر جا رحیمے!"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟"

لالی نے مشتبہ نظروں سے سوٹ کیس دیکھا۔ "مجھے تو کچھ گڑ بڑ نظر آتی ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "یار! اس کے اندر کہیں کٹی پھٹی لاش نہ رکھی ہو۔"

رحیم داد نے خوف زدہ ہو کر لالی کو دیکھا اور سہمے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "دیکھنے میں بھی بھاری بھاری لگتا ہے۔"

لالی مخمصے میں پڑ گیا۔ خاموش کھڑا سوٹ کیس کو تکتا رہا۔ چند لمحے دونوں گو مگو کے عالم میں کھڑے رہے۔ آخر لالی نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا۔ سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑا' اسے اٹھایا اور آہستہ آہستہ اونچا نیچا کر کے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اندر کیا ہے۔ سوٹ کیس زیادہ بھاری نہیں تھا۔ اس کے وزن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اندر کپڑے اور دوسرا سفری سامان بھرا ہے۔

لالی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ "لے یار! بن گیا کام۔"

رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔ "کیا ہے؟"

"یہ تو کھولنے ہی پر پتہ چلے گا۔ مجھے تو کپڑے لتے معلوم ہوتے ہیں اور بھی کام کی بہت سی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ فسٹ کلاس کے ڈبے سے گرا ہے۔ سامان بھی اس میں فسٹ کلاس ہی ہو گا۔ یار! کیسا کھٹاک سے آکر گرا جیسے اپنے ہی لیے پھینکا گیا ہو۔"

"یار اسے کھول کر تو دیکھ" رحیم داد اپنی بے قراری پر زیادہ دیر قابو نہ رکھ سکا۔

"یہاں نہیں' آگے چل کے۔ اب یہاں زیادہ دیر ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔"

وہ سوٹ کیس ایک ہاتھ میں لٹکا کر چلنے لگا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ دونوں نشیب سے نکل کر اوپر آ گئے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ریل گاڑی کی پٹری دھند میں لپٹی سنسان پڑی تھی۔

دونوں آہستہ آہستہ پٹری کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ مگر وہ ادھر نہیں گئے' جدھر ریل گاڑی گئی تھی بلکہ اس طرف بڑھنے لگے جدھر سے آئی تھی۔ مشکل سے وہ پچاس ساٹھ قدم آگے گئے ہوں گے' ناگاہ درختوں تلے خشک پتوں پر آہٹ ابھری۔ انھوں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا' ایک شخص اندھیرے سے نکل کر ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دھندلی روشنی میں دونوں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ اس نے دور سے للکارا۔

"اوئے چھبڑ! سوٹ کیس رکھ دے۔"

لالی جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ لیکن اس نے سوٹ کیس نہیں چھوڑا۔ اجنبی اور قریب آ گیا۔ اس دفعہ وہ زیادہ گرج دار آواز سے بولا۔ "دیکھتا کیا ہے؟ جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔" وہ جھپٹنے کے انداز میں



تیزی سے لپکا۔ لیکن آگے بڑھتے بڑھتے ٹھٹک کے حیرت سے چیخا۔

"اوئے لالی! کتے' حرام دے۔"

لالی نے فوراً اسے پہچان لیا۔ وہ اشرف تھا۔ کئی سال پہلے وہ اسی کے گروہ میں شامل تھا۔ جیل میں بھی ساتھ رہ چکا تھا۔ اشرف پیار سے گالیاں دیتا ہوا قریب آیا اور لالی کے گلے سے لپٹ گیا۔ نہایت گرمجوشی سے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچنے لگا۔ اس نے علیحدہ ہو کر لالی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

اس کی ملگجی بش شرٹ اور پتلون دیکھی' بڑھی ہوئی حجامت اور گرد سے اٹے ہوئے بال دیکھے۔ کبیدہ خاطر ہو کر بولا۔

"یار! تو نے یہ اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟"

لالی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ "تجھے نہیں معلوم؟"

"مجھے پتہ ہے تو منٹگمری جیل سے بھاگا ہوا ہے۔ نصیرا تو تیرے ساتھ ہی جیل میں تھا۔ پرسوں چھوٹ کے آیا ہے۔ وہی بتاتا تھا۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ وہ لالی کے پیچھے کھڑا تھا۔ اشرف نے اس کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ تیرے ساتھ کا دوسرا مفرور کیدی ہے نا؟ اس کی جیل کی وردی تو بدلوا دی ہوتی۔ یہ صاف تجھے پکڑوا دے گا۔"

لالی نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ "یہ بتا' اتنے سویرے سویرے یہاں کیسے آ ٹپکا۔"

"ڈیوٹی پر تھا۔" اشرف نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔ "اسی کے انتظار میں تھا۔"

"کچھ اونچا چکر لگتا ہے۔" لالی نے آنکھ مار کر پوچھا۔ "معاملہ کیا ہے؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتا' تیرا پروگرام کیا ہے؟"

"میرا کیا پروگرام ہے۔" لالی کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ "چھپتا لکتا پھرتا ہوں۔ نہ رہنے کا ٹھکانا ہے نہ روٹی ٹکر کا۔ کبھی یہاں' کبھی وہاں۔"

"ایسا کر میرے ساتھ چل۔" اس نے لالی کا کندھا ہولے ہولے تھپ تھپایا۔ "راستے کی پروا نہ کر۔ کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ ادھر اپنی ہی عمل داری ہے۔ لہور تک کی میں گارنٹی لیتا ہوں۔"

"ایسا کر۔ سوٹ کیس کھول۔ اپنے مطلب کے کپڑے نکل آئے تو بن گیا کام۔"

اشرف سوٹ کیس کھولنے پر آمادہ نہ ہوا۔ "یہ سنڈیکیٹ کا مال ہے۔ اسے صرف باس کھول سکتا

ہے۔"

"باس؟" لالی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "یہ باس کیا چیز ہے؟"

"بہت اونچی چیز ہے۔ فسٹ کلاس سے نیچے نہیں چلتا۔ کراچی گیا ہے۔"

"سوٹ کیس اسی نے پھینکا تھا؟"

"ہاں۔" اشرف نے جواب دیا۔ "میں بھی اسی ٹرین میں تھا۔ فسٹ کلاس کے ساتھ والے انٹر کے ڈبے میں تھا۔ پیچھے کادر آباد سٹیشن ہے۔ وہیں اتر گیا تھا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ رہا سامنے آؤٹر سگنل۔"

لالی نے سوٹ کیس اس کے حوالے کر دیا۔ "لے' سنبھال اپنی امانت۔" اس نے مسکرا کر پوچھا "کتنا مال پانی ہوگا اس کے اندر؟"

"مخبر نے تو لاکھ روپے سے اوپر کی اطلاع دی تھی۔ مال زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیش کے علاوہ جڑاؤ زیورات جا رہے تھے اس میں۔" اس نے سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اپنا سنڈیکیٹ چھوٹا شکار نہیں مارتا۔"

لالی مرعوب ہو کر بولا۔ "یار! یہ تو بہت اونچا چکر جان پڑتا ہے' پر خطرناک بھی اتنا ہی ہے۔"

"کوئی خطرناک شترناک نہیں۔" اشرف نے ہنس کر بتایا۔ "مہینے سوا مہینے میں صرف ایک بار نکلتے ہیں اور تگڑا شکار مارتے ہیں۔ اکیلے نہیں کھاتے' مل بانٹ کے کھاتے ہیں۔ اوپر سے نیچے تک سب کا حصہ بندھا ہے۔ اپنے پر کوئی آسانی سے ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔" اس نے ایک آنکھ دبائی۔ "جی چاہے تو لگ جا لین میں۔ بول کیا کہتا ہے۔ چلتا ہے میرے ساتھ؟"

لالی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چلیں گے تو ہم دونوں ہی چلیں گے۔ تو سوٹ کیس کھولنے کو تیار نہیں۔ فیر اپنا رحیمے کیسے چلے گا۔"

"اپنی بات کر۔" اشرف نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ "یار! برا نہ مان۔ یہ تو دیکھنے ہی میں یتیم مسکین لگتا ہے۔ اسے خاماخا نکال لایا۔ ایک بار پوری سزا کاٹ لینے دے' فیر فروٹ ہو کر نکلے گا۔ ابھی تو بہت کچا ہے۔"

"شرفے! بہت اونچا نہ اڑ۔ مارا جائے گا۔ یہ بتا میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کیا کرتا؟"

اشرف نے گردن اونچی کی۔ "پورا راشن لے کر چلتا ہوں۔" اس نے پتلون کی جیب سے پستول نکالا اور لالی کے سامنے گھما پھرا کر بولا۔ "پورا لوڈ ہے۔ کیا سمجھا؟" اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "جھیتی فیصلہ کر' بول کیا کہتا ہے؟ میرے پاس ٹائم بہت کم ہے۔" اس نے مڑ کر



پیچھے دیکھا۔ "یوسف والا سٹیشن سے ٹرین آنے ہی والی ہے۔ مجھے اسی سے واپس لہور جانا ہے۔"

رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ "چلا جا لالی! میری پروا نہ کر۔" اس کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔ "جو نصیب میں لکھا ہے' ہو کے رہے گا۔"

لالی نے اسے غصے سے ڈانٹا۔ "چپ کر رحیمے! بکواس نہ کر۔ یہ میرا اور شرفے کا معاملہ ہے۔ خاماخا اپنی ٹانگ بیچ میں نہ اڑا۔" اس نے رحیم داد کا بازو پکڑا۔ اسے اپنی طرف کھینچا اور کمر میں ہاتھ ڈال کر بے تکلفی سے بولا۔ "شرفے! یہ اپنا جگر ہے۔ اسے میں نہیں چھوڑ سکتا۔ تو جا' میرا تیرا رستہ الگ ہے۔"

"جیسی تیری مرضی۔ جی تو چاہتا تھا تو ساتھ چلتا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے بٹوا نکال کر کچھ نوٹ نکالے اور لالی کی طرف بڑھا کر مخاطب ہوا۔ "یہ رکھ لے' کام آئیں گے۔ پیارے! ہم تو یاروں کے یار ہیں۔"

لالی نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ "انھیں اپنے ہی پاس رکھ۔ یاری دوستی کی بات کرتا ہے تو اتار دے کمیص' پتلون۔ تجھ سے زیادہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔" اشرف سٹپٹا کر خاموش کھڑا رہا۔ لالی منہ بگاڑ کر بولا۔ "جا دیکھ لیا تجھے بھی۔ خالی پیلی بڑھکیں مارنا جانتا ہے۔ اونہہ!" اس نے جھنجلا کر زمین پر تھوک دیا۔

اشرف بھڑک اٹھا۔ "گالی نہ دے لالی!" وہ جلدی جلدی اپنی قمیص اتارنے لگا۔ "تو بھی اتار اپنے کپڑے' جھیتی نال۔ ٹائم بہت کم ہے۔"

دونوں نے جھٹ پٹ کپڑے اتارے اور ایک دوسرے سے بدل لیے۔ لالی نے اشرف کا جوتا بھی ہتھیا لیا۔ وہ اس کے پیروں میں بالکل فٹ تھا۔ کپڑے البتہ ذرا ڈھیلے تھے۔ مگر لالی کے جسم پر بدنما نہیں لگتے تھے۔

اشرف نے ضد کر کے لالی کی جیب میں پچاس روپے بھی ڈال دیئے۔ لالی نے کہا۔ "یار! ذرا ٹھیر۔ ادھر کا کچھ اتا پتا تو بتا۔ اپنے کو تو کچھ نہیں ملوم۔ چاہتا ہوں جلد سے جلد اس ضلع سے باہر نکل جاؤں۔ تو بتا' کیا کروں؟"

"ایسا کر ریلوے لائن کے اس پار نکل جا۔ آگے ملتان روڈ ہے۔ اس سے کچھ ہی دور آگے نہر لوئر باری دو آب ہے۔ اسے پار کر لے تو جھل اور بیٹے ہیں۔ تیرے لیے بہت محفوظ ٹھکانا ہے۔ دن بھر وہاں رہ۔ رات کو چک ۶۷ کی طرف نکل جا۔ کھبے ہتھ کو ہے۔ ادھر سے سدھی سڑک نور شاہ جاتی ہے۔ نور شاہ نہ جانا۔ نور شاہ سے پہلے فیر نہر آئے گی۔ اس کے کنارے کنارے چلتا ہوا عالم

شاہ پہنچ جا۔ راوی نزدیک ہی ہے۔ کسی پتن پر پہنچ کر بیڑی میں بیٹھ کر دریا کے دوسری طرف پہنچ جا۔ وہاں سے ضلع لائل پور شروع ہو جائے گا۔ میں اس رستے سے دو بار لائل پور جا چکا ہوں۔ لائل پور پہنچ کر جی چاہے تو میرے پاس لہور آجانا۔ دیکھ ضرور آنا۔"

لالی نے اشرف کو گرم جوشی سے گلے لگایا اور پیشانی چوم کر محبت سے رخصت کیا۔

اشرف سوٹ کیس اٹھا کے آگے بڑھ گیا۔ وہ لالی کی میلی کچیلی بش شرٹ، تنگ اور اونچی پتلون اور بڑے بڑے جوتوں میں بھدا اور بے ڈول لگ رہا تھا۔ لالی اسے جاتے ہوئے دور تک دیکھتا رہا۔ مگر اشرف نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا قادر آباد اسٹیشن کی جانب بڑھ رہا تھا۔

جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو دونوں پٹڑی عبور کر کے اس پار چلے گئے۔ کچھ ہی دور گئے تھے کہ سڑک آگئی۔ یہ ملتان روڈ تھی اور اس وقت بالکل ویران تھی۔ وہ سڑک کے دوسری جانب چلے گئے۔ نہر بھی زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔

دونوں نہر پر پہنچے۔ کچھ دور اس کے کنارے کنارے چلے۔ پل آگیا۔ پل سے گزر کر وہ نہر کے اس پار پہنچ گئے۔

اشرف نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ نہر کے کنارے کھجور کے چند درخت تھے۔ ان کے عقب میں جنگلی درختوں اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا جھنگر تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ جھنگر ختم ہوا تو اونچے نیچے ٹیلوں اور ٹبوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

وہ ایک ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ اوپر پہنچے تو فراش کے اونچے اونچے درخت دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ دوسرے جنگلی درخت تھے۔ جھاڑیاں بھی تھیں۔ ٹیلے کی بلندی سے انھوں نے پیچھے مڑ کر نظر ڈالی۔ صبح کی ہلکی ہلکی دودھیا روشنی میں جھنگر کے اس پار نہر لوئر باری دو آب چاندی کے تار کی طرح جھلملا رہی تھی۔

وہ ڈھلانوں سے اترتے، چڑھائیوں پر چڑھتے اور آگے چلے گئے۔ اب وہ بہت تھک چکے تھے۔ انھیں کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش تھی۔ دونوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کچھ فاصلے پر انھیں جھاڑیوں کا جھنڈ نظر آیا۔ قریب ہی کبڑوں کی مانند جھکے ہوئے دو پتھریلے ٹیلوں کے درمیان ایسا خلا تھا جس کے اوپر ٹیلوں کی چوٹیاں ملنے سے محراب بن گئی تھی۔ یہاں وہ روپوش ہو سکتے تھے۔ دھوپ سے بچ کر دن میں سو بھی سکتے تھے۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی اور انھیں اس وقت ویرانی ہی کی ضرورت تھی۔

دونوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے ڈھلان سے نیچے اترے اور محراب کے سامنے جا کر



ٹھہر گئے۔ محراب ان کے قد سے اونچی تھی۔ اندر کی زمین خاصی ہموار تھی۔ اس میں سخت مٹی کی تہہ اور پتھر تھے۔ مگر صاف ستھری تھی۔

محراب سے ذرا ہٹ کر فراش کا ایک درخت سر اٹھائے کھڑا تھا۔ محراب کے دوسری طرف کا حصہ بھی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس کے عین نیچے گہرا کھڈ تھا۔ کھڈ میں ریتلی مٹی کے اونچے اونچے تودے تھے۔

رحیم داد زیادہ کھڑا نہ رہ سکا۔ محراب کے نیچے چلا گیا اور نڈھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔ لالی بھی اس کے برابر لیٹ گیا۔ دونوں دیر تک خاموش پڑے رہے۔ باہر درختوں اور ٹیلوں پر زرد زرد دھوپ پھیلتی جا رہی تھی۔

رحیم داد زمین پر چت لیٹا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی۔ لمحے بھر لالی کے چہرے کو تکتا رہا، پھر گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ شاداں خطرناک زنانی ہے۔"

"ہے تو۔" لالی نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "پر اس میں ایک بات ہے جو ہر زنانی میں نہیں ہوتی۔"

رحیم داد حیرت سے بولا۔ "وہ کیا؟"

"شاداں کھرا روپیہ ہے، بجاؤ تو ٹن سے بولے۔"

رحیم داد نے احتجاج کیا۔ "کیا بات کر رہا ہے لالی؟ بال بال بچ گئے۔ ورنہ اس نے تو مروا دیا تھا دونوں کو۔"

"دو ہزار بہت بھاری رکم ہوتی ہے رحیمے!" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کو رکا۔ "میری تو سگی موسی نے صرف دو سو روپے کے لیے مجھے آگ میں جھونک دیا تھا۔"

"چوری کی ہو گی۔"

"نہیں۔" لالی اسی طرح چت لیٹا اوپر دیکھتا رہا اور آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "میں نے اس کے دو سو کے نوٹ دیوے سے جلا کر روشنی کی تھی۔ ان دنوں میں بہت چھوٹا ہوتا تھا۔ شبرات پر ماں کے ساتھ موسی کے گھر گیا تھا۔"

رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "بہت ظالم تھی۔"

"یہ بات بھی نہیں۔" لالی ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھ کر ہولے ہولے ہلانے لگا۔ "میرا موسا درزی تھا۔ سلائی کی مشین بیچ کر اپنی بیٹی کے ویاہ کے لیے دو سو روپے لایا تھا۔ موسی اس کی

دوسری گھروالی تھی۔ پہلی مرگئی تھی اور اسی کی بیٹی کا ویاہ تھا۔ میں نے موسا کے دو سو روپے جلا ڈالے تو وہ غصے سے پاگل ہوگیا۔ جلتا دیوا اٹھا کر موسی کے منہ پر مارا۔ اس کی ایک آنکھ جل گئی۔ اس نے اپنا غصہ مجھ پر اتارا۔ مجھے دھکا دے کر جلتے الاؤ میں پھینک دیا۔ ماں نہ ہوتی تو جل کر مرجاتا۔ ٹھیک ہی ہوتا۔" لالی کی آواز میں درد کی چبھن تھی۔

رحیم داد خاموش رہا۔ لالی بھی نہ بولا۔

دونوں یادوں کی دھوپ چھاؤں میں ڈولتے رہے۔ آخر ان کی آنکھ لگ گئی۔ وہ گہری نیند سوگئے۔ دھوپ ٹیلوں کی بلندی سے زینہ زینہ نیچے اتر رہی تھی۔ اندھیری گھاٹیاں روشن ہوگئی تھیں۔ دن کا ایک پہر گزر گیا۔ دوپہر ہوگئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سورج کا الاؤ سرد پڑ گیا۔ دونوں بے خبر سوتے رہے۔

☆

ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ لالی نے اسے بیدار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سخت بھوک لگی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ رحیم داد کو سوتا چھوڑ کر باہر نکلا اور کچھ دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ پھر ایک طرف چل دیا۔ آگے بڑھ کے وہ آہستہ آہستہ نشیب میں اترنے لگا۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنیں درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر جھلملا رہی تھیں۔ نیچے گھاٹی میں نیل گوں دھندلکا پھیل رہا تھا۔ لالی آگے بڑھا تو سرس کے درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ ان میں پیلے پیلے پھولوں کے گچھے جھول رہے تھے۔ ان کی مہک ہوا میں بسی ہوئی تھی۔ فضا میں پہلی رات کی دلہن کی سی چھب تھی اور لالی کو شدید بھوک لگی تھی۔

وہ ٹیلوں اور ٹبوں کے دامن میں اونچے نیچے ناہموار راستوں پر چلتا ہوا دور تک چلا گیا۔ یکایک تیز بو کا بھبکا آیا۔ لالی ٹھہر گیا۔ اس نے ایک ٹیلے کی بلندی سے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر ایک مردار خچر پڑا ہے۔ دو گدھ اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ اوپر ٹیلے پر پانچ چھ گدھ قطار میں بیٹھے تھے اور اڑنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

مردہ خچر کے جسم سے اٹھتی ہوئی تیز بو کے باوجود لالی وہیں کھڑا رہا اور گردن اونچی کرکے متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

دور فراش کے درختوں کے پیچھے سے دھواں اٹھ رہا تھا جو شام کے دھندلکے میں آہستہ آہستہ تحلیل ہوتا جارہا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ قریب ہی کوئی آبادی ہے۔ وہ اسی طرف چل دیا۔ نزدیک جاکر دیکھا، ٹیلوں کے دامن میں رکابی کی طرح کا اونچا اور ابھرا ہوا میدان ہے۔



میدان میں جگہ جگہ اونٹ کے سیاہ بالوں کے بنے ہوئے نمدے کے خیمے لگے ہیں۔ ان خیموں کو خانہ بدوش پاوندے گیرے کہتے ہیں۔ خیمے پھٹے پرانے تھے اور بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔

خیموں کے آس پاس اونٹ اور خچر بندھے تھے، بھیڑوں کے ریوڑ بھی تھے۔ خیموں کے باہر آگ روشن تھی۔ لالی نے دور ہی سے بھانپ لیا کہ وہاں پاوندوں نے پڑاؤ ڈالا ہے۔

وہ میدان میں پہنچنے کے لیے مڑا۔ جھٹ پٹے میں اس نے دیکھا، دو خانہ بدوش لڑکیاں آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ ایک دوسرے کے بال نوچ رہی ہیں۔ زور زور سے چیخ رہی ہیں۔ ان کے قریب ہی زمین پر سوکھی شاخوں کے گٹھے رکھے تھے۔ سامنے مٹی کے تودے پر ایک نوجوان پاوندا بیٹھا نہایت سکون سے لڑکیوں کو ایک دوسرے کے جھونٹے کھسوٹتے دیکھ رہا تھا۔ لالی کی چاپ سن کر نوجوان نے پلٹ کر سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ذرا دیر ہکا بکا بیٹھا رہا۔ پھر ایک دم اٹھ کر خیموں کی سمت بھاگا۔

لڑکیاں بھی دھینگا مشتی چھوڑ کر لالی کو حیرت سے تکنے لگیں۔ ان کے لباس بوسیدہ اور گندے تھے۔ بالوں کی چھوٹی چھوٹی مینڈھیاں تھیں جو جھونٹے کھسوٹنے سے بکھر کر منہ پر آگئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ رخسار تازہ سیب کی طرح گلابی تھے۔ وہ بنجر ٹیلوں پر اگنے والے جنگلی پھولوں کی مانند تھیں جن میں رنگ ہی رنگ ہوتا ہے، خوشبو اور مہک نہیں ہوتی۔ توڑو تو ہاتھ میں کانٹے چبھ جائیں۔

ایک خانہ بدوش لڑکی بڑھ کر لالی کی قریب آئی۔ اس کے پہلو سے لگ کے اس طرح کھڑی ہوگئی کہ اس کے بدن کی تیز بو لالی کی سانس میں گھل مل گئی۔ لڑکی نے سر جھکا کر اپنے بکھرے ہوئے بال دکھائے اور دوسری لڑکی کی طرف اشارہ کرکے بولی۔ "اس نے مجھے مارا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ سٹ کر لالی کے اس قدر قریب آگئی کہ اس کی بھری بھری چھاتیاں لالی کے بازو میں پیوست ہوگئیں۔ لالی نے جھرجھری لی اور بے رخی سے اسے زور سے دھکا دیا۔ "پرے ہٹ کر بات کر۔" لڑکی کے بھورے بھورے بال اور بکھر گئے۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچی۔ اس نے لالی کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

دوسری نے زور کا قہقہہ لگایا اور لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "ڈیرے جانا ہے؟"

"ہاں جی۔" لالی نے مختصر جواب دیا۔

مزید کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ خانہ بدوش لڑکیوں نے قریب پڑے ہوئے لکڑیوں کے گٹھے اٹھا کر

سروں پر رکھے اور ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرتی آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ لالی آہستہ آہستہ ڈیرے کے جانب چلا۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک بوڑھا پاوندا' دو نوجوانوں کے ہم راہ خیموں کے پیچھے سے نکلا اور لالی کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب آکر تینوں پاوندوں نے مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔

بوڑھا پاوندا کھردرے لہجے میں بتانے لگا کہ پڑاؤ رات ہی کو ختم ہو جائے گا اور صبح تڑکے قافلہ کوچ کرے گا۔ وہ مظفر گڑھ کے راستے ڈیرہ غازی خان جارہے ہیں۔ بوڑھا پوچھے بغیر لالی کے سامنے صفائی پیش کر رہا تھا۔ اسے یقین دلا رہا تھا کہ قافلے کا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے نہیں ہے۔

☆

لالی کئی برس پہلے چند روز کے لیے پاوندوں کے ڈیرے میں قیام کر چکا تھا۔ چنانچہ عادات واطوار اور ان کے طرز زندگی سے کسی حد تک واقف تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ پاوندے ان خانہ بدوش قبائل میں سے ہیں جو موسم سرما شروع ہوتے ہی افغانستان کے کوہستانی دروں سے نکل کر پنجاب اور سندھ کے میدانی علاقوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اینٹوں کے بھٹوں پر پتھیروں کا کام کرتے ہیں۔ دیہات کے کچے مکانات کے لیے' مٹی کی دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔ شہروں اور قصبوں میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ کمبل اور نمدے' بھیڑ اور لومڑی کی کھالیں' قراقلی ٹوپیاں' جڑی بوٹیاں' خشک میوے' ہینگ اور مشک' گھوڑے' ایرانی بلیاں اور گرے ہاؤنڈ شکاری کتے فروخت کرتے ہیں۔ ان کی عورتیں سخت جفاکش' محنتی اور منہ زور ہوتی ہیں۔ اس قدر آزاد اور بے باک ہوتی ہیں کہ غیر مردوں کے سامنے بھی ذرا حجاب محسوس نہیں کرتیں۔ پاوندے عورتوں اور بچوں کے ساتھ اونٹوں اور خچروں پر سوار ہو کر' خیمے اور سامان لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہیں۔

سفر کے دوران مرد اور عورتیں مل کر کوہستانی نغمے الاپتے ہیں۔ نغموں کے ساتھ ساتھ اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی پیتل کی گھنٹیاں بجتی ہیں جو نغمے کی لے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ساز کا کام دیتی ہیں۔ قافلے کی حفاظت کے لیے پاوندے اپنے ہم راہ روسی نسل کے کتے رکھتے ہیں۔ یہ کتے برف کی طرح سفید اور کوتاہ قامت ہوتے ہیں۔

درختوں میں پت جھڑ لگتے ہی پاوندوں کی واپسی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ دریائے سندھ عبور کر کے پہلے ڈیرہ اسماعیل خان پہنچتے ہیں جہاں دور دراز کے علاقوں میں بکھرے ہوئے قافلے مختلف سمتوں



سے آکر اکٹھا ہوتے ہیں۔ یہ ان کا آخری پڑاؤ ہوتا ہے۔ گرمی بڑھنے سے پہلے پہلے وہ درہ گومل کے راستے جہاں سے آتے ہیں وہیں لوٹ جاتے ہیں۔

پاوندوں میں جرائم پیشہ بھی ہوتے ہیں جو ڈاکہ زنی اور مویشیوں کی چوری کرتے ہیں یا چرس اور افیون کا ناجائز دھندا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس ان کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کرتی ہے۔ وہ جہاں پہنچتے ہیں' وہاں کے تھانے میں اپنی آمد کی باقاعدہ اطلاع دیتے ہیں۔

بوڑھے کی جانب سے خواہ مخواہ صفائی پیش کرنے پر لالی نے جلد ہی بھانپ لیا کہ پاوندے اس کی پتلون اور اجلی قمیص سے سخت مرعوب ہو گئے ہیں۔ اسے پولیس یا سی آئی ڈی کا افسر سمجھ رہے ہیں۔

لالی ان کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھا کر ہراساں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس ویرانے میں اپنی آمد کا بھی اسے کوئی نہ کوئی عذر پیش کرنا تھا۔ لہٰذا اس نے یہ ظاہر کیا کہ محکمہ جنگلات کے سرکاری کام کے سلسلے میں ادھر آیا ہے۔ لیکن اس کے عملے کے دوسرے لوگ ابھی پہنچ نہیں سکے۔ اس کے بعد اس نے سیدھی سیدھی معاملے کی بات کی۔ انھیں بتایا کہ وہ سخت بھوکا ہے اور بھوک ہی سے بے قرار ہو کر اس طرف آیا ہے۔

وہ ان کے ہم راہ ایک خیمے کے اندر گیا' ان کا مہمان بنا۔ کٹورا بھر بھیڑ کا دودھ پیا۔ شہد اور پنیر کھایا۔ قہوے کا گرم گرم پیالہ پیا۔ مکئی کی ڈھیر سی روٹیاں لیں۔ شہد اور پنیر لیا۔ مشکیزے میں پانی لیا۔ ہاتھ کا بنا ہوا کمبل اور ایک نمدا لیا۔ بھیڑ کی چربی سے جلنے والا چراغ لیا اور ایک تیز دھار چھری بھی لی۔

تیس روپے میں یہ سودا کسی طور برا نہ تھا۔ پاوندوں نے اسے چرس بھری سگریٹ بھی پلائی۔ چرس پر دم لگا کے لالی کے جسم میں سرخوشی اور جولانی آگئی۔ خانہ بدوش اس کے ہاتھ چرس بھی فروخت کرنا چاہتے تھے مگر لالی اس چکر میں نہیں پڑا۔ وہ زیادہ دیر وہاں ٹھہرا بھی نہیں۔ شام گہری ہوگئی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ راستہ ناہموار اور پیچیدہ تھا اور چڑھائی بھی چڑھنا تھی۔ وہ جلد سے جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اسے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ رحیم داد اس کی اچانک غیر حاضری سے سخت پریشان ہوگا۔

دو پاوندے دور تک اس کے ہم راہ آئے۔ وہ اور بھی آگے تک اس کے ساتھ جانے پر آمادہ تھے مگر لالی نے ایک موڑ پر انھیں رخصت کر دیا۔ وہ انھیں نہ تو اپنا ٹھکانہ دکھانا چاہتا تھا نہ اپنے بارے میں کسی قسم کی اطلاع بہم پہنچانا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ پولیس والے برابر ان سے پوچھ گچھ

کرتے رہتے ہیں۔

لالی ایک ٹیلے کی آڑ میں کھڑا انھیں دور تک واپس جاتے دیکھتا رہا۔ دونوں نظروں سے اوجھل ہوگئے تو وہ آگے بڑھا۔ اس نے ناہموار چڑھائی عبور کی اور سامان سے لدا پھندا محراب کے قریب پہنچ گیا۔

☆

رحیم داد آہٹ سن کر گھبرایا ہوا باہر آیا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ مگر لالی نے کوئی بات نہیں کی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ رحیم داد اندھیرے میں ایک ایک چیز ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ جب اس نے کمبل کی تہہ کھولی اور اندر سے تازہ تازہ روٹیوں کی سوندھی سوندھی مہک نکلی تو وہ بچوں کی طرح چہک کر بولا۔

"او، ہو، ہو یار! کمال کر دیا۔ روٹیوں کا تھبا تو بالکل گرم گرم ہے۔"

"شہد اور پنیر بھی ہے۔" لالی نے اسے مطلع کیا۔ جیب سے ماچس نکالی، جھک کر چراغ اٹھایا اور اسے روشن کر دیا۔ ہوا تیز تھی، چراغ کی لو بار بار بھڑکتی۔ لالی نے ادھر ادھر سے پتھر اکٹھا کر کے چراغ ان کی اوٹ میں رکھ دیا۔ اس طرح وہ ہوا سے محفوظ ہوگیا۔ روشنی بھی باہر جانے کے بجائے محدود ہو کر رہ گئی۔

رحیم داد نے زمین پر نمدا بچھا دیا۔ دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ لالی پاوندوں کے ڈیرے کا حال بتانے لگا۔ رحیم داد نے روٹیاں نکال کر باہر رکھیں۔ آٹھ روٹیاں تھیں۔ موٹی موٹی اور خوب بڑی بڑی۔

"یہ ۸ دن کا راشن ہے۔" لالی نے پاوندوں سے خریدی ہوئی چھری نکالی اور ہر روٹی کے چار چار ٹکڑے کر دیے۔

"روٹیاں تو چل جائیں گی۔ پر پانی کم ہے۔"

"بوکی تو اپنے پاس ہے اور نہر بھی زیادہ دور نہیں۔ پانی نہر سے آجائے گا۔" لالی نے مسکرا کر مشکیزے کی جانب اشارہ کیا۔ "پر ۸ دن تک یہاں کون پڑا رہے گا؟ تب تک ہم بہت آگے نکل جائیں گے۔"

رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "برا نہ منانا۔ تیرا معاملہ تو ایک دم فسٹ کلاس بن گیا۔" اس نے اپنا میلا کچیلا لباس دیکھا۔ "یہ جیل کی وردی نہ جانے اپنے بدن سے کب اترے گی اور جب تک یہ نہیں اترے گی، میرے لیے تو خطرہ ہی خطرہ ہے۔"

"پروا نہ کر۔ جلد ہی تیرے لیے بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ مجھے ہر دم اسی کی فکر رہتی ہے۔



خطرہ صرف تیرے لیے نہیں، میرے لیے بھی تو ہے۔ یہ تو سوچ تو اور میں کیا الگ الگ ہیں۔؟" اس نے رحیم داد کو ٹھوکا دیا۔

"دیکھ کیا رہا ہے؟ شروع ہو جا۔"

رحیم داد فوراً شروع ہوگیا۔ اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔ اس پر تھوڑا سا شہد ڈالا، پنیر کا ٹکڑا رکھا۔ پھر روٹی گول گول لپیٹ کر دانتوں سے چباتے ہوئے بولا۔

"تو نہیں کھائے گا؟"

"نہیں۔" لالی نے انکار کر دیا۔ "مجھے دو گھونٹ پانی پلا دے۔ میں نوں جانا ہے۔" وہ لمحے بھر کو رکا۔ "چرس پر دم لگا کر بھڑکی لگ جاتی ہے۔"

رحیم داد نے مشکیزہ لالی کی طرف بڑھا دیا۔ "یار! تو نے تو پاوندوں کے ڈیرے پر زبردست عیش کیے۔" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مشکیزہ منہ سے لگا کر پانی کے کئی گھونٹ پیے۔ مشکیزہ ایک طرف رکھا، ہاتھ سے منہ پونچھا اور کھڑا ہوگیا۔

رحیم داد نے جلدی سے پوچھا۔ "اکیلا ہی جائے گا؟"

لالی نے رسان سے کہا۔ "ہاں۔"

"شاداں کے پاس تو نہیں جا رہا؟"

"جا تو وہیں رہا ہوں۔" لالی نے اقرار کیا۔

رحیم داد آنکھ مار کر بولا۔ "ایسا جان پڑتا ہے، شاداں پر تیرا دل آگیا۔"

"چھوڑ یار! کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "اپنے پاس دل ہے کہاں؟ دل تو دل والوں کے پاس ہوتا ہے۔"

"تو چاہے کچھ کہے۔ تیری ایلیل دیکھ کر تو مجھے ایسا ہی لگتا ہے، تو...."

لالی اس کی بات کاٹ کر بیزاری سے بولا۔ "ٹھرک بازی چھوڑ۔ کام کی بات سن۔" اس نے چھری پتلون میں اڑس لی اور اپنا چاقو نکال کر رحیم داد کو دیا۔ "اسے رکھ لے۔ میں کل رات کو لوٹوں گا۔ واپسی پر دیر ہو جائے تو فکر نہ کرنا۔"

"ابھی اندھیرا ہے۔ چاند نکل آئے تب جانا۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھا اور قریب کے ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ بلندی پر جا کر اس نے دیکھا، ہر طرف ہولناک تاریکی چھائی ہے۔ دور دور تک کچھ نظر نہیں آتا۔ اس نے جھک کر محراب کے نیچے نظر ڈالی۔

رحیم داد چراغ کی دھندلی روشنی میں بیٹھا روٹیوں کے ٹکڑے گن رہا تھا۔ لالی زیادہ دیر ٹیلے پر نہ ٹھہرا۔ آہستہ آہستہ دوسری طرف اتر گیا۔ وہ چڑھائیوں پر چڑھتا' ڈھلانوں سے اترتا' ناہموار راستوں سے گزرتا ہوا ٹیلوں کے نیچے گھنے جھنگر میں پہنچ گیا۔ جھنگر عبور کرکے وہ نہر کی جانب بڑھنے لگا۔

وہ شاداں کے پاس جانا چاہتا تھا اور اس سے رحیم داد کے لیے کپڑے لانا چاہتا تھا۔ کپڑے مل جاتے تو وہ رحیم داد کو جیل کی وردی سے چھٹکارا دلا سکتا تھا اور اس کے ہم راہ شرفے کے بتائے ہوئے راستے سے لائل پور کی طرف نکل جاتا۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ چلتے چلتے اچانک اسے خیال آیا کہ آج شاداں کے گاؤں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ کل ہی رات پولیس سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی ہے۔ اب پولیس نہ صرف شاداں سے پوچھ گچھ کرتی ہوگی بلکہ اس کے گھر کی نگرانی بھی کرتی ہوگی۔ گاؤں کے اندر اور باہر جگہ جگہ ناکوں پر پولیس تعینات ہوگی۔

یہ سوچتے سوچتے اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ نہر اب زیادہ دور نہ تھی۔ مگر لالی نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ واپس مڑا اور اپنے ٹھکانے کی جانب روانہ ہوا۔ جب وہ جھنگر سے گزر کر ٹیلوں پر چڑھ رہا تھا تو رات خاصی گزر چکی تھی۔ ہر طرف گہری ویرانی چھائی تھی۔

وہ کچھ ہی دور چلا تھا کہ روشنی پھیلنے لگی۔ دور فراش کے اونچے اونچے درختوں کے پیچھے سے چاند ابھر رہا تھا۔ گول گول سونے کے بڑے سے تھال کی طرح چمکتا دمکتا چاند ویرانے میں اس قدر خوبصورت نظر آرہا تھا کہ لالی ٹکٹکی باندھے اسے تکتا رہا۔ چاند ابھر کر اوپر آیا تو اندھیرے راستے روشن ہوگئے۔

اجلی اجلی چاندنی میں چلتا ہوا لالی کچھ ہی دیر بعد محراب کے قریب پہنچ گیا۔ رحیم داد ابھی تک جاگ رہا تھا۔ پتھریلے راستوں پر آہٹ سن کر وہ گھبرایا ہوا جھٹ نکل کر باہر آگیا۔ لالی کو اس نے نکھری نکھری چاندنی میں دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

"یار' تو واپس کیوں آگیا؟"

"اندر چل کر آرام سے گل بات کریں گے۔"

دونوں محراب کے نیچے پہنچ گئے۔ لالی دور سے چل کر آیا تھا۔ نمدے پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ مگر رحیم داد سخت بے چین تھا۔ خاموش نہ رہ سکا۔ "یہ تو بتا دے' رستے میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگئی۔"

"ذرا دم لے' سب کچھ بتا دوں گا۔ ویسے پریشانی کی کوئی گل نہیں۔" لالی کچھ دیر خاموش بیٹھا



رہا۔ "گل ایسہ ہے رحیمے! میں نے خود ہی شاداں کے پنڈ جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "کیوں؟"

"میں نے چلتے چلتے سوچا' وہاں تو ابھی پولیس لگی ہوگی۔ تفتیش کرتی ہوگی۔"

"یہ تو تیں نوں پہلے ہی سوچ لینا چاہئے تھا۔ میں تو کہتا ہوں شاداں نے ہمارے بارے میں پولیس کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔"

"بتانا تو نہیں چاہئے۔ اس نے بالے کا خون جو کیا ہے۔ یہ بات ہم دونوں جانتے ہیں۔ ویسے ہمارے بارے میں وہ اتنا ہی جانتی ہے جتنا پولیس کو پتہ ہے۔"

"ایسا ہے تو اس نے ملک کو کیوں ہمارے بارے میں بتایا؟" رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ "بتا اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"وہ تو اس نے دو ہزار انعام کے لالچ میں کیا۔ پر اسے جلد ہی اپنی غلطی کا پتہ چل گیا تھا۔ یار! وہ اتنی بری نہیں جتنی تو سمجھتا ہے۔"

"سوچ لے۔ ویسے میں تو یہی کہوں گا' تیرا اس کے پاس جانا ٹھیک نہیں۔"

"میں تو تیرے لیے کپڑے لینے اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔" لالی اسے سمجھانے لگا۔ "یہ تو تیں نوں بھی پتہ ہے جب تک تیرے بدن پر جیل کی وردی ہے' ہم کہیں جا بھی تو نہیں سکتے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہم دونوں فٹافٹ یہاں سے لائل پور کی طرف نکل جائیں۔"

رحیم داد نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔

باہر چاندنی چھٹکی تھی۔ رات نکھرتی جا رہی تھی۔ خنکی بھی بڑھ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد رحیم داد جماہیاں لیتا ہوا بولا۔

"مجھے تو جھوک آرہی ہے۔ میں تو اب سوتا ہوں۔"

یہ کہتا ہوا وہ نمدے پر لیٹ گیا۔ مگر لالی نہ لیٹا۔ اس نے پھونک مار کر چراغ بجھایا۔ باہر نکل کر کچھ دیر چاندنی میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ واپس آکر وہ بھی لیٹ گیا۔ رحیم داد پہلے ہی سو چکا تھا۔ لالی ذرا دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

صبح اٹھ کر دونوں نے شہد کے ساتھ روٹی کا ایک ایک ٹکڑا کھایا' پانی پیا۔ محراب کے نیچے بیٹھے رہے یا اس کے قریب ہی منڈلاتے رہے۔ مگر دور نہیں گئے۔ شام کو انھوں نے پھر روٹی کا ایک ایک ٹکڑا کھایا۔ تھوڑا تھوڑا پنیر بھی کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انھوں نے فوراً چراغ بجھا دیا۔ اندھیرے میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ چاند طلوع ہوا تو دونوں باہر نکلے اور کچھ دور جا

کر ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ بلندی سے انھوں نے گھوم پھر کر ہر طرف نظر دوڑائی۔ اجلی اجلی چاندنی ہر طرف چھٹکی ہوئی تھی۔ مگر سناٹا بہت گہرا تھا۔ وہ بہت دیر بعد واپس آئے اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔

دوسرا دن بھی اسی طرح گزرا۔ تیسرا دن بھی گزر گیا۔ مگر چوتھے روز پانی ختم ہو گیا۔ البتہ روٹیاں ابھی موجود تھیں۔ شہد اور پنیر بھی تھا۔ دن بھر وہ پیاسے رہے۔ شام ہوئی اور اندھیرا پھیلا تو لالی نے مشکیزہ اٹھایا۔ رحیم داد کو اپنے ساتھ لیا۔

دونوں ٹیلوں سے اتر کر جھنگر میں پہنچے۔ اسے عبور کیا اور نہر پر پہنچ گئے۔ اب رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ لالی نے نہر سے مشکیزے میں پانی بھرا اور مشکیزہ رحیم داد کے حوالے کر کے بولا۔

"میں اب شاداں کے پنڈ جہانگیرہ جاؤں گا۔ کوشش کروں گا سورج نکلنے سے پہلے واپس آجاؤں۔ آج نہ آسکا تو کل آجاؤں گا۔ مان لے، مجھے آنے میں دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا۔ میں آؤں گا ضرور۔ میرا انتظار کرنا۔ تیرے پاس ابھی چار روٹیاں رہتی ہیں۔ شہد اور پنیر بھی ہے۔ یہ کئی دن کا راشن ہے۔ روٹیاں سوکھ جائیں تو پانی میں بھگو کر کھا لینا۔ صبح شام روٹیوں کا ایک ایک چپا کھانا۔ پانی مک جائے تو رات کے اندھیرے میں نہر سے لے آنا۔ پر دن میں ہرگز اپنے ٹھکانے سے باہر نہ نکلنا۔"

رحیم داد اس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے بے چین ہو کر کہا۔ "یار! جھیتی نال آجانا اور میرے لیے کپڑے ضرور لانا۔ ویسے مجھے ساتھ لے چلتا تو ٹھیک رہتا۔ مجھے ادھر کے رستوں کا کچھ تو اتا پتا ہے۔ تیں نوں تو کچھ بھی پتہ نہیں، توں تو بچپن سے لہور میں رہا۔"

"پروا نہ کر۔ مجھے رستے کا سب پتہ ہے۔ میں جھیتی آؤں گا اور تیرے لیے کپڑے ضرور لاؤں گا۔" لالی محبت سے اس کی پیٹھ تھپک کر بولا۔ "اب تو ٹر جا۔"

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ وہ ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ لٹکائے جھنگر کی طرف چل دیا۔

لالی خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو لالی نہر کے کنارے کنارے چلتا ہوا پل پر پہنچا۔ اسے عبور کیا اور نہر کی دوسری جانب چلا گیا۔ وہ آگے بڑھا تو سڑک آگئی اس نے دور ہی سے دیکھا، ایک لاری تیزی سے سڑک پر دوڑتی ہوئی گزر رہی ہے۔ اس کے جانے کے بعد گہرا سناٹا چھا گیا۔

لالی سڑک سے گزر کر ریل کی پٹڑی کی جانب بڑھا۔ ریل کی پٹڑی کے آس پاس سناٹا اور زیادہ گہرا



تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔

وہ ریل کی پٹڑی کے کنارے کنارے کچھ دور تک چلتا رہا، پھر نشیب میں اتر کر جنگلی جھاڑیوں کے درمیان راستہ بناتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ لالی سنسان راستوں سے گزرتا، ہر آہٹ پر چونکتا، ایک پہر شاداں کے گھر کی دیوار کے نیچے کھڑا تھا۔ وہ ذرا دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر دیوار پر چڑھا اور آہستہ سے آنگن میں اتر گیا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور دالان کی جانب دبے قدموں بڑھا۔ اس نے دیکھا کہ شاداں دالان کے ایک کونے میں فرش پر لیٹی ہے۔ وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے اجلی چاندنی میں لالی کا سایہ دیکھا تو گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ لالی اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

شاداں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لالی نے کچھ کہنا چاہا تو شاداں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر رکھ دیا۔ کمرے کے بند دروازے کی جانب اشارہ کیا اور لالی کا ہاتھ پکڑ کر آنگن میں آگئی۔

وہ اسے پرچھتی میں لے گئی۔ آہستہ سے پوچھا۔ "توں آیا کیسے؟"

"دیوار پھاند کر۔" لالی بے نیازی سے بولا۔

"مسکری نہ کر۔ ٹھیک ٹھیک بتا۔"

"پہلے یہ بتا، کمرے میں کون ہے؟"

"ہے کوئی، کیا کرے گا جان کر۔" شاداں نے گول مول جواب دیا۔

لالی نے آنکھ مار کر بے تکلفی سے کہا۔ "کوئی نیا یار پھانس لیا؟"

شاداں ایک دم شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "میں کوئی چھنال ہوں؟ مجھے سمجھتا کیا ہے کنجر۔" یہ کہہ کر اس نے غصے سے زمین پر تھوک دیا۔

لالی نے اس کی برہمی پر ذرا بھی برا نہ مانا۔ ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ "ایسا نہیں ہے تو فیر چھپا کیوں رہی ہے؟ صاف صاف بتا کمرے میں کون ہے؟" اس نے لہجے بھرک کر پوچھا۔

"تیرا خصم تو نہیں آگیا؟"

"نہیں۔" شاداں کے لہجے میں ٹھہراؤ آگیا تھا۔ "وہ یہاں کیسے آسکتا ہے۔"

"کیوں نہیں آسکتا؟ تو اس کی گھر والی جو ہے۔ چھوٹ تو نہیں گئی۔ اس نے تجھے طلاق تو نہیں

دی۔"

"دے بھی نہیں سکتا۔" شاداں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "جب بالے کے ساتھ میرے جانے کا اسے پتہ چلا تو اس نے نہ پرچہ چاک کرایا نہ تھانے گیا۔ سب نے بہت کہا تب بھی نہ گیا۔ وہ اور ہی طرح کا بندہ ہے۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ ذرا سا شرمائی اور ڈوپٹے کا پلو سر پر ڈال لیا۔ "اب بھی جان دیتا ہے مجھ پر۔"

لالی نے نظر بھر کر شاداں کو دیکھا۔ وہ پڑچھتی کے کنارے پر اس طرح کھڑی تھی کہ ہلکی ہلکی چاندنی کی پھوار میں اس کا چہرہ اجلے پیتل کی طرح دمک رہا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں میں کنول کھل رہے تھے۔

لالی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "تجھ پر جان دینے والے اور تیرے لیے تڑپنے والے تو اور بھی بہت ہیں۔ تجھ میں بات ہی ایسی ہے۔" اس نے شاداں کی دمکتی ہوئی پیشانی اور آنکھیں بھرپور نظروں سے دیکھیں۔

"توں تو ابھی تک متحیلی مٹیار لگتی ہے۔"

"دے مخول نہ کر۔" وہ شرما گئی۔ پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اب کیا رہ گیا مجھ میں، جل کر راکھ ہو گئی۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "بالے مجھے برباد کر گیا۔"

"اس کی گل چھوڑ۔ ٹھیک ٹھیک بتا، کمرے میں کون ہے؟"

"ناراض تو نہیں ہو گا؟" شاداں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میرے سر پر ہتھ رکھ کرتا۔"

"نہیں۔" لالی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھے بغیر کہا۔ "نہیں مناؤں گا۔ بالکل نہیں مناؤں گا۔"

"ایسے نہیں۔" شاداں نے اصرار کیا۔ "سر پر ہاتھ رکھ کرتا۔ برا تو نہیں منائے گا؟"

لالی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "لے اب بتا۔"

شاداں نے ذرا سا آگے جھک کر سرگوشی کی۔ "تاجی ہے، اندر منجی پر سو رہی ہے۔"

"کون تاجی؟" لالی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ ہونق کی طرح شاداں کا چہرہ تکنے لگا۔

شاداں ناک سکیڑ کر تیکھے لہجے میں بولی۔ "وہی کنجری، جس نے بالے کو مجھ سے چھین لیا تھا۔"

لالی نے خطرے کے احساس سے خوف زدہ ہو کر کہا۔ "وہ یہاں کیسے آئی؟"

"آئی نہیں۔ میں خود جا کر لائی ہوں۔" شاداں مطلق خوف زدہ نہیں تھی۔

لالی اس کی بات سن کر سخت پریشان ہوا۔ جھنجلا کر بولا۔ "تیرا مغز تو نہیں چل گیا؟ یہ تجھے سوجھی کیا؟"



"ناراض نہ ہو۔ تو نے میرے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔" وہ صفائی پیش کرنے لگی۔ "تپ چڑھی تھی اسے۔ کوئی دوا دارو بھی نہیں۔ میں شام کو اس کے لیے دوائی لائی ہوں۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ تڑپ کر بولی۔

"ہائے سرسوں کے پھول کی طرح پیلی پڑ گئی ہے۔"

لالی اس کی باتوں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ نہایت بے رخی سے بولا۔ "تجھے کس نے کہا تھا اسے اپنے گھر میں لا، اس کا علاج کرا۔ اور کوئی نہیں اس کا؟ کوئی تو ہو گا؟"

"ہے تو۔" شاداں نے جواب دیا۔ "ویر ہے، پر وہ کراچی میں ہوتا ہے۔ بھرجائی تھی، وہ بھی پچھلے دنوں اس کے پاس چلی گئی۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "ٹھیک ہی ہوا۔ ایسی چنڈال تھی۔ ہائے، کیا بتاؤں، روز تاجی کا ہاتھ پکڑ کر نکالتی تھی۔ مارتی تھی، جھونٹے کھسوٹتی تھی۔ تبھی تو بالے کے گلے پڑ گئی۔"

لالی اس کی باتوں سے اکتا گیا۔ بات کاٹ کر بولا۔ "خاما خا کی کڑکڑ بند کر۔ یہ بتا وہ بالے کو تو نہیں پوچھتی تھی؟"

"کیوں نہیں پوچھتی تھی۔ میں اس کے پاس گئی تو اس نے پہلی بات یہی پوچھی۔ میں نے جھٹ کہا۔ بالے تو میرے پاس تین مہینے سے نہیں آیا۔ لہور گیا ہو گا، ایکٹر بننے۔ وہ تو اپنے کو سوہنا منڈا سمجھتا ہے۔" شاداں نے غور سے لالی کا چہرہ دیکھا۔

"غلط بات تو نہیں کہی میں نے؟"

"بات تو ٹھیک ہی کہی، پر اسے یہاں لے کیوں آئی؟"

"نہ لاتی تو کیا کرتی۔ بیمار ہے۔ کھانے پینے کو بھی گھر میں کچھ نہیں۔ پیسہ کوڑی بھی اس کے پاس نہیں۔" شاداں نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"توں چاہتا ہے مرجانے دیتی اسے؟"

وہ لالی سے اور قریب ہو گئی۔ اتنے قریب کہ لالی اس کے پتھر کے مانند سخت جسم کی چبھن محسوس کر سکتا تھا۔ شاداں رسان سے بولی۔ "تاجی کے پیٹ میں بچہ ہے۔ بالے ہی کا ہے۔ سچ جان اسی کا ہے۔" شاداں نے یہ بات ایسی لذت سے کہی کہ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔

لالی گم صم کھڑا رہا۔ اسے شاداں پر غصہ بھی آ رہا تھا اور اس سے ہمدردی بھی تھی۔ شاداں اس کی الجھن سے بے نیاز کہتی رہی۔ "جینیا یہیں ہو گا۔ بچے کو خود پالوں گی۔ اپنے ہی پاس رکھوں گی۔

تاجی بھی یہیں رہے گی۔ میرا کیا لے گی' اپنے نصیب کا کھائے گی۔"

"توسفنا تو نہیں دیکھ رہی؟" لالی نے مسکرا کر ٹوکا۔ "اب تو جاگ جا۔"

شاداں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ سب کرے گی کیسے؟"

شاداں نے شیشم کے پیڑ کے قریب پڑے ہوئے چھپر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ پتل دیکھ رہا ہے؟ ادھر آ۔" وہ لالی کا ہاتھ پکڑ کر چھپر کے پاس لے گئی اور اس کے نیچے بیٹھی ہوئی بھینس کی تھوتھنی محبت سے سہلاتے ہوئے بولی۔

"میری بوری دھرلی ہے۔ نیلی بار کی نج ہے۔ بھاڑو ہے۔ کٹے کے بنا صرف چارے پر صبح شام پکا اٹھاراں سیر دودھ دیتی ہے۔"

"پر تیرا اس سے کیا بنتا ہوگا؟"

"لے یہ کم ہے۔" شاداں نے چہک کر کہا۔ "ملک کی حویلی پر دودھی آتا ہے۔ روز کے روز دام چکا کر دودھ لے جاتا ہے۔ شام کو چاٹی میں دودھ بلو کر مکھن نکال لیتی ہوں۔ وہ بھی بک جاتا ہے۔" شاداں نے قدرے تامل کیا۔ "اور سن' ساڑی کی فصل پر پھٹی کی چنائی بھی کرتی ہوں۔ خاصی چوگی مل جاتی ہے۔ ملک کی حویلی میں بھی کام کاج کرتی ہوں۔ محنت کرنے کے معاملے میں زبردست اہری ہوں۔ پرواہ نہ کر لالی۔ فکر کی کوئی گل نہیں۔"

"جب اتنے بہت سے کام کرلیتی ہے تو ایک کام اور کر۔" لالی مسکرانے لگا۔ "مجھے پکڑوا دے۔ ایک اور نج آجائے گی۔"

"گالاں نہ نکال۔" وہ بگڑ کر بولی۔ "میں نے جتی تیرے ہاتھ میں دے دی تھی۔ جتی سے مار لے' پر ایسی گل بات نہ کہہ۔"

"مجھے پکڑوا دے گی تو تجھ سے کوئی گلہ نہ ہوگا۔ سچ کہہ رہا ہوں تجھے انعام ملے گا تو مجھے خوشی ہوگی۔" لالی کسی قدر جذباتی ہوگیا۔ "شاداں! توں بہت زوروں کی مٹیار ہے۔ مٹی جائے چندن بن کر مہکتی جائے۔ بالے تجھے پہچان ہی نہ سکا۔ وہ تو ایک نمبر......"

شاداں نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی' جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑلی۔ مگر وہ چونک پڑا۔ شاداں کا ہاتھ بالکل خالی تھا۔ لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"شاداں! تیرے ہاتھ کی چوڑیاں کہاں گئیں؟"



"توڑ ڈالیں۔ بالے جو مر گیا۔"

"تجھ پر ابھی تک اس کی محبت کا بھوت سوار ہے۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اس طرح اس اسیاپا کرے گی تو ضرور جیل جائے گی۔"

"نراض کیوں ہوتا ہے۔ تو چاہتا ہے' میں خوشی مناؤں' سلاری باندھوں' دانتوں پر دنداسا ملوں' نکھوں میں کاجل ڈالوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بتاتا ہوں' ابھی بتاتا ہوں۔" لالی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "ایسا کر پھانسی کے پھندے پر جا رلٹک جا۔" شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی ذرا دیر چپ رہ کر بولا۔ "بھیجے سے کام لے بھیجے ے۔ تیری تو مت ماری گئی ہے۔ آج نہیں تو کل چرچا ہوگا۔ بالے کہاں گیا؟ ایسی گل بات زیادہ دن چھپی نہیں رہتی۔ خون سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ توں صاف پکڑی جائے گی۔ کچھ تو سوچ۔ سب بے کیا کہیں گے۔ مرنا ہی ہے تو ذلیل اور بدنام ہو کر کیوں مرنا چاہتی ہے؟" شاداں گم صم کھڑی اس باتیں سنتی رہی۔

لالی نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا' شاداں کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لے' کل جا کر ڑیاں پہن لینا۔ جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔" لالی نے نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ کر ہاتھ بند کر دیا۔ سمجھ گئی نا میری بات کا مطلب؟"

"سمجھ گئی۔" شاداں نے سر ہلایا اور نوٹ ملگجے لاچے کے ڈب میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بتا ج آیا کیسے؟" پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "کپڑوں کے لیے آیا ہوگا' ہائے میں تو بھول ہی گئی۔ جس رات یا ہے' اس کے بعد تو دو روز تک تھانے دار نے پچھ پچھ کر میرا مغز خراب کر دیا۔"

"کیا بتایا توں نے؟"

"میں نے کہہ دیا' دونوں بالے سے ملنے آئے تھے۔ اس کا دوست بتاتے تھے۔ میں نے خوب ئے بہائے۔ رو رو کر کہا' وہ مجھے چھری دکھا کر ڈراتے تھے۔ مار دینے کو کہتے تھے۔"

"توں تو ایک دم فروٹ نکلی۔ دیکھنے میں ایسی نہیں لگتی۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "بالے کے ے میں بھی پوچھتے تھے؟"

"پوچھتے تھے۔" شاداں نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "میں نے وہی بات کہی جو تاجی سے تھی۔ کوئی غلط بات تو نہیں کہی میں نے؟"

"ابھی تک تو ٹھیک ہی جا رہی ہے۔"

"پر تجھ سے ڈر لگتا ہے تیرا کیا بھروسا۔ چوراچکا جو ٹھیرا۔"

لالی اس کی چوٹ اس طرح سہ گیا جیسے گونگا چپ چاپ کڑوی دوا نگل جاتا ہے۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ شاداں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”آزمالے۔ لے چل ملک کے پاس پکڑوا دے مجھے‘ بھاگوں گا نہیں۔ بھاگ جاؤں تو پیشاب سے مونچھ منڈوا دینا۔“ اس نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

”ایک رات تیرے پنڈ آؤں گا اور تجھے صاف اڑا لے جاؤں گا۔“

شاداں ایکدم بپھر گئی۔ ”تو اپنے کنجرپن سے باز نہیں آئے گا۔“ وہ غصے سے لالی کو گھورنے لگی۔ ”مرجاؤں گی۔ پر تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ ہرگز نہیں جاؤں گی۔“

لالی ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ ”توں ضرور چلے گی۔ میرے سوا تجھے کوئی بھگا کر نہیں لے جاسکتا۔ شرط بدلے مجھ سے۔“ اس نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ”آ ہاتھ مار۔“

شاداں نے تیوری پر بل ڈال کر کچھ کہنا چاہا۔ عین اس وقت کمرے کے اندر آہستہ آہستہ کھانسنے کی آواز ابھری۔ شاداں نے سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا۔ گردن جھکا کر سرگوشی کی۔

”لگتا ہے‘ تاجی جاگ گئی۔ تو اب ٹرجا۔“

لالی نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے والے تھے۔ چاند ڈوب گیا تھا۔ اندھیرے میں صبح کا ہلکا ہلکا اجالا ابھر رہا تھا۔

اس نے گھبرا کر کہا۔ ”ہاں اب مجھے چلنا چاہیے۔ صبح ہونے والی ہے۔ توں کمیس اور دھوتی ضرور لے آنا۔ میں بعد میں آؤں گا۔“ وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا۔

”ٹھیر میں بھی تیرے سنگ چلوں گی۔“

لالی آنکھ مار کر بولا۔ ”رہنے دے‘ ابھی وہ رات نہیں آئی۔“

”بکواس نہ کر۔“ شاداں نے اسے ڈانٹا۔ ”تیرا ایسے جانا ٹھیک نہیں۔ چل میں تجھے رڑ کے نکڑ تک چھوڑ آؤں۔ بوری کو بھی ساتھ لے چلوں گی۔ کوئی پوچھے گا تو کہہ دوں گی۔ بیمار ہے‘ اسے موک لگ گیا ہے۔ سلوتری کو دکھانے ساتھ والے چک لے جارہی ہوں۔“

لالی جاتے جاتے رک گیا اور چوکنا نظروں سے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ مگر کھانسی اب بند ہو چکی تھی۔ شاداں نے بھینس کھولی۔ اس کی گردن میں موٹی رسی کا ڈابا ڈالا اور اسے ہنکاتی ہوئی لالی کے پاس پہنچی۔ دونوں گھر سے نکل کر گلی میں آگئے۔ شاداں نے دروازہ بند کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ ہر طرف دودھیا دھند پھیلتی جارہی تھی۔ گھروں سے رک رک کر



مویشیوں کی اڑاٹ‘ بوڑھوں کی کھانسی اور بچوں کے رونے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

شاداں نے ان آوازوں سے پریشان ہو کر کہا۔ ”جھیتی کر‘ بول برالا شروع ہو گیا۔“

لالی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تیز قدم اٹھا کر چلنے لگا۔ دونوں ویران راستوں سے گزرتے‘ درختوں کی آڑ لیتے آگے بڑھنے لگے۔ بھینس ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ شاداں کبھی اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتی کبھی لاڈ سے تھوتھنی سہلاتی اور اسے ہنکانے کے لیے رک رک کر منہ سے ”تت تت“ کی آواز نکالتی۔

لالی صبح کا پھیلتا ہوا اجالا دیکھ کر اور زیادہ تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے جوتوں کی تیز رگڑ سے خاموشی میں آہٹ ابھر رہی تھی۔

شاداں نے اسے ٹوکا۔ ”وے لالی! دھیرے چل۔ دگڑ دگڑ نہ کر۔“

لالی نے پلٹ کر شاداں کو دیکھا‘ اپنی رفتار سست کر دی اور خاموشی سے شاداں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا جاتا۔ دونوں گاؤں سے نکل کر باہر آگئے۔ اب رڑ شروع ہو گیا تھا۔ رڑ کے ایک طرف ربیع کی فصلیں تیار کھڑی تھیں۔ صبح کی نرم نرم ہوا کے جھونکوں سے گندم کی بالیاں جھومتیں اور خشک پتوں سے سرسراہٹیں ابھرتیں۔ رڑ اس وقت سنسان تھا۔ اس کی زمین سخت اور ہموار تھی۔ کہیں کہیں بارش سے زمین میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ گاؤں کے سامنے کا یہ میدان کھیل کود کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر صبح کے سناٹے میں چٹیل نظر آتا تھا۔

دونوں کھیتوں کے ساتھ ساتھ رڑ سے گزرتے رہے۔ شاداں کے بال بپھری ہوا کے جھونکوں سے اڑ اڑ کر اس کے صندلیں چہرے پر بکھر جاتے۔ وہ ہر بار انھیں سمیٹ کر پیچھے کرتی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ وہ گردن اونچی کیے چل رہی تھی۔ لالی چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس کے جسم کے دائرے اور پیچ و خم دیکھتا رہا۔ اب نہ وہ خوف زدہ تھا نہ بے چین۔ شاداں کی پناہ میں وہ خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا اور شاداں ملگجے لاچے میں اپنے بھاری کولھے گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلاتی آگے آگے چل رہی تھی۔ وہ اپنی اوپر اٹھی ہوئی گردن کو ہلکا سا خم دے کر ادھر ادھر دیکھتی جاتی۔ ایسے جیسے کتیا اپنے پلے کی رکھوالی کرتے وقت چوکس نظر آتی ہے۔ سویرا بلندیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔

ہر چیز خواب کے مانند دھندلی اور خاموش نظر آرہی تھی۔ یکایک اس خاموشی میں دور سے گھوڑے کے دوڑنے کی آواز ابھری۔

شاداں گھبرا کر بولی۔ "ہائے میں مرگئی۔ یہ تو ملک جان پڑتا ہے۔"

لالی بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں رک گئے۔ دیکھتے دیکھتے کھڑی فصلوں کی آڑ سے نمبردار ملک اللہ نواز خان نکلا اور عین ان کے سامنے آگیا۔ وہ اپنی سفید گھوڑی پر مرغ کی طرح اکڑا بیٹھا تھا۔ آگے بندوق رکھی تھی۔ دونوں کو دیکھتے ہی اس نے گھوڑی کی راس زور سے کھینچی اور شاداں سے مخاطب ہوا۔ "اتنے سویرے کہاں چلی؟" اس نے شاداں کے پیچھے کھڑے ہوئے لالی کو مشتبہ نظروں سے دیکھا اور اونچی آواز سے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟" شاداں نے کچھ کہنا چاہا مگر ملک پہلے ہی بول پڑا۔ "یہ وہی جیل سے بھاگا ہوا کیدی تو نہیں ہے؟ وہی جان پڑتا ہے۔" ملک نے غصے سے ڈپٹ کر دریافت کیا۔

"ٹھیک ٹھیک بتا' کون ہے یہ؟"

شاداں کچھ نہ بتا سکی۔ اس کی آنکھیں خوف اور گھبراہٹ سے پھٹی ہوئی تھیں' ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ بالکل ہونق نظر آرہی تھی۔ شاداں کو خاموش پا کر ملک زور سے چیخا۔ "آج یہ نکل کر نہیں جائے گا۔" اس نے جھٹ سامنے رکھی ہوئی بندوق اٹھائی اور لالی کو للکارا۔

"آگے بڑھا تو گولی سے اڑا دوں گا۔"

"ملک جی!" شاداں اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ لیکن ملک اس کی التجا سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ فلمی ولن کی طرح زور سے دہاڑا۔

"ہٹ جا میرے سامنے سے۔"

لالی خاموش کھڑا تھا۔ ملک بندوق تانے اسے خون خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی گھنی مونچھیں غصے سے ابابیل کے پروں کی مانند پھڑپھڑا رہی تھیں۔ اس کی کلف وار پگ کا اونچا طرہ ہوا سے لہرا رہا تھا۔

شاداں ابھی تک لالی اور ملک کے درمیان دیوار بنی کھڑی تھی۔ اچانک لالی نے پیچھے سے شاداں کی کمر پر اس زور سے لات ماری کہ وہ منہ کے بل زمین پر گری۔ ملک کی نظریں بھٹک گئیں۔ لالی جھٹ قریب کھڑی ہوئی بھینس کے اوٹ میں جھک کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ ملک نشانہ باندھتے ہوئے چلایا۔

"باہر نکل' نہیں تو میں فائر کھول دوں گا۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جھپاک سے چھری نکالی اور بھینس کی ٹانگوں کے بیچ سے ملک کی جانب تیزی سے پھینکی۔ چھری گھوڑی کی ایک ٹانگ چیرتی ہوئی گوشت میں پیوست ہو گئی۔ گھوڑی



نے ہنہنا کر دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا دیں۔ ملک بے قابو ہو گیا۔ اس نے گھبراہٹ میں ٹریگر دبا دیا۔ گولی چلی اور چیختی ہوئی بھینس کے پیٹ میں اتر گئی۔ سب کچھ پلک جھپکتے ہوا۔ ملک کی گھوڑی ہنہناتی ہوئی سرپٹ بھاگی۔

ملک اللہ نواز پیٹھ پر بیٹھا اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر گھوڑی رکنا تھی نہ رکی۔ دوڑتی ہوئی دور نکل گئی۔ بندوق بھی ملک کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔

لالی نے تیزی سے دوڑ کر بندوق اٹھائی۔ اس میں ابھی تک کارتوس موجود تھا۔ وہ بندوق اٹھا کر پلٹا۔

شاداں کی بھینس زور زور سے ڈکرائی۔ چند قدم بھاگی پھر لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اس کے پیٹ سے خون نکل کر دور تک زمین پر پھیل گیا۔ بھینس بے بسی سے گردن ہلا کر زمین پر منہ رگڑنے لگی۔ شاداں دوڑ کر زخمی بھینس سے دیوانوں کی طرح لپٹ گئی۔ اس کے کپڑے خون سے لت پت ہو گئے۔ دونوں آنکھیں اشکوں سے آبشار بن گئیں۔ لالی بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا بھینس کے قریب پہنچ گیا۔

شاداں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اور سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "توں گیا نہیں؟"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بت بنا بھینس کو تڑپتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ "شاداں! تیری بوری مر رہی ہے۔"

"دیکھ رہی ہوں' پر توں یہاں سے ٹر جا۔"

لالی چپ کھڑا رہا۔ اس کی نظریں بھینس کے پیٹ سے ابلتے ہوئے لال لال خون پر جمی تھیں۔ یکایک شاداں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ غصے سے بولی۔ "کھڑا کیوں ہے؟ جا یہاں سے۔ ملک اپنے کرندوں کو لے کر آتا ہی ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ لالی پر جھپٹی اور اسے زور سے دھکا دیا۔

"جا' بجھیتی نال ٹر جا۔"

لالی لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا اور مڑ مڑ کر شاداں کو اور اس کی تڑپتی ہوئی بھینس کو دیکھتا رہا۔ مگر جب اس راستے کی جانب بڑھا جدھر سے گاؤں میں داخل ہوا تھا تو اس نے دیکھا' کئی ہالی' ہل پنجالی لیے سامنے کھڑے ہیں اور اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ لالی کی ان پر نظر پڑی تو وہ ٹھٹکا۔ اس نے ہاتھ میں دبی ہوئی بندوق اٹھائی اور اس کی نال ان کی طرف کر دی۔ وہ خوف زدہ ہو کر پلٹے اور ہل پنجالی چھوڑ چھاڑ بگ ٹٹ بھاگے۔

لالی نے ان کی سراسیمگی سے فائدہ اٹھایا اور جھٹ کھیتوں میں داخل ہو کر ایک پگڈنڈی پر تیزی

سے دوڑنے لگا۔ اب اسے دور سے ملی جلی انسانی آوازوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ آوازیں اسی سمت سے آرہی تھیں جہاں شاداں کی زخمی بھینس دم توڑ رہی تھی۔



# ۷

پڑیلی میں دور دور تک جنگلی جھاڑیاں اور اونچی اونچی گھاس تھی۔ زمین خشک اور ریتلی تھی۔ صبح کا اجالا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ چڑیوں کے غول بھراتا مار کر جھاڑیوں سے نکلتے اور چہچہاتے ہوئے فضا میں بکھر جاتے۔ لالی نے بندوق گھنی جھاڑیوں کے نیچے ایک گڑھے میں ڈال دی۔ اسے خشک پتوں اور پتھروں سے چھپا دیا۔ اب لالی کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خودرو پودے روندتا، جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس کے درمیان سے راستہ بناتا، جدھر منہ اٹھا، اسی طرف بڑھتا چلا گیا۔

جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس سے بھری ہوئی پڑیلی ختم ہوئی تو اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سامنے سڑک ہے۔ سڑک صبح کے اجالے میں سانپ کی طرح بل کھاتی دور تک چلی گئی تھی۔ سڑک نیم پختہ تھی اور زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ سڑک کے دونوں جانب بنجر اور غیر مزروعہ علاقہ تھا۔ کہیں کہیں مٹی اور ریت کے تودے سر اٹھائے کھڑے تھے۔

اس نے دو ڈھائی میل راستہ طے کیا تو دور سے ہریالی نظر آئی۔ آگے بڑھا تو کھیتوں اور درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی نہر ملی۔ سورج نکل آیا تھا۔ نہر کا پانی ہلکی ہلکی دھوپ میں جھلملا رہا تھا۔ سڑک نہر کے اوپر سے گزرتی تھی۔

لالی نے نہر دیکھی تو بے قرار ہو کر نیچے اترا۔ نہر کے قریب گیا۔ اسے شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چلو بھر بھر کر پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا اور نہر کے کنارے لیٹ گیا۔ نرم اور نیم
لیٹ کر بڑی فرحت محسوس ہوئی۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ ٹھنڈے جھونکے آئے تو

نیند سے آنکھیں بند ہونے لگیں۔ مگر وہ سویا نہیں۔ ذرا دیر سستا کر اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھر سڑک پر آگیا۔ اس نے پل عبور کیا اور آگے بڑھنے لگا۔

اب دن نکل آیا تھا۔ اسے کسی ایسے ٹھکانے کی تلاش تھی جہاں روپوش ہو کر دن گزارا جا سکے۔ سڑک کے دونوں طرف کھیتوں کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ ان کے پیچھے گاؤں کے مکانات نظر آرہے تھے۔ کچھ ہی دور آگے بڑھا تھا کہ ایک لاری شور مچاتی، دھول اڑاتی سامنے سے آتی نظر آئی۔ وہ سڑک سے اتر کر نشیب میں آگیا۔ لاری تیزی سے دوڑتی ہوئی گزر گئی۔ لالی پھر سڑک پر آگیا۔

فرلانگ سوا فرلانگ فاصلہ طے کیا تو اسے سڑک سے ایک کچا راستہ گاؤں کی طرف جاتا نظر آیا۔ یہی کچا راستہ سڑک کے دوسری طرف بھی جاتا تھا۔ مگر اس طرف لاگھا تھا۔ جگہ جگہ ریت کے ٹیلے تھے اور ان کے درمیان گندم اور جو کے پودے لہلہا رہے تھے۔ چنے اور سرسوں کے کھیت بھی تھے۔ ہوا زور سے چلتی تو سرسوں کے پیلے پیلے پھول کسی الھڑ مٹیار کے بسنتی آنچل کی طرح لہراتے۔ ایک سانڈنی سوار ٹیلوں اور کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر گرد کے بگولے اڑاتا دور جاتا نظر آرہا تھا۔

لالی مخمصے میں پڑگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کدھر جائے اور کون سا راستہ اختیار کرے؟ وہ خاموش کھڑا سانڈنی سوار کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسی اثنا میں اسے اپنی پشت پر چاپ سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا کہ ایک شخص آہستہ آہستہ اسی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ وہ ادھیڑ آدمی تھا۔ اس کا لباس اجلا تھا۔ آنکھوں پر عینک تھی۔ سر پر سفید پگڑی تھی۔ ڈاڑھی کے بال کھچڑی تھے۔ قریب آکر اس نے لالی سے پوچھا۔ "کیا تم لاری سے اترے ہو؟" لالی بات کا جواب فوراً نہ دے سکا۔

اسے خاموش پاکر وہ شخص مسکرایا۔ "مجھے بھی اسی لاری سے جانا تھا۔ پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ لاری نکل گئی۔"

"ابھی ابھی گئی ہے جی۔"

"یہ لاری تو کوٹ لنگر سے آرہی تھی۔ تم بھی وہیں سے آرہے ہو؟" لالی کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خود ہی بولا۔ "لگتا ہے، تم غلط جگہ آگئے۔"

لالی اس کی بات کا جواب نہیں دے سکا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کس مقام پر کھڑا ہے۔ نہ اسے آگے کا پتہ تھا نہ پیچھے کا۔ وہ پہلے کبھی اس طرف آیا ہی نہ تھا۔



وہ شخص بولا۔ "تم آگے چلے آئے، تمہیں پیچھے اترنا تھا۔ سفر میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ اسی لاری سے میں پہلی پہاڑ جا رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ جھوک آگئی۔ آنکھ کھلی تو دیپال پور میں تھا۔ پہلی پہاڑ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ لمحے بھر کو رکا۔ "مگر واپسی کے لیے تمہیں شام سے پہلے کوئی لاری نہیں ملے گی۔ اس سڑک پر پچھلی بارشوں کے بعد بہت کم لاریاں چلتی ہیں۔ سڑک ٹوٹ پھوٹ کر بہت خراب ہوگئی ہے۔ پہلی لاری صبح صبح نکل جاتی ہے۔"

لالی کو وہ بھلا آدمی لگا۔ اس کے لہجے میں نرمی اور شفقت تھی۔ مگر لالی خاموش رہا۔ وہ ابھی تک بھونچکا تھا اور خود کو ذہنی طور پر آمادہ نہیں کرسکا تھا کہ اس شخص کے ساتھ کس طرح کا رویّہ اختیار کرے۔ یکسر نظرانداز کردے یا اس کے جذبہ ہمدردی سے فائدہ اٹھا کر راستہ دریافت کرنے کی کوشش کرے۔ جب لالی نے اس کی باتوں کے جواب میں کچھ نہ کہا اور گم صم کھڑا رہا تو وہ شخص بولا۔

"تم کس سوچ میں پڑگئے؟"

آخر لالی کو بولنا پڑا۔ اس نے بات بنائی۔ "بات یہ ہے جی! میں یہاں دوسری بار آیا ہوں۔ کئی سال پہلے آیا تھا۔ رات کا وکھت تھا۔ یاد پڑتا ہے، اسی جگہ اترا تھا۔"

"لاری سے آئے تھے یا تانگے سے؟"

"آیا تو لاری ہی سے تھا۔" لالی نے گاؤں کی طرف نظر ڈالی جس کے مکانات درختوں کے پیچھے سے نظر آرہے تھے۔ اس نے پلٹ کر سڑک کے اس پار لاگھے کی جانب دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ "سمجھ نہیں آتی، یہی جگہ تھی یا کوئی اور۔"

"کوئی بات نہیں۔" اس شخص نے درختوں کی سمت ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ رہا اپنا چک۔ تم چاہو تو شام تک میرے ساتھ ٹھیر سکتے ہو۔ یہاں دھوپ میں کھڑے کھڑے پریشان ہوگے۔ آؤ میرے ساتھ۔ جہاں تمہیں جانا ہے پہنچا دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

لالی انکار نہیں کرسکا۔ چپ چاپ اس کے ہم راہ چلنے لگا۔ دونوں کچھ دور کچے راستے پر چلتے رہے۔ وہ شخص ایک پہے کی جانب مڑگیا۔ لالی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ کھیتوں کے درمیان سے گزرتے رہے اور جب پہا طے کرکے باہر آئے تو گاؤں شروع ہوچکا تھا۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے۔ ایک دو منزلہ پختہ مکان کے سامنے ٹھہر کر اس شخص نے کہا۔

"لوجی! یہ رہی اپنی ماڑی۔ یہ گھر کا اگواڑہ ہے۔ ساتھ ہی ڈیرا ہے۔ بیٹھک بھی اسی طرف ہے۔ ادھر ہی چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر گپ شپ ہوگی۔"

وہ مکان کے ساتھ ساتھ چلا اور سیدھے ہاتھ کو مڑ گیا۔ مکان کے آگے آم اور نیم کے پیڑ تھے۔ ان کے نیچے چارپائی بچھی تھی۔ اس شخص نے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں بیٹھو۔ میں ذرا دیر میں آتا ہوں۔" وہ جس طرف سے آیا تھا اسی طرف واپس چلا گیا۔

لالی چارپائی پر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے سامنے مکان کا جو حصہ تھا' اس کے آگے کھلا ہوا نیچی چھت کا برآمدہ تھا۔ برآمدے میں ایک دروازہ کھلتا تھا اور اس کے ساتھ ہی کھڑکی بھی تھی۔ برآمدہ اس وقت خالی تھا۔

مکان آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اس کے گردو نواح میں صرف چند کچے مکانات تھے۔ لالی نے گاؤں صرف ایک نظر دیکھا۔ اس میں کئی اور بھی دو منزلہ مکانات تھے۔ گاؤں اپنی آبادی اور رونق کے اعتبار سے جہانگیرہ سے بھی بڑا تھا۔ مکان دیکھ کر لالی کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا میزبان گاؤں کا کھاتا پیتا آدمی ہے۔ مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

درختوں کے نیچے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لالی بہت تھکا ہوا تھا۔ وہاں بیٹھ کر اسے سکون ملا۔ اس نے دل میں کہا کہ دن گزارنے کے لیے اچھا ٹھکانا مل گیا۔ شام کو چلا جاؤں گا۔ موقع ملا تو شاداں سے مل لوں گا۔ پچھلی رات کے بارے میں معلوم کروں گا کہ بعد میں اس پر کیا بیتی؟ اگر وہ کپڑے لے آئی تو آج ہی رات رحیم داد کو جیل کی وردی سے چھٹکارا دلا دوں گا۔ پھر آگے جانے کا پروگرام بنے گا۔ مگر شاداں کے گھر جاتے ہوئے اسے خطرے کا بھی احساس ہوا۔ اتنے سنگین واقعے کے بعد گاؤں بھر میں کھلبلی مچ گئی ہو گی۔ ملک اللہ نواز بہت غصے میں ہو گا۔ ہو سکتا ہے' اس نے پولیس کو بھی بلایا ہو۔ تھانیدار اس کا بھائی ہے۔

لیکن شاداں کے گاؤں کی طرف جانا اس کے لیے ضروری تھا۔ رحیم داد کے پاس پہنچنے کا راستہ اسی طرف سے جاتا تھا۔ کوئی اور راستہ لالی جانتا بھی نہیں تھا۔ وہ اسی ادھیڑبن میں گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

اس نے نظریں اٹھائیں تو دو کانسٹیبل سامنے سے آتے نظر آئے۔ لالی لرز کر رہ گیا۔ اس نے سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور بھاگ کر کسی گلی میں گھس جانے کا ارادہ کیا۔ عین اس وقت برآمدے کی طرف سے آواز آئی۔

"ادھر بیٹھک میں آ جاؤ۔ کچھ کھا پی لو۔ تم نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہو گا۔"

لالی نے دیکھا' برآمدے میں اس کا میزبان دروازہ کھولے کھڑا ہے۔ لالی تو اس وقت چاہتا بھی یہی تھا۔ فوراً اٹھا' برآمدے میں پہنچا اور بیٹھک کے اندر چلا گیا۔ بیٹھک صاف ستھری تھی۔ ایک



طرف اونچے پایوں کا پلنگ تھا۔ اس پر اجلا بستر تھا۔ فرش پر دری بچھی تھی۔ مونڈھے تھے۔ دو تین کرسیاں تھیں اور ایک میز بھی تھی۔ میز پر لیمپ رکھا تھا۔ اس کے قریب ہی چند پرانے اخبار پڑے تھے۔ دیواروں پر رنگین طغرے لگے تھے۔ ایک آئینہ بھی میز کے پاس ہی دیوار پر آویزاں تھا۔ اس شخص نے لالی کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک مونڈھا کھینچ کر بولا۔

"میں تو جی اس پر بیٹھوں گا۔ مجھے تو اسی پر بیٹھنے میں آرام ملتا ہے۔"

لالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے جھجکا۔ میزبان نے اصرار کر کے اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ ذرا دیر بعد ایک عورت دوپٹے کے آنچل سے سر ڈھانکتی ہوئی اس دروازے سے کمرے میں داخل ہوئی جو گھر کے اندر کھلتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں حقہ تھا۔ اس نے حقہ مونڈھے کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اس شخص نے حقے کی نے سنبھالتے ہوئے عورت سے کہا۔

"بھاگ بھری! کھانے کو کچھ روٹی شوٹی لا۔ جلدی کر۔"

"ابھی لائی جی۔" یہ کہتی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔

وہ شخص چپ بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہا۔ ذرا دیر بعد بھاگ بھری لوٹے میں پانی لائی۔ لالی نے باہر جا کر منہ دھویا' پھر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ وہ شخص لالی سے مخاطب ہوا۔ "برخوردار! تم سوچتے ہو گے۔ میں کون ہوں؟" وہ زیر لب مسکرایا۔ "میں مشرقی پنجاب کا مہاجر ہوں۔ میرا نام فیض محمد ہے۔ مگر لوگ مجھے ماسٹر جی کے نام سے جانتے ہیں۔ بات یہ ہے برخوردار کہ میں پہلے سکول ماسٹر تھا۔ جب پاکستان بنا تو میں بھوانی کے پرائمری سکول میں پڑھاتا تھا۔ ویسے میں رہنے والا سونی پت کا ہوں۔ فسادات اور بلوے ہوئے تو لٹ پٹ کر پاکستان آ گیا۔ کچھ دن ٹھوکریں کھاتا رہا' پھر پاک پتن میں سکول ماسٹر لگ گیا۔ سونی پت میں اپنی کچھ زرعی اراضی تھی۔ اس کا کلیم داخل کیا۔ بھاگ دوڑ کی تو کلیم منظور ہو گیا اور اس چک میں الاٹمنٹ بھی مل گیا۔ میں سکول ماسٹری چھوڑ چھاڑ یہاں آ گیا۔ اب غلہ منڈی میں آڑھت کا کاروبار بھی کرتا ہوں۔ چار مربعے کے لگ بھگ زمین ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ عزت کے ساتھ گزر رہی ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "برخوردار! تم نے اپنے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا؟"

لالی صاف جھوٹ بول گیا۔ "سرفراز۔ جی میرا نام محمد سرفراز ہے۔"

"اچھا' اچھا۔" وہ مسکرایا۔ "ادھر کیسے آنا ہوا؟"

"ایک دوست کے پاس آیا تھا۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"جی وہ۔" لالی ذرا سا الجھا۔ "اس کا نام رحمت ہے۔"

"وہی تو نہیں، جو محمد حنیف پٹواری کا پتر ہے؟"

"مجھے اس کے پیو کا نام تو ملوم نہیں جی۔"

"اگر یہ وہی رحمت ہے تو وہ اب اس چک میں نہیں رہتا۔" فیض محمد نے حقے کا کش لگا کر کہا۔ "اس نے ریلوے میں نوکری کرلی ہے۔ کبھی کبھار یہاں آتا ہے۔"

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا، اسی اثناء میں بھاگ بھری ناشتا لے کر آگئی۔ اس نے دری پر دسترخوان بچھایا اور ناشتے کا سامان اس پر رکھ دیا۔ ناشتے میں پراٹھے تھے، تلے ہوئے انڈے تھے، مکھن تھا اور چائے بھی تھی۔ ماسٹرجی نے لالی کو مخاطب کیا۔ "لو برخوردار! ناشتا کرلو۔" وہ اٹھا اور دسترخوان کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ لالی بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"میں نے تو صبح ہی ناشتا کرلیا تھا۔ تمہارا ساتھ دینے کے لیے صرف ایک پیالی چائے پیوں گا۔ تم میرا خیال نہ کرنا۔ اطمینان سے کھاؤ۔ کسی تکلف وکلف کی مطلق ضرورت نہیں۔"

لالی خاموشی سے بیٹھا ناشتا کرتا رہا اور فیض محمد اسے اپنے کاروبار اور زمیں داری کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں سناتا رہا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر لالی پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ فیض محمد نے اخبار اٹھایا اور اسے پڑھنے لگا۔ بھاگ بھری دسترخوان اور برتن اٹھا کر لے گئی۔ فیض محمد نے اخبار پڑھتے پڑھتے سر اٹھایا اور لالی کو مخاطب کیا۔

"لو جی! یہ تو اپنے ہی ضلعے کی خبر ہے۔ دو قیدی منٹگمری جیل سے نکل بھاگے۔ ہفتے بھر سے اوپر ہوگیا۔ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں لگے۔ دو ہزار کا انعام بھی مقرر ہوا۔ تب بھی نہ پکڑے گئے۔" وہ مسکرایا۔ "پکڑے بھی کیسے جائیں۔ سب ملی بھگت ہے۔"

لالی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ فیض محمد نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ "سرفراز! تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ سو جاؤ۔" مگر دوسرے ہی لمحے اس نے لالی کو سونے سے منع کردیا۔ "بھئی! پہلے حجامت بنوالو۔ بہت بڑھ گئی ہے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "میں نائی کو بھیجتا ہوں۔ تم حجامت بنوالو۔ پچھواڑے مویشیوں کا کڑا ہے۔ وہاں کنواں بھی ہے۔ جی چاہے تو نہالو۔ پھر اطمینان سے سوجانا۔"

فیض محمد کے اٹھتے ہی لالی بھی احتراماً کھڑا ہوگیا۔ فیض محمد گھر کے اندر جانے والے دروازے کی جانب بڑھا۔ جاتے جاتے ٹھٹک کر گویا ہوا۔

"میں گھوڑی پر بیٹھ کر منڈی چلا جاؤں گا۔ ویسے سائیکل بھی ہے۔ مگر مجھے گھوڑی کی سواری پسند



ہے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے واپس آجاؤں گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو کنڈی کھٹکھٹا کر بھاگ بھری کو بلا لینا۔ ادھر ڈیرے پر بھی کئی کمی اور نوکر چاکر موجود ہیں۔"

وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ لالی اس کے جانے کے بعد بھی خوف زدہ رہا۔ طرح طرح کے اندیشے پریشان کرنے لگے۔ باہر جانا خطرناک تھا اور کمرے میں بیٹھا رہنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ خاموش بیٹھا آنے والے خطرے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر خطرہ نہیں آیا۔ نائی آگیا۔ اس نے لالی کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی صاف کی۔ مونچھیں کاٹ چھانٹ کر درست کیں اور سر کے بال بھی تراش دیئے۔ اس نے حجامت بناتے ہوئے لالی سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ مگر لالی نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ خاموش بیٹھا رہا۔ نائی پھر بھی خاموش نہ رہا۔ گاؤں کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں بتاتا رہا۔

حجامت بنانے کے بعد نائی چلا گیا۔ لیکن لالی سو نہ سکا۔ وہ نہانے کے لیے کنوئیں پر بھی نہیں گیا۔ بستر پر لیٹ گیا۔ مگر بستر پر لیٹے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ بھاگ بھری کھانا لے کر آگئی۔ کھانا کسی قدر پر تکلف اور خوش ذائقہ تھا۔ لالی نے بھوک نہ ہونے کے باوجود کھانا کھایا۔ اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور تھکا ہوا بھی تھا۔ لیٹتے ہی ایسی گہری نیند سویا کہ چراغ جلے آنکھ کھلی۔

اس نے دیکھا، لیمپ روشن ہے۔ فیض محمد عرف ماسٹرجی سامنے مونڈھے پر بیٹھا ہے۔ اسے بیدار دیکھ کر فیض محمد نے کہا۔ "برخوردار! تمہاری لاری تو نکل گئی۔ میں دن ڈھلے ہی واپس آگیا تھا۔ لیکن تم اس قدر گہری نیند سو رہے تھے کہ جگانے کو جی نہ چاہا۔" اس نے تامل کیا۔ "کوئی ضروری کام تو نہیں تھا؟"

"نہیں۔" لالی نے بہت مختصر جواب دیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تب تو ٹھیک ہے۔ ویسے میں نے معلوم کیا تھا۔ رحمت تین روز بعد آرہا ہے، کیوں نہ اس کا انتظار کرلو؟"

لالی پریشان ہوگیا۔ وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکا۔ بات یہ تھی کہ وہ سرے سے کسی رحمت کو جانتا ہی نہ تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس وقت اس کی زبان پر یہی نام آیا، ورنہ وہ کوئی دوسرا نام بتا دیتا۔ مگر اب رحمت اس کے لیے زحمت بن گیا تھا۔ اس مسئلے کا واحد حل اس کی سمجھ میں یہ آیا کہ رحمت کے پہنچنے سے پہلے ہی گاؤں سے نکل جائے۔ ساتھ ہی اسے رحیم داد کا بھی رہ رہ کر خیال آرہا تھا۔ رحیم داد اکیلا تھا اور لالی نے رات تک اس کے پاس پہنچنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ لالی کو

خاموش پا کر ماسٹر جی نے کہا۔

"برخوردار! تم کس سوچ میں پڑ گئے؟ اب آئے ہو تو رحمت سے مل کر ہی جانا۔ تین ہی دن کی تو بات ہے۔ تکلف چھوڑو۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب تک چاہو، ٹھیرو۔"

"صبح نہیں تو کل شام ضرور چلا جاؤں گا۔ میں زیادہ دیر نہیں ٹھیر سکتا جی!"

"جیسی تمہاری مرضی۔ ویسے میں تو یہی کہوں گا، تمہیں رحمت سے مل کر جانا چاہیے۔" فیض محمد نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "بھئی برا نہ ماننا۔ سنا ہے، رحمت کا چال چلن کچھ ٹھیک نہیں۔ بازاری عورتوں کے چکر میں پڑ گیا ہے۔"

"مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں تو جی اسے بہت دنوں سے نہیں ملا۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ نوکری کے بعد اس نے پر پرزے نکالے ہیں۔ برخوردار! سچ پوچھو تو لڑکے کو جوان ہوتے ہی شادی کی زنجیر میں باندھ دینا چاہیے۔ زمانہ بہت برا ہے۔ محمد حنیف نے یہی غلطی کی۔ میں نے سمجھایا بھی مگر میری بات سن کر ٹال گیا۔ کہنے لگا، لڑکے کی مرضی نہیں ہے۔ لے بھئی اب دیکھ لڑکے کی مرضی۔" فیض محمد کھل کر مسکرایا۔ اس نے لالی کو غور سے دیکھا۔

"تم نے تو اپنا گھر بسا لیا ہوگا؟"

"نہیں۔" لالی معصوم صورت بنا کر بولا۔ "بات یہ ہے جی! ماں اور پیو تو اپنے ہیں نہیں۔ بھائی بھین بھی نہیں۔ بالکل اکیلا ہوں۔ نوکری چاکری بھی نہیں۔ رحمت کے پاس اسی لیے آیا تھا۔"

لالی کی بات سن کر فیض محمد نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ کچھ دیر سر جھکائے سوچتا رہا۔ لالی نے اس کا یہ رویہ دیکھا تو دل ہی دل میں پچھتایا کہ اس نے ماسٹر جی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ناحق ایسی بات کہی۔ ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنی پریشان حالی بتا کر خود کو ماسٹر جی کی نظروں میں گرا لیا۔ ذرا دیر بعد فیض محمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کھانا آ جائے گا۔ تم اکیلے ہی کھا لینا۔ میں رات کا کھانا نہیں کھاتا، عشاء کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھتا ہوں۔ یہ میرا روز مرہ کا معمول ہے۔ اب تم سے صبح ملاقات ہوگی۔ فجر کی اذان سے پہلے میرے لیے حجرے سے باہر نکلنے کا حکم نہیں۔" فیض محمد دروازے کی جانب بڑھا۔

"کھڑکی کھول دینا۔ بہت اچھی ہوا آتی ہے۔ کمرے میں گرمی ہو تو باہر چارپائی پڑی ہے۔ ڈیرے سے رحمان کو بلا لینا۔ بستر لگا دے گا۔"

"نہیں جی! یہیں ٹھیک ہے۔ میں کھڑکی کھول لوں گا۔ فکر نہ کریں۔"



"تم دن بھر سوتے رہے ہو۔ نیند جلدی نہیں آئے گی۔ کرسی نکال کر باہر برآمدے میں بیٹھ جاؤ۔ ذرا دل بہل جائے گا۔" فیض محمد نے شفقت کا اظہار کیا۔ "روٹی کھا کر سو جانا۔ ابھی تو سمجھو، رات شروع ہوئی ہے۔"

وہ چلا گیا۔ لالی چاہتا بھی یہی تھا کہ وہ زیادہ دیر اس کے پاس نہ ٹھہرے۔ وہ بیٹھا رہتا تو باتیں بھی کرنا پڑتیں۔ نت نیا جھوٹ بولنا پڑتا۔ لالی اس سے بات کرتے ہوئے کتراتا تھا۔ کم سے کم بولتا اور بہت سنبھل سنبھل کر بولتا۔ اسے ہر لمحے دھڑکا لگا رہتا کہ اس کا عامیانہ لب ولہجہ کہیں سارا بھرم نہ کھول دے۔

فیض محمد کے جانے کے بعد لالی کمرے سے باہر آ گیا۔ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا درختوں کے نیچے جا کر ٹہلنے لگا۔ گاؤں کی گھما گھمی اب اجڑنے لگی تھی۔ سناٹا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لالی دور نہیں گیا۔ درختوں کے نیچے اندھیرے میں ٹہلتا رہا۔ رات دھیرے دھیرے تاریک ہوتی گئی۔ اسی اثناء میں برآمدے کی کھڑکی سے منہ نکال کر کسی عورت نے اسے مخاطب کیا۔

"روٹی کھا لو باؤ جی!"

لالی خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔ مگر وہاں بھاگ بھری نہیں، کوئی دوسری عورت کھڑی تھی۔ عمر تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ مگر سخت محنت اور خوراک کی کمی نے اس کی جوانی کا چراغ وقت سے پہلے ہی مدھم کر دیا تھا۔ لالی دسترخوان کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ عورت دروازے کے قریب کھڑی رہی۔ لالی نے کھانا کھاتے کھاتے مڑ کر اسے دیکھا۔

"کیا نام ہے تیرا؟"

"ربیا۔" اس نے جواب دیا۔ "میں جی رحمان کی گھر والی ہوں۔"

"ذرا پانی تو پلا۔"

ربیا نے گلاس میں پانی بھر دیا۔ لالی نے پانی پیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ربیا نے برتن سمیٹے، دسترخوان اٹھایا اور چلتے چلتے لالی سے پوچھا۔ "کوئی اور کام ہو تو جی بتا دیں۔ مجھے گھر جا کر ابھی اور کام کاج کرنا ہو گا۔"

"نہیں، اب تو جا۔"

ربیا خاموشی سے گھر کے اندر چلی گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ لالی ذرا دیر تک کرسی پر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اٹھ کر برآمدے میں کھلنے والا دروازہ بند کیا اور کھڑکی کھول دی۔ پھونک مار کر لیمپ بجھایا اور بستر پر دراز ہو گیا۔

وہ دیر تک جاگتا رہا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ پلنگ سے نیچے اترا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ رات کے اندھیرے میں سنسان گاؤں اونگھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کے قریب کھڑے کھڑے اس نے سوچا کہ اب یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ رحیم داد اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ مگر خالی ہاتھ رحیم داد کے پاس جا کر وہ کیا کرتا۔ جب تک رحیم داد کے جسم پر جیل کے قیدیوں کی وردی تھی اس وقت تک لالی کا ہر مقصد ادھورا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس دروازے پر پہنچا' جو گھر کے اندر کھلتا تھا۔ اس نے دروازہ ہولے ہولے ہلایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ لالی کو سخت کوفت ہوئی۔ وہ خاموشی سے بستر پر جا کر لیٹ گیا اور کروٹیں بدلتے' بدلتے سو گیا۔

سویرے بہت تڑکے فیض محمد نے اسے بیدار کیا۔ اصرار کر کے باہر لے گیا۔ برآمدے سے نکل کر وہ لالی کے ہم راہ گھر کے پچھواڑے گیا' جہاں باڑے میں اس کے مویشی اور چوکھر تھے۔ وہ ایک بھینس کے پاس گیا' جو کھوری میں منہ ڈالے سانی کھا رہی تھی۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ ماتھے اور کھروں پر سفید نشان تھے۔ فیض محمد نے بھینس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر بڑے فخر سے بتایا۔ "برخوردار! یہ بلھا ہے۔ اس کے کھروں اور متھے پر سفید سفید پھلیاں دیکھ رہے ہو۔ ایسی مُ کو پنج کلیان بھی کہتے ہیں۔ یہ دھرلی ہے۔ پکا بیس سیر دودھ دیتی ہے۔"

لالی خاموش رہا۔ فیض محمد آگے بڑھا اور ایک بھوری بھینس کی گردن جھک کر آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی دھرلی ہے۔ اس کا کٹا پچھلے دنوں مر گیا۔ صرف چارے پر دودھ دیتی ہے۔ یہ بھی اعلیٰ نسل کی مُ ہے۔" اس نے فخر سے گردن اونچی کی۔ "یہ نیلی بار کی مشہور مُ ہے۔ پنج کلیان کے ساتھ میں اسے بھی میلے سے خرید کر لایا تھا۔ منہ مانگی قیمت دی تھی۔"

لالی نے بھوری بھینس کو غور سے دیکھا اور اس کی چکنی چکنی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "ماسٹر جی' یہ نیلی بار کی مُ ہے نا؟ یہ نیلی بار کیا ہوا جی؟"

"برخوردار' پہلے یہ سمجھ لو کہ بار کسے کہتے ہیں۔" فیض محمد آڑھتی سے فوراً اسکول ماسٹر بن گیا۔ "بار' ایسے غیر مزروعہ اور بنجر علاقے کو کہتے ہیں' جس پر کھیتی باڑی نہ ہوتی ہو۔ منٹگمری کسی زمانے میں ایسا ہی علاقہ تھا۔ اسے باری دوآب کہا جاتا ہے۔ یعنی راوی اور ستلج کے درمیان کا علاقہ۔ دراصل یہ پلیٹو ہے جس کا ایک ڈھلان راوی کی جانب ہے اور دوسرا ستلج کی جانب۔ پرانے زمانے کے جاٹوں نے باری دوآب کو چار باروں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ ہیں راوی بار' گنجی بار' بار



بار اور نیلی بار۔"

"پر یہ نیلی بار کونسا ہوا ماسٹر جی؟"

"برخوردار! یہ تو تمہاری سمجھ میں آ گیا کہ بار کسے کہتے ہیں۔ اب آگے کی سنو۔ نہریں نکلنے سے پہلے' خاص طور پر نہر لوئر باری دوآب سے قبل' باری دوآب کا علاقہ اس قدر زرخیز اور سرسبز و شاداب نہ تھا جیسا آج ہے۔" ماسٹر فیض محمد نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "نیلی' دراصل دریائے ستلج ہی کا نام ہے۔ اس کا پرانا نام گھارا ہے۔ مگر اسے اب ستلج ہی کہا جاتا ہے۔ تحصیل دیپال پور میں بھی ستلج ہی کہا جاتا ہے۔ لیکن ساتھ کی تحصیل پاک پتن میں اسے نیلی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ستلج کا پانی گہرا نیلا ہے۔ اسی لیے اسے نیلی کہتے ہیں۔ نیلی بار بھی اسی نیلی سے پڑا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔

"اب تو تمہاری سمجھ میں نیلی بار کا مطلب آ گیا۔"

لالی نے مسکرا کر مستعدی سے جواب دیا۔ "بالکل آ گیا جی۔" وہ ایک بار پھر بھوری بھینس کی پیٹھ سہلانے لگا۔

لالی کی یہ شیفتگی اور پیار دیکھ کر فیض محمد خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ "ابھی یہ کھانگڑ تو نہیں ہوئی' پھر بھی اس کا دودھ گاڑھا ہوتا ہے۔ اس سے عجب طرح کی مہک آتی ہے۔ ایسی سوندھی' سوندھی خوشبو کہ دودھ کا گلاس منہ سے لگاؤ تو ہٹانے کو جی نہ چاہے۔"

فیض محمد اپنی دوسری بھینسوں کے بارے میں دیر تک خوش ہو ہو کر بتاتا رہا۔ آخر میں وہ گھوڑی کے پاس گیا اور اس کی خوبیاں گنانے لگا۔ دھوپ درختوں سے نیچے اترنے لگی تو وہ باڑے سے لالی کے ہم راہ واپس کمرے میں آیا۔ ناشتا تیار تھا۔ ذرا ہی دیر میں لگا دیا گیا۔ دونوں نے بیٹھ کر ناشتا کیا۔

ناشتے پر بھی فیض محمد اپنی بھینسوں اور دوسرے مویشیوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ لالی نے ں کی گفتگو میں دلچسپی کا اظہار کیا اور جان بوجھ کر ناشتا دیر تک کرتا رہا۔ وہ صبح کی لاری سے سفر رنا نہ چاہتا تھا۔ فیض محمد نے بھی اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی' بلکہ بار بار یہی اصرار کرتا رہا کہ ے رحمت سے مل کر ہی جانا چاہیے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ زیادہ دیر لالی کے پاس نہ ٹھہرا۔ ہوا یہ کہ اس کے کچھ ملنے والے آ گئے۔ ں نے انھیں کمرے کے اندر نہیں بلایا۔ دروازہ کھول کر برآمدے میں گیا اور ان کے ساتھ نتوں کے نیچے پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر کچھ دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کرتا رہا اور ان کے ساتھ

ہی اٹھ کر کہیں چلا گیا۔

دوپہر کو وہ لالی کے پاس آیا اور اس کے لیے سگریٹ کے پیکٹ اور ایک کنگھا بھی لایا۔ دونوں نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا۔ مگر خلاف معمول وہ چپ چپ تھا۔ اس کا چہرا اترا ہوا تھا۔ اس نے کھانا بھی رغبت سے نہیں کھایا۔ چند لقمے کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر اس نے خود ہی اپنی پریشانی کا سبب بتایا۔ ”میرے منشی کا آج صبح انتقال ہوگیا۔ کل شام تک بالکل بھلا چنگا تھا۔ رات کو ٹھیک ٹھاک سویا۔ فجر کے وقت سینے میں ایسا شدید درد اٹھا کہ چٹ پٹ ختم ہوگیا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ ”اللہ اس کی مغفرت کرے۔ بڑا نیک اور محنتی بندہ تھا۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ یہی کوئی چھتیس سال کا ہوگا۔ چار چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا۔

”انھیں یہیں اپنے پاس لے آؤں گا۔ مگر ان پر یتیمی کا جو داغ لگ چکا ہے‘ اسے کون مٹا سکتا ہے۔“

لالی چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا۔ فیض محمد آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ ”قریب ہی کے پنڈ میں رہتا تھا۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔ شاید شام تک واپس نہ آسکوں۔ دیر ہوجائے تو میرا انتظار نہ کرنا۔ شام کو جانا تو رحمان یا کسی نوکر کو بتا دینا۔ ویسے میں چاہتا ہوں‘ تم آج کی بجائے کل صبح کی لاری سے جاؤ۔ بولو‘ کیا ارادہ ہے؟“

”آپ کہتے ہیں جی تو میں کل صبح ہی چلا جاؤں گا۔“

فیض محمد نے اس کے بعد کوئی بات چیت نہیں کی۔ چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔ لالی دیر تک خاموش بیٹھا سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ پھر وہ بستر پر لیٹ گیا اور شام تک سوتا رہا۔

عشاء کی نماز سے کچھ پہلے فیض محمد تھکا ہارا واپس آیا۔ لالی سے اس کی زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ چند منٹ ٹھہر کر وہ وظیفہ پڑھنے اپنے حجرے میں چلا گیا۔

رات کا کھانا کھا کر لالی کمرے سے باہر نہیں گیا۔ اس نے لیمپ پھونک مار کر بجھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔

☆

بیٹھک کا دروازہ کھول کر لالی خاموشی سے باہر نکلا اور دبے قدموں چلتا ہوا گھر کے پچھواڑے گیا۔ مویشیوں کے باڑے پر پہنچا۔ باڑا مویشیوں کے عام ڈھارے کی طرح کا نہ تھا جس پر بارش اور سردی سے بچاؤ کے لیے چھپر ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ باڑا احاطے کی مانند تھا جس کے گرد قد آدم



چار دیواری تھی۔ اس کا پھاٹک بند تھا اور پھاٹک کے عین سامنے مویشیوں کا رکھوالا چارپائی ڈالے سو رہا تھا۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ لالی ایک درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑا تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ رات سنسان تھی۔ لالی گومگو کے عالم میں تھا۔ یکایک عقب میں آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ فیض محمد آہستہ آہستہ اسی طرف آرہا تھا۔ لالی جہاں تھا وہیں دم بخود کھڑا رہا۔ وہ قریب آکر ٹھہر گیا۔ مگر نہ اس نے کسی شک کا اظہار کیا نہ حیرت کا۔ حسب معمول نرم لہجے میں بولا۔

”برخوردار! تم یہاں ہو۔ بیٹھک میں تمھیں نہ پایا تو طبیعت پریشان ہوئی۔ خیریت تو ہے۔ تم اتنی رات گئے ادھر کیسے آگئے؟“ وہ دم بھر کے لیے رکا اور جلد ہی بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔ ”سمجھ گیا۔ سگریٹ کی طلب نے ستایا ہوگا۔ ماچس نہیں ہوگی۔ دینو کے پاس ماچس لینے آئے ہوگے۔ یہی بات ہے نا؟“

لالی کو اس کی نیک نفسی اور سادہ دلی پر پیار آگیا۔ سعادت مندی سے سر جھکا کر بولا۔ ”بات تو جی‘ کچھ ایسی ہی تھی۔“

”میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا۔“ وہ بدستور مسکراتا رہا۔ ”مجھے اس وقت یہاں دیکھ کر تمھیں بھی سخت حیرت ہوگی۔ مجھے تو اس وقت حجرے کے اندر وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہونا چاہئے تھا۔ باہر کیسے آگیا؟ یہی بتانے تمھارے پاس آیا تھا۔“

مویشیوں کا رکھوالا دینو دونوں کی باتیں سن کر بیدار ہوگیا تھا اور حیران و پریشان آنکھیں پھاڑے انھیں دیکھ رہا تھا۔ مگر فیض محمد نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ لالی کو مخاطب کیا۔ ”آؤ‘ بیٹھک میں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“ وہ مڑا اور لالی کے ہم راہ چپ چاپ چلتا ہوا بیٹھک میں پہنچ گیا۔

لالی کو کمرے میں چھوڑ کر وہ گھر کے اندر گیا اور ماچس ہاتھ میں لیے واپس آگیا۔ اس نے لیمپ روشن کیا اور میز کے قریب کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لالی بستر پر پیر لٹکائے بیٹھا تھا۔ ذرا دیر توقف کرنے کے بعد فیض محمد نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔

”برخوردار! آج عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں وظیفے کا ورد کر رہا تھا۔ خلاف معمول نیند کا ایسا زبردست جھونکا آیا کہ آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں‘ ایک بزرگ سامنے کھڑے ہیں۔ سفید براق لباس‘ چہرے کے گرد نور کا ہالہ‘ آنکھوں میں ایسا جلال کہ نظریں خود بخود جھک گئیں۔ کیا بتاؤں‘ کیا شان تھی ان کی۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”چند لمحے وہ خاموش کھڑے میری جانب دیکھتے

رہے۔ پھر حکم دیا' فیض محمد! اپنی بیٹی طاہرہ کو اس نوجوان کے حبالہ عقد میں دے دے جو دو روز سے تیرا مہمان ہے۔ نافرمانی کرے گا تو راندہ درگاہ ہوگا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ اب تک وہ آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔"

لالی بھونچکا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ ماسٹر فیض محمد نے اسے خاموش پایا تو نہایت شفقت سے کہا۔ "بھئی! اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ضرور ہے۔ میں نے بہت غور کیا تو یہ نکتہ ہاتھ آیا۔ تمہارے سر پر کسی کا سایہ نہیں۔ پریشان حال بھی ہو مگر نیک اور سعادت مند ہو۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ مجھے بھی بیٹی کی فرض سے سبکدوش ہونا ہے۔ کسی نہ کسی کے ساتھ تو اس کا پلو باندھنا ہی ہوگا۔ ویسے خاندان میں کئی لڑکے ہیں۔ پڑھے لکھے اور برسرروزگار بھی ہیں۔ لیکن مجھے تو تمہارے لیے حکم ملا ہے۔ تمہیں اپنی فرزندی میں لینے پر مجھے خوشی ہوگی۔ تم میرے پاس رہو گے' کاروبار میں ہاتھ بٹاؤ گے' میرا سہارا بنو گے۔ میرے لیے اس سے اچھا رشتہ اور کیا ہو سکتا ہے؟"

اس نے ایک بار پھر کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "عزیزم! میری طرف سے تو ہاں ہے۔ رہ گئی تمہاری مرضی' تو جو چاہو' اپنے بارے میں فیصلہ کرو۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ہم دونوں ہی کے لیے تائید غیبی ہے۔" لالی پھر بھی کوئی جواب نہ دے سکا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ کمرے میں کچھ دیر گہری خاموشی چھائی رہی۔ آخر فیض محمد کی آواز ابھری۔

"برخوردار! کیا اس خاموشی کو میں تمہاری مرضی سمجھوں؟"

اب لالی کے لیے خاموش رہنا ممکن نہ رہا وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں کیا بتاؤں جی! میں تو کچھ بھی نہیں سوچ سکا۔"

"کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔" فیض محمد نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ "سوچ لو۔ اچھی طرح سوچ لو۔ تمہیں حق حاصل ہے' جو چاہو اور جیسا چاہو' اپنے بارے میں فیصلہ کرو۔" اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے لالی سے پوچھا۔ "تمہاری گھڑی میں کیا بجا ہے؟"

لالی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر بتایا۔ "ساڑھے چار۔"

فیض محمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اب تم سو جاؤ۔ میں تو اب سو نہ سکوں گا۔ کچھ ہی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ مسجد میں فجر کی نماز ادا کروں گا اور صبح کی بس سے منڈی چلا جاؤں گا۔ تم سے شام کو واپسی پر ملاقات ہوگی۔ تمہارے پاس خاصا وقت ہے۔ اچھی طرح غور کر لو۔ جو بھی فیصلہ کرو' مجھے بے جھجک بتا دینا۔"



اس نے لالی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ گھر کے اندر جانے کے بجائے بیٹھک کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ لالی نے سوچا تھا کہ اس کے جانے کے بعد چپکے سے نکل جائے گا۔ مگر اب اس کی گنجائش نہ تھی۔

صبح ہونے والی تھی اور فیض محمد ابھی باہر ہی تھا۔ اس نے سونے کی کوشش کی مگر بے چین رہا۔ ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ دن میں بھی وہ بے چین رہا۔

شام کو فیض محمد کی واپسی ہوئی۔ وہ روز کی طرح مسکراتا ہوا لالی کے پاس آیا اور نہایت شفقت سے مخاطب ہوا۔ "کچھ تھکے تھکے نظر آرہے ہو۔" اس نے توقف کیا اور لالی کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی وضاحت کی۔ "بات یہ ہے کہ تم کہیں آتے جاتے بھی تو نہیں' تمام وقت تو کمرے میں رہتے ہو۔ ذرا باہر نکلا کرو۔ مگر سوال یہ ہے کہ کس کے پاس جاؤ' کہاں جاؤ؟ تمہارا کوئی ملنے جلنے والا بھی یہاں نہیں ہے۔ یہاں رہو گے تو سبھی سے میل ملاپ پیدا ہو جائے گا۔"

لالی چپ چاپ بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔

فیض محمد کچھ دیر خاموش رہا پھر یوں گویا ہوا۔ "برخوردار! تم بہت کم گو ہو۔ مجھے تمہاری یہ ادا پسند بھی ہے۔ مگر نوجوانوں کو اتنا خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ ہنسا بولا کرو۔ کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھ رہو گے تو بولنے کی بھی عادت پڑ جائے گی۔ بھئی! میں زیادہ دیر خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ سخت الجھن ہوتی ہے۔ اور تم سے باتیں کر کے تو دل بہت خوش ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے' تین روز نہیں' تمہارے ساتھ تین برس بیت گئے۔"

وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ لالی بھی چپ بیٹھا رہا۔ مگر فیض محمد سے زیادہ دیر خاموش نہ رہا گیا۔ وہ حرف مطلب پر آ گیا۔ "برخوردار! کیا فیصلہ کیا تم نے؟" پھر خود ہی بولا۔ "فیصلہ کیا کرنا ہے۔ بھئی میں نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ میرا کوئی بیٹا نہیں' اللہ تعالیٰ نے تمہارے روپ میں مجھے بیٹا دے دیا۔ میری دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی تو بیاہ کر پشاور چلی گئی۔ سال دو سال میں آتی ہے۔ سمجھو وہ تو غیر ہو گئی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔

"ہاں تو برخوردار! تم نے کیا سوچا؟"

لالی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ پچھلی رات سے جس سوال نے اسے الجھن میں ڈال رکھا تھا وہ ہنوز جواب کا محتاج تھا۔ لالی میں نہ صاف انکار کرنے کی جرات تھی' نہ وہ اپنے بارے میں اصل حقیقت سے آگاہ کر سکتا تھا۔ دونوں ہی صورتوں میں اس کے دل کو زبردست ٹھیس لگتی۔ لالی اسے کسی طور دکھ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنے جرائم پیشہ ہونے کا کبھی اتنی شدت سے احساس نہیں

ہوا تھا۔ وہ دلدل میں گر گیا تھا۔ اس دلدل سے نکلنے اور صاف ستھری زندگی بسر کرنے کا بہت اچھا موقع ملا تھا۔ مگر وہ اس دلدل میں اتنا دھنس چکا تھا' اس قدر لت پت ہو گیا تھا کہ اس موقعے سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اسے سب سے بڑا دکھ اس بات کا تھا کہ جس زندگی کے اس نے کبھی سہانے خواب دیکھے تھے' وہ خود چل کر اس کے گھر آئی تھی۔ مگر وہ دروازے کے پٹ کھول کر اس کا خیر مقدم نہیں کر سکتا تھا۔

لالی کو خاموش اور گم دیکھ کر فیض محمد نے کہا۔ "برخوردار! جو کہنا ہے صاف صاف کہہ دو۔ تم انکار کر دو گے تو میں یہی سمجھوں گا کہ مجھی میں کوئی خامی ہو گی۔ تمہیں میں اچھا سمجھتا ہوں' ہمیشہ سمجھتا رہوں گا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "مجھے جو حکم ملا' اس کی تعمیل میں سر جھکا دیا۔ اپنی پگڑی تمہارے سامنے ڈال دی۔ بیٹی باپ کی عزت ہی ہوتی ہے۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں کے پیمانے چھلک اٹھیں گے۔ لالی تڑپ اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ جھک کر اس کے پیر پکڑ لے اور اسے اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دے۔ وہ بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ فیض محمد دل گرفتہ ہو کر بولا۔

"معلوم ہوتا ہے میری باتیں تمہیں ناگوار گزریں؟"

لالی کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ "ہرگز نہیں۔ جو آپ کا فیصلہ' وہی میرا فیصلہ ہے جی۔"

وہ تڑپ کر اٹھا اور لالی کو گلے سے لگا لیا۔ چند لمحے تک وہ لالی کو گلے سے لگائے خاموش کھڑا رہا۔ لالی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ رو رہا ہے۔ اس کے جسم کی حرارت میں باپ کے پیار کا لاڈ تھا۔ اس نے شفقت سے لالی کے سر پر ہاتھ پھیرا' اس کی پیشانی چومی۔ "تم نے میری لاج رکھ لی۔ مجھے حکم عدولی کے عذاب سے بچا لیا۔" لالی سر جھکائے نہایت سعادت مندی سے کھڑا رہا۔

فیض محمد نے لمحہ بھر خاموش رہ کر کہا۔ "نیک کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ کسی دھوم دھام کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ وظیفے سے فارغ ہوتے ہی مسجد کے ملا جی کے پاس جاؤں گا۔ نمازیوں میں گواہ اور وکیل بھی مل جائیں گے۔ فجر کی نماز کے بعد نکاح ہو جائے گا۔ مجھے یہی بشارت ہوئی تھی۔"

وہ لالی کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ وظیفے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ گھر کے اندر چلا گیا۔

لالی بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے فیض محمد کا دل رکھنے کے لیے ہامی تو بھر لی تھی مگر اسے نباہ نہیں سکتا تھا۔ اب وہ جلد سے جلد اس گھر سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔

رات کو لالی سے کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ دو چار لقموں کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ پلنگ پر خاموش بیٹھا



رہا اور بار بار گھڑی دیکھتا رہا۔ اسے رات تاریک اور گلی کوچے سنسان ہو جانے کا انتظار تھا۔

کوئی دس بجے کا عمل ہو گا۔ لالی نے باہر جانے کا ارادہ کیا۔ عین اس وقت گھر کے اندر جانے والے دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ لالی نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ دھندلی روشنی میں ایک سایہ لہرایا۔ کوئی دروازے کی اوٹ میں دبکا کھڑا تھا۔

لالی حیران و پریشان بیٹھا اس جانب دیکھتا رہا۔ ذرا دیر بعد ایک نوجوان لڑکی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور سر جھکا کر لالی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنا بدن سفید چادر سے چھپائے ہوئے تھی' صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔ کھلتا ہوا چمپئی رنگ' سبک نقش و نگار' ابھری ہوئی سیاہ آنکھیں۔ وہ اچھی خوش شکل لڑکی تھی۔

لالی نے انکل سے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ "تم طاہرہ تو نہیں ہو؟"

"ہاں میں طاہرہ ہوں' ماسٹر جی کی بیٹی۔"

"تم اتنی رات گئے یہاں کس لیے آئی ہو؟"

اس دفعہ طاہرہ نے گردن اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ تیوری پر بل ڈالا اور ایک دم پھٹ پڑی۔ "یہ کہنے آئی ہوں کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

لالی سٹپٹا کے رہ گیا۔ حیران ہو کر بولا۔ "کیوں؟"

"اس لیے کہ میں تمہارے ساتھ شادی وادی کا ڈھونگ رچانا نہیں چاہتی" وہ ویسے ہی تیکھے لہجے میں بولی۔ "تم مجھے بالکل پسند نہیں۔ تم صورت سے اجڈ اور لوفر لگتے ہو۔" اس نے غصے سے لالی کو گھورا۔

"جاؤ یہاں سے نکل جاؤ۔"

لالی نے پریشان ہو کر کہا۔ "دھیرے بولو۔ ماسٹر جی آ جائیں گے۔"

"آ جانے دو۔ مجھے کسی کی پروا نہیں ہے' نہ تمہاری' نہ ابا جی کی۔ میں کسی سے ڈرتی نہیں۔ سنا م نے۔"

لالی جل کر بولا۔ "مجھے سنانے کیوں آئی ہو' جاؤ' جا کر اپنے ابا جی کو سناؤ۔"

"میں ان کے پاس نہیں جاؤں گی۔" طاہرہ نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "میں تم سے ت کرنے آئی ہوں۔ یہ بتانے آئی ہوں کہ میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی' نہیں چاہتی۔"

"نہ کرو۔ میں نے تمہارے آگے ہاتھ نہیں جوڑے' پیروں پر پگڑی نہیں ڈالی۔ نہ کبھی تمہیں استے میں چھیڑا' نہ آنکھ ماری' نہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا' اوئے سوہنیو! ہم تو قتل ہو گئے۔ میں نے

تو......"

"ارے ارے۔" طاہرہ اس کی بات کاٹ کر حیرت سے بولی۔ "تم تو بالکل لفنگے ہو۔" وہ ایک بار پھر دھاڑنے لگی۔ "تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے؟ جاؤ' ابھی چلے جاؤ۔"

پہلی نظر میں وہ طاہرہ کو بھولی بھالی شرمیلی دوشیزہ سمجھا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر تیز اور طرار ہو گی۔ مگر جب وہ اپنی تمام تیزی اور طراری کے ساتھ کھل کر سامنے آ گئی تو لالی نے دل ہی دل میں کہا۔ چھوہری تو زوردار ہے۔ اب اسے طاہرہ کو چھیڑنے میں مزا آنے لگا۔

"میں تو نہیں جاؤں گا۔ یہیں رہوں گا۔" یہ کہہ کر وہ ٹانگیں پسار کر بستر پر لیٹ گیا۔ طاہرہ کو مخاطب کر کے بولا۔

"کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔ آرام سے گل بات کرو۔"

وہ اسی طرح خفگی سے بولی۔ "میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔ تم سے صاف صاف یہ کہنے آئی ہوں کہ تم میرے ساتھ شادی کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔" چند لمحے رک کر اس نے کہا۔ "ذرا اپنی شکل تو دیکھو۔ کیسی خطرناک غنڈوں کی سی مونچھیں ہیں۔ اونہہ!" طاہرہ نے حقارت سے منہ بگاڑا۔

مگر لالی بالکل ناراض نہ ہوا۔ مسکرا کر بولا۔ "کوئی بات نہیں۔ کل صبح منڈوا دوں گا۔ تم چاہو تو استرا لا کر ابھی مونڈ دو۔ لے آؤ اسی بات پر استرا!"

طاہرہ نے غصے سے گردن ہلائی۔ "گویا مونچھیں منڈوا کر تم گل فام بن جاؤ گے اور میں تمہیں اپنا سرتاج بنا لوں گی۔ چغد! احمق کہیں کا۔"

"نکالو' نکالو جتنی چاہے گالاں نکالو۔ کل صبح کے بعد تم سے پوچھوں گا۔"

"کیا کرو گے تم؟"

لالی اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ گردن ذرا سی اکڑا کر نخوت سے بولا۔ "کل صبح میں تمہارا کھسم بن جاؤں گا۔"

"خصم!" وہ تلملا کے بولی۔ "تم غنڈے ہو۔ بالکل تھرڈ کلاس غنڈے۔"

لالی نے مطلق ناگواری ظاہر نہیں کی۔ قمیص کی آستین چڑھائی اور طاہرہ کو اپنے بازو کی مچھلیاں دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ دیکھ رہی ہو؟ نزدیک آ جاؤ۔ چھو کر دیکھو۔"

"دیکھ رہی ہوں' دیکھ رہی ہوں۔ تم دور ہی سے اچھے خاصے مسٹنڈے نظر آتے ہو۔"

"میں تمہیں اپنے بازو اس لیے دکھا رہا ہوں۔" لالی نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔ "کل صبح کے بعد تم



نے کڑ کڑ کی تو سمجھ لینا۔ ایک چپیڑ ادھر سے لگاؤں گا دوسری ادھر سے۔" لالی نے ہاتھ گھما گھما کر خبردار کیا۔

"اوپر سے ایک ٹھڈا بھی لگاؤں گا۔ وہ جاؤ گی دور تک گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی۔ ساری کڑ کڑ نکل جائے گی۔"

"کیا کہا؟ تم مجھے مارو گے؟" اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "وحشی' درندے! بے غیرت! تمہیں ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آئے گی؟ تم تو بالکل جنگلی ہو۔"

لالی نے مصالحت کرنے کے انداز میں کہا۔ "چلو' نہیں ماروں گا۔ اب تو غصہ تھوک دو۔ جو تم کہو گی' وہ کروں گا۔ مونچھیں بھی منڈوا دوں گا۔ ایک دم صفاچٹ۔ بال بھی نئے اسٹائل کے بناؤں گا۔ کمیض اور پتلون تو پہلے ہی پہنے بیٹھا ہوں۔ بولو اب تو میری گھر والی بننا منظور کر لو گی؟"

طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھکی ہوئی سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس دفعہ اس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔ "کیا واقعی تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ساتھ میری شادی ہو جائے گی؟"

"سمجھتا کیا' سولہ آنے پکی گل ہے۔"

طاہرہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر دفعتاً اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "اچھا تو پھر یہ بھی سن لو بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لو۔" اس نے اپنے بدن سے چادر اتار کر میز پر رکھ دی اور نہایت بے باکی سے اپنا پھولا ہوا پیٹ دکھا کر بولی۔ "یہ کسی کی امانت ہے اور جس کی یہ امانت ہے میں اسی کی امانت ہوں۔"

لالی بھونچکا رہ گیا۔ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اس نے سنبھل کر آہستہ سے پوچھا۔ "کس کا ہے؟"

"کسی کا بھی ہے۔ تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے' بالکل ہے۔" لالی نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "زیادہ کڑ کڑ نہ کرو۔ صاف صاف بتاؤ۔"

"چلو' یہ بھی سن لو۔" وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ "میں لہور میں اپنی خالہ کے پاس رہتی تھی۔ وہاں کالج میں پڑھتی تھی۔ کالج کے ایک پروفیسر مجھے گھر پر بھی پڑھاتے تھے۔ مجھے ان سے محبت ہو گئی۔ وہ بھی مجھ سے دیوانوں کی طرح محبت کرنے لگے۔" یہ کہتے کہتے وہ یادوں کے سہارے بہت دور نکل گئی۔ "ایک لمحے کی جدائی بھی برداشت نہ ہوتی۔ گھر اور کالج کے باہر بھی ہم چھپ چھپ کر ملتے۔ کبھی......

لالی بات کاٹ کر بولا۔ "شالیمار باغ اور لارنس گارڈن میں اس کے ساتھ ٹھمک ٹھمک کر گانے بھی گاتی ہوگی؟" وہ لمحے بھر کے لیے رکا۔ "یہ تو فلمی باتیں ہوئیں۔ آگے بتاؤ؟"

"آگے جو کچھ ہوا' وہ تمہارے سامنے ہے۔"

"اسے بھی دیکھ لیا۔ اور آگے بتاؤ۔"

"پروفیسر کی ایک بیوی پہلے سے موجود ہے۔ ایک بچہ بھی ہے۔ مگر مجھے اس کی دوسری بیوی بننا منظور ہے۔ میں اس کی محبت میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں' لیکن ابا جی تیار نہیں ہیں۔ وہ میری تعلیم ادھوری چھڑوا کر مجھے گھر لے آئے۔ اب تمہارے سر منڈھنا چاہتے ہیں مجھے' تاکہ ان کی بدنامی نہ ہو۔"

لالی کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا' پھر بولا۔ "میں تو جی تم سے یہی کہوں گا' تمہیں بھی چاہئے کہ ماسٹر جی کی بدنامی نہ ہو۔ وہ بہت چنگے بندے ہیں۔ فرشتے' ہیں فرشتے' اتنے نیک اور بھلے مانس کہ جی چاہتا ہے ان کے پیر دھو کر پیوں۔" لالی نے دل کی بات صاف صاف کہہ دی۔

طاہرہ کے چہرے پر چند لمحوں کے لیے غم کا سایہ پھیل گیا۔ اس میں حیا بھی تھی اور دبا دبا کرب بھی تھا۔ وہ ذرا دیر تک اسی عالم میں بیٹھی رہی' مگر جلد ہی غم کا سایہ آہستہ آہستہ اس کے چہرے سے ہٹ گیا۔ غصے اور نفرت کی کڑی دھوپ چھا گئی۔ "تم نرے چغد ہو۔ تمہیں کچھ بھی پتہ نہیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں۔ میں ابا جی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ نہ وہ فرشتے ہیں نہ اتنے بھلے مانس جتنا تم انھیں سمجھ رہے ہو۔" طاہرہ نے قدرے تامل کیا۔

"وہ ایک نمبر فراڈ ہیں۔ پہلے تو انھوں نے چار سو بیسی کر کے بوگس کلیم منظور کرایا' پرائمری اسکول کے معمولی ماسٹر سے بڑے زمین دار بن گئے۔ پھر غلے کی آڑھت کا کاروبار شروع کر دیا۔" اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ "سن رہے ہو؟"

"ہاں جی' بالکل سن رہا ہوں۔ کہتی جاؤ۔"

"اچھا تو اب یہ بھی سن لو۔ آڑھت کا تو صرف بہانہ ہے۔ وہ سمگلنگ کرتے ہیں۔ ادھر سے کنک اور چینی سرحد پار بھیجتے ہیں ادھر سے ہندوؤں کی بیمار اور بوڑھی گائیں بھینسیں لاتے ہیں۔ قصائیوں کے ہاتھ بیچ کر ان کا سڑیل گوشت لوگوں کو کھلاتے ہیں۔ دن بھر سمگلنگ کا دھندا کرتے ہیں۔ رات کو وظیفے پڑھ پڑھ کر اپنے گناہ بخشواتے ہیں۔" طاہرہ کا لہجہ اور تلخ ہوگیا۔ "سن لیا تم نے وہ کتنے نیک اور فرشتہ ہیں؟"

لالی کو ایسا محسوس ہوا جیسے قلابازی کھا گیا ہو۔ اسے دکھ بھی ہوا' حیرت بھی ہوئی۔ مگر طا



کے ذہنی خلفشار سے بے نیاز بولتی رہی۔ "اب تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ وہ تمہیں اپنے سمگلنگ کے دھندے میں ایجنٹ کے طور پر استعمال کریں گے تاکہ رینجرز اور بارڈر پولیس کے ساتھ گولی چلے تو تمہی مارے جاؤ' تمہی جیل جاؤ۔ مگر یہ سلسلہ بھی چند ہی مہینے چلے گا۔ میرے بچے کی پیدائش کے بعد وہ کسی مقدمے میں پھنسوا کر تم سے فارخطی لکھوا لیں گے اور میرا بیاہ اپنے بھتیجے سے کر دیں گے۔ وہ بدصورت ہے اور ایک ٹانگ سے لنگڑا بھی۔ مگر بہت بڑی زمین داری اور جائیداد کا اکلوتا وارث ہے۔ اپنی یہ سکیم وہ آج ہی شام ماں جی کو بتا چکے ہیں۔" اس نے نظریں نیچی کر کے آہستہ سے کہا۔

"تم نے سب کچھ سن لیا۔ اب بتاؤ' کیا تم ایسی لڑکی سے شادی کر لو گے جس کے پیٹ میں کسی اور کا بچہ ہے؟"

"کتنے دن کا ہے؟" لالی نے اس کے پھولے ہوئے پیٹ کی جانب دیکھ کر کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"چھ سات مہینے سے تو کم کا نہیں لگتا۔"

"شاید!" طاہرہ نے مختصر جواب دیا۔

لالی مسکرا کر بے نیازی سے بولا۔ "صرف تین مہینے کی تو بات ہے۔ فیر تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔"

طاہرہ نے لالی کو خوں خوار نظروں سے دیکھا اور نفرت سے منہ بگاڑ کر بولی۔ "تم عجیب بے غیرت انسان ہو۔ تم ایسا بچہ قبول کر لو گے؟"

"کرلوں گا' ضرور کرلوں گا۔ حرج ہی کیا ہے جی!" وہ نہایت ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ "ویسے سچ پوچھو تو یہ میرا معاملہ ہے بھی نہیں۔ اولاد کے بارے میں صرف ماں بتا سکتی ہے کہ اس کا پیئو کون ہے۔ میں کس کا پتر ہوں' یہ بات میری ماں بتا سکتی تھی۔ تم کس کی دھی ہو' یہ بات بھی ماسٹر جی نہیں' تمہاری ماں بتا سکتی ہے۔ غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں میں؟"

طاہرہ نے زچ ہو کر کہا۔ "جو کچھ تم کہہ رہے ہو' ٹھیک ہی کہہ رہے ہو گے۔" وہ نڈھال ہو کر پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔

لالی بھی خاموش رہا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اب لالی کو وہاں سے چلا جانا چاہئے۔ تھا۔ اس نے طاہرہ کو پھر چھیڑا۔

"تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ اندر جاؤ۔ وٹنا ملو' خوشبو لگاؤ' ریشمی پٹانگل پہنو' سرخ جھمی اوڑھو'

سنگھار کرو۔ سویرے سویرے سامنے ایسے نہ آنا۔ دلہن بن کے آنا۔ میں تمہارا گھونگھٹ اٹھاؤں گا۔ گھنڈ چکائی دوں گا۔"

طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے گم صم بیٹھی رہی۔ پھر اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اس نے لالی کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "کہو تو تمہارے پیروں پر سر رکھ دوں۔ خدا کے لیے میرے ساتھ شادی کا خیال دل سے نکال دو۔"

"اپنے ابا جی سے کیوں نہیں کہتیں؟ ویاہ تو انھوں نے ہی طے کیا ہے۔"

"کہہ چکی ہوں' ان سے بار بار کہہ چکی ہوں۔ ان کے سینے میں دل نہیں' پتھر ہے۔ ماں جی کو بھی یہ رشتہ پسند نہیں۔ جب سے سنا ہے' بے چاری بیٹھی زار و قطار رو رہی ہیں۔" طاہرہ تیزی سے بولتے بولتے اچانک دھیمی پڑ گئی۔ اس نے لالی کا چہرہ غور سے دیکھا اور غم زدہ ہو کر بولی۔ "تم اتنے سنگدل کیوں ہو؟ تم مجھ سے شادی کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟ تمہیں مجھ سے محبت بھی نہیں ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔ "سیدھی سیدھی معاملے کی بات یہ ہے کہ اب تو میں ماسٹر جی سے اپنا ٹیکس وصول کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے مجھ سے چار سو بیسی جو کی ہے۔"

طاہرہ چونک پڑی۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ جھٹ اپنے کانوں سے سونے کے جھمکے اتارے' ہاتھوں کے کنگن اتارے اور انھیں لالی کی طرف بڑھا کر بولی۔ "لو یہ لے لو۔ یہ تمہارا ٹیکس ہے۔ اب یہاں سے چلے جاؤ۔" لالی نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ طاہرہ تلملا کر بولی۔ "قسم کھا کر کہتی ہوں' زہر کھالوں گی' خودکشی کرلوں گی مگر تمہارے ساتھ شادی نہیں کروں گی' نہیں کروں گی۔"

"زیور پہن لو۔ زہر کھانے اور خودکشی کرنے کی ضرورت نہیں۔" لالی نے اس دفعہ نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "میں یہاں سے ابھی چلا جاؤں گا' پر ایک شرط پر۔"

"کیا شرط ہے تمہاری؟" طاہرہ کے چہرے پر خوشی سے پھول کھل اٹھے۔

"مجھے تمہاری نہیں' تمہاری بوری مجھ کی ضرورت ہے۔ وہ پکا اٹھارہ سیر دودھ دیتی ہے اور تمہارے پیٹ میں...."

طاہرہ بات کاٹ کر بولی۔ "ایک نہیں تم دو لے جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جاؤ' جا کر نکال لاؤ دونوں کو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں صرف بوری مجھ لوں گا۔ مگر اسے لینے میں نہیں جاؤں گا۔ وہاں راکھا موجود ہے۔ تم خود



جاؤ اور مجھ لے کر آجاؤ۔"

"مگر وہ مجھے بھی نہیں لے جانے دے گا۔ میں اس سے کہوں گی کیا؟"

لالی اپنی ضد پر اڑا رہا۔ "یہ میں نہیں جانتا۔ مجھ نکال کر تم ہی لاؤ گی اور میرے ساتھ پنڈ کے آخری سرے تک جاؤ گی۔ بولو کیا کہتی ہو؟ اگر یہ کام کر سکتی ہو تو جلدی کرو۔ نہیں تو اندر جاؤ' مجھے سونے دو۔ صبح نکاح کے بعد تم سے ملوں گا۔"

طاہرہ کا دمکتا ہوا چہرہ ایک بار پھر سونا پڑ گیا۔ "تم یہ تو سوچو۔ میں اسے کیسے نکال کر لا سکتی ہوں۔" وہ گڑگڑانے لگی۔ "خدا کے لیے مجھے بتاؤ' میں کیا کروں؟"

لالی نے اس کا پریشان چہرہ دیکھا اور کھل کر مسکرایا۔ "تم مجھے بے وقوف' گنوار' احمق' جنگلی اور نہ جانے کیا کیا کہہ چکی ہو۔ پر تم نے یہ بھی سوچا' خود تمہارے پاس کتنی سمجھ ہے۔ اگر تمہارے پاس سمجھ بوجھ ہوتی تو یوں گابھن مجھ کی طرح پیٹ پھلائے نہ بیٹھی ہوتیں۔" اس نے کچھ تامل کیا۔ حقارت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ "ماسٹر جی وظیفے پڑھتے ہیں' بیٹی عشق لڑاتی ہے اور میں بے وقوف ہوں۔ احمق اور جنگلی ہوں۔"

طاہرہ خاموش بیٹھی اس کی جلی کٹی سنتی رہی۔ لالی اسے مخاطب کر کے بولا۔ "اس طرح یہاں بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ بتاؤ آس پاس کے کسی پنڈ میں تمہارا کوئی شریکا' کوئی رشتے دار ہے۔ ماماں' چاچا' موسا' تاؤ۔ کوئی نہ کوئی تو ہوگا؟"

طاہرہ نے جھٹ جواب دیا۔ "ماموں ہیں۔ چھ میل ادھر ایک چک میں رہتے ہیں۔ مگر وہ ہمارے گھر کم آتے ہیں۔ سگے ماموں نہیں ہیں۔"

"سگے' سوتیلے کی چھوڑو۔ بھیجے سے کام لو بھیجے سے۔ ماں جی تو تمہاری ہی طرف دار ہیں نا؟"

"بالکل ہیں۔ انھوں نے ہی تو مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔"

"تو بس تم سیدھی ان کے پاس جاؤ۔ ان سے کہو کہ وہ راکھے کو ماماں کو بلانے بھیج دیں۔ وہ ادھر جائے اور ادھر تم بوری مجھ نکال کر لاؤ۔ بن گیا دونوں کا کام۔"

طاہرہ نے خوش ہو کر گردن ہلائی۔ "یہ ترکیب ٹھیک رہے گی۔" اس نے موج میں آ کر چٹکی بجائی۔ "بالکل ٹھیک ہے۔"

"خالی پیلی ٹھیک کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ جاؤ اور بوری مجھ لے کر فٹافٹ آجاؤ۔"

طاہرہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ لالی نے اسے ٹوکا۔ "اور دیکھو ماسٹر جی کی ایک قمیض' پگڑی اور ایک دھوتی بھی لیتی آنا۔ ایک ڈانگ بھی لانا۔"

"وہ کس لیے؟"

"جیسا کہتا ہوں' ویسا کرو۔ بیچ میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔ مُ ایسے ہی نہیں لے جاؤں گا۔ اس کے ساتھ چاک یا گوجر بن کر جاؤں گا۔ آیا بھیجے میں؟ اور ہاں دیکھو۔ جاتے ہی ماسٹر جی کے حجرے کی زنجیر باہر سے چڑھا کر اس میں چپکے سے تالا ڈال دینا۔ ہر کام چوکس ہونا چاہیے۔"

طاہرہ چلی گئی۔ لالی بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ منٹ بعد طاہرہ واپس آئی' مسکراتے ہوئے بولی۔ "رکھوالا چلا گیا۔ کم بخت بڑی مشکل سے گیا۔ جب میں نے اور ماں جی نے نوکری سے نکال دینے کی دھمکی دی تب گیا۔" اس نے بغل میں دبے ہوئے کپڑے لالی کو دے دیئے۔ ایک لاٹھی بھی لائی تھی' وہ بھی دے دی۔

لالی نے ساری چیزیں لے کر کہا۔ "اب اندر جا کر تھوڑی دیر انتظار کرلو۔ اتنی دیر میں راکھا پنڈ سے دور چلا جائے گا۔ جلدی نہ کرنا' ورنہ سارا کام گڑبڑ ہو جائے گا۔ سمجھ گئیں؟ اب تم جاؤ۔"

طاہرہ کے جاتے ہی لالی نے جھٹ پٹ کپڑے تبدیل کئے۔ اپنی پتلون اور قمیص تہہ کر کے بغل میں دبالی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے وہ جوتی بھی کپڑوں کے اندر رکھ لی جو ماسٹر جی نے عام استعمال کے لیے دی تھی۔ لالی نے گھڑی دیکھی' ساڑھے دس بج رہے تھے۔

طاہرہ دوبارہ کمرے میں آئی۔ اس نے لالی کو دیکھا اور حیرت سے بولی۔ "ارے! تم تو بالکل پینڈو لگ رہے ہو۔" اس نے لالی کو دو سو روپے کے نوٹ دیئے۔ "لو' یہ رکھ لو۔ تمہیں ضرورت پڑے گی۔"

لالی نے روپے لے کر دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔ طاہرہ نے ذرا دیر خاموش رہ کر چادر کے اندر سے چمڑے کی چار گول گول تھیلیاں نکال کر لالی کو دیں۔ "یہ کھسے ہیں۔ ماں جی نے کہا ہے' انھیں نُ کے چاروں کھروں میں پہنا دینا تاکہ کھوجی مُ کا سراغ لگانے نکلیں تو کھروں کے نشان پہچان نہ سکیں۔ سمجھ گئے؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" لالی نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔ "اپنے ماسٹر جی رسا گیری کا دھندا بھی کرتے ہیں؟"

طاہرہ نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اب تم جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ بوری سامنے درختوں کے نیچے کھڑی ہے' اسے لے جاؤ۔"

لالی اڑ گیا۔ "نہیں' تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" وہ آگے بڑھا۔ اس نے برآمدے میں کھلنے والا دروازہ کھولا اور طاہرہ کو مخاطب کیا۔ "چلو آگے بڑھو۔ جو طے ہوا ہے' وہی ہوگا۔" اس کا



لہجہ تلخ ہو گیا۔ "تمہیں بھگا کر نہیں لے جاؤں گا۔ ایسا ارادہ ہوتا تو یہاں سے جاتا ہی کیوں۔" طاہرہ نے گھبرا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازے کی اوٹ میں اس کی ماں کھڑی تھی۔ لالی نے طاہرہ کو خاموش پا کر کہا۔

"خاما خا کا نکھرا نہ کرو۔ آگے بڑھو۔ میرا منہ کیا تک رہی ہو۔"

طاہرہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی اور لالی کے ساتھ بیٹھک سے باہر نکلی۔ بھینس درختوں کے نیچے کھڑی تھی۔ لالی نے اسے دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ بھوری بھینس تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ بھینس کے چاروں کھروں میں چمڑے کے کھسے چڑھا دیئے۔ رسی کھولی اور بھینس کو آگے بڑھانے کے لیے دھیرے دھیرے تت تت کی آواز نکالی۔

بھینس آگے بڑھی۔ لالی اس کی رسی پکڑ کر چلنے لگا۔ طاہرہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے اپنا بدن چادر سے چھپا رکھا تھا۔

آسمان پر گہرا غبار چھایا تھا۔ چاندنی دھندلی اور میلی میلی تھی۔ طاہرہ بہت خوف زدہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی چل رہی تھی۔ ہر آہٹ پر کانپ اٹھتی۔ کسی قریب کی گلی میں کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ اس کی آواز سن کر طاہرہ ایسی بدحواس ہوئی کہ گرتے گرتے بچی۔

لالی نے جھٹ بازو پکڑ کر اسے سنبھال لیا اور جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ دونوں گھر سے لگ بھگ سو قدم کے فاصلے پر تھے اور ایک درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑے تھے۔ طاہرہ آہستہ آہستہ ہانپ رہی تھی۔ لالی کو اس پر ترس آ گیا۔

"تم واپس چلی جاؤ۔ زبان کی تم جتنی فروٹ ہو اتنی ہی بزدل اور ڈرپوک ہو' بالکل چھچھوندر کی طرح۔ آہٹ ہوئی اور چر چر کرتی بھاگی۔" طاہرہ نے اس کی باتوں کا بالکل برا نہ مانا۔ مسکرا کر بولی۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ! تم بہت نیک بندے ہو۔"

لالی نے اس کی جانب ذرا جھک کر دھیرے سے سرگوشی کی۔ "میں بالکل نیک بندہ نہیں ہوں۔ ہاں تم بہت نیک اور چنگی ہو۔ نہ شادی ہوئی نہ ویاہ اور دھیجے میں میرے لیے یہ مُ لے آئیں اور دو سو روپے بھی۔" طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑی تو لالی نے اسے ٹوکا اور اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"اپنے بچے کا نام لالی رکھنا۔"

"لالا!" وہ حیرت سے بولی۔ "یہ کیا نام ہوا؟"

"میرا نام بھی لالی ہے۔ میں بھی اپنی ماں کے پیٹ میں بالکل اسی طرح آیا تھا۔ علوم نہیں' میرا پیئو کون ہے؟ میری ماں کے ویاہ کے بعد جو میرا پیئو بنا' وہ مجھے ہمیشہ حرام دا کہتا۔ ماں کو گالاں نکالتا' اور گھر سے مار کر باہر کر دیتا۔ مجھے اس سے ملنے نہ دیتا۔" وہ ایک لمحے کو رکا۔ "میرے ساتھ تمہارا ویاہ ہو جاتا تو میں تمہارے بچے کو کبھی حرام دا نہ کہتا۔ تمہیں مار کر کبھی گھر سے نہ نکالتا۔ پر میرے ہاتھ میں تو ویاہ کی لکیر ہی نہیں ہے۔"

طاہرہ نے نظر بھر کو لالی کو دیکھا اور واپس جانے کا ارادہ بدل دیا۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تمہیں گاؤں کے نکڑ پر جا کر رخصت کروں گی۔"

لالی نے مسکرا کر کہا۔ "اتنی جلدی جلدی فیصلے نہ بدلا کرو۔ ایک گڑھے سے نکلو گی تو دوسرے میں گر جاؤ گی۔" "معاً" رات کے سناٹے میں آہٹ ابھری۔ لالی نے ہولے سے طاہرہ کو دھکا دیا۔

"جاؤ' کوئی آ رہا ہے۔"

طاہرہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے گھر کی جانب چلی گئی۔ لالی آگے بڑھ گیا۔



## ۹

لالی جہانگیرہ میں داخل ہو کر شاداں کے گھر پر پہنچا تو رات ڈھل رہی تھی۔ اس نے بھینس گھر کے دروازے کے نزدیک ایک درخت سے باندھی اور دیوار پھاند کر آنگن میں آہستہ سے اتر گیا۔ شاداں آنگن میں سو رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ لالی نے قریب جا کر دھیرے سے شاداں کا کندھا جھنجوڑا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"وے لالی توں' تو بالکل جٹ لگ رہا ہے۔ میں تو ڈر گئی تھی' کون آ گیا؟"

"ڈرمت' میں تجھے اغوا کرنے نہیں آیا۔ یہ بتا تیری بوری کا کیا بنا؟"

"مرگئی' ملک نے اسے مار ڈالا۔" وہ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ ذرا دیر خاموش رہی۔ پھر شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ "میں ملک کا خون پی لوں گی۔ اس کی بوٹیاں چبا ڈالوں گی۔"

"بوری کو ملک نے نہیں' میں نے مارا۔ لے میری بوٹیاں نوچ کر چبا۔"

"لالی! تو یہاں سے چلا جا۔ مجھے کچھ چنگا نہیں لگتا۔" شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "تیں نوں پتہ ہے' میں نے بوری کے کارن بالے کا گلا کاٹ ڈالا۔"

لالی نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تاجی تو کمرے میں نہیں ہے؟"

"نہیں وہ آج سویرے مجھ سے لڑ جھگڑ کر اپنے گھر چلی گئی۔"

لالی نے شاداں کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ "میرے ساتھ آ۔"

شاداں ہاتھ چھڑاتے ہوئے بیزاری سے بولی۔ "لالی! مجھے تنگ نہ کر۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میرا جی کرتا ہے' اپنا گوشت نوچ ڈالوں۔"

انکار کے باوجود لالی اسے کھینچتا ہوا آنگن کے دوسرے سرے پر لے گیا۔ مگر جب وہ دروازے کی جانب بڑھا تو شاداں نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ آنکھیں نکال کر بولی۔ ”کیا چاہتا ہے؟ میں تیرے سنگ نہیں جاؤں گی۔“

”پاگل نہ بن‘ تیری مرضی کے بنا تجھے کوئی اپنے سنگ نہیں لے جا سکتا۔ یہ بات تو بھی جانتی ہے۔ فیر کیوں ڈرتی ہے۔“ لالی نے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ ”دروازے تک تو آجا۔ یہ تو تیرے ہی گھر کی دہلیج ہے۔“

شاداں آہستہ آہستہ دروازے تک چلی گئی۔ لالی نے دروازہ کھولا۔ باہر گیا اور بھینس کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ شاداں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

”ہائے! یہ مُجھ تو کہاں سے لے آیا؟“

لالی نے دروازہ بند کیا۔ ”ٹھیک طرح دیکھ لے۔ بوری ہے اور دھرلی بھی ہے۔ پکا اٹھاراں سیر دودھ دیتی ہے۔ نیلی بار ہی کی کھولی ہے۔ اب تو ہنس دے۔ تیری بوری واپس آ گئی۔“

شاداں نے بھینس کی گردن اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ ”لگتی تو ویسی ہی ہے۔“ پھر اس کی تھوتھنی سہلاتے ہوئے بولی۔ ”اٹھاراں ہی سیر دودھ دیتی ہے نا؟“

”بیٹھ جا‘ تھنوں کے نیچے۔ دوہ کر دیکھ لے۔“

”اس وکھت؟ تیرا مگز تو نہیں چل گیا۔ یہ بتا کہاں سے لایا؟“ اس کی نظر بھینس کے کھروں پر پڑی۔ ”چوری کر کے تو نہیں لایا؟ اس کے کھرے میں کھسے کیوں پڑے ہیں؟“

”اس لیے کہ کھوجی اس کا کھرا نہ نکال سکیں۔“ وہ نہایت ڈھٹائی سے بولا۔ ”ویسے یہ مجھے دہیج میں ملی ہے۔ گھر والی تو نہیں ملی۔ اس کی مجھے ضرورت بھی نہیں تھی۔“

”ٹھیک ٹھیک بتا؟“

”میں نے کبھی تجھ سے جھوٹ بولا ہے۔“ لالی نے مسکرا کر بتایا۔ ”اسے نہ لاتا تو گھر والی گلے پڑ جاتی۔ تھی تو ایسی سوہنی‘ تجھے کیا بتاؤں۔ لہور کے کالج میں پڑھتی ہے‘ پر وہ گھبن مُجھ ہے۔ اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔“

”تیری باتیں بالکل سمجھ نہیں آئیں۔“ وہ بیزاری سے بولی۔ ”صاف صاف بات کر۔“

”آرام سے بیٹھ کر تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے یہ بتا‘ اس روز میرے جانے کے بعد کیا ہوا؟“

”تیرے جاتے ہی ملک اپنے کرندوں کو لے کر آ گیا۔ مجھے زبردستی پکڑ کر اپنی حویلی میں لے گیا۔ بہت لال پیلا ہوا۔ بہت نراض ہوا۔ مارنے کو بار بار اٹھا۔ مجھے دھمکی دی کہ کسی سے نہ کہوں کہ



بوری اس کی گولی لگنے سے مر گئی۔ پر پنڈ میں یہ بات سب کو ملوم ہے۔“ وہ اپنی بات کہتے کہتے دم بھر کو رکی۔ ”بوری کو اس کے کی اور کرندے اسی وکھت ریڑھے میں ڈال کر لے گئے۔ کصائی کو دے دیا ہو گا۔ دور کسی گڑھے شڑھے میں ڈال دیا ہو گا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”ملک سو روپے دیتا تھا۔ میں نے نہیں لیے۔ خالی ہاتھ چلی آئی۔“

”ٹھیک ہی کیا۔ اس نے پولیس تو نہیں بلائی؟“

”نہیں! بوری کے مرنے کے بعد ڈر گیا۔ پر اپنی بندوک کے بارے میں بار بار پوچھتا تھا۔ توں نے اس کا کیا کیا؟“

”ادھر پڑیلی کی ایک جھاڑی میں پھینک دی۔“ لالی نے بے نیازی سے کہا۔ ”اب تو یہ سوچ۔ کل سب پوچھیں گے‘ یہ مُجھ کہاں سے آئی‘ تو کیا کہے گی؟“

”ہائے! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ بتا کیا کہوں؟“

”تیرا کھسم کہہ دے گا‘ یہ مُجھ اس نے تجھے دی ہے؟“

”کہہ دے گا۔ ضرور کہہ دے گا۔ جو کہوں گی‘ وہی کہہ دے گا۔“

”وہ تجھے اتنا پیار کرتا ہے تب بھی اس کے پاس نہیں جاتی۔ اس سے اتنا خار کیوں کھاتی ہے؟“

”تیں نوں پتہ نہیں‘ مجھے وہ کبھی پسند نہیں آیا۔“ وہ خیالوں میں کھو گئی۔ ذرا دیر خاموش رہ کر بولی۔ ”میری ماں مر گئی تھی۔ سوتیلی ماں تھی۔ وہ مجھے بہت تنگ کرتی تھی۔ مارتی تھی۔ کھانے کو نہیں دیتی تھی۔ ننگی ننگی گالاں نکالتی تھی۔ میں چھوٹی سی تھی تو اس نے کھیر دین سے میرا ویاہ کر دیا۔ میرے گھر والے کا نام کھیر دین ہے۔ توں نے اسے نہیں دیکھا۔ بالکل ادھکڑ ہے۔ آدھے سے زیادہ تو اس کی داڑھی اور سر کے بال چٹے ہیں۔ ہائے‘ ایسی بری شکل ہے اس کی‘ تجھے کیا بتاؤں۔ یہ لما منہ اور باہر نکلے ہوئے یہ لمے لمے دانت۔ بالکل دندلو ہے۔ گصہ تو اسے آتا ہی نہیں۔ کبھی لڑائی جھگڑا نہیں کرتا۔ کوئی آنکھ دکھائے تو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ سب کہتے ہیں۔ ہائے‘ کھیر دین کتنا نیک بندہ ہے‘ کتنا بھلا ہے۔ فرشتہ ہے فرشتہ۔ شاداں ہی بری ہے۔“ وہ غصے سے ایک دم بھپر گئی۔ ”ایسا ہی بھلا ہے تو اس فرشتے سے اپنی دھی‘ اپنی بھین کیوں نہیں ویاہ دی؟ شاداں کیوں اس کے گلے میں ڈھول بنا کر ڈال دی؟ ماں نے چپکے سے تین سو روپے جو لیے تھے۔ ہائے کتنے سستے داموں بیچ دیا مجھے۔“

وہ نہ جانے اور کیا کیا کہتی مگر لالی نے اسے روک دیا۔ ”اپنی ہی کہے جائے گی یا دوسرے کی بھی سنے گی؟“

"کہہ کیا کہتا ہے؟"

"میرا کہا مان۔ کل سویرے ہی سویرے اپنے خصم کے پاس چلی جا۔ ہو سکے تو اسے اور بچوں کو چند روز کے لیے، یہاں لے آ۔"

"میں وہاں نہیں جاؤں گی۔" شاداں نے صاف انکار کر دیا۔ "ایک بار اس کے گھر سے چلی آئی، اب اس کی دہلیز پر قدم نہیں رکھوں گی۔ اس نے پہلے بھی بہت منتیں کیں پر میں نہیں گئی۔ اب کیسے جا سکتی ہوں؟"

"نہ جا۔" لالی جل کر بولا۔ "پکڑی جائے گی۔"

"تو کیا سچ مچ، تُو نے چوری کی ہے؟"

"پیئو کی طرف سے چوری کی ہے، ماں اور دھی کی طرف سے دہیج میں ملی ہے۔ یہ دو سو روپے بھی ملے ہیں۔" لالی نے دھوتی کے ڈب سے روپے نکالے اور شاداں کو دے کر بولا۔ "لے یہ رکھ لے۔ مان لے، پولیس کوئی چکر شکر چلائے تو کچھ دے دلا کر معاملہ دبا دینا اور دیکھ، کل ضرور کھیر دین کے پاس جانا۔ وندلو تجھے اپنے لمبے لمبے دانتوں سے کاٹ تو نہیں کھائے گا۔ ویسے بھی تجھے برسوں کاٹتا رہا ہے۔ چند روز اور کاٹ لے گا تو تیرا کیا بگڑ جائے گا۔" لالی نے اسے نرم لہجے میں سمجھایا۔ "ضد نہ کر، میرا کہا مان۔ ورنہ گھر آئی مُہ بھی ہاتھ سے جائے گی اور خود بھی کسی چکر میں پڑ جائے گی۔ بول، کیا کہتی ہے؟"

"توں کہتا ہے تو چلی جاؤں گی۔" شاداں صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے رضامند ہو گئی۔ "سویرے ہی سویرے چلی جاؤں گی۔"

"یہ بتا کپڑے لے آئی؟"

"نہیں، درزی پنڈ چھوڑ کر شہر چلا گیا۔ برا نہ مان۔ کل شام تک ٹھیر جا۔ میں ضرور تیرے لیے، کمیض سلوا کر لے آؤں گی۔ دھوتی کا کیا ہے وہ میری لے لے۔ ویسے چدر سے بھی کام چل جائے گا۔"

"اب ضرورت بھی نہیں، مجھے اب جانا ہے۔ ابھی رات رہتی ہے۔ اندھیرے میں نکل جاؤں گا۔ دیکھ، سویرے اپنے خصم کے پاس چلی جانا۔"

"تجھے کہہ تو دیا، چلی جاؤں گی، ضرور چلی جاؤں گی۔" شاداں نے بھینس کی رسی پکڑی اور لالی کو روک کر بولی۔ "بوری کو باندھ لوں۔ توں اکیلا نہیں جائے گا۔ میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

"آج نہیں۔ اب تو میرے ساتھ اس روز چلے گی جس روز میں تجھے بھگا کر لے جاؤں گا۔ تیار



رہنا۔"

"بکواس نہ کر۔" شاداں منہ بگاڑ کر بولی۔ "توں تو اڑیل ٹٹو ہے۔"

لالی کھل کر مسکرایا۔ "دیکھ اتنا تو ہوا۔ کنجر سے مجھے اڑیل ٹٹو بنا دیا۔ سیڑھی سیڑھی نیچے اتر رہی ہے۔" وہ آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

☆

لالی اس راستے کی جانب بڑھا جو ریل کی پٹڑی کی طرف جاتا تھا۔ اسی راستے سے وہ پہلے بھی جہانگیرہ آ چکا تھا اور اب اس سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ وہ جلد سے جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔ ابھی اسے خاصا لمبا فاصلہ طے کرنا تھا۔ رات ختم ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ مگر وہ دو ڈھائی میل آگے گیا تھا کہ ایک موڑ پر قریب سے آواز آئی۔

"چوہدری! تیرے پاس ماچس تو ہو گی؟"

لالی سنی ان سنی کر کے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ ایک شخص اندھیرے سے نکل کر اس کی جانب بڑھا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" وہ سائیکل پر سوار تھا۔ لالی نے دھندلی دھندلی چاندنی میں فوراً بھانپ لیا کہ وہ سادہ لباس میں پولیس کا کانسٹیبل ہے۔ وہ لمبے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ ڈھلتی عمر کے باعث اس کی کمر ذرا جھک گئی تھی۔ لالی نے ٹالنے کے لیے کہا۔

"میرے پاس ماچس نہیں ہے۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

وہ آگے بڑھ گیا۔ لیکن کانسٹیبل نے اسے جانے نہیں دیا، پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "چوہدری! گل سن۔"

لالی ٹھہر گیا۔ مگر خاموش رہا۔ کانسٹیبل نے سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور جھک کر اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "لگتا ہے، تجھے کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟" وہ لالی کو مشتبہ نظروں سے گھورنے لگا۔

لالی نے جھٹ کہا۔ "تجھے ایسے ہی شبہ ہوا۔ میں تو اس پنڈ میں پہلی بار آیا تھا۔" اس نے چاہا کہ بڑھ کر آگے نکل جائے۔ لیکن کانسٹیبل نے اس کا بازو تھام کر روک لیا۔ "بات تو سن۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "تو لالی تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" لالی نے صاف انکار کر دیا۔ "میں نے کہا نہیں، تجھے شبہ ہوا۔"

"میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔" کانسٹیبل نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تو لالی ہے۔ پچھلے دنوں جیل سے نکل کر بھاگا ہے۔"

"تجھے کیسے ملوم ہوا میں لالی ہوں۔" لالی نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے اسے دیکھا۔ "خالی پیلی تھانے داری جمانے کھڑا ہو گیا۔"

"میں نے تھانے میں تیری تصویر دیکھی ہے۔ تو لالی ہی ہے۔" کانسٹیبل نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تو میری نظروں کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ ۳۰ سال ہو گئے، پولیس کی نوکری کرتے۔ ایک سے ایک اونچا مجرم دیکھا ہے اور ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔"

لالی نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ دس روپے کا نوٹ دھوتی کے ڈب سے نکالا اور کانسٹیبل کی طرف بڑھاتے ہوئے گویا ہوا۔

"لے اسے رکھ لے۔"

کانسٹیبل نے دس روپے کا نوٹ تو لے لیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ "تیرے لیے تو دو ہزار روپے کا انعام ہے۔ تیرا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟"

لالی نے ایک نوٹ اور نکالا اور کانسٹیبل کو دے کر بولا۔ "میرے پاس اب صرف ریل کا کرایہ رہ گیا ہے، وہ تجھے نہیں دوں گا۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "ساتھ ہی یہ بھی سن لے۔ میرا رستہ روکا تو یہیں لٹا دوں گا۔"

لالی نے جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ ہلکا سا جھٹکا دے کر ہاتھ کا شکنجہ کسا تو ادھیڑ عمر کانسٹیبل غیں غیں کرنے لگا۔ "خانہ خراب، میری گردن تو چھوڑ۔ میں نے کب تیرا رستہ روکا۔" لالی نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اپنی گردن سہلاتے ہوئے بولا۔ "تیرے ہاتھ تو لوہے کے لگتے ہیں۔ تو نے تو میری گردن ہی توڑ دی تھی۔" وہ ذرا سا رکا۔

"جائے گا کہاں؟"

"بیکار کی ٹرٹر نہ کر۔" لالی نے اسے ڈانٹا۔

"ناراض نہ ہو۔ میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ پولیس کی ایک پارٹی ذرا دیر پہلے ادھر سے گزری ہے۔ سب کے سب مسلح ہیں۔ صوبے دار بھی ان کے ساتھ ہے۔"

"راؤنڈ پر نکلے ہیں؟" لالی نے دریافت کیا۔ اس کے لہجے سے تشویش جھلک رہی تھی۔

"نہیں۔" کانسٹیبل ابھی تک رک رک کر اپنی گردن سہلا رہا تھا۔ "پرسوں رات یوسف والا



ریلوے کراسنگ پر زبردست ڈاکا پڑا۔ ڈاکوؤں نے بس لوٹ لی۔ گولی بھی چلائی۔ ایک زخمی اسپتال جاتے جاتے راستے ہی میں چل بسا۔ جب سے یہ واردات ہوئی ہے پولیس ہر طرف بھاگ دوڑ کرتی پھر رہی ہے۔ ویسے میں تو اپنے بھائی کے پنڈ جا رہا تھا۔ وہ سخت بیمار ہے۔" اس نے توقف کیا۔ "مخبروں نے بتایا ہے، ڈاکو ادھر ہی کہیں چھپے بیٹھے ہیں۔"

"صوبے دار کدھر گیا ہے؟"

کانسٹیبل نے شمال کی سمت ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "پوری پارٹی ادھر گئی ہے۔" لالی کو بھی اسی طرف جانا تھا۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ اسے کوئی دوسرا راستہ معلوم نہیں تھا۔ کانسٹیبل نے اسے خاموش دیکھ کر دریافت کیا۔ "تیں نوں کتھے جانا ہے؟"

"جدھر پولیس پارٹی گئی ہے۔"

"پر تو تو سٹیشن جائے گا۔"

"ہاں۔" لالی نے انکار نہیں کیا۔ حالانکہ اسے اسٹیشن ہرگز نہیں جانا تھا۔ مگر وہ یہ ضرور جانتا تھا لہ قادر آباد اسٹیشن کے قریب پہنچ کر اسے اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کا راستہ مل جائے گا۔

"میری مان تو اس طرف سے نکل جا۔" کانسٹیبل نے اس راستے سے ذرا ہٹ کر ایک طرف شارہ کیا۔ "یہ رستہ چھوٹا ہے اور تیرے لیے ٹھیک بھی رہے گا۔ ایسا کر سیدھا سیدھا چلا جا۔ آگے ا کر چو ملے گا۔ یہ برساتی نالا چک ۲۰۱۔ بی کے نزدیک سے گزرتا ہے۔" وہ گردن اٹھا کر سوچنے لگا۔ "چو یہاں سے چار میل تو ہوگا۔ اس پر پہنچ کر ایسا کرنا، اس پار نہ جانا۔ چو کے کنارے چلا انا۔ اس رستے پر جھنگر ہے، جھاڑیاں بہت ہیں۔ تجھے کوئی دیکھ بھی نہ پائے گا۔ جہاں چو مڑتا ہے اں سے پورب کی طرف جانے والا رستہ پکڑنا۔ آگے جا کر نہر ملے گی وہ قادر آباد سٹیشن کے نزدیک ے گزر کر لوئر باری دو آب سے مل جاتی ہے۔ سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا، بالکل سمجھ گیا۔" لالی تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "پر تجھے ایک گل بتا دوں۔ اگر دو ہزار نام کے چکر میں تو نے مجھے پھنسوا دیا اور میں پکڑا گیا تو اتنا سمجھ لے، میں جیل سے سیدھا یہاں ں گا۔ تجھے چھوڑوں گا نہیں۔" یہ کہہ کر لالی نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ "میرا نام لالی ہے۔ اتنا یاد ھنا۔"

"تو کس چکر میں پڑ گیا۔ میرا نام واحد ہے۔ ادھر مجھے سب جانتے ہیں۔ پہلے بھی کئی مجرم پکڑوا چکا ہ۔ دوبار اسی چکر میں زخمی ہو کر اسپتال بھی گیا۔ ان پر تجھ سے زیادہ انعام تھا پر ہر بار انعام اوپر ں کو ملا کس ا کی وردی میں ایک سے دو پھول لگ گئے۔ مجھے کیا ملا۔ کپتان صاحب نے ہاتھ ملایا

اور کندھا تھپک دیا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ میری تنخواہ ۲۰ روپے سے آگے نہ بڑھی۔ ۵ بچے ہیں۔ گھر والی ہے اور اندھی ماں ہے۔" اس کا لہجہ اور تلخ ہوگیا۔ "ذرا سوچ تو' اپنے پر کیا بیتتی ہے۔ میری ماں تو اندھی ہے۔ اوپر والوں کی دونوں آنکھیں ہیں۔ تب بھی اندھے ہیں۔"

لالی بہت متاثر ہوا۔ اس نے کانسٹیبل کی باتوں پر اعتبار بھی کرلیا۔ ڈب سے دس روپے کا ایک نوٹ اور نکالا اور کانسٹیبل کو دے کر بولا۔ "لے' یہ بھی رکھ لے۔ پروا نہ کر۔ اپنا کام چل جائے گا۔" وہ اس سمت بڑھا جدھر کانسٹیبل نے جانے کی ہدایت کی تھی۔

کانسٹیبل نے چلتے چلتے ٹوکا۔ "دیکھ بھال کے رستہ چلنا۔ اتنا دھیان رکھنا' ڈاکوؤں کی دھاڑ بھی اسی علاکے میں ہے۔" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اس راستے پر چل پڑا جو کانسٹیبل نے بتایا تھا۔

چار' ساڑھے چار میل راستہ طے کر کے وہ برساتی نالے پر پہنچا اور اس کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگا۔ کانسٹیبل نے ٹھیک کہا تھا۔ اس راستے پر جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں' گھنی بھی اور اونچی بھی۔ لالی جھاڑیوں کی اوٹ میں تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھتا گیا۔ وہ مڑ مڑ کر چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا بھی جاتا۔ پولیس کا بھی خطرہ تھا اور ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہونے کا بھی دھڑکا تھا۔

☆

ایک گھنی جھاڑی کے قریب اندھیرے میں دو سائے لہرائے۔ لالی سنبھلا بھی نہ تھا کہ کسی نے پیچھے سے اسے دبوچ لیا۔ ایسی مضبوطی سے گرفت میں لیا کہ لالی بے بس ہوگیا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا' ایک قوی ہیکل نوجوان اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچے خونخوار نظروں سے گھور رہا ہے۔ آن کی آن میں اسی وضع قطع کے دو اور نوجوان جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے کرتے اور خوب گھیردار شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ ایک کے چہرے پر ڈھاٹا بھی بندھا تھا۔ لالی فوراً سمجھ گیا کہ وہ کون ہیں۔ یہ وہی ڈاکو تھے جنھوں نے پرسوں رات ریلوے کراسنگ پر بس لوٹی تھی۔ ایک ڈاکو نے لالی سے پوچھا۔

"کون ہے تو؟"

لالی نے غچا دے کر نکل جانا چاہا۔ "سٹیشن جا رہا ہوں۔ میں نے ملتان کے لیے گڈی پکڑنی ہے۔"

پیچھے کھڑے ہوئے ڈاکو نے جو دونوں ہاتھوں سے لالی کو جکڑے ہوئے تھا' اونچی آواز سے کہا۔ "مجھے تو پولیسا جان پڑتا ہے۔"



"مخبر ہوگا۔" دوسرے نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

لالی نے انکار میں گردن ہلائی۔ "نہیں۔"

"ٹھیک ٹھیک بتا' کون ہے؟" سامنے کھڑے ہوئے ڈاکو نے لالی کے منہ پر تڑاق سے تھپڑ رسید کیا۔ لالی کا ایک گال اور کان جھنجھنا کے رہ گئے۔ آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔ اس نے بے بسی سے کہا۔ "یارو! مارتے کیوں ہو؟ میں سچ سچ بتادوں گا۔" اس نے اپنا گال سہلایا۔ "میرا نام لالی ہے۔ میں جیل سے بھاگا ہوا کیدی ہوں۔"

چند لمحے وہ خاموش کھڑے رہے۔ ان کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں لالی کی بات پر یقین نہیں آیا۔ ایک نے شبے کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"ادھر کس لیے آیا تھا؟"

"پولیس کے ڈر سے۔ پولیس میری تلاش میں ہے۔ دو ہزار کا انعام میری گرفتاری پر رکھا گیا ہے۔"

"دو ہزار کا انعام؟" دوسرے نے حیرت سے کہا۔ "اوئے پھیرو! یہ تو کوئی اونچی چیز لگتا ہے۔"

پھیرو نے لالی کے بازو کا گوشت ٹٹولا اور اس کی مونچھ مروڑ کر اونچی کی۔ مسکرا کر بولا۔ "لگتا بھی زور آور ہے۔"

لالی نے عاجزی سے کہا۔ "یار! میری کمر تو چھوڑ۔ میں بھاگا نہیں جا رہا ہوں۔"

پھیرو نے اونچی آواز سے کہا۔ "عالم! چھوڑ دے اسے۔" عالم نے لالی کو اپنی گرفت سے آزاد کردیا۔

لالی گڑگڑا کر بولا۔ "جو پوچھنا ہے' پوچھ لو۔ ابھی اندھیرا ہے' میں سٹیشن چلا جاؤں گا۔"

مگر انھوں نے لالی کو جانے نہیں دیا۔ اسے اپنے نرغے میں لے کر ایک طرف چل دیئے۔ انھوں نے خشک برساتی نالہ عبور کیا اور دوسری طرف پہنچ کر گھنے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھنے لگے۔

قریب جا کر لالی نے دیکھا' وہاں بھی دو ڈاکو موجود ہیں۔ ایک مٹی کے تودے پر درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس بارہ بور کی دو نالی بندوق رکھی تھی۔ اپنی آن بان سے وہ ان کا سرغنہ لگتا تھا۔ اس نے لالی کو دیکھ کر دور ہی سے پوچھا۔

"کون ہے یہ؟"

پھ نے جواب دیا۔ "ٹھیک سے پتہ نہیں۔ کہتا ہے' جیل سے نکل کے بھاگا ہے۔"

عالم بولا۔ "یہ بھی کہتا ہے' اس کی گرفتاری پر دو ہزار کا انعام ہے۔"

سرغنہ نے لالی کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا۔ "سنا تو میں نے بھی ہے کہ پچھلے دنوں دو قیدی جیل سے نکل بھاگے۔" اس نے لالی سے پوچھا۔ "جیل کس چکر میں گیا تھا۔ کسی کا خون کیا تھا؟"

لالی نے جواب دیا۔ "نہیں۔"

"ڈکیتی کی تھی؟"

"نہیں۔" لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔

"فیر جیل کیوں ہوئی تھی؟ کوئی چھوہری شوہری بھگائی تھی؟"

"نہیں جی' میں ایسا کام نہیں کرتا۔" لالی نے آہستہ سے کہا۔ "سیکل چرائی تھی۔"

"اوئے چوّ! اتی وڈی توپ چلائی۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ اپنے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہوا۔ "لو سن لو۔ اس نیولے کے جیل سے بھاگنے پر دو ہزار کا انعام رکھا ہے۔ پولیس کی مت ماری گئی ہے۔" اس نے ڈپٹ کر لالی سے کہا۔ "اوئے نیولے! ادھر آ میرے نزدیک۔"

لالی اس کے پاس چلا گیا۔ وہ اپنی ٹانگوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "لے' میری ٹانگیں دبا۔" لالی خاموشی سے اس کے نزدیک بیٹھ کر ٹانگیں دبانے لگا۔ ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے عالم کی جانب مڑ کر دیکھا۔

"رشید بلاّ ابھی تک نہیں لوٹا؟"

عالم نے جواب دیا۔ "اب تو جی مشکل ہی لگتا ہے۔ اجالا ہو گیا ہے۔ شام کو آئے گا وہ۔"

سرغنہ اونچی آواز سے گرجا۔ "تم سبھی چلے آئے۔ چاروں طرف پولیس پھیلی ہے اور تم یہاں کھڑے ہو۔ جاؤ' جا کر ہوشیاری سے ادھر ادھر دیکھتے رہو۔ خطرہ ہو تو فوراً سیٹی مارو۔" وہ پاس کھڑے ہوئے ڈاکو سے مخاطب ہوا۔ "کلیرے' تو بھی جا۔ کسی اونچے درخت پر چڑھ کر دور دور تک نظر ڈال لینا۔"

سب چلے گئے۔ صرف لالی رہ گیا۔ وہ گردن جھکائے سرغنہ کے پیر دباتا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے لالی کو مخاطب کیا۔ "نیولے!"

اس دفعہ لالی بھڑک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "دیکھو جی! مجھے نیولا شیولا مت کہو۔" ڈاکو نے جھٹ بندوق پر ہاتھ رکھا۔ تیوری پر بل ڈال کر چیخا۔ "کیا کہا؟"

لالی مرعوب نہیں ہوا۔ گردن اونچی کر کے گویا ہوا۔ "میرا نام لالی ہے' نیولا نہیں۔"



"چل لالی ہی سہی۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا اور بندوق پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی جان لے' میرا نام داد محمد ساہو ہے۔ چھ خون کر چکا ہوں' پرسوں رات والا ساتواں تھا۔ تو چوری چکاری کرنے والا مجھے کیا جانے۔ پولیس جانتی ہے مجھے۔ میرے سر کی بولی پنج ہزار رکھی گئی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے ساہو' میں تجھے نہیں جانتا۔" لالی اس کے پیر دباتے ہوئے بولا۔ "تجھے کون نہیں جانتا؟ مگر مجھے گلہ ہے پولیس تو مجھے جانتی ہے' توں نہیں جانتا۔ جانتا ہوتا تو میرا رستہ نہ روکتا۔ مجھ سے تو تیں نوں کوئی خطرہ نہیں۔"

"اب تو اجالا بھی پھیل گیا۔ یہاں سے نکل کے کہاں جائے گا؟" داد محمد ساہو نے لالی کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تو نے تو اپنا ٹھکانا بھی دیکھ لیا۔ ابھی تجھے نہیں جانے دوں گا۔ دن یہیں کاٹ لے۔ رات کو اپنے ساتھ نکل چلنا۔ رشید بلاّ آجاتا تو میں آج ہی نکل جاتا۔ مجھے اسی کا انتظار ہے۔ شام تک آہی جائے گا۔"

لالی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا اور خاموشی سے ساہو کے پیر دباتا رہا۔ ذرا دیر بعد ساہو درخت سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ "لے ذرا کندھے بھی دباوے۔ بہت تھک گیا ہوں۔ رات بھر راؤنڈ پر رہا۔ پولیسے گھات میں ہیں۔ اپنے کو بھی چوکس رہنا پڑتا ہے۔" وہ چند لمحے آنکھیں بند کئے چپ بیٹھا رہا پھر لالی سے مخاطب ہوا۔ "لگتا تو جی دار ہے۔ کہاں پڑ گیا چوری چکاری میں؟ کیا دھرا ہے اس میں؟ پوچھو چرایا کیا؟ صرف ایک سیکل' ملا کیا؟ دو سو سے بھی کم اور سزا دو سال سے اوپر ہی ہوئی ہوگی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "جی کرے تو لگ جا اپنے ساتھ لین میں۔ ڈکیتی کا مزا بھی دیکھ لے۔ لومڑی سے ایک دم شیر بن جائے گا' شیر۔ کیا سمجھا؟"

"ڈاکے تو میں نے بھی ڈالے ہیں۔ راشن ڈپو لوٹا تھا' ایک پیٹرول پمپ بھی لوٹا۔" لالی اپنی بات کہتے کہتے ذرا سا رکا۔ "پر اس وکھت تو مجھے رحیم داد کے پاس جانا ہے۔"

"کون رحیم داد؟"

"وہی جو میرے ساتھ جیل سے فرار ہوا ہے۔"

"گولی مار اسے۔ اپنی سوچ۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "میں اس سے دھوکا نہیں کر سکتا۔"

"جیسی تیری مرضی۔ لیکن جب تک اپنا ادھر پڑاؤ ہے' تو نہیں جا سکتا۔ دن تو تجھے یہیں کاٹنا پڑے گا۔ رات کو تیرے بارے میں سوچوں گا۔"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ مگر ذرا ہی دیر بعد لالی کو اس بیگار سے نجات مل گئی۔ داد محمد ساہو بولا۔ "بس کر۔ نیند آ رہی ہو تو یہیں لیٹ جا۔ پروا نہ کر۔ دوپہر کی روٹی تجھے بھی ملے گی۔"

لالی اٹھا اور کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے گٹھری سرہانے رکھ کر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ نرم نرم جھونکوں سے آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

سہ پہر کو لالی بیدار ہوا۔ ساہو کھیس بچھائے بے خبر سو رہا تھا۔ سامنے فقیرا بندوق سنبھالے چوکس بیٹھا تھا۔ لالی بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ فقیرا اس کے لیے کھانا لے آیا۔ باسی روٹی تھی، اور اس کے ساتھ صرف پیاز اور ہری مرچ تھی۔ البتہ پینے کو پانی گلاس بھر کر ملا۔ کھانا کھا کر لالی پھر لیٹ گیا مگر اسے نیند نہیں آئی۔ وہ پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ فقیرا خاموش بیٹھا لالی کو گھورتا رہا۔ عالم ایک بار آیا مگر ساہو کو سوتا پا کر چپ چاپ واپس چلا گیا۔

لالی پیشاب کرنے اٹھا۔ اس نے کچھ دور آگے جانا چاہا تو فقیرا بھی بندوق سنبھالے اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ لالی نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ پیشاب کرنے کے بعد اپنی جگہ آ کر لیٹ گیا۔ مگر اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ اس کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے۔ اس نگرانی سے لالی سخت پریشان ہوا۔ رات کا جانا بھی مشکل نظر آیا۔

اسی پریشانی میں شام ہو گئی۔ داد محمد ساہو بیدار ہو گیا۔ مگر اس نے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ دیر بیٹھا انگڑائیاں لیتا رہا۔ اس نے پانی منگوا کر پیا۔ بندوق سنبھالی اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ فقیرا جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔

لالی اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ درختوں کے نیچے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد ساہو واپس آیا۔ اس کے ہم راہ پھیرو بھی تھا۔ دونوں کھیس پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ وہ اس قدر آہستہ آہستہ بول رہے تھے کہ لالی ٹھیک سے کچھ نہیں سن سکا۔ البتہ ان کی باتوں سے اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ رشید بلّا ابھی تک واپس نہیں آیا اور اس کے نہ آنے سے ساہو بہت پریشان ہے۔

اندھیرا خوب گہرا ہو گیا تھا۔ ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آتی تھی۔ پھیرو جا چکا تھا۔ فقیرا بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا۔ ساہو اکیلا بیٹھا تھا اور سگریٹ سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ دھوئیں کی تیز بو سے لالی تاڑ گیا کہ وہ چرس بھری سگریٹ پی رہا ہے۔ لالی اور ساہو ایک دوسرے سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھے تھے۔ مگر دونوں خاموش تھے۔ اسی دوران سکنالے کے اس پار سے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی اونچی آواز سے بول رہا ہو۔ ساہو نے سگریٹ بجھا دی اور فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔



بندوق اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ ذرا دیر بعد اندھیرے میں کوئی تیز تیز قدموں چلتا ہوا آیا۔ یہ عالم تھا۔

ساہو نے پوچھا۔ "عالم! یہ آوازیں کیسی آ رہی ہیں؟"

"رشید بلّے نے مروا دیا۔"

"بات کیا ہے؟ ٹھیک ٹھیک بتا؟"

"پولیس نے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ انسپکٹر منہ سے بھونپو لگا کر بول رہا ہے۔ کہتا ہے 'ہتھیار ڈال دو۔'" یہ کہہ کر عالم رکا، پھر غصے سے چیخا۔ "کہاں گیا وہ حرام دا؟ میں نے پہلے ہی کہا تھا' یہ پولیس کا مخبر ہے۔" یہ کہتا ہوا عالم اندھیرے میں اٹکل سے آگے بڑھا اور لالی کے قریب پہنچ کر اس نے زور سے کمر پر لات ماری۔ لالی بلبلا کر زمین پر گر پڑا۔

وہ لالی کو اور مارتا مگر ساہو نے روک دیا۔ "رہنے دے عالم! اس سے بعد میں نمٹ لیں گے۔" وہ لالی سے مخاطب ہوا۔ "یہاں سے ہلا تو تیرے لیے فضول ایک کارتوس خراب کرنا پڑے گا۔"

"مجھے ایک کارتوس خراب ہی کر لینے دے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

ساہو نے ڈپٹ کر کہا۔ "بکواس نہ کر۔ اس چڑی چور کو گولی مار' کام کی بات کر۔ رشید بلّا جانے کس چکر میں پھنس گیا۔ راشن پانی اپنے پاس مک گیا ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے آج ہی کرنا ہو گا۔ کل پولیس کا گھیرا توڑ کر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ بتا' انسپکٹر کتھے ہے؟"

"چوکے اس پار جھاڑیوں کے پیچھے۔ آواز وہیں سے آ رہی ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے سنی ہے۔"

"ایسا کر' کفیرے کو میرے پاس بھیج دے۔ تو ملنگی کے ساتھ مورچہ لگا کر انسپکٹر کی پارٹی پر فائر کھول۔ پھیرو سے کہہ' وہ اور دارا تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مورچے لگا دیں۔ سمٹ کر رہنا۔ دور دور نہ بکھر جانا۔ فائر ایک ساتھ کھولنا۔ ایسا لگے جیسے چاروں طرف سے فائرنگ ہو رہی ہے۔"

"اب میں چلوں؟"

ساہو زور سے دہاڑا۔ "پوری گل تو سن۔ جھیتی نہ کر' ورنہ مروا دے گا۔ میں کفیرے کے ساتھ پیچھے سے پولیس کا گھیرا توڑ کر نکلنے کی کوشش کروں گا۔ مال پانی اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔ جب میری طرف فائرنگ ہلکی پڑ جائے' تو تم چاروں تیز فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹنا شروع کر دینا اور اندھا دھند گولی چلاتے ہوئے نکل جانا۔ میں نہر کی پلی کے پاس تمہارا انتظار کروں گا۔ ہر بات پوری ھ گیا؟"

"پروا نہ کر۔ پولیس سے پہلی بار ٹاکرا نہیں ہے۔ پہلے بھی بہت گولی چلی ہے۔ اس دفعہ صاف نکل جائیں گے۔ راؤنڈ بھی اپنے پاس کافی ہیں۔"

"اب تو جا۔ کفیرے کو بھیج دے۔"

عالم چلا گیا۔ ساہو بندوق سنبھال کر آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔

لالی زمین پر سہما ہوا پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور ساہو کے قریب جا کر صفائی پیش کرنے لگا۔

"سچ کہتا ہوں' میں لالی ہی ہوں' جیل سے بھاگا ہوا کیدی۔ میں پولیس کا مخبر نہیں ہوں۔ نہ جانے کیسے میرے بارے میں تجھے شبہ ہوگیا۔ میری بات کا یکین مان۔ جیسی چاہے کسم لے لے۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

ساہو بے نیازی سے بولا۔ "میں کب کہہ رہا ہوں' تو لالی نہیں ہے۔ پولیس کا مخبر تو تجھے عالم بتاتا ہے۔ پتہ نہیں' کیسے اسے تجھ پر مخبر ہونے کا شبہ ہوگیا۔ کوئی بات تو ضرور ہوگی۔"

"میں تو صبح سے تیرے سامنے ہوں۔ کہیں گیا بھی نہیں۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تیرا ادھر آنا ہی کم شبے کی بات نہیں۔ تو کہتا تھا سٹیشن جانا ہے۔ کون سا سٹیشن؟ ادھر کوئی سٹیشن نہیں ہے۔ تو نے خود ہی شبہ پیدا کیا۔"

لالی عاجزی سے بولا۔ "رب سونہہ' میں لالی ہوں' جیل سے....."

ساہو نے اس کی بات کاٹ کر غصے سے کہا۔ "سن لیا' تو لالی ہے' جیل سے بھاگا ہوا کیدی ہے۔ میں نے تیری بات سچ مان لی۔ تو میرا مہمانہ کھا' بکواس بند کر اور چپ کر کے بیٹھ جا۔"

لالی نے اس کے بعد ایک لفظ نہیں کہا۔ خاموشی سے اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد فقیرا آگیا۔ اس کے پہنچتے ہی ساہو درخت کے تنے کے پاس اندھیرے میں گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں گٹھری تھی۔ اس نے گٹھری مضبوطی سے فقیرے کی پیٹھ پر باندھی' مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔

"ادھر آ۔ تجھے بھی میرے ساتھ چلنا ہے۔"

لالی لرز اٹھا۔ انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے لاٹھی وہیں چھوڑ دی مگر اپنی گٹھری نہیں چھوڑی۔ اسے بغل میں دابا اور ساہو کے پاس پہنچ گیا۔

تینوں درختوں کے نیچے گھپ اندھیرے میں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ لگ بھگ سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد داد محمد ساہو ٹھہر گیا۔ پلٹا اور منہ میں انگلیاں ڈال کر زور سے سیٹی بجائی۔ سیٹی بلند ہوتے ہی رات کے سناٹے میں برساتی نالے کے قریب گولیاں چلنے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ساہو اور فقیرا چپ کھڑے رہے۔ لالی بھی دم بخود تھا۔ عقب میں تابڑ توڑ گولیاں چلتی رہیں۔ لالی نے ساہو کی پشت پر لٹکی ہوئی فاضل بندوق دیکھ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "تیرے پاس کاربین ہے' مجھے بندوک دے دے۔ میں بالکل نہتا ہوں۔ تیری مدد بھی کرسکوں گا۔" ساہو نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "دے دوں گا۔ ضرور دے دوں گا۔" مگر اس نے بندوق دی نہیں۔ ذرا ہی دیر بعد اس نے لالی کو ہولے سے دھکا دیا۔



"آگے چل۔"

لالی آگے بڑھا۔ ساہو اور فقیرا اپنی جگہ کھڑے رہے۔ انھیں اپنے ہم راہ نہ پا کر لالی ٹھٹکا۔ پلٹ کر دیکھا۔ ساہو نے ڈپٹ کر کہا۔ "دیکھتا کیا ہے؟ آگے بڑھ۔" اس نے لالی کو قرابین کی زد پر رکھ لیا۔

لالی آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ آگے پولیس تھی' پیچھے ساہو اور فقیرا تھے۔ ادھر بھی بندوقیں تھیں اور ادھر بھی۔ لالی دونوں کے بیچ میں تھا اور بالکل غیر مسلح تھا۔ بھاگنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ اس کی پشت پر ساہو اور فقیرا بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھتا گیا۔ خشک پتے اس کے پیروں کے نیچے آہٹ پیدا کرتے رہے۔ جیسے ہی وہ درختوں سے نکل کر کھلی جگہ آیا سامنے سے پولیس نے بندوقوں سے باڑھ ماری۔ گولیاں چیختی ہوئی چلیں۔ لالی دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

فائرنگ مسلسل ہوتی رہی۔ گولیاں لالی کے سر پر سے' سینے پر سے' ٹانگوں پر سے سنساتی ہوئی گزرتی رہیں۔ وہ دم سادھے پڑا رہا۔ موت اس کے چاروں طرف منڈلاتی رہی۔ وہ رک رک کر سانس لیتا رہا۔

ساہو اور فقیرا نے جوابی فائرنگ نہیں کی۔ کچھ دیر بعد پولیس نے گولی چلانا بند کردی۔ لیکن برساتی نالے کے آس پاس فائرنگ پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی۔ لالی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کوئی گولی اس کے جسم کے کسی حصے میں لگی بھی ہے یا نہیں۔ اسے صرف اس قدر ہوش تھا کہ وہ زندہ ہے۔ لالی کی سمجھ میں یہ بات بھی نہ آئی کہ ساہو نے اسے تنہا آگے کیوں بڑھایا اور اسے پولیس کی گولیوں کی بوچھاڑ میں بالکل سامنے کیوں کردیا؟ اپنے منصوبے کے مطابق نہ اس نے جوابی فائرنگ کی نہ ہی پولیس کا گھیرا توڑنے کی کوشش کی۔ لالی ذرا دیر دم سادھے پڑا رہا پھر آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا درختوں کی جانب بڑھنے لگا۔ آخر وہ درختوں تلے اندھیرے میں آگیا۔ پولیس نے پھر فائرنگ شروع کردی۔

مگر اب لالی فائرنگ کی زد سے باہر تھا۔ ساہو اور فقیرے نے اس بار بھی پولیس کے جواب میں

گولی نہیں چلائی۔

لالی اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور تیزی سے ایک طرف بھاگا۔ وہ فائرنگ کی زد سے زیادہ سے زیادہ دور چلا جانا چاہتا تھا۔ کچھ فاصلے پر پہنچنے کے بعد وہ ٹھہر گیا اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔

اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ گٹھری ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبی ہے۔ پولیس رک رک کر فائرنگ کرتی رہی۔ لالی نے اپنے بہت قریب چاپ سنی۔ ساتھ ہی دھیمے لہجے میں باتوں کی آوازیں بھی ابھریں۔

"لالی مارا گیا۔" یہ فقیرے کی آواز تھی۔

فقیرے کے ساتھ ساہو تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اسے تو مارا ہی جانا تھا۔ آگے بھیجا اسی لیے تھا۔ دیکھ، پولیس کیسے چکر میں آگئی۔"

"پولیس ابھی تک اسی طرف گولی چلا رہی ہے۔"

"چلانے دے۔ چلانے دے۔ اپنے لیے ادھر کا رستہ صاف ہوگیا۔ چلا آ میرے پیچھے پیچھے۔"

دونوں دبے دبے قدموں آگے بڑھ گئے۔ لالی سانس روکے کھڑا رہا۔ ان کی آہٹ رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی۔ پھر ختم ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد اس طرف بھی گولیاں گونجیں جدھر ساہو اور فقیرا گئے تھے۔

☆

لالی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے، کدھر جائے؟ ہر سمت گولیاں تڑاتڑ چیخ رہی تھیں۔ مگر ٹھہرنا بھی خطرناک تھا۔ اسے جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہئے تھا۔ وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا ایک طرف بڑھا اور کچھ دور تک بڑھتا گیا۔ وہ اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ اسی وقت دور سے ٹارچ کی روشنی ابھری۔ لالی نے دیکھا کہ پھیرو خون میں لت پت پڑا ہے۔ وہ مرچکا تھا۔ ٹارچ بجھ گئی، مگر اس کے ساتھ ہی گولیوں کی بوچھار شروع ہوگئی۔ لالی جھٹ زمین پر گر پڑا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے برابر سے گزرتی رہیں۔ قریب ہی پھیرو کی لاش پڑی تھی۔

چاند نکل آیا تھا۔ مگر آسمان پر غبار اس قدر گہرا تھا کہ چاندنی بہت پھیکی اور دھندلی پڑ گئی تھی۔ درختوں کے نیچے گہرا اندھیرا تھا۔ لالی زیادہ دیر اس جگہ نہیں ٹھہرا۔ جیسے ہی فائرنگ ذرا تھمی، وہ درختوں کی آڑ لیتا ہوا تیزی سے بھاگا اور دور تک بھاگتا چلا گیا۔



وہ درختوں کے نیچے سے نکل کر باہر آگیا۔ مگر یہ دیکھ کر حواس باختہ ہوگیا کہ دھندلی چاندنی میں
ا۔ کانسٹیبل عین اس کے سامنے کھڑا ہے۔

کانسٹیبل بھی اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ لالی سراسیمہ ہو کر ٹھٹکا۔ ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو تیزی
، دوڑتا ہوا سامنے کی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں کچھ دور آگے گیا تھا کہ اس
، سنا، کانسٹیبل کہہ رہا تھا۔

"نہیں جی! وہ لالی ہی تھا۔ کانسٹیبل واحد نے جو کپڑے بتائے تھے، وہی پہنے ہوئے تھا۔ میرے
منے بالکل اس طرح کھڑا تھا جیسے تم کھڑے ہو۔"

"تم نے جھپٹ کر دبوچ نہ لیا؟"

"موقع ہی نہیں دیا اس نے۔ چھلاوے کی طرح نکل گیا، پر جائے گا کہاں؟"

لالی ان کی باتیں سنتا، جھاڑیوں میں دبکتا، گھبرایا ہوا اندھیرے میں تیزی سے چلتا رہا۔ پچاس
ٹھ گز فاصلہ اس نے جلدی جلدی طے کرلیا۔

اس کے آس پاس گہری خاموشی تھی۔ لیکن برساتی نالے کی طرف ابھی تک رک رک کر
ولیاں چل رہی تھیں۔ چلتے چلتے وہ ایک طرف مڑا تو قریب سے بھاری بھاری بوٹوں کی آہٹ
مری۔ ساتھ ہی آواز بھی آئی۔

"محمد خاں! ادھر اندھیرے میں جھاڑیوں تلے کوئی سفید چیز ہلتی نظر آتی ہے۔"

لالی نے جھٹ راستہ بدل دیا اور تیزی سے بھاگا۔ مگر ایک جھاڑی سے اس کی دھوتی ایسی الجھی
لہ وہ ننگا ہوگیا اور وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہولے ہولے دھوتی جھاڑی سے علیحدہ کی۔ ڈب
ے نوٹ نکل کر گر گئے تھے انھیں ٹٹول ٹٹول کر اکٹھا کیا اور دھوتی کے پلو میں باندھ لیا۔ مگر دھوتی
دبارہ نہیں باندھی بلکہ جلدی جلدی قمیص بھی اتار دی۔

قمیص اور دھوتی سفید تھی۔ ان کا اجلا پن اندھیرے میں دور سے جھلکتا تھا۔ لالی نے جوتے بھی
تار دیئے۔ جوتوں سے آہٹ پیدا ہوتی تھی۔ اس نے دھوتی کے ساتھ قمیص اور جوتے بھی گٹھری
بں باندھ لیے۔ اب وہ مادر زاد برہنہ تھا۔

کچھ دیر وہ جھاڑی کے نیچے دبکا بیٹھا رہا۔ جب قدموں کی آہٹ دور ہوگئی تو اس نے گٹھری بغل
بں دبائی اور جھاڑیوں کے درمیان چھپتا چھپاتا آگے بڑھا۔ اسے پولیس والوں کی چاپ برابر سنائی
ے رہی تھی۔ کبھی چاپ قریب آجاتی، کبھی دور ہوجاتی۔

کئی منٹ تک وہ اسی طرح جھاڑیوں کی اوٹ میں چلتا رہا۔ بار بار راستے بدلتا رہا۔ کہیں قدموں

کی رفتار تیز کردیتا، کہیں جھاڑی کی آڑ لے کر دبک جاتا۔ جھاڑیوں میں کانٹوں کی بہتات تھی۔

لالی کے برہنہ جسم پر کانٹوں سے جگہ جگہ خراشیں پڑ گئیں۔ خون رسنے لگا۔ مگر اس برہنگی سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ اندھیرے میں گھل مل گیا۔ پولیس کے لیے اس کا سراغ لگانا مشکل ہوگیا۔

چلتے چلتے وہ ایسی جگہ آگیا جہاں جھنگر ختم ہوگیا تھا۔ ساتھ ہی جھاڑیوں کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ سامنے چٹیل میدان تھا اور اس سے آگے کسی قدر بلندی پر درختوں کا جھنڈ تھا۔ درختوں کی آڑ سے زرد زرد روشنی کا ایک دھبا نظر آرہا تھا۔

لالی نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور سرپٹ بھاگا۔ وہ میدان سے گزرتا ہوا بلندی کی جانب لپکا۔ دور سے کوئی چیخا۔ "ٹھیر جا لالی!" مگر لالی ٹھہرا نہیں۔ دوبارہ اور زیادہ زور سے چیخنے کی آواز ابھری۔

"ٹھہر جا، نہیں، تو گولی چلا دوں گا۔"

لالی پھر بھی نہ ٹھہرا۔

گولی گہرے سناٹے میں زور سے گونجی اور لالی کے سر پر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ لالی نے بدحواس ہوکر اپنی رفتار اور تیز کردی۔



# ۹

لالی ایک گھنے درخت پر بندر کی طرح پھرتی سے چڑھ گیا۔ کچھ دیر شاخوں کی اوٹ میں دبکا ہوا بیٹھا رہا اور چوکنا نظروں سے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ جب درخت کے آس پاس کوئی نظر نہ آیا تو وہ ایک مضبوط ڈال سے چمٹ کر آہستہ آہستہ آگے کھسکنے لگا۔

اس نے ڈال کو دونوں ہاتھوں سے تھاما۔ ٹانگیں نیچے لٹکائیں۔ بنگلے کی چار دیواری پر پیر ٹکائے اور نہایت ہوشیاری سے نیچے اتر گیا۔ بنگلہ سامنے ہی تھا۔ بنگلے کی ایک کھڑکی سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ وہ پودوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا، دبے دبے قدموں چلتا، سیدھا اس کھڑکی پر پہنچا، جس سے روشنی جھلک رہی تھی۔ اس نے شیشے سے قریب ہوکر اندر جھانکا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

کھڑکی کا ایک شیشہ چٹخا ہوا تھا۔ لالی نے انگلی پھنسا کر شیشہ نصف سے زیادہ توڑ دیا۔ مگر ٹوٹے ہوئے شیشے کی تیز دھار سے انگلی کٹ گئی۔ خون بہنے لگا۔ اس نے انگلی ہونٹوں میں دبا کر خون چوسا اور گردن جھکا کر زمین پر تھوک دیا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کے اندر جلدی سے ہاتھ ڈالا اور چٹخنی کھول دی۔ آہستہ سے کھڑکی کا ایک پٹ ہٹا کر راستہ بنایا۔ اوپر چڑھا اور اندر کود گیا۔

سامنے میز پر لیمپ رکھا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی میں ہر چیز نظر آرہی تھی۔ لالی سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چار دیواری کے اس پار آہٹ ابھر رہی تھی۔ ساتھ ہی زور زور سے سیٹیاں بھی بجنے لگیں۔ لالی اور سراسیمہ ہوگیا۔

بنگلے کے بیرونی پھاٹک کے کھلنے کی آواز سنی۔ وہ بدحواس ہوکر آگے بڑھا اور ایک کرسی

سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ کرسی الٹ گئی۔ کرسی الٹنے سے آواز پیدا ہوئی۔ ساتھ ہی سامنے کا دروازہ کھلا۔ ایک شخص دھاری دار گاؤن پہنے دروازے سے نمودار ہوا۔ وہ گورا چٹا دہرے بدن کا آدمی تھا۔ چہرے پر بھوری بھوری پروقار مونچھیں تھیں۔ عمر چوالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول دبا تھا۔ دوسرا ہاتھ گاؤن کی جیب میں تھا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر لالی کو دیکھا۔ لالی اس کے سامنے بالکل ننگ دھڑنگ کھڑا تھا۔ سر کے بال گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ جسم پر بھی گرد ہی گرد تھی۔ جگہ جگہ آڑی ترچھی خراشیں بھی تھیں۔ ہونٹوں کے نیچے تازہ تازہ خون کا دھبا تھا جو ٹھوڑی سے نیچے تک چلا گیا تھا۔ وہ شخص لالی کی یہ ہیئت دیکھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کون ہے تو؟ اندر کیسے آ گیا؟"

ابھی اس نے اپنا جملہ پورا ہی کیا تھا کہ بنگلے کے باہر زور زور سے بولنے کی ملی جلی آوازیں ابھریں۔ لالی دہشت زدہ ہو کر بولا۔ "وہ، وہ پولیس۔" گھبراہٹ میں وہ پوری بات نہ کہہ سکا۔ خوف اور بھاگ دوڑ سے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا۔

"کیا پولیس تیرا پیچھا کر رہی ہے؟"

لالی نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ اس شخص نے دریافت کیا۔ "پولیس تیرا پیچھا کیوں کر رہی ہے؟"

لالی گڑگڑانے لگا۔ "مجھے بچا لیجیے۔ میں سب کچھ بتا دوں گا۔" ننگا دھڑنگا، خاک سے اٹا ہوا لالی دھندلی روشنی میں بڑا مسکین نظر آ رہا تھا۔ اس شخص نے اسے مسکرا کر دیکھا اور تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" اس نے ذرا تامل کیا۔ "یہیں کھڑا رہ۔ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ جس کمرے سے نکلا تھا پھر اس میں چلا گیا۔

لالی ایک گوشے میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا، کمرے میں ہر طرف اونچی اونچی الماریاں ہیں۔ الماریوں کے شیشوں کے پیچھے ترتیب سے رکھی ہوئی طرح طرح کی کتابیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف بڑی سی جھلکتی ہوئی میز تھی۔ میز پر لیمپ روشن تھا۔ اس پر دودھیا سرپوش تھا جس نے روشنی دھیمی کر دی تھی۔ میز پر کاغذات اور چند موٹی موٹی کتابیں رکھی تھیں۔

بنگلے کے پھاٹک پر آوازیں بند ہو گئیں تھیں۔ لالی ہنوز خاموش کھڑا تھا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ لالی نے اس کھڑکی کی جانب دیکھا جسے پھاند کر وہ کمرے کے اندر آیا تھا۔ کھڑکی کا ایک پٹ ابھی تک کھلا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کی جانب بڑھا۔ اس اثناء میں بنگلے کے صدر دروازے کے کھلنے اور بند



ونے کی آواز سناٹے میں ابھری۔ لالی ٹھہر گیا۔ وہ دم بخود اور سہما ہوا تھا۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزر ئے۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور وہ شخص کمرے میں دوبارہ داخل ہوا۔ اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا، غصے سے ڈانٹا۔ "کپڑے تو پہن لے۔"

لالی نے منہ سے ایک لفظ نہ نکالا۔ چپ چاپ گٹھری کھولی اور دھوتی نکال کر کمر کے گرد باندھنے لگا۔ اس شخص نے پوچھا۔ "کیا تو جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے؟"

"ہاں جی۔" لالی نے آہستہ سے گردن ہلائی۔

"میں نے تجھے پولیس سے بچا لیا ہے۔ اس لیے کہ میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا۔" اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ "میں میاں حیات محمد خان وٹو ہوں۔ تو میری پناہ میں ہے۔"

لالی نے نظریں نیچے کر کے آہستہ سے کہا۔ "آپ نے جی مجھ پر بہت احسان کیا۔" اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔ "بات یہ ہے جی۔۔۔۔"

حیات محمد نے اس کی بات نہیں سنی۔ رعب اور دبدبے سے بولا۔ "تجھ سے صبح بات ہوگی۔" وہ چند لمحے خاموش کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اس نے انگلی کے اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا۔

"میرے ساتھ آ۔" وہ آگے بڑھا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

کمرے کا دروازہ کھول کر دونوں راہ داری میں داخل ہوئے اور کچھ دور جا کر ایک دروازے کے سامنے ٹھہر گئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ حیات محمد خاں وٹو نے لالی سے کہا۔ "اندر جا کر سو جا۔ دروازہ بند کر لینا۔ اب تو بالکل محفوظ ہے۔"

لالی اندر چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ یہ مختصر سی کوٹھری تھی۔ ایک دیوار کی بلندی پر روشن دان تھا۔ اس پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں جڑی ہوئی تھیں۔ روشن دان سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ لالی دروازے کے پاس خاموش کھڑا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کی نظریں کوٹھری کے اندھیرے سے مانوس ہو گئیں۔ اس نے دیکھا، دیوار کے ساتھ اونچا چبوترہ ہے۔ لالی نے اس پر ہاتھ پھیرا۔ چبوترا صاف ستھرا تھا۔ وہ خاموشی سے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اس نے گٹھری سر کے نیچے رکھی اور ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ مگر اسے نیند نہیں آئی۔

وہ چپ لیٹا رہا۔ گھنٹے سوا گھنٹے بعد وہ چبوترے سے نیچے اترا، گٹھری بغل میں دبائی، ہولے ہولے چلتا ہوا دروازے پر پہنچا اور کان لگا کر سن گن لی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ وہ چند لمحے دروازے کے قریب بت بنا کھڑا رہا۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کے دروازہ کھولنا چاہا۔ مگر دروازہ باہر سے

بند تھا۔ لالی نے پریشان ہو کر دروازہ دھیرے سے ہلایا۔ باہر سے کسی کی کھنکار ابھری۔ لالی ایسا دہشت زدہ ہوا کہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ گہری سانس بھری اور دل گرفتہ ہو کر دروازے پر سر ٹکا دیا۔

صبح کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ لالی نے دھڑکتے دل اور سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا، دروازے کے بیچوں بیچ اونچے قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی کمر سے ریوالور لگائے کھڑا ہے۔ تمتمایا ہوا گہرا سانولا چہرہ، سر پر گھنے بال، ڈاڑھی مونچھ صاف، آنکھیں موٹی موٹی اور سرخی مائل۔ اپنے ڈیل ڈول اور وضع قطع سے وہ خاصا ہیبت ناک لگتا تھا۔

اس نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ گردن کو ذرا سا خم دے کر باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لالی باہر آگیا۔ وہ شخص آگے بڑھا، لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں ایک تنگ غلام گردش سے گزر کر بنگلے کے باہر آگئے۔

لالی نے چلتے چلتے اسے ٹوکا۔ "مجھے کہاں لیے جا رہا ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ دونوں ایک پر فضا باغ کے کنارے کنارے پگ ڈنڈی پر چل رہے تھے۔ پگ ڈنڈی خاصی کشادہ تھی۔ اس پر سرخ بجری بچھی تھی جو جوتوں کی رگڑ سے ہلکی ہلکی آہٹ پیدا کر رہی تھی۔ سورج چڑھ کر درختوں کے اوپر آگیا تھا۔ ہر طرف بسنتی دھوپ پھیلی تھی۔ مارچ کا تیسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔ دھوپ میں ہلکی ہلکی تمازت تھی۔ پت جھڑ ختم ہو رہا تھا۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ باغ بہت وسیع تھا۔ جگہ جگہ رنگا رنگ پھولوں کے تختے ہوا سے جھوم رہے تھے۔

باغ میں پھلوں اور میووں کے درخت تھے۔ نرم نرم گھاس کا دور تک پھیلا ہوا سبزہ زار تھا۔ درمیان سے پتھر کی بنی ہوئی پختہ نہر گزرتی تھی۔ نہر پر دو بڑے بڑے فوارے تھے۔ فواروں سے پھوٹتی ہوئی پانی کی جھالر دھوپ میں جھلملا رہی تھی۔ باغ کے اس پار درختوں کی اوٹ سے بنگلے کی اونچی چار دیواری نظر آتی تھی۔

پگ ڈنڈی سے ذرا ہٹ کر ایک بوڑھا شخص گردن جھکائے، ترنگلی سے خشک پتے اکٹھا کرنے میں مصروف تھا۔ دونوں اس کے قریب پہنچے تو اس نے مڑ کر دیکھا اور ترنگلی کا لمبا دستہ سنبھال کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور مسکرا کر آہستہ سے کہا۔

"کتھے چلا دھیور؟"

دھیور نے کوئی جواب نہیں دیا، نہ اس کی جانب دیکھا۔ وہ لالی کے آگے آگے مرغ کی طرح



ردن اونچی کیے چلتا رہا۔ مگر وہ جتنا قد آور جوان تھا، چال سے اتنا ہی ڈھیلا ڈھالا لگتا تھا۔ چلتا تو کمر واس طرح ہلکا سا خم دیتا کہ اس کے بھاری بھاری کولھے ہولے ہولے لچکتے۔ کچھ دور جا کر دھیور ہر گیا اور باغ کے اس گوشے کی جانب دیکھنے لگا جہاں چنبیلی کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے کنج کے نیچے ند کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ کرسیاں خالی تھیں۔ میز پر پانی سے بھرا ا شیشے کا قرابہ اور دو گلاس رکھے تھے۔ قریب ہی ایش ٹرے بھی موجود تھی۔ میز دیکھ کر اندازہ ہوتا ا کہ کچھ ہی دیر پہلے وہاں سے کوئی اٹھ کر گیا ہے۔ دھیور ذرا دیر رک کر واپس مڑا۔ اب وہ لالی کے م راہ بنگلے کے صدر دروازے کی جانب جا رہا تھا۔ دروازے کے سامنے اونچے، اونچے ستونوں کا رچ تھا۔ پورچ کے نیچے ایک لمبی چوڑی سیاہ بیوک کھڑی تھی۔ ڈرائیور جھاڑن سے کار کو جھاڑ پنچھ رہا تھا۔

بنگلہ قدیم طرز کا تھا۔ مگر خوب بڑا اور نہایت شاندار تھا۔ جگہ جگہ عشق پیچاں کی بیلیں چڑھی یں اور کھپریلوں کی خمیدہ چھت پر دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لالی نے بنگلے کی وہ کھڑکی بھی دیکھی س کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ یہ شیشہ اس نے پچھلی رات توڑا تھا۔ اس کی اس انگلی میں جو شیشہ ٹنے سے زخمی ہو گئی تھی، ابھی تک کسک تھی۔ دھیور بنگلے کی سمت بڑھتے بڑھتے لمحے بھر کو ٹھٹکا۔ رکچھ سوچ کر اس نے راستہ بدل دیا۔

دونوں آگے بڑھے۔ سامنے چار دیواری کا اونچا چوبی پھاٹک تھا۔ اب وہ اس راستے پر چل رہے تھے، جو پھاٹک سے بنگلے کے پورچ تک جاتا تھا۔ راستہ سرخ اینٹوں سے بنا تھا۔ دونوں جانب سایہ ر درخت تھے۔ پھاٹک سے کچھ فاصلے پر پختہ سائبان تھا۔ سائبان کے نیچے بجلی پیدا کرنے کا جنریٹر ا تھا۔ اس کا انجن، شور کرتا ہوا چل رہا تھا۔ قریب ہی باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانے کا کشادہ بوترا فرش سے لگ بھگ چار فٹ اونچا تھا۔ چبوترے کے بیچوں بیچ تنور تھا۔ دو تندورچی اس کے دیک بیٹھے جھپا جھپ روٹیاں لگا رہے تھے۔ تنور سے ذرا ہٹ کر مٹی کا بڑا سا چولھا تھا، جس پر گچا چڑھا تھا۔ دیگچے کے نیچے لکڑیاں جل رہی تھیں۔ باورچی خانے سے متصل نوکروں اور کمیوں ے کچے مکانات تھے۔ مکانات کا سلسلہ خاصی دور تک چلا گیا تھا۔ لیکن ہر طرف گہرا سکوت طاری ا۔ نوکر چاکر، ادھر ادھر چل پھر رہے تھے۔ مگر وہ چپ چاپ چلتے تھے۔ کوئی اونچی آواز سے نہیں تا تھا۔ جب لالی اور دھیور پھاٹک سے کچھ فاصلے پر رہ گئے تو لالی نے بے چین ہو کر ایک بار پھر ریافت کیا۔

"مار، نہ تو بتا، مجھے کہاں لیے جا رہا ہے؟"

اس دفعہ بھی دھیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پلٹ کر قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا اور خاموشی سے پھاٹک کی جانب بڑھنے لگا۔ پھاٹک کھلا تھا اور اس کے قریب دو مسلح پہریدار فرش پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔

انھوں نے نگاہیں اٹھا کر دھیور اور لالی کو دیکھا' لیکن کوئی بات نہیں کی۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پھاٹک سے گزر کر باہر آگئے۔ پھاٹک کے آگے کنکر کی بنی ہوئی نیم پختہ سڑک تھی جو شیشم اور بکائین کے درختوں کے سائے میں دور تک چلی گئی تھی۔

سڑک کے اس پار تا حد نظر کھیتوں کا سلسلہ پھیلا تھا۔ کھیتوں کے ایک طرف آم کے باغ تھے۔ درختوں سے بور جھڑ چکا تھا۔ کہیں کہیں شاخوں میں کیریاں بھی جھول رہی تھیں۔ دونوں نے سڑک پار کی۔ دوسری جانب پہنچے اور کھیتوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کھیتوں میں گندم کے پودے لہرا رہے تھے۔ پودوں کی لمبی لمبی پتیاں اور ان کے اوپر جھومتی ہوئی گندم کی بالیاں زرد پڑ گئی تھیں۔

دھیور اور لالی آگے بڑھتے گئے۔ دھیور آگے تھا اور لالی پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ گندم کے پودوں کو دیکھتا رہا اور پتیوں اور بالیوں کا بدلتا ہوا رنگ دیکھ کر سوچتا رہا کہ ربیع کی فصل ابھی پک کر تیار نہیں ہوئی۔ اس کی کٹائی میں لگ بھگ مہینہ بھر باقی ہے۔ مگر فصل بہت اچھی تھی۔ بالیاں گندم کے دانوں سے لدی ہوئی تھیں۔

گندم کے کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو درختوں کے نیچے ایک ٹریکٹر نظر آیا جس کا بونٹ کھلا ہوا تھا۔ ایک ادھیڑ شخص' جو وضع قطع سے مکینک نظر آتا تھا' ٹریکٹر کے انجن پر جھکا ہوا کسی پرزے کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ٹریکٹر کے عقب میں کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر ٹیوب ویل تھا۔ ٹیوب ویل سے نکلتی ہوئی پانی کی موٹی دھار' آبشار کی مانند اوپر سے نیچے بم بی میں گر رہی تھی۔ بم بی میں بھرا ہوا پانی آڈ اور نالیوں کے ذریعے سرسوں اور چنے کے کھیتوں میں پہنچ رہا تھا۔ سرسوں کے بسنتی پھول ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔

دھیور کچھ اور آگے بڑھا۔ سامنے دور تک پھیلا ہوا سبزہ زار تھا۔ سبزہ زار کے ارد گرد ٹاہلی' شہتوت اور سرس کے گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ دھیور چلتے چلتے رک گیا اور گردن اٹھا کر تجسس انگیز نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لالی بھی اس کے قریب ہی کھڑا تھا اور بالکل خاموش تھا۔ اس نے دھیور سے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔

ذرا ہی دیر بعد گھوڑے کے دوڑنے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں دور سے سنائی دیں۔ دونوں



ی سمت دیکھنے لگے' جدھر سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔ دیکھتے' دیکھتے درختوں کے ایک جھنڈ سے یاں حیات محمد خاں وٹو نمودار ہوا۔ وہ اس وقت گھڑ سواری کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ ایک ہاتھ میں ڑے کا چابک دبا تھا۔

وہ پیروں سے ایڑ دیتا ہوا گھوڑے کو دوڑا رہا تھا۔ عقب میں شکاری کتوں کا غول تھا جو زور زور سے بھونک رہے تھے اور گھوڑے کے پیچھے' پیچھے بھاگ رہے تھے۔ حیات محمد نے نہ دھیور اور لالی و دیکھا اور نہ ہی ان کی طرف آیا۔ بائیں موڑیں اور اس راستے پر گھوڑا دوڑانے لگا جو گھنے رختوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ جب میاں حیات محمد وٹو نظروں سے اوجھل ہوگیا تو دھیور پس مڑا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

دونوں بنگلے کے پھاٹک پر پہنچے۔ دھیور نے ہاتھ کے اشاروں سے منہ پھاڑ کر طرح طرح کی وازوں سے پہریداروں سے بات کی۔ لالی کو پہلی بار اس حقیقت کا سراغ ملا کہ دھیور بالکل گونگا ہے۔ پھاٹک پر تعینات ایک پہریدار نے اس کے اشاروں کو سمجھتے ہوئے بنگلے کے صدر دروازے ی جانب ہاتھ اٹھا کر بتایا۔

"میاں صاحب اندر چلے گئے۔"

دھیور خاموشی سے بنگلے کی جانب چل دیا۔ وہ لالی کے ہم راہ پورچ میں پہنچا۔ کار ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ ڈرائیور' دروازے کے سامنے سیڑھیوں پر خاموش بیٹھا تھا۔ دھیور کو دیکھ کر وہ ایک رف سرک گیا۔ مگر اس نے دھیور یا لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ دھیور اس کے قریب سے گزرتا ا آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا اور لالی کے ہم راہ اندر داخل ہوگیا۔ یہ خاصا طویل لاؤنج تھا۔ جگہ' لہ کیکٹس اور پام کے پودے گملوں میں لگے تھے۔ گملوں کے درمیان دو گرے ہاؤنڈ کتے چمڑے کے موٹے موٹے گدوں پر بیٹھے لمبی لمبی زبانیں نکالے ہانپ رہے تھے۔ انھوں نے قدموں کی آہٹ ن کر تیز نظروں سے دھیور اور لالی کو دیکھا۔ لیکن خاموش بیٹھے رہے۔

لاؤنج سے گزر کر دونوں وکٹورین طرز کے کشادہ ہال میں داخل ہوئے جس میں دبیز قالین کا فرش ا۔ ہال کی چھت' لاؤنج سے خاصی اونچی تھی۔ چھت کے بیچوں بیچ بہت بڑا بلوریں جھاڑ لٹک رہا ا۔ دیواروں پر چیتے اور تیندوے کے سروں اور کھالوں کے علاوہ قسم قسم کی تلواریں' خنجر' ھالیں' پرانی وضع کی لمبی لمبی بندوقیں اور قرابین آویزاں تھیں۔ دیواروں پر چند بڑی بڑی روغنی ماویر بھی لگی تھیں۔

ایک تصویر میں جو سب سے بڑی تھی اور نہایت نمایاں طور پر آویزاں تھی' حیات محمد گھنی

موچھوں والے ایک قد آور انگریز سے مصافحہ کر رہا تھا۔ مصافحہ کرتے ہوئے وہ اس قدر باادب بالملاحظہ بنا ہوا تھا کہ اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آتا تھا۔ ہال میں مخمل اور زر بغت کے صوفے اور دیوان قرینے سے رکھے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر نرم اور باریک ریشم کے پردے لہرا رہے تھے۔

دو نوجوان خادمائیں جھاڑن سے کھڑکیوں کے شیشے اور تصاویر جھاڑ پونچھ کر چمکا رہی تھیں۔ ایک شوخ اور عشوہ طراز خادمہ نے اپنی چھینٹ کی گھگریل ایک طرف سے پکڑ کر گھٹنے تک اوپر اٹھائی اور برہنہ پنڈلی کھجاتے ہوئے الھڑپن سے مسکرا کر دھیور کو دیکھا۔ دھیور نے غصے سے اس پر نظر ڈالی اور نفرت سے منہ بگاڑ کر آگے بڑھ گیا۔ ہال عبور کر کے لالی کے ساتھ ایک طویل غلام گردش میں داخل ہوا۔

غلام گردش میں بھی سرخ قالین کا فرش تھا۔ دیواروں پر دل فریب مناظر کی تصاویر آویزاں تھیں۔ دیوار گیریوں سے پھوٹتی ہوئی ہلکی ہلکی نیل گوں روشنی میں ہر چیز گویا خواب کے سایوں میں تیرتی نظر آتی تھی۔

غلام گردش میں کئی دروازے کھلتے تھے۔ ان پر ریشمی پردے پڑے تھے۔ دھیور ایک بند دروازے کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اندر جھانکا' لالی کی جانب متوجہ ہوا اور کمرے میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

لالی اس قدر گم صم تھا جیسے پگھل کر بنگلے کی طلسمی فضا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ اندر جاتے ہوئے اس کے قدم نہ اٹھتے تھے۔ دھیور نے اپنی لال لال آنکھوں سے اسے گھورا اور ہولے سے دھکا دیا۔ لالی جھٹ کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں روشنی بہت دھیمی تھی۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر دبیز پردے جھول رہے تھے۔ کمرے میں تمباکو کی تیز بو بسی ہوئی تھی۔ لالی ہکا بکا دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے دروازہ بند ہونے کی آہٹ سنی۔ پلٹ کر دیکھا' دھیور وہاں موجود نہیں تھا۔ اسی وقت کمرے کی پراسرار خاموشی میں بھاری بھرکم آواز ابھری۔

"ادھر آ۔"

لالی نے چونک کر دیکھا' کمرے کے ایک گوشے میں میاں حیات محمد خاں وٹو چوڑے چکلے صوفے پر بیٹھا ہے۔ لالی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے روبہ رو جا کر کھڑا ہو گیا۔ حیات نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ دبایا۔ قریب رکھا ہوا پیڈسٹل لیمپ روشن ہو گیا۔ حیات محمد خاں خاموش بیٹھا پائپ پر ہلکے ہلکے کش



لگا رہا تھا اور لالی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے برابر والے صوفے پر جرمن شیفرڈ نسل کا موٹا تازہ السیشن لیٹا تھا۔ کتے کا چہرہ نہایت خوفناک تھا۔ رنگ گہرا سیاہ تھا۔ صرف ٹانگوں اور منہ کا کچھ حصہ بھورا تھا۔

وہ لالی کو قریب پا کر غرانے لگا۔ لالی نے اس پر نظر ڈالی تو دہشت زدہ ہو کر سہم گیا۔ کتا غرا کر اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس پر جھپٹنا ہی چاہتا ہو۔ وہ گردن اٹھا کر زور سے بھونکا۔ اس کی آواز اس قدر ڈراؤنی تھی کہ پورا کمرہ گونج اٹھا۔ لالی لرز کر رہ گیا۔

حیات محمد نے گردن موڑ کر کتے کی جانب دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" وہ اس کی پیٹھ ایک ہاتھ سے آہستہ آہستہ تھپکنے لگا۔ کتے نے گردن نیچی کر لی اور غرانا بند کر دیا۔ حیات محمد چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے پائپ کی راکھ میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے میں جھاڑی اور لالی سے مخاطب ہوا۔

"میں نے تجھے سٹور میں بند کر دیا تھا۔ پتہ ہے میں نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔ "مجھے نہیں ملوم جی۔"

"مجھے شبہ تھا' تو فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔" حیات محمد نے گردن کو ذرا سا خم دے کر نہایت بارعب انداز میں دیکھا۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "میں نہیں چاہتا کہ تو پکڑا جائے اور میری بدنامی کا سبب بنے۔"

لالی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کی بات کا کیا جواب دے۔ وہ مجرم کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات نے کہا۔ "فی الحال یہاں سے جانے کا خیال چھوڑ دے۔ میں تیرے ہی بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ پورے علاقے میں پولیس پھیلی ہے۔ کل رات ڈاکوؤں سے پولیس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہوئی۔ ایک ڈاکو مارا گیا۔ دو پولیس والے زخمی ہوئے۔ پولیس نے پورے علاقے کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔" اپنی بلت کہتے' کہتے وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔

"کیا تو بھی ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہے؟ اگر ایسا ہے تو مجھے صاف' صاف بتا دے۔"

"میں تو جی انھیں بالکل نہیں جانتا۔ مجھے تو انھوں نے زبردستی پکڑ رکھا تھا۔ رات' پولیس کے ساتھ ان کی گولی چلی تو میں ان کے چنگل سے کسی نہ کسی طرح نکل بھاگا؟"

"سچ کہہ رہا ہے تو؟" میاں حیات محمد وٹو نے دریافت کیا۔

"میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا جی۔" لالی نے عاجزی سے کہا۔ "آپ نے جی مجھے

گرفتاری سے بچایا ہے۔"

"بندوق شندوق چلانی تو تجھے آتی ہی ہوگی؟"

"آتی ہے جی' بالکل آتی ہے۔" لالی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "مجھے تو کاربین اور رائفل بھی چلانی آتی ہے۔ نشانہ بھی میرا سچا ہے۔"

حیات محمد نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ "اب تو جا۔ رات کو بات ہوگی۔ دھیور تیرے ٹھہرنے اور کھانے پینے کا بندوبست کردے گا۔ دھیور گونگا ہے' بول نہیں سکتا۔ مگر سن سکتا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو اسے بتا دینا۔ یہاں تجھے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اب تو جا سکتا ہے۔"

لالی خاموشی سے باہر چلا گیا۔

☆

برآمدہ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے سے راہداری گزرتی تھی۔ برآمدے میں دروازے کھلتے تھے۔ دھیور نے ایک بند دروازہ کھولا۔ یہ کوٹھری نما مختصر کمرہ تھا۔ اس میں چارپائی تھی۔ چارپائی پر معمولی بستر تھا۔ کمرے میں کھڑکی بھی تھی۔ اس میں لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی تھیں۔ کھڑکی کے عین سامنے ملطر تھا۔ کوڑے کرکٹ کے اس ڈھیر کے ارد گرد جھاڑیاں اور گھنے درخت تھے۔ کمرے سے ملحق اتنا ہی بڑا ایک اور کمرہ تھا۔ اس میں دھیور کا قیام تھا۔ دونوں کمرے بنگلے کے عقبی حصے میں واقع تھے اور ایک بڑے کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کرکے بنائے گئے تھے۔

دروازہ کھول کر دھیور نے لالی کی طرف دیکھا اور کمرے کے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ لالی نے کمرے میں جا کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دھیور دروازے پر خاموش کھڑا تھا۔ لالی نے اپنی بڑھی ہوئی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیور سے کہا۔ "یار' کوئی نائی شائی ہوگا؟ میں نے ڈاڑھی بنوانی ہے۔ بہت بڑھ گئی ہے۔" دھیور نے اس کی بات سن کر آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور ایک طرف چلا گیا۔ لالی بستر پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد دھیور واپس آیا۔ اس کے ہم راہ نائی بھی تھا۔ وہ دبلا پتلا اور ادھیڑ تھا۔ اس نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ برآمدے میں دروازے کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔ لالی کمرے سے باہر آیا اور نائی کے سامنے فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ڈاڑھی بنوانی ہے۔" نائی نے کوئی جواب نہ دیا۔ استرے سے اس کی ڈاڑھی مونڈنے لگا۔

دھیور برآمدے میں رکھے ہوئے ایک چوڑے اسٹول پر بیٹھا دونوں کو دیکھتا رہا۔ ڈاڑھی



مونڈنے کے بعد نائی نے اپنی کسبت سے آئینہ نکالا اور لالی کی طرف بڑھا دیا۔ لالی نے آئینہ ہاتھ میں لے کر اپنا چہرہ مختلف زاویوں سے دیکھا۔ مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے معاً اسے اپنا حلیہ بدلنے کا خیال آیا۔ اس نے نائی سے کہا۔ "یار' مونچھیں بھی صاف کردے۔" اس نے گردن موڑ کر دھیور کی جانب دیکھا' زیرلب مسکرایا۔ "مجھے بھی دھیور کی طرح صفاچٹ بنا دے۔" اس کی بات سن کر دھیور نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

نائی بھی نہیں بولا۔ اس نے استرے سے لالی کی مونچھیں صاف کردیں۔ حجامت بنا کر نائی نے اپنا سامان کسبت میں رکھا اور لالی سے کچھ کہے بغیر چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔ لالی نے رخساروں پر ہاتھ پھیرا۔ اور دھیور کو مخاطب کرتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔ "لے یار تیری محبت میں' میں نے بھی اپنی مونچھیں صاف کرادیں۔ کیا یاد کرے گا' کوئی لالی ملا تھا۔ اب یہ بتا' نہانے دھونے کا کیا سیتا ہوگا؟ میں نہانا چاہتا ہوں۔ بھوک بھی زوروں کی لگی ہے۔ تو نے سویرے سے روٹی بھی نہیں کھلائی۔"

دھیور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ برآمدے کے برابر ہی دروازہ تھا۔ دھیور نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ یہ غسل خانہ تھا۔ سامنے دیوار پر آئینہ لگا تھا۔ اس کے برابر ہی لکڑی کے تختے پر کنگھا' صابن اور سر میں ڈالنے کے لیے شیشی میں تیل بھی موجود تھا۔ غسل خانے میں ایک طرف نلکا تھا اور اس کے نیچے فٹ بھر اونچا چبوترہ تھا۔ لالی نے غسل خانے کا دروازہ بند کیا۔ کپڑے اتارے اور نلکے کے نیچے چبوترے پر بیٹھ کر نہانے لگا۔ وہ صابن مل کر دیر تک نہاتا رہا۔

نہانے سے فارغ ہوا تو اس نے کھونٹی پر لٹکے ہوئے تولیے سے بدن پونچھا۔ کپڑے پہنے۔ سر میں تیل ڈالا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کنگھے سے بال سنوارے اور تروتازہ ہو کر غسل خانے سے باہر آگیا۔

دھیور برآمدے کے سامنے اسٹول پر بیٹھا تھا۔ لالی نے اسے دیکھا تو مسکرا کر بولا۔ "یار! میری گٹھڑی تو لا دے۔" اس نے اپنے لباس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "یہ کپڑے تو بہت گندے ہوگئے ہیں۔ گٹھڑی میں میرے کپڑے ہیں۔ انھیں نکال کر پہن لوں گا۔" دھیور نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

لالی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ غسل کرنے کے بعد اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ مگر وہ سویا نہیں۔ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ چند منٹ بعد دھیور واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں گٹھری دبی

تھی۔ اس نے گٹھری لالی کو دی اور اسٹول پر جا کر بیٹھ گیا۔ لالی نے کپڑے تبدیل نہیں کیے۔ گٹھری لے کر ایک طرف رکھ دی۔

کچھ اور وقت گزر گیا۔ ایک بوڑھی عورت کھانا لے کر آئی۔ اس نے دھیور کی جانب دیکھا اور کمرے میں داخل ہو کر کھانا لالی کے سامنے رکھ دیا۔ لالی نے اسے مخاطب کیا۔ "بے بے! پانی بھی پلا دے۔" عورت نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے میں ایک طرف المونیم کا گلاس رکھا تھا۔ عورت نے گلاس اٹھایا' خاموشی سے غسل خانے میں گئی اور پانی سے بھرا ہوا گلاس سر جھکا کر چپ چاپ سامنے رکھ دیا۔

لالی نے حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھا اور آہستہ سے پوچھا۔ "بے بے کیا تو بھی گونگی ہے؟" بوڑھی عورت نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹھہری۔ الٹے قدموں واپس چلی گئی۔

لالی کھانا کھانے لگا۔ کھانے میں تنوری روٹی اور چنے کی دال تھی۔ اس کے ساتھ جنڈ کی پھلیوں کا اچار بھی تھا۔

لالی نے کھانا کھایا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک بنگلے کے پراسرار ماحول کے بارے میں غور کرتا رہا۔ وہاں حیات محمد کے سوا ہر شخص گونگا تھا یا خاموش اور سہما ہوا نظر آتا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ دن ڈھلے وہ نیند سے بیدار ہوا۔ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ دروازے کے سامنے اسٹول خالی تھا۔ دھیور وہاں نہیں تھا۔ لالی چارپائی سے نیچے اترا اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ اسی وقت دھیور بھی اپنے کمرے سے نکل کر باہر آ گیا۔

لالی نے اسے دیکھ کر کہا۔ "یار دھیور! چائے شائے بھی ملے گی؟"

دھیور نے حسب معمول آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور راہ داری میں اس طرف چل دیا جدھر سے بوڑھی عورت کھانا لے کر آئی تھی۔ لالی کا جی چاہا کہ وہ بھی دھیور کے پیچھے پیچھے چلا جائے' لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ برآمدے میں خاموش کھڑا چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ مگر ہر طرف دیواریں تھیں اور جھکی ہوئی نیچی چھت تھی۔ ذرا دیر بعد دھیور مٹی کی ٹھوٹھی میں چائے لے کر آ گیا۔ چائے گرم تھی اور بہت میٹھی۔ اس میں شکر کے بجائے گڑ ڈالا گیا تھا۔ مگر دودھ کی مقدار زیادہ تھی۔

لالی نے چائے پی کر دھیور سے یارانہ گانٹھنے کی کوشش کی۔ مسکرا کر دریافت کیا۔ "دھیور! تیری گھر والی اور بچے کہاں ہیں؟"



دھیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بت بنا اسٹول پر خاموش بیٹھا رہا۔ مگر لالی خاموش نہ رہا۔ اس نے دھیور کو کریدا۔ "توں نے ویاہ نہیں کیا؟" دھیور نے انکار میں گردن ہلا دی۔ مگر اس کے چہرے سے بیزاری ٹپک رہی تھی۔

لالی نے اس کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ "اپنے تو جی تین بچے ہیں۔ بہت یاد آتے ہیں۔ مہینوں ہو گئے دیکھے ہوئے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ویسے تو یاد گھر والی بھی آتی ہے اور رات کو تو بہت یاد آتی ہے۔ سونے سے پہلے بہت چاؤ سے اپنی مج کا کوسا پلاتی تھی۔ ایسا گرم اور گاڑھا گاڑھا دودھ کہ پی کر مزا آ جاتا تھا۔"

دھیور نے اس کی باتیں سن کر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری اور بالکل سپاٹ تھا۔ لالی کہتا رہا۔ "جاڑے کی راتوں میں گھر والی ساتھ ہو تو یار' کوسا کیا بہار دکھاتا ہے۔ ایسی ایلل ہوتی ہے' تجھے کیا بتاؤں۔" یہ کہہ کر اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ دھیور کے چہرے پر رفتہ رفتہ جھنجلاہٹ بکھرنے لگی۔ اس نے اپنی لال لال آنکھوں سے گھورا۔ لیکن لالی اس کے گھورنے پر ذرا خائف نہ ہوا' بے تکلفی سے آنکھ مار کر بولا۔

"یار! تیرا ایسا ڈھو جوان' گھر والی کے بغیر تیرا گزارہ کیسے......"

دھیور نے اسے آگے کچھ نہ کہنے دیا۔ تیزی سے جھپٹا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا سر اور ٹھوڑی اس زور سے جھٹکا دے کر دبایا کہ لالی کی زبان دانتوں کے درمیان آ کر زخمی ہو گئی۔ وہ تلملا کے رہ گیا۔ دیر تک اس کی زبان میں ٹیس اٹھتی رہی۔ تکلیف سے وہ بول بھی نہ سکا۔ بھونچکا کھڑا سوچتا رہا کہ دھیور اچانک اس قدر خفا کیوں ہو گیا؟ اس نے تھوکا تو تھوک کے ساتھ خون بھی آیا۔ لالی چند لمحے غصے سے ہانپتا رہا آخر وہ اس دروازے کی جانب بڑھا' جو غلام گردش میں کھلتا تھا۔ وہ میاں حیات محمد ونو کے پاس جا کر دھیور کے وحشیانہ رویے کے خلاف فریاد کرنا چاہتا تھا۔ مگر دھیور نے اسے آگے جانے نہ دیا۔ لپک کر سامنے آ گیا۔ لالی نے آگے بڑھنا چاہا تو دھیور نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس زور سے دھکا دیا کہ لالی سنبھل نہ سکا۔ لڑھکتا ہوا کمرے کی دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑا۔

وہ گہری سانسیں بھرتا رہا اور قہر آلود نظروں سے دھیور کو گھورتا رہا۔ کچھ دیر وہ اسی عالم میں پڑا ہانپتا رہا۔ پھر ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا اٹھا اور دھیرے دھیرے دھیور کی طرف بڑھا۔ دھیور خاموش کھڑا رہا۔ لالی نے چاہا کہ جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لے۔ لیکن دھیور نے نہایت پھرتی سے اس کے دونوں ہاتھوں کی کلائیاں پکڑ لیں۔ لالی نے

جھٹکا دے کر اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو اسے اندازہ ہوا کہ دھیور کے ہاتھ لوہے کے شکنجوں کی مانند سخت اور مضبوط ہیں۔

ذرا دیر تک دونوں میں زور آزمائی ہوتی رہی۔ لالی نے بہت زور مارا' مگر وہ دھیور کی گرفت سے اپنے ہاتھ نہ چھڑا سکا۔ دھیور چٹان کی طرح اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ لالی نے کبڈی کے کھلاڑیوں کی طرح حلق سے "ڈھو" کی آواز نکالی۔ اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ اس کے دونوں ہاتھ دھیور کی پکڑ سے آزاد ہو گئے۔ دھیور کے قدم لڑکھڑا گئے۔ لالی نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ اچھلا اور سر جھکا کر پوری قوت سے دھیور کے سینے پر ٹکر ماری۔ وہ دھڑام سے پیٹھ کے بل گرا۔ لالی نے چاہا کہ جھپٹ کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے' مگر دھیور نے گرتے ہی جھٹ ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا اور تیندوے کی مانند تیز نظروں سے لالی کو گھورنے لگا۔

لالی جہاں تھا وہیں رک گیا۔ دھیور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آگے بڑھا اور قریب جا کر ایک ہاتھ لالی کی گردن پر رکھ کر پوری قوت سے دھکا دیا۔ لالی دہلیز سے ٹکرا کر لڑھکتا ہوا اپنی چارپائی کے پاس جا گرا۔ اس کے سر میں کراری چوٹ آئی۔ مگر سر پھٹا نہیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ سر میں شدید ٹیس اور کسک تھی۔ دھیور سامنے دروازے پر خاموش کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دبا تھا۔

لالی نے اس کی جانب نہیں دیکھا۔ سر کی چوٹ سے زیادہ لالی کو احساس ہزیمت نے تڑپا دیا۔ اپنی بے بسی پر اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ دھیور ذرا دیر تک کھڑا اسے گھورتا رہا' آخر دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

☆

شام کا جھٹپٹا ہوا تو اندھیرے کے ساتھ ہی بنگلے میں ہر طرف موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ لالی چارپائی کے پاس فرش پر گم صم بیٹھا رہا۔ جب اندھیرا زیادہ بڑھا تو دھیور نے لالٹین روشن کی۔ لالی کے کمرے میں آیا۔ اس نے لالٹین ایک طرف رکھ دی۔ لالی نے اس کی جانب نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ دھیور کمرے سے باہر چلا گیا' سناٹا اور بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد سناٹے میں چاپ سنائی دی۔ لالی نے گردن اٹھا کر دیکھا' سامنے بوڑھی عورت کھڑی ہے۔ وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ عورت لمحہ بھر کو ٹھٹکی۔ اس نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ جھک کر کھانا لالی کے سامنے رکھا۔ دن کے برتن اٹھائے اور سائے کی طرح خاموشی سے چلی گئی۔ لالی نے کھانا کھایا۔ مگر وہ ایک روٹی سے زیادہ نہ کھا سکا۔ چپ چاپ جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ خود کو بہت مضمحل اور تھکا ہوا محسوس کر رہا



تھا۔ دیر تک خاموش پڑا رہا' پھر سو گیا۔

دس بجے کے قریب دھیور نے لالی کو جگایا۔ باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ لالی نے اٹھ کر گٹھری کھولی۔ پتلون اور بش شرٹ نکال کر پہنی۔ خاموشی سے باہر نکلا اور دھیور کے ہم راہ چلنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ میاں حیات محمد کے سامنے کھڑا تھا۔ سیاہ السیشن اس وقت بھی صوفے پر بیٹھا تھا۔ حیات محمد وہسکی سے شغل کر رہا تھا۔

اس نے لالی کو نظریں اٹھا کر دیکھا۔ مونچھوں سے صاف چہرے اور سلوٹیں پڑی ملگجی پتلون اور بش شرٹ کو دیکھا مگر ان کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ صرف اتنا پوچھا۔

"ٹھیک ٹھاک ہے' کوئی تکلیف شکلیف تو نہیں؟"

لالی نے دھیور کی زیادتی اور اشتعال انگیزی کے خلاف احتجاج کیا۔ "ویسے تو جی ہر طرح کا آرام ہے' پر دھیور نے میرے ساتھ خاما خا ٹنٹا کیا۔ مجھے دھکا دے کر گرا دیا۔ پستول تان کر کھڑا ہو گیا۔"

"میں اسے سمجھا دوں گا۔ آگے وہ ٹھیک طرح پیش آئے گا۔" حیات محمد نے وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے کہا۔ "مگر وہ غیر ضروری بات کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دے گا اور جیسا وہ کہے گا تجھے ویسا ہی کرنا ہوگا۔ تو اس کے چارج میں ہے۔ تجھے یہ بات نہیں بھولنی چاہئے۔"

لالی اپنی بات پر اڑا رہا۔ "ساب' میرا اس کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر گرمی دکھائے گا تو اپنا ہاتھ بھی چل جائے گا۔ خاما خا' فیر کسی دن جھگڑا ٹنٹا ہو جائے گا۔ آج تو جی میں چپ کر گیا۔ پر آگے اس نے گرمی دکھائی تو...."

حیات ایک دم بپھر گیا۔ لالی کی بات کاٹ کر زور سے چیخا۔ "کیا کہنا چاہتا ہے؟" اس کی برہمی کے ساتھ ہی کتے نے گردن اٹھائی اور زور زور سے غرانے لگا۔

لالی نرم پڑ گیا۔ سر جھکا کر کسی قدر عاجزی سے بولا۔ "میاں صاحب! مجھے جانے کی اجازت دے دیجئے۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔"

حیات محمد نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے کہا۔ "جیل جانا چاہتا ہے؟"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات محمد خاں چند لمحے چپ بیٹھا رہا اور قریب بیٹھے ہوئے کتے کی پیٹھ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ "شام کو ڈی ایس پی میرے پاس آیا تھا۔ یہ تو اسے جرات نہ ہوئی کہ کھل کر تیرے بارے میں مجھ سے پوچھتا۔ مگر اس کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اسے شبہ ہے' تو میرے بنگلے میں ہے۔"

"... مجھے فوراً یہاں سے چلا جانا چاہئے۔"

"بیوقوف۔" حیات نے اسے غصے سے ڈانٹا۔ "یہاں سے نکلتے ہی تو گرفتار کرلیا جائے گا۔ پولیس تیری گھات میں ہر طرف بیٹھی ہے۔" اس نے وہسکی کا بڑا گھونٹ لیا۔ لہجے میں ٹھہراؤ پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"تو یہاں سے جانے کے لیے اتنا بے چین کیوں ہے؟"

"آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ صاف بات یہ ہے جی! مجھے رحیم داد کی بہت فکر ہے۔ میں چھیتی نال اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا ہوں۔"

"یہ رحیم داد وہی قیدی ہے نا جو تیرے ساتھ جیل سے فرار ہوا تھا؟"

"جی ساب! آپ اسے جانتے ہیں؟"

"نہیں۔" میاں حیات نے بے رخی سے جواب دیا۔ "اس کے بارے میں ڈی ایس پی نے صرف اتنا بتایا ہے کہ اسے اقدام قتل کے جرم میں سزا ہوئی تھی۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "سنا ہے دونوں پارٹیوں کے درمیان مسلح تصادم ہوا تھا۔ کچھ زخمی بھی ہوئے' مگر ان میں سے ایک زخمی پچھلے دنوں چل بسا۔"

لالی نے رحیم داد کی جانب سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "پر ساب! چھے سات مہینے تو کیس چلا۔ رحیم داد نے تین مہینے سے اوپر جیل میں سزا کے گزارے۔ اب تو یہ بات بہت پرانی ہوگئی۔"

"میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔" حیات محمد نے بے زاری سے کہا۔ "مجھے تو یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ بندہ مرگیا جو اس کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔ اب پولیس اس کے خلاف قتل کے الزام میں ۳۰۲ کا مقدمہ قائم کرنا چاہتی ہے۔ پہلے اسے دفعہ ۳۰۷ میں سزا ہوئی تھی۔ اب جرم کی نوعیت بدل کر زیادہ سنگین ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی ترمیم مقدمہ کی کارروائی بھی شروع ہوگئی ہے۔"

لالی نے کچھ نہ کہا۔ حیات بھی چپ بیٹھا رہا اور آہستہ آہستہ وہسکی کے گھونٹ بھرتا رہا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر اس نے لالی کو مخاطب کیا۔ "پولیس تجھے گرفتار کرنے کی سرتوڑ کوشش اس لیے کر رہی ہے۔" اپنی بات کہتے کہتے حیات محمد ذرا الجھا۔ "کیا نام ہے دوسرے مفرور قیدی کا؟"

لالی نے آہستہ سے جواب دیا۔ "رحیم داد۔"

"رحیم داد۔" حیات محمد نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ "پولیس تیرے ذریعے رحیم داد کا سراغ لگانا چاہتی ہے۔ پولیس کو ایسی اطلاعات ملی ہیں کہ کچھ دنوں پہلے وہ تیرے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ بعد میں روپوش ہوگیا اور اب تک لاپتہ ہے۔"



لالی نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ میاں حیات محمد وٹو نے ذرا دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔ "میں تجھے یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو بندہ رحیم داد کے ہاتھوں قتل ہوا' وہ صوبائی وزیر زراعت کا قریبی عزیز ہوتا تھا۔ بھانجا یا بھتیجا تھا۔ شاید کوئی اور رشتہ ہو۔ مجھے صحیح طور پر نہیں معلوم۔ وزیر کا پیو پہلے ادھر ہی ہوتا تھا۔ بعد میں لہور چلا گیا اور وہیں کوٹھی بنوا کر رہنے لگا۔ اب تو وہ بوڑھا ہوگیا ہے۔ کسی زمانے میں وڈا سیاست داں ہوتا تھا۔ مقتول کے گھر والے اس پر اور اس کے پتر پر بہت دباؤ ڈال رہے ہیں۔ للذا وہ تیری اور تیرے ساتھی رحیم داد کی گرفتاری میں ذاتی دلچسپی لے رہا ہے۔"

حیات نے اپنی بات کہتے کہتے قدرے تامل کیا۔ "جب کوئی وزیر کسی معاملے میں ذاتی دلچسپی لیتا ہے تو پولیس کی راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ ملازمت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ سن لیا تو نے؟"

لالی نے نہایت سادگی سے کہا۔ "یہ بات ہے' تب تو جی مجھے ساری بات رحیم داد کو فوراً بتا دینی چاہیے۔"

اس کی بات سن کر حیات محمد شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔ غصے سے آنکھیں نکال کر بولا۔ "تو بالکل الو کا پٹھا ہے۔"

لالی اس کے برہم ہونے پر ڈر گیا۔ گڑگڑا کر گویا ہوا۔ "ساب جی! ناراض نہ ہوں۔ پر یہ بھی تو ہوسکتا ہے' پولیس کو جب یہ شبہ ہے کہ میں یہاں ہوں تو وہ کسی دن چھاپا مار کر مجھے پکڑ بھی سکتی ہے۔"

"پولیس کی اتنی جرات نہیں ہوسکتی کہ وہ میرے بنگلے پر چھاپا مارے اور تلاشی لے۔" حیات نے نہایت رعونت سے کہا۔ "شاید تجھے پتہ نہیں۔ کل رات جو پولیس انسپکٹر میری اجازت کے بغیر بنگلے کی چار دیواری کے اندر داخل ہوا تھا' اسے میرے صرف ایک ٹیلی فون کھڑکھڑانے پر تین کانسٹیبلوں کے ساتھ آج معطل کرکے لائن حاضر کردیا گیا۔ ڈی ایس پی کل رات ہی کے واقعے کے بارے میں معذرت کرنے میرے پاس آیا تھا۔" اس نے وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ گلاس میز پر رکھا۔ "میں نے سہ پہر کو وزیر زراعت سے بھی گل بات کی تھی۔ وہ میرا پرانا یار ہے۔ کالج میں ساتھ پڑھتا تھا۔ میری ہی کوششوں سے وزیر لگا ہے۔" لالی بت بنا خاموش کھڑا رہا۔ میاں حیات محمد کہتا رہا۔

"تو یہاں ہر طرح محفوظ ہے۔ رہ گیا رحیم داد تو اسے اب بھول جا۔"

لالی خاموش نہ رہ سکا۔ بے چین ہو کر بولا۔ "میاں صاحب' یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"ایسے ہی جیسے میں کہہ رہا ہوں۔ رحیم داد جلد ہی گرفتار کرلیا جائے گا یا ہلاک کردیا جائے گا۔ مقتول کے بھائی اور خاندان والے بھی اس کی تلاش میں ہیں۔ دیکھتے ہی اسے قتل کردیں گے۔ پولیس کے ہاتھوں اگر وہ پکڑا گیا تب مقدمے کی سماعت کے دوران ہی اسے مار ڈالیں گے۔ تجھے تو پتہ ہی ہوگا کہ خون کا بدلہ یہاں ایسے ہی لیا جاتا ہے۔ عدالت کے فیصلے کا انتظار نہیں کیا جاتا' بلکہ عدالت کے احاطے کے اندر بھی قتل ہوجاتا ہے۔"

حیات محمد نے بوتل اٹھائی' خالی گلاس میں وہسکی انڈیلی' تھرماس سے برف نکال کر ڈالی' شیشے کے قرابے سے پانی ڈالا اور پیگ بنا کر وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ پھر سمجھانے کے انداز میں نرمی سے بولا۔ "دیکھ' رحیم داد کے ساتھ ہمدردی تجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ مجھے ڈر ہے اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں تو بھی مارا جائے گا۔ گرفتار تو بہرحال کرہی لیا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں تو میرے پاس ٹھیرا رہ۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "رحیم داد زیادہ دنوں تک روپوش نہیں رہ سکتا۔ پولیس اس کا سراغ لگالے گی۔ اس کی گرفتاری کے بعد پولیس تیری طرف سے غافل ہوجائے گی۔ میں اپنے اثرورسوخ سے تجھے جیل جانے سے بچالوں گا۔ کوئی تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

لالی نے سر جھکا کر نہایت عاجزی سے کہا۔ "ساب' آپ رحیم داد کے لیے کچھ نہیں کرسکتے؟ گل ایسہ ہے میاں جی' جیل سے میں ہی اسے نکال کر لایا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔"

حیات نے لالی کو آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ بات کاٹ کر بولا۔ "رحیم داد کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ سمجھ لے' وہ مرگیا۔" اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "میں اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ صرف تجھے بچا سکتا ہوں۔"

لالی نے ہچکچاتے ہوئے ایک بار پھر درخواست کی۔ "آپ کی بہت مہربانی ہے جی' مگر۔"

"اگر مگر چھوڑ۔" حیات محمد وٹو نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "مجھے دوٹوک جواب چاہیے۔ جیل جانا چاہتا ہے یا یہاں رہنا چاہتا ہے۔" اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ "مجھے صرف ٹیلیفون کرنا ہوگا۔ گھنٹے بھر کے اندر تو پولس کی حراست میں ہوگا۔ بول کیا چاہتا ہے؟"

لالی اس کی دھمکی سے مرعوب ہوگیا۔ گڑگڑا کر بولا۔ "میاں جی' میری کیا مرضی' جو آپ حکم کریں گے وہی کروں گا۔"

"شاباش۔" حیات محمد وٹو نے اونچی آواز سے کہا۔ اس کا چہرہ شگفتہ ہوگیا۔ وہ خاموش بیٹھا' اپنے السیشن کی نرم نرم پیٹھ پر محبت سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ کتا دھیرے دھیرے' غراتا رہا۔ میاں حیات محمد نے گلاس اٹھایا اور ساری وہسکی غٹاغٹ چڑھا کر ایک بار پھر اسے خالی کردیا۔ اس نے گلاس میز



پر رکھا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"میرے ساتھ آ۔"

السیشن بھی صوفے سے اتر کر نیچے آگیا اور میاں حیات محمد کے ساتھ' ساتھ چلنے لگا۔ لالی کو اس سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ مگر وہ سہما ہوا حیات محمد کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ حیات محمد' غلام گردش میں کھلنے والے دروازے پر پہنچا۔ اسے کھولا۔ باہر دھیور کھڑا تھا۔ حیات محمد نے اسے کمرے کے اندر بلایا۔

دھیور کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دروازہ بند کردیا۔ میاں حیات محمد نے جنوبی دیوار کا بند دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ یہ دروازہ کمرے کے دوسرے دروازوں سے کسی قدر مختصر تھا۔ اس میں تالا بھی پڑا تھا۔

دھیور نے شلوار کی چور جیب سے کنجی نکالی اور نہایت مستعدی سے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔

میاں حیات محمد اپنے السیشن کے ساتھ ذرا سا جھک کر اندر داخل ہوا۔ اس نے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

لالی بھی اندر چلا گیا۔ دھیور باہر رہ گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ بند کردیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ حیات نے ہاتھ بڑھا کر دیوار میں لگا ہوا بجلی کا سوئچ دبایا۔ ایک بلب روشن ہوگیا۔ اس کی روشنی بہت دھیمی تھی۔

سامنے زینہ تھا جو نیچے جاتا تھا۔ دونوں آگے پیچھے نیچے اترے۔ یہ کشادہ تہہ خانہ تھا۔ فرش کچا تھا۔ تہہ خانے میں نمی تھی' گھٹن تھی اور عجیب طرح کی بساند پھیلی ہوئی تھی۔ تہہ خانے میں بھی دھندلا بلب روشن تھا۔ ہوا کی آمدورفت کے لیے چمنی تھی جو کھپریلوں کی چھت کے اوپر نکلی ہوئی تھی۔ چمنی کے نیچے آتش دان تھا۔ اس میں تہہ خانہ گرم رکھنے کے لیے موسم سرما میں لکڑی کے ٹکڑے اور کوئلے سلگائے جاتے تھے۔

☆

دھندلی دھندلی روشنی میں ایک بوڑھا شخص زمین پر لیٹا تھا۔ اس کی ڈاڑھی اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ وہ جیل کے قیدیوں کا سا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ایک پیر میں لوہے کی موٹی زنجیر تھی جس میں وزنی گولا پڑا تھا۔ قریب ہی تام چینی کا بوسیدہ تسلا رکھا تھا۔ ایک طرف مٹی کا گھڑا اور المونیم کا گلاس تھا۔ آہٹ سن کر بوڑھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میاں حیات اور لالی کو گھورنے

لگا۔ اس کی آنکھیں غصے اور نفرت سے جلدی ہی بھڑکتا ہوا شعلہ بن گئیں۔ چہرے پر وحشت طاری ہو گئی۔ وہ منہ بگاڑ کر چیخنے لگا۔

"تو آگیا۔ کتے! ذلیل! دور ہو جا میری آنکھوں کے سامنے سے۔ میں تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ دفع ہو جا یہاں سے۔"

وہ چیخ چیخ کر حیات محمد کو گالیاں دیتا رہا اور گہری گہری سانس بھر کر ہانپتا رہا۔ حیات ٹھٹکا۔ ذرا دیر خاموش کھڑا رہا پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا' بوڑھے کی جانب بڑھا۔ حیات جس قدر قریب ہوتا گیا بوڑھے کی دیوانگی میں اسی قدر اضافہ ہوتا گیا۔ وہ اور زیادہ غصے سے چیخنے لگا۔ اس کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ آنکھیں وحشت سے ابل پڑیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حیات محمد پر تیزی سے جھپٹا مگر لوہے کے وزنی گولے نے اسے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کے پیر میں پڑی ہوئی زنجیر جھن جھنا اٹھی۔ حیات کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ وہ بوڑھے کے عین مقابل کھڑا تھا۔ بوڑھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ تلملا کر اٹھا' کھڑا ہوا اور نفرت سے حیات کے منہ پر تھوک دیا۔ حیات نے قہرآلود نظروں سے اسے دیکھا۔ جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ پونچھا۔ مڑ کر اپنے ساتھ کھڑے ہوئے السیشن کو دیکھا۔ اسے آہستہ سے ششکارا۔ کتا غرایا' زور سے بھونکا اور اچھل کر بوڑھے پر حملہ آور ہوا۔ بوڑھا زمین پر گر پڑا۔ کتا اسے زور زور سے جھنجھوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

بوڑھا پھولی ہوئی سانس سے چیخا۔ "مار دے' مار دے۔ مجھے جان سے مار دے۔"

میاں حیات چپ چاپ کھڑا رہا۔ بوڑھا بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ کتا اس کے پھڑکتے ہوئے جسم کو جگہ جگہ سے جھنجھوڑنے لگا۔ سینے پر سوار ہو کر اس نے بوڑھے کی گردن اپنے دانتوں سے دبوچنے کی کوشش کی۔ بوڑھے نے پھٹی پھٹی خوف زدہ آنکھوں سے حیات محمد وٹو کی جانب دیکھا۔

حیات نے ڈپٹ کر کتے کو اپنے پاس بلایا۔ کتے نے بوڑھے کو چھوڑ دیا۔ خاموشی سے حیات کے پاس آگیا اور اس کے پیروں کے قریب زمین پر لیٹ گیا۔ کتے کے جھنجھوڑنے سے بوڑھے کا لباس کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ مگر جسم پر کہیں کھرنچا بھی نہیں آیا۔ وہ کروٹ کے بل زمین پر لیٹا ہوا ہانپ رہا تھا۔ حیات محمد خاموش کھڑا بوڑھے کو گھورتا رہا۔ پھر واپس مڑا۔ اس نے زینے کے برابر دیوار میں لگی ہوئی الماری کھولی۔ لالی سہما ہوا جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

میاں حیات نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔ "ادھر آ۔"



لالی اس کے پاس چلا گیا۔ حیات نے الماری کے اندر سے ایک ڈبا نکالا۔ ڈھکنا کھول کر ڈبا لالی ے ہاتھ میں تھما دیا۔ کھلے ہوئے ڈبے کے اندر سے سرنج اور شیشی باہر نکالی۔ لالی کو اپنے ساتھ نے کا اشارہ کیا۔ حیات محمد ایک بار پھر بوڑھے کے پاس گیا۔ لالی اس کے عقب میں خاموش کھڑا رہا۔

سرنج دیکھتے ہی بوڑھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خوف طاری ہو گیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ س نے دونوں ہاتھ ہلا کر انکار کیا اور گھگیا کر بولا۔ "نہیں نہیں۔"

حیات نے اسے خوں خوار نظروں سے گھورا۔ بوڑھا سہم کر ایک طرف جھک گیا۔ حیات محمد س کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے بوڑھے کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ بوڑھے نے کوئی مزاحمت نیں کی۔ بے چارگی سے گردن جھکا دی۔ حیات نے اس کے بازو پر روئی سے اسپرٹ لگائی اور سرنج ی سوئی کھال میں داخل کر کے دوا رگوں میں اتار دی۔ انجکشن لگا کر وہ کھڑا ہو گیا۔ تہہ خانے میں ہری خاموشی چھائی تھی۔ بوڑھا گم صم بیٹھا رہا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ حیات محمد وٹو اور لالی چپ کھڑے رہے۔

بوڑھا گردن کو ذرا سا خم دے کر اس طرح سکڑ کر بیٹھ گیا گویا کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے چہرے پر اچانک گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ حیات سے مخاطب ہوا۔ "سن رہا ہے حیات۔ بہت تیز ہوا چل رہی ہے۔ طوفان آنے والا ہے۔ آندھی کے ساتھ بارش بھی ہو گی۔" وہ زور سے چیخا۔ "غضب ہو جائے گا۔ کنک کی واڈھو فصلیں تباہ ہو جائیں گی۔ اب کیا ہو گا حیات؟"

"ابھی فصلیں پک کر تیار نہیں ہوئیں۔ کٹائی میں دیر ہے۔"

"سچ۔" وہ خوشی سے چہک کر بولا۔ "سچ' سچ بتا۔ فصلوں کی واڈھی میں ابھی کتنی دیر ہے؟"

"اس بار مئی سے پہلے واڈھی نہیں ہو گی۔ یہ تو مارچ کا مہینہ ہے۔" حیات محمد وٹو نے اسے تسلی دی۔ "اب تم سو جاؤ۔"

بوڑھے نے بچوں کی سی معصومیت سے کہا۔ "اب میں سو جاؤں؟"

"ہاں' ہاں' اب تم سو جاؤ۔"

بوڑھے نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ذرا دیر چپ بیٹھا جھومتا رہا اور جھومتے' جھومتے ایک طرف لڑھک گیا۔ لالی خوف اور حیرت سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟

جب بوڑھا سو گیا تو حیات واپس ہوا۔ اس نے سرنج صاف کی۔ ڈبے میں رکھی۔ الماری کا

دروازہ کھولا اور ڈبا اس میں رکھ کر دروازہ بند کردیا۔ وہ مڑا' لالی کے ہم راہ زینے کی سیڑھیاں طے کیں اور اوپر پہنچ گیا۔ بلب بجھایا۔ دونوں باہر آگئے۔ کتا بھی باہر آگیا۔ دھیور دروازے کے قریب مستعدی سے کھڑا تھا۔ ان کے باہر آتے ہی اس نے بڑھ کر تہہ خانے کا دروازہ بند کیا اور تالا ڈال دیا۔ کنجی اپنے پاس رکھ لی۔

حیات نے دھیور کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ کمرے سے چلا گیا۔ لالی نے بھی دھیور کے ساتھ باہر جانا چاہا۔ حیات نے اسے ٹوکا۔

"لالی تو ٹھیر جا۔"

میاں حیات محمد آگے بڑھا اور تھکا ہوا سا صوفے پر بیٹھ گیا۔ قریب کے صوفے پر اس کا السیشن بھی بیٹھ گیا۔ حیات نے وہسکی کا بڑا پیگ بنایا اور آہستہ آہستہ چسکی لگانے لگا۔ لالی اس کے روبرو خاموش کھڑا تھا۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ بنگلے کے باہر ہوا کے جھونکوں سے پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ سناٹے میں خشک پتوں کے کھڑکھڑانے کی ہلکی ہلکی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ گہری خاموشی میں حیات کی آواز ابھری۔ وہ لالی سے کہہ رہا تھا۔ "دیکھ لیا تو نے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "یہ میرا وڈا بھرا میاں ریاض محمد خاں وٹو ہے۔ پاگل ہوگیا ہے۔"

"میاں ساب' آپ انھیں پاگل خانے کیوں نہیں بھیج دیتے۔"

"فضول بات نہ کر۔" حیات محمد نے خفا ہو کر کہا۔ "میرا بھائی پاگل خانے نہیں جا سکتا۔ وہ یہیں رہے گا۔"

لالی کے ذہن میں کئی سوالات ابھرے۔ مگر وہ حیات کی برہمی کے ڈر سے کچھ نہ کہہ سکا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات محمد چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "میں اس لیے تجھے اپنے ساتھ تہہ خانے میں لے گیا تھا کہ جو کام آج میں نے کیا ہے' کل سے تجھے کرنا ہوگا۔" وہ مسکرایا۔ "تیری صرف اتنی ہی ڈیوٹی ہوگی۔ باقی وقت میں عیش کر۔ کھا پی' موجاں کر۔"

لالی نے دبی زبان سے پہلوتہی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے جی یہ کام کبھی نہیں کیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" حیات نے بے نیازی سے کہا۔ "بہت معمولی کام ہے۔ دوا کی شیشی تو دیکھ ہی لی ہے۔ سرنج میں دوا بھرنا۔ مریض کا ہاتھ پکڑنا اور کھال میں سوئی چبھو کر دوا اندر داخل کر دینا۔ کام ختم۔"

لالی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "میاں جی' یہ کام تو دھیور بھی کر سکتا ہے۔"

"نہیں۔" میاں حیات محمد نے تیوری پر بل ڈال کر لالی کو دیکھا۔ "دھیور یہ کام نہیں کر سکتا۔ وہ



کیلا تہہ خانے کے اندر بھی نہیں جا سکتا۔" اس نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ "دھیور اگر اس کے پاس گیا تو ہو سکتا ہے' وہ اس کا خون کردے۔ میرے بھائی نے ناراض ہو کر دھیور کی زبان کٹوا دی تھی۔ تب سے وہ گونگا ہے۔ مگر دھیور اس سے جتنی نفرت کرتا ہے' میرا اتنا ہی وفادار ہے۔ دھیور بہت ہی وفادار ہے۔ میرے دو ہی وفادار ہیں۔" اس نے قریب بیٹھے ہوئے السیشن کی طرف اشارہ کیا۔ "ایک یہ' دوسرا دھیور۔"

لالی نے آہستہ سے کہا۔ "میاں ساب! اپنے بھرا کا کسی چنگے ڈاکٹر سے علاج کرائیے۔ ایسے کب تک کام چلے گا۔"

"مجھے تیرے مشورے کی ضرورت نہیں۔" حیات نے لالی کو ڈانٹ دیا۔ "میں خود ڈاکٹر ہوں۔"

"اچھا جی! آپ ڈاکٹر بھی ہیں؟" لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔ "یہ مجھے پتہ نہیں تھا۔"

"میں نے ڈاکٹری لہور میں نہیں پڑھی۔" حیات نے بڑے فخر سے کہا۔ "انگلستان میں پڑھی ہے۔"

لالی نے اور زیادہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میاں ساب! آپ ولایت میں بھی رہ چکے ہیں؟"

"برسوں رہا ہوں۔"

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ ذرا دیر بعد لالی نے خاموشی توڑی اور عاجزی سے بولا۔ "برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں؟"

"کہہ' کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"میری کوئی اور ڈیوٹی لگا دیجئے۔"

حیات محمد چند لمحے لالی کو گہری نظروں سے دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر مسکرایا۔ "مجھے معلوم ہے' تو بندوق چلانا بھی جانتا ہے۔ نشانہ بھی تیرا بہت ٹھیک ٹھاک ہے۔" اس نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ گلاس میز پر رکھا۔ "میں تیری نشانے بازی اور زور آوری بعد میں دیکھوں گا۔ تو کام کا بندہ لگتا ہے۔" حیات نے ایک بار پھر اسے بغور دیکھا اور ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا۔ "مگر فی الحال تجھے یہی کام کرنا ہوگا۔ بات یہ ہے کہ میں تہہ خانے میں جا کر انجکشن خود لگانا نہیں چاہتا۔ وہ پاگل بندہ ہے۔ اس کے پاگل پن پر مجھے غصہ بھی آتا ہے اور دکھ بھی ہوتا ہے۔ وہ میرا بھائی ہے نا۔"

"ساب! آپ کو ان پر غصہ نہیں کرنا چاہئے۔"

"فضول باتیں شروع کردیں۔" حیات نے بگڑ کر کہا۔ "میں چاہتا ہوں' تو اس کے بارے میں

بالکل نہ سوچ۔ یہ تیرا کام نہیں۔ تیرا کام صرف اتنا ہی ہے جس کے لیے میں نے تیری ڈیوٹی لگائی ہے۔ تجھے روزانہ دو بار اسے انجکشن لگانا ہوگا۔ اور اس وقت لگانا ہوگا جب دھیور تجھے کہے گا۔ تہہ خانے کی کنجی اسی کے پاس رہتی ہے۔ تہہ خانے کے اندر صرف تو جائے گا' وہ نہیں جائے گا۔ سمجھ گیا؟"

"جی' بالکل سمجھ گیا۔"

"اور یہ بھی جان لے کہ تہہ خانے میں تیرے علاوہ صرف مائی جنتے جاتی ہے۔ وہ تہہ خانے کی صفائی کرتی ہے۔ روٹی ٹکر پہنچاتی ہے۔ وہ گونگی ہے اور بہری بھی۔ تجھے بھی یہاں گونگا اور بہرہ بن کر رہنا ہوگا' صرف آنکھیں کھلی رکھنا۔ منہ اور زبان بند رکھنا۔" حیات محمد نے قریب رکھی ہوئی میز کی دراز کھولی۔ اندر سے سرنج اور دو شیشیاں نکالیں۔ ایک شیشی اس نے میز پر رکھ دی' دوسری شیشی کی دوا سرنج میں بھری اور سرنج لالی کے ہاتھ میں تھما کر بولا۔ "میں چاہتا ہوں تو میرے سامنے انجکشن لگا کر دکھا۔"

لالی نے گھبرا کر کہا۔ "کس کے لگاؤں جی؟"

"میں تو بہرحال تجھ سے انجکشن نہیں لگوا سکتا اور نہ ہی تو اپنے بدن میں انجکشن لگا سکتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ مسکرایا اور اپنے خوفناک السیشن کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے انجکشن لگانا ہوگا۔"

"اسے؟" لالی نے خوف زدہ نظروں سے دیکھا' کتا صوفے پر لیٹا اسے گھور رہا ہے۔ "میاں ساب! اس سے تو مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر نہیں' یہ تجھے کاٹے گا نہیں۔" یہ کہہ کر حیات نے میز کی دراز سے چمڑے کا پوزہ بند نکالا۔ اسے کتے کے منہ پر چڑھایا اور اس کی پشت آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ کتا سر نیچے جھکا کر لیٹ گیا۔ حیات نے اس کی ران پر ایک جگہ انگلی رکھ کر حکم دیا۔ "یہاں انجکشن لگا دے۔" لالی جھجکا۔ حیات نے ڈپٹ کر کہا۔ "منہ کیا تک رہا ہے؟ لگا انجکشن۔"

لالی نے جھٹ کتے کی کھال میں سرنج کی سوئی داخل کر کے دوا اندر آتار دی۔ کتا خاموش پڑا رہا۔ جب لالی انجکشن لگا چکا تو حیات محمد نے مسکرا کر کہا۔ "بالکل اسی طرح تجھے تہہ خانے میں اس پاگل کو انجکشن لگانا ہوگا۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تو اس کتے سے ڈر رہا تھا۔ یہ نہ کاٹتا ہے' نہ پنجے مارتا ہے اور اس انجکشن کے بعد تو یہ بالکل



ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔"

لالی نے دیکھا' کتا نڈھال پڑا ہے۔ حیات محمد نے پوزہ بند اس کے منہ سے اتار دیا اور تیکھے لہجے میں بولا۔ "لیکن یہ کبھی کبھی نہایت خطرناک بھی ہو جاتا ہے۔" اس نے میز پر رکھی ہوئی دوسری شیشی اٹھائی۔ "اگر اس کا انجکشن لگا دیا جائے تو یہ کتا اتنا خوں خوار ہو جاتا ہے کہ جس پر حملہ کرے' اسے چیر پھاڑ کر ختم بھی کر سکتا ہے۔"

لالی نے خوف زدہ نظروں سے شیشی دیکھی اور سرنج ہاتھ میں دبائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات نے اس سے سرنج لی' اسے میز پر رکھا اور لالی سے مخاطب ہوا۔ "یاد رکھ' جیسا تجھ سے کہا جائے تجھے ویسا ہی کرنا ہوگا۔ میرے حکم کی خلاف ورزی تجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ کچھ عرصے تک تیری کڑی نگرانی کی جائے گی۔ اگر تو نے ہر کام ٹھیک ٹھاک کیا تو نگرانی ختم کر دی جائے گی۔" اس نے وہسکی کا گھونٹ بھرا اور بھاری بھرکم لہجے میں بولا۔

"جا' جا کر سو جا۔"

لالی نے سر جھکا کر خاموشی سے حیات محمد کی باتیں سنیں۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھولا۔ باہر دھیور مستعدی سے کھڑا تھا۔ وہ اس کے ہم راہ اپنے کمرے میں پہنچا اور بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد دھیور نے اپنی چارپائی نکالی اور عین دروازے کے سامنے برآمدے میں ڈالی۔ بستر لگایا اور لیٹ گیا۔

دھیور کچھ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا پھر سو گیا۔ مگر لالی کو نیند نہیں آئی۔ وہ سخت بے چین تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے' کیا نہ کرے؟

رات کے پچھلے پہر وہ آہستہ سے اٹھا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر زرد زرد چاندنی بکھری تھی۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ لالی نے کھڑکی کی آہنی سلاخیں دونوں ہاتھوں سے تھام کر پورا زور لگایا مگر سلاخیں بہت مضبوط تھیں۔ ایک بھی سلاخ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اچانک اسے اپنی پشت پر چاپ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا' لالٹین کی مدھم روشنی میں دھیور اس کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ خوں خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور لالی کا بازو پکڑ کر اس زور سے دھکا دیا کہ لالی لڑکھڑاتا ہوا بستر پر جا کر گرا۔ اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ بستر پر خاموش پڑا رہا۔ دھیور نے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر کے چٹخنی لگائی اور کمرے سے باہر جا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

چارپائی سے ٹکرانے کے باعث لالی کے کندھے میں چوٹ بھی آئی مگر وہ خاموش رہا اور کروٹ

بدل کر لیٹ گیا۔ آخر اسے نیند آ گئی۔ وہ سو گیا۔ صبح مائی جنتے نے لالی کو آہستہ سے جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ وہ اس کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔ چائے کے ساتھ روٹی اور ساگ بھی تھا۔ یہ صبح کا ناشتا تھا۔ مائی جنتے نے لالی کی جانب نظر بھر کر بھی نہ دیکھا۔ وہ چپ چاپ آئی اور چپ چاپ چلی گئی۔ لالی منہ دھونے کے لیے غسل خانے میں گیا۔ واپس آیا تو اس نے دیکھا، دھیور اپنے کمرے میں چٹائی پر بیٹھا ناشتا کر رہا ہے۔ لالی کے کمرے کی کھڑکی بھی اب کھلی ہوئی تھی۔

لالی ناشتے سے فارغ ہوا تو دھیور اسٹول پر آ کر بیٹھ چکا تھا۔ وہ چپ بیٹھا لالی کو تک رہا تھا۔ لالی نے جتنی بار نظر اٹھائی، اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ اس طرح گھورنے پر لالی جھنجلا گیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھیور کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تک دونوں پلک جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ آخر دھیور کی پلک جھپک گئی۔ لالی مسکرانے لگا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر دھیور کی تیوری پر بل پڑ گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نفرت سے منہ بگاڑ کر زمین پر تھوک دیا۔ اس کی اس اشتعال انگیزی پر لالی کا خون کھول گیا۔ مگر وہ طرح دے گیا۔ وہ نہتا تھا اور دھیور مسلح۔ لالی نظریں جھکا کر بستر پر لیٹ گیا اور کھڑکی کی سلاخوں سے باہر دیکھنے لگا۔ باہر ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک نوجوان مٹیار ٹوکری میں کوڑا کرکٹ بھر کر لائی اور اسے جھاڑیوں کے پاس انڈیل دیا۔ کوڑے میں شیشے کی ٹوٹی ہوئی بوتلیں بھی تھیں۔ ان کے گرنے سے چھناکا ہوا۔ لڑکی نے نظریں اٹھا کر بستر پر لیٹے ہوئے لالی کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اس نے اپنی اوڑھنی کے پلو سے سر ڈھکا اور شرما کر زیر لب مسکرائی۔ لالی بھی مسکرانے لگا۔ دھیور جھٹ کمرے کے اندر داخل ہوا، کھڑکی کے پاس پہنچا اور قہر آلود نظروں سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ لڑکی خالی ٹوکری بغل میں دبا کر سہمی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

دھیور نے ایک بار پھر کھڑکی کے پٹ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ لالی تلملا کے رہ گیا۔ اس نے دھیور کی طرف نہیں دیکھا۔ کروٹ بدل کے منہ دوسری طرف کر لیا۔ دھیور اس کے پاس نہیں آیا، باہر چلا گیا۔

لالی خاموش لیٹا رہا۔ اس کے لیے وقت کاٹنا عذاب ہو گیا۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ ٹھیک بارہ بجے دھیور اس کے پاس آیا اور باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ لالی خاموشی سے اٹھا اور دھیور کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں غلام گردش کے راستے حیات محمد کے کمرے میں داخل ہوئے۔ حیات کمرے میں موجود نہیں تھا۔ دھیور نے تہ خانے کا دروازہ کھولا اور لالی کو ٹھوکا دے کر اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ لالی نے اندر جا کر سوئچ دبایا۔ بلب روشن ہو گیا۔ اس کی روشنی میں لالی سیڑھیوں سے نیچے تہ



خانے میں چلا گیا۔

بوڑھا ریاض محمد خاں وٹو آتش دان کے قریب زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کھانے کے برتن پڑے تھے۔ اس وقت وہ ہونٹوں سے گلاس لگائے پانی پی رہا تھا۔ پانی پیتے پیتے اس نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ خاموشی سے گلاس ایک طرف رکھا اور لمحے بھر تک لالی کو گھورتا رہا۔ لالی سیڑھیوں کے پاس ٹھہر گیا۔ دبے دبے خوف اور حیرت سے ریاض کو تکنے لگا۔ ذرا دیر تہ خانے میں خاموشی رہی، پھر بوڑھے میاں ریاض محمد کی آواز ابھری۔

"آ، میرے نزدیک آ جا۔"

مگر لالی جہاں تھا، وہیں کھڑا رہا۔ اس دفعہ بوڑھے نے کسی قدر نرمی سے کہا۔ "ڈر نہیں، نزدیک چلا آ۔" لالی نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ آہستہ، آہستہ اس کی جانب بڑھا، مگر نزدیک جانے کے بجائے کچھ فاصلے پر رک گیا۔

میاں ریاض محمد نے کہا۔ "میں نے کل رات ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ اب تیری ڈیوٹی لگائی جائے گی۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "دور کیوں کھڑا ہے؟ نزدیک آ جا۔ تو تگڑا جوان ہے اور میں بوڑھا، کمزور۔ پاؤں میں زنجیر بھی پڑی ہے۔ فیر بھی تو مجھ سے ڈر رہا ہے۔"

لالی نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھ کر نزدیک چلا گیا۔ ریاض محمد وٹو تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولا۔ "جب کوئی نیا نیا ڈیوٹی پر لگایا جاتا ہے، وہ مجھ سے اسی طرح ڈرتا ہے۔ سمجھتا ہے میں پاگل ہوں۔ کیا میں تجھے پاگل نظر آتا ہوں۔" لالی بدستور خاموش کھڑا رہا۔ بوڑھے ریاض نے گہری سانس بھری۔ "تو میری گل بات کیوں ماننے لگا؟" وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ لالی گم صم کھڑا رہا۔ تہ خانے میں گہرا سناٹا چھا گیا۔

میاں ریاض محمد نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا اور کسی قدر بیزاری سے بولا۔ "کھڑا منہ کیا تک رہا ہے۔ جا، جا کر الماری سے سرنج نکال اور گھسیڑ دے اس کی سوئی میری کھال میں۔ یہی تیری ڈیوٹی ہے اور اسی کے لیے تو یہاں آیا ہے۔ خاما خا کیوں وقت برباد کر رہا ہے۔"

لالی نے پھر بھی کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے الماری کے پاس گیا۔ اسے کھولا۔ سرنج میں دوا بھری۔ میاں ریاض کے پاس پہنچا۔ جھک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور بازو میں انجکشن لگانا چاہا۔ مگر ریاض نے منع کر دیا۔ نرم لہجے میں کہا۔ "آرام سے بیٹھ جا۔" لالی اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑا۔ بوڑھے ریاض نے ٹوکا۔ "میرا ہاتھ چھوڑ دے۔" اس نے کرتے کا دامن اٹھایا اور اپنی برہنہ کمر کا رخ لالی کی طرف کر دیا۔

"ہاتھ میں نہیں' کمر میں انجیکشن لگادے۔"

لالی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ سرنج کی سوئی ریاض کی کمر میں چبھونے کی کوشش کی تو وہ بلبلا کر چیخا۔ "تو' تو بالکل اناڑی لگتا ہے۔ پہلے کبھی انجیکشن لگایا ہے؟" لالی نے زبان سے تو کچھ نہ کہا' صرف انکار میں گردن ہلا دی۔ ریاض نے سرنج اپنے ہاتھ میں سنبھالی اور اس کی نوک کمر پر لگا کر بولا۔ "لے اب لگادے انجیکشن۔"

لالی نے اس کی ہدایت کے مطابق انجیکشن لگایا۔ ریاض نے نہایت اطمینان سے انجیکشن لگوالیا۔ مسکرا کر کہا۔ "اب تجھے انجیکشن لگانا آگیا۔ کچھ دنوں بعد تو فٹافٹ انجیکشن لگانے لگے گا۔" لالی نے اس دفعہ بھی کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اٹھ کر الماری کے پاس گیا۔ سرنج صاف کی۔ ڈبے میں رکھی اور الماری میں بند کردی۔

لالی ایک بار پھر ریاض کے قریب گیا۔ مگر اس نے لالی کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ آنکھیں بند کیے دھیرے دھیرے سانس بھرتا رہا۔ چند لمحے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا ہلکا خمار تھا۔ اس نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "اب تو جا سکتا ہے۔ تیری ڈیوٹی ختم ہوگئی۔ میں تھوڑی دیر بعد سوجاؤں گا۔" مگر لالی نہیں گیا۔ ریاض نے بھی کچھ نہ کہا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر آنکھیں بند کیے جھومتا رہا۔ اور جھومتے جھومتے فرش پر لڑھک گیا۔

لالی واپس ہوا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر چڑھنے لگا۔ وہ سخت حیرت زدہ تھا۔ اس نے پچھلی رات جس ریاض محمد کو دیکھا تھا وہ اس ریاض محمد سے قطعی مختلف تھا' جس سے ذرا دیر پہلے اس کا سابقہ پڑا تھا۔ نہ وہ اسے دیکھ کر دیوانوں کی طرح چیخا' نہ گالیاں دیں اور نہ مارنے کے لیے جھپٹا' بلکہ نرمی اور شفقت سے پیش آیا۔ حتیٰ کہ انجیکشن لگانے میں بھی اس کی رہنمائی کی۔ پورا پورا تعاون کیا۔

لالی نے اوپر جا کر بجلی بجھائی۔ بند دروازے پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ دھیور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے تہ خانے کا دروازہ بند کیا اور تالا ڈال دیا۔ لالی کے ہم راہ کمرے میں واپس آگیا۔ لالی نے دوپہر کا کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔

رات کے گیارہ بجے وہ پھر دھیور کے ساتھ تہ خانے کے دروازے پر پہنچا۔ حیات کمرے میں اس وقت بھی موجود نہ تھا۔

لالی تہ خانے کے اندر گیا۔ ریاض محمد وٹو کو دیکھا' وہ جاگ رہا تھا۔ مگر اس نے لالی سے کوئی



بات نہیں کی۔ لالی بھی خاموش رہا۔ ریاض نے انجیکشن لگوایا اور سوگیا۔ لالی واپس ہوا۔ دھیور کے ہم راہ اپنے کمرے میں پہنچا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کھڑکی سے ہوا کے نرم نرم جھونکے اندر آرہے تھے۔ باہر چاندنی چھٹکی تھی۔ مگر دھیور کے ڈر سے لالی کھڑکی پر نہیں گیا۔

☆

لالی دن کے بارہ اور رات کے گیارہ بجے دھیور کے ہم راہ تہ خانے کے دروازے پر جاتا۔ تنہا اندر داخل ہوتا اور بوڑھے ریاض کے جسم میں انجیکشن لگاتا۔ انجیکشن لگاتے وقت کبھی کبھار ریاض نے بات کرنے کی کوشش بھی کی مگر لالی نے مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ حیات محمد کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بالکل خاموش رہتا۔ لیکن ریاض کبھی ناراض نہ ہوا۔ نہ چیخا نہ چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا۔ بلکہ عام طور پر خاموش ہی رہتا۔

لالی واپس کمرے میں جاتا تو دھیور اس کی کڑی نگرانی کرتا۔ ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتا۔ نہایت بے رخی اور حقارت سے پیش آتا۔ لالی تنہائی سے اکتا کر کبھی کھڑکی کی جانب جانے کی کوشش کرتا تو دھیور جھٹ کمرے میں جاتا اور لالی کی گردن پکڑ کر زور سے دھکا دیتا۔ دوبار ایسا ہی ہوا۔ لالی اس سے جھگڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کھڑکی پر جانے کا ارادہ ہی ترک کردیا۔ بستر پر لیٹتا تو کروٹ بدل کر منہ موڑ لیتا۔

کمرے سے نکل کر وہ صرف برآمدے میں آسکتا تھا یا غسل خانے تک جاسکتا تھا اور چوبیس گھنٹے میں صرف دو بار راہ داری سے گزر کر تہ خانے میں جاسکتا تھا۔ دھیور ہر وقت اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا۔ کوئی بات کرنے والا بھی نہ تھا۔ مائی جنتے بھی گونگی تھی اور دھیور بھی گونگا تھا اور بوڑھے ریاض سے اسے بات کرنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔ اس دوران حیات محمد وٹو سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔

لالی اس ماحول سے جلد ہی اکتا گیا۔ فرار ہونے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ دھیور اس کے راستے میں دیوار بنا کھڑا تھا۔ دھیور پر قابو پانا یا اسے رام کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کا رویہ اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ لالی نے جب بھی اس کی طرف دیکھا' ہمیشہ قہر آلود نظروں سے اپنی جانب گھورتے پایا۔ دھیور صرف رات کو سوتا تھا اور لالی کے کمرے کے دروازے کے سامنے چارپائی ڈال کر سوتا تھا۔ مگر وہ اس قدر چوکنا اور چوکس رہتا کہ اگر لالی رات کو پیشاب کے لیے بھی اٹھتا تو اس کی چاپ کے ساتھ ہی دھیور جھٹ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ صبح ہوتی' شام ہوتی۔ مگر لالی نے سورج نہ طلوع ہوتے دیکھا' نہ

غروب ہوتے۔ بنگلے کے باہر کی دنیا کے بارے میں اسے کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ اسے رہ رہ کے رحیم داد کا خیال آتا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا کہ رحیم داد اس کے بارے میں نہ جانے کیا سوچتا ہوگا۔ حیات محمد کا کہنا تھا کہ وہ رحیم داد کو بھول جائے۔ اس کا خیال دل سے نکال دے۔ اسے مردہ سمجھ لے۔ مگر لالی کے لیے یہ ممکن نہ تھا۔

وہ رحیم داد کو بھولنا بھی چاہتا تو بھول نہیں سکتا تھا۔ اس نے رحیم داد سے ہر حال میں مدد کرنے کا عہد کیا تھا اور وہ اپنا یہ عہد پوری نیک نیتی سے نباہنا چاہتا تھا۔ لیکن میاں حیات محمد خاں وٹو کی قید میں رہ کر وہ رحیم داد کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پولیس رحیم داد کی تلاش میں سرگرداں تھی اور رحیم داد کے مخالف اسے قتل کرنے کے لیے گھات میں لگے تھے۔ لالی کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے؟

☆

رات کے گیارہ بجے وہ معمول کے مطابق دھیور کے ہم راہ تہہ خانے کے دروازے پر پہنچا۔ اس وقت بھی میاں حیات محمد کا کمرہ خالی تھا۔ لالی تہہ خانے کے اندر گیا۔ بوڑھے ریاض نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ چپ چاپ انجکشن لگوایا اور سونے کے لیے فرش پر لیٹ گیا۔

لالی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ خلاف معمول تہہ خانے کے دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھلا ہے۔ وہ بھونچکا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسی اثنا میں حیات محمد کی آواز خاموشی میں ابھری۔

"دھیور کمرے کے باہر کھڑا ہے۔ تہہ خانے کا دروازہ بند کردے اور میرے پاس چلا آ۔"

لالی تہہ خانے کا دروازہ بند کر کے حیات محمد خاں وٹو کے پاس چلا گیا۔ وہ مدھم روشنی میں صوفے کی پشت سے سر ٹکائے اس طرح بیٹھا تھا کہ دور سے نظر نہ آتا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں سامنے رکھی ہوئی میز پر پھیلی تھیں۔

وہ اس وقت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کے جوتوں کے تلوں میں تازہ تازہ مٹی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ بھی تہہ خانے میں گیا تھا اور غالباً "اس وقت گیا تھا" جب لالی گردن جھکائے ریاض کے جسم میں انجکشن لگا رہا تھا۔ لالی فوراً بھانپ گیا کہ حیات محمد بھی نہایت رازداری سے اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہا ہے۔

حیات محمد وٹو کا سیاہ السیشن قریب ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔ حیات کی آنکھیں نشے سے چڑھی ہوئی تھیں۔ اس نے لالی سے پوچھا۔ "اس پاگل نے تجھے تنگ تو نہیں کیا؟"



لالی نے جھٹ بتایا۔ "نہیں میاں جی، بالکل تنگ نہیں کیا۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے حیات محمد کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "ویسے تو جی وہ پاگل لگتے نہیں۔"

"نہیں۔" میاں حیات نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ پاگل ہی ہے۔ تجھے جلد ہی پتہ چل جائے گا۔"

لالی نے سر جھکا کر دھیرے سے کہا۔ "سمجھ نہیں آتی جی۔"

"اس کے ساتھ تیری بات چیت تو نہیں ہوئی؟"

"انھوں نے جی بات کرنے کی کوشش تو بہت کی، پر میں بولا ہی نہیں۔ بالکل چپ رہا۔ اب تو جی وہ بھی نہیں بولتے۔ چپ کر کے انجکشن لگوا لیتے ہیں۔" لالی نے میاں حیات کی طرف نظریں اٹھائیں۔ "میں جی آپ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے، تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

لالی نے ایک بار پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میاں جی، آپ تہہ خانے میں بھی گئے تھے؟"

حیات نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔ "تجھے کیسے پتہ چلا، میں تہہ خانے میں گیا تھا؟"

لالی نے اس کے جوتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے جوتوں میں جی ابھی تک تہہ خانے کی کچی زمین کی مٹی لگی ہے۔ آج تہہ خانے کا دروازہ بھی کھلا تھا، دھیور بھی دروازے پر نہیں تھا۔"

"تو دیکھنے میں جتنا گھامڑ لگتا ہے، اتنا ہے نہیں۔" حیات نے مسکرا کر کہا۔ "خاصا تیز ہے۔ عادی مجرم جو ٹھیرا۔"

لالی نے ہاتھ باندھ کر انکساری کا اظہار کیا۔ "میاں ساب، میں آپ سے بہت ڈرتا ہوں۔ اتنا تو کبھی پولیس سے بھی مجھے ڈر نہیں لگا۔"

میاں حیات نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی ٹھیک ہی ہوا کہ تجھے یہ معلوم ہو گیا کہ میں خفیہ طور پر معائنہ کرنے تہہ خانے میں گیا تھا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا، یہ بات تجھے معلوم ہو جائے تاکہ تو آئندہ بھی اسی طرح احتیاط سے کام لے۔"

"جیسا آپ حکم کریں گے جی، ویسا ہی کروں گا۔"

"میں چاہتا ہوں، تو اس پاگل سے بالکل بات نہ کر۔" حیات محمد تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "وہ بات بھی کرے تو سختی سے روک دے۔ ضد کرے تو منہ پر تھپڑ مار کر اس کی زبان بند کر دے۔ وہ پاگل پن میں الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں تو ایسی باتیں نہ سن۔ ان پر بالکل دھیان نہ دے۔ میں ایک بار فیر تجھے خبردار کرتا ہوں، میرے اس حکم پر سختی سے عمل کرنا۔ ٹھیک اسی طرح

جیسے میں کہہ رہا ہوں۔ سمجھ گیا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" لالی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "فکر نہ کریں جی۔"

"امید تو یہی ہے تو ایسا ہی کرے گا۔ تو خاصا تیز اور ہوشیار ہے اور کوئی ہوشیار بندہ جانتے بوجھتے گڑھے میں گرنے کی کوشش نہیں کرتا۔"

کمرے کی خاموشی میں صرف السیشن کے دھیرے دھیرے غرانے کی آواز ابھرتی رہی۔ حیات محمد نے نظر بھر کر لالی کو دیکھا۔ "میں صبح گورنر کے ساتھ شکار کھیلنے جا رہا ہوں۔ شام کو واپسی ہوگی۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے پروگرام لمبا ہو جائے۔ دو تین روز بعد واپس آؤں۔ میری غیر حاضری میں ہر کام بالکل ٹھیک ٹھاک ہونا چاہیے۔" اس نے قریب رکھی ہوئی بڑی میز کی دراز کھولی' سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اسے لالی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ رکھ لے۔ ویسے جس چیز کی ضرورت ہو دھیور سے منگوا لینا۔"

لالی نے نوٹ لے کر کہا۔ "ساب' ویسے تو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ پر میرے پاس کپڑے بالکل نہیں' جو ہیں بہت میلے ہو چکے ہیں۔ دھونے سے بھی صاف نہیں ہوتے۔ میرے لیے کمیص شلوار بنوا دیجیے۔ برسوں سے شہر میں رہتا ہوں۔ ایسے ہی کپڑے پہنتا ہوں۔"

میاں حیات محمد نے غور سے لالی کا لباس دیکھا۔ "ہاں' تیرے کپڑے بہت گندے ہیں۔ میں شکار پر روانہ ہونے سے پہلے دھیور سے کہتا جاؤں گا وہ تیرے لیے نئے کپڑے سلوا دے گا۔ بنگلے میں درزی موجود ہے۔ وہ کل تیرے پاس آ جائے گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "اور کوئی بات؟"

"کمرے میں پڑے پڑے جی بہت گھبراتا ہے۔ دھیور بنگلے سے باہر نکلنے ہی نہیں دیتا۔ وہ تو جی اتنی سختی کرتا ہے' کھڑکی پر کھڑا ہو جاتا ہوں تو گردن سے پکڑ لیتا ہے۔ میرا مطلب ہے۔"

"میں تیرا مطلب سمجھ گیا۔" حیات نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "ابھی تو بنگلے سے باہر نہیں جا سکتا۔ تیری کچھ دنوں اور اسی طرح سختی سے نگرانی ہوگی۔"

"جیسی آپ کی مرضی جی' میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تو اس معاملے میں کچھ نہ کہہ۔ ٹھیک ٹھاک رہے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تو یہاں محفوظ بھی رہے گا اور آرام سے بھی رہے گا۔ میں تیری تنخواہ بھی لگا دوں گا اور بھی تیرے لیے بہت کچھ کروں گا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہوگا جب تو آزمائش پر پورا اترے گا۔ جیسا میں کہوں گا تجھے ٹھیک ویسا ہی کرنا ہوگا۔" لالی گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات ذرا



دیر چپ بیٹھا رہا پھر اس نے پوچھا۔ "کوئی اور ضرورت ہو تو صاف صاف بتا دے۔ نشہ وشہ تو نہیں کرتا؟"

"کرتا تو ہوں جی!" لالی نے دبی زبان سے اظہار مدعا کیا۔ "پر بہت دنوں سے بالکل نشہ پانی نہیں کیا۔ سگریٹ بھی پینے کو نہیں ملی۔"

میاں حیات مسکرا کر بولا۔ "مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی لیے یہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب تیری یہ ضرورت بھی پوری ہو جائے گی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ دروازہ کھول' اندر جا۔ جو بوتل پسند آئے اٹھا لے۔ سگریٹ کل مل جائے گی۔"

لالی خاموشی سے آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا' اندر گیا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کمرہ نہایت کشادہ تھا۔ جگہ جگہ قیمتی صوفے پڑے تھے۔ فرش پر نرم نرم قالین بچھا تھا۔ ہر طرف ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ ایک گوشے میں نہایت شان دار بار تھا۔ شیشے کی الماریوں میں قسم قسم کی شراب کی بوتلیں تھیں' کنستر تھے۔ ہر رنگ کی شراب تھی اور ہر وضع کی بوتل۔ اسکاچ وہسکی تھی۔ عام وہسکی بھی اور ڈی لکس بھی۔ جونی واکر' ہیگ' اولڈ اسمگلر' وہائٹ ہارس' ڈمپل' بلیک ڈاگ' شیواز ریگل' جونی واکر' بلیک لیبل' رائل سلیوٹ۔ وہسکی کے علاوہ شیمپین تھی' شیری تھی' مارٹینی تھی' ووڈکا تھی' جن تھی' پورٹ تھی' رم تھی' ہر طرح کی برانڈی اور کونیک تھی۔ خوشنما بلوری کنستروں میں فرانسیسی وائنز' چیلیس تھورن' چیلیس اردت تھی۔ بلیوتن تھی۔ لالی گھبرائی ہوئی نظروں سے ہر سمت دیکھتا تھا۔ کبھی ادھر نظر ڈالتا' کبھی ادھر۔ اس کے لیے انتخاب کرنا مشکل ہو گیا۔ آخر اس نے اسکاچ وہسکی کی ویسی ہی بوتل اٹھائی جیسی اس نے حیات محمد کی میز پر دیکھی تھی۔ بوتل عام سائز کی بوتلوں سے بڑی بھی تھی۔

وہسکی کی بوتل ہاتھ میں دبائے وہ واپس آیا۔ میاں حیات نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "جا موج کر۔ آگے تیرے نشے پانی کا بندوبست دھیور کر دے گا۔ مگر ایک بات یاد رکھنا۔ تو شراب پی کر کبھی میرے سامنے نہیں آئے گا۔ نہ نشے کی حالت میں کوئی گڑبڑ کرے گا۔" اس نے پیچھے دیوار پر کھونٹی سے لٹکے ہوئے چمڑے کے ہنٹر کو ہاتھ بڑھا کر زور سے کھینچا اور اونچی آواز سے ڈپٹ کر کہا۔ "کبھی ایسا ہوا تو چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔" لالی سہما ہوا خاموش کھڑا رہا۔

کمرے کی خاموشی میں حیات کی آواز ابھری۔ "جا' باہر دھیور تیرا انتظار کر رہا ہے۔"

بان سے ایک لفظ نکالے بغیر کمرے سے چلا گیا۔ دھیور دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے لالی

کے ہاتھ میں دبی ہوئی وہسکی کی بوتل حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھی۔ مگر بالکل چپ رہا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ لالی نے اپنے کمرے میں پہنچ کر بوتل ایک کونے میں رکھ دی۔ وہ بہت سہما ہوا تھا۔ خاموشی سے بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ صبح دن چڑھے اٹھا۔ رات کو دیر سے سونے کے باعث اب وہ دیر ہی سے بیدار ہوتا تھا۔

☆

دروازے کے پیچھے سے چیخنے چلانے کی آوازیں' رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ لالی کو سخت حیرت ہوئی۔ وہ ڈرتے ڈرتے تہہ خانے کے اندر داخل ہوا۔ زینے سے اتر کر نیچے پہنچا۔ سامنے بوڑھا ریاض بیٹھا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی آنکھیں نکال کر بولا۔ "آگیا کتا میری ہڈیاں چچوڑنے۔" لالی کو تعجب تو ہوا مگر بالکل خاموش رہا اور آہستہ آہستہ ریاض کی جانب بڑھنے لگا۔ ریاض محمد خاں وٹو نے لالی کو اپنی جانب آتے دیکھا تو زور سے چیخا۔ "ہٹ جا میری نظروں کے سامنے سے' حرام کے تخم!"

لالی اس کے رویے میں یہ اچانک تبدیلی دیکھ کر بہت سٹپٹایا۔ جھجک کر کھڑا ہو گیا۔ میاں ریاض اور زیادہ غضب ناک ہو کر چلایا۔ "بے غیرت' دلے! میں تیری منحوس صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔" اس نے جھٹ سامنے رکھی ہوئی المونیم کی پلیٹ اٹھا کر ماری۔ پلیٹ لالی کے ماتھے پر کھٹاک سے لگی۔ ساتھ ہی ریاض کی آواز ابھری۔

"دفع ہو جا یہاں سے۔"

لالی چوٹ کھا کر تلملا اٹھا۔ غصے سے بے قابو ہو کر بوڑھے پر جھپٹا۔ اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مار کر چیخا۔ "اوئے چپ کر کے کھڑا ہو جا۔" اس نے ریاض کی گردن ایک ہاتھ سے دبوچی اور جھٹکا دے کر کھڑا کر دیا۔

ریاض محمد خاں اپنی گردن بے بسی سے ادھر ادھر جھٹک کر چلانے لگا۔ "مار دے مجھے' جان سے مار دے۔"

لالی نے اسے زور سے دھکا دیا۔ میاں ریاض محمد زمین پر گر کر ہانپنے لگا۔ لالی نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ الماری سے سرنج نکالی۔ دوا بھری اور قریب بیٹھ کر ریاض کا بازو اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس نے نہ مزاحمت کی نہ چیخا۔ خاموشی سے انجکشن لگوا لیا۔ جب واپس جانے لگا تو لالی نے گہری گہری سانسوں کی سرسراہٹ سنی۔ پلٹ کر دیکھا' بوڑھا ریاض دونوں گھٹنوں پر سر رکھے سسکیاں بھر رہا ہے۔ اسے روتے دیکھ کر لالی کے دل کو ٹھیس لگی۔ وہ اداس ہو گیا۔



لالی تہہ خانے سے باہر نکلا اور دھیور کے ہم راہ اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ آج کے واقعے کے بعد ریاض اس کے لیے معمہ بن گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر اسی روپ میں نظر آیا' جو اس نے حیات محمد کے ساتھ پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے سوچا حیات محمد ٹھیک ہی کہتا ہے۔ میاں ریاض واقعی پاگل ہے۔

دوپہر کا کھانا کھا کر لالی بستر پر لیٹا ہی تھا کہ درزی آ گیا۔ اس کا قد اونچا تھا۔ چہرے پر سفید چگی ڈاڑھی تھی۔ اس نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ نہ مسکرایا نہ نظر ملائی۔ گردن جھکائے مختلف زاویوں سے لالی کے جسم کی ناپ لیتا رہا۔ لالی نے اس کی خاموشی پر ہنس کر بے تکلفی کا اظہار کیا۔ "بابے تو بھی گونگا ہے؟"

درزی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی نے کہا۔ "ایک کمیض اور شلوار تو فٹافٹ تیار کر دے۔ دیکھ تو میرے کپڑے کتنے گندے ہو رہے ہیں۔" درزی پھر بھی خاموش رہا۔ لالی کی جانب دیکھے بغیر چپ چاپ کمرے سے باہر چلا گیا۔

سہ پہر کو دھیور دیسی شراب کا ادھا اور سستے برانڈ کی سگریٹوں کے کئی پیکٹ لایا۔ لالی کے حوالے کئے اور دروازے کے باہر اسٹول پر بیٹھ گیا۔ لالی نے ادھا بھی وہسکی کی بوتل کے پاس رکھ دیا۔

دن گزرا' جھٹپٹا ہوا تو لالی کا دل مچلا۔ اس نے وہسکی کی بوتل اٹھائی۔ اسے آنکھوں کے سامنے کیا۔ مسکرا کر ہونٹوں سے چوما۔ بوتل کھولی' ناک سے لگا کر سونگھی۔ خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے وہسکی گلاس میں انڈیلی' پانی ڈالا اور گلاس سامنے رکھ لیا۔ دھیور خاموش بیٹھا لالی کو دیکھتا رہا۔ لالی نے دھیور کی جانب دیکھا۔ گلاس اٹھا کر اس کے قریب پہنچا۔ مسکرا کر گلاس اس کے سامنے کیا۔

"لے یار تو بھی ذرا سی لگا لے۔ ولایتی شراب ہے۔ فسٹ کلاس چیز ہے۔ مزا آ جائے گا۔"

دھیور اس حرکت پر لالی سے ذرا بھی خفا نہیں ہوا۔ صرف انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگا۔ لالی نہ مانا۔ بار بار گلاس دھیور کی طرف بڑھاتا رہا۔ جب مسلسل اصرار کے باوجود دھیور پینے پر رضامند نہ ہوا تو لالی نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "یار اگر تو نہیں پئے گا تو میں نے بھی نہیں پینی۔" اس نے شراب پھینکنے کے لیے ہاتھ موڑا' دھیور جھٹ اپنی جگہ سے اٹھا۔ مسکرایا اور گلاس لالی کے ہاتھ سے لے کر غٹاغٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔

لالی اس قدر خوش ہوا کہ اس نے بے ساختہ دھیور کا منہ چوم لیا۔ دھیور نے خلاف معمول اس

بے تکلفی پر نہ لالی کو گھورا نہ مارنے کے لیے جھپٹا' بلکہ کھل کر مسکرانے لگا۔ اس نے گلاس لالی کی طرف بڑھایا۔ لالی نے بھی تھوڑی سی وہسکی پی۔

ذرا دیر بعد دونوں لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اطمینان سے فرش پر بیٹھے شراب نوشی کر رہے تھے۔ دھیور بھی اپنا گلاس اٹھا لایا تھا۔ دونوں وہسکی کی چسکی لگا رہے تھے۔ گلاس ٹکرا رہے تھے۔ بے تکلفی سے ہنس رہے تھے۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا گہرا ہوگیا تھا۔ رات آہستہ آہستہ اپنا دامن پھیلا رہی تھی۔ دونوں دیر تک وہسکی سے شغل کرتے رہے۔ انھوں نے آدھی سے زیادہ بوتل ختم کردی۔ کھانا بھی ساتھ بیٹھ کر کھایا اور دیر سے کھایا۔

گیارہ بجے دھیور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ لالی کی جانب دیکھا اور چلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں راہ داری میں داخل ہوئے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ہلکی نیل گوں روشنی میں ہر چیز خواب میں تیرتی نظر آتی تھی۔ ان کی آنکھیں نشے سے مخمور تھیں۔

دھیور کچھ زیادہ ہی چڑھا گیا تھا۔ اس نے بے تکلفی سے لالی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ دونوں جھومتے جھامتے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئے۔ لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک دم سنبھل گئے۔

کمرہ خالی تھا۔ حیات محمد ابھی شکار سے واپس نہیں آیا تھا۔ دھیور نے تہہ خانے کا دروازہ کھولا۔ لالی سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ اس کے قدم نشے سے کسی قدر لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ تہہ خانے میں پہنچا تو بوڑھے ریاض محمد خاں وٹو کی آواز ابھری۔

"آگیا تو؟ میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا۔ ریاض نے اس کی نشے سے چڑھی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔ "اچھا تو یہ رنگ ہے۔ کتنی پی؟" لالی پھر بھی نہ بولا۔ ریاض نے ایک بار پھر اسے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور دوپہر والے شوریدہ سر ریاض سے بالکل مختلف تھا۔ لالی کو خاموش دیکھ کر ریاض نے نرم لہجے میں کہا۔ "میرے پاس بیٹھ جا۔ لگا دینا انجیکشن۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" مگر لالی بدستور کھڑا رہا۔ ریاض مسکرایا۔ "ڈر کیوں رہا ہے؟ بیٹھ جا۔ میں تجھے کاٹ نہیں کھاؤں گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "تیرے پاس سگریٹ تو ہوگی؟"

لالی نے آہستہ سے کہا۔ "نہیں۔"

"تیرا نام کیا ہے؟"



"لالی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تو مجھے آبادکار نہیں لگتا۔" بوڑھے ریاض نے اسے غور سے دیکھا۔ "دیکھنے میں تو جانگلی لگتا ہے۔ تو جانگلی ہے نا؟"

"میری ماں بھی یہی کہتی تھی۔"

"تو رہنے والا کہاں کا ہے؟"

"گوگیرہ کے نزدیک اپنا پنڈ ہے جی۔ پر میں زیادہ تر لہور میں رہا۔"

"تب تو تو اسی ضلعے کا ہوا۔" ریاض نے مسکراتے ہوئے لالی کو دیکھا۔ "مگر تو لہور میں رہ کر بھی ڈے لڑ ہی لگتا ہے۔ شراب پی کر تو اپنی آنکھوں سے اور بھی زیادہ خوف ناک ڈے لڑ لگتا ہے۔" اس نے آنکھ مار کر سرگوشی کی۔ "یہ بتا تو کس چکر میں یہاں آگیا؟"

لالی اس کی بات ٹال گیا۔ خاموشی سے الماری کے پاس گیا اور دوا سے بھری ہوئی سرنج نکال کر ریاض کے پاس واپس آگیا۔ وہ انجیکشن لگانے کے لیے اس کے نزدیک بیٹھا تو ریاض نے کہا۔ "ٹھیک سے بیٹھ جا۔ آرام سے لگا دینا انجیکشن۔ مجھے ایسی کوئی جلدی نہیں۔"

"پر مجھے تو جلدی ہے۔" لالی نے کسی قدر بے رخی سے کہا۔ "نیند آرہی ہے' جا کر سو جاؤں گا۔"

"نیند آرہی ہے تو یہیں سو جا۔ ایک دن تو' تجھے یہاں سونا ہی ہوگا۔"

لالی اس کی بات سن کر چونکا۔ "کیوں؟" اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"ہر نیا آنے والا یہی بات پوچھتا ہے۔ میں اسے جواب دیتا ہوں تو وہ یقین نہیں کرتا۔ تو بھی میری بات پر یقین نہیں کرے گا۔ ایسی بات پوچھنے سے کیا فائدہ جس پر یقین نہ آئے۔" ریاض کے لہجے میں دبا دبا کرب تھا۔ اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔

لالی اور پریشان ہوگیا۔ گھبرا کر بولا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے' بابے تو پاگل شاغل نہیں ہے؟" ریاض صرف مسکرا کر رہ گیا۔ مگر یہ مسکراہٹ نہیں تھی' زہرخند تھا۔ لالی نے اصرار کیا۔ "بابے' کیا تو سچ مچ پاگل نہیں ہے؟"

"یہ سوال نہ کر۔ تیری زندگی اور مختصر ہو جائے گی۔" ریاض نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جس نے بھی مجھ سے یہ سوال کیا' وہ کچھ ہی دنوں بعد غائب ہوگیا۔ فیر یہاں نہیں آیا' اس کی لاش آئی۔ یہ جگہ جگہ سے کھدی ہوئی زمین دیکھ رہا ہے؟" اس نے تہہ خانے کے فرش کی جانب اشارہ کیا۔ "یہاں ان کی لاشیں دبی ہیں۔ اب تک ایسی تین لاشیں یہاں دبائی جا چکی ہیں۔ پچھلے چار مہینے سے

یہی تماشا دیکھ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تو چوتھی لاش بن کر یہاں نہ آئے اور مجھے بھوت بن کر رات کی تنہائی میں نہ ڈرائے۔" اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ چہرے پر دہشت طاری ہو گئی۔ "ہر رات جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو یہ بھوت اپنی کٹی ہوئی گردنیں اور زخمی سینے لے کر خون میں لتھڑے ہوئے یہاں آتے ہیں۔ ہنستے ہیں' ناچتے ہیں' شور مچاتے ہیں۔ کبھی میری گردن مروڑتے ہیں۔ کبھی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتے ہیں۔ میں ڈر کر چیختا ہوں تو حیات آجاتا ہے۔ مجھے ہنٹر سے سڑاک سڑاک مارتا ہے۔ یہ دیکھ میری پیٹھ۔" اس نے کرتا اٹھا کر اپنی برہنہ پیٹھ لالی کے سامنے کر دی۔

ریاض کی پیٹھ اور کمر پر لمبی لمبی سیاہ دھاریاں اور بلٹیں پڑی تھیں۔ لالی نے یہ بھی دیکھا کہ تہ خانے کا کچا فرش جگہ جگہ سے کھدا ہوا ہے۔ لالی نے گنا' فرش تین جگہ سے ادھڑا ہوا ہے۔ گویا ریاض ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ لالی کسی ان جانے خوف سے لرز کر رہ گیا۔ اس نے سرنج ایک طرف رکھی اور ریاض کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر کسی قدر عاجزی سے بولا۔

"بابے! یہ تو بتا' یہ سب چکر کیا ہے؟"

"تو زیادہ دیر یہاں ٹھہرے گا تو حیات آجائے گا۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تو میرے ساتھ تیری چمڑی بھی ادھیڑ ڈالے گا۔"

لالی نے جھٹ کہا۔ "وہ تو شکار پر گئے ہیں جی! کل یا پرسوں آئیں گے۔" اسے فوراً دھیور کا خیال آیا۔ لالی کو اس سے بھی خطرہ تھا۔

وہ میاں ریاض سے کچھ کہے بغیر اٹھا اور تیزی سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچا۔ دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ کمرہ ہنوز خالی ہے۔ دھیور دروازے کے قریب فرش پر بے خبر سو رہا تھا۔

لالی تہ خانے میں واپس پہنچا۔ ریاض نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تو اچانک کہاں چلا گیا تھا؟"

"میں دھیور کو دیکھنے گیا تھا جی۔"

دھیور کا نام سن کر بوڑھے ریاض کا چہرہ مکدر ہو گیا۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ "وہ نمک حرام' حیات کا پالتو کتا ہے۔ اس کے پاس دو کتے ہیں۔ ایک السیشن دوسرا دھیور۔ ہر قتل کے لیے وہ انھی کو استعمال کرتا ہے۔ حیات بیرسٹر بھی ہے۔ ہر جرم میں اپنا ہاتھ صاف رکھتا ہے۔ قانون کو پوری طرح جانتا ہے نا۔"

"پر ابھی تو دھیور سو رہا ہے۔ اس نے بھی میرے ساتھ ہی پی تھی اور زیادہ ہی چڑھا گیا تھا۔ اب نشے میں دھت پڑا ہے۔" لالی نے مطلع کیا۔



بوڑھے ریاض محمد وٹو نے دریافت کیا۔ "تجھے ٹھیک سے پتہ ہے حیات آج رات شکار سے نہیں لوٹے گا۔"

"مجھ سے تو جی پچھلی رات انھوں نے یہی بتایا تھا' شام کو نہ لوٹے تو دو تین روز بعد واپسی ہو گی۔"

میاں ریاض محمد خاں نے لالی کی بات سنی تو گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ لالی زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ وہ معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے بے قرار تھا۔ اس نے بوڑھے ریاض کو کریدا۔

"میاں ساب' آپ کے جی سگے بھائی ہیں؟"

"ہاں۔" ریاض نے مختصر جواب دیا۔ وہ ابھی تک سوچتا ہوا نظر آرہا تھا۔

لالی نے اس کی خاموشی سے اکتا کر استفسار کیا۔ "پر انھوں نے آپ کو یہاں تہ خانے میں کیوں ڈال دیا؟ کوئی بات تو ہو گی۔"

"تو بھی سن لے۔ کوئی لمبی چوڑی داستان نہیں' پر تو نہ سن تو اچھا ہے۔" اس نے چوکنا نظروں سے زینے کی جانب دیکھا۔ خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ "تجھے پورا یقین ہے' حیات آج شام واپس نہیں آیا اور دھیور نشے میں مدہوش سو رہا ہے۔"

"میں جی کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔ ابھی آپ کے سامنے ہی تو دیکھ کے آیا ہوں۔" لالی کھسک کر ریاض کے اور قریب ہو گیا اور اپنی بے چینی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے کچھ تو بتایئے جی۔ سمجھ نہیں آتی' یہ سارا چکر کیا ہے؟ سوچتے' سوچتے تھک گیا۔ اپنا تو بھیجا کام نہیں کرتا۔"

"بات صرف اتنی ہے۔ حیات جب بہت چھوٹا تھا۔ مشکل سے دو سال کا رہا ہو گا کہ ماں فوت ہو گئی۔ سال بھر بعد پیو بھی نہ رہے۔ میری پہلی گھر والی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ میں نے حیات ہی کو اپنی اولاد سمجھا' اور اولاد ہی کی طرح اسے پالا پوسا۔ وہ میرا اکلوتا بھائی ہے۔ مجھ سے لگ بھگ ۲۰ برس چھوٹا ہے۔ میری کوئی بھین بھی نہیں۔ میری تمام جائیداد کا وارث حیات ہی تھا۔ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ ساری جائیداد کا وارث وہی بنے گا۔"

لالی نے اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے لقمہ دیا۔ "ویسے بھی جی آدھی جیداد تو ان کی بنتی ہے۔"

"نہیں' ایسی کوئی گل بات نہیں۔" میاں ریاض نے فوراً وضاحت کی۔ "یہ جائیداد مجھے اپنے پیو کے ورثے میں نہیں ملی۔ وہ تو بہت معمولی زمیں دار تھے۔ ان کے پاس ۱۲۵ ایکڑ سے بھی کم اراضی تھی۔ ان کو زمیں داری سے کچھ زیادہ دلچسپی بھی نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے' میں پولیس میں بھرتی

ہو جاؤں یا پٹواری لگ جاؤں۔ اسی لیے انھوں نے مجھے مڈل تک تعلیم دلوائی۔" اس نے اپنا ماضی کریدتے کریدتے ٹھنڈی سانس بھری۔ "مگر انھوں نے جو چاہا' وہ نہ ہوا۔ ہوتا تو وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔" میاں ریاض محمد نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ "یہ اتنی وڈی جاگیر میں نے اپنی صلاحیت اور محنت سے حاصل کی ہے۔"

لالی خاموش بیٹھا رہا۔ ریاض محمد خاں وٹو بتا تا رہا۔ "فیر ایسا ہوا کہ میں نے دوسرا ویاہ کرلیا۔ تب تک میں اس جائیداد کا مالک نہیں تھا۔ منیجر لگا ہوا تھا۔ دوسری گھر والی سے میرا پتر نیاز پیدا ہوا۔ حیات تب جوان تھا۔ ان دنوں وہ لہور میں پڑھتا تھا۔ جب یہ جاگیر میری ہوگئی تو وہ بھی ادھر ہی آگیا۔ زمیں داری کی دیکھ بھال میں میرا ہاتھ بٹانے لگا۔ سچ پوچھو تو ساری ہی ذمہ داریاں میں نے اسے سونپ دی تھیں۔ اب نیاز بھی کچھ لمبا ہوگیا تھا اور سکول میں پڑھتا تھا۔" اس کا لہجہ قدرے تیکھا ہوگیا۔ "پر حیات اس سے خوش نہ تھا۔ خار کھاتا تھا۔ پریشان رہتا۔ میں نے جلد ہی اس کی پریشانی کا سبب جان لیا۔"

"وہ پریشانی کیا تھی جی؟" لالی بیچ میں بول پڑا۔

"سیدھی سادی گل ہے۔" ریاض نے لالی کو مطلع کیا۔ "نیاز کے ہوتے ہوئے حیات میری جائیداد کا وارث کیسے بن سکتا تھا۔ میں نے حیات کی پریشانی کا علاج یہ نکالا کہ اسے اپنے دوست کرنل جانسن کے پاس پڑھنے کے لیے لندن بھیج دیا۔ یہ جاگیر اور تمام فارم شارم پہلے کرنل جانسن ہی کی ملکیت ہوتے تھے۔"

"پر جی' یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ کرنیل نے اتنی وڈی جگیر کیسے دے دی؟" لالی ایک بار پھر بیچ میں بول پڑا۔ "دیکھو نا جی' کوئی اپنی جیداد کسی کو کیسے دے سکتا ہے؟" اس نے نشے کی ترنگ میں لہرا کر بے تکلفی سے آنکھ ماری۔ "کوئی اونچا ہی چکر چلایا ہوگا۔"

"بکواس نہ کر۔" میاں ریاض محمد نے لالی کو غصے سے ڈانٹا۔ "بیچ میں بولے گا تو میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" وہ روٹھنے کے انداز میں منہ موڑ کر بیٹھ گیا۔

مگر لالی نے اسے خاموش نہ رہنے دیا۔ ریاض کا گھٹنا چھو کر گڑگڑانے لگا۔ "غلطی ہوگئی جی۔ اب نہیں بولوں گا۔"

لالی نے منت سماجت کر کے میاں ریاض کو منالیا۔ وہ بتانے لگا۔ "میں چاہتا تھا حیات بہت تعلیم حاصل کرے۔ اسے بچپن میں ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ وہ ڈاکٹری پڑھنے لندن چلا گیا۔ پر ڈاکٹری پڑھتے' پڑھتے اچانک اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ مجھے لکھا کہ بیرسٹری پڑھوں گا۔ میں نے اسے خوشی



ے اجازت دے دی۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ "بیرسٹری کو میں نے ں بھی پسند کیا کہ میں چاہتا تھا وہ بیرسٹر بن کر سیاست میں حصہ لے۔ اسمبلی کا ممبر بنے۔ وزیر بنے۔ گورنر لگے۔ سارے ہی سیاست داں عام طور پر وکیل یا بیرسٹر ہی ہوتے ہیں۔"

"فیر ایہہ گل بھی تو ہے۔" لالی نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔ "بیرسٹری کے ساتھ' ساتھ وہ سیاست میں لگ جاتے تو جگیر اور جیداد کی طرف ان کا دھیان ہی نہ جاتا۔ ورثے کی سوچتے اور نہ نیاز سے خار کھاتے۔" لالی نے داد طلب نظروں سے ریاض کو دیکھا۔ "میں نے غلط تو نہیں سوچا جی؟"

"تیرا خیال ٹھیک ہے۔ میں نے بھی یہی سوچا تھا۔" میاں ریاض نے اس دفعہ لالی کی مداخلت پر خفگی کے بجائے تائید کی۔ "ویسے یہ بھی ہے کہ اپنی برادری کے کئی زمیں دار سیاست میں ہیں۔ پچھلے صوبائی الیکشن میں' جو ۱۹۵۱ء میں ہوئے تھے' ادھر سے میاں خدا یار خاں وٹو جیتا تھا۔ اس کے سسر خاں بہادر میاں نواز احمد خاں مانیکا کا نام تو' تونے بھی سنا ہوگا۔ اپنی ہی قوم کا بندہ ہے۔"

"نہیں جی' میں اسے نہیں جانتا۔" لالی نے گردن ہلا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

"حد ہوگئی۔ تو اسے نہیں جانتا۔ اسے تو سب ہی جانتے ہیں۔" ریاض نے حیرت زدہ ہو کر کہا "خاں بہادر نور احمد مانیکا' پاک پتن کا بہت وڈا زمیں دار ہے۔ وہ تو پاکستان بننے سے بھی پہلے پنجاب اسمبلی کا ممبر رہ چکا ہے۔"

"وہ تو جی مانیکا ہوا اور تم ٹھیرے وٹو۔ فیر وہ تمھاری کوم کا کیسے ہوا؟"

"مانیکا بھی وٹو ہی ہوتے ہیں۔" ریاض نے لالی کو بتایا۔ "سارے ہی وٹو دراصل سورج بنسی راجپوت ہیں۔ پہلے ہندو ہوتے تھے۔ کہتے ہیں بابا فرید گنج شکر نے انھیں مسلمان بنایا تھا۔ اور اب تو بابا فرید کے خلندان سے وٹوؤں کی رشتہ داری بھی ہوگئی ہے۔ خاں بہادر میاں نور احمد مانیکا کی ایک دھی' بابا فرید کے گدی نشین دیوان غلام قطب الدین چشتی سے ویاہی ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "مانیکا' کالوکا' تیجے کا' ٹھاکر کا' لالیکا' وٹوؤں کی گوتیں ہیں۔ اور بھی نہ جانے کتنی ہیں۔ ہماری گوت کالوکا ہے۔"

"میرے ساتھ جیل میں ایک کیدی ہوتا تھا۔ وہ اپنے کو راجپوت بتاتا تھا۔" لالی نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "پر وہ سیال تھا۔ میاں نہیں چوہدری کہلاتا تھا۔"

"چوہدری اور ملک تو کوئی بھی ہوسکتا ہے۔" میاں ریاض محمد نے وضاحت کی۔ "چوہدریوں اور ملکوں کی کوئی ذات' کوئی برادری نہیں ہوتی۔ چوہدری اور ملک تو ایک طرح کا خطاب ہوتا ہے۔ لیکن میاں صرف راجپوتوں کا خطاب ہوتا ہے۔ ویسے تو اب آرائیں اور شیخ بھی خود کو میاں

کہلواتے ہیں۔ مگر اصل میں یہ اونچی ذات کے راجپوتوں کا خطاب ہوتا ہے۔ خاص طور پر پہاڑی علاقے کے راجپوت، جو یہاں ہوتے ہیں، اس معاملے میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ وہ کھیتی باڑی نہیں کرسکتے۔ اپنی دھی کسی نچلی ذات کے راجپوت کو نہیں ویاہ سکتے۔ نہ وہ اپنی دھی کے لیے روپیہ پیسہ لیتے ہیں۔ ان کی زنانیاں سخت پردہ کرتی ہیں۔ اگر کوئی میاں راجپوت خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ میاں نہیں رہتا۔ نچلے درجے کا راجپوت بن جاتا ہے۔ اس کو ہل باہ یا بالی کہا جاتا ہے۔ راجپوت تو چھتری ہوتے ہیں ناں۔ ان کی شان تو تلوار ہوتی ہے۔ وہ فوجی بننا پسند کرتے ہیں۔ میاں سب سے اونچی ذات کے راجپوت ہوتے ہیں۔ ان کے بعد رانا ہوتے ہیں۔ فیر ٹھاکر ہوتے ہیں۔ اور سب سے نچلے درجے کے راؤ ہوتے ہیں۔ وہ رانگھڑ کہلاتے ہیں۔ سیال، چوہان، جویا، مہر، ٹوانے اور راٹھور بھی راجپوت ہوتے ہیں۔ جنجوعہ بھی راٹھوروں ہی کی ایک گوت ہے۔"

میاں ریاض محمد کو عرصے سے کسی کے ساتھ بات چیت کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ لالی نے اسے کریدا تو بات سے بات نکلتی رہی۔ میاں ریاض ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ اپنی اور اپنی ذات برادری کی بڑائی جتانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر لالی اس کی باتوں سے جلد ہی اکتا گیا۔ اسے نہ راجپوتوں سے دلچسپی تھی، نہ وٹوؤں سے اور نہ ان کی مختلف گوتوں سے۔ اسے صرف میاں حیات محمد سے دلچسپی تھی، جس نے اسے اپنے بنگلے میں اس طرح قید کردیا تھا کہ نہ وہ باہر نکل سکتا تھا اور نہ رحیم داد کے پاس پہنچ سکتا تھا۔ لہٰذا میاں ریاض کی بات نظرانداز کرکے اس نے ایک بار پھر میاں حیات محمد کا ذکر چھیڑ دیا۔

"یہ تو بتائیں جی، میاں صاب نے بیرسٹری پڑھی یا اسے بھی ڈاکٹری کی طرح چھوڑ دیا؟"

"نہیں، وہ ۵ سال بعد بیرسٹر بن کر لندن سے واپس آگیا۔ لندن سے اپنے ساتھ میم بھی لایا تھا۔"

"میں نے تو جی یہاں کوئی میم شیم دیکھی نہیں۔"

"وہ تھوڑے ہی دنوں بعد انگلستان چلی گئی۔ فیر واپس نہیں آئی۔ میں نے حیات کا ویاہ کردیا۔ اس سے ایک بچی بھی ہے۔ مگر گھر والی حیات کے ساتھ نہیں رہتی۔ وہ بری کڑی نہیں ہے۔ پڑھی لکھی اور سمجھدار ہے۔ یہی کمینہ اور بدمعاش ہے۔ شراب کے نشے میں دھت ہوکر اسے ہنٹر سے مارتا ہے۔ وہ لنگریالوں کی دھی ہے۔ اتنے اونچے گھرانے کی بیٹی کب تک اس کا ظلم برداشت کرتی، آخر روٹھ کر اپنے میکے چلی گئی۔ کبھی کبھار آجاتی ہے۔" ریاض نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔
"لندن سے واپسی کے بعد حیات نے کبھی بیرسٹری نہیں کی۔ میرے بار بار کہنے پر بھی اس نے



پریکٹس شروع نہیں کی۔ ہاں سیاست میں ضرور حصہ لینے لگا۔ مگر نہ وزیر لگا نہ گورنر اور نہ کبھی اسمبلی کی ممبری کی کوشش کی۔ وہ صرف بادشاہ گری کرتا ہے۔"

لالی نے ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر حیرت سے پوچھا۔ "یہ بادشاہ گری کیا ہوتی ہے جی؟"

"وہ یہ ہوتی ہے۔ کسی کو اسمبلی کا ممبر بنوا دیا، کسی کو وزیر لگوا دیا۔ کسی پارٹی کو اوپر کرادیا کسی کو نیچے۔ کبھی اس ٹولے کے ساتھ، کبھی اس ٹولے کے ساتھ۔ کہتا ہے، اصلی سیاست یہی ہے۔ پیچھے بیٹھے ڈوری ہلاتے رہو۔"

"اپنا میاں صاب تو بہت اونچا کاریگر معلوم ہوتا ہے۔" لالی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ نشے کا ایک بار پھر ریلا آیا۔ لالی بہکنے لگا۔ "وہ فلم تو آپ نے دیکھی ہوگی جی، 'استاد چکرم'، کیا زوردوں کی فلم تھی۔"

لالی نے نیم وا آنکھوں سے ریاض کو دیکھا اور جھوم کر اپنی بھونڈی آواز میں گنگنانے لگا۔ "آنکھیں شرابی، چہرہ گلابی۔"

ریاض نے غصے سے گھورا۔ "فیر تو نے بکواس شروع کردی۔"

لالی چونک پڑا۔ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا۔ "معاف کرنا جی! تھوڑی سی چڑھ گئی ہے۔" لالی نے منانے کے لیے ایک بار پھر اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ "اب نہیں بولوں گا جی۔ رب سوہنہ بالکل نہیں بہکوں گا۔"

"معلوم نہیں، میں کیا کہہ رہا تھا۔" ریاض کچھ دیر خاموشی سے سوچتا رہا، پھر بولا۔ "یاد آیا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا، حیات سیاست میں چور دروازے سے حصہ لینے لگا۔ مگر وہ زمینداری کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتا۔ فیر اس نے ایک بہت کمینی حرکت کی۔ ادھر ادھر یہ مشہور کردیا کہ نیاز میرا نہیں، کرنل جانسن کا پتر ہے۔"

لالی پھر بیچ میں بول پڑا۔ "یہ تو بہت شرم کی گل ہے جی! بہت بدنامی ہوئی ہوگی۔"

لالی کی مداخلت پر ریاض خفا نہیں ہوا، گہری سانس بھر کر بولا۔ "ٹھیک کہہ رہا ہے۔ نیاز کی ماں نے یہ بات سنی تو اسے اتنا دکھ ہوا کہ خودکشی کرلی۔ میں نے تب ہی سوچا تھا، حیات کو دھتکار کر نکال دوں۔ مگر وہ میرے پیر پکڑ کر رونے لگا۔ میں نے اسے معاف کردیا۔ پر نیاز نے معاف نہیں کیا۔ وہ مشکل سے ۱۹ سال کا تھا۔ لیکن اتنا ناراض ہوا کہ اس کا بس چلتا تو حیات کو گولی سے اڑا دیتا۔ وہ بہت سرکش اور ضدی ہے۔ میں نے سوچا، کسی روز چاچا بھتیجے میں گولی نہ چل جائے، نیاز کو پڑھنے کے لیے امریکہ بھیج دیا۔ اسے وہاں گئے ہوئے لگ بھگ ڈیڑھ سال ہوچکا ہے۔ ابھی سال بھر اور امریکہ میں تعلیم حاصل کرے گا۔"

"آپ نے جی! اپنے لیے یہ ٹھیک نہیں کیا۔"

ریاض بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا کرتا۔ کوئی اور رستہ بھی نہیں تھا۔ مگر سال بھر بعد میں نے اسے واپس بلانا چاہا۔ ہوا یہ کہ نیاز کے امریکہ جانے کے چند ہی مہینوں بعد میری پہلی گھر والی بھی مرگئی۔ میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ میں چاہتا تھا' میرا پتر میرے پاس رہے۔ لیکن حیات نے کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے اسے واپس نہ آنے دیا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میں نے یہ بھی غور کیا کہ زمیں داری کے معاملوں میں حیات من مانی کرنے لگا تھا۔ میری ذرا پرواہ نہ کرتا۔ جو جی چاہتا' فیصلہ کرتا۔ مجھ سے دور دور رہتا۔ بلاتا تو نہ آتا۔ ٹال مٹول سے کام لیتا۔"

"آپ کو تو جی تب ہی ہوشیار ہوجانا چاہئے تھا۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" بوڑھے ریاض نے لالی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے یہی غلطی ہوئی۔ کیا کرتا' بھائی کی محبت نے اندھا کردیا تھا۔" اس نے لالی کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ "انھی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک رات میں دیر سے واپس آرہا تھا۔ بنگلے سے کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے پر اندھیرے میں مجھ پر اندھادھند فائرنگ ہوئی۔ میں بال بال بچ گیا۔ البتہ میرا ایک کرندہ بری طرح زخمی ہوگیا۔ بعد میں پوچھ تاچھ کرنے پر پتہ چلا' مجھ پر یہ قاتلانہ حملہ حیات کے اشارے پر دھیور نے کیا تھا۔ دھیور کو تو میں نے ایسی سزا دی کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ حیات کو جاگیر سے علیحدہ کردوں تاکہ اس کے دماغ سے وارث بن جانے کا خناس ہی نکل جائے۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اسے ہٹاتا' اس نے مجھے اپنے راستے سے 'ہٹا دیا۔ لگ بھگ چار مہینے سے اس تہہ خانے میں بند ہوں۔"

"پر یہ چکر کب تک چلے گا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ وہ مجھے قتل بھی کرنا نہیں چاہتا۔"

لالی نے پوچھا۔ "کیوں؟"

"مجھے قتل کرنے سے ابھی اسے کیا ملے گا۔ میری جائیداد کا وارث حیات نہیں میرا پتر نیاز ہے۔ حیات میرے سامنے بار بار وصیت نامے کی دستاویز لے کر آتا ہے' جس کے ذریعے وہ چاہتا ہے میں نیاز کو عاق کردوں اور تحریری طور پر یہ تسلیم کرلوں' نیاز میرا نہیں کسی اور کا نطفہ ہے۔ اس طرح نیاز کو جائیداد سے محروم کرکے حیات کو اپنا وارث بنادوں۔"

"میں تو کہتا ہوں جی' آپ دستاویز پر دستخط کردیں۔ کید سے تو چھٹکارا مل جائے گا۔ فیر عدالت میں جاکر کہہ دیجئے گا' مجھ سے زبردستی دستخط کرائے گئے تھے۔"



"وہ تیری طرح بیوقوف نہیں ہے۔ دستاویز پر دستخط کرتے ہی مجھے مار کر یہیں تہہ خانے میں دبا دے گا۔ وہ ایک سال پہلے کی دستاویز پر مجھ سے دستخط کرانا چاہتا ہے۔ وہ بیرسٹر ہے' بیرسٹر۔ قانون کو ہر معاملے میں سامنے رکھتا ہے۔"

ریاض نے اپنی بات ختم کی تو تہہ خانے میں گہری خاموشی چھاگئی۔ چند لمحے بعد لالی نے کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا جی کہ آپ پاگل شاغل بالکل نہیں ہیں؟"

"ویسے تو اس نے مجھے پاگل ہی بنا رکھا ہے۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ مدت بعد سچ مچ پاگل ہوجاؤں گا۔ کبھی کبھی مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑتا بھی ہے۔ میں بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا ہوں۔ تب مجھے کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا۔ جب سے حیات نے یہ انجکشن لگانے شروع کئے ہیں' اس وقت سے مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہونے لگا ہے۔"

"یہ بات تو میں نے بھی نوٹ کی۔ مجھے بھی ان انجکشنوں کا ایسا ہی چکر لگتا ہے۔"

"ویسے تو مجھے ان سے نیند آجاتی ہے۔" ریاض ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔ "انجکشن لگنے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے میں بادل کی طرح بالکل ہلکا پھلکا ہوگیا ہوں۔ کبھی تیز ہواؤں کی آوازیں سنتا ہوں' کبھی پانی کا شور۔ کبھی اوپر سے نیچے جاتا ہوں' کبھی خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ فیر میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہوجاتی ہیں۔"

"نیاز کو ان باتوں کا پتہ ہے؟"

"نہیں۔ میرا خیال ہے' اسے کچھ نہیں معلوم۔ اسے معلوم ہوتا تو فوراً یہاں آتا اور مجھے قید سے نکالنے کی کوشش کرتا۔ وہ ضرور ایسا کرتا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا' اسے یہ باتیں معلوم ہوں اور وہ چپ کرکے بیٹھا رہے۔ تمھی سوچو' یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ میرا پتر ہے' میرا اپنا خون ہے۔" ریاض جذباتی ہوگیا۔

لالی بھی اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ "مجھے نیاز کا پتہ بتائیں جی۔ میں ساری باتیں خط کے ذریعے اسے بتادوں گا۔" لالی نے گرم جوشی سے ریاض کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا اور بڑے جوش سے یقین دلایا۔

"پرواہ نہ کریں جی' یہ کام تو میں ضرور کردوں گا۔"

لالی کی بات سن کر ریاض پریشان ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ وہ انکار میں دونوں ہاتھ ہلا کر بولا۔ "نہیں' نہیں تو ایسا نہیں کرسکتا۔" وہ گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ "تجھ سے پہلے ان تینوں نے بھی ایسی ہی کوشش کی تھی۔ اب وہ اس تہہ خانے میں دفن ہیں۔ میں نے منع بھی کیا

مگر نہیں مانے۔ اب مجھے رات کی تنہائی میں اپنے کٹے ہوئے سر اور زخمی سینے دکھا کر ڈراتے ہیں۔"

ریاض کسی ان جانے خوف سے لرزنے لگا۔ "حیات تجھے ایسا نہیں کرنے دے گا۔ وہ خوں خوار چیتے کی طرح بہت چوکنا رہتا ہے۔ تو اسے نہیں جانتا۔" یہ کہتے کہتے یکایک اس کے چہرے پر وحشت طاری ہو گئی۔ وہ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے زور سے چیخا۔

"دیکھ' وہ آگیا۔"

لالی نے گھبرا کر پیچھے دیکھا' میاں حیات زینے کے پاس کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہنٹر تھا اور سرخ سرخ آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ خوں خوار نظروں سے دونوں کو گھورتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ اس کا سیاہ کتا بھی تھا۔ لالی ذرا دیر تو سہا ہوا خاموش بیٹھا رہا' مگر جب حیات اس کے قریب پہنچ گیا تو اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ حیات محمد نے گرج دار لہجے میں کہا۔ "بیٹھا رہ۔" لالی جہاں تھا' وہیں بیٹھا رہا۔

ریاض نے حیات سے نظریں نہیں ملائیں۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر کے گردن جھکا لی حیات تیزی سے ریاض پر جھپٹا اور اسے ہنٹر سے سڑاک سڑاک مارنے لگا۔ بوڑھے نے بے بسی سے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ گڑگڑا کر بولا۔ "نہیں' نہیں۔" مگر حیات باز نہ آیا۔ گھما گھما کے ہنٹر چلاتا رہا۔ ریاض بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ خوف اور دہشت سے اس کا پیشاب نکل گیا۔ دونوں ٹانگیں شرابور ہو گئیں۔ فرش بھی گیلا ہو گیا۔ حیات نے ہاتھ روک لیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے لالی سے دریافت کیا۔

"انجیکشن لگا دیا تو نے؟"

لالی نے آہستہ سے کہا۔ "ابھی نہیں۔"

"انجیکشن لگا۔"

لالی نے خاموشی سے سرنج اٹھائی اور ریاض کی کمر میں انجیکشن لگا دیا۔ ریاض فرش پر پڑا آہستہ آہستہ کراہتا رہا' گہری گہری سانس بھرتا رہا۔ جب لالی انجیکشن لگا چکا تو حیات نے اس کے ہاتھ سے سرنج لے کر الماری میں رکھ دی اور لالی کو مخاطب کیا۔

"میرے ساتھ آ۔"

لالی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں سیڑھیوں کے قریب پہنچے تو پیچھے سے ریاض کی آواز ابھری۔ "سنو۔"



لالی نے پلٹ کر دیکھا۔ ریاض اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اس سے کہہ رہا تھا۔ "لاش بن کر یہاں آنا تو مجھے بھوت بن کر نہ ڈرانا۔ اپنی کٹی ہوئی گردن اور خون سے تھڑا ہوا سینہ نہ دکھانا۔"

حیات نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں زینے کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچ گئے۔ لالی سہما ہوا بوجھل قدموں سے چل رہا تھا۔ تہہ خانے کے دروازے سے گزر کر دونوں کمرے میں آگئے۔ دھیور مدھم روشنی میں ایک طرف کھڑا تھا۔ اس نے بڑھ کر تہہ خانے کا دروازہ بند کر دیا۔

حیات محمد آگے بڑھا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ ہنٹر ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔ لالی اس کے روبہ رو نظریں جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اس کی پشت پر دروازے کے قریب دھیور موجود تھا۔ حیات تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا پھر لالی کی طرف متوجہ ہوا۔ تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔ "کیا کہتا تھا وہ؟" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

حیات غصے سے ڈپٹ کر بولا۔ "خاموش کیوں ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟"

لالی گڑگڑانے لگا۔ "ساب غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیجئے۔"

حیات تیوری پر بل ڈالے خوں خوار نظروں سے اسے گھورتا رہا' گردن کو ذرا سا خم دے کر بولا۔ "مجھے معلوم ہے اس نے کیا کہا ہو گا۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔ "وہ بہت مظلوم ہے۔ خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے اس نے تجھے بھی ایک دردناک داستان سنائی ہو گی۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا ہو گا کہ خود اس نے کتنا ظلم ڈھایا ہے۔ اس کے ظلم و ستم کا جیتا جاگتا ثبوت یہ کھڑا ہے۔" اس نے دھیور کی جانب اشارہ کیا۔ "اس کی زبان اس نے صرف اس لیے کٹوا دی کہ یہ اس کے گرے ہاؤنڈ کتوں کے راتب سے گوشت چرا کر کھا جاتا تھا۔ یہ دھیور تیرے سامنے کھڑا ہے۔ اس سے پوچھ' کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

لالی نے مڑ کر دیکھا' دھیور دروازے کے قریب کھڑا آہستہ آہستہ گردن ہلا کر اقرار کر رہا ہے۔ حیات کہتا رہا۔ "اس سے یہ بھی پوچھ' اس نے اسے خصی بھی کرا دیا ہے۔ یہ اکیلا نہیں' اس بنگلے میں اور بھی ایسے ہی کئی کھسرے ہیں۔ ان سب کو اس نے خصّی بنایا ہے۔ پتہ ہے اس نے ایسا کیوں کیا؟"

لالی نے آہستہ سے انکار میں گردن ہلا دی۔

حیات نے بتایا۔ "اسے اپنی دونوں گھر والیوں پر اعتماد نہیں تھا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "اس

نے یہ بھی نہیں بتایا ہوگا کہ یہ جائیداد اور جاگیر اس نے کرنل جانسن سے کس طرح حاصل کی۔ ریاض تو اس کا معمولی کرندہ تھا۔ ایسا خوشامدی اور وفادار تھا کہ اس کی خاطر مزارعوں کے کھیت کھلیان جلوا دیتا' ان کے گھربار تباہ کرا دیتا' ان کی کڑیوں اور گھر والیوں کو اٹھوا لیتا۔ انھیں بے دخل کرنا' ان کے خلاف جھوٹے مقدمے بنوانا' انھیں جیل بھجوانا' قتل کرا دینا اس کے نزدیک بہت معمولی بات تھی۔ اس کارگزاری کے صلے میں وہ کرندے سے ترقی کر کے منیجر بن گیا۔" حیات محمد نے تہہ خانے کے دروازے کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "یہ تہہ خانہ پہلے بھی جیل خانہ تھا۔ اس کے اندر نہ جانے کتنی لاشیں دفن ہیں۔ اس بنگلے میں ایسے دو تہہ خانے اور بھی ہیں۔ ان میں ہمیشہ قیدی بند رہے اور بہت سوں کا قبرستان بھی بنے۔ اب تو صرف وہ اکیلا قیدی رہ گیا ہے۔ دوسرے تہہ خانے میں نے گودام بنا دیئے۔"

حیات نے قدرے توقف کے بعد اونچی آواز سے کہا۔ "سن لیا تو نے؟"

"میاں ساب! آپ نے تو ایسی باتیں بتائیں کہ اپنا سر چکرا گیا۔"

"وہ کہتا ہے' یہ جاگیر اور جائیداد اس نے اپنی محنت اور صلاحیت سے حاصل کی ہے۔ جانتا ہے اس نے کیسی صلاحیت دکھائی۔ اس نے اپنی عزت بھی داؤ پر لگا دی۔ اپنی نوجوان گھر والی کو کرنل جانسن کی رکھیل بنا دیا' پھر گلا گھونٹ کر اس کا خون بھی کر دیا۔ مشہور کر دیا کہ اس نے خودکشی کر لی۔"

حیات محمد خاموش ہو کر بے چینی سے اپنا ایک پیر آہستہ آہستہ ہلانے لگا۔ کمرے میں گہری خاموشی پھیل گئی۔ چند لمحے بعد حیات کی آواز ابھری۔ وہ غصے سے کہہ رہا تھا۔ "نیاز اس کا پتر نہیں ہے۔ وہ جھوٹ بولتا ہے' بکواس کرتا ہے۔ دربار ہال میں کرنل جانسن کی تصویر لگی ہے۔ نیاز کو تصویر کے برابر کھڑا کر دے اور دیکھ لے' وہ جانسن کا پتر ہے یا ریاض کا۔ یہ بات وہ بھی جانتا ہے۔ وہ چھوٹے بھائی کو جائیداد کا وارث بنانا نہیں چاہتا۔ کرنل جانسن کے پتر نیاز کو وارث بنانا چاہتا ہے۔ اس کا وفادار جو ہے۔" حیات نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "اونہہ' یہ اس کا بھی تو وفادار نہیں۔ پاکستان بنا اور انگریزی راج ختم ہوا تو اس نے جاگیر اور جائیداد ہتھیانے کے لیے اس کے خلاف سازشوں کا جال پھیلا دیا۔ میرے ذریعے مزارعوں کو بھڑکایا' سرکشی پر اکسایا۔ مزارعوں سے کہا' بٹائی دینا بند کر دو' فارموں پر کام کرنا چھوڑ دو۔ دوسری طرف کرنل کی حمایت میں ان پر فائرنگ بھی کرائی۔ ایسے سنگین حالات پیدا کر دیئے کہ جانسن سخت خوف زدہ ہو گیا۔ ایسا پریشان ہوا کہ دو لاکھ روپے سالانہ پر اپنے تمام فارم اور پوری زمینداری اس کے سپرد کر کے لندن چلا گیا اور اب تو وہ



لرنل جانسن کو کچھ بھی نہیں دیتا۔ ساری جاگیر ہتیا کر اپنے نام کرا لی۔"

حیات محمد چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔ "مجھے کہتا ہے' میں بے ایمان وں' ظالم ہوں۔ اب تو بتا۔ بے ایمان اور ظالم کون ہے؟" لالی نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ ظریں نیچے کئے چپ کھڑا رہا۔ حیات نے اونچی آواز سے پوچھا۔ "بول' جواب دے۔ خاموش کیوں ہے؟"

لالی نے ایک بار پھر گڑگڑا کر کہا۔ "میاں ساب! غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیجئے۔"

حیات محمد خاموش بیٹھا رہا۔ لالی نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "وہ ایسا ہوا جی' کچھ زیادہ ا چڑھ گئی تھی۔ بہت دنوں بعد پی تھی۔ بالکل یاد نہیں رہا۔ میں تو جی ان سے کبھی بات ہی نہیں لرتا تھا اور نہ ان کی سنتا تھا۔ فٹافٹ انجیکشن لگا کر آ جاتا تھا۔ وہ تو جی مجھے بھی گونگا بہرا سمجھتے تھے۔ آج اپنی مت ماری گئی۔"

حیات محمد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تیری نہیں' اس کی مت ماری گئی تھی۔" اس نے دھیور کی انب گردن موڑ کر دیکھا۔ "مگر اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ میرا حکم نہ ماننے کی کیا سزا ہوتی ہے۔ اس اچہرہ ٹھیک سے دیکھ۔"

لالی نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر غور سے دھیور کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی سے کنپٹی کے نیچے تک سیاہ لکیر پھیلتی چلی گئی تھی۔ حیات بولا۔ "قمیص اٹھا کر اس کی پیٹھ بھی دیکھ لینا۔ میں نے تجھے اس کی نگرانی میں اس لیے نہیں دیا تھا کہ یہ نشے میں مدہوش ہو کر تہہ خانے کے دروازے پر وجائے۔ اور تو تہہ خانے کے اندر آرام سے بیٹھ کر میرے خلاف اس بڈھے کھوسٹ کی بکواس سنے۔"

لالی عاجزی سے بولا۔ "ساب! معاف کر دیجئے۔ اب کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ آپ سے لکل سچ کہہ رہا ہوں۔" حیات محمد وٹو نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ چپ بیٹھا ہنٹر مروڑتا رہا۔ لی نے چند لمحے خاموش رہ کر ایک بار پھر التجا کی۔ "ساب جی اس بار معافی دے دیجئے۔ آگے ایسی طی ہو تو گولی مار دیجئے۔"

حیات نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور اونچی آواز سے بولا۔ "اس تہہ خانے میں پچھلے چند مہینوں میں تین لاشیں دبائی جا چکی ہیں۔ یہ بات شاید اس نے بھی تجھے بتائی ہوگی۔ میں ہتا ہوں چوتھی لاش تیری نہ ہو۔" اس نے قریب بیٹھے ہوئے اپنے السیشن کی طرف اشارہ کیا۔ ا... سرا انجیکشن لگایا جاتا ہے تو یہ السیشن نہیں رہتا' تیندوا بن جاتا ہے۔ خونخوار ہو کر

جس پر جھپٹتا ہے' اسے چیر پھاڑ کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا ہے۔ تو نے دوسرا انجکشن بھی دیکھا ہے' لیکن یہ نہیں دیکھا' اس کے لگنے کے بعد یہ کتنا خوفناک بن جاتا ہے۔" لالی خوف سے لرز گیا۔ السیشن حیات محمد کے پیروں کے پاس لیٹا دھیرے دھیرے غرا رہا تھا۔

لالی نے السیشن کی جانب نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ سہا ہوا خاموش کھڑا رہا۔ یکایک کتا زور سے بھونکا رات کے گہرے سناٹے میں اس کی آواز بہت ڈراؤنی معلوم ہوئی۔ لالی اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔ حیات محمد جھک کر السیشن کی پیٹھ سہلاتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ "نہیں' ابھی وقت نہیں آیا۔" اس نے گردن اٹھا کر لالی کی طرف دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔ پھر بھاری بھرکم لہجے میں بولا۔ "لالی!" وہ لمحہ بھر خاموش رہا۔ "آئندہ ایسی غلطی نہ ہو۔ میں تجھے آخری موقع دے رہا ہوں اور اس لیے دے رہا ہوں کہ وہسکی کی بوتل میں نے ہی تجھے دی تھی۔ اس کے نشے میں تو سب کچھ بھول گیا۔ میرا حکم بھی بھول گیا۔ تجھے یہ پتہ نہیں' میں کبھی غافل نہیں رہتا۔ ہمیشہ چوکنا رہتا ہوں۔"

لالی نے دونوں کان انگلیوں سے پکڑ کر کہا۔ "میاں ساب' اب شراب کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔"

"میں تجھ پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگانا چاہتا۔ صرف یہ چاہتا ہوں' میں جیسا کہوں' تو بالکل ویسا ہی کر۔ جب تک یہاں رہنا ہے' تجھے گونگا اور بہرا بن کر رہنا ہو گا بلکہ آنکھوں سے بھی کم سے کم کام لینا ہو گا۔ سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا جی' بالکل سمجھ گیا۔"

حیات نے حکم دیا۔ "جا' جا کر اب اپنی جگہ سو جا۔"

لالی نظریں جھکائے دروازے پر پہنچا۔ دھیور نے دروازہ کھول دیا' اور لالی سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ لالی باہر آ گیا۔ مگر دھیور نہ آیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ لالی کو دھیور کے نہ آنے پر تعجب تو ہوا مگر وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر لیٹ گیا۔

☆

رات کے پچھلے پہر اچانک لالی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ کمرے کے دروازے کے سامنے دھیور حسب معمول اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ لالی کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ مگر جب دھیور مسلسل کراہتا رہا تو وہ اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ دھیور بستر پر اوندھا پڑا تھا۔

لالی اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور دھیرے دھیرے اس کا سر دبانے لگا۔ دھیور نے اسے منع نہیں



لیا' نہ گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ بے حال پڑا کراہتا رہا۔ لالی نے اس کی قمیص کا دامن ٹھایا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں دیکھا' دھیور کی پیٹھ پر ہنٹر کی مار سے نیل پڑ گئے ہیں۔ کھال جگہ بلہ سے پھٹ گئی ہے۔ زخموں سے خون نکل کر جم گیا ہے۔ لالی پریشان ہو کر بولا۔ "اوے ربا! میاں اب نے تو سچ مچ تیری چمڑی ادھیڑ ڈالی۔ کیسے لمبے لمبے لاس پڑے ہیں۔"

دھیور خاموش لیٹا رک رک کر کراہتا رہا۔ لالی ذرا دیر دھیور کی زخمی پیٹھ تکتا رہا' پھر اٹھا۔ لمرے کے اندر گیا۔ کونے میں رکھی ہوئی وہسکی کی بوتل اٹھائی اور دھیور کے پاس آ گیا۔ اس نے ِتل کھولی۔ تھوڑی سی وہسکی ہتھیلی پر ڈالی اور اسے دھیور کے زخموں پر آہستہ آہستہ لگایا۔ وہسکی لگتے ہی دھیور نے تکلیف سے بلبلا کر ہائے کی۔

لالی نے اس کا سر پیار سے تھپک کر نرم لہجے میں کہا۔ "صبر کر۔ ذرا دیر میں چنگا ہو جائے گا۔" دھیور نے مزاحمت نہیں کی۔ کراہتا رہا اور گہری گہری سانس بھرتا رہا۔ لالی چپ بیٹھا اس کی پیٹھ وہسکی لگاتا رہا۔ وہ اپنی چوٹ اور زخموں کا علاج بھی اسی طرح کرتا تھا۔ یہ نسخہ اس نے ورڈشکرے سے سیکھا تھا۔ ان دنوں انور اس کے گروہ کا سرغنہ تھا۔ وہ لمبا چوڑا قوی ہیکل جوان ا۔ لگتا بھی ڈشکرا تھا۔

لالی' دھیور کی پیٹھ کے زخموں پر ہولے ہولے وہسکی لگاتا رہا۔ دھیور کچھ دیر تو بے قرار ہو کر ادھر ھر گردن ہلاتا رہا۔ رفتہ رفتہ زخموں کی ٹیس کم ہوتی گئی۔ سکون ملا تو اس نے کراہنا بند کر دیا۔ کچھ یہ بعد وہ سو گیا۔ لالی اس کے قریب خاموش بیٹھا رہا۔ دھیور منہ اوندھا کیے پیٹ کے بل بے سدھ اتھا۔

اس کا ریوالور تکیے کے نیچے رکھا تھا۔ لالی نے اسے دیکھا اور چند لمحوں تک دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ چمڑے کے ہولسٹر سے نہایت ہوشیاری سے ریوالور نکالا۔ اسے گھما پھرا ردیکھا۔ دھیور کو مطلق خبر نہ ہوئی۔

لالی آہستہ سے نیچے اترا اور چند لمحوں تک دھیور کے سرہانے چپ چاپ کھڑا رہا۔ ہر طرف گہرا ٹا چھایا تھا۔ لالی نے وہیں کھڑے کھڑے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ دھیور گہری نیند سو رہا تھا اور ں کا ریوالور لالی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ دبے دبے قدموں چلتا ہوا غلام گردش کے دروازے پر پہنچا۔ ںانے ہولے سے دروازہ کھولا۔ سامنے نیل گوں روشنی میں سیاہ السیشن بیٹھا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی پھاڑ کر غرایا۔

لالی نے جھٹ غلام گردش کا دروازہ بند کر دیا۔ الٹے قدموں واپس ہوا۔ دھیور کے سرہانے پہنچ

کر اس نے جس ہوشیاری سے ریوالور نکالا تھا' اسی ہوشیاری سے ہولسٹر میں رکھ دیا۔ وہ اپنے کمرے میں گیا اور بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

دوسرے روز دن چڑھے درزی کرتا اور شلوار سی کر لے آیا۔ لالی نے غسل کیا۔ نیا لباس پہنا اور دوپہر کو دھیور کے ہم راہ تہہ خانے کے دروازے پر پہنچا' اندر گیا' الماری سے سرنج نکالی' اس میں دوا بھری اور ریاض کے قریب پہنچ گیا۔ لالی نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بات کرتا بھی تو لالی نہ بولتا۔ وہ یہی طے کر کے تہہ خانے میں گیا تھا۔ ریاض بھی خاموش رہا۔ مگر جب لالی نے جھک کر اس کی کمر میں انجکشن لگایا تو ریاض نے سرگوشی کی۔

"بھاگ سکتا ہے تو بھاگ جا۔ آج رات تجھے قتل کر دیا جائے گا۔"

لالی کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے بوڑھے ریاض کو دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

ریاض نے گردن اٹھا کر زینے کی جانب دیکھا اور لالی کے چہرے کے قریب منہ لا کر بولا۔ "پچھلی رات حیات اور دھیور یہاں آئے تھے۔ انھوں نے تیری لاش دفن کرنے کے لیے قبر کا نشان بھی ڈال دیا ہے۔ وہ دیکھ۔" اس نے انگلی اٹھا کر ایک طرف اشارہ کیا۔ لالی نے دیکھا' آتش دان سے ذرا ہٹ کر دیوار کے پاس فرش تازہ تازہ اکھڑا ہوا ہے۔ لالی پریشان ہو گیا۔ وہ بدستور خاموش رہا۔ ریاض مدھم لہجے میں اس طرح بولنے لگا جیسے بڑبڑا رہا ہو۔

"ٹھیک بارہ بجے رات کو بنگلے کی تمام بتیاں بجھ جائیں گی۔ ہر طرف اندھیرا چھا جائے گا۔ فیر رات کے سناٹے میں حیات کے السیشن کے زور زور سے بھونکنے کی خوف ناک آواز ابھرے گی۔ جب بتیاں دوبارہ جلیں گی تو ایک لاش یہاں آئے گی۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔" میاں ریاض محمد وٹو ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ "ایک لاش' دوسری لاش' تیسری لاش اور اب چوتھی لاش آنے والی ہے۔" اس نے نظر بھر کر لالی کا چہرہ دیکھا۔ "ابھی تو میرے سامنے زندہ بیٹھا ہے۔ جب رات آدھی ہو جائے گی' تو خون میں لتھڑی لاش بن جائے گا۔ دھیور لاش اٹھائے کبڑوں کی طرح جھکا جھکا زینے سے نیچے اترے گا۔ اس کے پیچھے حیات ہو گا۔ دھیور لاش ایک طرف ڈال دے گا۔ فیر نہ تو رہے گا نہ لاش۔" یہ کہتے کہتے بوڑھے کے چہرے پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ ٹھٹھا مار کر زور سے ہنسا۔

لالی کا تمام جسم ستار کے تاروں کی مانند جھنجھنا اٹھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے انجکشن لگایا۔ اور بوڑھے ریاض کی جانب دیکھے بغیر جلدی سے اٹھا۔ مگر جب سرنج الماری میں رکھ رہا تھا تو اس



نے سیڑھیوں پر آہٹ سنی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا' حیات محمد سیڑھیوں سے اتر کر نیچے پہنچ چکا ہے۔ اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔

"تو نے انجکشن لگا دیا؟"

"جی ساب!"

"کیا تو آج مقررہ وقت سے پہلے یہاں نہیں آگیا؟"

"مجھے نہیں ملوم جی۔" لالی نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے تو دھیور جب اشارہ کرتا ہے' میں اس کے ساتھ آجاتا ہوں۔"

میاں حیات محمد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ اس نے بوڑھے ریاض محمد کی طرف دیکھا' وہ زمین پر سکڑا سکڑایا' آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ حیات نے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں تہہ خانے سے باہر آئے۔ دروازے پر دھیور بت بنا کھڑا تھا۔ حیات محمد نے اس سے بھی بات نہیں کی۔

دھیور نے تہہ خانے کا دروازہ بند کر کے قفل لگایا اور لالی سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ میاں حیات محمد وٹو صوفے پر خاموش بیٹھا رہا۔ السیشن اس وقت بھی اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ گردن اٹھائے لالی اور دھیور کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں آگے بڑھے اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر چلے گئے۔

کمرے میں پہنچ کر لالی نڈھال ہو کر بستر پر گر گیا۔ تھوڑی دیر بعد مائی جنتے کھانا لے کر آگئی۔ لالی نے کھانا رغبت سے نہیں کھایا۔ وہ ذہنی طور پر اس قدر پریشان تھا کہ کھانا کھایا ہی نہ گیا۔ وہ پھر لیٹ گیا۔ لیکن نیند نہیں آئی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے جتنی بار باہر نظر ڈالی ہر بار دھیور کو اسٹول پر بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ اس وقت ڈھیلا ڈھالا سفید کرتا پہنے ہوئے تھا۔ دھوتی بھی اجلی تھی اور اس کا چوڑا کنارا سرخ تھا۔ کندھے پر پرنا پڑا تھا جس سے وہ بار بار منہ پونچھتا۔ پیروں میں نئی گامے شاہی جوتی تھی۔ بالوں میں تیل پڑا تھا اور بیچ سے مانگ نکال کر لمبے لمبے پٹے قاعدے سے جمائے گئے تھے۔ وہ خوب بن سنور کر بیٹھا تھا۔

لالی اسے دیکھتا تو وحشت ہوتی۔ بے چینی بڑھ جاتی۔ دن اسی بے چینی میں گزر گیا۔ سورج غروب ہو گیا۔ کمرے میں شام کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ دھیور نے لالٹین روشن کی۔ لالی کے کمرے میں آیا۔ مگر اس نے لالی سے نظر نہ ملائی۔ چپ چاپ لالٹین رکھ کر چلا گیا۔ لالی دیوار سے سر ٹکائے [illegible] خاموش بیٹھا رہا۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ رات ہو گئی۔ مائی جنتے کھانا لے کر آئی اور لالی کے

سامنے رکھ کر ہوا کے جھونکے کی مانند باہر چلی گئی۔

لالی نے کھانا نہیں کھایا۔ دھیور نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ اسٹول پر خاموش بیٹھا رہا۔ رات کا ایک پہر گزر گیا۔ سناٹا گہرا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد دھیور اپنی جگہ سے اٹھا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ لالی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ اور لمحے بھر تک آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ دھیور نے مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا اور بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔

لالی چارپائی سے نیچے اترا، مگر دھیور اس کے پاس نہ آیا۔ اس نے جھک کر وہسکی کی بوتل اٹھائی اسے کھولا اور منہ سے لگا کر غٹاغٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ اس نے بوتل لالی کی طرف بڑھا دی۔ لالی نے بوتل ہاتھ میں لے لی۔ وہ کچھ دیر بوتل ہاتھ میں لیے خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے بھی بوتل منہ سے لگائی اور تھوڑی سی وہسکی پی کر بوتل دھیور کو واپس دے دی۔

انھوں نے کھڑے کھڑے بوتل خالی کر دی۔ دھیور دیسی شراب کا ادھا بھی اٹھا لایا۔ دونوں فرش پر بیٹھ کر پینے لگے۔ ادھا بھی خالی ہو گیا۔ وہسکی اور ٹھرے نے مل کر نشے کو کریلا اور نیم چڑھا بنا دیا۔

لالی نے کھانا اٹھا کر دھیور کے سامنے رکھ دیا۔ دونوں کھانا کھانے لگے۔ کھانا کھاتے کھاتے نہ جانے کیا سوچ کر دھیور بطخ کی طرح قیں قیں کر کے ہنسنے لگا۔ لالی نے خمار آلود نظروں سے دھیور کو دیکھا اور وہ بھی ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے بولا۔

"ہنس لے پیارے! ہنس لے۔ میں نوں پتہ ہے، تو کیوں ہنس رہا ہے؟"

دھیور نے گردن اونچی کی۔ لالی کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ لالی ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے انگلیوں میں دبا ہوا نوالہ پلیٹ میں ڈال دیا۔ اونچی آواز سے بولا۔ "تو مجھے کتل کرنا چاہتا ہے۔ بوڑھے ریاض نے مجھے یہی بتایا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟" دھیور نے اس کی بات سن کر کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ نظریں نیچی کر کے کھانا کھانے لگا۔ لالی کہتا رہا۔ "تو مجھے کیوں کتل کرنا چاہتا ہے؟ مجھے نہیں ملوم، پر تجھے یہ ضرور بتا دینا چاہتا ہوں، میں چاہتا تو کل رات تجھے کتل کر دیتا۔ میں نے تیرا پستول نکال لیا تھا۔ فیر جیسے نکالا تھا، ویسے ہی اسے رکھ بھی دیا۔ تجھے بالکل پتہ نہیں چلا۔ تو بے خبر سو رہا تھا۔" دھیور نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"دیکھ کیا رہا ہے؟ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" لالی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ نشے کی جھونک میں جھوم کر بولا۔ "پر یار! میں تجھے کیسے کتل کرتا؟ تجھ پر مجھے گصہ ہی نہیں آیا۔ جب تک گصہ نہ آئے، کوئی کسی کو کیسے کتل کر سکتا ہے۔ کبھی تو نے یہ بات سوچی؟ پر تو سوچتا ہی کب ہے؟" لالی ہنسنے لگا۔



ھیور نے کھانا چھوڑ دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی نے اسے ٹوکا۔ "میری بات تو سن۔" لیکن دھیور نے اس کی جانب مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

وہ کمرے سے باہر نکلا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

لالی دیر تک بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ واپس نہیں آیا۔ لالی اٹھ کر دروازے تک گیا۔ س نے گردن باہر نکال کر دھیور کے کمرے میں دیکھا۔ دھیور وہاں بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں ہلا گیا تھا۔ لالی کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا اور لالی کے ذہن میں بہت سی نیاں جل رہی تھیں بجھ رہی تھیں۔ تیز نشے کا ریلا سمندر کی سرکش موجوں کے مانند بار بار اُمڈتا ور جھاگ بن کر بکھر جاتا۔ ایک بار زور کا ریلا آیا۔ لالی نے لڑکھڑا کر کھڑکی کی سلاخیں دونوں اتھوں سے تھام لیں۔ انھیں پوری قوت سے کھینچا۔ کئی بار زور آزمائی کی مگر سلاخیں نہیں ہلیں۔ الی ہانپنے لگا اور جھومتا ہوا بستر پر جا کر دراز ہو گیا۔ لیکن قرار نہ آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دھیور ابھی تک غائب تھا۔

وقت قطرہ قطرہ بن کر رات کے سناٹے میں تحلیل ہوتا گیا۔ لالی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی یکھی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ یہ تہہ خانے میں جانے اور انجیکشن لگانے کا وقت تھا۔ لالی اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ اب دھیور کو واپس آ جانا چاہیے تھا۔ کئی منٹ گزر گئے، دھیور نہیں آیا۔ لالی برآمدے میں خاموش کھڑا رہا اور وہیں کھڑے کھڑے اس نے بنگلے سے فرار ہونے کا ایک بار پھر تہیہ کیا۔ وہ اس راہداری کی جانب بڑھا جس سے گزر کر وہ کچھ عرصہ قبل دھیور کے ہمراہ باغ میں پہنچا تھا۔

راہداری میں اندھیرا تھا۔ لالی لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھتا گیا اور دیوار کا سہارا لیتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا کہ دروازہ بند ہے۔ لالی نے دروازہ آہستہ سے ہلایا۔

دروازہ تو نہ کھلا البتہ باہر سے کسی کی کھنکار ابھری۔ لالی سہم کر رہ گیا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا واپس ہوا۔ وہ ایک بار پھر برآمدے کے سامنے کھڑا تھا۔ دھیور وہاں نہیں تھا۔

لالی برآمدے کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ غلام گردش کی جانب بڑھا اور اندر داخل ہو گیا۔ غلام گردش میں گہرا سناٹا تھا۔ وہ اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا جس میں داخل ہو کر تہہ خانے میں جاتا تھا۔

آہستہ سے دروازہ کھولا، اندر جھانکا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہ چپ چاپ کمرے میں چلا

گیا۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ تہہ خانے کا دروازہ کھلا ہے۔ وہ کھلے دروازے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر جھومتا جھامتا اندر داخل ہوگیا۔ زینے سے نیچے اتر کر اس نے دیکھا' بوڑھا ریاض محمد وٹو دھندلی روشنی میں فرش پر لیٹا ہے۔

لالی نے الماری سے سرنج نکالی اور انجیکشن لگانے کے لیے ریاض کے قریب پہنچ گیا۔ ریاض چت لیٹا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت تک رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا' زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ ایک کان اور رخسار کا نچلا حصہ خون سے لت پت تھا۔ فرش پر بھی خون پھیلا تھا۔ زنجیر اور اس میں لگے ہوئے لوہے کے گولے پر بھی گاڑھا گاڑھا خون تھا۔ لالی نے گھبرا کر میاں ریاض محمد کو جھنجھوڑا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

لالی کو ایسا محسوس ہوا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ اسے اپنے چاروں طرف خطرہ منڈلاتا محسوس ہوا۔ وہ سرنج وہیں چھوڑ کر گھبرایا ہوا تیزی سے زینے کی جانب لپکا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ دروازے سے گزر کر باہر آیا۔ کمرہ ابھی تک خالی تھا۔ لالی جلدی سے کمرے کا دروازہ کھول کر غلام گردش میں پہنچ گیا۔

☆

دیوار گیریوں کی ہلکی' ہلکی روشنی میں ہر چیز اونگھتی ہوئی نظر آتی تھی۔ غلام گردش کے آخری سرے پر ہال کا دروازہ تھا۔ دروازے کے شیشوں سے ہال کی روشنی جھلک رہی تھی۔ ہال بالکل خالی تھا۔ غلام گردش میں کئی دروازے کھلتے تھے۔ ان پر خوش رنگ پردے پڑے تھے۔ لالی نے گھڑی دیکھی' بارہ بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔

لالی بدحواس ہوگیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ دھیورا اس کی گھات میں کہیں قریب ہی چھپا بیٹھا ہے۔ ذرا دیر میں بتیاں بجھ جائیں گی' اور دھیورا اندھیرے میں کسی دروازے سے نکل کر اس پر تیندوے کی طرح جھپٹے گا۔

لالی نے خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ چھپنے کی کہیں گنجائش نہیں تھی۔ فرار ہونے کے لیے ہال سے گزرنا ضروری تھا۔ اس نے سوچا' جب روشنیاں گل ہو جائیں گی تو وہ اندھیرے میں ہال کے اندر داخل ہو جائے گا اور بنگلے سے نکل کر چار دیواری تک پہنچ جائے گا۔ چار دیواری پھاندنا اس کے لیے دشوار نہ تھا۔ مگر اندھیرا ہونے سے پہلے ہی اسے ہال کے دروازے تک پہنچ جانا چاہیے۔

وہ آہستہ آہستہ ہال کی جانب بڑھنے لگا۔ قریب' اور قریب ہوتا گیا۔



مگر جب ہال کے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر تھا تو اس نے دیکھا' حیات محمد وٹو ہال میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کے ہم راہ کوئی اور بھی تھا۔ لالی نے دروازے کے شیشوں سے دونوں کی ہلکی سی جھلک دیکھی۔ وہ خوف سے لرز کر رہ گیا۔ جلدی سے مڑا۔ غلام گردش خاصی طویل تھی۔ وہ غلام گردش سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو حیات محمد اسے دور ہی سے دیکھ لیتا۔ اس نے گھبرا کر چاہا کہ کوئی دروازہ کھول کر اندر چلا جائے۔ اس نے ایک دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اندر سے بند تھا۔ لالی لپک کر دوسرے دروازے پر پہنچا۔ وہ بھی بند تھا۔

لالی دیوار سے لگا لگا آگے بڑھا۔ اس نے مڑ کر ہال کی جانب دیکھا۔ میاں حیات محمد وٹو دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ لالی نے سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور جو دروازہ قریب ترین پایا اس کے پردے کے پیچھے دبک گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھل گیا۔ لالی جھٹ اندر چلا گیا اور دروازے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔

یہ خواب گاہ تھی۔ نہایت نفاست سے آراستہ کی گئی تھی۔ کمرے کے وسط میں چوڑی چکلی مسہری تھی۔ مسہری کے قریب اونچے اسٹول پر پیتل کا اجلا اجلا گل دان تھا۔ اس میں گلاب کے سفید اور گہرے سرخ پھول تھے۔ مسہری سے ذرا ہٹ کر صوفہ سیٹ قرینے سے رکھا تھا۔ دروازوں پر جھلملاتے ہوئے ریشمی پردے تھے۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا اور ہلکی ہلکی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ کمرے میں گہرا سبز بلب روشن تھا۔

لالی دروازے کے قریب سہما ہوا کھڑا تھا اور رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ باہر غلام گردش میں قدموں کی آہٹ ابھر رہی تھی اور رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ دھب' دھب' دھب' آہٹ دروازے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

لالی کا بے قرار دل دھڑکتے دھڑکتے پل بھر کے لیے ٹھہر گیا۔ اس نے چاہا کہ لپک کر مسہری کے نیچے دبک جائے۔ مگر فوری طور پر مسہری تک پہنچنے کی گنجائش نہ تھی۔ وہ دروازے سے ہٹ کر ایک کونے میں دیوار سے چپٹ کر کھڑا ہو گیا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ لالی نے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میاں حیات محمد خاں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ وہ سفید ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ اس کے داخل ہوتے ہی تیز خوشبو کا جھونکا آیا۔ حیات نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور یہ کہتا ہوا عورت کے قریب پہنچ گیا۔ "ناصرہ تمہارے بغیر' یہ کمرہ کتنا ویران' ویران لگتا ہے۔"

حیات محمد نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے سمیٹ کر اپنے قریب کر لیا۔

ناصرہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے بڑے ناز سے کہا۔ "ایسی باتیں سوچنے کی تمہیں فرصت مل جاتی ہے؟"

"نہیں جان من! ایسی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو تم شدت سے یاد آتی ہو۔" میاں حیات محمد نے گہری سانس بھری۔ "جب تم آجاتی ہو تو ایسا محسوس ہوتا جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔"

"آج کچھ زیادہ ہی مہربان نظر آرہے ہو۔" ناصرہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "بات کیا ہے؟"

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" حیات محمد وٹو صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے پیار سے ناصرہ کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ بازو کے حلقے میں لے کر اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا اور اس کے بال انگلیوں سے آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ چند لمحے خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔ "کل رات بنگلے میں بڑی شاندار پارٹی ہے اور تم تو اس پارٹی میں جان محفل ہوگی۔ میں تو صرف میزبان ہوں گا۔"

ناصرہ نے اپنا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کسی قدر بیزاری سے کہا۔ "میں سمجھتی ہوں' میرا اس میں موجود ہونا ضروری نہیں۔"

"جان من! پہلے میری بات تو سن لو۔" حیات محمد نے اسے پھر سینے سے لگایا۔ "یہ پارٹی میں نے ایک ایم' سی' اے کے اعزاز میں دی ہے۔ دستور ساز اسمبلی میں اس نے اپنا تگڑا گروپ بنا لیا ہے۔ تم تو اسے جانتی بھی ہو۔ میرا مطلب ہے....."

ناصرہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ عورتوں سے باتیں کرتے ہوئے تم نے کبھی اس کے چہرے اور آنکھوں کو دیکھا ہے؟ مجھے تو اس کی صورت دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔"

"کاک ٹیل پارٹی ہوگی۔ تم شیری پیتی رہنا۔ میں نے سیلریشن کریم اور ڈرائی فلائی پچھلے ہی دنوں منگوائی ہے۔ دونوں ہی اعلیٰ درجے کی شیری ہیں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "فیر کوئی وحشت دحشت نہیں رہے گی۔" اس نے ہولے ہولے ناصرہ کا رخسار تھپ تھپایا۔ "جان من! مجھے اس کے گروپ کے ووٹوں کی شدید ضرورت ہے۔"

"کسی کو مرکزی وزیر بنوانا ہوگا۔"

"بالکل ٹھیک سمجھیں تم۔" حیات نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "اب تو تم سیاست کو پوری طرح سمجھنے لگی ہو۔"

"نہیں حیات! اپنی اس گندی سیاست میں مجھے نہ گھسیٹو۔" ناصرہ نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔



"تم جو چاہتے ہو' اب وہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں تمہاری اس سیاست سے اتنی عاجز آچکی ہوں کہ مجھے خود اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ مجھ میں اور ایک....."

حیات نے محبت سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "فضول باتیں نہ کرو۔" اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔ "تم دو تین روز یہاں رہوگی اور پارٹی میں بھی شریک ہوگی۔" اس نے قدرے تامل کیا' پھر ناصرہ کے ہونٹ چوم کر بولا۔ "ناصرہ' میری جان! مجھے یہ کام ضرور کرنا ہے اور تم اس میں میری مدد کروگی۔ یوں سمجھ لو' وہ مرکزی وزیر بن گیا تو حکومت میں اپنی پوزیشن بہت مضبوط ہوجائے گی۔ جو چاہوں گا' حکومت سے کروالوں گا۔ کیا سمجھیں؟" اس نے قہقہہ لگایا اور ناصرہ کو اپنے سینے سے چمٹالیا۔

ناصرہ اس کے پہلو میں اس طرح دبکی بیٹھی تھی کہ اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ حیات محمد اسے رام کرنے کے لیے سر جھکائے پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھا۔ دونوں صوفے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ لالی خوف زدہ نظروں سے انھیں دیکھتا رہا۔ دونوں میں سے کوئی بھی پلٹ کر دیکھتا تو ہلکی ہلکی سبز روشنی میں وہ دیوار کے ساتھ سائے کی طرح چمٹا ہوا نظر آتا۔ مگر جب ناصرہ کسمسا کر حیات کے بازوؤں کی گرفت سے نکلنے کے لیے مڑی تو اس کا چہرہ لالی کی طرف تھا۔ عین اس وقت خواب گاہ کا سبز بلب بجھ گیا۔ ناصرہ کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ پھر اندھیرے میں حیات کی آواز ابھری۔

"معلوم ہوتا ہے جنریٹر میں فیر گڑبڑ ہوگئی۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر ناصرہ کی تھرتھراتی ہوئی آواز ابھری۔ "آدھی رات کو جب اس طرح بلیک آؤٹ ہوجائے تو یہ بنگلہ کتنا خوف ناک لگتا ہے۔ ہر طرف موت کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔"

اسی وقت باہر غلام گردش میں تیز تیز قدموں سے چلنے کی آہٹ ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ گھپ اندھیرے میں السیشن کے زور زور سے بھونکنے کی آواز بھی ابھری۔ ناصرہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "یہ خوف ناک آوازیں سن رہے ہو۔ یہ سب کیا ہے حیات؟ موت کا یہ کھیل کب تک چلتا رہے گا؟ آج کون....."

حیات نے اس کی بات کاٹ کر اونچی آواز سے کہا۔ "خواہ مخواہ کی باتیں نہ کرو۔ ذرا دیر میں روشنی ہوجائے گی۔ میں تو کل صبح تمہارے پاس آنے ہی والا تھا۔ مگر تم اتنی رات گئے اچانک کیسے آگئیں؟"

"میں موت کا کھیل دیکھنے نہیں آئی تھی۔ تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ نیاز کل رات کیلی فورنیا

سے واپس آ گیا ہے۔"

حیات کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "نیاز' نیاز واپس آ گیا؟ نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ کیسے واپس آ سکتا ہے؟"

"میں تم سے غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"کہاں ہے وہ؟ یہاں کیوں نہیں آیا؟"

لالی دیوار کا سہارا لیتا ہوا دھیرے دھیرے دروازے کی جانب کھسکنے لگا۔ اس نے سنا' ناصرہ کہہ رہی تھی۔ "نیاز اپنے ماماں کے پاس ٹھیرا ہے۔" وہ کچھ رکی۔ اس نے رسان سے بتایا۔ "وہ تمہارے خلاف مقدمہ چلانے کی تیاری کر رہا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے سب کچھ معلوم ہو گیا؟"

"نہیں! وہ کچھ نہیں جانتا۔ وہ صرف جائیداد اور زمینداری پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اپنے پیؤ کی جاگیر کا وارث جو ہوا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ مقدمے کی تیاری کر رہا ہے؟"

"آج شام وہ میرے پاس آیا تھا۔"

حیات غصے سے چیخا۔ "وہ تمہارے پاس کیوں آیا تھا؟"

"میرا خیال ہے اس کے ساتھ کوئی سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ اس کی باتوں سے ایسا ہی لگتا تھا۔"

"نہیں! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ جاگیر نہ اس کی ہے نہ اس کے پیؤ کی۔ اور نہ وہ کسی طور اس کا وارث ہے۔" حیات تیز لہجے میں بول رہا تھا۔ "میں اسے جاگیر پر قبضہ کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ وہ سمجھتا کیا ہے؟ میں اس کی لاش بھی یہیں تہ خانے میں لا کر دبا دوں گا۔"

"حیات!" ناصرہ کے لہجے میں التجا تھی۔ "یہ خطرناک کھیل اب ختم ہو جانا چاہیے۔"

"بکواس نہ کرو۔" حیات تلملا کر بولا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے' تم ہی نے اسے بلایا ہے۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکا۔ "تم نے اسے سب کچھ بتا دیا۔"

"پاگل نہ بنو۔" ناصرہ نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "تمہیں میرے بارے میں اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔ میں تمہاری بیوی ہوں' تمہاری بیٹی مونا کی ماں ہوں۔ تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے۔"

"میں کسی پر اعتماد شد ماد نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے' تم یہاں کس لیے آئی ہو۔ تم میرے خلاف اس سازش میں برابر کی شریک ہو۔"



لالی کھسکتا ہوا اب دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے سنا۔ حیات اندھیرے میں چیخ رہا تھا۔ "میں یہ سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ میں نہ اسے زندہ چھوڑوں گا نہ تجھے۔"

اندھیرے میں کسی چیز کے زور سے ٹکرانے کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی ناصرہ کی تیز کراہ سنائی دی۔ "ہائے۔" چند لمحے خاموشی رہی پھر صوفے پر گتھم گتھا ہونے کی سرسراہٹیں ابھرنے لگیں۔ لالی نے آنکھیں پھاڑ کر اس طرف دیکھا۔ گھپ اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ لالی دروازہ کھولنے کے لیے انگلیوں سے چٹخنی ٹٹولنے لگا۔ یکایک اسے عقب میں ناصرہ کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ وہ گڑگڑا رہی تھی۔

"نہیں نہیں۔ خدا کے لیے نہیں۔"

لالی نے ایک بار پھر گردن موڑ کر ادھر نظر ڈالی۔ اسی وقت کمرے کا سبز بلب روشن ہو گیا۔ لالی نے دیکھا' ناصرہ کا سر صوفے کی پشت سے ٹکا ہے۔ حیات دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچے ہوئے تھا۔ ناصرہ کے بال بکھر کر اس کے چہرے پر آ گئے تھے۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں لالی کی جانب اٹھی تھیں۔ اس نے لالی کو دیکھا اور اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"وہ' وہ۔"

حیات نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ ناصرہ کی گردن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "تو ابھی تک زندہ ہے۔" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا' خاموش کھڑا رہا۔ حیات نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"تو یہاں آ کیسے گیا؟"

"میں یہ بتانے آیا تھا' آپ کا بھائی میاں ریاض محمد مر گیا۔"

حیات بوکھلا گیا۔ "نہیں' وہ نہیں مر سکتا۔ وہ کیسے مر سکتا ہے۔ تو جھوٹ بول رہا ہے۔"

لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

حیات سخت بدحواس ہو رہا تھا۔ "مگر وہ کیسے مر گیا؟" وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ "اس نے وصیت نامے کی دستاویز پر دستخط نہیں کیے۔ مجھے اپنا وارث نہیں بنایا۔ اسے ابھی نہیں مرنا چاہیے۔" وہ بے قرار ہو کر بولا۔ "اسے کس نے مار ڈالا؟ اسے تو نے قتل کیا ہے۔"

"میں ایسا کام نہیں کرتا۔ میں نے آج تک کسی کا خون نہیں کیا۔"

"فیرا سے کون قتل کر سکتا ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "دھیور؟ ہاں دھیور ہی ہو سکتا ہے۔" وہ ہولے ہولے اپنی گردن ہلانے لگا۔ "دھیور نے آج اپنا بدلہ لے ہی لیا۔" پھر وہ غصے سے پاگلوں کی

طرح چیخنے لگا۔ "مگر اس کتے کو ایسی جرات کیسے ہوئی؟ کہاں ہے دھیور؟ کہاں ہے وہ؟"

"مجھے نہیں پتہ۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ تجھے ضرور پتہ ہوگا۔"

"میاں ساب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نوں تو یہ پتہ ہے' جب بارہ بجے سب بتیاں بجھ گئی تھیں' اس وکھت آپ کا خونی کتا مجھے چیر پھاڑ کر ختم کر دیتا۔ میری لاش تہ خانے میں زمین کھود کر دبا دی جاتی۔"

حیات نے خونخوار نظروں سے لالی کو دیکھا اور سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کی بیوی ناصرہ صوفے پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر پیچھے کر لیے تھے۔ اس کا حسین چہرہ اجلی چاندنی کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خوف تھا۔ وہ اپنی لمبی گردن داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے بار بار سہلا رہی تھی۔ کمرے کی فضا پر گہرا سکوت طاری تھا۔

لالی نے سکوت توڑا۔ عاجزی سے بولا۔ "ساب' میں جسے انجکشن لگاتا تھا' وہ تو مر ہی گیا۔ ساتھ ہی میری ڈیوٹی بھی ختم ہو گئی۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ "اب مجھے بھی چھٹی دے دیجئے۔ آپ کی مہربانی ہوگی جی۔"

"نہیں' تو ابھی نہیں جا سکتا۔ یہاں سے نکلتے ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔"

لالی نشے کی ترنگ میں تھا۔ جل کر بولا۔ "گرفتار کر لیا جاؤں گا تو کیا ہوگا۔ جیل ہی تو چلا جاؤں گا۔ گولی تو نہیں ماری جائے گی۔"

"تو یہاں کے کئی راز جانتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تو پکڑا جائے اور میرے خلاف قانون کے ہاتھ مضبوط کرے۔"

"ساب' کون سا کنون' کیسا کنون؟" اب وہ خوف اور دہشت کا خول توڑ کر رفتہ رفتہ باہر نکل رہا تھا۔ "کنون تو میرے جیسے چھوٹے آدمی کے لیے ہے۔ میں تین بار جیل کاٹ چکا ہوں۔ میں نے تو کسی وڈے آدمی کو اپنی طرح جیل کاٹتے نہیں دیکھا' نہ پھانسی پر چڑھتے دیکھا۔" لالی کھل کر مسکرانے لگا۔ "میاں جی' آپ وڈے آدمی ہیں۔ آپ کنون شنون سے کیوں ڈرتے ہیں؟ آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ اس نے قسم کھا کر حیات کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "رب سونہہ' میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں تو یہاں سے سیدھا رحیمے کے پاس جاؤں گا۔ اس کے ساتھ آج ہی رات' بہت دور نکل جاؤں گا۔ آپ میری بات مان لیں۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"



ناصرہ' جو اب تک خاموش بیٹھی دونوں کی گفتگو سن رہی تھی' لالی کی حمایت میں بولی۔ "اسے جانے دو حیات۔"

"تاکہ میرے خلاف تمہارے ہاتھ چشم دید گواہ آجائے۔" میاں حیات محمد نے قہر آلود نظروں سے ناصرہ کو دیکھا۔ "میں جانتا ہوں' تم اس کی سفارش کیوں کر رہی ہو؟"

"تم میرے بارے میں اتنی بدگمانی میں مبتلا کیوں ہو؟"

"یہ بدگمانی خود تم نے پیدا کی ہے۔ نیاز کیوں واپس آگیا؟ وہ کیوں تمہارے پاس گیا؟ میرے پاس کیوں نہیں آیا؟"

"مجھے کیا معلوم۔" وہ آہستہ سے بولی۔

حیات محمد نے اونچی آواز سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے' وہ کیوں واپس آیا اور کیوں تمہارے پاس پہنچا؟" وہ اپنی مونچھوں کی نوکیں انگلیوں سے مروڑنے لگا۔ "میرے علاوہ صرف تین بندے ہیں جو ریاض کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر وہ بنگلے سے باہر نہیں جا سکتے۔ تم اور صرف تم ہو جو بنگلے سے باہر بھی رہتی ہو۔ یہ راز صرف تمہارے ذریعے نیاز تک پہنچا۔ مجھے یقین ہے' تم ہی نے اسے نیاز تک پہنچایا ہے۔"

"اف! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ تمہارا وہم ہے۔ سراسر وہم ہے۔" ناصرہ نے زچ ہو کر کہا۔

"ہرگز نہیں۔" حیات اپنی بات پر اڑا رہا۔ "دو ہفتے پہلے فون پر نیاز سے میری بات ہوئی تھی۔ اس کا امریکہ سے یہاں آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ اسی روز کی بات ہے جس روز تم مجھ سے لڑ جھگڑ کر روتی ہوئی یہاں سے گئی تھیں۔ مجھے یاد ہے' اس روز تم نے خودکشی کر لینے کی دھمکی بھی دی تھی۔" اس نے ناصرہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

"اس روز تم غصے سے پاگل ہو رہی تھیں۔ تم نے یہاں سے جاتے ہی غصے کی حالت میں نیاز کو خط لکھا اور اسے ساری باتیں بتا دیں۔"

"تم' تم پاگل ہو گئے ہو۔" وہ جل کر بولی۔ "ریاض کے جسم میں پاگل آدمی کے جراثیم انجکشنوں کے ذریعے داخل کرتے کرتے خود بھی پاگل ہو گئے ہو۔"

حیات کی آنکھیں بھڑکتا شعلہ بن گئیں۔ وہ سانپ کی طرح پھنکارنے لگا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ ٹکٹکی باندھے بیوی کو گھورتا رہا' پھر تیزی سے جھپٹا اور اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہ بے بسی سے اپنی گردن ادھر ادھر ہلانے لگی۔ لالی ذرا دیر تک یہ لرزہ خیز منظر دیکھتا رہا۔ اس نے

حیات کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"میاں ساب! یہ کیا کر رہے ہیں؟"

حیات محمد نے اس کی جانب دیکھے بغیر ڈپٹ کر کہا۔ "بکواس نہ کر۔" اس نے بیوی کو نیچے گرا دیا اور دونوں ہاتھوں کی پوری قوت سے اس کا گلا دبانے لگا۔ ساتھ ہی وہ غصے سے بڑبڑاتا رہا۔ "میں یہ ثبوت بھی مٹا دوں گا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

لالی لپک کر دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ ناصرہ صوفے پر بے بس پڑی تھی۔ اس کے لمبے لمبے بال دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر دہشت طاری تھی۔ حیات کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ ناصرہ آنکھیں پھاڑے بے بسی سے لالی کو دیکھ رہی تھی۔ لالی بے قرار ہو گیا۔ اس نے حیات کا کندھا پکڑ کر کھینچا اور گڑگڑا کر بولا۔

"ساب جی! اب چھوڑ دیجیے۔"

حیات نے پلٹ کر لالی کو دیکھا' غصے سے اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ "ہٹ جا میرے سامنے سے۔" اس نے لالی کو دھکا دیا۔ لالی لڑکھڑا کر گرا۔ اس نے اٹھنا چاہا تو حیات نے اور بھی زیادہ زور سے دھکا دیا۔ اس دفعہ وہ لڑھکتا ہوا میز سے جا کر ٹکرایا۔ میز الٹ گئی اور لالی کے سر پر گری۔ چوٹ ایسی سخت آئی کہ وہ چکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ نظریں دھندلی پڑ گئیں۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ رک رک کر سانس بھرنے لگا۔

ناصرہ نے اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ مگر حیات نے جھپٹ کر اس کی ساڑھی کا پلو پکڑ کر زور سے کھینچا۔ ساڑھی کھل کر اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے غصے سے ساڑھی ایک طرف پھینک دی۔ ناصرہ کے منہ پر تابڑ توڑ کئی تھپڑ مارے۔ پیٹ پر اس زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ ڈگمگا کر صوفے پر گر پڑی۔ حیات نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ جھپٹ کر ایک بار پھر اس کی گردن دبوچ لی۔ ناصرہ گلا پھاڑ کر چیخی۔

"نہیں' نہیں۔"

لالی نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میاں حیات محمد خاں صوفے پر جھکا ہوا تھا۔ ناصرہ کی دونوں ٹانگیں بالکل برہنہ تھیں اور خزاں رسیدہ درخت کی شاخوں کے مانند جھول رہی تھیں۔ لالی ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا حیات کی جانب بڑھا۔ حیات نے چاپ سنی۔ پلٹ کے دیکھا اور زور سے چیخا۔

"ہٹ جا یہاں سے کنجر!"



لالی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "یہ نہیں ہو گا۔" حیات نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ لالی نرم پڑ گیا۔ گڑگڑانے لگا۔ "ساب! تم نے اس کے کپڑے اتار دیئے۔ وہ تمہاری گھر والی ہے' تمہاری عزت ہے۔" حیات اور غضب ناک ہو گیا۔ اس نے جھنجلا کر لالی کے منہ پر تھپڑ مارنا چاہا۔ لیکن لالی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

حیات نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور تیزی سے مسہری کی جانب لپکا۔

ناصرہ نے ہانپتے ہوئے نحیف آواز میں لالی سے کہا۔ "وہ' وہ پستول لینے گیا ہے۔"

لالی نے دیکھا کہ حیات مسہری کے تکیے کی جانب جھک رہا ہے۔ لالی تیزی سے اس پر جھپٹا اور اس زور سے دھکا دیا کہ حیات چاروں خانے چت بستر پر گر گیا۔ وہ دانت پیستا ہوا اٹھا' چیخ کر بولا۔

"کتے! نمک حرام! تیری یہ ہمت۔" اس نے لالی کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔

لالی کا ایک کان جھن جھنے کے مانند جھن جھن کرنے لگا۔ وہ تکلیف سے تلملا اٹھا۔ نشے کا ایسا زبردست جھونکا آیا کہ وہ حیات کے ٹھنٹنے اور طمطراق کے حصار سے باہر نکل آیا۔ اس نے خون خوار نظروں سے حیات کو دیکھا اور دونوں ہاتھ بڑھا کر جھومتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔

حیات محمد نے رعب اور دبدبے کے ساتھ اسے ڈانٹا۔ "آگے نہ بڑھ۔"

مگر لالی نہیں رکا۔ نشے کے غلبے نے اونچ نیچ کے تمام بندھن توڑ دیئے تھے۔ اس کا امڈتا ہوا سیلاب خوف و دہشت کے سارے پشتے اور رکاوٹیں اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ حیات نے جلدی سے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔

لالی نے اچھل کر اس کی کمر پر لات ماری۔ میاں حیات پھر بستر پر لڑھک گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر لالی نے جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ حیات غیں غیں کرنے لگا۔ اس نے گرفت سے نکلنے کے لیے لالی کا منہ نوچ لیا۔ لیکن لالی نے اسے نہیں چھوڑا۔ گریبان پکڑ کر اٹھایا اور ڈھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔

حیات گھٹی ہوئی آواز سے چیخا۔ "دھیورا!"

لالی نے دیوار سے اڑا کر اس کا سر زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ آگے کھینچا' پھر ٹکرایا۔ کھٹ' کھٹ' کھٹ۔ لالی نشے کی جھونک میں پاگلوں کی طرح اس کے سر کو جھٹکے دے دے کر دیوار سے ٹکراتا رہا۔

لالی کا چہرہ کرخت ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے۔ میاں حیات محمد خاں ونو کے سر سے دھار نکلی اور پیشانی سے ٹپکتی ہوئی چہرے پر پھیل گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

گردن لٹک کر ڈگمگانے لگی۔

☆

ناصرہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنی ساڑھی اٹھائی۔ اسے باندھا۔ جلدی' جلدی اپنا بے ترتیب لباس درست کیا۔ حیات محمد کی جانب بڑھی۔ وہ فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔ ناصرہ نے جھک کر دیکھا۔ حیات کا چہرہ خون سے تربتر تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ رک' رک کر سانس لے رہا تھا۔
ناصرہ نے پریشان ہوکر لالی کی جانب دیکھا۔ لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ کیا کردیا؟"

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ وہ مرا نہیں ہے۔"

دونوں خاموش کھڑے رہے۔ مگر لالی اب وہاں مزید ٹھہرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ اس دروازے کی جانب بڑھا' جو غلام گردش میں کھلتا تھا۔

"کہاں جارہا ہے؟" ناصرہ نے پوچھا۔

"باہر" لالی نے دروازے کے قریب پہنچ کر کہا۔ "مجھے اب یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

"ٹھیر جا۔"

"تم ٹھیر جاؤ۔" لالی دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ "یہاں رک کر تم اپنے کھصم کی مرہم پٹی کرو تاکہ وہ تمھیں اطمینان سے کتل کرسکے۔ میں نہیں ٹھیر سکتا۔"

"حماقت نہ کر۔ باہر حیات کے بہت سے کتے پھر رہے ہیں۔ وہ تجھے بنگلے سے باہر نکلنے نہیں دیں گے۔" وہ تلخی سے بولی۔

"تمھارا مطلب شکاری کتوں سے ہے؟" لالی رک گیا۔ اور مڑ کر ناصرہ کی جانب دیکھنے لگا۔

"نہیں' میں اس کے خونخوار کرندوں کی بات کررہی ہوں۔ انھیں پتہ چل گیا تو تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "میں بھی یہاں نہیں ٹھیروں گی۔" ناصرہ نے اپنے بکھرے ہوئے بال ایک بار پھر سنوارے' ساڑھی کی شکنیں اور سلوٹیں درست کیں۔ دروازے کی جانب بڑھی۔ قریب پہنچ کر آہستہ سے دروازے کی چٹخنی کھولی۔ گردن بڑھا کر باہر دیکھا۔ رسان سے بولی۔

"باہر کوئی نہیں ہے۔"

لالی نے پلٹ کر میاں حیات محمد کو دیکھا۔ وہ ٹانگیں پھیلائے مردے کی طرح دیوار کے پاس بے حال پڑا تھا۔ لالی دروازے کی جانب بڑھا۔ پہلے ناصرہ باہر نکلی۔ اس کے پیچھے پیچھے لالی باہر آ[illegible]



ناصرہ ہال کے دروازے کی جانب نہ گئی۔ اس کمرے کی جانب بڑھی' جس میں تہ خانہ تھا۔ لالی نے ناصرہ کو ادھر جاتے دیکھا تو سرگوشی کی۔

"اس کمرے میں نہ جاؤ۔"

ناصرہ نے دھیرے سے بتایا۔ "اس کمرے کا ایک دروازہ باغیچے میں کھلتا ہے۔ یہ سب سے محفوظ راستہ ہے۔" وہ آگے بڑھی۔ کمرے کے دروازے پر پہنچی۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔

ناصرہ نے اسے کھولنے کے لیے آہستہ آہستہ ہلایا تو اندر سے السیشن کے غرانے اور زور زور سے بھونکنے کی آواز ابھری۔ وہ دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کی خوفناک آواز سن کر دونوں سہم گئے اور جہاں تھے' وہیں دم بخود کھڑے رہے۔

غلام گردش میں پراسرار سناٹا تھا۔ دونوں خاموش کھڑے رہے' ناصرہ مڑی۔ وہ اس دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی جو ہال میں کھلتا تھا۔ لالی اس کے پیچھے' پیچھے چلا۔ ناصرہ کشیدہ قامت خوبصورت عورت تھی۔ وہ سفید ساڑھی میں ملبوس راج ہنس کی طرح گردن اونچی کئے چل رہی تھی۔ اس کی چال میں وقار تھا' تمکنت تھی۔ لالی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دونوں دروازے سے گزر کر ہال میں آگئے۔

ہال میں دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ صرف ایک بلب روشن تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ مگر جب ہال عبور کرکے باہر نکلے تو انھوں نے دیکھا' دروازے پر مسلح پہریدار کھڑا ہے۔ ناصرہ کو دیکھ کر وہ ادب سے جھک گیا۔ ناصرہ نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ گردن اٹھائے آہستہ' آہستہ پھاٹک کی سمت بڑھنے لگی۔

لالی اس کے پیچھے' پیچھے چلتا رہا۔ پھاٹک کے قریب درختوں کے نیچے ایک سیاہ سیڈان کھڑی تھی۔ ناصرہ نے آہستہ سے آواز دی۔ "چوکیدار۔" اس کی آواز سنتے ہی پھاٹک پر کھڑا ہوا چوکیدار اپنی بندوق سنبھالے دوڑتا ہوا قریب آیا۔ ناصرہ نے پوچھا۔

"میرا ڈرائیور کہاں ہے؟"

"وہ تو جی سوگیا۔ وہ تو شاید ہی گاڑی چلاسکے۔"

ناصرہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "کیوں؟ کیا ہوگیا اسے؟"

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ڈریور نے تو جی نشہ وشا کر رکھا ہے۔"

"[illegible]ر۔" ناصرہ نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ چوکیدار کو مخاطب کیا۔ "تم جا کر جلدی سے اس

کی جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر لاؤ۔ میں خود ڈرائیور کروں گی۔"

چوکیدار تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ ناصرہ اور لالی خوف زدہ نظروں سے ہال کی جانب دیکھنے لگے۔ دروازے پر مسلح پہریدار مستعدی سے کھڑا تھا۔ ہال خالی تھا۔ یکایک باغ کی جانب سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ دونوں گھبرا گئے۔ چوکیدار ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

دونوں بے چین ہو کر بار بار اس سمت دیکھتے جدھر چوکیدار گیا تھا۔ کتوں کی آواز کے ساتھ ساتھ قدموں کی آہٹ بھی ابھری۔ لالی نے جھک کر سرگوشی کی۔

"کوئی آرہا ہے؟"

"ہاں۔" ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ "مگر وہ حیات نہیں ہوسکتا۔ اسے اب تک ہوش نہیں آیا ہوگا۔" اس نے ہال کی جانب دیکھا۔ "حیات آئے گا تو ہال ہی کے دروازے سے آئے گا۔"

خشک پتوں پر آہٹ بڑھتی گئی۔ لالی نے ناصرہ کی طرف جھک کر کہا۔ "میں دیوار پھاند کر باہر نکل جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ مڑا۔

ناصرہ نے اسے حیرت سے دیکھا اور رسان سے کہا۔ "ٹھیر جا۔"

آہٹ اور قریب آگئی۔ لالی سہما ہوا کھڑا رہا۔ مگر آہٹ کچھ فاصلے پر بند ہوگئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس طرف آتے آتے یکایک ٹھٹک کر رہ گیا ہے اور ان کے قریب ہی درختوں تلے اندھیرے میں کھڑا ہے۔ دونوں کی بے چینی بڑھ گئی۔ مگر نہ چاپ سنائی دی' نہ کوئی ان کے پاس آیا۔

چوکیدار اینٹوں کے پختہ فرش پر تیز تیز چلتا ہوا اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا۔ اس نے قریب آکر کار کی کنجی ناصرہ کو دیتے ہوئے کہا۔ "ڈریور تو جی ایسا پڑا ہے کہ اسے بالکل ہوش نہیں۔ میں نے بہت مشکل سے چابی تلاش کر کے اس کی جیب سے نکالی۔"

"گیٹ کھول دو۔"

چوکیدار نے لالی کی طرف دیکھا۔ "کیا اس نے بھی باہر جانا ہے؟"

ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے جی! بنگلے کا کوئی بندہ میاں ساب کے حکم کے بغیر رات کو باہر نہیں جاسکتا۔"

چوکیدار نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تو جی ہرگز نہیں جاسکتا۔"

ناصرہ نے کار کا دروازہ کھولا اور تیوری چڑھا کر کہا۔ "نہیں' یہ میرے ساتھ ہی جائے گا۔"

چوکیدار عاجزی سے بولا۔ "میاں ساب کو تو آپ جانتی ہی ہیں جی۔ آپ سے تو وہ کچھ نہیں



کہیں گے' میں غریب ایں ویں مارا جاؤں گا۔ میری تو وہ چمڑی ادھیڑ ڈالیں گے۔" اس نے مڑ کر ہال کے دروازے کی جانب دیکھا۔

ناصرہ نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں نوں جھیتی نال جانا ہے۔ میاں صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ ٹیلی فون میں بھی گڑبڑ ہے۔ میں نوں خود جا کر ڈاکٹر کو لانا ہے۔"

"ایسی گل بات ہے جی تو میں ساب کے ڈریور کو بولتا ہوں۔ وہ ڈاکٹر کو لے آئے گا۔"

"فضول بحث نہ کر۔ جو میں کہتی ہوں وہ کر۔" ناصرہ نے چوکیدار کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور ڈپٹ کر حکم دیا۔ "جا' جا کر گیٹ کھول۔"

چوکیدار چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا پھر آہستہ آہستہ گیٹ کی جانب بڑھا۔ ناصرہ فوراً اسٹیرنگ وھیل سنبھال کر بیٹھ گئی۔ اس نے سیڈان کا پچھلا دروازہ کھولا۔ کچھ سوچ کر لالی سے مخاطب ہوئی۔ "نہیں' تم اگلی ہی سیٹ پر میرے برابر بیٹھ جاؤ۔" لالی کار کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔

ناصرہ نے کار اسٹارٹ کی۔ کار کی بتیاں روشن ہوگئیں۔ لالی نے ان کی تیز روشنی میں دیکھا بائیں ہاتھ پر ایک درخت کے تنے کے ساتھ کوئی اندھیرے میں دبکا کھڑا ہے۔ اس کے پیروں کا نچلا حصہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ نئی گاے شاہی جوتی پہنے ہوئے تھا اور اس کی اجلی دھوتی کا نچلا کنارہ گہرا سرخ تھا۔ لالی کو محسوس ہوا کہ وہ دھیورہے۔ کار تیزی سے آگے بڑھی اور پھاٹک سے گزر کر باہر آگئی۔ لالی چپ بیٹھا دھیور کے بارے میں سوچتا رہا۔

اسے گم صم دیکھ کر ناصرہ نے دریافت کیا۔ "کیا سوچ رہا ہے؟"

"میں نوں ایسا لگتا ہے جی' دھیور ہمارے نزدیک ہی درختوں کے نیچے کھڑا تھا۔"

"دھیورا!" ناصرہ نے حیرت سے کہا۔ "نہیں' وہ نہیں ہوسکتا۔ وہ بہت سنگدل اور خونخوار ہے' تجھے ہرگز گیٹ سے باہر آنے نہ دیتا۔"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔"

ناصرہ خاموش بیٹھی رہی۔ سیاہ سیڈان دھول اڑاتی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ لالی بھی چپ بیٹھا تھا۔ کچھ دور جا کر نہر آگئی۔ سیڈان نہر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھی۔ یہ راستہ بھی کچا تھا' مگر کشادہ تھا۔ زمین بھی قدرے نم تھی۔ اب زیادہ دھول نہیں اڑ رہی تھی۔ ایک طرف نہر تھی' دوسری طرف گندم اور جو کی فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ چاند چڑھ کر آسمان کے بیچوں بیچ آگیا تھا۔ ہر طرف اجلی اجلی چاندنی بکھری تھی۔ لگ بھگ چار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سیڈان بائیں ہاتھ کو مڑی اور ایک نیم پختہ سڑک پر آگئی۔

لالی نے منہ باہر نکال کر پیچھے دیکھا اور دبی زبان سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”اگر میاں ساب، کو ہوش آگیا اور انھوں نے ہمارا پیچھا کیا تو کیا ہوگا؟“

”موت۔“ ناصرہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہم دونوں کو قتل کردے گا۔ اس کے لیے قتل کرنا ایسا ہی ہے جیسے بچے کے لیے کھلونا توڑنا۔“

ناصرہ نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ کار ہچکولے کھانے لگی۔ اس نے رفتار سست کردی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”پچھلے پہیے میں پنکچر ہوگیا۔“ اس نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کردی۔

دونوں کار سے اتر کر باہر آگئے۔ سڑک کے دونوں طرف ویران اور بنجر کڑ تھا۔ البتہ کچھ دور آگے سڑک کے دائیں طرف درختوں کا گھنا جھنڈ تھا۔ رات چپ چاپ کھڑی تھی۔ ہوا میں شوریدہ سری تھی۔ تیز جھونکوں سے ناصرہ کے بال بکھر گئے تھے۔ ساڑھی کا آنچل بار بار ڈھلک جاتا۔ وہ اپنے بال درست کرتی، ساڑھی سنبھالتی کار کے پچھلے حصے کی جانب گئی۔ اس نے کار کی ڈکی جلدی سے کھولی۔ لالی سے پوچھا۔

”تیں نوں پہیا بدلنا آتا ہے؟“

”میں نے تو جی کبھی یہ کام نہیں کیا۔“ لالی نے انکار میں گردن ہلادی۔

”کوئی گل نہیں۔ جیسا میں کہوں ویسے کرنا۔ یہ ایسا مشکل کام نہیں۔“ ناصرہ نے اسٹپنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ پہیا باہر نکال اور کونے میں رکھا ہوا جیک اور ٹول باکس بھی نکال لے۔“

لالی اسٹپنی اٹھانے لگا۔ اسی وقت عقب میں تیز روشنی ابھری۔ ناصرہ نے روشنی دیکھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ وہ بدحواس ہوکر بولی۔

”وہ آرہا ہے، وہ آرہا ہے۔“

لالی نے مڑ کر روشنی دیکھی۔ وہ بھی پریشان ہوگیا۔ مگر اس نے جلدی سے اسٹپنی نکالنے کی کوشش کی۔ ناصرہ نے اسے روک دیا۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اسٹپنی باہر نہ نکال۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔“ لالی خاموش کھڑا رہا۔

ناصرہ نے ایک بار پھر روشنی کی سمت دیکھا اور ڈکی کے ڈھکنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے لالی سے کہا۔ ”بھاگ سکتا ہے تو بھاگ جا۔“ اس نے ڈکی بند کردی۔

”نہیں جی، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں تمھیں اکیلا چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہوں؟“



”نہیں، میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ مجھے اکیلا چھوڑ دے۔ ورنہ تو بھی میرے ساتھ مارا جائے گا۔“ ناصرہ نے گہری سانس بھری۔ اس کا لہجہ جذباتی ہوگیا۔ ”مگر وہ مجھے قتل نہیں کرسکے گا۔ میں اس کے ہاتھوں نہیں مروں گی۔“ وہ آگے کے دروازے کی جانب بڑھی۔

لالی نے گھبرا کر کہا۔ ”کہاں جارہی ہو؟“

وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بولی۔ ”میں خودکشی کرلوں گی۔ خود کو گولی مارلوں گی مگر اس کے ہاتھوں نہیں مروں گی۔ میرے پاس بھرا ہوا پستول ہے۔“

لالی بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ ناصرہ دروازے کے اندر جھک کر ڈیش بورڈ کے خانے کا ڈھکنا کھولنے لگی۔ لالی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”میری گل تو سنو۔“

ناصرہ نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”جلدی سے بھاگ جا۔ تو کچھ نہیں کرسکتا۔“ وہ زور سے چیخی۔ ”جا یہاں سے۔“ اس کے بال بکھر کے چہرے پر آگئے تھے۔ آنکھیں تیزی سے چمک رہی تھیں۔

”تمھارے پاس بھرا ہوا پستول ہے۔ فیر پروا نہ کرو۔“

”تو کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ اکیلا نہیں ہوگا۔ اپنے خوں خوار کرندوں کے ساتھ ہوگا۔“

”اس سے کیا فرک پڑتا ہے جی۔“ لالی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”کیا گڈی آگے نہیں جاسکتی؟“

”جا تو سکتی ہے، مگر اس سے کیا ہوگا؟“

”گڈی سامنے درختوں کے نیچے لے چلو۔ سڑک سے اتار کر کچے میں ڈال دینا۔“ اس نے دور تک پھیلے ہوئے بنجر میدان پر نظر ڈالی۔ ”یہاں تو چھپنے کی بھی کوئی جگہ نہیں۔“

دیکھتے دیکھتے روشنی بہت قریب آگئی۔ سڑک پر کسی گاڑی کے تیزی سے دوڑنے کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ ناصرہ نے اس کی طرف دیکھا اور بدحواس ہوکر بولی۔ ”لو، وہ آگیا۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔“

”فکر نہ کرو۔ بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ لاؤ پستول مجھے دو، جھیتی نال۔“

ناصرہ نے ڈیش بورڈ کے خانے سے پستول نکال کر لالی کو دیا۔ پستول لے کر لالی بولا۔ ”تم یہیں گڈی کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔“

ناصرہ بیزاری سے بولی۔ ”یہ تو کیا کررہا ہے؟ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔“

”زبان بند رکھو۔ جیسا کہتا ہوں، وہ کرو۔“

[illegible] ان کے پچھلے حصے کی جانب بڑھا اور گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ روشنی اور قریب آگئی۔ اتنی

قریب کے لالی نے یہ بھی دیکھ لیا کہ آنے والی سفید رنگ کی کار ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا' کار کی رفتار سست پڑی' بریک لگانے کی آواز ابھری۔ کار کچھ فاصلے پر رک گئی۔ لالی نے نشانہ باندھا اور چوکس ہو کر سامنے دیکھنے لگا۔

ذرا دیر بعد کار کا دروازہ کھلا۔ ایک شخص نکل کر باہر آیا۔ مگر وہ حیات محمد نہیں تھا۔ میانہ قدو قامت کا نوجوان تھا۔ وہ پتلون اور بش شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ لالی اندھیرے میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ اس کے پیچھے اترتے ہی ایک اور شخص بھی دروازہ کھول کر باہر آیا۔ دونوں سیڈان کی جانب آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ وہ کچھ فاصلے پر رک گئے۔ ایک نے تبصرہ کیا۔ "ایکسی ڈنٹ تو نہیں لگتا۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکا اور اونچی آواز سے بولا۔ "کوئی ہے یہاں؟" لالی اس کی آواز سن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ پیچھے کر لیے۔ دونوں سیڈان کے قریب آ گئے۔ بش شرٹ والے نوجوان نے پوچھا۔

"کیا ہو گیا جی؟"

لالی نے جواب دیا۔ "پنکچر ہو گیا ہے۔"

ناصرہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنے بکھرے ہوئے بال درست کر رہی تھی۔ نوجوان نے اسے دیکھ کر حیرت سے کہا۔ "ارے آپ! آپ تو میاں حیات محمد وٹو کی بیگم ہیں نا؟"

ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں جی۔"

نوجوان مسکرا کر بولا۔ "میرا نام چوہدری ولی داد خاں بھٹی ہے۔ ادھر اپنی بھی زمینداری ہے۔" اس نے توقف کیا۔ "میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

ناصرہ نے نرم لہجے میں کہا۔ "شکریہ! میرا ڈرائیور اسٹپنی لگا دے گا۔"

بھٹی نے کہا۔ "جیسی آپ کی مرضی۔"

مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ دونوں واپس چلے گئے۔ اپنی کار میں جا کر بیٹھے۔ اسے اسٹارٹ کیا ذرا دیر میں ان کی کار سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگی۔ جب کار دور چلی گئی اور اس کی پچھلی سرخ بتیاں دھندلی پڑ گئیں تو ناصرہ نے ایک بار پھر ڈکی کھولی۔ لالی نے اسٹپنی اور ٹول بکس نکالا۔ ناصرہ کی ہدایت کے مطابق لالی نے جیک لگا کر کار کا پچھلا حصہ اونچا کیا۔ وھیل کیپ اتار کر نٹ بولٹ کھولے اور پہیا نکال کر اسٹپنی لگا دی۔ ناصرہ اس کے قریب بیٹھی ضروری ہدایات دے رہی تھی اور اس کی مدد بھی کر رہی تھی۔

لالی نے پہیا اور ٹول بکس ڈکی میں رکھ دیے اور اسے بند کر دیا۔ دونوں پھر کار میں بیٹھ گئے۔ لالی



نے پستول ناصرہ کو واپس دے دیا۔ ناصرہ نے پستول ڈیش بورڈ کے خانے میں بند کیا۔ کار اسٹارٹ کی۔ لالی کی جانب متوجہ ہوئی۔

"جانتا ہے میں نے کیا سوچا تھا؟ اگر حیات آجاتا تو تجھے کہتی' مجھ پر گولی چلا دے۔"

"نہیں جی! میں ایسا کام نہیں کرتا۔ میں کسی زنانی کا خون کرنے کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ کام تو میاں حیات محمد کر سکتا ہے۔ وہ تو جی بہت ہی ظالم ہے۔ اس نے تو جی تمہیں مار ہی ڈالا تھا۔ ایسا گلا دبوچا تھا' چھوڑتا ہی نہ تھا۔" لالی یہ کہتے ہوئے نشے سے جھوم کر مسکرانے لگا۔

"برا نہ منانا۔ تسیں صرف بیگم ہو۔ تاش کی بیگم۔ اس کی مونچھیں ہی نوچ لیتیں' کاٹ کھاتیں' منہ پر تھوک دیتیں۔ کچھ تو کرتیں۔ نہ ہوئی شاداں' میاں حیات اس کا گلا دباتا تو وہ اس کی گردن چھری سے کاٹ کر سر الگ کر دیتی۔"

"کون ہے وہ؟"

"ہے کوئی۔ پر وہ بہت زور آور ہے جی!"

"تیری گھروالی ہے۔"

"اپنی کوئی گھروالی شروالی نہیں۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ "اپنے سے بھلا کون کڑی ویاہ کر سکتی ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے' تو تین بار جیل کاٹ چکا ہے؟"

"ہاں جی۔" لالی انکار نہ کر سکا۔ "اور چوتھی بار جیل میں بند کرنے کے لیے پولیس میری تلاش میں ہے۔"

"سمجھ نہیں آتی' تم لوگ جرائم پیشہ کیسے بن جاتے ہو؟"

"چھوٹا سا تھا تو ماں مر گئی۔ پیو جیل چلا گیا۔ پتہ نہیں' زندہ ہے کہ مر گیا۔" لالی افسردہ ہو گیا۔ "میں تو جی کوڑے کا ڈھیر ہوں۔ کوڑے کے ڈھیر پر پلا اور کوڑے کا ڈھیر ہی رہا۔ کھاد بھی نہ بن سکا۔ مگر تمہارا کھسم۔" لالی جھجکا پھر مسکرا کر بولا۔ "معاف کرنا جی! میں ایسے ہی بولتا ہوں۔"

"کہتا جا۔ میں تیری گل سن رہی ہوں۔"

"میں یہ کہہ رہا تھا' تمہارا کھسم' میاں حیات محمد کیسے جرائم پیشہ بن گیا؟ وہ تو جی ولایت سے بیرسٹری پڑھ کر آیا ہے۔ کنون کو پوری طرح جانتا ہے۔"

ناصرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی بھی خاموش ہو گیا۔ ذرا دیر بعد لالی کی آواز ابھری۔ "میاں ریاض تو مر گیا۔ اب کیا ہو گا بی بی جی؟"

"وہ زندہ ہی کب تھا۔ اسے تو مرے ہوئے بھی تین مہینے سے اوپر ہوگئے۔ اس کی تو قبر بھی موجود ہے۔"

لالی نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "اور وہ جو تہہ خانے میں تھا' وہ کون تھا؟"

"وہ ریاض ہی تھا؟"

"فیر وہ کبر کس کی ہے؟" لالی بدستور حیرت زدہ تھا۔

"یہ تو حیات ہی جانتا ہوگا' اس قبر میں کس کی لاش دفن ہے۔ مگر اس نے مشہور یہی کر رکھا ہے کہ وہ ریاض کی قبر ہے۔"

لالی اور حیرت زدہ ہوگیا۔ "تو یہ چکر بھی چل رہا تھا۔"

"حیات نے جب اپنے بھائی ریاض کو تہہ خانے میں بند کیا تو چند ہی روز بعد یہ خبر پھیلا دی کہ ریاض کار کے ایکسی ڈنٹ میں مرگیا۔" ناصرہ نے بتایا۔ "حیات کسی لاوارث کی لاش بھی لے آیا۔ اسپتال کے مردہ خانے سے رشوت دے کر منگوائی تھی یا کسی قبر سے نکالی تھی۔ لاش رات کو آئی تھی۔ ایسی کٹی پھٹی اور مسخ تھی کہ نہ چہرہ نظر آتا تھا' نہ گردن۔ اس میں اتنی سڑاند تھی' اتنی بدبو تھی کہ میرا جی متلا گیا۔ نہ معلوم لاش کو غسل بھی دیا کہ نہیں۔ رات ہی کو فٹافٹ دفن کر دیا۔ قبر بھی بنا دی گئی۔"

"پیسے میں جی بہت طاقت ہے۔ زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ بنا سکتا ہے۔"

"شروع میں تو میں یہ سمجھی میاں ریاض مرگیا۔ مگر ایک روز ایسا ہوا' میں حیات کی تلاش میں تہہ خانے میں چلی گئی۔ اس وقت دروازہ کھلا تھا اور دھیور بھی پہرے پر موجود نہیں تھا۔ میں تہہ خانے کے اندر گئی تو کیا دیکھتی ہوں' ریاض زندہ بیٹھا ہے۔ حیات بھی وہاں موجود تھا۔ وہ اتنا ناراض ہوا کہ دھیور کو ہنٹر سے ڈنگر کی طرح پیٹا۔ مجھے بھی مارا۔"

"ریاض کے پتر میاں نیاز محمد کو بھی یہ گل بات ملوم ہے؟"

"نہیں۔ نیاز کو کچھ نہیں معلوم۔ وہ یہی جانتا ہے' اس کا پیئو مرگیا۔ حیات نے اسے جو کچھ بتایا' اس نے مان لیا۔"

"فیر وہ مکدمہ کیوں چلا رہا ہے؟"

"جاگیر اور جائیداد اپنے قبضے میں لینے کے لیے۔ مجھے تو ایسے لگتا ہے یہ سارا منصوبہ نیاز کے ماماں کا ہے۔" ناصرہ چند لمحے خاموش بیٹھی رہی اور ونڈ اسکرین سے سنسان سڑک کو دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر یکایک جھنجلاہٹ آگئی۔ کسی قدر تیکھے لہجے میں بولی۔ "یہ جاگیر' سچ پوچھو تو ایسی



ہڈی ہے' جس کے لیے تین کتے لڑ رہے تھے۔ ایک مرگیا' دو ابھی رہ گئے ہیں۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ نیاز' میاں ریاض کا نہیں' کرنیل جانسن کا پتر ہے؟"

"میں نوں اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔" ناصرہ نے بے نیازی کا اظہار کیا۔ "مگر حیات یہی کہتا ہے۔"

"وہ تو یہ بھی کہتے ہیں جی' ریاض اپنی گھر والی کو کرنیل کے پاس سونے کے لیے بھیجتا تھا۔ مجھے خود انھوں نے بتایا تھا۔ میں غلط نہیں کہہ رہا۔"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے بھی یہی بتاتا ہے۔ وہ سب سے یہی کہتا ہے۔" اس کے چہرے پر برہمی چھا گئی۔ "ریاض بھی بے غیرت تھا اور حیات بھی بے غیرت ہے۔ دونوں ایک جیسے ہیں۔"

لالی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہارا خصم بھی ایسا ہی چکر چلاتا ہے؟ میرا مطلب ہے۔۔۔۔"

"میں تیرا مطلب سمجھتی ہوں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "اسی بات پر میرا اس کا جھگڑا شروع ہوا۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے مہمانوں کے دل بہلاؤں۔ ان کے ساتھ سوؤں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں اب تک آٹھ مہمانوں کے ساتھ سو چکی ہوں۔ کل رات وہ مجھے نویں کے ساتھ سلانا چاہتا تھا۔ اسے وہ سیاست کہتا ہے۔ بادشاہ گری بتاتا ہے۔ جب میں اس کی اس سیاست اور بادشاہ گری میں مدد کرنے سے انکار کرتی ہوں تو مجھے بے رحمی سے مارتا ہے۔ ہڈی پسلی توڑ دیتا ہے۔ لہولہان کر دیتا ہے۔ تجھے کس طرح بتاؤں۔ کیسے کیسے ظلم کرتا ہے۔" ناصرہ کی آواز میں کسک تھی۔ وہ خاموش ہوگئی۔

لالی اندھیرے میں ناصرہ کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ لالی بھی اداس ہوگیا۔ سیاہ سیڈان سنسان سڑک پر تیزی سے دوڑتی رہی۔

لالی اسے تسلی بھی نہ دے سکا۔ بت بنا خاموش بیٹھا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ ایک منٹ' دو منٹ' تین منٹ' کئی منٹ گزر گئے۔

لالی نے خاموشی سے اکتا کر کہا۔ "بی بی جی' ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھ' کیا پوچھنا چاہتا ہے۔"

"کیا نیاز کو امریکہ سے تم نے بلایا ہے؟"

"نہیں' وہ خود آیا ہے۔" ناصرہ نے جواب دیا۔ "ہاں' میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ جاگیر اور جائیداد نیاز کو مل جائے۔"

"اس لیے کہ وہ اصلی وارث ہے۔ جیداد پر اس کا حق بنتا ہے؟"

"کسی کا حق وق نہیں بنتا۔ اور نہ مجھے کسی کے حق سے کوئی دلچسپی ہے۔" وہ جھنجلا کر بولی۔ "میں تو یہ چاہتی ہوں کہ جاگیر حیات کے پاس نہ رہے۔ اگر جاگیر اور زمینداری اس کے پاس رہے گی تو وہ ساری عمر اپنی اکلوتی بیٹی کا ویاہ نہیں کرے گا۔ اس ڈر سے کہ جاگیر اور جائیداد اس کے خاندان سے باہر چلی جائے گی۔ وہ جاگیر کم کرنے کی بجائے بڑھانا چاہتا ہے۔ یہ بات وہ مجھ سے صاف صاف بتا چکا ہے۔ وہ جاگیر اور جائیداد کے سوا کسی سے بھی محبت نہیں کرتا۔" ناصرہ نے گہری سانس بھری۔ "جب تک یہ جاگیر اور زمینداری ہے' نہ وہ اپنی بیٹی کا پیئو بن سکتا ہے' نہ میرا شوہر۔"

"جیداد اور زمینداری تو جی وہ چھوڑے گا نہیں۔ یہ بالکل پکی گل ہے۔" لالی نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "پر بی بی جی تم اتنی پڑھی لکھی ہو۔ وڈے گھر کی دھی ہو۔ تمہارے لیے کسی چیز کی کمی نہیں۔ فیر تم اس کی پروا کیوں کرتی ہو؟ کاگز لکھوا کر اس سے چھٹکارا کیوں نہیں پالیتیں۔"

"کیسے چھٹکارا پالوں۔ میرا پیئو نہیں مانتا۔ وہ خاندانی جاگیردار ہے۔ کہتا ہے ہمارے خاندان کی کسی زنانی نے آج تک طلاق نہیں لی۔ جس کے ساتھ ایک بار ویاہ ہوگیا' ساری زندگی اسی کے نام پر کاٹ دی۔ میں نے کاغذ لکھوایا تو خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔" ناصرہ نے تامل کیا۔ "مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ میری بچی مونا کا مستقبل خراب ہوجائے گا۔ سب کہیں گے طلاقن کی بیٹی ہے۔"

"تمہاری مونا کتنی عمر کی ہوگی؟"

"ابھی تو بہت چھوٹی ہے اور بہت معصوم ہے۔ ابھی تو وہ کچھ بھی نہیں جانتی۔ اسے کچھ پتہ نہیں۔"

"جب میں چھوٹا سا تھا تو ساری گالاں سیکھ گیا تھا۔ ان کا کچھ کچھ مطلب بھی جان گیا تھا۔" یہ کہتے کہتے لالی یادوں کے دھندلکوں میں گم ہوگیا۔ ایک بار پھر نشہ اس پر حملہ آور ہوا۔ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ جھوم کر بولا۔ "ایک بار ایسا ہوا جی کہ میں نے پنڈ کی ایک سلے بار مٹیار کو آنکھ مار دی۔ وہ فصل کی واڈھی کے بعد کھیت میں پڑے ہوئے کنک کے سٹے چن رہی تھی۔ اس نے آنکھیں نکال کر مجھے گھورا اور دبا کے پٹائی کی۔ فیر تو جی چاچا نے مجھے اینٹوں کے بھٹے پر لگا دیا۔ سویرے تڑکے کام پر جاتا اور شام کو گھر آتا۔ چلچلاتی دھوپ میں پتھیروں کے ساتھ کام کرتا۔ بہت دنوں اینٹیں ڈھوتا رہا۔ ہاتھوں میں گھاؤ پڑ گئے۔ سر کے بال ایسے اڑے کہ بالکل گھون مون ہوگیا۔ کرتا بھی کیا۔ کھانے کو نہ ملتا۔"



ناصرہ خاموش بیٹھی رہی۔ لالی کہتا رہا۔ "میرا چاچا بے چارہ بہت بوڑھا تھا۔ اوپر سے اسے دمہ تھا۔ پڑا پڑا' کھوں کھوں کھانستا رہتا۔ میری چھوٹی بہن پورے دس سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ چاچا نے اس کا ویاہ کر دیا۔ وہ کھاتی ڈھیر سا تھی اور گھر میں کھانے کو نہ تھا۔ ویاہ کے بعد اسے سب ملوم ہوگیا۔ کھٹا کھٹ بچے جننے لگی۔ اس نے تین خصم کیے۔ پر روٹی کو ترستی ہوئی مرگئی۔"

"ہمارے گھرانے میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہمارا خاندان بہت اونچا ہے۔" ناصرہ نے فخر سے گردن نچی کی۔ "ہم کوٹ کمالیہ کے لنگریال ہیں۔ تمیں نوں پتہ ہے لنگریال کون ہوتے ہیں؟"

"اپنے کو تو جی کچھ پتہ نہیں۔"

"پرانے زمانے میں ہمارے وڈوں اور بزرگوں کے گھر کے دروازے محتاج اور حاجت مندوں ے لیے دن رات کھلے رہتے تھے۔ وہ بہت امیر ہوتے تھے۔ ان کی حویلیوں میں لنگر خانے ہوتے ے۔ جس کا جی چاہتا' لنگر سے روٹی کھاتا۔ کوئی بھوکا نہ جاتا۔ ان کے لنگر خانے اتنے مشہور تھے کہ ری برادری کا نام لنگریال پڑ گیا۔" ناصرہ چند لمحے خاموش رہی۔ "حیات کی ذات کا کچھ پتہ نہیں۔ د کو وٹو کہتا ہے۔ لیکن کوئی ڈوگر بتاتا ہے کوئی آرائیں۔ ڈوگروں کے بارے میں مشہور ہے' ڈنگر ر ہوتے تھے اور آرائیں پہلے شاہی مالی ہوتے تھے' اب تو خود کو میاں کہلواتے ہیں۔" اس نے رت سے منہ بگاڑا اور تیکھے لہجے میں بولی۔ "نہ جانے ابا جی نے کیا سوچ کر مجھے حیات کے پلے ندھ دیا۔"

لالی اس کی باتیں سن کر بے تکلفی سے ہنس پڑا۔ "یہ خاندان اور برادری کا بھی عجیب چکر ہے ت یہ ہے جی' اپنا تو سرے سے کوئی خاندان ہی نہیں۔ میں نوں تو ٹھیک سے یہ بھی پتہ نہیں میرا پیئو ن تھا۔"

ناصرہ نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ "تو کیا تیری ماں...." اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"نہیں جی' وہ کنجری شنجری نہیں تھی' بہت نیک بندی تھی۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "برا تو ہ زمیندار تھا جس کی حویلی میں ویاہ سے پہلے میری ماں کام کاج کرتی تھی۔ غریب کی تھی۔ زمیندار نے اسے خراب کر دیا۔ فیر ایسا ہوا جی کہ میرا نانا اپنا پنڈ چھوڑ کر میری ماں کے ساتھ گوگیرہ کے زدیک ایک چک میں آ کر بس گیا۔ جب اس نے میری ماں کا ویاہ کیا تو میں اس کے پیٹ میں تھا۔"

ہ خاموش ہوگیا۔ ناصرہ بھی خاموس بیٹھی رہی۔

کھلی کھڑکی سے ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ نشے کا تیز ریلا آیا۔ لالی مسکرا کر بولا۔ "جب میں تگڑا جوان ہوگیا اور چوری چکاری بھی کرنے لگا تو مجھے اپنی ماں کے بارے میں بہت سی باتوں کا پتہ

چل گیا۔ مجھے زمیندار پر بہت غصہ تھا۔ ایک رات میں قتل کرنے کے ارادے سے اس کی حویلی میں گھسا۔ جیسے ہی کھڑکی کے رستے کمرے میں گیا' کیا دیکھتا ہوں' وہ ایک چھوہری کے ساتھ بالکل ننگا کھڑا ہے۔ وہ اس کی دھی سے بھی چھوٹی تھی۔ میں نے چاقو کھول کر دکھایا۔ اسے کہا' ابھی قتل کردوں گا۔ وہ ایسا ڈرا کہ تھر تھر کانپنے لگا۔ مجھے ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے اسے قتل کرنے کا ارادہ چھوڑ دیا اور اس سے پورے چار ہزار روپے لے کر چلا آیا۔ وہ بہت مالدار ہے جی۔ وڈا زمیندار ہے۔ سنا ہے ملوٹ کا جنجوعہ ملک ہے۔ اسمبلی کا ممبر شمبر بھی رہ چکا ہے۔ اخباروں میں اس کی تصویریں بھی چھپتی ہیں۔ آج کل وہ اپنی زمین داری میں بہت شاندار مسجد بنوا رہا ہے۔ اس کے ساتھ یتیم خانہ اور مدرسہ بھی ہوگا اور میں نے جو تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا سیکھا' وہ جیل میں سیکھا۔"
لالی ٹھٹھا مار کر ہنسا۔

ناصرہ خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی لمبی چوڑی کار تیزی سے سڑک پر دوڑتی رہی' ایک موڑ کاٹ کر پختہ سڑک پر آگئی۔ کچھ دیر بعد ناصرہ نے پوچھا۔ "تیں نوں کتھے جانا ہے؟"

"میں نوں تو جی قادر آباد سٹیشن جانا ہے۔"

"قادر آباد تو ادھر رہ گیا۔" ناصرہ نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "آگے تو منٹگمری شہر ہے۔ مگر میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ کچھ دور جا کر نہر آئے گی اور اس کے ساتھ ہی میں لال ٹبے کی جانب مڑ جاؤں گی۔ میں اپنی بہن کے گھر جاؤں گی۔"

"ایسا ہے جی تو مجھے یہیں اتار دو۔ اب تمہیں اپنے خصم کا بھی ڈر نہیں رہا۔"

ناصرہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولی۔ "حیات کے سر سے بہت خون بہہ گیا تھا۔ جانے اب اس کا کیا حال ہوگا۔"

لالی بے نیازی سے بولا۔ "مر گیا ہوگا۔"

ناصرہ غصے سے پھٹ پڑی۔ "تو بالکل جانگلی ہے اور بے رحم بھی ہے۔"

لالی اس کی برہمی خاموشی سے پی گیا۔ کار سڑک پر دوڑتی رہی۔ نہ ناصرہ نے اسے روکا نہ لالی نے روکنے کے لیے کہا۔ دونوں چپ بیٹھے تھے۔ کار کسی بستی کے قریب سے گزر رہی تھی۔ درختوں کے جھنڈ کے پیچھے اکا دکا چراغ ٹمٹما رہے تھے۔

کار آن کی آن میں بستی کے آگے سے گزر گئی۔ سڑک کے دونوں طرف درخت اور ہرے بھرے کھیت تھے۔ پت جھڑ کے مارے ہوئے درخت اجڑے اجڑے نظر آتے تھے۔ فضا غبار آلود تھی۔ چاندنی دھندلی پڑ گئی تھی۔ لالی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آرہا تھا۔ ناصرہ نے خاموشی سے اکتا کر



چھا۔

"کیا سوچ رہا ہے؟"

"تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔"

ناصرہ نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ "میرے بارے میں؟"

"ہاں۔" لالی نے رسان سے کہا۔ "میں سوچ رہا تھا' جب وہ جھکا ہوا دونوں ہاتھوں سے تمہارا ا دبا رہا تھا۔ میں نیچے زمین پر پڑا تھا۔ تمہاری ساڑھی الگ پڑی تھی۔ تمہاری سوہنی سوہنی ہیں پھٹی ہوئی تھیں' بال بکھر گئے تھے۔"

لالی بالکل بھول گیا کہ وہ شاداں سے نہیں میاں حیات محمد خاں وٹو کی بیگم ناصرہ سے بات کر رہا ہے' جو ایک خاندانی جاگیردار کی بیٹی بھی تھی۔ لالی نشے کی ترنگ میں کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا۔ ایت بے باکی سے کہتا رہا۔ "تمہاری دونوں ٹانگیں ننگی تھیں۔ ایک دم ننگی۔ ہری' ہری روشنی ں...."

ناصرہ نے فوراً بریک لگایا۔ کار کے پہیے سڑک کی تیز رگڑ سے سناٹے میں زور سے چیخے۔ لالی کی ت ادھوری رہ گئی۔ کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ناصرہ غضب ناک ہو کر چیخی۔ "بے غیرت! تمیز! فوراً گاڑی سے نیچے اتر جا۔ نکل باہر۔"

لالی کھسیانا ہو کر بولا۔ "اتنا ناراض کیوں ہوتی ہو۔"

وہ ڈپٹ کر بولی۔ "میں کہتی ہوں نکل باہر۔" اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا اور ڈیش بورڈ کا نہ کھولنے لگی۔

"میں نوں پتہ ہے' تمہارے پاس بھرا ہوا پستول ہے۔ پستول نہ نکالو۔ میں چلا جاؤں گا۔"

لالی نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا' ناصرہ کی طرف مڑا اور ڈھیٹ بن کر مسکراتے ہوئے لا۔ "مجھے جی زنانیوں کی ننگی ٹانگیں دیکھنے کا چسکا نہیں ہے۔ وہ تو میں دس روپے خرچ کر کے بھی کھ سکتا ہوں۔ صرف ٹانگیں نہیں' پورا بدن دیکھ سکتا ہوں۔ میرے پاس جگیر اور جیداد ہوتی تو وز زنانیوں کو ننگا کر کے دیکھتا۔ خود بھی دیکھتا' دوسروں کو بھی دکھاتا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا' تمہارا خصم بے رحم بھی ہے' بے غیرت بھی۔ میں نے اس کے منہ پر ی لیے تھوکا تھا اور اسی لیے اس کا سر دیوار سے ٹکرا کر چھوڑا تھا کہ وہ بہت وڈا بے غیرت دلا ہے۔"

لالی نے کار کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ ناصرہ گردن موڑے اسے غور سے دیکھتی رہی' پھر

اس نے آہستہ سے کہا۔ "ٹھیر جا۔" وہ اپنا پرس کھولنے لگی۔

لالی نے کار کا دروازہ دھیرے سے بند کیا اور اس کا سہارا لے کر زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "اسے نہ کھولو۔ اس میں ۱۷۰ روپے تھے' وہ میں نے پہلے ہی نکال لئے ہیں۔ پروا نہ کرو۔ اپنا کام چل جائے گا۔ اب تسیں جاؤ۔"

لالی الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ناصرہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ کار اسٹارٹ کی' گیئر میں ڈالی اور جھنجلا کر ایکسی لیٹر اس قدر زور سے دبایا کہ سیاہ سیڈان چیختی ہوئی تیزی سے بھاگی اور آن کی آن میں بہت دور نکل گئی۔



ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سڑک نیم پختہ تھی اور زیادہ کشادہ بھی نہ تھی۔ سڑک کے دونوں طرف ے درخت تھے۔ لالی آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ کچھ ہی دور آگے گیا تھا کہ درختوں کی اوٹ سے روشنی ر آئی۔ وہ اسی سمت بڑھنے لگا۔ قریب پہنچا تو پتھروں کی بنی ہوئی دو منزلہ عمارت نظر آئی۔ یہ ریسٹ ں تھا۔

لالی ٹھہر گیا اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسی اثناء میں درختوں کے نیچے سے کتوں کا ں نکلا۔ کتے زور زور سے بھونکتے ہوئے لالی پر جھپٹے۔ وہ گھبرا کر سرپٹ بھاگا۔ کتوں نے اس کا قب کیا۔ لالی دوڑتا ہوا ریسٹ ہاؤس کے قریب پہنچ گیا۔ مگر کتوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر ۔ وہ زور زور سے بھونکتے اور دانت نکال کر غراتے ہوئے اس پر جھپٹتے۔ ان کے نرغے سے بچنے ے لیے قریب نہ کوئی جھاڑی تھی نہ درخت تھا۔ پتھر بھی نہ تھے کہ اٹھا' اٹھا کر مارتا اور کتوں کو گانے کی کوشش کرتا۔

اس کے پیروں کے نیچے خشک اور ریتلی زمین تھی۔ لالی جھٹ زمین پر جھکا اور دونوں ہاتھوں سے ی اڑانے لگا۔ یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ کتے بکھر کے پیچھے ہٹے۔ گرد کا غبار چھا گیا۔ لالی کو ریسٹ ؤس کی دیوار تک پہنچنے کا موقع مل گیا۔ اس نے زغند بھری اور دیوار پھاند کر اندر چلا گیا۔ دیوار کے باہر کتے مسلسل بھونک رہے تھے۔

ریسٹ ہاؤس میں ہر طرف ویرانی تھی۔ وسط میں دو منزلہ عمارت تھی۔ اوپر کی منزل کے ایک ریچے سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ عمارت کے اردگرد وسیع احاطہ تھا۔ احاطے میں اونچے

اونچے درخت تھے۔ درختوں کے پتے گر چکے تھے۔

برہنہ شاخیں تاریکی میں مکڑی کے جالوں کی مانند الجھی الجھی نظر آتی تھیں۔ خزاں کی اجاڑ رات نڈھال کھڑی تھی۔ ہوا چلتی تو خشک پتے کھڑکھڑاتے اور دور تک بکھر جاتے۔ لالی احاطے میں پہنچنے کے بعد اندھیرے میں دیوار کے ساتھ دبک کر بیٹھ گیا۔ چار دیواری کے اس پار کتے ابھی تک بھونک رہے تھے۔

لالی نے دم بھی نہ لیا تھا کہ عمارت کے عقب سے ایک شخص جھپاک سے نکلا اور عین اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لمبی لاٹھی تھی' دوسرے میں لالٹین لٹک رہی تھی۔ وضع قطع سے وہ ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار لگتا تھا۔ اس نے جھٹ لالٹین ایک طرف رکھی اور لالی پر لاٹھی تان کر بولا۔

"کون ہے تو؟"

چوکیدار اس طرح "آناً" فاناً" نکل کر سامنے آیا کہ لالی کے لیے راہ فرار اختیار کرنے کی گنجائش نہ رہی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور آہستہ سے کہا۔

"چاچا! ڈر نہیں۔"

"پر تو ہے کون؟" چوکیدار بدستور لاٹھی تانے کھڑا تھا۔ اس نے کسی قدر اونچی آواز سے کہا۔ "ٹھیک' ٹھیک بتا' یہاں آیا کیسے؟"

وہ دبلا پتلا ادھیڑ آدمی تھا۔ لالی نے اسے کمزور اور سن رسیدہ پایا تو نڈر ہو کر بولا۔ "چاچا! خاما خا گرمی نہ دکھا۔" وہ مسکراتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اپنی ڈانگ تو ہٹا۔ ذرا دم لے۔ میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔"

چوکیدار نے لاٹھی نیچے کر لی۔ چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے لالٹین اٹھائی اور لالی کے چہرے کے سامنے لا کر اس طرح چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے پوچھا۔ "تو عیدو کا پت ملّی' تو نہیں ہے؟ لگتا تو کچھ ویسا ہی ہے۔"

"نہیں جی' نہ میں عیدو کا پتر ہوں' نہ ملّی ہوں۔" لالی نے اس کا شک رفع کیا۔ "گل ایہہ ہے جی! میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ کتے بھونکتے ہوئے پیچھے لگ گئے۔ گھبرا کر بھاگا اور یہاں آ گیا۔"

چوکیدار نے مڑ کر دیکھا' پھاٹک قریب ہی تھا۔ اس نے حیرت سے کہا۔ "پھاٹک میں تو تالا لگا ہے۔ تو آیا کیسے؟"

"پھاٹک پھاند کر اندر آ گیا۔" لالی ایک بار پھر مسکرایا۔ "کرتا بھی کیا۔ یہاں نہ آتا تو کتے مجھے نہ



چھوڑتے۔ ایک دو نہیں' پورا غول ہے۔" احاطے کے باہر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ لالی نے پشت کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "سن رہا ہے؟ ابھی تک کھڑے بھونک رہے ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" چوکیدار نے لالٹین زمین پر رکھ دی۔ "پچھلے دنوں ادھر ایک کھوتا مر گیا تھا۔ جانے کہاں کہاں کے کتے اسے کھانے آ گئے۔ رات بھر بھونکتے ہیں۔" چوکیدار کا رویّہ اب نرم ہو گیا تھا۔ وہ مسکرا کر کسی قدر بے تکلفی سے بولا۔ "یہاں کھڑا کیوں ہے؟ ادھر منجی پر آجا۔ آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔" چوکیدار مڑا' لالٹین اٹھائی اور آگے بڑھ گیا۔

لالی بھی ساتھ ساتھ چلا۔ چلتے چلتے اس نے پوچھا۔ "چاچا یہ کس کی حویلی ہے؟"

چوکیدار نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "یہ حویلی نہیں' ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہاں سرکاری افسر آکر ٹھیرتے ہیں۔"

لالی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "آج یہاں کوئی ٹھیرا ہے؟"

"نہیں!" چوکیدار نے جواب دیا۔ "ریسٹ ہاؤس بالکل خالی ہے۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے درختوں کے نیچے پہنچ گئے۔ قریب ہی نیچی چھت کا پختہ کوارٹر تھا۔ کوارٹر کا دروازہ بند تھا۔ اس کے سامنے بوسیدہ چارپائی پڑی تھی۔ چوکیدار نے چارپائی کے نزدیک جا کر کہا۔

"لے' اب تو آرام سے یہاں بیٹھ۔"

لالی چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چوکیدار نے لاٹھی ایک طرف رکھ دی۔ لالٹین کی لو دھیمی کی اور اسے بھی چارپائی کے قریب رکھ دیا۔ وہ لالی کے نزدیک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ لالی نے ذرا دیر خاموش رہ کر پوچھا۔ "جب یہاں کوئی ٹھیرا نہیں ہے تو یہ اوپر بتی کیوں جل رہی ہے؟" اس نے گردن اونچی کی اور اوپر کی منزل کی وہ کھڑکی دیکھنے لگا جس کے شیشوں سے زرد زرد روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔

"وہ تو میں اس لیے روز جلا دیتا ہوں کہ صاحب لوگ ادھر آئیں تو دور سے ریسٹ ہاؤس نظر آجائے۔ پر اب یہاں آتا ہی کون ہے۔ جو افسر کبھی دورے پر ادھر آتے بھی ہیں' وہ لمبردار اور زمیں داروں کی حویلیوں میں ٹھیر جاتے ہیں۔ مہینوں میں کوئی بھولا بھٹکا ادھر آجاتا ہے۔"

کتے اب ریسٹ ہاؤس سے دور جا چکے تھے۔ مگر ان کے بھونکنے کی آوازیں رات کے سناٹے میں برابر سنائی دے رہی تھیں۔ لالی نے سوچا' ابھی باہر جانا مناسب نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ریسٹ ہاؤس

سے نکلتے ہی کتے پھر پیچھے لگ جائیں اور کسی نئے خطرے کا باعث بن جائیں۔ ریسٹ ہاؤس محفوظ جگہ تھی۔ چوکیدار سے اس نے یارانہ بھی گانٹھ لیا تھا۔ لالی نے کچھ دیر وہاں ٹھہرنے کا ارادہ کیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور چوکیدار کی طرف بڑھا کر بولا۔

”چاچا! سگریٹ پئے گا؟“

”پلا دے۔“ چوکیدار نے بے نیازی سے کہا اور ایک سگریٹ پیکٹ سے نکال لی۔ ”سگریٹ پینے سے کھانسی بہت ہوتی ہے پر طبیعت بھی تو نہیں مانتی۔“ لالی نے اپنی اور چوکیدار کی سگریٹیں ماچس جلا کر سلگائیں۔ چوکیدار سگریٹ پر کش لگاتے ہی کھانسنے لگا۔ ذرا دیر کھانستا رہا' کچھ سکون ہوا تو پوچھنے لگا۔

”تیرا ناں کیہہ ہے؟“

لالی ایسے سوالات کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اس نے نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ”ناں تو جی اپنا محمد ابراہیم ہے' پر سب مجھے ہیما کہتے ہیں۔“

”ہیمے! یہ تو بتا' تو اتنی رات گئے ادھر آیا کیسے؟“ چوکیدار نے دریافت کیا۔ ”تیں نوں شمس پور تو نہیں جانا؟“

”جانا تو جی مجھے بہت آگے ہے۔“ لالی نے گول مول جواب دیا۔ ”سوچا' اسی رستے سے چلا جاؤں۔“

چوکیدار نے سگریٹ کا کش لگایا' لالی کے کرتے شلوار کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”تو کرتا کیا ہے ہیمے؟“

”میں جی اوکاڑہ ڈیری فارم میں نوکری کرتا ہوں۔“

چوکیدار نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”تو کیا تو اوکاڑے جا رہا تھا؟“ مگر لالی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ مسکرا کر بولا۔ ”پیدل اوکاڑے کیسے جا سکتا ہے؟ وہ تو بہت دور ہے۔“ اس نے ذرا تامل کیا۔

”تیں نوں کہیں اور ہی جانا ہوگا۔ کہاں کا ارادہ ہے؟“

”مین نوں تو جی کادر آباد سٹیشن جانا ہے۔ ایک دو روز ادھر ٹھیر کر اوکاڑے چلا جاؤں گا۔“

”پر کادر آباد سٹیشن بھی یہاں سے دور ہے۔ ۲۰ میل سے کم نہیں ہوگا۔ تیرے لیے تو سیدھا رستہ منٹگمری کا ہے۔ لاری پکڑتا' منٹگمری جاتا اور وہاں سے ریل یا راوی ٹرانسپورٹ کی لاری سے کادر آباد چلا جاتا۔ تجھے اس طرف کا رستہ کس نے بتایا؟“

”اب تجھ سے کیا بتاؤں چاچا!“ لالی نے بات بنائی۔ ”ہوا یہ کہ میں جہاں خان پنڈ میں اپنے ایک دوست کے ویاہ میں آیا تھا۔ وہاں ہنسی مخول میں ہوگیا ٹنٹا۔ میں ایسا گرمی میں آگیا کہ آدھی رات ہی



کو اٹھ کر چل کھڑا ہوا۔“

”کچھ زیادہ جھگڑا تو نہیں ہوا؟“ چوکیدار نے مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”میرا مطلب ہے' کوئی خون شون تو نہیں ہوگیا جو تجھے اس طرح رات ہی کو وہاں سے بھاگنا پڑا؟“

”نہیں چاچا! ایسی کوئی گل نہیں۔“ لالی نے ہنس کر کہا۔ ”جھگڑا بڑھ تو جاتا پر میں ٹال گیا۔ جیسے بیٹھا تھا ویسے ہی اٹھ کر چل کھڑا ہوا۔ کپڑے لتے بھی ساتھ لایا تھا' وہ بھی وہیں چھوڑ آیا۔ میرے دوست اور دوسرے بندوں نے روکا بھی' پر میں نے کسی کی نہ مانی۔ پنڈ سے نکل کر آگے بڑھا تو پکی سڑک آگئی۔ سڑک کے دوسری طرف تیرے ریسٹ ہاؤس کا رستہ نظر آیا۔ میں اسی پر چل کھڑا ہوا۔ سوچا' آگے جا کر کسی راہ گیر سے کادر آباد کا رستہ پوچھ لوں گا۔“ اس نے باتوں باتوں میں چوکیدار سے قادر آباد اسٹیشن کا راستہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ”کوئی نہ کوئی رستہ تو ادھر سے کادر آباد جاتا ہی ہوگا۔ چاچا تجھے تو رستے کا پتہ ہوگا؟“

”رستہ تو ادھر سے جاتا ہے۔“ چوکیدار نے بتایا۔ ”آگے گوردا پورہ ہے۔ یہاں سے چار میل کے لگ بھگ ہوگا۔“ اس نے شمال کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”وہاں سے نہر ملے گی۔ سیدھی کادر آباد جاتی ہے اور وڈی نہر' لوئر باری دوآب سے جا کر مل جاتی ہے۔ اب تو رات بہت ہوگئی۔ ویسے نہر کے کنارے کی کسی بستی سے کادر آباد تک جانے کے لیے تانگا بھی مل جائے گا۔ زیادہ پھیر کا رستہ نہیں۔ نہر کے کنارے کی سڑک' ہے تو کچی پر ٹھیک ٹھاک ہے۔ صرف برسات میں کہیں کہیں سے خراب ہوجاتی ہے۔“

لالی ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”چاچا! اب میں چلوں گا۔“

”تو اس وکھت جائے گا؟“ چوکیدار نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔ ”ذرا اپنی گھڑی دیکھ کرتا' بجا کیا ہے؟“

لالی نے لالٹین کی جانب ہاتھ بڑھا کر گھڑی دیکھی۔ ”اڑھائی بجا ہے۔“

”نہیں جی' اتنی رات گئے جانا ٹھیک نہیں۔ گوردا پورے کا رستہ بھی ٹھیک نہیں۔“

”تو فکر نہ کر چاچا! میں بے کھٹکے چلا جاؤں گا۔ ڈرنے شرنے کی کوئی بات نہیں۔“

”ڈرنے کی بات نہیں۔ پر گوردا پورے تک رستہ ذرا پھیر کا ہے۔ اندھیرے میں بھٹک کر جانے کدھر نکل جائے گا۔ ساری رات پریشان ہوگا۔ ایسا کیوں نہیں کرتا' صبح تک یہیں ٹھیر جا۔ پاک پتن روڈ یہ سامنے رہی۔“ چوکیدار نے ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ ”سویرے سویرے چلا جانا۔ دوپہر تک پہنچ جائے گا۔ اتنی رات کو کہاں بھٹکتا پھرے گا۔“

مگر لالی آمادہ نہ ہوا۔ "نہیں چاچا! میں چلا جاؤں گا۔ مجھے نہ روک۔ صبح ہونے تک تو میں قادر آباد کے نزدیک پہنچ جاؤں گا۔ ۲۰ ہی میل کا تو رستہ ہے۔ ابھی سورج نکلنے میں بہت دیری ہے۔ اتنی دیر میں تو بہت سا رستہ طے ہو جائے گا۔" یہ کہتا ہوا لالی اٹھنے کے لیے کسمسایا۔ اب وہ مزید ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا اور جلد سے جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

لیکن چوکیدار نے اسے اٹھنے نہیں دیا' اپنی بات پر اڑا رہا۔ لالی کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "میرا کہا مان' اس وقت یہاں سے جانے کا وچار چھوڑ دے۔" اس نے پیار سے لالی کو ڈانٹا۔ "خاماخا ضد نہ کر۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں تیرے سونے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

لالی نے چوکیدار کو اس قدر مہربان پایا تو انکار نہ کر سکا۔ ویسے بھی سورج نکلنے سے پہلے قادر آباد پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ دن میں کہیں نہ کہیں ٹھہرنا پڑتا اور نیا خطرہ مول لینا پڑتا۔ "تو کہتا ہے تو میں نہیں جاؤں گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "چاچا! میری فکر نہ کر۔ میں کہیں بھی سو جاؤں گا۔ چند گھنٹے کی تو بات ہے۔" اس نے نظریں گھما پھرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ "مجھے تو تیرے سوا یہاں کوئی دکھائی نہیں پڑتا۔ کیا یہاں اور کوئی نہیں رہتا؟"

"کیوں نہیں رہتا۔ میری گھر والی بھی ساتھ رہتی ہے۔"

"وہ تو کوارٹر میں پڑی سوتی ہوگی۔"

"نہیں' وہ اپنے بھرا کے گھر چک ۶۸ گئی ہے۔ بھتیجے کا ویاہ ہے' اس میں شریک ہونے گئی ہے۔ تین روز ہو گئے گئے ہوئے۔ کوارٹر میں صرف نجیا ہے۔ نجیا میری سب سے چھوٹی دھی ہے۔ بہت کام کاج کرتی ہے جی۔ کوئی افسر آکر ریسٹ ہاؤس میں ٹھیرتا ہے تو وہی چائے بناتی ہے' روٹی شوٹی تیار کرتی ہے۔ خانساماں یہاں رہتا ہی کب ہے۔"

"خانساماں کہاں ہوتا ہے؟"

"ویسے تو ریسٹ ہاؤس ہی کا نوکر ہے پر کام ایس' ڈی' او صاحب کے بنگلے پر کرتا ہے۔ رہتا بھی وہیں ہے۔ کبھی کبھار آجاتا ہے۔ یہاں کام ہی کون سا ہے۔ اسے گئے دو مہینے سے اوپر ہو گئے۔ سنا ہے' اس نے ملتان میں کوئی دھندا شروع کر رکھا ہے۔" چوکیدار پر ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ بھینچ کر دیر تک کھانستا رہا' جب ذرا قرار آیا تو گویا ہوا۔

"خانساماں کا کوارٹر خالی ہے' اسی میں سو جا۔"

چوکیدار آگے بڑھا اور اپنے کوارٹر پر پہنچ کر کنڈی کھٹکھٹانے لگا۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھل گیا



س کی اوٹ دھندلا سایہ نظر آیا۔ یہ چوکیدار کی بیٹی نجیا تھی۔ اس نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز پوچھا۔ "کیا بات ہے بابا؟"

"خانساماں کے کوارٹر کی چابی تو لا دے۔"

"کیا خانساماں چاچا آگیا؟"

"نہیں۔" چوکیدار نے جواب دیا۔ "اس کی منجی باہر نکالنی ہے۔"

ذرا دیر خاموشی رہی۔ لالی بھی چپ بیٹھا رہا۔ چوکیدار نے نجیا سے خانساماں کے کوارٹر کی کنجی ڑکر لالی کی جانب دیکھا اور اونچی آواز سے پوچھا۔

"چائے پیئے گا؟"

"چاچا! یہ چائے پینے کا کون سا ٹیم ہے۔"

"یہ سرکاری ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہاں ہر وقت چائے چلتی ہے۔" چوکیدار نے بے تکلفی سے ۔ "اب تو نجیا جاگ ہی گئی۔ فٹافٹ چائے بنا دے گی۔"

مگر لالی چائے پینے پر آمادہ نہ ہوا۔ "نہیں چاچا! میں نے چائے شائے نہیں پینی۔ نیند آرہی ۔"

"جیسی تیری مرضی۔" چوکیدار نے آہستہ سے پھر بیٹی کو مخاطب کیا۔ "دروازہ بند کر لے نجیا۔"

نجیا نے خاموشی سے دروازہ بند کر لیا۔ چوکیدار لالی کے پاس آگیا۔ "آ میرے ساتھ۔" دونوں کر درختوں کے نیچے چلنے لگے۔ چوکیدار کے ہاتھ میں لالٹین لٹک رہی تھی۔ خانساماں کا کوارٹر ب ہی تھا۔ چوکیدار نے تالا کھولا اور دروازے کا ایک پٹ کھول کر بولا۔ "اندر آجا۔" لالی اس ہم راہ کوارٹر میں چلا گیا۔ کوارٹر میں صرف ایک کمرہ تھا۔ کمرے کے آگے برآمدہ تھا۔ برآمدے ساتھ مختصر آنگن تھا۔ کوارٹر کی چار دیواری اونچی تھی۔ برآمدے میں ایک چارپائی بچھی تھی۔ یدار نے چارپائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کمرے میں بستر بھی ہے' بچھا لے۔ جی کرے تو کوارٹر سے باہر نکال لے یا آنگن میں ڈال لے۔ ں جی چاہے اور جیسے جی چاہے آرام سے سو۔"

لالی بے نیازی سے بولا۔ "فکر نہ کر۔ میں سو جاؤں گا۔"

چوکیدار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے کے اندر جا کے ایک کھیس اور تکیہ اٹھا لایا۔ "جی میں ئے تو کھیس بچھا لے۔ دری میں نہیں لایا۔ بہت میلی ہو رہی ہے۔"

لالی نے کھیس اور تکیہ چوکیدار سے لیا اور نظریں جھکا کر نرم لہجے میں کہا۔ "چاچا! تو نے خاماخا

اتنی تکلیف اٹھائی۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "اب باتیں چھوڑ اور آرام سے سو۔ رات بہت ہو گئی۔" لالی خاموش رہا۔ چوکیدار کوارٹر سے چلا گیا۔

☆

دھوپ دیوار سے اتر کر کوارٹر کے آنگن میں پھیل گئی تھی۔ لالی نے آنکھیں کھول کر دیکھا چوکیدار چارپائی کے نزدیک کھڑا ہے۔ وہ اس کے لیے ناشتا لایا تھا۔ ناشتے میں چائے کے ساتھ حلوہ تھا' پراٹھے تھے۔

لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور چپ چاپ ناشتا کرنے لگا۔ چوکیدار اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ "لاری سے جانا ہے تو فٹافٹ تیار ہو جا۔ میں سیکل پر ایس 'ڈی 'او صاحب کے بنگلے جا رہا ہوں۔ سویرے سویرے صاب کا فون آیا تھا۔ مجھے بلایا ہے۔ میں تجھے لاری کے اڈے تک پہنچا دوں گا۔"

لالی دن میں سفر نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ وہ چوکیدار کے ساتھ جانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ "چاچا! مجھے تو سخت نیند آ رہی ہے۔ کچھ دیر اور سو لینے دے۔ دن ڈھلے لاری سے چلا جاؤں گا یا تیرے بتائے ہوئے رستے پر نہر کے کنارے کنارے نکل جاؤں گا۔"

"نیند تو تیری آنکھوں سے صاف ٹپک رہی ہے۔ آرام سے سو لے۔ میں دوپہر تک واپس آجاؤں گا۔ دوپہر کی روٹی دونوں ساتھ ہی کھائیں گے۔"

لالی ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ "نہیں چاچا! مجھے اب اور کچھ نہیں کھانا۔ اپنے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

"جیسی تیری مرضی' اب اطمینان سے سو۔ میں چلا صاحب کے بنگلے کی طرف۔ واپسی پر آرام سے گل بات ہو گی۔"

وہ کوارٹر سے چلا گیا۔ لالی پھر بستر پر لیٹ گیا مگر سویا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد اٹھا۔ کوارٹر کے دروازے پر گیا۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ لالی نے اس کی آڑ سے دیکھا' چوکیدار سائیکل کا ہینڈل سنبھالے ریسٹ ہاؤس سے باہر نکل رہا ہے۔ اس نے سائیکل ایک طرف کھڑی کی۔ گیٹ بند کیا اور سائیکل پر سوار ہو کر چل دیا۔ لالی چند لمحے دروازے کے قریب کھڑا رہا' پھر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ دن خانساماں کے کوارٹر میں گزارہ جائے اور سورج ڈوبنے کے بعد جھٹ پٹے میں گوردا پورہ کے رستے نہر کے کنارے کنارے چلتا ہوا قادر آباد اسٹیشن پہنچ جائے۔ وہ رات بھر سفر



کر کے سویرا ہونے سے پہلے رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ لالی کچھ دیر تو کروٹیں بدلتا رہا' پھر دوبارہ گہری نیند سو گیا۔

دن ڈھلے آنکھ کھلی۔ دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر پہنچ چکی تھی۔ کوارٹر میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا تھا اور چوکیدار اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ لالی نے چوکیدار کو دیکھا تو جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چوکیدار نے مسکرا کر کہا۔ "دوبار پہلے آیا اور تجھے بے خبر سوتا پایا' جوانی کی نیند بھی کیا نیند ہوتی ہے۔" اس نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ "لے گرم گرم چائے پی۔ بہت سو چکا' اب شام ہو رہی ہے۔"

لالی نے چائے کی پیالی سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ "چاچا! تو کب واپس آیا؟"

"میں تو دوپہری کو آ گیا تھا۔" چوکیدار اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "سیدھا تیرے پاس آیا تھا۔ پر تو تو بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔"

"مجھے جگایا کیوں نہیں؟"

"کیا کرتا جگا کر' لاریوں کی سویرے سے ہڑتال ہے۔ ایک بھی لاری سڑک پر نہیں چل رہی۔ تو جاتا کیسے؟"

"لاریوں کی ہڑتال کیوں ہے؟"

"پولیس نے کسی لاری کا چالان کیا اور اس کے ڈرائیور کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔ سنا ہے' وہاں اس کی دبا کے پٹائی کی گئی اور حوالات میں بند بھی کر دیا۔" چوکیدار نے بتایا۔ "لاری والوں نے ہڑتال کر دی۔ ڈاکیا آیا تھا۔ بتاتا تھا' لاریوں کے مالکوں اور پولیس کے افسروں کے درمیان بات چیت ہو رہی ہے پر ڈرائیور بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے۔ تھانے والوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ ایسا لگتا ہے' ابھی کچھ طے نہیں ہوا۔ سڑک پر کوئی لاری نظر نہیں آتی۔"

"میں گوردا پورے کے رستے نہر کے کنارے کنارے پیدل چلا جاؤں گا۔ تانگا مل گیا تو پکڑ لوں گا۔ کچھ رستہ تانگے سے کٹ جائے گا۔" لالی نے نظریں اٹھا کر ڈوبتے ہوئے سورج کی دھوپ دیکھی' چائے کی پیالی ختم کر کے ایک طرف رکھی اور چارپائی سے نیچے اترتے ہوئے بولا۔ "مجھے اب چلنا چاہیے۔ شام ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔"

"کیوں خاما خا اس چکر میں پڑتا ہے۔ رات بھر یہاں اور ٹھہر جا۔ سویرے سرکاری گڈی ایس 'ڈی 'او صاحب کی ڈاک لے کر لہور جائے گی۔ تو چاہے تو سیدھا اوکاڑے چلا جا یا کادر آباد۔ دونوں

ہی رستے میں پڑیں گے۔ میں نے ڈریور سے بات کرلی ہے۔ وہ کل صبح گڈی لے کر یہاں پہنچ جائے گا۔" چوکیدار زیر لب مسکرایا۔ "ڈریور کو چائے پانی کے لیے ۸ آنے دے دینا۔ تیرا بھی کام بن جائے گا' وہ بھی خوش ہوجائے گا۔"

"نہیں چاچا! میں پیدل ہی چلا جاؤں گا۔" لالی رضامند نہ ہوا۔ "فکر نہ کر۔ میں آرام نال کادر آباد پہنچ جاؤں گا۔"

چوکیدار لمحے بھر مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھتا رہا۔ "ہیے! کوئی واردات کرکے تو نہیں آیا؟ تیری باتوں سے تو یہی پتہ چلتا ہے۔ سچ سچ بتا' اصل بات کیا ہے؟"

لالی اس کی بات سن کر پہلے تو ذرا پریشان ہوا پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ مسکرا کر بولا۔ "نہیں چاچا! ایسی کوئی گل بات نہیں۔"

"فیر کیا بات ہے جو تو پیدل جانے پر اڑا ہوا ہے؟ ایک دو میل نہیں' ۲۰ میل سے اوپر کا سفر ہے۔ جب سرکاری گڈی میں بیٹھ کر آرام نال کادر آباد پہنچ سکتا ہے تو خاماخا اس چکر میں کیوں پڑ رہا ہے؟"

لالی نے اس کا شبہ دور کرنے کے لیے جھٹ کہا۔ "تو کہتا ہے تو سرکاری گڈی ہی سے چلا جاؤں گا۔ آج رات بھی تیرے پاس ٹھیر جاؤں گا۔"

"باہر آجا۔ یہاں اندھیرا بھی ہوگیا ہے۔" چوکیدار اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "باہر منجی پر بیٹھ کر گپ شپ ہوگی۔ وہیں بیٹھ کر روٹی ٹکر بھی کھالیں گے۔"

چوکیدار بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ لالی بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں کوارٹر سے نکل کر احاطے میں آگئے۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ شام کا دھندلکا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ اس چارپائی کے نزدیک پہنچے جو چوکیدار کے کوارٹر کے سامنے درختوں تلے بچھی تھی۔ لالی چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مگر چوکیدار نہیں بیٹھا۔ وہ کوارٹر کے اندر گیا۔ ذرا دیر بعد واپس آیا تو جلتی ہوئی لالٹین اس کے ہاتھ میں لٹک رہی تھی۔ مگر لالی کی جانب آنے کے بجائے وہ ریسٹ ہاؤس کی دو منزلہ عمارت کی طرف گیا اور اس میں داخل ہوگیا۔ لالی خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے دیکھا' ریسٹ ہاؤس کی بالائی منزل کے ایک دریچے کے پیچھے روشنی جھلملا رہی ہے۔ چوکیدار نے وہاں لیمپ روشن کردیا تھا۔ عمارت سے نکل کر وہ لالی کے پاس آیا۔ اس نے لالٹین ایک طرف رکھی اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

اندھیرا اب بڑھ گیا تھا۔ ریسٹ ہاؤس پر گہرا سناٹا چھایا تھا۔ لالی نے سناٹے کی شدت محسوس



کرتے ہوئے پوچھا۔ "چاچا! یہاں تو ابھی سے اتنا سناٹا ہے۔ لگتا ہے جیسے آدھی رات ہوگئی۔ یہاں تیرا جی نہیں گھبراتا؟"

"گھبراتا تو ہے پر نوکری جو کرنی ہوئی۔ اکیلے میں جی نہ گھبراتا تو تجھے اس طرح کیوں روکتا؟ آج کل گھر والی بھی نہیں ہے۔ تیرے ساتھ بات چیت میں ٹیم کٹ جائے گا۔"

لالی نے اندھیرے میں ادھر ادھر نظریں گھما کر کہا۔ "دیکھ تو' یہاں کتنی ویرانی ہے۔ لگتا ہے جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہیں۔"

پت جھڑ کے مارے ہوئے درختوں سے زرد زرد پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ ہوا کا جھونکا آتا۔ گہری خاموشی میں ان کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوتی۔ یکایک چوکیدار کو کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ چند لمحے کھانستا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری اور بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

"ایک زمانہ تھا' جب ریسٹ ہاؤس میں کوئی نہ کوئی ضرور ٹھیرا رہتا' خوب چہل پہل ہوتی۔ ایک جاتا' دوسرا آتا۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا' مجھے بھی صاحب لوگوں کے لیے اپنی منجی دینی پڑتی۔ تب بھی کتنے ہی افسر واپس چلے جاتے۔ دن کا الگ' رات کا الگ' پورا اسٹاف تھا۔" وہ افسردہ ہوگیا۔ "پر اب تو یہاں الو بولتا ہے۔"

"ایسا کیوں ہوگیا چاچا؟"

چوکیدار نے کوئی جواب نہیں دیا' خاموش بیٹھا رہا۔ لالی بھی ذرا دیر تک خاموش رہا' پھر اس نے کرید کر پوچھا۔ "کوئی خاص بات ہوگئی؟"

"خاص ہی بات کہہ لو۔" چوکیدار نے آہستہ سے کہا۔ "کہتے ہیں ریسٹ ہاؤس میں رات کو کسی زنانی کی روح بھٹکتی پھرتی ہے۔"

"روح بھٹکتی پھرتی ہے؟ نہیں چاچا! کوئی اور بات ہوگی۔"

"اللہ جانے' کہتے یہی ہیں' آدھی رات کے بعد وہ نظر آتی ہے۔ کبھی زور زور سے چیختی ہے کبھی روتی ہے۔ کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستی ہے۔"

"دوسروں کی چھوڑ' اپنی بتا۔ کبھی اسے دیکھا بھی؟"

"نہ جی' نہ میں نے اسے دیکھا نہ اس کی آواز سنی۔ ویسے شبہ تو مجھے کئی بار ہوا پر ایمان لگتی بات یہ ہے' ٹھیک سے کچھ دیکھا نہیں۔ اپنے کو ویسے ہی رات کو کم دکھائی دیتا ہے۔ دوسرے لوگوں نے اسے دیکھا ہے۔ کئی تو اسے دیکھ کر ڈر کے مارے چیخنے چلانے لگے۔ کسی کی گھگھی بندھ گئی۔ کوئی بے ہوش ہوگیا۔ نہر کے محکمے کا ایک افسر ایسا ڈرا کہ بیمار پڑ گیا۔ کتنے ہی دن اسپتال میں رہا۔ بس جی

یہی وجہ ہے لوگ یہاں ٹھہرنے سے گھبراتے ہیں۔"

لالی نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔ "تیری گل سمجھ نہیں آئی۔" پھر کچھ سوچ کر اس نے دریافت کیا۔

"یہ چکر شروع کب سے ہوا؟"

"یہاں ایک زنانی کا خون ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہی یہ چکر شروع ہوا۔" چوکیدار آہستہ آہستہ بتانے لگا۔ "اب تو یہ بات پرانی ہو گئی۔ ۳ سال سے بھی اوپر ہو گئے۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "مجھے اب تک یاد ہے۔ جاڑوں کی رات تھی۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ شام ہی سے بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ہوا بھی تیز تھی۔ فیر خوب زور کی بارش ہونے لگی۔ ریسٹ ہاؤس اس روز بالکل خالی تھا۔ ایک ذیل دار ٹھیرا ہوا تھا۔ وہ بھی شام ہونے سے پہلے ہی جا چکا تھا۔ کوئی دس بجے رات کو موٹر میں ایک افسر آیا۔ کوئی وڈا افسر لگتا تھا۔ لہور سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی گھر والی بھی تھی۔ میں اس روز اکیلا ہی تھا۔ خانساماں بیمار تھا۔ رات والا بیرا بھی ڈیوٹی پر نہیں آیا تھا۔ انچارج بھی غائب تھا۔"

"چاچا! مجھے تو آج بھی تو اکیلا ہی نظر آ رہا ہے۔ خانساماں تو ایس۔ ڈی۔ او کے بنگلے پر کام کرتا ہے۔ ایک بیرا چھٹی پر ہے' دوسرے بیرے اور انچارج کہاں چلے گئے؟"

"جب کوئی آتا ہی نہیں تو دو بیروں کی چھٹی کر دی گئی۔ دونوں انچارجوں کا دوسرے محکموں میں تبادلہ کر دیا گیا۔ یہاں کام ہی کون سا ہے۔ سمجھو' اب تو میں اکیلا ہی یہاں رہ گیا ہوں۔" چوکیدار پر ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ دیر تک کھانستا رہا۔ جب کھانس چکا تو بتانے لگا۔ "ہاں' تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ اس رات میں اکیلا ہی ڈیوٹی پر تھا۔ صاحب کے آنے کے بعد میں نے نیچے کے کمرے میں اس کے ٹھیرنے کا بندوبست کر دیا۔ آتش دان میں کوئلے سلگا کر کمرہ خوب گرم کر دیا۔ گیارہ بجے تک میں صاحب کے کمرے کے آس پاس ہی رہا۔ صاحب اور اس کی گھر والی دونوں خوش خوش تھے۔ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔"

لالی چپ بیٹھا چوکیدار کی باتیں سن رہا تھا۔ چوکیدار کہتا رہا۔ "جب صاحب کے کمرے میں خاموشی چھا گئی اور روشنی بھی دھیمی پڑ گئی تو میں اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ صاحب کا ڈریور بھی میرے ساتھ آ گیا۔ اچھا گبھرو جوان تھا' یہ لمبا چوڑا۔ طبیعت کا بھی بہت بھلا تھا۔ چوی پنجی سال سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ میرے ساتھ کوارٹر میں بیٹھا آگ تاپتا رہا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے چائے بھی پلائی۔"



"وہ بنگلے میں نہیں سویا؟"

"چپ کر کے سنتا جا۔" چوکیدار کو لالی کی مداخلت ناگوار گزری۔ اس نے منہ بگاڑ کر اسے جھڑک دیا۔ "کوئی ایک بجا ہوگا۔ ڈریور میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ یہ زینہ دیکھ رہا ہے۔" اس نے لوہے کے اس زینے کی جانب اشارہ کیا جو دو منزلہ عمارت کے عقبی حصے میں باہر سے اوپر کی منزل پر گیا تھا۔ "اس زینے سے میں نے اسے اوپر جاتے دیکھا۔ وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں گیا اور میں نے باہر نکل کر بنگلے کا ایک راونڈ لگایا۔ ابھی تک ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ واپس آکر میں نے کوارٹر کا دروازہ بند کیا اور آگ کے سامنے بیٹھ گیا۔" چوکیدار چند لمحے خاموش رہا' پھر اس نے لالی کو مخاطب کیا۔

"بیبے! سگریٹ ہو تو پلا دے۔"

لالی نے ایک سگریٹ سلگا کر اسے دی اور اپنی سگریٹ سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگانے لگا۔ چوکیدار نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ "اب آگے کی سن۔ ڈریور کے جانے کے بعد میں دیر تک جاگتا رہا۔ جانے کتنی دیر ہو گئی۔ ذرا سی جھپکی آئی تھی کہ اوپر کی منزل پر ڈز' ڈز دو فیر ہوئے۔ میں نکل کر باہر آیا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ مگر ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ گولی کی آواز سن کر خانساماں بھی گھبرا کر اپنے کوارٹر سے نکل آیا۔ اسے بخار تھا' وہ کمبل اوڑھے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہم دونوں ڈرتے ڈرتے بنگلے کے اندر گئے۔ وہاں بالکل خاموشی تھی۔ اوپر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں' لیمپ کی دھیمی دھیمی روشنی میں ڈریور اور صاحب کی گھر والی دونوں خون میں لت پت پڑے ہیں۔"

"دونوں ہی مر گئے؟"

"نہیں۔" چوکیدار نے بتایا۔ "زنانی تو بستر پر پڑی تھی۔ اس کا سر پلنگ سے نیچے جھول رہا تھا۔ وہ مر چکی تھی اور بالکل ننگی تھی۔ میں نے جھیتی نال اس کے بدن پر چدر ڈال دی۔ ڈریور دیوار کے پاس زمین پر پڑا تھا۔ وہ بھی ننگا تھا۔ مگر زندہ تھا۔ دھیرے دھیرے سانس لے رہا تھا۔ گولی اس کے کندھے پر لگی تھی۔ میں نے نیچے سے چدر لا کے اس کا ننگا بدن ڈھک دیا۔ پستول بھی کمرے میں ایک طرف پڑا تھا۔"

"گولی کس نے چلائی تھی؟"

"صاحب نے چلائی تھی۔ ڈریور یہی کہتا تھا۔ ہوا یوں کہ ذرا ہی دیر بعد اسے ہوش آ گیا۔ اس نے پینے کو پانی مانگا۔ میں نے اسے پانی پلایا۔ پوچھا تو اس نے صرف اتنا بتایا کہ صاحب نے کمرے میں گھستے ہی ڈز ڈز فیر کرنے شروع کر دیئے۔"

لالی کھسک کر چوکیدار کے قریب ہو گیا۔ "اور صاب کیا کہتا تھا؟"

"ہم دونوں تھوڑی دیر بعد نیچے آئے۔ صاحب کمرے میں تھا۔ پر دروازہ اندر سے بند تھا۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹایا تب بھی وہ باہر نہ آیا۔ ہم سے اس نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ کمرے کے اندر بیٹھا ٹیلی فون پر کسی سے دھیرے دھیرے باتیں کر رہا تھا۔"

لالی کی سمجھ میں ابھی تک پوری بات نہیں آئی تھی۔ "چاچا' چکر کیا تھا؟"

چوکیدار مسکرا کر بولا۔ "ارے بھئی! گل ایسہ تھی' ڈریور سے صاحب کی گھر والی کی پہلے سے لگ سٹ تھی۔ صاحب تھا پکی عمر کا اور اس کی لگائی تھی جوان پٹھیا۔ میں تو کہتا ہوں دوسری تھی۔ مگر یہ بھی سننے میں آیا کہ گھر والی نہیں تھی' صاحب اسے پھانس کر لایا تھا۔ اسی کے محکمے میں کام کرتی تھی۔ اللہ جانے کون سی بات سچ ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں' پر اتنا ضرور ہے وہ صاحب کے جوڑ کی ہرگز نہیں تھی۔"

"پر وہ اوپر ڈریور کے پاس پہنچی کیسے؟"

"تو بھی کیا بچوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ خود گئی تھی۔ پہلے سے پروگرام بنا رکھا ہوگا۔ ہوا یوں کہ صاحب نے دبا کے شراب پی۔ خانساماں کا کہنا ہے' زنانی نے جان بوجھ کر اسے زیادہ ہی پلا دی۔ خانساماں ٹھیک ہی کہتا ہے۔ تھی بھی وہ بہت فروٹ۔ بانو نام تھا اس کا۔ ایسی آنکھیں مٹکا مٹکا کر باتیں کرتی تھی' میں تجھے کیا بتاؤں۔ بھرپور جوان تھی' اوپر سے رات کو بھی خوب سرخی پوڈر لگائے ہوئے تھی۔"

چوکیدار کو پھر کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ تھوڑی دیر کھانستا رہا' پھر بتانے لگا۔ "صاحب جب نشے میں دھت ہو کر سو گیا تو وہ چپکے سے اٹھی اور ڈریور کے پاس چلی گئی۔ ادھر صاحب کی آنکھ کھل گئی' وہ اسے ڈھونڈتا ہوا اوپر پہنچا۔ کچھ شبہ اسے ضرور تھا۔ تبھی تو بھرا ہوا پستول لے کر گیا تھا۔ دونوں کو ایک ہی بستر پر دیکھا تو غصے سے پاگل ہو گیا۔ گولی چلا کر دونوں کو وہیں ڈھیر کر دیا؟"

"پولیس شولیس تو نہیں آئی؟"

"آئی تھی۔" چوکیدار نے جواب دیا۔ "صاحب نے خود ٹیلی فون کر کے پولیس کو بلایا تھا۔ کمرہ بند کر کے پولیس کے ساتھ اس نے جانے کیا کھسر پھسر کی۔ بس جی رات ہی کو پولیس نے ساری تفتیش بھی پوری کر لی۔ لکھا پڑھی کی۔ تفتیشی رپوٹ تیار ہو گئی تو اس پر مجھ سے اور خانساماں سے بھی انگوٹھا لگوا لیا۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے لاش بھی چلی گئی' زخمی ڈریور بھی گیا اور صاحب بھی اپنی گڈی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ دن چڑھے تھانے دار دو کانسٹیبلوں کے ساتھ آیا۔ اوپر والے کمرے کا



فرش دھلوایا۔ جہاں جہاں خون کے دھبے تھے' تھانے دار نے اپنے سامنے صاف کروائے اور خون میں ڈوبے ہوئے سارے کپڑے اور بستر بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ ریسٹ ہاؤس کے سارے بندوں میں سے کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا۔"

چوکیدار خاموش ہو گیا۔

لالی بھی خاموش بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "پھر کیا ہوا چاچا؟"

"ہونا کیا تھا؟" وہ تلخی سے بولا۔ "پولیس نے سارا معاملہ دبا دیا۔ بعد میں سننے میں آیا۔ گولی' پستول صاف کرتے ہوئے اتفاقیہ چل گئی تھی۔ ڈریور بھی اسپتال میں کچھ دنوں رہ کر ٹھیک ہو گیا۔"

چوکیدار نے ایک بار پھر کھنکار کر گلا صاف کیا۔ زیر لب مسکرایا۔ "گل ایسہ ہے جی! وڈے بندوں کی بات بھی وڈی ہوتی ہے۔ پولیس بھی ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ کنون شنون بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اپنے جیسا کوئی موالی بندہ ہوتا تو کب کا پھانسی پر لٹک چکا ہوتا۔ ہڈیاں بھی اب تک کبر میں گل سڑ کر برابر ہو گئی ہوتیں۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے چاچا۔" لالی نے گہری سانس بھری۔ "کنون بھی تو ایک نہیں۔ وڈوں کا الگ' چھوٹوں کا الگ۔"

چوکیدار لمحے بھر خاموش رہ کر بتانے لگا۔ "۲۵ سال سے اوپر ہو گئے یہاں کام کرتے ہوئے۔ انگریزوں کے زمانے سے ملازم ہوں۔ ان آنکھوں نے یہاں کیا کیا ہوتے نہیں دیکھا۔" اس کے لہجے میں ہلکا ہلکا کرب تھا۔ "پر وہ بھی کیا دن تھے۔ ہر وکھت بھاگ دوڑ مچی رہتی۔ رات کو بھی دن کا سماں ہوتا۔ اب رات آتی ہے تو ریسٹ ہاؤس کبرستان بن جاتا ہے۔ بانو کا خون ہونے کے بعد سے ایسا اجڑا کہ لوگ ادھر آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ نور محمد بیرا ایک پیر بابا کو بھی لایا تھا۔ یہ لمبی داڑھی تھی ان کی۔ انھوں نے گول کمرے میں بیٹھ کر چلہ کھینچا۔ چار کیلیں پڑھ کر دیں۔ ریسٹ ہاؤس کے چاروں کونوں میں وہ کیلیں گاڑی بھی گئیں' پر کچھ بھی نہ ہوا۔"

☆

اندھیرے میں نجیا کی آواز ابھری۔ "بابا! روٹی تیار ہے۔ لے آؤں؟" وہ کوارٹر کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ لالٹین کی دھندلی روشنی میں پرچھائیں کے مانند نظر آ رہی تھی۔ چوکیدار مسکرا کر بولا۔ "لو جی! باتوں میں روٹی کا دھیان ہی نہ رہا۔" اس نے لالی کی جانب دیکھا۔ "تو نے تو دوپہر کی روٹی بھی نہیں کھائی۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اونچی آواز میں نجیا سے کہا۔

"وہیں ٹھیر۔ میں خود روٹی لینے آ رہا ہوں۔"

وہ اپنے کوارٹر کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا اور اندر داخل ہو گیا۔ ریسٹ ہاؤس پر چھائی ہوئی گہری خاموشی میں صرف خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔ رات اب اور سیاہ ہو گئی تھی۔ لالی خاموش بیٹھا رہا۔ البتہ یہ بات ضرور کھٹکی کہ چوکیدار نے نجیا کو آنے نہیں دیا۔ خود ہی کھانا لینے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار لکڑی کی ٹرے میں کھانا لے کر آیا اور چارپائی پر رکھ دیا۔ اس نے لالٹین کی لو اونچی کی اور اسے قریب کے ایک درخت کی شاخ سے لٹکا دیا۔ اس نے لالی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ "اب تو سنبھل کر بیٹھ جا۔ میں پانی اور گلاس لے کر آتا ہوں۔" چوکیدار ایک بار پھر کوارٹر میں گیا۔ واپس آیا تو اس کے ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا المونیم کا جگ تھا' دوسرے میں گلاس دبا تھا۔ جگ اور گلاس اس نے چارپائی کے قریب فرش پر رکھ دیا اور خود چارپائی پر بیٹھ گیا۔

دونوں اطمینان سے کھانا کھانے لگے۔ کھانا مزیدار تھا۔ لالی بھوکا بھی زیادہ تھا۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ مگر چوکیدار کھانا کھاتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ ریسٹ ہاؤس کے بارے میں چھوٹے موٹے واقعات سناتا رہا۔ خانساماں اور بیروں کا تذکرہ کرتا رہا۔ دونوں کھانے سے فارغ ہوئے تو چوکیدار نے کھانے پینے کے برتن اٹھا کر کوارٹر میں پہنچائے اور واپس آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

لالی کے پیکٹ میں ابھی چند سگریٹیں موجود تھیں۔ اس نے اور چوکیدار نے ایک ایک سگریٹ سلگائی اور آہستہ آہستہ کش لگانے لگے۔

دونوں تمباکو نوشی سے لطف اندوز ہو رہے تھے' اسی اثناء میں ایک بار پھر نجیا کی آواز ابھری۔ وہ چوکیدار سے کہہ رہی تھی۔

"بابا! بتی بجھ گئی۔ ماچس دے دے۔"

لالی نے مڑ کر کوارٹر کی جانب دیکھا۔ لالٹین کی ہلکی روشنی میں درختوں کے تلے اسے نجیا نظر آئی۔ وہ اسی طرف آ رہی تھی۔ روشنی اتنی کم تھی کہ لالی اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ مگر قد و قامت دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ بھرے بھرے بدن کی نوجوان لڑکی ہے۔ وہ چند ہی قدم آگے بڑھی ہو گی کہ چوکیدار نے چارپائی پر رکھی ہوئی لالی کی ماچس اٹھائی اور لپک کر نجیا کے پاس پہنچا۔ اسے ماچس دی اور واپس آ گیا۔

نجیا کوارٹر میں چلی گئی۔ کچھ دیر لالی اور چوکیدار چپ بیٹھے سگریٹ کے کش لگاتے رہے' آخر چوکیدار نے پوچھا۔

"کیا کادر آباد جانا ضروری ہے؟ میں تو کہتا ہوں سیدھا ڈیوٹی پر اوکاڑے چلے جا۔"



"اوکاڑے بھی جاؤں گا پر کادر آباد دو روز ٹھہر کر جاؤں گا۔ ایک دوست سے ملنا ہے' وہ میرا
نتظار کر رہا ہو گا۔"

"سیدھا اوکاڑے جاتا تو میرا ایک کام کر دیتا۔ اوکاڑے کے نزدیک ہی چک ٦۔بی ہے' وہاں۔"
دکیدار نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ رات کے سناٹے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اپنی
ت ادھوری چھوڑ دی' جھٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ درخت کی شاخ سے لٹکتی ہوئی لالٹین اتار کر ہاتھ میں
نبھالی اور عمارت کی جانب تیزی سے بڑھا۔ وہ عمارت کے اندر چلا گیا۔

ذرا دیر بعد چوکیدار کی آواز ابھری۔ مگر اس قدر دھیمی تھی کہ لالی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ
موش بیٹھا رہا۔ چند منٹ بعد چوکیدار واپس آیا تو لالی نے پوچھا۔

"کس کا ٹیلیفون تھا؟"

"خانساماں تھا۔" چوکیدار نے لالٹین نیچے رکھی اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ایس' ڈی' او
حب کے بنگلے سے بول رہا تھا۔"

"کیا کہتا تھا؟"

"وہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں یہاں پہنچ جائے گا۔ پی ڈبلیو ڈی کا کوئی افسر ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے آرہا
،۔ خانساماں بھی اس کے ساتھ ہی آئے گا۔ ابھی تو وہ ایس' ڈی' او کے بنگلے پر ہے۔"

لالی یہ سنتے ہی پریشان ہو گیا۔ اس نے خود کو سنبھالا' دبی زبان سے پوچھا۔ "خانساماں تو اپنے ہی
ٹر میں ٹھہرے گا نا؟"

"ٹھہرے گا تو وہ اپنے ہی کواٹر میں۔ تو بھی اسی کے ساتھ ٹھہر جانا۔" پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "پر
، کے پاس منجی تو ایک ہی ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "بیرے کا کواٹر بند ہے۔ چابی بھی
ﮯ ساتھ لے گیا ہے۔" چوکیدار کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

"چاچا! تو خامخا پریشان نہ ہو۔ اب مجھے جانے دے۔ روٹی بھی میں نے کھا لی اور رات بھی زیادہ
، گزری۔" لالی نے لالٹین کی جانب ہاتھ بڑھا کر گھڑی دیکھی۔ "ابھی تو نو بھی نہیں بجے۔
یوں کی رات ہے۔ میں......"

ہوکیدار اس کی بات کاٹ کر کسی قدر تیکھے لہجے میں بولا۔ "تو بار بار جانے کی گل کیوں کرتا ہے؟
رات بھر ہی تو یہاں ٹھہرنا ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں کہیں بھی رات گزار سکتا ہے۔"

"تو برا مناتا ہے تو نہیں جاؤں گا۔" لالی نے چوکیدار کے لہجے کی تلخی سے مرعوب ہو کر کہا۔
ے میں نے تیری پریشانی کے خیال سے ایسا سوچا تھا۔"

"ایسا کر' تو اس منجی پر سو جا۔ میں ادھر لیٹ جاؤں گا۔" اس نے بنگلے کے عقبی حصے کے برآمدے کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "صاحب کے آنے کے بعد آدھی سے زیادہ رات تو اسی کی اردلی میں کٹ جائے گی۔ ویسے مجھے رات کو نیند ہی کہاں آتی ہے۔ سینکڑوں راتیں جاگتے گزر گئیں۔ ایک رات اور جاگتے گزر جائے گی تو کیا ہو جائے گا۔ ویسے برآمدے کا فرش صاف ستھرا ہے۔ روزانہ سویرے پورے ریسٹ ہاؤس کی صفائی ہوتی ہے۔"

"یہ نہیں ہوگا چاچا! میں منجی پر سوؤں اور تو رات بھر جاگتا رہے یا برآمدے کے فرش پر سوئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

چوکیدار چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ "ویسے تو ریسٹ ہاؤس میں کئی کمرے ہیں۔ صاحب کے آنے کے بعد بھی خالی رہیں گے۔ تو کسی میں بھی رات بھر کے لیے ٹھیر سکتا ہے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کو رکا۔ "پر صاحب کو پتہ چل گیا تو جانے وہ کیا سوچے۔ یہ بھی پتہ نہیں' طبیعت کا کیسا ہے۔"

"میرا کہا مان تو مجھے جانے دے۔" لالی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "خاماخا ضد نہ کر۔"

"ضد کی بات نہیں۔ رات کے سفر کے لیے یہ رستہ ٹھیک نہیں۔ ادھر ڈکیتی کی کئی وارداتیں ہو چکی ہیں۔ پچھلے ہی ہفتے ریلوے کراسنگ پر ڈاکوؤں نے لاری لوٹ لی تھی۔ سنا ہے' بعد میں پولیس کا ان سے ٹاکرہ بھی ہوا۔ ایک ڈاکو مارا گیا۔ پولسئے بھی زخمی ہوئے پر ابھی تک پولیس کسی کو پکڑ نہیں سکی۔"

"سنا تو میں نے بھی ہے۔ پر اپنے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ ویسے میں ڈرنے والا نہیں۔" لالی چند لمحے خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اس نے گردن اونچی کی اور سینہ تان کر مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔ "تو کہے تو میں اوپر والے اس کمرے میں جا کر لیٹ جاؤں جس میں بانو کا خون ہوا تھا؟"

چوکیدار ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ "کمرہ تو وہ فسٹ کلاس ہے۔ ہوا بھی خوب آتی ہے۔" اسی وقت اوپر کھڑکی کے پیچھے جلتا ہوا لیمپ زور سے بھڑکا اور بجھ گیا۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ درختوں تلے خشک پتے آہستہ آہستہ کھڑکھڑائے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی دبے دبے قدموں چل رہا ہو۔ چوکیدار زور سے کھنکارا۔ اس نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔

"نہیں جی! اس کمرے میں تیرا سونا ٹھیک نہیں۔"

"چاچا! تجھے اس کمرے میں کبھی ڈر لگا؟"

"میری بات چھوڑ۔" چوکیدار بے نیازی سے بولا۔ "میں کیا' میری نجیا تک نہیں ڈرتی۔ آج



شام اس کمرے کی صفائی کر رہی تھی اور میں تو روز اوپر کی منزل پر لیمپ جلانے جاتا ہوں۔ کچھ پہلے تیرے سامنے لیمپ جلانے گیا تھا۔"

"تب تو میں اسی کمرے میں جا کر سوؤں گا۔" لالی کھل کر مسکرایا۔ "ارے چاچا! ڈرنا شرنا کیا۔ ۔ زنانی ہی سے تو نمٹنا ہے اور زنانی کا معاملہ یہ ہے' ذرا ہاتھ لگا اور وہ نئی گھوڑی کی طرح بدک کر باتی ہے۔"

"کہتے ہیں چڑیل سے کبھی ٹاکرا ہو جائے تو اسے کابو کرنے کا ایک ہی گر ہے اور وہ یہ ہے' جھٹ ، کی چوٹی پکڑ لو۔ فیر تو وہ ہاتھ جوڑے گی' پیر پڑے گی۔"

"یہ تو زبردست ترکیب بتائی۔" لالی ہنس کر بولا۔ "اب تو میں اسی کمرے میں رات گزاروں ."

"ایک گل اور بھی ہے۔ اس کمرے میں بانو کی واردات کے بعد سے نہ کوئی مہمان جاتا ہے نہ رتا ہے۔ ویسے میں کسی کو ادھر جانے ہی نہ دوں گا اور ادھر جائے گا بھی کون۔ نیچے کی منزل کے ے کمرے خالی ہیں۔ لمبے چوڑے بھی ہیں۔ ان میں فرنیچر بھی زیادہ عمدہ لگا ہے۔"

"تو فیر یہ طے ہو گیا' میں اسی کمرے میں سوؤں گا۔" لالی نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے نیند بھی ۃ لگ رہی ہے۔"

لالی چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چوکیدار بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے لالٹین اٹھائی۔ دونوں ٹ ہاؤس کے عقبی حصے کی جانب بڑھے۔ لالی نے قریب جا کر دیکھا کہ برآمدے سے ذرا ہی لے آہنی زینہ ہے۔ اس نے گردن اونچی کی۔ زینے کے آخری سرے پر نظر ڈالی۔ کمرے کا بند ازہ دھندلی روشنی میں اس کے سامنے تھا۔ راستہ باہر سے تھا اور کمرے کی کھڑکی کے قریب سے ، کے گھنے درخت کی موٹی سی ڈال اس طرح گزرتی تھی کہ خطرے کے وقت وہ آسانی سے اس ذریعے ریسٹ ہاؤس کی چاردیواری سے باہر جا سکتا تھا۔ اس پہلو سے لالی کو وہ کمرہ زیادہ محفوظ مناسب لگا۔

دونوں آہستہ آہستہ زینے کے پاس پہنچ گئے۔ چوکیدار زینے پر چڑھنے لگا۔ لالی بھی اس کے پیچھے ، چلا۔

زینہ طے کر کے دونوں اوپر پہنچے۔ چوکیدار نے دروازہ کھولا۔ دونوں اندر گئے۔ کمرہ صاف ستھرا دیواروں پر اجلی قلعی تھی۔ کھڑکی کے برابر پلنگ تھا۔ اس پر اجلا بستر بچھا تھا۔ پلنگ سے ذرا ہٹ یز اور دو کرسیاں تھیں۔ میز پر لیمپ رکھا تھا۔ چوکیدار نے ماچس جلا کر لیمپ روشن کیا اور کھڑکی

کے پٹ کھول دیئے۔ کھڑکی کھلتے ہی کمرے میں ہوا کے نرم نرم جھونکے آنے لگے۔ چوکیدار نے کہا۔

"اب تو سو جا۔ تجھے سویرے اٹھنا بھی ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے فوراً آواز دینا۔ میں تو جاگ ہی رہا ہوں۔ جھٹ آجاؤں گا۔ گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔"

"فکر نہ کر چاچا! مجھے ڈر خوف نہیں لگتا۔"

"لگتا تو جی دار اور زور آور ہے۔ صاحب لوگوں کی طرح نہیں۔ وہ تو اپنے سائے سے بھی ڈر جاتے ہیں۔" اس نے نظر بھر کر لالی کا چہرہ دیکھا۔ "سچ پوچھ تو میں خود چاہتا تھا' تیرے جیسا کوئی زور آور جوان اس کمرے میں ٹھیرے۔ یہ بھوت پریت کا چکر ختم ہو اور صاحب لوگوں کا آنا جانا پہلے کی طرح شروع ہو۔"

چوکیدار کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جب سے یہ چکر شروع ہوا ہے' اپنا تو سمجھو کباڑا ہو گیا۔ صاحب لوگ آتے تھے تو بخشش اور انعام دے کر جاتے تھے۔ مزے سے گزر بسر ہوتی تھی۔ اب تو سوکھی تنخواہ پر گزارہ ہے۔ پیٹ بھرنا مشکل ہے۔ بچیا جوان ہو گئی ہے۔ رشتہ بھی طے ہو چکا ہے۔ پیسہ ہو تو کل اس کا ویاہ کر دوں۔"

لالی نے جیب سے دس دس روپے کے دو نوٹ نکالے اور چوکیدار کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لے یہ رکھ لے چاچا!"

چوکیدار نے انکار کیا۔ "تو میری بات کا غلط مطلب سمجھا۔ میں تجھ سے کچھ نہیں لوں گا۔ تو میرے مہمان کی طرح ہے۔"

"دیکھ چاچا! نہ یہ بخشش ہے نہ انعام۔ ویسے بھی میں نہ افسر ہوں نہ صاحب جو تجھے بخشش یا انعام دوں۔ میری خوشی ہے تو اسے رکھ لے۔ انکار نہ کر۔"

چوکیدار نے پھر انکار کیا۔ مگر لالی نے اصرار کر کے اسے نوٹ دے ہی دیئے۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار چلا گیا۔

☆

لالی نے دروازہ بند کیا' لیمپ دھیما کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ مگر سویا نہیں۔ اس کمرے میں وہ سونے کے لیے آیا بھی نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اور خالی ہاتھ بھی جانا نہ چاہتا تھا۔ رحیم داد کے لیے اس نے جو کپڑے گٹھری میں باندھ کر رکھے تھے' وہ گٹھری کے ساتھ میاں حیات محمد وٹو کے بنگلے میں رہ گئے تھے۔



اس نے کمرے میں آنے سے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ کچھ نہیں تو ایک چادر ہی اٹھا کر لے جائے گا۔ اس سے رحیم داد کا کچھ تو کام چل ہی جاتا۔ مگر اب اسے ایک چھوڑ' دو چادریں مل گئیں۔ ایک بستر پر بچھی تھی' دوسری اوڑھنے کے لیے تھی۔

لالی بستر پر خاموش لیٹا رحیم داد کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ویران' ٹیلوں اور ٹبوں کے درمیان بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر اب تک جیل کی وردی تھی اور جب تک یہ وردی موجود تھی' نہ وہ باہر نکل سکتا تھا' نہ کسی سے مل سکتا تھا اور نہ لاری یا ٹرین سے سفر کر سکتا تھا۔ لالی کو سب سے زیادہ فکر اسی بات کی تھی۔ وہ شرمندہ بھی تھا کہ اس نے تو اپنی جیل کی وردی اتار پھینکی تھی' مگر رحیم داد کو اس سے نجات نہ دلا سکا۔ چلتے وقت رحیم داد نے دبی زبان سے گلہ بھی کیا تھا۔ اس کا گلہ بھی بجا تھا۔ اسے جیل سے فرار ہونے پر لالی ہی نے آمادہ کیا تھا۔ اسے رہ رہ کر یاد آ رہا تھا کہ رحیم داد بڑی مشکل سے فرار ہونے پر رضامند ہوا تھا۔ وہ لالی کی طرح عادی مجرم نہیں تھا۔ لہٰذا ڈرتا بھی تھا۔

لالی بستر پر لیٹا یہی سوچ رہا تھا کہ میز پر آہستہ سے آہٹ ہوئی۔ کھڑکی کے باہر درخت کی ڈال زور سے ہلی۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ لیمپ کی لو بھڑکی۔ سامنے دیوار پر پرچھائیں لہرائی۔ لالی چونک پڑا۔ اس نے گردن اونچی کی۔ ادھر ادھر دیکھا' وہاں کوئی نہیں تھا۔ دروازہ بند تھا۔ چٹخنی اس نے اپنے ہاتھ سے لگائی تھی۔ مگر اسے تسلی نہ ہوئی۔ بستر سے اترا' میز دیکھی۔ میز ٹھیک ٹھاک تھی۔ لیمپ بھی اپنی جگہ تھا اور روشن بھی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچا اور اس کی چوکھٹ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

رات جاگ رہی تھی۔ آسمان پر ستاروں کے کنول روشن تھے۔ ہوا میں تیزی تھی۔ لالی نے کھڑکی کے برابر سے گزرتی ہوئی پیپل کے درخت کی ڈال دیکھی۔ ہاتھ بڑھا کر اسے مضبوطی سے پکڑا۔ دھیرے دھیرے ہلایا۔ ڈال خوب موٹی اور مضبوط تھی۔ اس پر وہ آسانی سے چڑھ سکتا تھا اور ریسٹ ہاؤس کی چار دیواری سے باہر بھی جا سکتا تھا۔ چار دیواری کے اس پار لاگھا تھا جس میں ریت کے اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان کہیں کہیں کھیت تھے۔ دور تک پھیلا ہوا یہ ریتلا اور ناہموار میدان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔

اس نے کھڑکی کے پاس کھڑے کھڑے ریسٹ ہاؤس سے نکل بھاگنے کا فیصلہ کیا۔ اب وہ زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی پہر رات گزری تھی اور اسٹیشن پہنچنے کا راستہ چوکیدار نے بتا ہی دیا تھا۔ قادر آباد پہنچ کر وہ ریل کی پٹڑی عبور کر کے سورج نکلنے سے پہلے پہلے اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ

سکتا تھا۔

وہ کھڑکی سے ہٹ کر بستر کے قریب آیا اور بستر کی دونوں چادروں میں جوتے لپیٹ کر گٹھری باندھنے کا ارادہ کرنے لگا۔ اسی اثناء میں باہر سے چوکیدار کے کھانسنے کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی زمین پر لاٹھی بجنے کی آہٹ بھی ہوئی۔ آہٹ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ چوکیدار اسی طرف آرہا تھا۔ خشک پتوں پر اس کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ کھڑکی کے عین نیچے پہنچ کر چاپ بند ہوگئی۔ لالٹین کی روشنی لالی کو کھڑکی کے باہر دکھائی دے رہی تھی۔

ذرا ہی دیر بعد چوکیدار زور سے کھنکارا۔ اس نے کھڑکی کے نیچے سے اونچی آواز میں لالی سے پوچھا۔

"ابے! جاگ رہا ہے؟"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بالکل خاموش رہا۔ چوکیدار ذرا دیر ٹھہر کر آگے بڑھ گیا۔ خشک پتوں پر اس کی چاپ رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی۔ لالی ایک بار پھر کھڑکی کے قریب پہنچا۔ گردن بڑھا کر دیکھا' درختوں کے نیچے چوکیدار آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی اور دوسرے ہاتھ میں دبی ہوئی لاٹھی زمین سے ٹکرا کر آہٹ پیدا کر رہا تھا۔ اس کے ہم راہ کوئی اور بھی تھا۔ وہ نجیا تھی۔ اس کی کلائیوں میں پڑی ہوئی چوڑیاں چلتے وقت آہستہ آہستہ بج رہی تھیں۔

دونوں مڑ کر اندھیرے میں غائب ہوگئے۔ روشنی کا زرد زرد دھبا کچھ دیر تک نظر آتا رہا اور جب وہ بھی دھندلا پڑ گیا تو لالی بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں' مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چوکیدار کے چارپائی پر لیٹ جانے کا انتظار کر رہا تھا جس کی کھانسی پھاٹک کے پاس بار بار سنائی پڑ رہی تھی۔ کھڑکی کے راستے ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے۔

لالی کی آنکھیں غنودگی سے بار بار بند ہو جاتیں۔ آخر نیند کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ اس کی آنکھیں بند ہو کر کھل نہ سکیں۔ وہ گہری نیند سوگیا۔

☆

کمرے میں تیز خوشبو پھیلی تھی۔ لالی غنودگی کے عالم میں تھا۔ ایسا محسوس ہوا' کوئی سرہانے کھڑا آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہا ہے۔

اب وہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور سسکیاں سن رہا تھا۔ سسکیوں کے ساتھ رک رک کر چوڑیاں بھی بجتیں۔ ذرا دیر تک وہ سکتے کے عالم میں چپ لیٹا رہا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے



لگا۔ وہ اچھل کر بستر پر بیٹھ گیا۔ لیمپ کی دھیمی دھیمی روشنی میں اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ میز سے ذرا ہٹ کر دیوار کے پاس ایک نوجوان عورت کھڑی ہے۔ وہ گردن جھکائے رک رک کر سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کے بال بکھر کر چہرے پر آگئے تھے۔ وہ خوب سنگھار کیے ہوئے تھی۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ ہونٹوں پر سرخی تھی۔ لباس بھی بھڑکیلا اور خوب چست تھا۔ اتنا چست کہ اس کی بھرپور جوانی لباس سے بے محابا جھانک رہی تھی۔ وہ تیز خوشبو میں اس طرح بسی ہوئی تھی کہ پورا کمرہ مہک رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کے لالی کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ لالی چند لمحے اسے گھورتا رہا' پھر پلنگ سے کود کر نیچے آگیا۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بالکل خاموش کھڑے تھے۔

کھڑکی کے باہر پیپل کی ڈال ہوا کے تیز جھونکوں سے جھول رہی تھی۔ خشک پتے اس طرح کھڑکھڑاتے گویا آہستہ آہستہ تالیاں بجا رہے ہوں۔ لالی چند لمحے چپ چاپ کھڑا رہا پھر دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ عورت نے اسے اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو دیوار سے لگ کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ نہ اس نے نظریں نیچی کیں نہ زبان سے کچھ کہا۔ برابر اسے گہری نظروں سے دیکھتی رہی اور ہولے ہولے کھسکتی رہی۔ وہ مڑ کر دروازے کی جانب لپکی۔ لیکن لالی نے اسے دروازے تک پہنچنے کا موقع نہیں دیا۔

وہ تیزی سے جھپٹا اور ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کی چوٹی پکڑلی۔ ڈپٹ کر پوچھا۔ "کون ہے تو؟"

وہ بلبلا کر بولی۔ "میری چوٹی تو چھوڑ۔"

لالی نے چوٹی چھوڑنے کے بجائے اور زور سے مروڑ دی۔ عورت نے پلٹ کر بے بسی سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ یکایک تیز جھونکا آیا۔ لیمپ زور سے بھڑکا اور بجھ گیا۔ کمرے میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔ باہر درختوں میں الو کے زور زور سے بولنے کی آواز رات کی خاموشی میں ابھری۔ لالی کسی ان جانے خوف سے کپکپا کے رہ گیا۔ مگر وہ اس کی چوٹی مضبوطی سے پکڑے رہا۔ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ آخر لالی نے پوچھا۔

"تو بانو ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

لالی نے اس کی چوٹی کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور ایک بار پھر پوچھا۔ "بولتی کیوں نہیں۔ تو بانو ہے نا؟"

"کون بانو؟" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "میں کسی بانو وانو کو نہیں جانتی۔"

"سچ سچ بتا کون ہے تو؟"

وہ تکلیف سے منہ بگاڑ کر بولی۔ "کہہ تو دیا' میں بانو نہیں ہوں۔"

لالی مخمصے میں پڑ گیا۔ چند لمحے خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔ "تو چوکیدار کی بیٹی نجیا تو نہیں ہے؟"

"میں کیوں ہونے لگی چوکیدار کی بیٹی۔"

لالی اور زیادہ الجھن میں پڑ گیا۔ اس دفعہ اس نے غصے سے آنکھیں نکال کر کہا۔ "ٹھیک ٹھیک بتا۔ زیادہ کڑ کڑ کی تو لگاؤں گا ایک چپیڑ۔" اس نے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

"بتاتی ہوں' بتاتی ہوں۔"

لالی اس کی چوٹی ہلا کر بولا۔ "تو فیر بتانا۔"

اس نے منہ بسور کر کہا۔ "میں زرینہ ہوں۔ صفدر علی اور سیئر کی بیوی۔" وہ لمحے بھر خاموش رہ کر عاجزی سے بولی۔ "اب تو میری چوٹی چھوڑ دو۔" لالی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے؟ وہ اس کی چوٹی گھوڑے کی لگام کی طرح کھینچے ہوئے چپ کھڑا رہا۔ مگر وہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہی۔ اس نے گردن ہلائی اور جھنجلا کر بولی۔

"دیکھو! میری چوٹی چھوڑ دو' نہیں تو میں چیخنے لگوں گی۔"

لالی اس کی دھمکی سے ڈر گیا۔ اس نے چوٹی چھوڑ دی۔ مگر وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ "تو یہاں پہنچی کیسے؟ دروازہ تو بند ہے۔" لالی نے اس دروازے کی جانب اشارہ کیا جو باہر لوہے کے زینے پر کھلتا تھا۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔

"تو کھڑکی کے رستے تو اندر نہیں آئی؟"

"کچھ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ میں کھڑکی کے رستے کیسے اندر آ سکتی ہوں۔" اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اور یہ دروازہ نہیں ہے۔" زرینہ نے کمرے کے دوسرے دروازے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "میں اسی دروازے سے سیڑھیاں چڑھ کر نیچے سے آئی ہوں۔ توبہ توبہ' کتنی سیڑھیاں ہیں۔ چڑھتے چڑھتے میرا تو سانس پھول گیا۔" اب وہ کسی قدر اطمینان سے بول رہی تھی۔

لالی نے اس کی بات سن کر کچھ نہیں کہا۔ میز کی جانب بڑھا۔ قریب جا کر اس نے لیمپ روشن کیا۔ زرینہ کمرے سے باہر جانے کے ارادے سے دروازے کی جانب بڑھی۔ لالی نے ٹوکا۔ "ٹھیر جا۔ یہ تو بتا' تو ریسٹ ہاؤس میں آئی کیسے؟"

"سرکاری جیپ میں آئی تھی۔ صفدر علی لے کر یہاں آیا تھا۔ مجھے تو یہاں آئے ہوئے بھی آدھے گھنٹے سے اوپر ہو گیا۔ تم کو خبر ہی نہیں۔"



"تیرا کھسم صفدر علی کہاں ہے؟"

"وہ جیپ میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔"

لالی پھر الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے تیکھی نظروں سے زرینہ کو دیکھا اور ڈپٹ کر بولا۔ "صاف ان بتا۔ تیری باتیں سمجھ نہیں آئیں۔ پہلی بات تو یہ ہے' اس کمرے میں کیوں آئی؟"

"میں تو یہاں چھپنے کے لیے آئی تھی۔" وہ آنکھیں مٹکا کر الھڑپن سے بولی۔ تھی بھی الھڑ۔ اس ی عمر سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ شکل و صورت معمولی تھی مگر اس کی جوانی سمندر کا جوار بھاٹا ی۔ انگ انگ سے ابل رہی تھی۔

اس کی بات سن کر لالی اور چکرایا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "یہاں چھپنے آئی تھی۔ مگر یوں؟"

"کچھ ہے ایسی بات۔" زرینہ نے گول مول جواب دیا۔

لالی نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا اور ہاتھ بڑھا کر پھر اس کی چوٹی پکڑ لی۔ "ٹھیک ٹھیک ا۔"

"ارے ارے' میری چوٹی تو چھوڑ۔" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "وہ' وہ بڑا انجینئر ہے۔" زرینہ اپنی بات' کہتے کہتے رک گئی۔

لالی نے حیرت سے پوچھا۔ "کون انجینئر؟" اس نے زرینہ کی چوٹی چھوڑ دی۔

"وہی جو یہاں ٹھیرا ہوا ہے۔" زرینہ نے جواب دیا۔ "وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے یہاں آ گیا ا۔" اس نے ذرا رک کر بتایا۔ "صفدر کے ساتھ وہ بھی جیپ میں گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں واپس جائے گا۔"

"صفدر واپس نہیں آئے گا؟"

وہ نظریں جھکا کر آہستہ سے بولی۔ "صفدر تو گھر گیا ہے۔ سویرے آئے گا۔ مجھ سے یہی کہہ کر گیا ہے۔"

بات اب لالی کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگی تھی۔ اس نے غور سے زرینہ کو دیکھا۔ "تیرا کھسم کلا تو نہیں چلاتا؟"

"ایسی بات نہیں ہے جی۔ ہے تو وہ اوور سیئر ہی۔" وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ "بات یہ ہے۔ ایک چکر میں آ گیا ہے۔ دو مہینے سے معطل ہے۔ اس کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔" وہ ھجکی۔ "سڑک کے ٹھیکے میں صفدر نے ایک ٹھیکیدار سے رشوت لی تھی۔ کسی نے اوپر شکایت لگا

دی۔ اب بڑا انجینئر انکوائری کرنے آیا ہے۔ جو رپورٹ وہ دے گا' اسی پر صفدر کے کیس کا فیصلہ ہوگا۔"

"اب اصلی گل سمجھ آئی۔ صفدر نے تجھے رشوت میں انجینئر کو پیش کیا ہے۔ تیرا کھسم ہے بہت تیز۔ رشوت لینا بھی جانتا ہے اور رشوت دے کر بچ نکلنے کا رستہ بھی جانتا ہے۔" اس نے مسکرا کر زرینہ کو دیکھا۔ "رشوت بھی اس نے تکڑی دی ہے۔ جبھی تو اتنی بن ٹھن کر آئی ہے۔"

"توبہ کرو جی۔" وہ بے باکی سے بولی۔ "انجینئر کو دیکھ کر تو مجھے گھن آگئی۔ وہ کوئی آدمی ہے' بالکل گینڈا لگتا ہے۔ سر بھی گنجا ہے۔ روشنی میں تاملوٹ کی طرح چمکتا ہے۔" وہ کھل کھلا کر ہنسی' مگر جلد ہی اس کا شگفتہ چہرہ بجھ گیا۔ "صفدر باہر گیا تو انجینئر کمرے میں میرے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ لگا مجھے دبوچنے۔ زبردستی میرے ہونٹ چوم لیے۔ اس کے منہ سے ایسی کڑوی کڑوی بو نکلی۔ اخ تھو۔" اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ "انجینئر کے جانے کے بعد مجھے اتنا ڈر لگا کہ رونا آگیا۔ میں روتی ہوئی چھپنے کے لیے یہاں آگئی۔"

لالی نے بے رخی سے کہا۔ "اب روتی کیوں ہے؟ گھر سے تو خوشی خوشی بن ٹھن کر آگئی۔ اب کہتی ہے ڈر لگتا ہے۔" اس نے غصے سے منہ بگاڑا۔ "ایسا ہی ڈر تھا تو گھر سے نکلی ہی کیوں؟"

"کرتی بھی کیا۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "صفدر میرے آگے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ رو رو کر کہنے لگا' زرینہ! مجھے بچالے۔ نوکری بھی جائے گی اور جیل بھی ہوجائے گی۔ تم ہی بتاؤ' جب اپنا آدمی اس طرح رو رو کر گڑگڑائے تو میں کیسے انکار کرتی۔ ابھی تو ہمارے بیاہ کو چھے مہینے بھی نہیں ہوئے' یہ مصیبت پھٹ پڑی۔"

"تو فیر بچالے اپنے کھسم کو اس مصیبت سے۔ نخرا کیوں کرتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں اس کی بات مان لے۔ فیر وہ جیل بھی نہیں جائے گا' نوکری بھی بچ جائے گی اور اب تو چالو ہو ہی گئی۔ اپنے کھسم کو ترقی دلوا کر انجینئر بھی لگوا دے گی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"نا جی نا۔ ایسی بات نہ کرو۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "تم مجھے انجینئر سے بچالو۔"

"میں کوئی تھانیدار لگا ہوں جو تجھے بچالوں۔" لالی نے نہایت بے مروتی سے کہا۔ "جا' جا کر انجینئر کا دل خوش کرا اور اپنے کھسم کو بچا۔ مجھے سونے دے۔"

زرینہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا' منہ لٹکائے کھڑی رہی۔ اس کے چہرے کی چمک دمک ماند پڑ گئی۔ لالی بھی چپ چاپ کھڑا رہا۔ زرا دیر تک کمرے میں سکوت رہا۔ زرینہ نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا اور افسردہ لہجے میں بولی۔



"تم مجھے نہیں بچاسکتے؟"

لالی نے اس دفعہ اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "کچھ تو مغز سے کام لے۔ مان لے کہ' آج میں نے تجھے بچالیا۔ کل پھر تیرا کھسم تیرے پیر پکڑ کر روئے گا۔ تو فیر ایسے ہی بن ٹھن کر چلی آئے گی۔ نہیں آئے گی تو انجینئر تیرے کھسم کے خلاف رپورٹ دے دے گا۔ اسے جیل ہوجائے گی اور نوکری بھی جائے گی۔ میں تجھے کہاں کہاں بچاؤں گا۔ کب تک ہتھیلی لگاؤں گا۔"

"تم مجھے آج بچالو۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" اس نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی' الھڑپن سے بولی۔ "میں تمہارے پلنگ کے نیچے چھپ جاؤں گی۔ انجینئر یہاں آکر تم سے پوچھے تو کہہ دینا' کون زرینہ' کیسی زرینہ؟ یہاں کوئی زرینہ ورینہ نہیں آئی۔ وہ تمہارا کیا بگاڑ لے گا؟"

"نہیں جی' میں ایسے چکروں میں نہیں پڑتا۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ "اب یہاں سے جا۔"

لالی چاہتا تھا کہ زرینہ چلی جائے تاکہ وہ چادریں اٹھا کر جلد سے جلد بنگلے سے نکل سکے۔ اب وہاں مزید ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

مگر زرینہ اس کا صاف جواب سن کر بھی کمرے سے نہیں گئی۔ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ زرا دیر بعد کمرے کی خاموشی میں اس کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔ وہ رو رہی تھی۔ لالی اسے روتا دیکھ کر سخت پریشان ہوا۔ گھبرا کر بولا۔

"ارے ارے تو رونے لگی۔"

زرینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کی سسکیاں بند ہوگئی تھیں۔ لالی مسکرا کر بولا۔ "معلوم ہوتا ہے' سینما بہت دیکھتی ہے۔ دیکھتی ہے نا؟"

"دیکھتی ہوں' ضرور دیکھتی ہوں۔"

"جبھی تو ایسی ایکٹنگ کرلیتی ہے۔"

زرینہ جلدی جلدی آنسو پونچھ کر گویا ہوئی۔ "تو میں پلنگ تلے چھپ جاؤں۔ انجینئر اب آتا ہی ہوگا۔"

"ایسا کر' بستر پر لیٹ جا۔ میں منجی کے نیچے دبک جاؤں گا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"اس سے یہ ہوگا۔ جب انجینئر تجھ سے چھیڑ چھاڑ کرے گا تو میں نیچے سے نکل آؤں گا اور تھانے دار بن کر کھڑا ہوجاؤں گا۔ ٹھیک ہے نا۔"

"نہیں جی' یہ ٹھیک نہیں۔ کچھ اور سوچنا ہوگا۔"

لالی نے چند لمحے خاموش رہ کر سنجیدگی سے پوچھا۔ "سچ مچ انجینئر سے بچنا چاہتی ہے؟"

"کہہ تو رہی ہوں' اور کیسے کہوں۔" زرینہ نے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔ "بس تم مجھے اپنے پلنگ تلے چھپ جانے دو۔"

"کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہے۔" لالی نے اسے ڈانٹا' ذرا دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا پھر بولا۔ "چھپنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا کر۔ نیچے جا اور بنگلے سے نکل کر باہر برآمدے میں کھڑی ہو جا۔ جب انجینئر واپس آئے تو رونا شروع کر دینا۔ وہ پوچھے کیوں روتی ہے؟ کہنا مجھے بنگلے میں ڈر لگتا ہے۔ میں یہاں نہیں ٹھیروں گی۔ یہاں ایک چڑیل ہے۔ میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا۔ کبھی روتی تھی' کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستی تھی۔ کہتی تھی' میرا نام بانو ہے۔ مجھے اوپر والے کمرے میں کتل کر دیا گیا۔"

"وہ میری بات کا یقین مان لے گا؟"

"کیوں نہیں مانے گا؟ بانو کو اسی کمرے میں کتل کیا گیا تھا۔ اب یہاں اس کی روح بھٹکتی پھرتی ہے۔ اسی لیے تو میں نے تجھ سے پوچھا تھا' کیا تو بانو ہے؟"

"ہائے۔" وہ منہ پھاڑ کر بولی۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"بالکل سچ ہے۔ چوکیدار تو موجود ہی ہے جس کے سامنے بانو کا کتل ہوا تھا۔ میں نے تجھے بچنے کی ترکیب بتا دی۔ ایکٹنگ تو کر ہی لیتی ہے۔ اس طرح رونا اور چیخنا چلانا کہ انجینئر بھی ڈر جائے۔ سمجھ لے' تیرا کام بن گیا۔ اس طرح تیرے کھسم پر بھی بات نہیں آئے گی۔ اب جا' مجھے سونے دے۔"

وہ بستر کی جانب بڑھا۔

زرینہ نے ٹوکا۔ "میری بات تو سنو۔" لالی رک گیا۔ زرینہ نے سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ "تم نے ایسی بات سنائی کہ مجھے ڈر لگنے لگا۔ میں سیڑھیوں سے نیچے کیسے جاؤں گی۔ زینے میں تو بالکل اندھیرا ہے۔"

"ڈر کیوں رہی ہے؟" لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تو تو خوب تکڑی ہے۔ اندھیرے میں بانو سے مڈبھڑ ہو جائے تو جھٹ اس کی چوٹی پکڑ لینا' جیسے میں نے تیری چوٹی پکڑی تھی۔ چوٹی پکڑتے ہی کیسی میرے کابو آگئی تھی۔ ایسے ہی اسے کابو کر لینا۔"

"نہیں جی' یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔" وہ بدستور خوف زدہ تھی۔ "میں اکیلی نہیں جاؤں گی۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔"



لالی اب سخت بیزار ہو گیا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ ریسٹ ہاؤس سے جلد از جلد نکل بھاگنا چاہتا ا۔ مگر زرینہ اس کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو گئی تھی۔ اس نے بگڑ کر کہا۔ "خاماخا نکھرا نہ ھا۔" اس نے غصے سے ہاتھ اٹھایا۔

"جاتی ہے یا لگاؤں ایک چپیڑ۔"

"دیکھو ہاتھ نہ چلانا۔" وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "اتنی ہمت تو کبھی صفدر کو بھی نہیں ہوئی۔"

"وہ تو دلا ہے۔ اس کی بات مت کر۔"

اس دفعہ زرینہ نے عاجزی سے کہا۔ "تم مجھے نیچے پہنچا دو۔ پھر میں یہاں نہیں آؤں گی۔ بالکل یں آؤں گی۔"

لالی نے زچ ہو کر کہا۔ "اس طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ چل' میں تیرے ساتھ چلتا ں۔"

لالی آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا' کمرے سے نکلا۔ زرینہ بھی اس کے ساتھ ساتھ بڑھی۔ لالی آگے ا۔ زرینہ اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ زرینہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سیڑھیوں پر گھپ اندھیرا تھا۔ نوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ لالی نے چلتے چلتے کہا۔

"انجینئر سے تو تجھے اتنا ڈر لگتا ہے' مجھ سے نہیں لگتا؟ مان لے' میں تجھے اندھیرے میں دبوچ ں تو؟"

"میرے ہاتھ نہیں ہیں کیا؟" اس نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔ "منہ نوچ لوں گی' دانتوں ے کاٹوں گی۔ چیخوں گی' چلاؤں گی۔" وہ آہستہ سے ہنسی۔

"مجھ پر ہاتھ ڈالنا ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے۔"

"فیر اس گینڈے سے اتنا کیوں ڈرتی ہے؟ یہ کارروائی اس کے ساتھ کیوں نہیں کرتی؟"

"اس کی بات دوسری ہے۔" زرینہ دھیرے سے بولی۔ "صفدر خفا ہو جائے گا۔ کہتا تھا' انجینئر ے ساتھ کوئی گڑبڑ کی تو سمجھ لینا کھڑے کھڑے طلاق دے دوں گا۔"

لالی جل کر بولا۔ "وہ کنجر یہ بھی کہتا ہے۔ ولاگیری کرتا ہے اوپر سے آنکھیں بھی دکھاتا ہے۔"

زرینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ سیڑھیوں سے نیچے اترتی رہی۔ لالی بھی خاموش ہا۔ اندھیرے میں دونوں ریلنگ کا سہارا لے کر نپے تلے قدم اٹھا رہے تھے۔ ناگاہ زرینہ نے چونک ر پوچھا۔

"کیا تم نے میری چوٹی کھینچی تھی؟"

"تیرا مغز تو نہیں چل گیا۔" لالی نے اس کی جانب گردن موڑے بغیر کہا۔ "میں آگے آگے چل رہا ہوں۔ پیچھے سے تیری چوٹی کیسے کھینچ سکتا ہوں؟"

وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ "سچ' مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری چوٹی پکڑ کر کھینچی ہے۔"

"بانو ہوگی۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ زرینہ خاموش رہی۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے' تو ہی بانو ہے۔"

لالی نے توقف کے بعد پوچھا۔ "تو بانو تو نہیں ہے؟" زرینہ ہنوز خاموش رہی۔ ذرا دیر تک گہری خاموشی رہی۔ لالی اس خاموشی سے گھبرا گیا۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ زرینہ اندھیرے میں پرچھائیں کی طرح دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ لالی نے اس دفعہ کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔ "بول' بولتی کیوں نہیں؟"

"ہاں' میں بانو ہوں۔" لالی کے عقب سے منمنی آواز ابھری۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے زرینہ کو دیکھا۔

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ "بڑے بہادر بنتے تھے۔ ڈر گئے نا؟"

دونوں زینے سے اتر کر نیچے کوریڈور میں آگئے تھے۔ سامنے گول کمرہ تھا۔ اس میں لیمپ روشن تھا' زرینہ جھٹ لالی کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ ابھی تک شوخی سے مسکرا رہی تھی۔ لالی نے جھنجلا کر اسے دیکھا۔ "تو بھی ایک نمبری ہے۔ میں سچ مچ ڈر گیا تھا۔" اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "انجینئر' کس کمرے میں ٹھیرا ہے؟"

"یہ رہا وہ کمرہ۔" زرینہ نے نکڑ والے کمرے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر لیمپ روشن تھا۔ لالی آہستہ آہستہ دروازے پر پہنچا۔ بڑھ کر دیکھا' کمرہ خالی ہے۔ زرینہ بھی اس کے ساتھ ساتھ دروازے تک پہنچ گئی۔ لالی نے دریافت کیا۔

"انجینئر کے ساتھ ڈرائیور بھی ہے؟"

"ہے تو۔" زرینہ نے جواب دیا۔ "وہ آتے ہی ادھر پچھلے کمرے میں سو گیا تھا۔ اسے بخار ہے۔ جبھی تو انجینئر خود صفدر کو چھوڑنے گیا ہے۔ گاڑی چلانا جانتا ہے۔"

لالی نے مزید بات چیت نہیں کی۔ خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ایک طرف کھونٹی پر انجینئر کا دھاری دار سلیپنگ سوٹ لٹکا تھا۔ قریب ہی میز پر چمڑے کا سوٹ کیس رکھا تھا۔ سوٹ کیس بند تھا۔ کمرے میں ایک طرف سنگھار میز تھی۔ اس پر شیو کرنے کا سامان بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ ہی دیر پہلے کسی نے شیو کیا ہے۔



لالی دھیرے دھیرے کھڑکی کے پاس گیا۔ چوکنا نظروں سے باہر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ درختوں کے نیچے گہرا سناٹا تھا۔ البتہ بنگلے کے پچھواڑے بوڑھے چوکیدار کی کھانسی رک رک کر سنائی دے رہی تھی۔

زرینہ بھی لالی کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ پوچھنے لگی۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "کچھ نہیں۔"

اسی وقت گیٹ پر گاڑی رکنے اور ہارن بجنے کی آواز ابھری۔ زرینہ نے گھبرا کر کہا۔ "انجینئر واپس آگیا۔ اب کیا ہوگا؟"

لالی بھی گھبرا گیا۔ مگر اس نے اپنی گھبراہٹ ظاہر نہیں کی۔ "ہونا کیا ہے۔ باہر برآمدے میں جا کر کھڑی ہو جا۔ جیسے ہی انجینئر آئے رونا شروع کر دینا۔ وہی کہنا جو میں نے بتایا ہے اور دیکھ' میرے بارے میں بالکل کوئی بات نہ کرنا۔ ورنہ سارا معاملہ بگڑ جائے گا۔" زرینہ گھبرائی ہوئی نظروں سے لالی کو دیکھتی رہی۔ لالی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے ڈانٹا۔

"میرا منہ کیا تک رہی ہے؟ اب جا باہر۔"

زرینہ دروازے کی جانب بڑھی۔ لالی بھی اس کے ساتھ چلا۔ چلتے چلتے اس نے سرگوشی کے انداز میں رسان سے کہا۔ "ذرا اپنے بال وال تو بکھیر لے۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور خود ہی اس کے بال اس طرح بکھیر دیئے کہ وہ بے ترتیب ہو کر چہرے اور شانوں پر پھیل گئے۔ زرینہ چپ کھڑی رہی' پھر بکھری ہوئی لٹیں لہراتی کمرے سے نکلی اور کوریڈور کا بیرونی دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں چلی گئی۔

لالی فوراً انجینئر کے کمرے میں واپس آیا۔ اس نے سوٹ کیس کا تالا ہلا کر دیکھا۔ مگر تالا آسانی سے کھلتا معلوم نہ ہوا۔ ادھر بنگلے کے باہر گیٹ کھلنے اور گاڑی احاطے میں داخل ہونے کی آواز ابھری۔

لالی نے لپک کر فوراً کھونٹی سے سلیپنگ سوٹ کا پاجامہ اتارا۔ قمیص اتاری' بستر سے اجلی چادر کھینچی۔ چادر میں سلیپنگ سوٹ لپیٹا اور اسی میں سنگھار میز سے شیونگ کا سامان اٹھا کر رکھا۔ جھٹ پٹ گٹھری باندھی اور کمرے سے نکل کر زینے کی جانب بڑھا۔

زینے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے سنا' انجینئر باہر برآمدے میں زرینہ سے کہہ رہا تھا۔ "ارے' تم رو رہی ہو؟"

اس کی آواز بھاری تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "یہاں کیوں کھڑی ہو؟ آؤ اندر چلیں۔"

ذرا دیر خاموشی رہی پھر زرینہ کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ "میں اندر نہیں جاؤں گی۔ وہاں مجھے ڈر لگتا ہے۔"

لالی اس سے زیادہ کچھ نہ سن سکا۔ وہ اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا اوپر پہنچ گیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے جلدی سے جوتے بھی گٹھری میں باندھ لیے۔ میز کے قریب گیا اور پھونک مار کر لیمپ بجھا دیا۔

نچلی منزل سے ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ لالی نے ان آوازوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے گٹھری کندھے پر لٹکائی۔ بڑھ کر کھڑکی پر پہنچا۔ اس پر چڑھا اور پیپل کی ڈال پر چھلانگ لگا کر پہنچ گیا۔ ڈال اس کے بوجھ سے ہلی۔ لالی ذرا دیر تک ڈال سے چمٹا رہا پھر شاخوں کا سہارا لیتا دھیرے دھیرے نیچے اترنے لگا۔

نیچے پہنچ کر اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہیں چوکیدار ادھر نہ آجائے۔ مگر وہ اس وقت برآمدے میں تھا جہاں سے زرینہ کی آواز آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔ پیپل کا تنا احاطے کی دیوار سے ملا ہوا تھا۔ وہ دیوار پر پہنچا اور آہستہ سے باہر لاگھے میں اتر گیا۔



لالی نے ایک سنسان مقام پر ماچس جلا کر گھڑی دیکھی۔ دو بجنے والے تھے۔ لالی پریشان ہو گیا۔ گیارہ بجنے سے پہلے ہی وہ ریسٹ ہاؤس چھوڑ چکا تھا اور اب اسے چلتے چلتے تین گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ اسے بہت پہلے گوردا پورہ پہنچ جانا چاہئے تھا۔ مگر اسے دور دور تک کوئی بستی نظر آئی نہ نہر۔ وہ راستے سے بھٹک گیا تھا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ پریشان ہو گیا۔ لالی آگے بڑھا' اور تیز تیز قدموں سے ایک سمت چلنے لگا۔

اس نے لگ بھگ تین میل راستہ طے کیا ہو گا کہ قبرستان آگیا۔ قبرستان کے آگے بستی تھی۔ نزدیک پہنچ کر وہ ایک بار پھر ٹھہر گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ قبرستان پر ویرانی چھائی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

قبرستان بہت پرانا تھا۔ جگہ جگہ جنگلی جھاڑیاں اور ببول کے درخت تھے۔ ان کے درمیان ٹوٹی پھوٹی' اونچی نیچی قبریں بکھری ہوئی تھیں۔ قبرستان کے ایک گوشے میں نیم اور سرس کے درختوں کا جھنڈ تھا۔

درختوں کے نیچے مٹی کا بنا ہوا مکان تھا۔ مکان میں چراغ روشن تھا جس کی دھندلی روشنی دور سے زرد دھبے کی طرح نظر آتی تھی۔

لالی اس طرف نہیں گیا۔ آگے بڑھا اور ایک پگڈنڈی پر چلتا ہوا قبرستان کے اندر داخل ہو گیا۔ پگڈنڈی قبروں کے درمیان سے پیچ و خم کھاتی ہوئی گزرتی تھی اور اس کچی سڑک سے مل جاتی تھی جو دھندلی روشنی میں قبرستان کے دوسرے سرے پر نظر آرہی تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا

آگے بڑھتا گیا۔

اس نے قبرستان کا نصف سے زیادہ حصہ طے کر لیا۔ اب کچی سڑک صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ سڑک کی جانب چلا۔ مگر کچھ ہی دور گیا تھا کہ قبرستان کی گہری خاموشی میں قہقہہ بلند ہوا۔ لالی سراسیمہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مگر اس نے ہمت سے کام لیا۔ گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہر طرف اونچی نیچی قبریں تھیں۔

وہ چوکنا نظروں سے دائیں بائیں دیکھتا ایک بار پھر آگے بڑھا۔ ذرا ہی دیر بعد اسے ملی جلی سرگوشیاں سنائی دیں۔ آوازیں بہت دھیمی تھیں اور داہنے ہاتھ کے ایک گھنے درخت کے نیچے سے ابھر رہی تھیں۔

لالی نے سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا تو اسے درخت کے نیچے دھندلی دھندلی روشنی بھی نظر آئی۔ وہ گھبرا کر واپس مڑا اور پگڈنڈی چھوڑ کر قبروں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا سڑک کی جانب بڑھنے لگا۔ کئی بار ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ مگر وہ قبروں سے ٹھوکریں کھاتا، جنگلی جھاڑیوں سے الجھتا سڑک سے قریب ہوتا گیا۔ وہ قبرستان کے ڈراؤنے اور آسیبی ماحول سے جلد سے جلد نکل کر کچی سڑک پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

سڑک اب بالکل اس کے سامنے تھی۔ مگر یہ دیکھ کر سخت پریشان ہوا کہ سڑک کے کنارے ایک ٹرک کھڑا ہے۔ وہ خوف سے جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹرک کے پچھلے حصے سے پولیس والے کود کود کر باہر نکلنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی لمبی لاٹھیاں تھیں۔ چند ہی لمحے بعد تھانے دار بھی اگلی نشست سے اتر کر نیچے آیا۔ اس نے گردن اونچی کی۔ کانسٹیبلوں پر نظر ڈالی اور انھیں حکم دیا۔

"قبرستان چاروں طرف سے گھیرے میں لے لو۔"

لالی بدحواس ہو کر تیزی سے پلٹا اور قبریں پھلانگتا ہوا سرپٹ بھاگا۔ ناگاہ اس نے اندھیرے میں ٹھوکر کھائی اور ایک ٹوٹی قبر میں دھڑام سے منہ کے بل گرا۔ قبر قد آدم گہری تھی۔ مگر اندر سے کچی تھی۔ چوٹ زیادہ نہیں آئی۔ پھر بھی اس کے دو دانت ہل گئے۔ ایک گھٹنے میں بھی درد ہو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا۔ عین اس وقت قبر کے آس پاس تیز تیز قدموں سے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں ابھریں۔ وہ جس طور گرا تھا، اسی حالت میں چپ پڑا رہا۔



ذرا دیر بعد کوئی دھم سے قبر کے اندر کودا۔ مگر وہ لالی پر نہیں گرا۔ لالی نے بدحواس ہو کر سر اٹھایا۔ وہ پولیس والا نہیں تھا۔ اس کی سفید قمیص اندھیرے میں جھلک رہی تھی۔ وہ کونے میں دبک کر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لالی بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کپڑوں کی سرسراہٹ سن کر اس شخص نے پلٹ کر لالی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں تاریکی میں شیشے کی گولیوں کی مانند چمک رہی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہے۔ اس شخص نے سرگوشی کی۔

"کون ہے تو؟"

"میں کبر کا مردہ ہوں۔" یہ کہہ کے لالی نے جھپٹ کر ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی اور دیوار سے اڑا کر بے بس کر دیا۔

مگر وہ بھی جاندار اور تگڑا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر جھٹکا دیا اور اپنی گردن لالی کی گرفت سے چھڑا لی۔ "صاف بتا کون ہے تو؟"

"کہہ تو دیا' میں اس کبر کا مردہ ہوں۔" لالی نے ناک سے منمنا کر اسے پھر دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی اور بدستور اس پر جھکا بیٹھا رہا۔

وہ نڈر ہو کر بولا۔ "یار! مسخری نہ کر' ٹھیک ٹھیک بتا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "نہ جانے کتنی ایسی راتیں قبرستانوں میں گزر گئیں۔ مجھے تو آج تک کوئی مردہ شردہ ملا نہیں۔ تو نرالا مردہ ہے۔ بولتا بھی ہے اور کپڑے بھی پہنے ہوئے ہے۔"

وہ شخص قبر کے ایک کونے میں سکڑا سکڑایا بیٹھا تھا اور آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ لالی کو اس کی بے باکی بہت شاق گزری۔ جی چاہا کہ اس کے منہ پر زور سے ایسا تھپڑ مارے کہ ساری ہیکڑی نکل جائے۔ مگر اب دور سے ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھرنے لگا تھا۔ شور سن کر لالی خود خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے سنبھل کر آہستہ سے پوچھا۔ "یہ تو بتا' یہ شور کیسا ہے؟" لالی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"پولیس نے چھاپا مارا ہے۔"

"پولیس نے چھاپہ مارا ہے۔" لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "پولیس نے کیوں چھاپا مارا ہے؟"

"ایک قبر میں ادھر جوا ہو رہا تھا۔" اس شخص نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

"تم بھی جوا کھیل رہے تھے؟"

"میں تو خاما خا پھنس گیا۔" وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ "نوے روپے بھی ہار گیا۔"

"جوا کھیلنے کے لیے جنگلی جگہ تلاش کی۔"

"آج ہفتہ ہے نا۔ ہر ہفتے کو یہاں ضرور جوا ہوتا ہے۔ کوٹ سلیم کے علاوہ شہر سے بھی کئی بندے جوا کھیلنے آتے ہیں۔ اونچا کھیل ہوتا ہے۔ پولیس کو بھی پتہ ہے۔"

"پولیس کی مرضی کی بنا ایسا دھندا چل ہی نہیں سکتا۔ پر آج چھاپا کیسے پڑ گیا؟ پولیس کا بھتا نہیں پہنچا ہوگا؟"

وہ اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "یار! میں تو بال بال بچ گیا۔ جیسے ہی پتہ چلا کہ دوڑ آگئی' میں نکل بھاگا۔ سامنے سے ایک کانسٹیبل آگیا۔ اس نے جھپٹ کر اس طرح دبوچ لیا' میں تو سمجھا' لے بھئی بشیرے آج دھر لیا گیا۔ مگر میں نے زور سے جھٹکا دے کر بیٹھک لگائی۔ داؤ ایسا فٹ بیٹھا کہ اس کے ہاتھ کھل گئے۔ ادھر میں نے زمین پر بیٹھتے ہی پیچھے ہاتھ ڈال کر اس کی ٹانگ پکڑ کر زور سے کھینچی۔ وہ دھڑام سے گرا' فیر میں کہاں ہاتھ آتا۔"

"یار توں تو..." لالی اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اسی وقت قبر کے قریب بھاری بھاری قدموں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ بشیرے نے جھٹ لالی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ لالی خاموش ہوگیا۔ دونوں اندھیرے میں دم سادھے بیٹھے رہے اور دھڑکتے دلوں سے آنے والے خطرے کا انتظار کرتے رہے۔ آہٹیں اور قریب آگئیں۔ پھر کسی کانسٹیبل کی آواز سنائی دی۔

"وہ آٹھواں جواری کہاں گیا جی؟"

ایک اور آواز ابھری۔ "اب وہ کہاں ہاتھ آتا ہے' اندھیرے میں نکل گیا ہوگا کسی طرف۔"

"اور بھی کئی ہوں گے۔"

"مگر یہ سب تو یہی بتاتے ہیں' کل آٹھ جواری تھے۔"

لالی اور بشیرا سہمے ہوئے ان کی باتیں سنتے رہے۔ وہ قبر کے بہت ہی قریب سے گزر رہے تھے۔ لیکن نہ وہ ٹھہرے نہ انھوں نے قبر کے اندر جھانکا۔

پولیس والوں کے پاس ٹارچیں بھی تھیں اور ٹارچوں کی رک رک کر ابھرتی ہوئی' تیز روشنی دونوں اپنے سروں کی بلندی پر دیکھ رہے تھے۔

ملی جلی آوازیں اور آہٹیں رفتہ رفتہ دور ہوتی گئیں۔ جب آوازیں خاصی دور ہوگئیں تو بشیرا آہستہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ وہ لمبا تڑنگا جوان تھا۔ چھ فٹ سے بھی اونچا قد تھا۔ وہ گردن اٹھا کر باہر دیکھنے لگا۔

لالی بھی کھڑا ہوگیا۔ قبر کی اونچائی اس کی پیشانی تک تھی۔ اس نے پنجوں کے بل اٹھ کر دیکھا۔ ساتوں جواری پولیس والوں کے نرغے میں سڑک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ چلتے چلتے ایک جواری



لڑکھڑا کر گرا۔ پولیس والوں نے سہارا دینے کے بجائے اسے اندھادھند پیٹنا شروع کر دیا۔ چیخ چیخ کر گالیاں بھی دیں۔ وہ بدحواس ہو کر فوراً کھڑا ہوگیا۔

دونوں خوف زدہ نظروں سے یہ منظر دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد پولیس والے جواریوں کو مویشیوں کی طرح ہنکاتے سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ٹرک کے قریب پہنچ گئے۔ سب اس میں سوار ہوگئے۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا اور سڑک پر دوڑنے لگا۔ جب وہ اندھیرے میں غائب ہوگیا تو لالی نے بشیرے کا کندھا تھپک کر کہا۔

"لے یار! صاف بچ گیا۔"

وہ بے نیازی سے مسکرا کر بولا۔ "ویسے ہونا ہوانا کیا تھا۔ سو دو سو روپے دے کر ہر جواری چھوٹ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ رات بھر حوالات میں بند رہے گا۔ سویرے ضمانت پر رہا ہو جائے گا۔ پر میں اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔" اس نے مڑ کر لالی کی طرف دیکھا۔ "پر تو قبر کے اندر بیٹھا کیا کر رہا تھا؟ میں نے جواریوں کے ساتھ تو تجھے دیکھا نہیں۔"

"نہیں یار! میں جوا شوا نہیں کھیلتا۔" لالی نے حیلہ جوئی سے کام لیا۔ "میں تو اس ٹوٹی کبر میں بیٹھ کر وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ۴۰ دن کا چلّہ ہے۔"

"پر تجھے یہ پتہ نہیں' یہاں جوا بھی ہوتا ہے؟"

"چلے کا آج پہلا ہی دن تھا۔ تو نے آکر میرا وظیفہ خراب کر دیا۔"

بشیرے نے آنکھ مار کر بدمعاشی سے کہا۔ "یاری آشنائی کا چکر ہے کچھ؟" وہ ہولے سے ہنسا۔ "کسی سے آنکھ لڑ گئی؟ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ ورنہ تیرے جیسا جوان کہاں قبروں میں بیٹھ کر چلے کشی کرتا ہے۔"

"نہیں جی! میرے ساتھ ایسا کوئی چکر نہیں۔ میں ایسے دھندوں میں نہیں پڑتا۔"

"کسی مقدمے میں پھنس گیا ہوگا۔" اس نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ "یار اب اس قبر سے تو نکل۔"

بشیرے نے دونوں ہاتھ باہر زمین پر ٹکائے' اچھلا اور دونوں ٹانگیں قبر کے اندر کی دیوار سے ٹکا کر دھیرے دھیرے گھسٹتا ہوا اوپر چلا گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں اور کپڑوں پر سے خاک جھاڑی' جھک کر لالی کو دیکھا۔ ہنس کر بولا۔ "یار! تو اتنی گہری قبر سے باہر کیسے نکلتا ہے؟" اس نے اپنا ہاتھ لالی کی طرف بڑھایا۔

"لے میرا ہاتھ پکڑ لے۔"

"رہنے دے۔" لالی نے اس کے ہاتھ کا سہارا لینے سے انکار کر دیا۔ جھک کر اپنی گٹھری اٹھائی۔ اسے کندھے پر لٹکایا۔ دونوں ہاتھ اونچے کیے۔ قبر کے باہر کی زمین تھامی۔ اچھلا اور ایک ہی زقند میں اس صفائی سے باہر آیا کہ بشیرا دنگ رہ گیا۔

"یار توں تو کوئی اونچی چیز لگتا ہے۔"

لالی اس کی بات نظرانداز کر کے بولا۔ "یہ بتا' تیں نوں اب کتھے جانا ہے؟"

"میں نے تو کہیں نہیں جانا۔ یہیں قبرستان میں رہوں گا۔"

"تو گورکن تو نہیں ہے؟"

"یار! تو نے حد کر دی۔" وہ کسی قدر تیکھے لہجے میں بولا۔ "میں تجھے گورکن لگتا ہوں۔"

لالی نے اس کی سفید قمیص اور خاکی پتلون غور سے دیکھی۔ چند لمحے خاموش رہا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "دیکھنے میں تو پولسیا لگتا ہے۔"

وہ ہنس کر بولا۔ "ٹھیک اندازہ لگایا تو نے۔"

لالی گھبرا گیا۔ بشیرے نے اس کی گھبراہٹ بھانپ لی۔ ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "ڈر نہیں' دو سال ہوئے میں نے پولیس کی ملازمت چھوڑ دی۔"

"چھوڑ دی یا نکال دیا گیا۔"

"نکال دیا گیا' یوں ہی سمجھ لے۔ ویسے پولیس کی نوکری مجھے پسند نہیں تھی۔ تنخواہ کم اور ہر وقت کی ذلیل' رشوت نہ بھی لو تب بھی بدنام۔"

لالی خاموش رہا۔ بشیرا بھی چپ ہو گیا۔

اب رات کا چل چلاؤ تھا۔ مشرق میں صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ ذرا دیر بعد دور سے اذان بلند ہوئی۔ لالی پریشان ہو گیا۔ اب قبرستان میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس نے بشیرے سے کہا۔

"تو یہاں ٹھہر۔ میں نوں تو اب جانا ہے۔" وہ چلنے کے لیے مڑا۔ بشیرے نے اسے روک لیا۔

"یار! ایسی بھی کیا جلدی' چائے پی کر جانا۔"

"چائے؟" لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔ "چائے یہاں کہاں ملے گی؟"

"کیوں نہیں ملے گی۔" بشیرا ہنس کر بولا۔ "ابھی تجھے چائے پلواتا ہوں۔"

"نہیں جی! میں نے چائے شائے نہیں پینی۔"

"چھوڑ یار! کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔" بشیرا بے تکلفی سے بولا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا



پیکٹ نکالا۔ لالی کی طرف بڑھایا۔ "لے' پہلے ایک سگریٹ پی۔" لالی نے سگریٹ پینے سے بھی انکار کر دیا' مگر بشیرا نہ مانا۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور اصرار کر کے لالی کے ہونٹوں سے لگا دی۔ پھر لالی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "آ میرے ساتھ۔ آرام سے بیٹھ کر چائے پئیں گے' فیر جہاں تیرا جی کرے' چلا جانا۔"

اس نے ایسا مجبور کیا کہ لالی کے لیے مزید انکار کی گنجائش نہیں رہی۔ وہ بشیرا کے ہم راہ چپ چاپ آگے بڑھنے لگا۔ دونوں قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے درختوں کے جھنڈ کی جانب چلنے لگے۔ قریب جا کر بشیرا نے مکان کے بند دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ ایک بوڑھے نے جھک کر بشیرے کو دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اندر' آجاؤ' اندر آجاؤ۔"

اس نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے۔ بشیرا اور لالی خاموشی سے اندر چلے گئے۔ بوڑھے نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ وہ ابھی تک گھبرایا ہوا تھا' بشیرے کو مخاطب کر کے بولا۔ "کہاں چلا گیا تھا؟ پولیس نے چھاپا مار کر کئی جواریوں کو پکڑ لیا۔ پولیس ذرا ہی دیر پہلے یہاں سے گئی ہے۔"

"مجھے سب معلوم ہے۔" بشیرا قریب پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے لالی کو بھی ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔ "چاچا! تو تو کہتا تھا' پولیس کل چھاپا مارے گی۔ آج کیسے دوڑ آگئی؟"

"مجھے تو شیر محمد کانسٹیبل نے یہی بتایا تھا۔"

بشیرا شکوہ کرنے لگا۔ "چاچا! تو نے تو آج مروا ہی دیا تھا۔ بال بال بچ گیا۔"

"کیا تو بھی جوا کھیلنے بیٹھ گیا تھا؟"

"میں تو ایسے ہی کھیل دیکھنے گیا تھا۔ انھوں نے زبردستی بٹھا لیا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "چاچا! اب تو فٹافٹ گرم گرم چائے پلوا دے۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"بھتاور نے دودھ لی تو ابھی چائے آجائے گی۔"

"سکندر واپس آگیا؟"

"نہیں جی! وہ شام تک شہر سے لوٹے گا۔" بوڑھے نے بشیرا کو بتایا۔ "تم آرام سے بیٹھو۔ میں تمہارے لیے چائے بنوا کر لاتا ہوں۔" اس نے گھر کے اندر جانے والا دروازہ کھولا اور کمرے سے چلا گیا۔

بشیرے نے لالی سے کہا۔ "یہ پیر بخش ہے' قبرستان کا گورکن۔ اپنا پرانا یار ہے۔ سمجھو یہ اپنا ہی

گھر ہے۔" چند لمحے خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔

"یار! تو نے اپنا نام نہیں بتایا؟"

لالی نے اس کے سوال کا جواب پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے بتایا۔ "میرا نام روشن ہے جی۔"

مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ دونوں رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ تھکن سے نڈھال تھے۔

تھوڑی دیر بعد بوڑھا پیر بخش اندر آیا' کہنے لگا۔ "ادھر ڈیرے پر آجاؤ۔ میں نے تیری منجی کے ساتھ ایک کھٹ اور ڈلوادی ہے۔ ساری رات جاگتے گزر گئی۔ اب تو سوجا۔"

بشیرا کسی قدر تیکھے لہجے میں بولا۔ "سونا سلانا تو بعد کی بات ہے۔ چاچا! پہلے یہ بتا' چائے کا کیا بنا؟"

"خالی چائے سے کیا بنے گا۔ پیٹ میں تھوڑی سی روٹی بھی جانی چاہئے۔" پیر بخش نے مسکرا کر کہا۔ "اب کھڑا ہوجا۔"

بشیرا اور لالی کھڑے ہوگئے۔ پیر بخش کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے نکل کر دالان میں آگئے۔ آگے کھلا صحن تھا۔ صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ تینوں صحن میں پہنچ گئے۔ صحن کی ایک دیوار کے ساتھ چھپر پڑا تھا۔ یہ جھلیانی تھی۔ اس میں چولھا تھا جس میں آگ جل رہی تھی۔ چولھے کے قریب ایک نوجوان عورت بیٹھی پراٹھے تیار کر رہی تھی۔ وہ پیر بخش کی بہو بختاور تھی۔ آہٹ سن کر اس نے ان کی طرف دیکھا۔ سر سے ڈوپٹے کا آنچل کھینچا اور بکل مار کر چہرے کو کسی قدر چھپالیا۔

پیر بخش نے اسے مخاطب کیا۔ "بکھتاور! جھیتی ہتھ چلا۔ دونوں رات بھر کے بھوکے ہیں۔"

تینوں نے صحن عبور کیا۔ پیر بخش نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہ باہر آگئے۔ صحن کے دروازے کے سامنے برآمدہ تھا۔ اس کے پیچھے کمرہ تھا۔ درمیان سے پتلی سی گلی گزرتی تھی۔ گلی عبور کر کے تینوں برآمدے میں پہنچے اور کمرے کے کھلے دروازے سے اندر چلے گئے۔ کمرہ صاف ستھرا تھا۔ اس میں دو چارپائیاں تھیں۔ ان پر بستر لگے تھے۔ فرش پر چٹائی بچھی تھی۔ تینوں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ پیر بخش زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہرا۔ واپس آنے کا وعدہ کر کے باہر چلا گیا۔ مگر آیا نہیں۔ کچھ دیر بعد بختاور کمرے کے اندر آئی۔ اس نے اس وقت بھی ہلکا سا گھونگٹ نکال رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں المونیم کا تھال تھا جس میں پراٹھوں کے ساتھ ساتھ دو پیالوں میں چائے بھی تھی۔ اس نے نظریں نیچی کئے ہوئے کہا۔

"چاچا باہر کسی سے گل بات کر رہا ہے۔ ادھر بستی میں موت ہوگئی ہے۔ کبر تیار کرنے کی گل ہو



رہی ہے۔"

وہ جھکی اور تھال بشیرا اور لالی کے درمیان رکھ کے واپس چلی گئی۔ مگر ذرا ہی دیر بعد لوٹے میں پانی لے کر آئی۔ کہنے لگی۔ "کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا۔"

وہ باہر چلی گئی۔ بشیرا اور لالی اٹھ کر برآمدے میں گئے اور لوٹے سے پانی لے کر کلیاں کرنے لگے۔ انہوں نے منہ دھویا اور اندر واپس آگئے۔

دونوں چٹائی پر بیٹھ کر پراٹھے کھانے لگے۔ پراٹھے گرم تھے۔ دونوں بھوکے بھی تھے۔ مزے لے کر سارے پراٹھے کھا گئے۔

چائے پیتے ہوئے بشیرا نے لالی سے پوچھا۔ "روشن! یہ بتا' تجھے جانا کہاں ہے؟"

"سٹیشن۔" لالی نے مختصر جواب دیا اور جان بوجھ کر اسٹیشن کا نام نہیں لیا۔

"سٹیشن سے کہاں جائے گا؟"

"کراچی کی گڈی پکڑنی ہے۔"

"لے یار! ملا اسی بات پر ہاتھ۔" اس نے گرم جوشی سے لالی کا ہاتھ تھام لیا۔ "کراچی تو مجھے بھی جانا ہے۔ دونوں کل صبح کی ٹرین سے اکٹھے چلیں گے۔ رات کو تھوڑا سا کام کرنا ہے۔ تو بھی ساتھ لگ جا تو کام جلد ہی نمٹ جائے گا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "سچ پوچھ تو میں نے تجھے اسی کام کے لیے روکا تھا۔"

"کام کیا کرنا ہوگا؟"

"یہ میں تجھے رات ہی کو بتاؤں گا۔"

لالی ذرا دیر خاموش رہا پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "تو کفن چور تو نہیں ہے؟"

"نہیں یار! میں ایسا گھٹیا کام نہیں کرتا۔"

"فیر کیا کام ہے؟"

"کہہ تو دیا' رات کو آرام سے بات ہوگی!"

بشیرا اٹھا اور چارپائی پر جاکر دراز ہوگیا۔ لالی کچھ دیر چٹائی پر گم صم بیٹھا رہا پھر وہ بھی اٹھ کر دوسری چارپائی پر لیٹ گیا۔ بشیرا ذرا ہی دیر بعد خراٹے بھرنے لگا۔ مگر لالی کو نیند نہیں آئی۔ بشیرا کی باتوں نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ کمرے میں مختصر سی کھڑکی بھی تھی جو کمرے کے پچھواڑے کھلتی تھی۔

لالی کروٹ بدل کر کھڑکی کی جانب دیکھنے لگا۔ باہر املتاس کا اجڑا ہوا درخت تھا۔ درخت کے پتے

گر چکے تھے۔ شاخوں میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہر طرف زرد زرد دھوپ پھیلی تھی۔ لالی کئی منٹ تک چپ لیٹا رہا۔

غنودگی کا غلبہ ہوا تو وہ بھی گہری نیند سو گیا۔

دوپہر کو آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا بختاور دہلیز پر کھڑی ہے۔ وہ لالی کو بیدار کرنے کے لیے دروازے کی کنڈی آہستہ آہستہ بجا رہی تھی۔ کھانا لے کر آئی تھی۔ لالی نے اسے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔

بختاور نے کھانا چٹائی پر رکھ دیا اور قریب بیٹھ کر کھانے پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں ہاتھ ہلا ہلا کر اڑانے لگی۔ لالی نے بشیرے کی چارپائی پر نظر ڈالی۔ اس کا بستر خالی تھا۔ لالی چارپائی سے اتر کر نیچے آیا۔ اس نے بختاور سے پوچھا۔

"بشیرا کہاں ہے؟"

بختاور نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ "وہ چاچا کے ساتھ کوٹ سلیم گیا ہے۔ دن ڈھلے لوٹے گا۔ اس نے روٹی کھالی ہے۔ توں اس وکھت سو رہا تھا۔"

"کتنی دیر ہوئی دونوں کو گئے ہوئے؟"

"زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ جانا تو انہیں سویرے ہی تھا پر چاچا کو ایک میت دفن کرنی تھی۔ اسی میں دیر ہو گئی۔"

لالی نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ وہ کھانا کھانے لگا۔ کھانے میں روٹی تھی۔ ساگ تھا۔ اچار اور مکھن بھی تھا۔ بختاور چٹائی پر خاموش بیٹھی رہی۔ لالی نے کھانا کھاتے کھاتے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ نہا دھو کر آئی تھی۔

اس کے کپڑے صاف ستھرے تھے۔ بال خشک تھے۔ سانولی رنگت تھی۔ بدن مضبوط اور صحت مند تھا۔ ناک نقشہ سبک تھا۔ عمر بھی بائیس تیئس برس سے زیادہ نہیں تھی، مگر اس کے چہرے پر عجب ویرانی برستی تھی۔ وہ بجھی بجھی دکھائی دے رہی تھی۔ لالی نے اس کے چہرے کی ویرانی محسوس کی اور یہ بھی محسوس کیا کہ قبرستان کی طرح گھر میں بھی گہری خاموشی ہے۔ اس نے بختاور سے پوچھا۔

"تیرے سوا یہاں اور کوئی نہیں؟"

"اس وکھت تو کوئی نہیں ہے۔" اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو گھورا۔ "پر تو یہ کیوں پوچھ رہا ہے؟"



"نراض کیوں ہوتی ہے۔" لالی مسکرا کر بولا۔ "تیرے بال بچے نہیں ہیں؟"

"نہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ اس دفعہ اس کا لہجہ نرم تھا۔ "پنج سال پہلے مرا ہوا نکا پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد کوئی نہیں ہوا۔" اس کے سانولے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔

لالی نے اس کی افسردگی کا سبب فوراً تاڑ لیا۔ تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "فکر کیوں کرتی ہے۔ بال بچے بھی ہو جائیں گے۔ ابھی تو بوڑھی تو نہیں ہو گئی۔"

بختاور نے نگاہ اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں ویران اور خالی خالی تھیں۔ وہ نظریں نیچی کیے چند لمحے گم صم بیٹھی رہی۔

اس نے گہری سانس بھری اور آہستہ سے بولی۔ "چاچا کو پوتا پوتی کا بہت چاؤ ہے۔ وہ سکندر کا دوسرا ویاہ کرنا چاہتا ہے۔" دل کی بات بے اختیار بختاور کی زبان پر آ گئی۔

"سکندر تیرا کھسم ہے نا؟ وہ کیا کہتا ہے؟"

"وہ کیا کہے گا۔ جو پیوٗ کہے گا، وہی کرے گا۔ ایک وڈی ننانی ہے، پڑوس کے چک میں ویاہی ہے۔ جب آتی ہے، وہ بھی پیوٗ اور بھائی کو اکساتی ہے۔"

لالی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس مسئلے کا کیا حل بتائے۔ وہ چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔ بختاور خاموش بیٹھی رہی۔ "ایک گل پوچھوں، برا تو نہیں منائے گا؟"

"پوچھ، کیا پوچھنا چاہتی ہے۔"

بختاور ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "یہ گندا کام کرتے تیں نوں برا نہیں لگتا؟"

لالی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "کیسا گندا کام؟"

"یہی جو بشیرا کرتا ہے۔"

"بشیرا کیا کرتا ہے؟" لالی ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

اس بار وہ زیر لب مسکرائی۔ "تیں نوں یہ بھی پتہ نہیں۔"

"مجھے کیا پتہ۔ میں تو بشیرا کو ٹھیک سے جانتا بھی نہیں۔ میرا تو اس سے کل رات ہی میل ملاپ ہوا ہے۔"

بختاور نے تعجب سے کہا۔ "رات توں بھی ادھر ٹوٹی کبر میں جوا کھیل رہا ہو گا؟"

"نہیں جی، میں جوا شوا نہیں کھیلتا۔" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ "تو نے یہ نہیں بتایا، بشیرا کیا کام کرتا ہے!"

"اسی سے پوچھ لینا۔ چاچا خاما خا میرے گلے پڑ جائے گا۔"

لالی اب کھانا کھا چکا تھا۔ بختاور نے برتن اٹھائے اور کمرے سے جانے لگی۔ لالی نے اسے روکا۔ "گل سن بختاور۔"

"کہہ کیا کہنا چاہتا ہے؟" اس نے پلٹ کر لالی کی جانب دیکھا۔

"ڈرتی کیوں ہے؟ میں تیرا نام نہیں بتاؤں گا۔ اب بتا' بات کیا ہے؟"

مگر بختاور نہیں رکی۔ "مجھے جانے دے۔ ابھی ڈھیر سارے کام کرنے ہیں۔" وہ کمرے سے چلی گئی۔

☆

لالی سخت مخمصے میں پڑ گیا۔ وہ حیران و پریشان بیٹھا سوچتا رہا کہ بشیرا ایسا کون سا کام کرتا ہے جسے بختاور بہت برا سمجھتی ہے' اور بتانے سے بھی ڈرتی ہے۔

بختاور کی باتوں سے اس نے یہ بھی اندازہ لگا لیا کہ پیر بخش گورکن بھی اس دھندے میں بشیرا کے ساتھ شریک ہے۔ لالی کے ذہن میں کرید پیدا ہوئی کہ کسی طرح یہ بھید معلوم کیا جائے۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا' مگر قرار نہ آیا۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور برآمدے میں آ گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ برآمدے کے سامنے کی گلی بھی ویران تھی۔ گلی کے دوسری طرف پیر بخش کے گھر کا دروازہ تھا جو صحن میں کھلتا تھا۔

لالی برآمدے میں کھڑا دروازہ تکتا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ شاید بختاور باہر نکلے۔ مگر نہ دروازہ کھلا نہ بختاور نظر آئی۔ آخر لالی خود ہی آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ دروازے پر پہنچا۔ دستک دینے کے لیے اس نے ہاتھ رکھا تو دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ بختاور پڑچھتی کے نیچے چبوترے پر ٹانگیں پسارے بیٹھی تھی' چاٹی میں مدھانی ڈالے اطمینان سے دودھ بلو رہی تھی۔ بختاور نے آہٹ سن کر دروازے کی جانب نظریں اٹھائیں۔ لالی کو اس نے وہاں کھڑے دیکھا تو دوپٹے کا پلو کھینچ کر گھونگھٹ نکال لیا' آہستہ سے پوچھا۔

"کیسے آیا؟"

"ماچس ہو تو دے دے۔"

بختاور فوراً کھڑی ہو گئی۔ "کمرے میں چل' میں ابھی ماچس لے کر آئی۔" وہ پڑچھتی سے نکل کر صحن میں آ گئی۔

لالی دروازے سے ہٹ کر کمرے میں پہنچا۔ تھوڑی دیر بعد بختاور بھی کمرے میں آ گئی۔ اس نے



ماچس لالی کے سامنے ڈال دی۔ لالی نے ماچس اٹھا کر سگریٹ سلگائی اور ایک کش لگا کر بختاور کی جانب دیکھا۔

"کھڑی کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔"

"کوئی اور کام ہو تو بتا دے۔" وہ بدستور کھڑی رہی۔ "میں نوں ابھی دودھ بلونا ہے۔ نہی پر چاٹی چھوڑ کر آئی ہوں۔"

لالی اس کی بات نظرانداز کر کے بولا۔ "کبھی سر میں تیل اور آنکھوں میں کاجل تو ڈال لیا کر۔"

وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "کبرستان میں رہتے رہتے تو بھی ٹوٹی پھوٹی کبر بن گئی۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھ۔"

"تیں نوں کیہہ پتہ' مجھ پر کیا بیتتی ہے۔" بختاور نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مرد اپنا ملا ہے' نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا اور چاچا تو صرف پیسہ جوڑتا ہے۔ جو آتا ہے' سیدھا اس کے گلک میں جاتا ہے۔"

"تیرے ماں پیو نہیں ہیں؟" یہ بات پوچھ کر لالی نے گویا بختاور کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور دہلیز کے پاس فرش پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "اپنا تو کوئی بھی نہیں۔"

وہ لمحے بھر خاموش رہی۔

"ماماں تھا' وہ بھی دو سال ہوئے گزر گیا۔"

لالی نے خاموشی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپے کا نوٹ نکال کر بختاور کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لے' یہ رکھ لے۔ اپنے لیے تیل' کاجل اور دنداسا شنداسا خرید لے۔"

بختاور نے نوٹ لینے سے انکار کیا۔ مگر لالی نے اصرار کیا تو اس نے نوٹ لے کر دھوتی کی ڈب میں رکھ لیا۔ ذرا دیر دونوں خاموش رہے پھر لالی نے دریافت کیا۔

"تیرا پیو بھی گورکن تھا؟"

"نہ جی' میرے تو ناتے داروں میں بھی کسی نے یہ دھندا نہیں کیا۔ کبر کھودنا' مردے دفن کرنا یہ بھی کوئی کام ہے۔ شروع شروع میں تو یہاں اتنا جی گھبراتا تھا' ایسا ڈر لگتا تھا' سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ گھنٹوں رویا کرتی' بالکل پیلی پڑ گئی تھی۔ بکھار رہنے لگا تھا۔" وہ بیتے دنوں کی یادوں میں کھو گئی۔ اس کا لہجہ رفتہ رفتہ افسردہ ہو گیا۔ "ماماں بے چارہ گریب مزارع تھا۔ اوپر سے مامی ہر وقت کڑ کڑ کرتی رہتی تھی۔ سو ماماں نے مجھے سکندر کے پلے باندھ دیا اور میں جیتے جی کبرستان میں آ گئی۔" وہ بے خیالی میں زمین پر انگلی سے لکیریں بنانے لگی۔

"اب چاچا کہتا ہے' سکندر کا دوسرا ویاہ کروں گا۔"

"اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔" لالی نے اظہار ہمدردی کیا۔ "یہ تو بتا' تیرا گھر والا سکندر کیسا بندہ ہے؟ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔"

"تجھے کیا بتاؤں۔" بختاور نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ دل گرفتہ تھی۔ نہ جانے کب سے ہمدردی کے دو بول سننے کے لیے ترس رہی تھی۔ لالی نے اس کی ذات میں دلچسپی لے کر اظہار ہمدردی کیا تو موم کی طرح پگھل گئی۔ وہ اس وقت اپنے دل کی بھڑاس نکال دینا چاہتی تھی۔ "جب میرا ویاہ ہوا تو سکندر ۱۴ سال کا چھوہرا تھا اور میں ۱۹ سال سے بھی اوپر کی ہو چکی تھی۔ ویاہ کے وکھت پوری جوان تھی۔" یہ بتاتے بتاتے اس کے لہجے میں اچانک تلخی آگئی۔ "پہلے پیو نے جورو بنا کر رکھا۔ فیر دونوں نے۔ چاچا اتنا بوڑھا ہو گیا پر اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔"

"پیر بخش اتنا نیچ اور بے گیرت ہے' یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔"

"ایک دم بے گیرت ہے۔ سکندر بھی بے گیرت ہے۔" بختاور نے غصے سے منہ بگاڑا۔ "سب کچھ جانتا ہے پر پیو کے سامنے کتے کی طرح دم ہلاتا ہے۔"

لالی نے چند لمحے خاموش رہ کر دریافت کیا۔ "بشیرے کا کیا معاملہ ہے؟"

"وہ مجھے کبھی چنگا بندہ نہیں لگا۔" بختاور نے جواب دیا۔ "پر اس نے کبھی مجھے بری نظر سے نہیں دیکھا۔"

لالی نے تعجب سے کہا۔ "سکندر کی طرح بشیرا بھی تیری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ دیکھنے میں تو بری نہیں لگتی۔" لالی نے نظر بھر کر دیکھا۔ اسے بختاور میں شاداں کی جھلک نظر آئی۔ لالی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔

"ابھی تو جوان مٹیار ہے۔ ذرا بناؤ سنگھار کر لے تو سوہنی نظر آنے لگے گی۔"

بختاور کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ شرما گئی۔ نظریں جھکا کر بولی۔ "ایسی گلاں کر کے کیوں مجھے بہکانے کی کوشش کر رہا ہے؟" یہ کہتی ہوئی وہ اٹھنے کے لیے کسمسائی۔ "چاچا آتا ہی ہو گا۔" اس کے چہرے کی شگفتگی فوراً ماند پڑ گئی' ہلکا ہلکا خوف منڈلانے لگا۔

مگر لالی نے اسے اٹھ کر جانے نہیں دیا۔ "میں تجھے کبرستان سے نکال کر باہر لایا' تو فیر کبرستان کی طرف چلی۔ زندہ رہنا ہے تو زندہ بن کر رہ۔ نہیں تو جلد ہی مرجائے گی۔"

"یہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "سچ کہتی ہوں' میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گی۔"

"اور اب بھی کہاں زندہ ہے؟"



"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" وہ اور افسردہ ہو گئی۔ "کوئی بھی تو کشش نہیں' کچھ بھی نہیں۔ ایسا جینا کس کام کا۔ مرجاؤں گی تو ٹھیک ہی ہو گا۔"

"کیا ٹھیک ہو گا؟" لالی کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ "پیر بخش تو خوش ہو گا۔ وہ سکندر کا جھٹ دوسرا ویاہ کر دے گا۔ جو بھی نئی ویاہ کر آئے گی' اسے بھی تیری طرح اپنی جورو بنا لے گا۔ سکندر تو کچھ کہے گا نہیں۔ یہ تجھے بھی پتہ ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

بختاور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہ زمین پر انگلی سے الٹی سیدھی لکیریں بنا رہی تھی۔ لالی نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔

"میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"بتا' میں کیا کروں؟"

"بتاتا ہوں' ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے مجھے یہ بتا' بشیرا کیا دھندا کرتا ہے؟"

بختاور کو لالی کی بات پسند نہیں آئی۔ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "مجھے اسی لیے روکا تھا؟ تو فیر سن لے۔ بشیرا کبروں سے مردوں کے پنجر نکالتا ہے۔"

"مردوں کے پنجر نکالتا ہے؟" لالی نے اس طرح آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے دیکھا جیسے یقین نہ آیا ہو۔ "مگر وہ انہیں کس لیے نکالتا ہے؟"

"پتہ نہیں۔" بختاور نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "میں نوں تو اتنا پتہ ہے وہ پنجروں کی ہڈیاں بکسوں میں بند کر کے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔" وہ چند لمحے چپ بیٹھی رہی۔ "اس نے چاچا اور سکندر کو بھی اسی رستے پر لگا دیا ہے۔ ذرا سوچ کتنا گندہ کام ہے۔ مردوں کی مٹی کھراب کرتے انہیں ذرا بھی تو ڈر نہیں لگتا۔"

"بشیرا یہیں رہتا ہے؟"

"نہ جی' وہ یہاں کیوں رہنے لگا۔ مہینے' ڈیڑھ مہینے میں ادھر کا پھیرا کرتا ہے۔ اس دفعہ تو کوئی تین مہینے بعد آیا ہے۔ پر جب بھی آتا ہے' تین چار روز ضرور ٹھیرتا ہے۔ اب کے وہ کئی دنوں سے ٹھیرا ہوا ہے۔ جواریوں کو پکڑنے پولیس کی جو دوڑ آئی تھی' بشیرا ہی نے چاچا کے ذریعے بلوائی تھی۔ چاچا مکھبری کرنے خود تھانے گیا تھا۔" لالی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ بختاور کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی پھر اس نے اٹھنے کے لیے پہلو بدلا۔

"اب مجھے جانے دے۔"

"چاچا کا ڈر لگ رہا ہے' یہی بات ہے نا؟"

"تیں توں پتہ نہیں' وہ کیسا بندہ ہے۔"

"اس کے بارے میں جاننے کو اب رہ کیا گیا ہے۔ سبھی کچھ تو بتا دیا۔ پر اس سے اتنا ڈرتی کیوں ہے؟"

"ڈروں نہیں تو کیا کروں۔ کتّا اپنے کھونٹے پر اچھلتا ہے۔ میرا کوئی بھی کھونٹا نہیں۔"

"مجھے پتہ ہے۔ پر تو جوان ہے اور جوان مٹیار کو جوان اور سوہنی ہی بن کر رہنا چاہیئے۔ جس زنانی کا کوئی نہیں ہوتا' وہ اسی کے سہارے زندہ رہتی ہے۔ میری بات کا مطلب سمجھ رہی ہے؟"

"سمجھ رہی ہوں' سب سمجھ رہی ہوں۔"

دونوں چند لمحے خاموش رہے۔ لالی نے کہا۔ "جانے سے پہلے ایک بار تیرے پاس ضرور آؤں گا' صرف ایک بات کہنے کے لیے۔ سونا نہیں' رات کو میرا انتظار کرنا۔"

وہ بے چین ہو کر بولی۔ "ابھی بتا دے۔"

"ابھی نہیں' رات کو بتاؤں گا۔ اب تو ٹر جا۔"

بختاور کمرے سے چلی گئی۔ لالی نے مڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہی شاداں کی چال' وہی گھڑی کے پنڈولم کے مانند ادھر سے ادھر جھولتے ہوئے کولھے' وہی پتھر کی طرح ترشا ہوا ٹھوس بدن۔ لالی اسے دیکھتا رہا۔

جب وہ صحن کا دروازہ کھول کر گھر کے اندر چلی گئی تو لالی اٹھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

☆

لالی بیدار ہوا تو کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا تھا۔ بشیرا چارپائی کے پاس کھڑا اسے آہستہ آہستہ جھنجوڑ رہا تھا۔ لالی نے آنکھیں کھولیں تو وہ ہنس کر بولا۔ "یار! بہت سو لیا۔ شام ہو رہی ہے۔ اب تو اٹھ جا۔" لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"منہ دھو لے' نیند کا خمار اتر جائے گا۔"

لالی چپ چاپ چارپائی سے نیچے اترا' کمرے سے باہر گیا اور منہ ہاتھ دھو کر واپس آ گیا۔ بشیرے نے مسکرا کر کہا۔ "ادھر' میرے پاس آ کر بیٹھ۔ اب تجھ سے کچھ کام کی باتیں ہو جائیں۔"

مگر لالی اس کے پاس نہیں گیا۔ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔ "پہلے یہ بتا' کیا تو کبروں سے مردوں کے پنجر نکالتا ہے؟"

"نکالتا تو ہوں۔" وہ انکار نہ کر سکا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا' مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ "مگر یہ بات



تجھے بتائی کس نے؟"

"کسی نے بھی بتائی' پر میں اس چکر میں نہیں پڑوں گا۔"

بشیرا نے کسی قدر پریشان ہو کر کہا۔ "بات کیا ہے؟"

"بات یہ ہے کہ یہ بہت گندا کام ہے۔ میں ایسے کام نہیں کرتا۔"

بشیرا لمحے بھر تک لالی کو گھورتا رہا پھر تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "زیادہ اڑنے کی کوشش نہ کر۔ مجھے پتہ ہے تو کتنا نیک اور بھلا مانس ہے۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔

"کہتا تھا' میں قبر کے اندر وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ لیکن تیرا ۴۰ دن کا چلہ ایک ہی رات میں ختم ہو گیا اور اب کراچی جانے کو کہتا ہے۔"

لالی نے فوراً بات بنانے کی کوشش کی۔ "کہنے کو تو میں نے یہ بھی کہا تھا' میں کبر کا مردہ ہوں۔"

بشیرا ذرا متاثر نہ ہوا۔ اسی طرح تیکھے لہجے میں بولا۔ "زیادہ باتیں نہ بنا۔ کسی مغالطے میں نہ رہنا۔ میری آنکھ پولیس والے کی آنکھ ہے۔ میں نے رات ہی کو تیری باتوں سے تاڑ لیا تھا' کوئی واردات کر کے بھاگا ہے۔ جبھی تو پولیس کے ڈر سے قبر میں چھپا بیٹھا تھا۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

لالی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ پیر بخش لالٹین سنبھالے ہوئے داخل ہوا۔ اس نے لالٹین چھت سے لٹکائی اور بشیرے سے پوچھنے لگا۔ "تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔ کام کب شروع کرنے کا ارادہ ہے؟"

"ذرا اندھیرا اور بڑھ جائے تو سکندر کے ساتھ کھدائی شروع کر دینا۔ میں آج ہی رات چلا جاؤں گا۔ ٹرک ایک بجے تک پہنچ جائے گا۔ لیکن تب تک سارا کام پورا ہو جانا چاہیئے۔"

"فکر نہ کر۔ سارا کام ٹھیک ٹیم پر ہو جائے گا۔" پیر بخش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پر کام شروع کرنے سے پہلے کچھ کھا پی لے۔"

"مجھے تو بالکل بھوک نہیں۔" بشیرا نے لالی سے کہا۔ "اپنے لیے روٹی منگوا لے۔"

"بھوک تو مجھے بھی نہیں ہے۔ میں بعد میں کھا لوں گا۔" لالی نے پیر بخش کی جانب دیکھا۔

"چاچا! میرے لیے روٹی یہیں رکھوا دینا۔ جب بھوک لگے گی' کھا لوں گا۔"

"جیسی تم دونوں کی مرضی۔" پیر بخش کمرے سے چلا گیا۔

لالی اپنی چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ بشیرا نے لالی کو ٹٹولا۔ "یار! اتنا گھبرا کیوں رہا ہے؟ یہ تو سیدھی سیدھی بزنس ہے۔" اس دفعہ اس کا لہجہ نرم تھا۔

"تیری بزنس شزنس سمجھ نہیں آئی۔ نہ جانے کیا چکر ہے۔"

"کوئی چکر شکر نہیں۔" بشیرے نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ "میں تجھے سب کچھ صاف صاف بتائے دیتا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے' میں کراچی کی ایک کمپنی کو مردوں کے پنجر سپلائی کرتا ہوں اور بھی کئی بندے یہ دھندا کرتے ہیں۔"

"پر کمپنی پنجر لے کر کرتی کیا ہے؟"

"باہر کے ملکوں کو ایکسپورٹ کرتی ہے۔ آج کل مال یونان اور اٹلی جا رہا ہے۔ پانچ سو ڈھانچوں کا آڈر ہے۔"

لالی بدستور حیرت زدہ تھا۔ "مگر مردوں کے یہ پنجر کس کام آئیں گے؟"

"یار! حد ہوگئی۔" بشیرا ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "یہ میڈیکل کالجوں میں جو لڑکے لڑکیاں ڈاکٹری پڑھتے ہیں' انسانی ڈھانچوں اور پنجروں کے بغیر ان کی پڑھائی کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ ڈھانچے ایسے ہی کالجوں کے لیے سپلائی کئے جاتے ہیں۔ اسپتالوں اور دوا بنانے والی کمپنیوں کو بھی ان کی ضرورت پڑتی ہے اور بھی ایسے ہی دوسرے کاموں میں استعمال ہوتے ہیں۔" وہ لمحے بھر خاموش رہا پھر اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو نے کبھی یہ بھی سوچا' اپنے اسپتالوں اور میڈیکل کالجوں میں جو انسانی ڈھانچے لٹکے نظر آتے ہیں' وہ کہاں سے آتے ہیں؟"

"مجھے کیا پتہ۔" لالی نے جواب دیا۔ "پر مجھے یہ پتہ ہے' ایسا کرنا جرم ہے۔"

"جرم تو ہے۔" بشیرا نے ڈھٹائی سے کہا۔ "اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ قبروں کی بے حرمتی کرنے کے الزام میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۷ کے تحت ضابطے کی کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔"

لالی نے خبردار کیا۔ "کسی دن دھر لیا گیا تو سیدھا جیل جائے گا۔"

"چھوڑ یار! کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔" بشیرا نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ "حکومت بھی جانتی ہے یہ ڈھانچے کہاں سے آتے ہیں؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ انسانی ڈھانچے درختوں میں نہیں اگتے اور مردے قبروں سے نکل کر میڈیکل کالجوں اور اسپتالوں میں نہیں جاتے؟ کسی نہ کسی قبر ہی سے کھود کر نکالے جاتے ہیں۔"

"تیری بات کچھ کچھ سمجھ آتی ہے۔"

"کمپنی کے پاس حکومت کی طرف سے باقاعدہ ایکسپورٹ لائسنس ہے اور کمپنی بھی کوئی ایسی ویسی نہیں' برٹش کمپنی ہے۔ دوائیں تیار کرتی ہے۔ پاکستان میں کمپنی کا سول ایجنٹ اپنا حاجی صالح بھائی لال جی کافور والا ہے۔ بہت وڑا کاروبار ہے اس کا۔ مجھ سے تو پنجر اور ڈھانچے وہی خریدتا



ـ" وہ زیر لب مسکرایا۔ "تجھے ایک راز کی بات بتاؤں' ہر وڈا سرکاری اسپتال مردوں کے نجے فروخت کرتا ہے۔"

لالی کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔ "نہیں جی' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں تجھ سے کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔" بشیرا نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔ "یہ جو الوں میں لاوارث لاشیں رہ جاتی ہیں' تیرے خیال میں کیا انہیں کفن میں لپیٹ کر دفن کیا جاتا ' قبر بنائی جاتی ہے؟ یار! کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایسی لاشیں کچھ عرصے تک اسپتالوں کے مردہ ں میں پڑی رہتی ہیں' بعد میں ڈاکٹری پڑھنے والے لڑکے لڑکیاں ان کی چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ فیر وہ ں اسپتال ہی کے ایک حصے میں زمین کھود کر دبا دی جاتی ہیں۔ سال سوا سال بعد جب کھال اور ت گل سڑ کر مٹی بن جاتے ہیں اور صرف ہڈیوں کا پنجر رہ جاتا ہے تو اسے نکال کر فروخت کر دیا ہے۔"

"حد ہوگئی جی۔" لالی منہ بگاڑ کر نفرت سے بولا۔ "سرکاری اسپتال یہ دھندا بھی کرتے ہیں۔"

"اگر اسپتال یہ دھندا نہ کرتے تو اپنا دھندہ کیسے چلتا؟ یوں سمجھ لے' اسپتالوں کے نام پر اپنا ا بھی چل رہا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ سرکاری اسپتال سے ۱۰ پنجر خریدے جاتے ہیں تو رجسٹروں میں نا کر دکھائے جاتے ہیں۔ جو کمی رہ جاتی ہے وہ ہماری سپلائی سے پوری کر دی جاتی ہے۔"

لالی ذرا دیر بھونچکا بیٹھا رہا پھر اس نے پوچھا۔ "یار بشیرے! تو اس چکر میں کیسے پڑ گیا؟"

"یہ نہ پوچھ۔ اسی چکر میں تو پولیس کی ملازمت گئی۔" بشیرے نے گہری سانس بھر کر بتایا۔ "چار سال ادھر کی بات ہے۔ میں ان دنوں کراچی میں تعینات تھا۔ ہوا یہ کہ پولیس کو ایک رات ے پر ایک لاش ملی۔ لاش بری طرح کچلی ہوئی تھی۔ بظاہرا یکسیڈنٹ کا کیس لگتا تھا۔ پولیس کی ائی تفتیش کے بعد لاش کئی روز تک اسپتال کے مردہ خانے میں پڑی رہی۔ جب کوئی لینے نہیں و اسپتال والوں نے لاش لاوارث قرار دے کر اسپتال کے اس حصے میں دبا دی جہاں ایسی لاشیں کی جاتی ہیں۔ یادداشت کے لیے اس جگہ رجسٹر کے اندراج کے حساب سے تختی پر نمبر بھی لگا اتا ہے۔"

لالی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ اطمینان سے بتاتا رہا۔ "فیر ایسا ہوا کہ چار مہینے بعد اوپر والوں کو یہ اطلاع ملی کہ وہ ایکسیڈنٹ کا نہیں قتل کا کیس تھا۔ متوفی سرگودھا کا ے والا تھا' کاروبار کے سلسلے میں کراچی آیا تھا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "ایک مجسٹریٹ کی نی میں عدالتی انکوائری ہوئی۔ جس جگہ لاش دفن تھی اس کی نگرانی کے لیے میری اور عبداللہ

خان کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگائی گئی۔ لاش زمین سے کھود کر نکالنے پر بھی ہم دونوں کو لگایا گیا۔ ایک روز ہم دونوں اسپتال میں تھے کہ صالح بھائی لال جی کافور والا بھی وہاں آگیا۔ وہ اسپتال والوں سے ڈھانچوں کا سودا کرنے آیا تھا۔ مگر دراصل وہ ہم دونوں کی تلاش میں تھا۔ اس نے ہم سے راز داری میں بات چیت شروع کی تو پتہ چلا کہ لاش سرے سے وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ اس نے تین ہزار رشوت دے کر ہم دونوں کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ اس جگہ کوئی اور لاش دبا دی جائے تاکہ ضابطے کی کارروائی پوری ہو جائے۔"

"مگر صالح بھائی' وہ لاش لایا کہاں سے تھا؟"

"اسپتال کے مردہ خانے سے لایا ہوگا یا کسی قبر سے کھود کر نکالی ہوگی۔ یہ لاش اس نے ہمیں دی۔ لاش بری طرح گل سڑ چکی تھی۔ ہم نے رات کے اندھیرے میں دیکھا بھی نہیں۔ فنافٹ زمین کھود کر اسے دبا دیا۔ اسپتال کے عملے کو صالح بھائی نے کھلا پلا کر پہلے ہی پکا کرلیا تھا۔ اس لیے کام آسانی سے ہوگیا۔ پوسٹ مارٹم ہوا تو پتہ چلا کہ لاش مرد کے بجائے کسی زنانی کی ہے۔ بس اسی سے معاملہ بگڑ گیا۔ ہم دونوں معطل کر دیئے گئے۔ سیدھی سیدھی جیل ہو جاتی مگر حاجی صالح بھائی بہت حوصلے والا بندہ ہے۔ اس نے بھاگ دوڑ کی' روپیہ پانی کی طرح بہایا اور ہم دونوں کو صاف بچا لیا۔ لیکن نوکری نہ بچ سکی۔ عبداللہ خان نے تو کوئی اور دھندہ شروع کردیا۔ مجھے صالح بھائی نے اس لائن پر لگا دیا۔"

لالی کے مجرمانہ ذہن میں کھلبلی مچی۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ "یہ بتا کتل صالح بھائی نے کرایا تھا؟"

"یہ تو آج تک پتہ نہیں چل سکا' قتل کس نے کیا تھا اور کس نے کرایا تھا۔" اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ "میرا خیال ہے صالح بھائی اس میں شریک نہیں تھا۔ وہ کسی اور کے لیے کام کر رہا تھا۔"

"یار بشیرے کوئی اور دھندا کر' یہ تو بہت واہیات کام ہے۔"

بشیرا نہایت ڈھٹائی سے بولا۔ "مگر یار' اس کام میں فائدہ بہت ہے۔ میں دو ہزار میں حاجی صالح بھائی کو ایک پنجر سپلائی کرتا ہوں۔ چار پانچ سو روپے اس کے نکالنے اور پہنچانے پر خرچ آتا ہے۔ دو سو تو گورکن ہی لے لیتا ہے۔ فیر کرایہ بھاڑا ہے۔ ریلوے اور پولیس کو رشوت بھی دینی پڑتی ہے۔ اس طرح مجھے ایک پنجر پر لگ بھگ ڈیڑھ ہزار مل جاتا ہے۔ میں یہاں سے چار پنجر لے جاؤں گا۔ چھ ہزار سیدھے سیدھے ہاتھ آجائیں گے۔ اب تو ہی بتا' کسی اور دھندے میں اتنی کمائی ہو سکتی ہے؟" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔



"اس کام میں مٹی سے سونا بنتا ہے۔ کیا سمجھا؟"

لالی متاثر نہ ہوا۔ "یار! میں تو یہ سمجھتا ہوں' پیسہ بنانے کے چکر میں مرنے والوں کی مٹی خراب کر رہا ہے۔ تیرا یہ دھندا چلتا رہا تو کسی دن کبر میں ایک بھی مردہ نہ رہے گا۔ یہ تو سوچ' ایک دن تجھے بھی مرنا ہے۔"

"شروع شروع میں ایسی باتیں میں بھی سوچتا تھا۔ ڈرتا بھی تھا' پر اب تو اس کام میں مزہ آنے لگا ہے۔ ادھر مال اٹھایا' ادھر پہنچایا' اپنے پیسے کھرے کیے۔ ایک ہی آرڈر سپلائی کرنے میں ہزاروں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔"

"کئی سال سے یہ کام کر رہا ہے' لاکھوں بنا لیے ہوں گے۔ ابھی تک تیری ہوس پوری نہیں ہوئی۔"

"نہیں یار' ایسی کوئی لوٹ پڑی ہے۔ روز روز سپلائی کہاں ہوتی ہے؟ مہینے دو مہینے بعد کام نکلتا ہے۔ یوں سمجھ لے' اب تک میں نے زیادہ سے زیادہ ۵۰ ڈھانچے یا پنجر سپلائی کیے ہوں گے۔"

"یہ تعداد کم ہے؟ تیرے ہی حساب سے دیکھا جائے تو اب تک ساٹھ ستر ہزار تو کما ہی چکا ہے۔ اتنے روپے سے کوئی بھی کاروبار شروع کر سکتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں' اب یہ کام چھوڑ' کوئی اور دھندا کر۔"

بشیرے نے سگریٹ کا لمبا کش لگا کر دھواں اڑایا۔ "کہتا تو ٹھیک ہے۔ اپنا بھی ایسا ہی ارادہ ہے۔ میرا پروگرام یہ ہے کہ سو ڈھانچے سپلائی کرنے کے بعد یہ دھندا ختم کردوں گا۔"

"یار! یہ سو کی شرط کیوں رکھی ہے؟"

"تب تک اتنی رقم اکٹھی ہو جائے گی کہ میں کاٹن جننگ فیکٹری لگا سکوں گا۔ اس کا سودا بھی ہو چکا ہے۔ ایڈوانس بھی دے چکا ہوں۔ چھ مہینے کے اندر اندر پوری رقم ادا کرنی ہے۔"

"کراچی میں سودا کر رکھا ہے؟"

"لائل پور میں چنیوٹی شیخ برادری کا اپنا ایک یار ہے' سیٹھ حمید اللہ گھوں۔ بہت وڈا کاروبار ہے اس کا۔ کئی فیکٹریاں اور کارخانے ہیں۔ اسی کی معرفت سودا طے ہوا ہے۔ اس کے ساتھ میری یاری دوستی بھی عجب طرح سے ہوئی۔ پتہ ہے کیسے ہوئی؟"

لالی خاموش بیٹھا رہا۔

"ہوا یہ کہ سیٹھ حمید گھوں کی بیٹی' لاکھ' ڈیڑھ لاکھ نقدی اور زیور لے کر ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔ میں ان دنوں لائل پور میں تعینات تھا۔ سیٹھ حمید گھوں خود تھانے آیا۔ رات کا وقت تھا' میں

ڈیوٹی پر تھا۔ سیٹھ حمید کو شبہ تھا کہ دونوں ٹرین سے کراچی جانے والے ہیں۔ میں فوراً اسٹیشن پہنچا۔ دیکھا' دونوں ٹرین میں سوار ہونے جا رہے ہیں۔ میں نے وہیں انہیں دھر لیا۔ سارا کام خاموشی سے ہو گیا۔ نہ بدنامی ہوئی' نہ ہنگامہ۔ مگوں بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے ہزار روپے بھی دیئے۔ اسی روز سے اس کے ساتھ میری یاری بھی ہو گئی۔" بشیرا نے لالی کو غور سے دیکھا' ہنس کر بولا۔ "میں تو کہتا ہوں' اپنے ساتھ لگ جا' عیش کرے گا۔ بول' کیا کہتا ہے؟"

لالی نے صاف انکار کر دیا۔ "نہیں جی! میں ایسے دھندے میں نہیں پڑتا۔"

"نہ پڑ' تیری مرضی۔ مگر آج رات تو میرے ساتھ کام کرے گا۔ دیکھ' انکار نہ کرنا۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ذرا دیر سر جھکائے کچھ سوچتا رہا' پھر بولا۔ "یہ بتا' مجھے دے گا کیا؟"

"چار سو روپے۔ مطلب یہ کہ ایک پنجر کے سو روپے۔"

"پورے پانچ سو کر دے۔" اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "مگر میرے حصے کا روپیہ تجھے پہلے دینا ہو گا۔"

"منظور ہے۔" بشیرے نے جیب سے پانچ سو روپے نکالے اور لالی کے حوالے کرتے ہوئے خبردار کیا۔ "ایک بات کان کھول کر سن لے' میرے ساتھ کوئی داؤ کیا تو یہ سمجھ لے' میں بہت خطرناک بندہ ہوں۔"

لالی نے روپے جیب میں رکھے اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں نوں پتہ ہے تو کتنا خطرناک بندہ ہے۔ مگر میں بھی ایسا ویسا بندہ نہیں ہوں' اپنی بات کا پکا ہوں۔ وعدہ کروں گا تو پورا کروں گا۔ میدان چھوڑ کر بھاگنے والا نہیں۔ وکھت پڑے تو آزما لینا۔"

بشیرا ہنستا ہوا اٹھا' لالی کے پاس گیا اور اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔ "زیادہ باتیں نہ بنا۔ چل اٹھ۔ ابھی بہت کام کرنا ہے۔" لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دونوں دروازے کی جانب بڑھے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

☆

شام اب تاریک ہو چکی تھی۔ ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ بشیرا اور لالی اندھیرے میں آگے بڑھنے لگے۔ چند ہی قدم چلنے کے بعد بشیرا درختوں کے نیچے بنی ہوئی کوٹھری کے دروازے پر ٹھہر گیا۔ دروازہ بند تھا مگر اندر روشنی تھی۔

اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ کوٹھری میں چراغ جل رہا تھا۔ اس کی دھندلی روشنی میں پیر بخش اور سکندر فرش پر بیٹھے تھے۔ ان کے قریب



لمبی لمبی خشک گھاس کا ڈھیر تھا۔ ایک طرف لکڑی کے دو بکسے رکھے تھے۔ ان کے ڈھکنے کھلے ہوئے تھے۔ بکسے چیڑ کی لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر بنائے گئے تھے۔ پیر بخش اور سکندر ان میں گھاس کی تہہ جما رہے تھے۔

بشیرے نے کوٹھری میں داخل ہوتے ہی کہا۔ "تم دونوں نے ابھی تک کھدائی شروع نہیں کی؟"

پیر بخش ہنس کر بولا۔ "میں نے سوچا' جب تک اندھیرا ہو' اتنی دیر میں یہ کام کر لیا جائے۔" اس نے بکسے میں بچھی ہوئی گھاس کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کام بھی تو ضروری ہے۔"

"یہ کتنی دیر کا کام ہے' بعد میں ہو جاتا۔ پہلے کھدائی ہونی چاہئے۔ یہ سمجھ لے' ٹرک زیادہ دیر نہیں ٹھہرے گا۔"

پیر بخش اطمینان سے بولا۔ "فکر نہ کر۔ ادھر کا کام تو ہم نے نمٹا ہی دیا۔ بس اب کھدائی کا نمبر ہے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

سکندر بھی باپ کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔ لالی نے سکندر کو غور سے دیکھا۔ وہ اٹھارہ انیس سال کا نوجوان تھا۔ لیکن پیر بخش کا بدن جس قدر گٹھا ہوا اور مضبوط تھا' سکندر اسی قدر دبلا پتلا' مریل سا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں' چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔ وہ تمام وقت خاموش رہا۔

پیر بخش نے کوٹھری کے ایک کونے میں پڑی ہوئی کدالیں اٹھائیں اور سکندر کو دے دیں۔ اس نے چپ چاپ کدالیں کندھے پر رکھ لیں۔

بیلچے پیر بخش نے سنبھال لیے۔ دونوں کوٹھری سے چلے گئے۔ پیر بخش نے جاتے جاتے دروازے پر ٹھٹک کر بشیرے سے کہا۔

"چاروں کبروں پر نشان تو میں نے دن ہی کو لگا دیئے تھے۔ ہم دونوں جا کر پہلے پچھم والی کبروں کی کھدائی شروع کرتے ہیں۔ تسیں کتنی دیر میں پہنچو گے؟"

"تم کھدائی شروع کرو' میں بھی ذرا دیر میں پہنچ جاؤں گا۔" بشیرا نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "روشن میرے ساتھ ہو گا' یہ بھی تمہارے ساتھ کام کرے گا۔"

پیر بخش اور سکندر چلے گئے۔

بشیرے نے لالی سے کہا۔ "اب یہ بھی سمجھ لے سارا کام کیسے ہو گا۔" اس نے دونوں بکسوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "ان پیٹیوں میں ڈھانچے بند کئے جائیں گے۔ ایک پیٹی میں دو ڈھانچے رکھے جائیں گے۔ انہیں گھاس میں اس طرح سنبھال کر رکھا جاتا ہے کہ ہڈیاں سفر میں ٹوٹنے

پھوٹنے نہ پائیں۔"

"انہیں ریل سے لے جائے گا؟"

"میں اس دفعہ ٹرین سے مال نہیں لے جاؤں گا۔"

لالی نے چونک کر پوچھا۔ "فیر کیسے لے جائے گا۔"

"ٹرک سے مال جائے گا۔" بشیرا نے جواب دیا۔ "اپنے جاننے والے ایک پولیس انسپکٹر کا کراچی تبادلہ ہوگیا ہے۔ اس کا سامان ٹرک سے جا رہا ہے۔ میں نے اس سے معاملہ طے کرلیا ہے۔ دوپہر کو اسی کے پاس گیا تھا۔ اس کے سامان کے ساتھ اپنی دونوں پیٹیاں بھی چلی جائیں گی۔ راستے میں کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ شہر سے ایک کانسٹیبل بھی اپنے ساتھ جائے گا۔"

"تب تو تیرا سٹیشن جانا نہیں ہوگا۔"

"اب سٹیشن جا کر کیا کروں گا۔ تجھے بھی تو کراچی ہی جانا ہے نا؟"

"نہیں یار! میں تو ٹرین سے جاؤں گا۔"

بشیرا نے لالی کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "پولیس سے ڈر رہا ہے؟" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "پروا نہ کر' اپنے ساتھ رہے گا تو تجھ پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکے گا۔" اس نے رازداری کے انداز میں آہستہ سے پوچھا۔

"یہ تو بتا' بات کیا ہے؟ کوئی اونچا پھڈا ہوگیا؟"

لالی نے صاف انکار کردیا۔ "نہیں جی! ایسی کوئی بات نہیں۔"

"فیر تو اپنے ساتھ کیوں نہیں چلتا؟ ٹرک میں ٹرین سے زیادہ آرام سے وقت گزرے گا۔ میں تو کہتا ہوں' تو بھی اپنے ساتھ ہی چلا چل۔"

لالی چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا' پھر وہ آمادہ ہوگیا۔ "تیرے ہی ساتھ چلوں گا پر کراچی تک نہیں جاؤں گا۔ مجھے شہر پہنچنے سے پہلے اتار دینا۔ میں نے پہلے کاور آباد سٹیشن جانا ہے۔ وہاں ایک دوست میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں اسے ساتھ لیے بنا کراچی نہیں جا سکتا۔"

"یہ بات تو نے پہلے کیوں نہ بتائی؟" بشیرا نے مسکرا کر کہا۔ "اپنی باتوں سے تو خود ہی شبہ پیدا کرتا ہے۔"

لالی نے بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "بشیرے! تو اس طرف آتا جاتا ہی رہتا ہے۔ یہ بتا' گوردا پورہ کتھے ہے؟"

بشیرا نے ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "وہ تو اس طرف رہا۔"



"یہاں سے کتنی دور ہوگا؟"

"یہاں سے ۱۵ میل تو ہوگا۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوگا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "پر تو گوردا پورے کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"گل ایہہ ہے' میں گوردا پورے ہی جا رہا تھا۔ کل رات اندھیرے میں رستہ بھٹک کر ادھر آگیا۔"

"بہت دور نکل آیا۔ یہ تو اپنے میاں حیات محمد خاں وٹو کی جاگیر کا علاقہ ہے۔ یہاں سے تو گوردا پورے کو کوئی کچا رستہ بھی نہیں جاتا۔"

حیات محمد وٹو کا نام سن کر لالی پریشان ہوگیا۔ "نہیں' اب مجھے گوردا پورے نہیں جانا' تیرے ہی ساتھ چلوں گا۔"

بشیرا نے گھاس کے ڈھیر کے پیچھے سے بڑا سا تھیلا نکالا اور اندر ہاتھ ڈال کر دو بڑی بڑی ٹارچیں نکالیں۔ انہیں جلا کر دیکھا۔ اس نے ایک ٹارچ لالی کو دی۔ تھیلا اپنے ہاتھ میں لٹکایا اور لالی کو مخاطب کیا۔

"چل یار! اب کام شروع کیا جائے۔ بہت باتیں ہوگئیں۔"

دونوں کوٹھری سے باہر نکلے۔ بشیرے نے دروازہ بند کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ درختوں کے نیچے گہرا اندھیرا تھا۔ بشیرے نے ٹارچ روشن کی تو پگڈنڈی نظر آئی۔ یہ پگڈنڈی قبرستان کی طرف جاتی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ قبرستان اندھیرے میں بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔

کچھ دور آگے جا کر انہیں ایک طرف ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ دونوں قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے روشنی کی طرف بڑھے۔ قریب جا کر انہوں نے دیکھا' ایک گھنی جھاڑی کی آڑ میں لالٹین رکھی ہے۔ اس کی دھندلی روشنی میں پیر بخش کدال سے ایک قبر کا بالائی حصہ کھود رہا ہے اور سکندر بیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر ایک طرف ڈالتا جا رہا ہے۔ قبر کچی تھی اور مٹ مٹا کر برابر ہو چکی تھی۔

بشیرے اور لالی کے پہنچنے کے بعد بھی دونوں اپنے کام میں جٹے رہے۔ قبر دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کھدائی شروع ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری۔

جب قبر اتنی کھد گئی کہ تختے نظر آنے لگے تو دونوں نے ہاتھ روک دیئے۔ تختے بھی گل سڑ گئے تھے۔ پیر بخش نے کدال اڑا کر ایک تختہ نکالا' فوراً بو کا بھبکا اٹھا۔ لالی کا جی متلانے لگا۔ بشیرے نے

تھیلے سے چادر نکالی اور چہرے پر اس طرح ڈھاٹا باندھ لیا کہ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ اس نے تھیلے سے دوسری چادر نکال کر لالی کو دی۔ اس نے بھی ڈھاٹا باندھ لیا۔ پیر بخش اور سکندر نے بھی اپنے سروں سے پگڑیاں اتار کر ناک اور منہ کے گرد لپیٹ لیں۔ مگر انہوں نے بشیرے اور لالی کی طرح پورے ڈھاٹے نہیں باندھے۔

ایک ایک کر کے تمام تختے نکال کر الگ کر دیئے گئے۔ لالی نے بھی تختے نکالنے میں پیر بخش اور سکندر کی مدد کی۔ البتہ بشیرا الگ کھڑا رہا اور بار بار کہتا رہا۔ "دیکھو' مٹی اندر نہ گرنے پائے۔ کوئی ٹوٹا ہوا تختہ بھی نیچے نہ گرے۔"

پیر بخش اور سکندر تو اپنے کام میں منجھے ہوئے تھے لیکن لالی اناڑی تھا۔ بشیرے کو اسی سے خدشہ تھا۔ مگر لالی نے زیادہ اناڑی پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔

تختے ہٹ گئے تو قبر کا منہ کھل گیا۔ بشیرے نے ٹارچ سے قبر کے اندر روشنی کی۔ لالی نے جھک کر دیکھا تو لرز کر رہ گیا۔ قبر میں مردے کا ڈھانچا پڑا تھا۔ کھال اور گوشت گل سڑ کر مدت ہوئی خاک میں مل چکا تھا۔ اب تو صرف سفید سفید' ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ ان پر جگہ جگہ مٹی جمی تھی۔ سرخ سرخ چیونٹے اور دوسرے کیڑے مکوڑے ادھر ادھر رینگ رہے تھے۔ لالی یہ ہولناک منظر زیادہ دیر نہ دیکھ سکا۔

پیر بخش نے ربڑ کے بڑے بڑے سیاہ جوتے پہنے۔ بشیرے سے ربڑ کے دستانے لے کر ہاتھوں پر چڑھائے اور قبر کے اندر اتر گیا۔ بشیرے نے تھیلے سے ایک اور چادر نکالی اور قبر کے قریب بچھا دی۔ پیر بخش قبر کے اندر سے ڈھانچے کی ہڈیاں نکال' نکال کر سکندر کو دینے لگا۔ اس نے سب سے پہلے کھوپڑی نکالی' پھر دوسری ہڈیاں نکالیں۔ سکندر انہیں سنبھال' سنبھال کر چادر پر رکھتا رہا۔

ڈھانچے کی تمام ہڈیاں باہر نکالنے کے بعد پیر بخش قبر سے نکل کر باہر آگیا۔ ہڈیوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ چادر میں لپیٹا گیا۔ پیر بخش اور سکندر اسے سنبھال کر اس کوٹھری کی طرف روانہ ہو گئے جہاں بکسے رکھے تھے۔ ادھر بشیرے کی ہدایت پر لالی نے قبر کے منہ پر تختے لگائے اور بیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر تختوں پر اس طرح ڈھیر بنا دیا کہ قبر ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگی۔

دوسری قبر جس کے اندر سے ڈھانچا نکالنا تھا' زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ بشیرے کی نشاندہی پر لالی نے کدال اٹھا کر اسے کھودنا شروع کر دیا۔ وہ کھودتا بھی جاتا اور بیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر الگ رکھتا جاتا۔ جب پیر بخش اور سکندر واپس آئے تو دوسری قبر کے تختے نظر آ رہے تھے۔ لالی نے ان دونوں کی مدد سے ذرا ہی دیر میں تختے نکال کر علیحدہ رکھ دیئے۔ دوسری قبر سے بھی ڈھانچے کی کھوپڑی اور



ہڈیاں باہر نکالی گئیں۔ پیر بخش اور سکندر انہیں چادر میں لپیٹ کر ایک بار پھر کوٹھری کی جانب روانہ ہو گئے۔

بشیرا' لالی کو تیسری قبر پر لے گیا۔ لالی نے اسے بھی کھود ڈالا اور اس دفعہ پیر بخش اور سکندر کے آنے سے پہلے پہلے قبر کے بوسیدہ تختے بھی نکال کر علیحدہ رکھ دیئے۔ جب تیسرے ڈھانچے کی ہڈیاں بھی قبر سے باہر نکال لی گئیں اور پیر بخش اور سکندر اسے لے کر چلے گئے اور لالی نے تختے لگا کر ان پر مٹی بھی ڈال دی تو بشیرے نے منہ سے ڈھاٹا کھول دیا اور لالی سے مخاطب ہوا۔ "یار! تو نے تو کمال کر دیا۔ فٹافٹ تین پنجر نکال لیے۔ اب تو بھی منڈاسا کھول دے۔"

لالی نے چہرے سے ڈھاٹا کھول کر کہا۔ "یار! میرا تو ارادہ تھا کہ کام ختم کرنے کے بعد ہی منہ کھولوں گا۔"

بشیرے نے محبت سے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ "پیارے! دل خوش کر دیا۔ اب ایسا کر۔ کمرے میں جا کر منہ ہاتھ دھو۔ کچھ کھا پی لے۔ بہت کام کر لیا۔"

لالی چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ تھک گیا تھا' بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس نے بشیرے کی بات مان لی' اس سے دریافت کیا۔ "تیرا روٹی کھانے کا ارادہ نہیں؟"

"نہیں یار! مجھے بالکل بھوک نہیں۔ میں تو سارا کام ختم کر کے صرف چائے پیوں گا۔ تو اب جا اور تازہ دم ہو کر آ۔ ویسے اب کام زیادہ نہیں رہا۔ ایک ہی پنجر تو نکالنا رہ گیا ہے۔" اس نے ٹارچ روشن کر کے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "ابھی تو گیارہ بھی نہیں بجے۔ بہت ٹیم ہے اپنے پاس۔"

لالی خاموشی سے درختوں کی جانب چل دیا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ راستے میں پیر بخش اور سکندر مل گئے۔ پیر بخش نے پوچھا۔ "کتھے چلا؟"

"بھوک لگ رہی ہے۔ روٹی کھا کر آؤں گا۔ جب تک تم دونوں بھی آرام کر لو۔"

پیر بخش بولا۔ "بختاور نے تیرے لیے روٹی کمرے میں رکھ دی ہے۔ بالٹی میں پانی بھی ہے۔ روٹی کھانے سے پہلے ٹھیک طرح صابن سے ہاتھ اور منہ دھو لینا۔ صابن بالٹی کے پاس ہی رکھا ہے۔"

سکندر اس دفعہ بھی نہ بولا' خاموش کھڑا لالی کو ٹکر ٹکر تکتا رہا۔ ذرا دیر بعد وہ پیر بخش کے ہم راہ آگے بڑھ گیا۔

لالی قبروں کے درمیان سے گزرتا ہوا پیر بخش کے ڈیرے کی جانب چلنے لگا۔ درختوں کے نیچے

پہنچ کر اس نے ٹارچ روشن کی۔ پیر بخش کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ گلی کے اس پار برآمدے میں کوئی اندھیرے میں کھڑا تھا۔

لالی نے ٹارچ بجھا دی' آہستہ آہستہ برآمدے میں داخل ہوا۔ دروازے کے قریب اسے بختاور نظر آئی۔ وہ' آہٹ پر سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ مگر لالی نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔ بختاور بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں پہنچی۔

"بہت دیری کر دی۔ میں تو گھنٹے بھر سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔"

لالی نے مڑ کر اسے دیکھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ کانوں میں چاندی کے مندرے تھے۔ بال سلیقے سے سنوارے گئے تھے۔ ان میں تیل چمک رہا تھا۔ دنداسا لگانے سے ہونٹ گلابی ہو گئے تھے۔

لالی نے اس کی یہ سج دھج دیکھی تو مسکرا کر بولا۔ "بختاور اب تجھے کسی کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ تیرا انتظار کرنے والے تو خود پیدا ہو جائیں گے۔ ایک دم سوہنی مٹیار بن گئی۔ ماجھے کی جٹی لگ رہی ہے۔"

بختاور ذرا شرمائی' مسکرا کر بولی۔ "یہ بتا' توں کیا کہنا چاہتا تھا؟"

لالی نے جیب سے پانچ سو روپے نکالے اور بختاور کو دے کر بولا۔ "لے' یہ رکھ لے۔ یہ کمائی میں نے تیرے ہی لیے کی تھی۔ میں مردوں کا مال نہیں کھاتا۔"

وہ تنک کر ناز سے بولی۔ "اور مجھے مردوں کا مال کھلانا چاہتا ہے؟"

"تیری بات دوسری ہے۔ برسوں سے مردوں کا مال کھا رہی ہے۔" یہ کہتا ہوا وہ کمرے سے چلا گیا۔ باہر برآمدے میں جا کر اس نے صابن مل کر اچھی طرح ہاتھ دھوئے' منہ صاف کیا اور تازہ دم ہو کر کمرے کے اندر آ گیا۔ بختاور ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ لالی آتے ہی چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ بختاور نے پوچھا۔

"توں نے وہ بات نہیں بتائی؟"

لالی نے ان جان بن کر کہا۔ "کون سی بات؟"

"وہی بات جسے بتانے کا دن کو وعدہ کیا تھا۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"میں تو یہ چاہتا ہوں' اگر تجھے کبرستان ہی میں رہنا ہے تو مردوں کی بجائے زندوں کی طرح رہے۔"

وہ افسردہ ہو گئی۔ "کس کے لیے زندہ رہوں' کیسے زندہ رہوں؟"



لالی نے اسے نظر بھر کر دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔ بختاور چند لمحے تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے نظریں جھکا لیں آہستہ سے بولی۔ "مجھے اس طرح کیوں گھور رہا ہے؟"

لالی نے گہری سانس بھری۔ "اس لیے کہ تو مجھے بہت سوہنی لگ رہی ہے۔ پتہ نہیں' میرے بارے میں تو کیا سوچتی ہے۔"

"توں برا بندہ نہیں ہے۔"

"میں کہوں تو میرے ساتھ بھاگ چلے گی؟ بول' کیا کہتی ہے؟"

"ڈر لگتا ہے۔ پتہ نہیں' توں کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ مجھے تو تیرے بارے میں کچھ بھی نہیں ملوم۔"

"ٹھیک ہی ہے کہ تجھے کچھ نہیں ملوم۔" لالی کسی قدر جذباتی ہو گیا۔ "میرے ہاتھ میں ایسی لکیر ہی نہیں کہ کسی مٹیار سے پیار کروں اور اسے اپنی گھر والی بناؤں۔"

"تیری باتیں سمجھ نہیں آتیں۔ صاف صاف بتا؟"

لالی کچھ کہنے ہی والا تھا' اچانک دروازہ کھلا۔ سکندر اندر داخل ہوا۔ لیکن جیسے ہی بختاور پر اس کی نظر پڑی' ایک دم بھڑک اٹھا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہے؟"

بختاور کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا۔ وہ گھبرا کر اٹھنے لگی۔ مگر لالی نے اسے اٹھنے نہیں دیا' ڈپٹ کر بولا۔ "بیٹھی رہ۔"

"میں ابھی بابا کو لے کر آتا ہوں۔ وہی اسے پوچھے گا یہاں کیوں آئی؟"

لالی نے مسکرا کر کہا۔ "اس کا کھسم تو ہے یا تیرا پیو؟"

سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا' لالی کو گھورتا رہا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر اس نے کہا۔ "توں ہمارے معاملے میں بولنے والا کون ہوتا ہے؟"

"خاما خا گرمی نہ دکھا۔ یہاں آ کر میرے پاس بیٹھ۔ فیر بتاؤں گا' میں اس معاملے میں بولنے والا کون ہوں؟"

سکندر چپ چاپ چٹائی پر بیٹھ گیا۔ لالی نے بختاور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ذرا اس کی طرف دیکھ اور سوچ' تجھے کیسی سوہنی گھر والی ملی ہے۔ تو اس کا مرد ہے۔ کبھی اسے پیار بھری نظروں سے بھی دیکھا؟"

بختاور بیچ میں بول پڑی۔ "یہ کیا دیکھے گا۔ چاچا دیکھنے ہی کب دیتا ہے۔ جو وہ کہتا ہے' وہی یہ کرتا ہے۔ بول' میں کوئی جھوٹ کہہ رہی ہوں؟"

سکندر مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "مجھے اس سے ڈر جو لگتا ہے۔"

"یوں ہی ڈرتا رہا تو فیر یہ بھی سن لے' یہ کسی دن پھر سے اڑ جائے گی اور یہ سمجھ لے ایسی گھر والی تجھے دوبارہ نہیں ملے گی۔" لالی نے اسے خبردار کیا۔

"پر میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"اس سے پہلے کہ یہ کسی اور کے ساتھ بھاگے' اسے لے کر یہاں سے بھاگ جا۔"

"نہیں جی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" سکندر خوف زدہ ہو گیا۔ "بابا مجھے جان سے مار دے گا۔ تو جانتا نہیں وہ کیسا بندہ ہے؟"

لالی نے اندازہ لگا لیا کہ سکندر بھی اپنے باپ کے رویئے سے خوش نہیں ہے' مگر اس سے ڈرتا بھی بہت ہے۔ لالی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ "مرد بن۔ وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھ۔ تجھے اس نے کیا بنا دیا ہے؟ کیسا بیمار اور مریل لگتا ہے۔"

بختاور تیکھے لہجے میں بولی۔ "یہی گل بات میں کہتی ہوں تو مجھ سے لڑتا ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ تو ایک دم بے گیرت ہے۔ چاچا اس کے سامنے مجھے زبردستی اپنی کوٹھری میں لے جاتا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتا رہتا ہے' کچھ بھی تو نہیں کہتا۔" اس نے ذرا سا تامل کیا۔ "اب اس کا دوسرا ویاہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ آئے گی تو اس کے ساتھ بھی یہی بے گیرتی کرے گا۔"

سکندر ایک دم بھڑک اٹھا۔ "زیادہ کڑ کڑ نہ کر۔ بند کر اپنی بکواس۔"

"نراض کیوں ہوتا ہے؟ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ اس طرح کب تک کام چلے گا۔"

سکندر زچ ہو کر بولا۔ "تو میں کیا کروں؟"

"وہی جو میں کہہ رہا ہوں۔" لالی نے مشورہ دیا۔ "اسے لے کر شہر چلا جا۔ پنج سو روپے میں نے اسے دے دیئے ہیں۔ کچھ دن اس سے کام چلانا' بعد میں کوئی نہ کوئی دھندا مل جائے گا۔ بول' کیا کہتا ہے؟"

"میں تو تیار ہوں' پر یہ تیار نہیں ہوگا۔" بختاور نے اپنی رضامندی کا کھل کر اظہار کر دیا۔

"ہو جائے گا' ہو جائے گا۔ اسے میں تیار کر لوں گا۔" لالی نے سکندر کی پیٹھ تھپکی۔ "ہمت سے کام لے' سب ٹھیک ہی ہوگا۔"

سکندر پہلے تو جھجکا۔ پھر لالی کے سمجھانے بجھانے پر رضامند ہو گیا اور یہ طے ہوا کہ جس روز



پیر بخش شہر جائے گا' دونوں میاں بیوی چپکے سے نکل بھاگیں گے۔

☆

لالی اور سکندر ڈیرے سے نکل کر بشیرے کے پاس پہنچے۔ اس اثناء میں پیر بخش نے قبر کھود ڈالی تھی اور تختے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پیر بخش نے سکندر کو دیکھ کر غصے سے کہا۔ "اتنی دیر کہاں لگا دی؟"

لالی فوراً بیچ میں بول پڑا۔ "چاچا! نراض نہ ہو۔ میں نے اسے روک لیا تھا۔ میں روٹی کھا رہا تھا' کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو کس سے منگواتا۔"

پیر بخش خاموش ہو گیا۔ لالی اور سکندر نے چہروں پر ڈھاٹے باندھے اور تختے اکھاڑنے لگے۔ تختے علیحدہ کر کے انھوں نے قبر سے ڈھانچے کی ہڈیاں نکالیں۔ پیر بخش اور سکندر انھیں چادر میں لپیٹ کر لے گئے۔

لالی نے جلدی جلدی قبر کے تختے لگائے اور بیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر ان پر ڈال دی۔ اب کام کا ایک مرحلہ ختم ہو چکا تھا۔ اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ بشیرے اور لالی نے اپنے چہروں سے ڈھاٹے ہٹا دیئے۔

بشیرے نے تمام سامان تھیلے میں ڈالا' اپنی اور لالی کی سگریٹ سلگائی۔ دونوں کش لگاتے ہوئے کوٹھری کی جانب روانہ ہو گئے۔

جب وہ درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچے تو دھندلی روشنی میں سڑک پر ایک لمبی چوڑی کار کھڑی نظر آئی۔ کار دیکھتے ہی دونوں ٹھٹکے۔ لالی کو شبہ ہوا کہ وہ میاں حیات محمد کی بیوک ہے۔ وہ اسے حیات محمد کے بنگلے کے باہر دیکھ چکا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ حیات محمد وٹو کی بیوک اتنی رات گئے وہاں کیوں آئی ہے؟ کار دیکھ کر بشیرا بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں جہاں تھے' وہیں ٹھہر گئے اور کار کی جانب دیکھتے رہے۔

کار کے قریب آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی تھیں۔ مگر آوازیں اس قدر دھیمی تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بشیرا اور لالی کان لگا کر باتیں سننے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن ان کے پلے کچھ نہ پڑا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ دونوں سہمے ہوئے خاموش کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد کار کی بتیاں روشن ہوئیں' انجن اسٹارٹ ہوا اور کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد دھندلی روشنی میں کوئی آتا ہوا نظر آیا۔ قریب آیا تو انھوں نے پہچان لیا۔ وہ پیر بخش تھا' مگر گھبرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

بشیرے نے پوچھا۔ "چاچا! کس سے بات کر رہا تھا؟ یہ کار کس کی تھی؟"

"ذرا صبر کر۔ سب کچھ بتا دوں گا۔"

مگر بشیرا بے چین تھا۔ "بتاتا کیوں نہیں۔ چاچا کے کیوں بات کر رہا ہے؟"

"ارے ارے، توں تو خاما خا ناراض ہو گیا۔" پیر بخش نے نرمی سے کہا۔ "میاں حیات محمد کا منیجر آیا تھا۔ سویرے بھی آیا تھا۔"

"کس لیے آیا تھا؟"

پیر بخش لمحے بھر خاموش رہا پھر سرگوشی کے انداز میں رسان سے بولا۔ "تجھ سے کیا چھپانا۔ وہ جو اونچی کبر دیکھ رہا ہے۔" اس نے قبرستان کے شمال کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "وہ میاں حیات محمد کے بھائی میاں ریاض محمد کی کبر ہے۔ میاں حیات چاہتا ہے اس سے مردہ نکال کر دوسرا مردہ رکھ دیا جائے۔"

بشیرے نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "یہ چکر کیا ہے؟"

پیر بخش گردن ہلا کر بولا۔ "اپنے کو تو کچھ پتہ نہیں۔"

لالی فوراً تاڑ گیا کہ حیات محمد نے قبر میں پہلے جو لاش دفن کرائی تھی، اب اس کی جگہ ریاض محمد کی اصل لاش رکھنا چاہتا ہے جسے دھیورنے تہہ خانے میں قتل کر دیا تھا۔

پیر بخش نے بتایا۔ "یہ کام بھی آج ہی ہوگا۔ کام مشکل بھی ہے۔ کبر بہت نیچے سے کھودنی ہوگی اور نیچے ہی نیچے پرانی لاش نکال کر نئی لاش رکھنی ہوگی تاکہ اوپر سے کبر ویسی کی ویسی رہے۔"

بشیرا گھبرا گیا۔ "یہ کام کب شروع ہوگا؟"

"میں نے انھیں دو بجے بلایا ہے۔ وہ تو ابھی شروع کرنے کو کہتے تھے پر میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا مجھے پہلے ایک اور کبر تیار کرنی ہے۔ اب میاں حیات کے کرندے دو بجے سے پہلے پہلے لاش لے کر آجائیں گے۔"

بشیرے نے کہا۔ "تب تو ہمیں اپنا کام جلد سے جلد ختم کرنا ہوگا۔"

پیر بخش بولا۔ "میں تو کہتا ہوں، اپنا کام کل پر چھوڑ دے۔ مان لے ٹرک دیر سے آیا تو کیا ہوگا؟"

بشیرے نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "ٹرک تو ٹھیک ایک بجے پہنچ جائے گا۔" اس نے ٹارچ جلا کر گھڑی دیکھی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "چاچا! بارہ بجنے والے ہیں، جھیتی کر۔ ابھی تو بہت کام پڑا ہے۔"

تینوں آگے بڑھے اور درختوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے کوٹھری کے دروازے پر پہنچ گئے۔



کوٹھری میں چاروں ڈھانچوں کی ہڈیاں علیحدہ علیحدہ ڈھیریوں میں گھاس پر رکھی تھیں۔ ہر طرف تیز بو پھیلی تھی۔

سکندر ایک بڑے ڈبے سے سفید سفید پاؤڈر نکال کر ہڈیوں پر چھڑک رہا تھا۔ بشیرے نے دونوں بکسوں میں جھک جھک کر دیکھا۔ اندر ہاتھ ڈالا اور ان میں بچھی ہوئی گھاس جگہ جگہ دباتا رہا۔ اس نے پیر بخش سے کہا۔

"چاچا دیری نہ کر۔ ایک ایک پنجر کی ہڈیاں سنبھال سنبھال کر رکھنی شروع کر دے۔"

پیر بخش نے ہدایت کے مطابق ایک ڈھانچے کی ہڈیاں اٹھا کر بکسے میں گھاس کی تہہ پر رکھیں۔ جب وہ ایک ایک ہڈی رکھ چکا، تو اس نے ہڈیوں پر گھاس کی دوسری تہہ جمائی۔ اس نے گھاس کی اس موٹی تہہ پر دوسرے ڈھانچے کی ہڈیاں ترتیب سے جما کر رکھ دیں۔ ایک بار پھر ہڈیوں پر گھاس کی تہہ جمائی گئی۔ یہاں تک کہ بکسا پوری طرح گھاس سے بھر گیا۔ بشیرا نے ہر بکسے کا ڈھکنا بند کیا، تالا لگایا اور کنجی اپنے پاس رکھ لی۔ بقیہ دو ڈھانچے بھی اسی طرح دوسرے بکسے میں بند کر کے تالا لگا دیا گیا۔

جب یہ کام ہو گیا تو بشیرے نے جیب سے آٹھ سو روپے نکالے اور پیر بخش کو دے دیے۔ اس نے پچاس روپے اور نکالے اور پیر بخش کو دیتے ہوئے بولا۔ "یہ تیرے چائے پانی کے لیے ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"چاچا! اسی بات پر گرما گرم چائے پلوا دے۔"

"روٹی ٹکر کھالے، توں نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔"

"میں روٹی نہیں کھاؤں گا۔ صرف چائے پلوا دے۔"

پیر بخش کوٹھری سے چلا گیا۔ سکندر وہیں ٹھہرا رہا۔ کچھ دیر بعد تینوں کوٹھری سے نکل کر ڈیرے میں آگئے۔ بشیرے نے چارپائی کے نیچے سے اپنا سوٹ کیس نکالا۔ اسے کھولا۔ اجلی بش شرٹ اور پتلون نکالی اور وہیں کھڑے کھڑے کپڑے تبدیل کیے۔ اس نے میلے کپڑے اور تھیلے کا سارا سامان سوٹ کیس میں رکھا اور اسے بند کر دیا۔ لالی نے اپنی گٹھری اٹھا کر ہاتھ میں لٹکائی۔ مگر پیر بخش ابھی تک چائے لے کر نہیں آیا تھا۔ خاصی دیر ہو گئی۔ بشیرے نے مڑ کر سکندر کو دیکھا۔ قدرے تیکھے لہجے میں بولا۔

"جا کر دیکھ، چائے کا کیا بنا؟"

مگر وہ جانے پر آمادہ نہیں ہوا۔

لالی نے ڈپٹ کر کہا۔ "یار! تو کیسا مرد ہے۔ بختاور تیری گھر والی ہے' تو کہے گا تو فٹافٹ چائے بنا دے گی۔ جا' کھڑا منہ کیا تک رہا ہے۔"

سکندر چپ چاپ کمرے سے چلا گیا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد صحن' سے پیر بخش کے زور زور سے بولنے کی آواز ابھری۔ بشیرا اور لالی خاموش بیٹھے رہے۔ چند منٹ بعد پیر بخش بڑبڑاتا ہوا آیا۔ وہ دو پیالیوں میں چائے بھی لایا تھا۔ بشیرے نے چائے کی پیالی لے کر پوچھا۔

"کیا ہو گیا چاچا؟ بہت ناراض نظر آ رہا ہے۔"

"کلجگ آ گیا ہے جی' کلجگ۔" وہ شکوے کے انداز میں بولا۔ "سکندر مجھ پر آنکھیں نکال کر کھڑا ہو گیا۔ آج تک اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔"

لالی نے چائے کی پیالی لے کر پوچھا۔ "بات کیا ہوئی؟"

"ہونا کیا تھا جی! گھر والی کی حمایت کر رہا تھا۔"

پیر بخش نے اپنا جملہ پورا ہی کیا تھا کہ سکندر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے بختاور بھی تھی۔ سکندر کمرے میں داخل ہوتے ہی بولا۔ "میں اس کی حمایت کر رہا تھا۔ تم دونوں خود دیکھ لو۔ اس نے کیا کیا ہے۔"

سکندر نے بختاور کا ہاتھ پکڑ کر سامنے کر دیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے' جھگے کا گریبان پھٹ گیا تھا اور سینہ عریاں ہو کر جگہ جگہ سے جھلک رہا تھا۔ بختاور کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ آنکھوں کا کاجل پھیل گیا تھا۔

پیر بخش غضب ناک ہو کر چیخا۔ "اوئے سور دے پتر! تیری اب اتنی ہمت ہو گئی؟"

"چاچا! گرمی نہ دکھا۔ یہ بتا اس کے ساتھ مار پیٹ کیوں کی؟" لالی نے بختاور کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ تیری نوہ ہے' گھر والی تو نہیں۔"

پیر بخش نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "بکواس نہ کر۔ توں ہمارے معاملے میں بولنے والا کون ہوتا ہے؟"

بشیرا نے لالی کو سمجھایا۔ "یار! اس معاملے میں نہ پڑ۔"

پیر بخش کو بشیرا کی شہہ ملی تو اس نے لالی کو ڈانٹا۔ "یہ بتا' توں نے ہمارے معاملے میں کیوں ٹانگ اڑائی؟ توں ہوتا کون ہے؟" اس نے لالی کو گندی سی گالی دی' جھنجلایا ہوا اس پر جھپٹا۔ اور اس کا گریبان پکڑنا چاہا۔

لالی کے ہاتھ سے پیالی اچھل کر دور گری اور ساری گرم گرم چائے لالی کے منہ پر آ گئی۔ لالی کے



آگ ہی تو لگ گئی۔ اس نے جھپٹ کر پیر بخش کی گردن دبوچی اور اس زور سے دھکا دیا کہ وہ دیوار سے جا کر ٹکرایا۔

پیر بخش نے اٹھنے کی کوشش کی تو لالی نے ایک بار پھر اسے دھکا دیا۔ پیر بخش نے پھر اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ زور زور سے ہانپتا رہا اور خوں خوار نظروں سے لالی کو گھورتا رہا۔

لالی نے کپڑوں سے چائے جھاڑتے ہوئے کہا۔ "تو نے مجھے بھی سکندر سمجھا تھا۔ کچھ اور گرمی رہ گئی ہو تو وہ بھی اتار دوں؟"

سکندر اور بختاور خاموش کھڑے رہے۔ بشیرے نے لالی سے کہا۔ "یار! جانے دے' بہت ہو گیا۔ بیکار کا ٹنٹا نہ کر۔" اس نے پیر بخش کو سمجھایا۔ "چاچا! اب تو بوڑھا ہو گیا۔ اتنا غصہ نہ کیا کر۔" وہ پیر بخش کے پاس گیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ گھڑی دیکھی' ایک بج رہا تھا۔ بشیرا پریشان ہو گیا۔ "ٹرک اب پہنچنے والا ہی ہو گا۔" وہ سکندر کی طرف متوجہ ہوا۔ "باہر جا کر سڑک پر دیکھ' ٹرک تو نہیں آ گیا۔"

بختاور بولی۔ "پہلے ایک بات کا فیصلہ ہو جائے۔ ہم دونوں یہاں نہیں رہیں گے۔ تم ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلو۔"

سکندر نے اس کی تائید کی۔ "ہاں جی! آج فیصلہ ہو جانا چاہیے۔"

"مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا؟ میں نے اسی دن کے لیے تجھے پال پوس کر جوان کیا تھا؟" یہ کہتے کہتے پیر بخش افسردہ ہو گیا۔

بشیرے نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "چاچا! پریشان نہ ہو۔ کوئی نہیں جا رہا۔"

سکندر نے کہا۔ "نہیں بشیرے بھائی! اب ہم دونوں کا گزارہ یہاں نہیں ہو سکتا۔"

"اتنی بگاڑ ٹھیک نہیں۔ چل' میرے کہنے سے اسے ایک موقع اور دے دے۔ یہ اب کے لڑائی جھگڑا کرے تو مجھے بتانا۔ میں مہینے بھر بعد آؤں گا' تم دونوں کو اپنے ساتھ کراچی لے جاؤں گا۔ میرا وعدہ رہا۔" بشیرے نے پیر بخش کو مخاطب کیا۔

"چاچا! اب تو بھی غصہ کرنا چھوڑ دے۔"

سکندر بولا۔ "بات صرف غصے کی نہیں۔ یہ اور ہی بات ہے۔ اب میں تمہیں کس طرح بتاؤں۔"

بشیرا ہنس کر بولا۔ "مجھے سب پتہ ہے' مجھے نہ بتا۔ میں جانتا تھا ایک دن یہی ہو گا۔ اب تو جا کر ٹرک دیکھ۔"

سکندر چپ چاپ کمرے سے چلا گیا۔ بختاور بھی اس کے ساتھ ساتھ گئی۔ کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ پیر بخش مجرموں کی طرح سر جھکائے ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ سکندر کئی منٹ تک واپس نہیں آیا۔ بشیرا بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اب سوا بج رہا تھا۔ آخر بشیرا خود باہر نکلا۔ لالی اور پیر بخش بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ تینوں درختوں کے نیچے جاکر ٹھہر گئے۔

سڑک بالکل ویران تھی۔ ٹرک کا دور دور نشان نہ تھا۔ سکندر سڑک پر انتظار کرتے کرتے واپس آگیا تھا۔ کچھ اور وقت گزر گیا۔ اب ڈیڑھ بج رہا تھا۔

پیر بخش نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میاں حیات کے کرندے آتے ہی ہوں گے۔“

بشیرا اور پریشان ہوگیا۔ اسی اثناء میں دور سے تیز روشنی ابھری اور رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ بشیرے نے اس دفعہ پیر بخش کو سڑک پر بھیجا۔ اس کے دل میں دھڑکا تھا کہ اگر یہ میاں حیات محمد کی کار ہوئی تو کیا ہوگا؟

لالی بھی کم پریشان نہ تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ حیات محمد ٹو بھی آگیا تو دیکھتے ہی اس پر گولی چلا دے گا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پیر بخش نے آکر خوش خبری سنائی کہ ٹرک آگیا۔

بشیرا نے جلدی جلدی کوٹھری سے دونوں بکسے نکلوائے اور انھیں ٹرک میں بھرے ہوئے سامان کے نیچے رکھوا دیا۔

ٹرک میں فرنیچر کے علاوہ گھر گرہستی کا دوسرا سامان بھی تھا۔ ٹرنک اور صندوق بھی تھے۔ بشیرا کے بکسے بھی ان کے ساتھ انسپکٹر کے سامان کا حصہ بن گئے۔

بکسے رکھوانے کے بعد بشیرا اور لالی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اسی وقت سامنے سے تیز روشنی ابھری۔

بشیرے نے ڈرائیور کو ٹرک اسٹارٹ کرنے کی ہدایت کی۔ ٹرک اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھا تو سامنے سے آنے والی گاڑی کی بتیاں بجھ گئیں۔ ٹرک رفتہ رفتہ آگے بڑھتا گیا۔ لالی دم بخود بیٹھا تھا۔

ٹرک قریب پہنچا تو ایک بار پھر بتیاں روشن ہوگئیں۔ لالی نے دھڑکتے دل سے دیکھا کہ سڑک کے کنارے کار کھڑی ہے۔ اس نے پہلی ہی نظر میں تاڑ لیا کہ وہ میاں حیات محمد کی بیوک ہے۔ مگر نہ کوئی کار سے اترا نہ کسی نے ٹرک روکنے کی کوشش کی۔ ٹرک گرد کے بادل اڑاتا تیزی سے کار کے برابر سے گزر گیا۔

ڈرائیور نے رفتار تیز کردی۔ ہوا کے تیز جھونکے اندر آنے لگے۔ لالی پہلے ہی تھکن سے



نڈھال تھا، جھونکے لگے تو اس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگیں۔ وہ ذرا دیر جھومتا رہا پھر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر سوگیا۔ ٹرک تیزی سے دوڑتا رہا۔ خنک جھونکے اندر آتے رہے۔

لالی بے خبر سوتا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو اس نے گھبرا کر دیکھا کہ ٹرک سڑک کے کنارے کھڑا ہے۔ ٹرک سے تھوڑے فاصلے پر بشیرا دو کانسٹیبلوں سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہا ہے۔ لالی سخت پریشان ہوا۔

فرار کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ کانسٹیبل دروازے کے عین سامنے تھے۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد اس نے دیکھا، کانسٹیبل سائیکلوں پر سوار ہوکر آگے بڑھ گئے۔

بشیرا ٹرک کی جانب واپس آیا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچا، مگر اندر نہیں آیا۔ اس نے لالی کو بیدار پایا تو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لالی نیچے اتر کر اس کے پاس گیا۔ بشیرے نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ اسے اپنے ساتھ ٹرک سے ذرا دور لے گیا۔ اس نے رازدارانہ انداز میں آہستہ سے پوچھا۔

”یار! تیرا نام لالی ہے؟ تو جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے؟“

”کیا یہ بات تجھے کانسٹیبلوں نے بتائی ہے؟“

”ہاں، انھوں نے ٹرک رکوایا اور ٹارچ کی روشنی ڈال کر اندر جھانکنے لگے۔ میں جھٹ نیچے اترا۔ انھیں بتایا کہ ٹرک میں انسپکٹر شاہنواز کے گھر کا سامان بھرا ہے۔ ان کا کراچی تبادلہ ہوگیا ہے۔ سامان وہیں جا رہا ہے۔ یہ سن کر کانسٹیبلوں نے سامان کی تلاشی نہ لی۔ مگر تیرے بارے میں انھیں شبہ تھا کہ تو مفرور قیدی لالی ہے۔“ وہ آہستہ سے مسکرایا۔ ”پر میں نے تجھے انسپکٹر شاہنواز کا ملازم بتا کر ان کا شبہ دور کردیا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”دونوں چلے گئے، لیکن ایسا لگتا ہے انھوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ سچ بتا، اصل بات کیا ہے؟“

لالی انکار نہ کرسکا۔ ”اب تجھ سے کیا چھپانا، بات کچھ ایسی ہی ہے۔“

”یار! یہ بات مجھے پہلے کیوں نہ بتائی؟“

”اب تو میں نے سب کچھ بتا دیا۔“

بشیرے نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے، آگے بھی پولیس والے ملیں گے اور اس دفعہ تجھ سے پوچھ گچھ بھی کریں گے۔ کانسٹیبلوں کی زبانی مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ پولیس نے ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے جگہ جگہ راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔“

”یہ کون سی جگہ ہے؟“

بشیرے نے جواب دیا۔ "یہ پاک پتن روڈ ہے۔ آگے منٹگمری ہے۔" اس نے سامنے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ دور درختوں کے پیچھے شہر کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

"مجھے یہیں چھوڑ دے۔"

"مگر جائے گا کہاں؟"

"میری فکر نہ کر۔" لالی نے اعتماد سے کہا۔ "میں کچے رستے سے کسی طرف نکل جاؤں گا؟"

"جیسی تیری مرضی۔ سوچ لے۔"

"سوچنا کیا ہے۔ اب تسیں اپنے رستے جاؤ۔ میں اپنے رستے چلا۔"

دونوں سڑک کے کنارے کھڑے باتیں [illegible] تھے کہ دور سے تیز روشنی ابھری۔ لالی روشنی دیکھتے ہی ٹرک کی جانب جھپٹا۔ ا[illegible] نے اگلی سیٹ سے اپنی گٹھڑی اٹھائی اور تیز تیز قدموں چلتا ہوا قریب کے کھیتوں میں گھس گیا۔

بشیرا ٹرک پر جا کر بیٹھ گیا۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا اور آگے بڑھ گیا۔



# ۹

راستہ ایک ٹبے کے پاس جا کر ختم ہو گیا تھا۔ اب لالی کے سامنے ٹبے کی صورت میں اونچا اور ابھرا ہوا ناہموار میدان تھا۔ لالی آہستہ آہستہ ٹبے پر چڑھنے لگا، اوپر پہنچا، میدان عبور کیا، نیچے آیا تو پختہ سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی اور بالکل ویران تھی۔ سڑک کے دونوں جانب کہیں کہیں گھنے درخت تھے۔ درختوں کے پیچھے نشیب میں جھنگر تھا۔ جھنگر جنگلی پودوں اور جھاڑیوں سے بھرا تھا۔

لالی سڑک پر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے مشکل سے چند فرلانگ راستہ طے کیا تھا کہ کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک کار نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ ٹھٹکا۔ کار کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحہ ایسا بھی آیا، جب اس نے واپسی کا ارادہ کیا۔ مگر وہ لوٹ کر جاتا بھی کہاں؟ لگ بھگ دو منٹ تک وہ گم صم کھڑا رہا۔ کار کوئی سو گز کے فاصلے پر بالکل اس کے سامنے تھی۔ مگر اس جگہ گہری خاموشی چھائی تھی۔

سڑک کے نشیب میں بکھری ہوئی جنگلی جھاڑیاں، تاروں کی مدھم روشنی میں سایوں کے مانند دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ لالی نے ہمت سے کام لیا اور کار کی سمت بڑھنے لگا۔ کار جس قدر قریب آتی گئی، اس کے قدموں کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ لالی چاہتا تھا کہ کار کے سامنے رکے بغیر تیزی سے آگے نکل جائے۔ وہ رفتہ رفتہ کار سے نزدیک ہوتا گیا۔ جب کار کا فاصلہ چند قدم رہ گیا تو کار کے اندر سے آواز آئی۔ "ہے، ٹھہر جاؤ۔" ساتھ ہی ایک شخص دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ لالی اسے دیکھ کر بھی نہیں رکا۔ اس نے چاہا کہ لپک کر نشیب میں اتر جائے اور جھاڑیوں کی آڑ میں چھپتا

چھپا تا کسی طرف نکل جائے' لیکن اس نے رفتار تیز ہی کی تھی کہ وہ شخص جھپاک سے عین اس کے سامنے آگیا۔

"بات تو سنو۔"

لالی نے بے رخی سے کہا۔ "کیہہ گل ہے جی؟"

اس نے گردن موڑ کر اس شخص کو غور سے دیکھا اور ایک ہی نظر میں اندازہ لگالیا کہ وہ اسے آسانی سے زیر کر سکتا ہے۔ اس کا قد لالی کے برابر تھا۔ چھریرا جسم' اجلی سفید قمیص اور پتلون' آنکھوں پر چشمہ' سر پر گھنے بال' ڈاڑھی مونچھ صاف' صورت شکل اور وضع قطع سے وہ کھاتا پیتا معقول آدمی لگتا تھا۔

اس نے لالی کو اپنی جانب گھورتے دیکھا تو مسکرا کر مخاطب ہوا۔ "یار' اس قدر ناراض کیوں ہو رہے ہو؟"

لالی پھر بھی نہ پگھلا' اکھڑپن سے گویا ہوا۔ "کہو' کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ شخص اور کھل کر مسکرایا۔ بے تکلفی سے بولا۔ "کیا بیوی سے جھگڑا کر کے آئے ہو؟ بات کیا ہے؟"

لالی نے اس دفعہ بھی بے رخی کا مظاہرہ کیا۔ "خاما خا کی باتیں نہ کرو۔ مطلب بتاؤ' فٹافٹ۔ کیا چاہتے ہو تم؟"

"چاہنا واہنا کیا ہے۔ یار! تھوڑی سی تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔ "ذرا گاڑی کو دھکا لگا دو۔" اس نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا۔ "لو' یہ رکھ لو۔"

لالی نے صاف انکار کر دیا۔ "نہیں جی! میں دھکا شکا نہیں لگاؤں گا۔ مجھے جلدی ہے۔"

اس شخص نے جیب سے ایک نوٹ اور نکالا۔ "لو' اب تو مان جاؤ۔"

"سو روپے دو گے' تب بھی تمہاری گڈّی کو دھکا نہیں لگاؤں گا۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "صاف بات یہ ہے جی! میں اس وکھت رک نہیں سکتا۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

اس شخص نے ہاتھ بڑھا کر لالی کا بازو تھام لیا۔ "یار ایسی بھی کیا بے مروّتی۔ آدمی سے آدمی کا کام پڑتا ہے۔"

لالی نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑایا اور غصے سے تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "پرے ہٹ کے بات کر۔" اس نے آنکھیں نکال کے اسے گھورا۔ "کہہ دیا' میں نہیں رک سکتا۔ ایویں گلے پڑا جا رہا ہے۔"



وہ شخص ڈھیٹ بن کر بولا۔ "یار! گالیاں دے لو۔ مگر گاڑی کو دھکا لگا دو۔"

لالی کا سارا طنطنہ جاتا رہا۔ اس نے چاہا بھی کہ غصہ آجائے اور اس شخص سے پیچھا چھوٹ جائے۔ لیکن اس نے تو غصے کا کوئی جواز ہی نہیں چھوڑا تھا۔ لالی چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر کسی قدر نرم لہجے میں اپنی مجبوری بیان کی۔

"دیکھو جی! نراضگی شراضگی کی گل نہیں۔ میں تمہاری مدد ضرور کرتا۔ پر مجھے بہت جلدی ہے۔"

"کہاں جانا ہے تمہیں؟"

"میں نے جی سٹیشن جانا ہے۔ لہور کی گڈی پکڑنی ہے۔"

"اسٹیشن یہاں سے خاصی دور ہے۔ تم پیدل تو صبح تک نہیں پہنچ سکتے۔" وہ شخص سوچنے لگا۔ "چار بجنے والے ہیں۔ ٹرین سوا چار بجے اسٹیشن پہنچے گی۔ ایکسپریس ہے۔ مشکل سے چند منٹ ٹھیرتی ہے۔ تم اسے کیسے پکڑ سکتے ہو؟"

لالی اڑا رہا۔ "نہیں جی! میں سیدھا سٹیشن جاؤں گا۔ اگر پہلی چھوٹ گئی تو دوسری سے چلا جاؤں گا۔"

"دوسری گاڑی دوپہر کو جاتی ہے۔ میں تمہیں اپنی کار سے اسٹیشن پہنچا دوں گا۔" اس نے نرم اور شگفتہ لہجے میں کہا۔ "اس وقت رات کو کہاں بھٹکتے پھرو گے اور ادھر سے تو کوئی راستہ اسٹیشن جاتا بھی نہیں۔ تمہیں ملتان روڈ جانا ہوگا۔"

لالی مخمصے میں پڑ گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا' پھر اس نے دریافت کیا۔ "تمہیں کتنی دور جانا ہے؟"

"پانچ میل سمجھ لو۔"

"پنج میل؟" لالی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "اتنی دور تک تو میں دھکا نہیں لگا سکتا۔ دھکا لگاتے لگاتے اپنا پلیتھن نکل جائے گا۔"

"تم اکیلے نہیں ہو' میں بھی تمہارے ساتھ دھکا لگاؤں گا۔"

لالی نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ کار کے قریب گیا' اس کا بونٹ چھو کر دیکھا اور اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ سٹارٹ بھی نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں یار! یہ اسٹارٹ نہیں ہو سکتی۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پیٹرول ختم ہو گیا ہے۔"

اس کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ وہ چند لمحے خاموشی سے سر کے بال کریدتا رہا۔ پھر بڑبڑانے کے انداز میں آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "سخت حماقت ہوگئی۔ آج ایک جگہ کھانے پر گیا تھا' پھنس گیا

وہاں۔ رات زیادہ ہوگئی۔ ڈرائیور کو پہلے ہی چھٹی دے دی تھی۔ اس کی بیوی بیمار ہے۔ حرام زادے نے یہ بھی نہیں بتایا کہ گاڑی میں پیٹرول کم ہے۔ ورنہ راستے میں کسی پیٹرول پمپ سے ڈلوا لیتا۔ بس ہوگئی حماقت۔ اب اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔

"یار! میل بھر تو میں نے دھکا لگایا' پھر اپنی ہمت نے جواب دے دیا۔"

لالی بے تکلفی سے بولا۔ "بے کار اس چکر میں پڑے۔ مزے سے گڈی کے اندر سوتے۔ سویرے کوئی نہ کوئی دھکا لگانے والا مل جاتا۔"

"سویرے تو دھکا لگانے والے بہت مل جائیں گے۔ دوسری گاڑی بھی آسکتی ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ مجھے صبح چھے بجے کمشنر صاحب کو چھوڑنے اسٹیشن جانا ہے۔ وہ ملتان جا رہے ہیں۔ انھیں کچھ ضروری فائلیں دینی ہیں جو میری گاڑی میں پڑی ہیں۔ ورنہ گاڑی چھوڑ کر پیدل ہی چلا جاتا۔"

لالی کسی قدر مرعوب ہوگیا' پوچھنے لگا۔ "جی! آپ ادھر کوئی افسر لگے ہوئے ہیں؟"

"یہ نہ پوچھو۔" وہ ایک بار پھر ہنسا۔ "تم سے پہلے بھی ایک راہ گیر ملا تھا۔ میں نے اس پر رعب جمانا چاہا۔ اسے بتایا کہ میں کون ہوں۔ میری بات سنتے ہی وہ بگٹٹ بھاگا اور سڑک سے نشیب میں اتر کر جھاڑیوں میں گھس گیا۔ یہ بھی سراغ نہ ملا' کہاں گیا' کدھر گیا؟" اس نے قدرے تامل کیا۔ "مشکل یہ ہے کہ اس سڑک پر نہ کوئی لاری چلتی ہے نہ ادھر سے ٹرک گزرتے ہیں۔ یہ سڑک سیدھی میری کوٹھی تک جاتی ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں جی! پیدل ہی چلے جاتے تو ٹھیک تھا۔"

"بھئی مجھے تمھارے مشورے کی ضرورت نہیں۔" اس دفعہ وہ بھنّا گیا۔ "لگا سکتے ہو تو گاڑی کو دھکا لگا دو۔ مجھے ہر حال میں صبح چھے بجے سے پہلے پہلے کوٹھی پہنچنا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور دوسرے سے کار آگے دھکیلنے لگا۔

لالی چند لمحے خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر وہ بھی اس کے ساتھ کار کو دھکا لگانے لگا۔ چھوٹی مورس کار تھی' نئی تھی اور ہلکی پھلکی بھی تھی۔ سڑک صاف ستھری تھی اور آگے ڈھلان بھی تھی۔ لالی کو زیادہ زور نہیں لگانا پڑا۔ کچھ دور تک دونوں دھکا دے کر کار آگے بڑھاتے رہے۔ لالی نے چلتے چلتے پوچھا۔

"آپ نے یہ نہیں بتایا جی! آپ یہاں کیا لگے ہوئے ہیں؟"

اس نے لالی کی جانب دیکھے بغیر بے نیازی سے کہا۔ "یار! میں اس ضلعے کا ڈپٹی کمشنر ہمدانی ہوں۔" لالی کے کان کھڑے ہوئے' اس کے قدم رک گئے۔ ہمدانی بھی رک گیا۔ اس نے مڑ کر لالی



پر نظر ڈالی۔ "تم گھبرا کیوں گئے؟" وہ آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے زیر لب مسکرایا۔ "قتل کر کے بھی آئے ہو تو پروا نہ کرو۔ تمھارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ڈرو نہیں۔ لگاؤ دھکا۔"

لالی نے دھکا نہیں لگایا' آہستہ سے بولا۔ "کتل شتل تو میں نے نہیں کیا۔ بات کچھ اور ہے۔"

"چوری کی ہے؟ ڈاکہ ڈالا ہے؟ عورت وورت بھگائی ہے؟" ہمدانی کھل کر مسکرانے لگا۔ "صاف صاف بتاؤ' بات کیا ہے؟"

لالی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "صاف بات یہ ہے جی! میں جیل سے بھاگا ہوا کیدی لالی ہوں۔ میری گرفتاری پر دو ہزار انعام بھی رکھا گیا ہے۔"

ہمدانی اسی بے نیازی سے بولا۔ "یار! جیل سے تو قیدی بھاگتے ہی رہتے ہیں۔ تم نے ایسا کون سا سنگین جرم کیا ہے۔" وہ خاموش ہوگیا اور چند لمحے سوچتا رہا۔ "یاد آیا۔ تمھارے معاملے میں وہ اپنے وزیر زراعت کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اسی لیے تمھاری گرفتاری پر انعام ونعام بھی رکھا گیا ہے۔ پولیس بھی بھاگ دوڑ کر رہی ہے۔ لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تم اس وقت میرے ساتھ ہو۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "یار تم بالکل پریشان نہ ہو۔ تمھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ڈپٹی کمشنر اپنے ضلعے کا بادشاہ ہوتا ہے۔"

"یہ تو مجھے پتہ چل گیا جی کہ آپ وڈے افسر ہو۔" لالی نے قدرے تامل کیا۔ "میاں حیات محمد نے بھی ایسا ہی وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی بہت وڈے زمیں دار ہیں' پر انھوں نے تو جی ایسے چکر میں ڈال دیا تھا میں آپ کو کیا بتاؤں۔"

"حیات محمد تو نہایت واہیات آدمی ہے۔ بیگم اس کی البتہ بڑی آب و تاب کی عورت ہے۔" وہ مسکرانے لگا۔ "ہیرے کی طرح جگمگاتی ہے۔ تم نے اسے دیکھا ہوگا؟"

"کیا بات ہے جی ان کی۔" میاں حیات محمد ٹوکی بیوی ناصرہ کے ذکر پر لالی نے بھی لذت محسوس کی' چہک کر بولا۔ "میں نے تو جی انھیں ننگا بھی دیکھا ہے۔"

"نہیں یار!" ہمدانی حیرت سے اچھل پڑا۔ "تو تو بڑا چھپا رستم نکلا۔ وہ تو بہت اونچی چیز ہے۔ کہاں ٹکر گئی تجھ سے؟" اس نے توقف کیا۔ "یار! سچ سچ بتا؟"

"سچ ہی کہہ رہا ہوں!" لالی نے سینہ پھلا کر فخر سے کہا۔ "پچھلے سوموار ہی کی تو بات ہے۔ ہوا یہ کہ میاں حیات محمد نے غصے میں اس کی ساڑی نوچ کر پھینک دی اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہ اپنی ننگی ننگی ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ میں صوفے کے نیچے زمین پر پڑا تھا' بالکل اس کے سامنے۔" لالی نے گہری سانس بھری۔ "میاں حیات تو اسے جان سے مار دیتا پر میں بیچ میں آگیا۔"

اس نے مجھ پر بھی ہاتھ چلایا۔ بس جی! فیر تو میں نے بھی گتے میں آنا ہی تھا۔ جھٹ میں نے اس کا گلا پکڑ لیا۔ اس نے بہت زور مارا‘ پر جی اپنے ہاتھ بھی لوہے کے ہیں۔ میں نے دیوار سے اڑا کر ٹھکا ٹھک جو اس کا سر ٹکرایا‘ تو وہیں ڈھیر ہو گیا۔“

”لگتے تو تم جان دار ہو۔“ ہمدانی نے لالی کا ایک بازو انگلیوں سے ٹٹولا۔ ”یہ تو بتاؤ‘ اب میاں حیات محمد کی بیگم کہاں ہے؟ بعد میں اس پر کیا گزری؟“

لالی نے اسی جوش و خروش سے بتایا۔ ”میں اسے صاف نکال لایا۔ وہ اپنی بہن کے پاس لال ٹیبے کی طرف گئی ہے۔ خود ہی گڈی چلا رہی تھی۔“

”یار! تم تو بڑے کام کے آدمی لگتے ہو۔“

”آپ نے جی مجھ سے جو وعدہ کیا ہے‘ مرد کا وعدہ ہے؟“

”بالکل مرد کا وعدہ۔ ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔“ ہمدانی نے ہاتھ بڑھا کر گرم جوشی سے لالی کا ہاتھ دبایا۔ ”اور یہ بھی وعدہ رہا کہ میں خود تمہیں چھوڑنے جاؤں گا۔ مگر آج دوپہر کو نہیں‘ کل صبح پانچ بجے والی ٹرین پر۔ چلو‘ اب لگاؤ دھکا۔“

”پر میں نے تو کادر آباد سٹیشن جانا ہے۔“

”قادر آباد؟“ ہمدانی نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ تو یہاں سے دور ہے۔ تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو؟ قادر آباد تو لاہور جاتے ہوئے راستے ہی میں پڑے گا۔“

”اب تو جی میں اپنے بارے میں آپ کو صاف صاف بتا ہی چکا ہوں۔“ لالی نے ہچکچاتے ہوئے ہمدانی کو بتایا۔ ”اب آپ سے کیا چھپانا۔ وہاں میرا ساتھی رحیم داد انتظار کر رہا ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے۔“

”چلو‘ تمہیں قادر آباد ہی پہنچا دوں گا۔ اب تو خوش ہو؟“

لالی واقعی خوش ہو گیا۔ چہک کر بولا۔ ”یہ بات ہے جی تو آپ اندر بیٹھ جائیں۔ میں اکیلا ہی دھکا لگاؤں گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ پنج ہی میل کا تو رستہ ہے۔“

”تم اپنی گٹھری تو اندر رکھ دو۔“ ہمدانی نے مسکرا کر لالی کے کندھے سے گٹھری اتار کے کار کی پچھلی نشست پر ڈال دی اور خود اگلی نشست پر اسٹیئرنگ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ لالی اکیلا کار کو دھکا لگانے میں جٹ گیا۔ وہ بہت جوش میں تھا۔

لالی کار کو دھکا دیتا ہوا آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ تین میل تک کار دھکیلتا ہوا لے گیا۔ پھر بری طرح ہانپنے لگا۔ ہمدانی نے کار ٹھہرا کے لالی کو ذرا دیر ستانے کا موقع دیا۔ لالی کار کا سہارا لیے لمبی



ی سانسیں بھر رہا تھا۔

ہمدانی خاموش بیٹھا رہا‘ پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا۔ ”یار! تو ٹھیک ہی کہتا تھا۔ گاڑی یہیں چھوڑتے ہیں۔ دونوں پیدل چلتے ہیں۔ لیکن تم فائلوں اور سرکاری کاغذات سے بھرا ہوا ٹرنک لاد کر چل سکو گے؟“

لالی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اب تو تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا ہے۔ آپ کو جی کار ہی میں بٹھا کر کوٹھی تک لے جاؤں گا۔“

ہمدانی نے کچھ نہیں کہا۔

مشرقی افق پر ہلکا ہلکا اجالا پھوٹنے لگا تھا۔ ستاروں کی چمک دمک ماند پڑتی جا رہی تھی۔ لالی نے تازہ دم ہو کر پھر دھکا لگانا شروع کر دیا۔ دوسرے ہلے میں وہ ستائے بغیر کار ہمدانی کی کوٹھی تک لے گیا۔ کوٹھی دور سے نظر آنے لگی تھی۔ قریب پہنچ کر لالی نے صبح کی ہلکی ہلکی دودھیا روشنی میں دیکھا۔ کوٹھی کی بلندی پر قومی پرچم لگا تھا۔ پھاٹک پر مسلح پولیس کا پہرا تھا۔ کار پر نظر پڑتے ہی دو پہرے دار بھاگتے ہوئے آئے۔ ہمدانی کار سے باہر آگیا۔ پہرے داروں نے اٹینشن ہو کر اسے کھٹاک کھٹاک سلیوٹ کیا۔

سلیوٹ کے ساتھ ہی وہ ہمدانی سے ایک دم ڈپٹی کمشنر بن گیا۔ ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ گردن اکڑ گئی‘ چہرے پر خشونت آگئی۔ اس نے پہرے داروں کو بڑی رعونت سے مخاطب کیا۔ ”گاڑی کی ڈکی کھولو۔“ اس نے کار کی کنجی ایک پہرے دار کی جانب اچھال دی۔ پہرے دار نے کنجی سنبھالی اور ڈکی کھولنے لگا۔

ذرا سی تاخیر ہوئی تو ڈپٹی کمشنر زور سے چیخا۔ ”کیا کرتا ہے؟ ڈکی تک نہیں کھلتی۔“ پہرے دار کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ بار بار کنجی گھماتا رہا مگر ڈکی نہ کھلی۔ ڈپٹی کمشنر نے دوسرے پہرے دار کو ڈانٹا۔ ”تم کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟ جاؤ‘ اس کی مدد کرو۔“ دوسرا پہرے دار بھی لپک کر ڈکی کے پاس پہنچ گیا۔

دونوں نے ڈکی کھولی۔ اندر ایک سیاہ ٹرنک رکھا تھا۔ خاصا وزنی بھی تھا۔ دونوں پہرے داروں نے مل کر اسے نکالا۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا۔ ”میرے کمرے میں پہنچا دو۔“ وہ آگے بڑھ گیا۔ چلتے چلتے اس نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ ”گاڑی گیرج میں کھڑی کر دو۔ ڈرائیور آئے تو اس حرام زادے کو فوراً میرے سامنے پیش کرو۔“ ساتھ ہی اس نے انگلی سے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ لالی گردن جھکا کر سکڑا سکڑایا ڈپٹی کمشنر کے پیچھے چلنے لگا۔

اب ڈپٹی کمشنر کی چال میں تمکنت آگئی تھی۔ وہ پختہ سڑک پر جوتوں سے آہٹ پیدا کرتا پھاٹک کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا تو ایک بار پھر پولیس کے مسلح پہرے داروں نے کھٹاک سے اسے سلیوٹ کیا۔ اس نے گردن کو خفیف سی جنبش دی اور بے نیازی سے آگے بڑھتا ہوا کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔

ایک اردلی سر پر پگڑی جماتا، وردی کے بٹن لگاتا، کمر پر سنہرا پٹکا درست کرتا کوٹھی کے عقب سے نکلا، برساتی میں پہنچا اور کوٹھی کے اندر جانے کا دروازہ کھول کر ایک طرف ادب سے کھڑا ہو گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے سر کی جنبش سے اسے قریب بلایا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا۔

ڈپٹی کمشنر نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر لالی کی جانب دیکھا اور نہایت بے نیازی سے پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

لالی سٹ پٹا کے رہ گیا۔ وہ گھبرا کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ڈپٹی کمشنر نے لالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اردلی سے کہا۔ "نذیر بیگ! اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کے ٹھہرنے کا بندوبست کر دو۔ شام کو اس کی پیشی کرنا۔" یہ ہدایات دے کر ہمدانی آگے بڑھ گیا۔

لالی چند ہی قدم گیا تھا کہ دہرے بدن کا ایک ادھیڑ آدمی سامنے باغ میں ایک درخت کے نیچے سے نکلا۔ وہ لمبا گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں چھڑی، چہرے پر رعب اور دبدبہ۔ یہ ڈویژنل کمشنر تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر ڈپٹی کمشنر کی جانب دیکھا۔ ڈپٹی کمشنر کی اس سے نظریں ملیں تو افسر سے جھٹ ماتحت بن گیا۔ اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی پڑ گئی، ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ چہرے پر خشونت کے بجائے شگفتگی پھیل گئی۔ وہ تیزی سے کمشنر کی جانب لپکا، قریب پہنچا اور اس کے روبرو ادب سے گردن جھکا کر گھگیانے لگا۔

لالی نے ہمدانی کو اس طرح گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھا تو سخت حیرت ہوئی۔ مگر نذیر بیگ اردلی نے اسے وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنے دیا۔ وہ لالی کو اپنے ہم راہ لے گیا اور انیکسی کے ایک کمرے میں ٹھہرا دیا۔ کمرہ مختصر تھا مگر ہوا دار تھا۔ اس میں چارپائی تھی۔ اس پر بستر لگا تھا۔ کمرے کے قریب ہی غسل خانہ تھا۔ نذیر بیگ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ رہا غسل خانہ، تم ذرا نہا دھو لو۔ بہت تھکے ہوئے نظر آ رہے ہو۔"

لالی کو سب سے زیادہ اپنی گٹھری کی فکر تھی۔ "میری گٹھڑی ساب کی گڈی میں پڑی ہے۔ وہ مجھے پہنچا دو۔"

نذیر بیگ مسکرا کر بولا۔ "پروا نہ کرو۔ تمہاری گٹھری آجائے گی، کہیں جائے گی نہیں۔" وہ



دروازے کی جانب بڑھا۔ "میں تھوڑی دیر بعد تمہارے لیے ناشتا بھجوا دوں گا۔ سونا نہیں۔" وہ کمرے سے چلا گیا۔

لالی ذرا دیر تک بستر پر خاموش بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر غسل خانے میں گیا۔ نہا کر غسل خانے سے نکلا تو دن نکل آیا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ درختوں کی بلندیوں پر جھلملانے لگی تھی۔ اس نے کوٹھی کی طرف دیکھا۔ ایک گہری نیلی شیورلٹ پھاٹک کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس پر کمشنر کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ پچھلی نشست پر ہمدانی بھی کمشنر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پھاٹک پر سنتری، بندوقیں سنبھالے ایک ہاتھ پیشانی پر رکھے چاق چوبند کھڑے تھے۔ کار پھاٹک سے گزر کے آگے بڑھی۔ لالی اسے دور تک دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں، غسل کرنے کے بعد نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ بستر پر لیٹ کر سونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ناشتا آگیا۔ لالی نے ناشتا کیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ آنکھ ہی نہیں کھلی۔

دن ڈھلے نذیر بیگ نے اسے جگایا۔ وہ اس کی گٹھری بھی لایا تھا۔ لالی نے گٹھری کھول کر شیو کرنے کا سامان نکالا۔ غسل خانے میں گیا۔ ڈاڑھی مونڈی۔ منہ ہاتھ دھوئے اور تازہ دم ہو کر باہر آگیا۔ نذیر بیگ کمرے میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے پیشی کے لیے لے گیا۔

☆

ڈپٹی کمشنر ٹینس کورٹ میں ٹینس کھیل رہا تھا۔ لالی درختوں کے نیچے خاموش بیٹھا کھیل دیکھنے میں محو تھا۔ ڈپٹی کمشنر کے مقابل اس کی بیوی کھیل رہی تھی۔ وہ بھی ہمدانی کی طرح سفید نیکر اور آدھی آستینوں کی اسپورٹنگ شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ شرٹ کے بٹن دور تک کھلے ہوئے تھے۔ اس کا گورا گورا سینہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ حسین اور طرح دار عورت تھی۔ چہرے پر دل کشی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور غزالی تھیں۔ بدن سڈول تھا۔ لالی کو بہت اچھی لگی۔ وہ اسے بھاگتے دوڑتے اور اچھل اچھل کر ریکٹ سے گیند اچھالتے دیکھتا رہا۔

کھیل ختم ہوا تو دونوں ٹینس کورٹ سے باہر آگئے۔ خدمت گاروں نے آگے بڑھ کر دونوں کے ہاتھوں سے ریکٹ لیے۔ اجلے اجلے تولیے پیش کیے۔ انہوں نے تولیے لے کر چہرے اور گردن سے پسینہ پونچھا۔ سفید وردی میں ملبوس ایک بیرے نے دو گلاسوں میں لیمو کا تازہ رس پیش کیا۔ دونوں نے گلاس خالی کیے، بیرے کو دیے۔ اسی اثنا میں ایک آیا، ڈپٹی کمشنر کے دو بچوں کو لے کر آگئی۔ دونوں لڑکے تھے۔ بڑے کی عمر پانچ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ چھوٹا اس سے دو ڈھائی برس کم عمر تھا۔

دونوں بچے تن درست اور خوب صورت تھے۔ نہادھو کر' تروتازہ ہو کر آئے تھے۔ ڈپٹی کمشنر نے گال تھپک کر بچوں کو پیار کیا۔ ماں نے جھک کر دونوں کے گلابی رخسار چومے۔ آیا بچوں کو لے کر ایک طرف چلی گئی۔

ڈپٹی کمشنر بیوی کے ہم راہ کوٹھی کی جانب چلا۔ اس نے لالی پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی مگر کوئی توجہ نہیں دی۔ بیوی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ لالی نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ نذیر بیگ نے آنکھ مار کر لالی کو ڈپٹی کمشنر کے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ لیکن لالی آگے نہیں بڑھا۔ نذیر بیگ نے ڈپٹی کمشنر کی نظر بچا کر دوسری بار ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لالی نے قدم اٹھائے اور سہا سہا ڈپٹی کمشنر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

دن ختم ہو رہا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنیں ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیوی کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ دونوں کے چہرے سنہری دھوپ سے دمک رہے تھے۔ سفید لباس میں دونوں راج ہنس کے جوڑے کے مانند خوبصورت نظر آرہے تھے۔ ڈپٹی کمشنر بیوی کے ساتھ ہنستا مسکراتا کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ اس نے پلٹ کر لالی کی جانب دیکھا تک نہیں۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ لالی اس کے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔

نذیر بیگ نے لالی کو کوٹھی کے باہر ہی روک لیا۔ "صاحب تھوڑی دیر میں باہر نکلیں گے۔ تم ان کا یہیں انتظار کرو۔" یہ کہہ کر وہ بھی چلا گیا۔

لالی کوٹھی کے باہر پڑی ہوئی لوہے کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ سورج ڈوب گیا۔ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا کوٹھی میں جگہ جگہ بجلی کے بلب روشن ہوگئے۔ مگر سناٹا بہت گہرا تھا۔ اردلی اور خدمت گار ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ لیکن سب خاموش تھے۔ وہ صرف اشاروں میں باتیں کرتے یا اس قدر آہستہ بولتے گویا سرگوشی کر رہے ہوں۔ کچھ دیر بعد ڈپٹی کمشنر کوٹھی سے باہر آیا۔ بیوی اس وقت بھی اس کے ساتھ تھی۔ دونوں نہا کر آئے تھے اور زیادہ شگفتہ' زیادہ تروتازہ لگ رہے تھے۔ ان کے لباس بھی بدلے ہوئے تھے۔

ڈپٹی کمشنر کو دیکھتے ہی لالی جھٹ کھڑا ہوگیا۔ ڈپٹی کمشنر نے اس دفعہ بھی لالی پر کوئی توجہ نہ دی۔ بیوی سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لالی پھر بنچ پر بیٹھ گیا۔ اب وہ بہت بیزار اور اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔

ذرا دیر بعد نذیر بیگ اردلی آگیا اور اسے اپنے ہم راہ باغ میں لے گیا۔ ڈپٹی کمشنر' بیوی کے ساتھ لان میں بچھی ہوئی بید کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی لوہے کے



قد آدم کھمبوں پر بجلی کے دودھیا بلب روشن تھے۔ ڈپٹی کمشنر کے سامنے میز پر ٹیلی فون تھا۔ اسی میز پر وھسکی سے بھرا ہوا گلاس بھی رکھا تھا۔ ڈپٹی کمشنر گلاس اٹھا کر آہستہ آہستہ چسکی لگا رہا تھا۔ لالی اور نذیر بیگ ذرا ہٹ کر ایک طرف خاموش کھڑے ہوگئے۔

نذیر بیگ چلا گیا۔ لالی اکیلا رہ گیا۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑا انتظار کرتا رہا کہ کب ڈپٹی کمشنر اشارہ کرے اور وہ اس کے قریب جائے۔ جب کئی منٹ تک ڈپٹی کمشنر نے اس کی جانب توجہ نہیں دی تو لالی کا جی چاہا کہ خود ڈپٹی کمشنر کے سامنے پہنچ جائے۔ لالی ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

ڈپٹی کمشنر نے بیوی کو اشارہ کیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور آہستہ سے کہا۔ "ملا دو۔" چند لمحے وہ ریسیور کان سے لگائے خاموش بیٹھی رہی پھر اونچی آواز سے بولی۔ "ہیلو!" اس نے ٹیلی فون پر کچھ سنا' مسکرائی اور ریسیور ڈپٹی کمشنر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"یاد ہے' آج پولی نیسین کلب کی نائٹ آف دی گریٹ سینس ہے۔ مسٹر سلیمان اسی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔"

ڈپٹی کمشنر نے ریسیور سنبھالا۔ "ہیلو سلیمان! مجھے یاد ہے۔ یار! یہ بھی کوئی بھول جانے والی بات ہے۔ کمال کر دیا تم نے۔" وہ مسکراتا رہا اور ریسیور پر سلیمان کی باتیں سنتا رہا۔ اسی اثنا میں اس کا چھوٹا بچہ آگیا۔ ماں نے اٹھ کر اسے گود میں اٹھالیا' سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ ڈپٹی کمشنر نے مڑ کر بیوی کی جانب دیکھا مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ بچے کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتی رہی اور اس کے رخسار چومتی ہوئی کوٹھی کی جانب چلی گئی۔ بچے کے ساتھ اس کی والہانہ محبت دیکھ کر لالی بھی بے اختیار مسکرا دیا۔

ڈپٹی کمشنر نے ٹیلی فون پر باتیں سنتے سنتے ایک دفعہ چونک کر حیرت سے کہا۔ "سمرا صاحب پر دل کا دورہ پڑا ہے؟ یار! اب کنڈکٹ کون کرے گا۔ ان کا سا امپائر کہاں ملے گا؟" بات کہتے کہتے وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "وہ بوڑھے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ رنڈوے بھی ہیں۔ وہ امپائرنگ کیا کرتے ہیں گویا عمر رفتہ کو آواز دیتے ہیں۔ قسم خدا کی ان پر جوانی آجاتی ہے۔ کبھی کنڈکٹ کرتے وقت ان کا چہرہ دیکھا ہے۔ بھئی کیا باغ و بہار آدمی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں' کسی طرح انہیں اسپتال سے اٹھالاؤ۔ ان کا دل بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا۔ چند لمحوں تک ہوں ہوں کرتا رہا اور ریسیور پر سلیمان کی بات سنتا رہا' پھر اس نے کہا۔ "امپائر کا بندوبست کرنا میرے لیے مشکل ہوگا۔ یار' ڈپٹی کمشنر ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میرے حکم پر ہر کام ہوجائے۔ کم از کم بنا

بنایا امپائر تو میرے حکم پر فی الفور مہیا نہیں ہو سکتا۔ ویسے کسی کو بھی امپائر بنا دو' مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" وہ ریسیور کان سے لگائے چپ بیٹھا رہا' پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اچھا' میں ہی کچھ کرتا ہوں۔ پروگرام ڈسٹرب نہیں ہو سکتا۔" اس نے ریسیور رکھ دیا اور سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اسی عالم میں اس نے گردن اٹھائی' لالی کو دیکھا۔ لالی بائیں طرف کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ ڈپٹی کمشنر اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ زیر لب مسکرایا۔ اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا۔ وہ قریب آگیا تو ڈپٹی کمشنر نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ہنس کر بولا۔

"ٹھیک ہے' امپائر بننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

لالی نے سادگی سے پوچھا۔ "وہ کیا ہوتا ہے جی؟"

"پروا نہ کرو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ یہ بتاؤ' کچھ انگریزی ونگریزی بھی جانتے ہو؟"

لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔ "ساب! انگریزی تو میں بالکل نہیں جانتا۔ میرے پیو نے تو کبھی مجھے سکول بھیجا نہیں' پر جیل میں ضرور پڑھا ہے۔ بات یہ ہے جی۔"

ڈپٹی کمشنر نے اسے آگے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ بات کاٹ کر بولا۔ "اردو میں کم از کم نام تو پڑھ لو گے؟"

لالی نے مستعدی سے جواب دیا۔ "وہ تو جی میں صاف پڑھ لیتا ہوں۔ کبھی انگوٹھا نہیں لگایا۔ ہمیشہ دستخط کرتا ہوں۔"

"بس۔ بس۔" ڈپٹی کمشنر نے ہاتھ اٹھا کر بے زاری کا اظہار کیا۔ "اتنا کافی ہے۔ اب تم امپائر بننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مگر دیکھو' تم کم سے کم بولنا بلکہ سرے سے بات ہی نہ کرنا تو اچھا ہے۔"

ڈپٹی کمشنر نے ریسیور اٹھایا۔

"مہر سلیمان سے ملا دو۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ لالی سر جھکائے کھڑا رہا۔ ڈپٹی کمشنر بے چینی سے اپنا ایک پیر ہلاتا رہا۔ ذرا دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ ڈپٹی کمشنر نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "سلیمان! امپائر کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اپنے ساتھ ہی لیتا آؤں گا۔ یار فضول باتیں چھوڑو' کام کی بات سنو۔ اس دفعہ ٹوکن انگریزی کے بجائے اردو میں ہوں گے۔ تم ٹوکن تیار کراؤ۔ میں آٹھ بجے تک نوشابہ کے ساتھ پہنچ جاؤں گا۔"

اس نے بات ختم کی۔ ریسیور رکھا۔ لالی کو ذرا اور قریب بلایا۔ "پریشان ہونے کی کوئی بات



نہیں۔ تم خاصے تیز آدمی ہو۔ آسانی سے امپائر کا رول ادا کر لو گے۔ اس میں رازداری بنیادی شرط ہے۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "ویسے تو تم خود ہی ایسا راز ہو جسے چھپائے چھپائے پھرتے ہو۔ کسی سے کچھ کہو گے بھی تو وہ تمہیں لپاڑیا سمجھے گا۔"

"اگر لاٹری شاٹری کا معاملہ ہے تب تو جی آپ بالکل پروا نہ کریں۔ میں ڈیڑھ سال تک سرکس میں لاٹری کھلاتا رہا ہوں۔" لالی مسکرایا اور سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولا۔ "مگر جی وہ تو صاف چار سو بیسی تھی۔ ایسا تو کوئی چکر نہیں؟"

"ہش' ایسا کوئی چکر نہیں۔" ڈپٹی کمشنر نے تیوری پر بل ڈال کر اسے گھورا' چند لمحے خاموش رہ کر گویا ہوا۔ "چلو یہ بھی اچھا ہے کہ تم جانتے ہو' لاٹری کس طرح کھیلی اور کھلائی جاتی ہے' مگر یہ ویسی لاٹری نہیں۔ یہ اور قسم کی لاٹری ہے۔ بلکہ اسے قرعہ اندازی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ لاٹری تو سیدھی سیدھی قماربازی ہوتی ہے۔"

اس نے قرعہ اندازی کا طریقہ اور اس کے قاعدے قوانین پوری تفصیل سے لالی کو سمجھائے۔ ہر بات کئی کئی بار بتائی تاکہ ذہن نشین ہو جائے اور وہ امپائر کا کردار اچھی طرح ادا کر سکے۔ لالی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سنتا رہا۔ جو بات سمجھ میں نہ آتی' اس کے بارے میں سوال بھی کرتا جاتا۔ ڈپٹی کمشنر اسے سمجھاتا جاتا۔ جب لالی ہر تفصیل سمجھ گیا اور اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا تو ڈپٹی کمشنر نے سامنے کھڑے ہوئے اردلی کو اشارے سے قریب بلایا۔ اسے کاغذ پینسل لانے کا حکم دیا۔ ذرا دیر بعد وہ کاغذ پینسل لے کر واپس آیا اور ڈپٹی کمشنر کے سامنے میز پر رکھ کر الٹے قدموں چلا گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے پینسل اٹھائی۔ مسکرا کر لالی سے کہا۔ "مسٹر امپائر! اب ذرا تمہارا امتحان بھی ہو جائے۔" اس نے کاغذ پر کچھ لکھا۔ اور لالی کی طرف بڑھا کر بولا۔

"اسے پڑھ کر سناؤ۔"

لالی نے جھٹ پڑھ دیا۔ "امینہ۔" اس نے لمحے بھر تامل کیا پھر ہچکچاتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ "یہ بھی وہاں ہوں گی جی؟"

ڈپٹی کمشنر ایک دم ہمدانی بن گیا' ہنس کر گویا ہوا۔ "ہائے' یہی تو شہر میں قاتل بچا ہے۔ تین راؤنڈ ہو چکے ہیں' مگر اب تک نہیں جاگا میری قسمت کا ستارہ!" اس نے ٹھنڈی سانس بھری' لالی کی طرف ذرا سا جھکا۔ "یار! آج تو تمہاری چودھراہٹ ہے۔ تمہارے ہی ہاتھوں کچھ ایسا ہو جائے کہ میں دروازے پر دستک دے کر کہوں' کھل جا سم سم' اور کھٹ سے سم سم کھل جائے۔ کیا سمجھے؟" اس نے بے تکلفی سے آنکھ ماری اور کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

لالی خاموش کھڑا رہا۔ ہمدانی بھی کچھ دیر خاموش رہ کر گویا ہوا۔ "اب تمہارا ایک عدد نام بھی ہو جائے یہ لالی والی نہیں چلے گا۔" اس نے لالی کو غور سے دیکھا۔ "تم اپنے ڈیل ڈول اور حلیے سے تو بالکل بکر قصاب لگتے ہو۔ تمہارا نام بھی کچھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔" وہ ذرا دیر سوچتا رہا پھر چٹکی بجا کر بولا۔ "مل گیا نام۔ سردار نور محمد خاں بزدار کیسا رہے گا؟" اس نے ذرا سا توقف کیا۔ "یہی ٹھیک رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی تم مظفر گڑھ کے رئیس اور زمیندار بھی بن گئے۔ تمہارا تعارف اسی طرح کرایا جائے گا۔ مگر اپنی چونچ بند رکھنا۔ نام یاد رکھنا' سردار نور محمد خاں بزدار۔ اب ذرا تم اپنا حلیہ ٹھیک کرلو۔ نہا کر کپڑے بدل لو۔"

"میرے پاس تو جی یہی کپڑے ہیں۔"

"کپڑوں کی تم فکر نہ کرو۔ میرے وارڈ روب میں بڑی گنجائش ہے۔"

لالی نے کسی قدر گھبرا کر کہا۔ "ساب! مجھے ٹائی شائی باندھنی نہیں آتی۔"

"کون کہہ رہا ہے' تم ٹائی باندھو۔ ٹائی باندھ کر اور سوٹ پہن کر تم نہایت عمدہ قسم کے بینڈ ماسٹر لگو گے۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "پتلون اور بش شرٹ چلے گی۔"

دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ ہمدانی گلاس اٹھا کر وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی نوشابہ آگئی۔ مگر کچھ سوچ کر فوراً جانے کے لیے مڑی۔ ہمدانی نے اسے ٹوکا۔ "بات تو سنو جان من! جانان من!" اس نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے میرے وارڈ روب سے بش شرٹ اور پتلون نکال کر دے دو۔ یہ آج کی سپنس نائٹ کا ایمپائر ہے۔ اس کا نام سردار نور محمد خاں بزدار ہے۔"

نوشابہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "اور سمرا صاحب؟ کیا انہوں نے امپائر بننے سے انکار کردیا؟"

"نہیں جان من! وہ سخت بیمار ہیں۔" ہمدانی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "تم بھی تیار ہو جاؤ۔ حشر مجسم' فتنہ بداماں۔"

نوشابہ نے ناز سے ہمدانی کو دیکھا۔ پلٹ کر لالی پر نظر ڈالی اور منہ بگاڑ کر بولی۔ "کیا یہ امپائر کے لیے مناسب رہے گا؟"

"بالکل رہے گا۔ اس سے زیادہ مناسب امپائر فی الحال دست یاب نہیں ہو سکتا۔"

وہ کسی قدر بے زاری سے بولی۔ "ہمدانی! کبھی کبھی تو تمہاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آتیں۔" اس نے ایک بار پھر لالی کی جانب دیکھا۔ "یہ تو جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے۔ تم نے اس کے بارے میں یہی تو بتایا تھا۔"



"بتایا تھا' بالکل بتایا تھا۔ بات بھی یہی ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" ہمدانی نے پھر قہقہہ
ـ "جاناں! یہ صرف امپائر ہے' کھیل کا کھلاڑی نہیں ہے۔ اس دفعہ امپائر کے معاملے میں بھی
س رہے گا۔ ہو جائے یاروں کے ساتھ تھوڑی سی اٹی وٹی۔ کیا خیال ہے؟"

"اور جو کسی نے اسے پہچان لیا تو؟"

اسی وقت اردلی طشتری میں وزیٹنگ کارڈ رکھے ہوئے آیا۔ اس نے طشتری ہمدانی کے سامنے ہ دی اور نظریں نیچی کر کے ادب سے کھڑا ہو گیا۔ ہمدانی نے کارڈ اٹھا کر دیکھا اور فوراً ہمدانی سے ں کمشنر بن گیا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا' ہونٹ سمٹ کر جڑ گئے۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر اردلی دیکھا اور خفا ہو کر بولا۔ "میں نے ہدایت کی تھی کہ آج کسی کو ملاقات کا وقت نہ دیا جائے۔ پھر یہ رڈ کیوں آیا؟"

اردلی نے اٹکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "سرکار! بات یہ ہے....."

ہمدانی نے اسے آگے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "مجھے معلوم ہے کیا بات ہے۔" ں نے قدرے تامل کیا۔ "جاؤ' جا کر خان بہادر کو بھیج دو' اب اور کوئی ملاقاتی نہیں آئے گا۔ سمجھ ئے۔"

اردلی الٹے قدموں واپس ہوا۔ نوشابہ بھی کوٹھی کی جانب چلی۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا وٹھی کے اندر چلا گیا اور نوشابہ کے ہم راہ ڈپٹی کمشنر کے ڈریسنگ روم میں پہنچ گیا۔ نوشابہ نے ارڈ روب کھولا۔ لالی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا' وارڈ روب قسم قسم کے کپڑوں سے بھرا ہے۔ بڑی تعداد سوٹوں کی تھی۔

نوشابہ نے لالی کے ڈیل ڈول کی مناسبت سے کئی کپڑے نکال کر دیکھے' پھر ایک پتلون اور بش شرٹ لالی کو دے دی۔ دونوں کپڑے نہایت نفیس سلے ہوئے تھے۔ ان پر عمدہ استری بھی کی گئی تھی۔ نوشابہ نے ایک جوڑی جوتے کی بھی لالی کو دی۔ لالی نے کپڑے اور جوتے سنبھال کر حیرت سے پوچھا۔

"یہ واپس تو نہیں کرنے ہوں گے؟"

نوشابہ نے غصے سے اسے ڈانٹا۔ "احمقانہ باتیں نہ کرو۔ تمہیں آج رات امپائر کا رول ادا کرنا ہے۔"

"وہ تو جی میں بالکل ادا کرلوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ ساب نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔"

"یہ بھی بتا دیا کہ اس کھیل میں رازداری نہایت ضروری ہے؟"

"کیوں نہیں بتایا جی! سارا کھیل تو راز داری ہی کا ہے اور راز داری بھی ایسی ہونی چاہئے کہ ساری زندگی کسی کو پتہ نہ چلے۔ بات تو تب ہوگی۔"

اس دفعہ نوشابہ نے مسکرا کر لالی کو دیکھا۔ "تم تو کچھ کچھ سمجھ دار بھی معلوم ہوتے ہو۔"

"سمجھ داری کی بات تو یہ ہے جی کہ سب کسمت کا کھیل ہے۔"

"کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ تم کم بولا کرو۔ کم سے کم امپائر بننے کے بعد تم اپنا منہ بالکل بند رکھنا۔" اس نے بے رخی سے کہا۔ "اچھا' اب جاؤ اور تیار ہو کر برساتی میں پہنچو۔"

لالی نے ہینگر میں لٹکے ہوئے کپڑے اٹھائے۔ دوسرے ہاتھ میں جوتے سنبھالے۔ خاموشی سے چلتا ہوا انیکسی میں پہنچا۔ اپنے کمرے میں گیا اور فوراً نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔ اس روز وہ بڑے اہتمام سے نہایا۔ ہمدانی کے دیے ہوئے کپڑے پہنے۔ کپڑے ذرا تنگ تھے مگر انہیں پہن کر وہ خوش تھا۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارے۔ مختلف زاویوں سے گھوم پھر کر اپنی سج دھج دیکھی۔

☆

پونے آٹھ بجے ڈپٹی کمشنر بیوی کے ہم راہ کوٹھی سے برآمد ہوا۔ نوشابہ ہلکے گلابی رنگ کا کرتا شلوار پہنے ہوئے تھی۔ میک اپ بھی اس نے بہت نفاست سے کیا تھا۔ چہرے کے نقش و نگار بلور کی طرح ترشے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں کوہستانی جھیلوں کی تابانی تھی۔ وہ ڈپٹی کمشنر کے بازو کا سہارا لیے نپے تلے قدموں سے چل رہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر بھی خوب بن سنور کر نکلا تھا۔ گہرے نیلے سوٹ میں وہ خاصا اسمارٹ اور وجیہہ لگ رہا تھا۔ اس کے انداز میں تمکنت تھی' دبدبہ تھا۔

ڈرائیور نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ دونوں میاں بیوی خراماں خراماں کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ لالی نظریں جھکائے ایک طرف ادب سے کھڑا رہا۔ ڈپٹی کمشنر نے اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے لالی کو اگلی نشست پر اپنے برابر بٹھالیا۔ کار روانہ ہوئی۔ پھاٹک پر مسلح پہرے داروں نے سلامی دی۔ لالی کی گردن بھی ذرا سی تن گئی۔

کار آگے بڑھی اور ملتان روڈ پر آگئی۔ منٹگمری شہر سے گزری۔ عارف والا روڈ پر مڑی۔ کچھ دور جاکر نہر کا پل عبور کیا۔ نشیب میں اتری اور راجباہ بیروالا کے کنارے کنارے دوڑنے لگی۔ ہوا کے بھیگے بھیگے جھونکے کھلی کھڑکیوں سے کار میں آرہے تھے۔ لالی خاموش بیٹھا قریب بہتی ہوئی نہر کا جھل مل کرتا پانی دیکھتا رہا۔



کار تیزی سے دوڑتی رہی۔ پھر وہ کنکر کی بنی ہوئی پتلی سڑک پر مڑ گئی۔ کار اب مہر سلیمان خاں کی جاگیر میں داخل ہو چکی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف آم اور مالٹے کے باغات تھے۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ آم اور مالٹے کے درختوں کا سلسلہ حد نظر تک پھیلا تھا۔

سوا آٹھ بجے کار مہر سلیمان کے بنگلے پر پہنچی۔ بنگلہ کھیتوں اور باغوں سے الگ تھلگ اونچے ٹیلے پر بنا تھا۔ گردونواح میں جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ خودرو پودے تھے۔ بنگلے میں بجلی بھی تھی اور اس کی روشنی رات کے اندھیرے میں دور سے نظر آتی تھی۔ نشیب میں ایک طرف رانی واہ بہتی تھی۔ یہ قدرتی نہر تھی۔ کسی زمانے میں اس جگہ برساتی نالا تھا جس میں صرف برسات کے موسم میں پانی ہوتا تھا۔

نہر کے آس پاس کی لگ بھگ چار ہزار ایکڑ زمین سلیمان کے سسر مہر فدا محمد خاں کی ملکیت تھی۔ اس کے انتقال کے بعد تمام زمین اور جائیداد سلیمان کی بیوی راحیلہ کو ترکے میں ملی۔ راحیلہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس وقت اس زمین کا بیشتر حصہ بنجر اور غیر مزروعہ تھا۔ یہ بنجر اور غیر مزروعہ زمین سلیمان کی تحویل میں آئی تو اس نے آم اور مالٹے کے باغات لگانے کا منصوبہ بنایا اور منصوبہ یہ دیکھ کر بنایا کہ برساتی نالا' راجباہ بیروالا کے بہت قریب سے بہتا تھا۔ اس نے اپنے مزارعوں اور کمیّوں کو بیگار پر لگا کر برساتی نالے کی کھدائی کرائی اور اسے بیروالا کی بڑی نہر سے ملا دیا۔ اس طرح برساتی نالا' قدرتی نہر میں تبدیل ہوگیا۔ اب یہ نہر بنگلے کے عین نیچے بل کھاتی ہوئی بہتی تھی۔ اس کے قرب وجوار میں اعلیٰ قسم کے تخمی اور پیوندی آموں اور ریڈبلڈ مالٹوں کے باغات تھے اور دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت تھے۔ لیکن ابھی تک ہزار ڈیڑھ ہزار ایکڑ اراضی بنجر اور غیر مزروعہ تھی۔ اس میں جھاڑیوں سے بھرے ہوئے جھنگر اور چھتّر تھے۔ انھی اجاڑ اور ویران جھنگروں اور چھتّروں کے درمیان مہر سلیمان کا بنگلہ تھا۔

کار بنگلے کے پھاٹک سے گزر کر پورٹیکو میں جاکر ٹھہر گئی۔ سلیمان اور اس کی بیوی راحیلہ نے ہمدانی کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ سلیمان خوب لمبا تڑنگا تھا' سر پر گھونگروالے بال تھے۔ ان میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ رنگ کھلتا ہوا تھا۔ راحیلہ کا قد بھی اونچا تھا۔ بدن کسی قدر بھاری' اجلی رنگت' چہرہ سیب کی طرح سرخ۔ مگر اس کے چہرے پر نسائیت کم تھی۔ آواز بھی بھاری تھی۔ وہ اس وقت ٹھاٹ سے سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کی عمر ۴۵ سال کے لگ بھگ تھی۔

لالی ڈرائیور کے ساتھ کار سے نیچے اتر کر ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ ہمدانی نے اس کی جانب

اشارہ کرتے ہوئے سلیمان اور راحیلہ سے کہا۔ ”ان سے ملو۔ یہ آج کی سپنس نائٹ کے امپائر ہیں، سردار نور محمد خاں بزدار۔ مظفر گڑھ کے رئیس اور بڑے زمیں دار ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قابل اعتماد بھی ہیں۔“ سلیمان اور راحیلہ نے باری باری ہاتھ بڑھا کر لالی سے مصافحہ کیا۔ لالی راحیلہ سے ہاتھ ملاتے وقت جھجکا۔ مگر راحیلہ نے جھٹ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا۔ لالی سخت پریشان ہوا۔ لیکن اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ ہمدانی نے لالی کی گھبراہٹ بھانپ لی۔ اس نے فوراً پینترا بدلا۔

”تم نے اتنا اصرار کیا کہ میں مسٹر بزدار کو مجبور کر کے لے آیا۔ بھئی آئندہ مجھے امپائر و مپائر کے چکر میں نہ ڈالنا۔ اس کا بندوبست پہلے سے کر لیا کرو۔“

مہر سلیمان نے معذرت کے انداز میں کہا۔ ”مجھے چھ بجے شام کو اچانک اطلاع ملی کہ سرا صاحب پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ تمھی بتاؤ، اتنے شارٹ نوٹس پر میں کیا کر سکتا تھا۔ تم جانتے ہو، میزبان کی حیثیت سے یہ میری ہی ذمہ داری ہے۔ بہرحال، تمہارا اور مسٹر بزدار دونوں کا بہت بہت شکریہ۔“

سلیمان اور ہمدانی باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھے مگر وہ بنگلے کے اندر نہیں گئے۔ سلیمان سب کو باغ میں لے گیا۔ باغ میں گھاس کے خوبصورت قطعے پر نیم دائرے میں صوفے رکھے تھے۔ روشنی بہت ہلکی تھی۔ صوفوں پر پہلے سے کچھ مہمان بیٹھے تھے، کچھ کھڑے تھے۔ مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ سب ملے جلے تھے۔ دھیمی روشنی میں ان کے چہرے دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔

ہمدانی اور نوشابہ پہنچے تو غلغلہ پڑا۔ دونوں نے مسکرا مسکرا کر سب سے مصافحہ کیا اور درمیان کے صوفوں پر ایک دوسرے سے جدا ہو کر بیٹھ گئے۔ لالی بھی ایک طرف چپ چاپ بیٹھ گیا۔

صوفوں سے خاصے فاصلے پر درختوں کے نیچے باقاعدہ بار تھا۔ کاؤنٹر پر قسم قسم کی بوتلیں رکھی تھیں۔ درختوں پر ننھے ننھے رنگ برنگے بلب روشن تھے۔ دو بارمین جھلکتی ہوئی سفید وردیاں پہنے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے تھے۔ وہ بوتلیں کھول کھول کر گلاسوں میں شراب انڈیل رہے تھے۔ بیروں کی وردیاں بھی کلف لگی سفید سفید تھیں۔ شراب کے بار سے ذرا ہٹ کر روشنیوں سے جگمگاتے درختوں تلے اسنیک بار بھی تھا۔ کاؤنٹر پر کھانے کے لئے مختلف اسنیکس قرینے سے رکھے تھے۔ اجلی وردیوں میں ملبوس خانساماں کمر پر سنہرے پٹکے لگائے، نہایت مستعدی سے پلیٹوں میں کھانے کی اشیاء سجا کر رکھ رہے تھے۔ بیرے، ٹرے سنبھالے ہوئے آتے اور اپنے اپنے کاؤنٹر سے شراب کے گلاس اور پیالے، سوڈے کی بوتلیں، پانی بھرے جگ اور کھانے کی اشیاء سے سجی سجائی پلیٹیں



اٹھا کر لے جاتے۔ وہ علیحدہ علیحدہ ٹرے میں شراب اور اسنیکس اٹھائے مہمانوں کے درمیان گھوم رہے تھے۔

اس وقت اسکاچ وہسکی کا دور چل رہا تھا۔ البتہ عورتیں مارٹینی، شیری اور ہلکی فرانسیسی سرخ اور سفید وائن سے شغل کر رہی تھیں۔ صوفوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی میزیں تھیں۔ ان پر چاندی کی خوبصورت طشتریوں میں ماچس اور سگریٹیں رکھی تھیں۔ بعض عورتیں نہایت دھڑلے سے سگریٹ پی رہی تھیں۔

سب عورتیں اور مرد ایک دوسرے سے شناسا اور بے تکلف معلوم ہوتے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہے تھے اور بے تکان باتیں کر رہے تھے۔ محفل میں چھ مرد تھے، چھ عورتیں تھیں۔ ان کی عمریں چالیس اور پچاس کے درمیان تھیں مگر دیکھنے میں اتنی نہیں لگتی تھیں۔ سبھی صحت مند اور زندہ دل تھے۔ سب جوڑے جوڑے تھے۔ صرف لالی لنڈورا تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ ایک صوفے پر خاموش بیٹھا تھا۔

محفل کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر لالی دیر تک حیران و پریشان رہا اور نظریں جھکائے گم صم بیٹھا رہا۔ اس محفل رنگ و بو میں جہاں زبان کے ساتھ ساتھ جسم بھی چہک رہے تھے، وہ خود کو بے حد اجنبی اور تنہا محسوس کر رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اٹھ کر بھاگ جاتا۔ ایک بیرا اس کے پاس بھی شراب کی ٹرے لے کر آیا مگر اس نے انکار کر دیا۔ کئی بار اس نے یہی کیا۔ البتہ اسنیکس کی ٹرے سے کھانے کی چیزیں بار بار اٹھاتا اور پلیٹ میں رکھ کر کھاتا رہا، طشتری سے سگریٹ اٹھا اٹھا کر پھونکتا رہا۔

ایک بیرا، شراب کی ٹرے لے کر آیا۔ تھوڑا سا اصرار بھی کیا، لالی اس دفعہ انکار نہ کر سکا۔ اس نے وہسکی کا گلاس اٹھا لیا۔ بیرے نے اس میں سوڈا ڈال دیا۔ لالی آہستہ آہستہ گھونٹ بھرنے لگا۔ گلاس ختم ہوا تو اس نے ایک بیرے کو اشارے سے قریب بلایا، دوسروں کی دیکھا دیکھی ٹرے میں خالی گلاس رکھا اور بھرا ہوا گلاس اٹھا لیا۔ وہسکی کے دو پیگ لگا کر طبیعت میں سرخوشی آ گئی۔ اجنبیت کا احساس کم ہو گیا۔ وہ اطمینان سے نظریں اٹھا اٹھا کر سب کو دیکھتا رہا۔ محفل میں کوئی شخص لطیفہ سناتا، قہقہے بلند ہوتے۔ لالی بھی بے ساختہ ہنسنے لگتا۔

ہمدانی ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا، جسے وہ ٹھہر ٹھہر کر اٹھاتا، ہونٹوں سے لگاتا، وہسکی کی چسکی لگاتا۔ ہمدانی کبھی بیٹھ جاتا، کبھی کھڑا ہو جاتا اور زور سے قہقہے لگاتا۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتا۔ مگر نوشابہ بہت دیر سے ایک ہی جگہ بیٹھی تھی۔ وہ شیشے کے نازک گوبلٹ سے آہستہ آہستہ گہری سرخ اطالوی وائن پی رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ مارٹینی سے شغل کر چکی تھی۔

اس کا گلابی چہرہ اور نکھر گیا تھا۔ آنکھوں میں چراغ جھل ملا رہے تھے۔ وہ سلیمان کی بیوی راحیلہ سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ نوشابہ نہ زور زور سے قہقہے لگا رہی تھی نہ تتلی کے مانند ادھر ادھر منڈلا رہی تھی۔ لالی کو وہ سب عورتوں سے زیادہ دل ربا اور باوقار نظر آئی۔

نو بجے سے پہلے ایک نیا جوڑا آیا۔ اس کے آتے ہی شور مچا۔ یہ مسعود تھا اور اس کے ساتھ اس کی بیوی امینہ تھی۔ لالی کی نگاہیں دیر سے اسے تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے امینہ کو نظر بھر کر دیکھا۔ وہ سانولی سلونی بنگالن تھی۔ لمبے لمبے بال اور بیچ سے نکلی ہوئی سیدھی مانگ۔ ماتھے پر جگ مگ جگ مگ کرتی بندیا۔ تازہ کنول کی طرح شفاف آنکھیں۔ میانہ قد، چھریرا بدن، پتلی کمر۔ چلتی تو جسم اس طرح لچکتا جیسے نیا دھیرے دھیرے ڈولے۔ وہ زعفرانی ساڑھی باندھے ہوئے تھی مگر بدن پر بلاؤز قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ سینے پر دھجی کی طرح زرتار چولی تھی۔ ساڑھی ناف سے اس قدر نیچے بندھی تھی کہ کولھے کے دائرے صاف نظر آرہے تھے۔ پیٹھ بالکل برہنہ تھی اور نشیب میں دور تک کھلتی چلی گئی تھی۔ اس نے اپنی برہنہ پیٹھ کی ستر پوشی لمبے لمبے چمک دار بالوں سے کر رکھی تھی۔ سن و سال چالیس سے تجاوز کر چکا تھا مگر کاٹھی بہت اچھی تھی۔ پہلی نظر میں وہ الھڑ دوشیزہ نظر آتی تھی۔

لالی نے سوچا ہمدانی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ بہت زوردار رن ہے۔ لیکن امینہ بھڑکتا شعلہ تھی تو اس کا شوہر مسعود اتنا ہی سنجیدہ اور کم گو تھا۔ وہ اونچے قد کا ادھیڑ آدمی تھا۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ تھا۔ رنگ ذرا کھلتا ہوا تھا، سر پر بال کم تھے۔ مگر مانگ نکال کر اچھی طرح جمائے گئے تھے۔ وہ ہونٹوں میں پائپ دبائے ہلکا ہلکا دھواں اڑا رہا تھا۔ ہمدانی نے امینہ کو نظر بھر کر دیکھا اور زور سے قہقہہ لگا کے چیخا۔ "یارو! اب روشنی گل دو۔" امینہ نے گردن کو ذرا سا خم دے کر ہمدانی کی جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم تھا۔ دنبالے کاجل کے حلقوں میں جگمگاتی آنکھیں گنگنا رہی تھیں۔ ہمدانی نے لہک کر شعر پڑھا۔

لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدر

محفل میں زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ ہمدانی ہاتھ پکڑ کر مسعود کو اپنے ساتھ لے گیا اور ایک صوفے پر بیٹھ کر اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ امینہ آگے بڑھی اور سلیمان کے پاس ٹھہر گئی۔ لالی نے وہسکی کے تین بڑے پیگ لگا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ البتہ اس نے کھانا زیادہ کھایا۔ صبح سے بھوکا بھی تھا۔



پہر رات گزر گئی۔ ستارے زیادہ تابناک ہو گئے۔ ہوا میں تیکھا پن آگیا۔ محفل کا رنگ نکھرتا جا رہا تھا۔ قہقہے تھے۔ آوازوں کا زیروبم تھا۔ چہرے سرخوشی سے دمکتے تھے۔ جسم جل ترنگ تھے، آنکھیں دھواں دھواں تھیں۔ سب آپس میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ ہم اور تم کی تمیز نہ رہی۔ صرف لالی اکیلا اور الگ تھلگ تھا۔ وہ صوفے پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ مگر محفل میں عملی طور پر شریک نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا حصہ بن گیا تھا۔ اسے بہت مزا آرہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا گویا کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہو۔

ٹھیک دس بجے سلیمان نے کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا۔ "لیڈیز اینڈ جینٹل مین!" سلیمان کی آواز کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی۔ قہقہے سرد پڑ گئے، آوازیں مدھم ہو گئیں۔ سب چپ چاپ صوفوں کی طرف بڑھے۔ ہر بیوی اپنے میاں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اب ان کی تعداد چودہ تھی۔ سات مرد، سات عورتیں۔

بیرے محفل سے چلے گئے۔ صرف سلیمان اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس نے اونچی آواز سے بولنا شروع کیا۔ "لیڈیز اینڈ جینٹلمین! آج کی نائٹ آف دی گریٹ سینس میں ہمیں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑی۔ یہ امپائر کی تبدیلی ہے۔ بات یہ ہے، مسٹر کرم علی سمرا اچانک شدید بیمار پڑ گئے۔ اب وہ اسپتال میں ہیں۔ یہ اطلاع بھی آج ہی شام کو ملی۔ ان کی جگہ دوسرے امپائر کا فوری انتخاب خاصا پیچیدہ مسئلہ تھا۔ مسٹر ہمدانی نے میری مدد کی۔ اس طرح یہ مسئلہ حل ہوا۔ ایک ممبر غیر حاضر ہیں۔ میری مراد مسٹر رؤف سے ہے۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ گزشتہ ہفتے کینیڈا چلے گئے۔ انہوں نے روانگی سے پہلے فون پر معذرت کر لی تھی۔"

سلیمان نے اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا۔ لالی ایک بار پھر گھبرا گیا اور بوجھل قدموں سے سلیمان کے برابر جا کر کھڑا ہو گیا۔ سلیمان نے لالی کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ ہیں سردار نور محمد خاں بزدار۔ مظفر گڑھ کے رئیس اور بڑے زمیں دار ہیں۔ ان پر پورا، پورا اعتماد بھی کیا جا سکتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اکثر خاندانی رئیسوں کی طرح ان کے ساتھ بھی یہ حادثہ ہے کہ انگریزی نہیں جانتے۔ کوشش ہی نہیں کی۔ ان سے آپ کو اردو یا پنجابی میں بات کرنی ہوگی۔ یہ بات میں پہلے بتائے دے رہا ہوں تاکہ بعد میں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔" اس نے لمحے بھر توقف کیا۔ "آئیے، اب میں آپ کو ان سے ملوا دوں۔ یہ ضروری بھی ہے۔ سمرا صاحب کی بات دوسری تھی۔ سب کے ساتھ ان کی اچھی جان پہچان تھی۔" اس مختصر تقریر کے بعد سلیمان خاموش ہو گیا۔ لالی بھی چپ چاپ کھڑا رہا۔ نہ وہ بولا، نہ کسی نے اس سے بولنے کی فرمائش کی۔

سلیمان اسے اپنے ہم راہ آخری سرے پر لے گیا۔ لالی بدستور گھبرایا ہوا تھا۔ سلیمان نے باری باری ہر شخص کا لالی سے سرسری تعارف کرایا۔ سب سے پہلے وہ شیخ عبدالحمید مگوں سے ملا۔ شیخ حمید چنیوٹ کا رہنے والا تھا۔ لائل پور میں اس کے دو کارخانے تھے۔ شیخ عبدالحمید مگوں کا نام سن کر لالی چونکا۔ اسے یاد آیا کہ پچھلی رات بشیرے نے اس کا تذکرہ کیا تھا۔

اس نے شیخ حمید کو غور سے دیکھا۔ حمید مگوں کے ساتھ اس کی بیوی مہ جبین تھی۔ وہ گداز بدن کی گوری چٹی عورت تھی۔ ناک نقشہ سبک تھا مگر آنکھیں ذرا چھوٹی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے ہلکی ہلکی جھریاں تھیں۔ جھریاں چھپانے کے لیے خاصا میک اپ کیا گیا تھا۔ وہ ہاتھوں اور کانوں میں قیمتی جڑاؤ زیور پہنے ہوئے تھی۔ چشم و ابرو اور ٹھسّا صاف چغلی کھاتا تھا کہ اس کا تعلق کبھی ارباب نشاط سے رہ چکا ہے۔ شیخ حمید مگوں خاصا تومند تھا۔ اس کا پیٹ ذرا سا آگے نکلا ہوا تھا۔ رنگ سانولا تھا' بات بھی کم کرتا تھا۔ وہ نہایت نفیس سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی عمر ۴۵ سے اوپر تھی۔ مہ جبین بھی تقریباً اسی عمر کی تھی۔

دوسرے نمبر پر چوہدری محمد نواز بھنڈر تھا۔ وہ پولی نیسین کلب کا بنیادی رکن تھا۔ سسپنس نائٹ میں شرکت کے لیے لاہور سے آیا تھا۔ وہ ریلوے میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھا۔ ادھیڑ عمر' مگر خوش رو اور خوش طبع۔ فاخرہ اس کی بیوی تھی۔ دبلی پتلی کامنی سی۔ چمپئی رنگت' چہرہ تروتازہ اور صراحی دار گردن۔ گردن میں سونے کا جڑاؤ گلوبند تھا۔ سر پر بالوں کی پتلی سی سفید لٹ تھی جس نے اس کے چہرے کی دل کشی میں تنوع پیدا کر دیا تھا۔ وہ خاصی طرح دار عورت تھی۔ بات کرتی تو گردن کو ذرا سا خم دیتی اور نظریں ترچھی رکھتی۔

نواز بھنڈر کے قریب مرزا ابوالحسن بیٹھا تھا۔ وہ ایس پی تھا اور گٹھے ہوئے بدن کا تندرست آدمی تھا۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ رنگت گندمی تھی۔ وہ بات بات پر زور سے قہقہے لگاتا۔ اس کی بیوی سائرہ تھی۔ خوش شکل' رنگ صاف اور قد قدرے چھوٹا۔ چھوٹے قد کے باعث وہ اپنی عمر سے کم نظر آتی تھی۔ بات کرتی تو دانت چنبیلی کی کلیوں کی طرح خوبصورت لگتے۔ وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ہلکے ہلکے نشے سے خمار آلود تھیں۔ لالی نے ایس' پی مرزا کو دیکھا تو سراسیمہ ہو گیا۔ مرزا نے اس کی گھبراہٹ بھانپ لی۔ اس کے چہرے پر پولیس والوں کی مخصوص خشونت جھلکنے لگی۔ اس نے لالی کو بغور دیکھا اور مسکرا کر بہت آہستہ سے بولا۔ "تم نے مونچھیں بھی صاف کرا دیں؟"

لالی لرز کر رہ گیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا' خاموش کھڑا رہا۔ ایس' پی نے تیوری پر ہلکا سا



بل ڈال کر سرگوشی کی۔ "تم تو لالی ہو' نور محمد بزدار کب سے بن گئے؟" اس نے ذرا تامل کیا۔ "تمہارا ساتھی رحیم دار کہاں ہے؟" لالی اور پریشان ہو گیا۔

ہمدانی قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے صورت حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے فوراً مداخلت کی۔ "مرزا! نو آفیشل بزنس پلیز۔" اس نے پہلو بدلا اور مسکرا کر بولا۔ "پارٹی میں آیا کرو تو اپنا پولیس مین گیٹ کے باہر چھوڑ دیا کرو۔"

مرزا نے گردن موڑ کر ہمدانی کو دیکھا اور سنجیدہ ہو کر بولا۔ "سر! مجھے کچھ شبہ ہوا تھا۔"

ہمدانی ایک دم ڈپٹی کمشنر بن گیا۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ "یہاں ہم اپنا شک و شبہ رفع کرنے کے لیے اکٹھا نہیں ہوئے ہیں۔"

ایس پی صفائی پیش کرنے لگا۔ "بات یہ ہے سر! وزیر زراعت نے فون پر فون کر کے اپنی دلیل بلوا دی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ڈپٹی کمشنر لمحے بھر خاموش رہا۔ "یار! تم پکی نوکری والے' ان کچی نوکری والے وزیروں کو گھاس ہی کیوں ڈالتے ہو؟ یہ تو چڑھتی اترتی دھوپ چھاؤں ہیں۔ ان کا تو کام ہی سفارشیں کرنا ہے۔ کسی کو چھڑوا دیا' کسی کو اندر کرا دیا' یا پھر انہیں الاٹ منٹوں اور لائسنسوں کا عارضہ ہے۔ تم نے خواہ مخواہ ان لوگوں سے لمبی چوڑی امیدیں باندھ رکھی ہیں۔ لاکھ کارگزاری دکھاؤ' تم پانچ سال سے پہلے ڈی آئی جی نہیں بن سکتے۔ وزیر زراعت کو مکھن لگانے سے بھی نہیں بن سکتے۔ ون یونٹ تو سمجھو بن ہی چکا ہے۔ چند مہینے کی بات اور ہے۔ پھر نہ یہ صوبہ رہے گا اور نہ اس کا کوئی صوبائی وزیر۔ کیا سمجھے؟"

ہمدانی خاموش ہوا تو مہر سلیمان نے بھی اظہار ناپسندیدگی کیا۔ "مرزا! تم کس کی لیگ پولنگ کر رہے ہو' میری یا ہمدانی کی؟ تم وردی اتار کر بھی وردی میں رہتے ہو۔ خواہ مخواہ کا ایک شوشا چھوڑ دیا۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔

بات چیت بہت آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ لہٰذا دوسرے مہمان ایس پی کی باتوں کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ پھر بھی کسی نے مرزا کا رویّہ پسند نہ کیا۔ چوہدری نواز بھنڈر نے ہنس کے کہا۔ "بھئی مرزا! اس ویرانے میں مہینے بھر بعد تو ایک خوبصورت رات ملتی ہے۔ تم اس کا بھی سارا حسن اور سارا مزہ کرکرا کر دینا چاہتے ہو۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "یار! ہم غربا و مساکین پر کچھ تو رحم کھایا کرو۔"

کچھ اور احتجاجی آوازیں بھی بلند ہوئیں۔ عورتوں نے سب سے زیادہ ناک بھوں چڑھائی۔ خود

مرزا کی بیوی سائرہ نے اسے ڈانٹا۔ "مرزا! ڈونٹ بی سلی۔" ایس پی ان تابڑ توڑ حملوں سے گھبرا گیا۔ شرمندہ ہو کر ہر ایک سے معذرت کرنے لگا۔ اس نے کئی بار اونچی آواز سے کہا۔

"سوری، آئی ایم ویری سوری۔"

لالی نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا، چپ کھڑا سب کی باتیں سنتا رہا۔ ذرا دیر بعد وہ سلیمان کے ہم راہ آگے بڑھا اور ڈاکٹر بٹ کے پاس پہنچا۔ بٹ محکمہ صحت کا ڈائریکٹر تھا اور شام ہی کو ملتان سے سیدھا سلیمان کے بنگلے پہنچا تھا۔ پچاس کے لگ بھگ سن، مگر زندہ دل اور یار باش۔ سر کے بال خشک اور کسی قدر لمبے تھے۔ لباس کے معاملے میں بھی وہ خاصا بے نیاز تھا۔ سرمئی پتلون پر کارڈرائے کا بش شرٹ نما فاختئی کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ٹائی گہری سرخ تھی۔ وہ آنکھوں پر چشمہ لگائے آہستہ آہستہ پائپ پر کش لگا رہا تھا۔ وضع قطع سے انٹلکچوئل لگتا تھا اور شکل و صورت کے اعتبار سے جاذب نظر تھا۔

ڈاکٹر بٹ کی بیوی ماہ رخ اس سے بھی زیادہ آشفتہ مزاج تھی۔ وہ سرخ ریشمی شلوار اور نہایت باریک ململ کا کڑھا ہوا سفید کرتا پہنے ہوئے تھی۔ کرتے کے نیچے اور کوئی کپڑا نہیں تھا۔ اندر سے اس کی گوری گوری جلد صاف جھلک رہی تھی۔ ناک ذرا چھوٹی تھی، مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور شبنم کے قطروں کی طرح جھلملاتی تھیں۔ وہ سن سے اتر چکی تھی۔ لیکن بدن اب تک سڈول تھا اور اسے سڈول رکھنے کے لئے وہ پابندی سے ریاض بھی کرتی تھی۔

سب سے آخر میں لالی مسعود کے پاس پہنچا۔ مسعود محکمہ آبادکاری میں ایڈیشنل کمشنر تھا۔ چند سال تک بنگال میں مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہ چکا تھا۔ اس نے کلکتے میں امینہ سے شادی کی۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی بنگال میں کئی سال گزارے، اب ادھر آ گیا تھا۔ اس کی بیوی امینہ کو موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ رقص کرنا بھی جانتی تھی۔ ہنستی تو گلے میں گھنگرو کا چھناکا ہوتا۔ اٹھتی تو بدن پھولوں سے لدی شاخ کی طرح جھومتا۔ چلتی تو بے ساختہ یہ مصرعہ زبان پر آ جاتا۔

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں!

نئے امپائر سے مہمانوں کے تعارف کی رسم ختم ہوئی تو سب کھڑے ہو گئے۔ روشوں پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باغ کے ایسے حصے میں پہنچے جو سرس اور شرینہ کے اونچے اونچے گنجان درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ درختوں کے درمیان جدید طرز کی دو منزلہ عمارت تھی جو کلب کے ممبروں میں پلے ژر ہاؤس کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ نہر اس کے نیچے ہی بہتی تھی۔ عمارت کے دریچوں سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ ہمدانی نے چلتے چلتے سلیمان سے کہا۔



"سلیمان! امپائر کو پلے ژر ہاؤس اچھی طرح دکھا دو تاکہ وہ اس کے جغرافیئے سے واقف ہو جائے۔"

مہر سلیمان نے مسکرا کر جواب دیا۔ "مجھے اپنی ذمہ داری کا بخوبی احساس ہے۔ امپائر نیا ہے، میں تو نیا نہیں ہوں۔"

☆

سب مہمان پلے ژر ہاؤس میں داخل ہوئے اور کوریڈور سے گزر کر ایک کشادہ ہال میں پہنچ گئے۔ صرف سلیمان اور لالی زینے کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر چلے گئے۔ بالائی منزل پر طویل غلام گردش تھی۔ اس کے ایک طرف کمرے تھے۔ کمروں کے دروازے ایک سلسلے سے دور تک چلے گئے تھے۔

پلے ژر ہاؤس کے طرز تعمیر سے مشرقیت جھلکتی تھی۔ غلام گردش کی آرائش میں بھی مشرقیت کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ جگہ جگہ محرابیں تھیں۔ ان میں پیتل کی منقش قندیلیں آویزاں تھیں۔ کہیں کہیں چھت سے فانوس لٹک رہے تھے۔ مگر روشنی مدھم تھی۔ اتنی مدھم کہ غلام گردش میں چلنے والے پرچھائیوں کے مانند دھندلے دھندلے نظر آتے۔ غلام گردش میں دبیز قالین کا فرش تھا۔ محرابوں کے نیچے ہر کونے میں ذرا اونچائی دے کر لکڑی کے خوش نما تختے لگائے گئے تھے۔ تختوں پر چھوٹے چھوٹے گملوں میں خوب صورت پودے تھے۔ ان کے قریب قد آدم سیاہ اور سفید مجسمے نصب تھے۔ دیواروں پر دل فریب تصاویر آویزاں تھیں۔ ان میں قرون وسطیٰ کے مشرقی شبستانوں کے رومانی مناظر پیش کیے گئے تھے۔ مجسموں کی طرح تصاویر بھی ہیجان انگیز تھیں اور جذبات میں تلاطم برپا کرتی تھیں۔

غلام گردش میں دس کمرے تھے۔ کمروں کے دروازوں کے درمیان خاصا فاصلہ تھا، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کمرے بڑے اور کشادہ ہیں۔ ان کی کھڑکیاں نہر کی طرف کھلتی تھیں۔ ہر کمرے کے دروازے کے مقابل ذرا ہٹ کر غلام گردش میں جگہ جگہ صوفے پڑے تھے۔ دروازوں پر ریشم کے باریک پردے جھول رہے تھے۔ ہر دروازے پر پیتل کی تختی آویزاں تھی۔ تختی پر کمرے کا نمبر درج تھا۔ مگر ہر دروازہ مقفل۔ ہر قفل میں کنجی لگی تھی اور ہر کنجی پر کمرے کا نمبر لکھا تھا۔ سلیمان نے ایک ایک دروازے کا تالا کھول کر لالی کو دکھایا اور کنجی، تالے میں لگی چھوڑ دی۔ مگر وہ لالی کو کمرے کے اندر نہیں لے گیا۔ لالی نے بھی اندر جانے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ تالوں اور کنجیوں کا معائنہ کر کے دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

مہر سلیمان نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمدانی، لالی کو قرعہ اندازی کا طریقہ اور اس کے قاعدے قوانین بتا چکا ہے، ایک بار پھر قرعہ اندازی کے بارے میں تمام تفصیلات دہرائیں۔ اس نے لالی سے پوچھا۔

"مسٹر بزدار! میں نے یہاں کی ہر بات بتا دی۔ اب بھی آپ نے کچھ پوچھنا ہے، تو پوچھ لیجئے۔ میں بعد میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ ہر بات کا فیصلہ آپ ہی نے کرنا ہوگا اور آپ کے فیصلے کو کوئی چیلنج نہیں کرے گا۔"

لالی نے اعتماد سے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے جی! آپ پروا نہ کریں۔ میں نے ہر بات سمجھ لی ہے۔"

اس نے سلیمان سے صرف اتنی ہی گفتگو کی۔ باقی تمام وقت خاموش رہا اور ہر چیز حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس نے کرید کر کوئی بات نہیں پوچھی۔ وہ ہمدانی کی تنبیہہ کے مطابق کم سے کم بلکہ سرے سے بولنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

اوپر کی منزل سے اتر کر دونوں ہال میں آئے۔ سارے مہمان بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی لالی چپ چاپ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد سلیمان بولنے کے لئے کھڑا ہوا۔ عین اسی وقت اس کا بوڑھا منیجر ہال کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ چہرے مہرے سے خرانٹ لگتا تھا۔ منیجر دروازے کے قریب سر جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر مہر سلیمان نے حیرت سے پوچھا۔

"سکھیرا! تم یہاں کیسے آ گئے؟"

اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "سر! میں جانتا ہوں، مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے۔ مگر بار بار ٹیلی فون آ رہے ہیں۔ بہت ارجنٹ کالز ہیں۔ مجھے مجبوراً آنا پڑا۔ یہاں ٹیلی فون بھی نہیں ہے۔ ورنہ میں فون پر آپ سے کنٹیکٹ کرتا۔"

سلیمان نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔ "کیسے فون آ رہے ہیں؟ کیوں آ رہے ہیں؟"

سکھیرا نے بتایا۔ "سر! کوئی دو گھنٹے پہلے گیمبر سٹیشن کے نزدیک دو ٹرینیں ٹکرا گئی ہیں۔ زبردست حادثہ ہوا ہے۔ ابھی تک گیارہ کے مرنے کی اطلاع ہے۔ زخمی تو بہت سے ہیں۔ ہر طرف چیخ پکار مچی ہوئی ہے۔"

ہال پر سناٹا طاری ہو گیا۔

سلیمان نے بے رخی سے کہا۔ "تو میں کیا کروں؟"



"نہیں سر!" سکھیرا نے فوراً وضاحت کی۔ "ساری کالیں چوہدری نواز بھنڈر صاحب، ڈپٹی کمشنر صاحب، ایس پی صاحب اور ڈاکٹر بٹ صاحب کے لیے ہیں۔"

"یار سکھیرا! تم اس وقت کہاں کباب میں ہڈی بن کر آ گئے۔" ہمدانی نے ہنس کر کہا۔ "بہرحال میرا اس معاملے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس نے مڑ کر نواز بھنڈر کی طرف دیکھا۔ "یہ تمہارا درد سر ہے۔ معلوم نہیں، مجھے کیوں ان کانٹوں میں گھسیٹ لیا گیا؟"

"ایسا نہیں ہے۔" نواز نے سنجیدگی سے کہا۔ "ذمے داری تو میری بھی ہے، تمہاری بھی، مرزا اور بٹ کی بھی ہے۔"

ایس پی مرزا نے اس کی بات پر احتجاج کیا۔ "مجھے کیوں انوالو کر رہے ہو؟ نواز! تمہاری ریلوے پولیس کس مرض کی دوا ہے؟"

سکھیرا نے ہچکچاتے ہوئے مطلع کیا۔ "مجھے بتایا گیا ہے کہ جہاں حادثہ ہوا ہے، وہاں بہت اندھیرا ہے۔ آس پاس کے پنڈ والوں نے لوٹ مار شروع کر دی ہے۔ سٹیشن پر صرف ایک کانسٹیبل تھا۔ وہ جائے حادثہ کی جانب گیا ہے۔ سر! وہ اکیلا کیا کر سکتا ہے؟ اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر نے مجھ سے خود بات کی ہے۔ وہ بہت پریشان لگتا تھا۔"

مرزا خاموش رہا۔ مگر نواز بھنڈر گویا ہوا۔ "ریلوے ٹریفک کا اتنا سٹاف موجود ہے۔ حادثے کی جگہ کوئی بھی پہنچ سکتا ہے۔ میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟" اس نے کچھ تامل کیا۔ "فون موجود ہوتا تو ڈی ایس کو وہاں پہنچنے کا حکم جاری کر دیتا۔ اور میں کیا کر سکتا ہوں؟ اتنی سی بات انہیں سمجھ نہیں آئی۔ بس ٹیلی فون کھڑکھڑانے شروع کر دیئے۔" اس نے جھنجلائی ہوئی نظروں سے سکھیرا کی جانب دیکھا۔ "اور تم انہیں ٹالنے کی بجائے فریاد لیے یہاں آ گئے؟"

ڈاکٹر بٹ نے سکھیرا کو مخاطب کیا۔ "سکھیرا! تم ایسا کرو، اسپتال ٹیلی فون کر کے میری طرف سے ڈیوٹی انچارج سے کہو، جتنی ایمبولینس اسپتال میں موجود ہوں، ڈاکٹروں اور نرسوں کی ایک ٹیم کے ساتھ فوراً جائے حادثہ پر پہنچا دی جائیں۔"

"یار ڈاکٹر! تم کس چکر میں پڑ گئے۔ یہ بتا کر کہ تم یہاں موجود ہو، اخبارات کے لیے خواہ مخواہ ایک اسکینڈل کا میٹریل فراہم کر دو گے۔" ہمدانی نے سکھیرا کی جانب دیکھا۔ "فون پر تمہاری کس کس سے بات ہوئی؟"

سکھیرا نے جواب دیا۔ "منسٹروں کے سیکریٹریوں اور دوسرے افسروں کے فون آ رہے ہیں۔ دستور ساز اسمبلی کے ایک ممبر نے بار بار فون کیا۔ وہ حادثے والی ایک ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔

وہ بھی بہت پریشان لگتے تھے۔"

ڈاکٹر بٹ کی بیوی ماہ رخ نے گھبرا کر کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا' آج کا پروگرام کینسل کر دیا جائے؟"

ہمدانی مسکرا کر بولا۔ "ڈونٹ بی سلی ماہ رخ! پروگرام کیسے کینسل ہو سکتا ہے؟"

وہ بولی۔ "بھئی دیکھئے نا' کتنے بہت سے لوگ مر گئے۔ زخمی بھی بہت ہیں۔ نہ کوئی ریلیف ورک ہے نہ میڈیکل ایڈ۔ بہت سیریس بات ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہئے۔ ایمرجنسی جو ٹھہری۔"

مرزا نے اسے پریشان دیکھ کر کہا۔ "ماہ رخ! تم تو ایسی رقت کے ساتھ بات کر رہی ہو' گویا سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہے۔" ایس پی کے اس جملے پر ہلکا قہقہہ بلند ہوا۔

نواز کی بیوی فاخرہ کسی قدر بے چین ہو کر بولی۔ "بھئی! آپ لوگ ہم عورتوں کے جذبات کا بالکل لحاظ نہیں کرتے۔"

ہمدانی نے اس کی بات نظرانداز کر کے کہا۔ "سکھیرا! یہ بتاؤ' تم نے جواب کیا دیا؟ کوئی حماقت تو نہیں کر بیٹھے؟ یہ تو نہیں بتا دیا کہ ہم سب یہاں موجود ہیں؟ ویسے اصولی طور پر تمہیں یہ بات معلوم نہیں ہونا چاہئے۔" اس نے مسکرا کر اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "یار تم بوڑھے ہو گئے اور ابھی تک تمہیں یہ معلوم نہیں کہ منیجر یا سیکرٹری کیا چیز ہوتا ہے؟"

سکھیرا نے جواب دیا۔ "سر! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ بنگلے میں ایک پارٹی ہے۔ مجھے نہیں معلوم اس میں کون کون موجود ہے۔ پوچھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔ یہ بات بھی میں نے اس لیے کہی کہ فون کرنے والوں کو آپ لوگوں کے بنگلوں سے اطلاعات ملی ہیں کہ آپ لوگ یہاں ہیں۔"

مرزا نے اونچی آواز سے کہا۔ "لو بھئی' سن لو۔ آئندہ یہ پروگرام ٹاپ سیکریٹ رکھنا ہو گا۔ ورنہ ایسی مصیبتیں اکثر نازل ہوتی رہیں گی۔"

"ویسے تو یہ ٹاپ سیکریٹ ہی ہے۔" نواز نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "مگر حادثے کے سلسلے میں ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"یار! پروگرام ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہ کرو۔" ہمدانی نے کسی قدر سنجیدگی سے کہا۔ اس نے مڑ کر سکھیرا کو دیکھا۔ وہ دروازے کے قریب سہما ہوا کھڑا تھا۔ "سکھیرا! ایسا کرو' لاہور یا کراچی سے کوئی اہم کال آئے تو صاف انکار کر دینا کہ ہم چاروں میں سے کوئی یہاں نہیں آیا۔ اس کے بعد فون ڈیڈ کر دو اور اطمینان سے سو جاؤ۔ آئندہ سے تمہارے لیے یہ قطعی ممنوعہ علاقہ ہو گا۔"



ڈاکٹر بٹ نے ہمدانی سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ "اس طرح کام نہیں چلے گا۔ ہمیں خانہ پری کے لیے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

مہر سلیمان اب تک خاموش کھڑا تھا۔ وہ کسی قدر بیزاری سے بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج کا پروگرام کینسل کر دیا جائے؟"

ڈاکٹر بٹ نے فوراً صفائی پیش کی۔ "میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ ٹھٹکا۔ "مگر تم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ معاملہ بہت سیریس ہے اور بات اوپر تک پہنچ چکی ہے۔ میں خود جا کر فون پر اسپتال سے کنٹیکٹ کرتا ہوں اور ڈیوٹی انچارج کو ہدایت دیتا ہوں کہ وہ میڈیکل ٹیم لے کر جائے حادثہ پر پہنچ جائے۔" اس نے سلیمان کی طرف نظریں اٹھائیں۔ "سلیمان پروگرام ختم کرنے کی بجائے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اسے تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر دیا جائے؟"

"پروگرام تو ڈلے کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ سوچ لو' تمہاری خانہ پری کی کارروائی سے کوئی پھڈا نہ ہو جائے۔" ایس پی مرزا نے خبردار کیا۔

"نہیں' ایسا نہیں ہو گا۔" بٹ نے بہت اعتماد سے کہا۔ "میں پوری احتیاط سے کام لوں گا۔ ڈیوٹی انچارج میرے اعتبار کا ڈاکٹر ہے۔ اس کا ایک کیس بھی میرے پاس دبا ہوا ہے۔" اس نے چوہدری نواز کی جانب رخ کیا۔ "نواز! تمہیں بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ تم ٹیلی فون پر فوراً لاہور سے کنٹیکٹ کرو۔ کسی ریلوے افسر کی ڈیوٹی لگاؤ کہ وہ ایک ریلیف ٹرین لے کر فوراً حادثے کی جگہ پہنچ جائے۔ اگر اتنا کام ہو جائے تو سمجھ لو' نہ صرف ہم دونوں کی بلکہ سب کی ذمہ داری پوری ہو گئی۔"

نواز بھنڈر نے ڈاکٹر بٹ کی تجویز سے اتفاق کیا۔

ہمدانی بھی رضامند ہو گیا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر پروگرام زیادہ ڈلے نہیں ہو سکتا۔"

سائرہ نے مسکرا کر کہا۔ "میرا خیال ہے' یہ ٹھیک ہے۔" اس نے ڈاکٹر بٹ اور نواز کی طرف دیکھا۔ "اب آپ دونوں دیر نہ کیجئے۔ جلدی سے یہ کام نمٹا کر آ جائیے۔"

ڈاکٹر بٹ اور نواز اپنی نشستوں سے اٹھے اور سکھیرا کے ہم راہ ہال سے چلے گئے۔ سلیمان اب تک کھڑا تھا۔ وہ بیٹھ گیا۔ اس کے برابر شیخ حمید مگوں بیٹھا تھا۔ وہ بالکل گم صم تھا۔ ریلوے کا حادثہ سرے سے اس کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ وہ بار بار دزدیدہ نگاہوں سے سلیمان کی بیوی راحیلہ کو دیکھ رہا تھا۔ راحیلہ کی سفید بنارسی ساڑھی کا پلو ڈھلک کر نیچے گر گیا تھا اور وہ نہایت اشتعال انگیز انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔

ہمدانی خمار آلود نظروں سے امینہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور امینہ کا شوہر مسعود خاموش بیٹھا آہستہ آہستہ پائپ کے کش لے رہا تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ اور قطعی بے نیاز نظر آرہا تھا۔

ماہ رخ نے چند لمحوں بعد خاموشی توڑی اور مسعود کو مخاطب کیا۔ "مسعود صاحب! آپ تو ایسے بے نیاز لگ رہے ہیں، جیسے حادثے کا آپ پر کوئی ری ایکشن نہیں ہوا؟"

مسعود نے ماہ رخ کو نظر بھر کر دیکھا اور ایش ٹرے میں پائپ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔ "میں سوچ رہا تھا، کون سی ایسی قیامت آگئی۔ گیارہ افراد ہی تو ہلاک ہوئے ہیں۔ کچھ اسپتال جاتے جاتے یا اسپتال پہنچ کر مرجائیں گے۔"

نوشابہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ آپ کو اتنا کیلس اور بے حس نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کا تعلق تو محکمہ آبادکاری سے ہے۔"

مسعود مسکرا کر بولا۔ "نوشابہ! تم میری نفسیات نہیں سمجھ سکتیں۔ میں برسوں مشرقی بنگال میں رہا ہوں۔ وہاں ہر سال قحط، سیلاب اور سائیکلون سے ہزاروں افراد مرجاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جتنے لوگ ہر سال مرجاتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ بچے پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہ موت اور زندگی کا کھیل ہے۔ ایک جاتا ہے، دوسرا آجاتا ہے۔" اس کے چہرے پر فلسفیانہ سنجیدگی چھاگئی۔ "اس طرح بنگالیوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ کسی حد تک خودبخود حل ہوتا جارہا ہے۔"

مہر سلیمان نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "آبادی میں اضافہ صرف مشرقی بنگال کا نہیں، اس صوبے کا بھی مسئلہ ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو یہ انٹرنیشنل مسئلہ ہے۔ میں نے پچھلے دنوں عالمی ادارہ صحت کی ایک رپورٹ دیکھی تھی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ صدی کے آخر تک دنیا کی آبادی اتنی بڑھ جائے گی کہ شدید غذائی بحران پیدا ہوجائے گا۔ یہاں تک کہ سمندر کی غذا پر بھی انحصار کرنا پڑے گا۔ اس کے لیے ابھی سے کوششیں شروع کردی گئی ہیں۔"

مسعود نے ہنس کر کہا۔ "سلیمان! تم آج کی بات کر رہے ہو۔ مالتھس نے تو اٹھارویں صدی کے آخر میں دنیا کو اس خطرے سے خبردار کردیا تھا۔ وہ تھا تو پادری مگر انگریز تھا اور اکنامسٹ بھی تھا۔ اس نے بڑھتی ہوئی انسانی آبادی اور اس کے لیے ناکافی پیداوار کے پیش نظر جنگیں، وبائی امراض اور ناگہانی آفات ناگزیر قرار دی تھیں۔ آبادی ہر قیمت پر کم کرنے پر زور دیا تھا۔ اس کے یہ خیالات مالتھزم کے نام سے مشہور ہوئے اور آج اس نظریے کی بنیاد پر بڑھتی ہوئی آبادی پر کنٹرول



کرنے کے لیے نہایت سنجیدگی سے غور کیا جارہا ہے۔" اس نے پائپ میں تازہ تمباکو بھری اور اسے سلگا کر کش لگایا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ حادثات سے زیادہ ہمیں بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔ خصوصاً خواتین کو اس مسئلے پر اور زیادہ سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔" مسعود کی باتیں سب خاموشی سے سنتے رہے۔ اس نے بات ختم کی تو ہال پر ایک بار پھر سکوت طاری ہوگیا۔

لالی گم صم بیٹھا، حیرت سے ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کس قسم کی باتیں ہیں؟

☆

ڈاکٹر بٹ اور نواز بھنڈر ہال میں داخل ہوئے۔ دونوں تھکے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ڈاکٹر بٹ نے بیٹھتے ہی کہا۔ "حد ہوگئی ہے بے پروائی کی۔ اسپتال میں ایک بھی ڈاکٹر موجود نہیں۔"

مرزا نے ہنس کر کہا۔ "آج ہفتے کی رات ہے۔ نرسوں کے ساتھ کہیں ٹھرک لگا رہے ہوں گے۔"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" ڈاکٹر بٹ نے جواب دیا۔ "بہت مشکل سے ایک ڈاکٹر کو تلاش کیا۔ اسے میں نے ایک میڈیکل ٹیم جائے حادثہ پر لے جانے کی ہدایت بھی کردی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ صرف ایک ایمبولینس ہے۔ وہ بھی پرانی اور بوسیدہ۔ ہفتے بھر سے مرمت کے لیے لاہور کے کسی آٹو ورکشاپ میں پڑی ہے۔ میں نے حکم دیا، کوئی ٹرانسپورٹ نہیں ہے تو بس اور ٹرک ہی کا بندوبست کرکے چلے جاؤ۔ بہرحال میں جو کرسکتا تھا، وہ میں نے کردیا۔"

مسعود نے کہا۔ "تم نے تو خانہ پری کردی۔ چلو، یہ بھی ٹھیک رہا۔" وہ نواز بھنڈر سے مخاطب ہوا۔ "تم پر کیا بیتی؟"

نواز نے بتایا۔ "لاہور کی لائن بے حد خراب تھی۔ فون پر کنیکٹ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح کنیکٹ ہوا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ریلیف ٹرین روانہ کرنے کے انتظامات ہو رہے ہیں۔" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "مگر حادثہ بہت سنگین ہے۔ مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ زخمی بھی بہت ہیں۔ نہ معلوم، کتنی لاشیں اور زخمی ٹوٹے پھوٹے ڈبوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور ابھی تک ریلیف کا کوئی کام شروع نہیں ہوا۔" پھر گہری خاموشی چھاگئی۔ ہر شخص خاموش اور نڈھال نظر آرہا تھا۔ ہال میں سب کے داخل ہوتے وقت فضا میں جو گھما گھمی اور شوریدہ سری تھی، اب غبار آلود ہوچکی تھی۔

مگر یہ بوجھل سکوت زیادہ دیر طاری نہ رہا۔ ہمدانی دیر سے چپ بیٹھا تھا، اس نے اچانک زور کا

قہقہہ لگایا اور اونچی آواز سے بولا۔ "یارو! یہ یبوست ختم کرو۔ جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے۔"

ہر طرف سے ہلکے ہلکے قہقہے پھوٹنے لگے، جسم لہکنے لگے، لب چھلکنے لگے، آنکھیں بولنے لگیں، دھواں دھواں محفل میں چکاچوند پیدا ہوگئی۔ سلیمان نے کھڑے ہوکر اونچی آواز سے نعرہ بلند کیا۔ "سپنس سپنس۔"

سب اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور راہداریوں سے گزرتے ہوئے دوسرے ہال میں پہنچ گئے۔ یہ ہال بھی خاصا وسیع تھا۔ مگر روشنی برائے نام تھی۔ ہال کے وسط میں خاصی بڑی میز تھی اس پر چاندی کا خوشنما شمع دان رکھا تھا۔ شمع دان میں شمع روشن تھی۔ ہال میں اس شمع کے سوا کوئی روشنی نہیں تھی۔

نشستوں کی ترتیب اس طرح تھی کہ میز کے دائیں طرف عورتیں اور بائیں طرف مردوں کے لیے صوفے رکھے تھے۔ ہال میں داخل ہو کر عورتیں اور مرد اپنی اپنی نشستوں پر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ہال کے دونوں بازوؤں میں روشنی اس قدر کم تھی کہ چہرے سایوں کی مانند دھندلے دھندلے نظر آتے تھے۔ سلیمان نے لالی کو بڑی میز کے پاس اونچی کرسی پر بٹھا دیا۔

ہال میں چھائے ہوئے گہرے سکوت اور دھیمی دھیمی روشنی نے ماحول پر اسرار بنا دیا تھا۔ لالی سخت پریشان ہوا۔ وہ گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر اخروٹ کی لکڑی کی تین منقش صندوقچیاں رکھی تھیں۔ بیچ کی صندوقچی ذرا بڑی اور اونچی تھی۔ ہر صندوقچی میں روپے کے برابر گول گول ٹوکن پڑے تھے۔ دائیں صندوقچی میں جو ٹوکن تھے، ان پر عورتوں کے نام اور بائیں صندوقچی کے ٹوکنوں پر مردوں کے نام جلی حروف میں لکھے تھے۔ دونوں صندوقچیوں میں سات سات ٹوکن تھے۔ البتہ درمیان کی صندوقچی میں دس ٹوکن تھے۔ ان پر ایک سے دس تک نمبر درج تھے۔ صندوقچیاں کوئی پون فٹ اونچی اور اسی قدر چوڑی تھیں۔ تینوں صندوقچیاں بند تھیں۔ مگر ہر ایک کے اوپر اتنا بڑا ڈھکنا تھا کہ صرف ایک ہاتھ آسانی سے اندر جا سکتا تھا۔ صندوقچیوں کی قطار کے پیچھے لکڑی کا مختصر ریک تھا۔ اس میں بارہ خانے تھے، چھ اوپر اور چھ نیچے۔ خانوں پر ایک سے دس تک نمبر درج تھے۔ اوپر نیچے دو خانے ایسے بھی تھے جن پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ سب خانے بالکل خالی تھے۔ ریک کے خانوں کا رخ لالی کی جانب تھا۔ پچھلا حصہ اس طرح بند تھا کہ خانے صرف سامنے بیٹھا ہوا امپائر دیکھ سکتا تھا۔

لالی نے قاعدے کے مطابق ہر صندوقچی کھولی، ٹوکن گنے، ان پر لکھے ہوئے نام اور نمبر پڑھے



اور جانچ پڑتال کے بعد سب ڈھکنے بند کردیئے۔ اس نے سامنے دیوار پر لگا ہوا کلاک دیکھا۔ گیارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا بار بار کلاک دیکھتا رہا۔ اور بھی بہت سی نگاہیں بے چینی سے کلاک کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

کلاک نے ٹن ٹن گیارہ بجائے۔ دلوں کی دھڑکنیں اچانک تیز ہوگئیں۔ ہال کے سکوت میں گہری سانسوں کی سرسراہٹیں ابھرنے لگیں۔ لالی کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے قرعہ اندازی کا آغاز کیا۔ کپکپاتے ہاتھ سے دائیں جانب کی صندوقچی کا بالائی ڈھکنا اٹھایا۔ اپنا دایاں ہاتھ اندر ڈال کے ایک ٹوکن نکالا۔ شمع کی روشنی میں اسے پڑھا۔ اس پر ماہ رخ کا نام درج تھا۔ لالی نے اونچی آواز سے پکارا۔ "ماہ رخ!" اس نے ٹوکن، ریک کے اوپر والے بے نمبر خانے میں رکھ دیا۔

ماہ رخ اپنی نشست سے اٹھی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لالی کے قریب آئی اور میز کے پاس عین اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ لالی نے درمیان کی صندوقچی کا ڈھکنا کھولا۔ ماہ رخ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالا۔ ٹوکن نکال کر لالی کو دیا۔ لالی نے اسے پڑھا۔ اس پر پانچ کا ہندسہ درج تھا۔ لالی نے ٹوکن ماہ رخ کو دکھایا اور اسے ریک کے نچلے بے نمبر خانے میں رکھ دیا۔ وہ اٹھا اور ماہ رخ کے ہم راہ ہال سے چلا گیا۔

دونوں سیڑھیاں طے کر کے بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ لالی آگے چل رہا تھا۔ ماہ رخ اس کے پیچھے تھی۔ دونوں بالکل خاموش تھے۔ لالی کمرہ نمبر ۵ پر پہنچا۔ کمرہ بند تھا۔ دروازے میں لگی ہوئی کنجی سے اس نے تالا کھولا اور پلٹ کر دیکھا۔ ماہ رخ اس کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ باریک کرتے کے پیچھے سے اس کا گورا گورا سینہ جھلک رہا تھا۔ لالی نے اپنے جسم میں ہلکی سی جھرجھری محسوس کی۔ اس نے دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کے کھڑا ہوگیا۔

ماہ رخ نے کمرے میں داخل ہوتے وقت لالی کی جانب دیکھا، مسکرائی اور آہستہ سے کہا۔ "شکریہ!" لالی نے دروازہ بند کیا۔ تالا لگایا اور کنجی ہاتھ میں لے کر ہال میں واپس آگیا۔ اپنی نشست پر بیٹھ کر اس نے کنجی ریک کے نمبر ۵ خانے میں رکھ دی۔ دائیں طرف رکھی ہوئی صندوقچی میں اس نے پھر ہاتھ ڈال کے ٹوکن نکالا۔ اس پر مہ جبیں کا نام درج تھا۔ لالی نے مہ جبیں کا نام پکارا۔ وہ میز کے نزدیک پہنچی۔ بیچ میں رکھی ہوئی صندوقچی کے کھلے ہوئے ڈھکنے کے اندر ہاتھ ڈالا۔ ٹوکن پر نمبر ۲ درج تھا۔ لالی نے نام اور نمبر کے ٹوکن ریک کے خانوں میں رکھے اور مہ جبیں کو کمرہ نمبر ۲ میں پہنچا کر تالا لگا دیا۔ واپسی پر اس نے کنجی، نمبر ۲ کے خانے میں رکھ دی۔ ماہ رخ کی طرح مہ

جبیں سے بھی لالی کی کوئی بات نہیں ہوئی۔

قرعہ اندازی میں نوشابہ کا نمبر ۱۰ نکلا۔ لالی اس کے ساتھ ہال سے نکلا۔ دونوں نے زینہ طے کیا اور بالائی منزل پر پہنچ کر غلام گردش میں چلے گئے۔ ایک محراب کے قریب نوشابہ نے رک کر لالی کو خبردار کیا۔ "سنو' کہیں خیر خواہی جتانے کے لیے ہمدانی کو یہ نہ بتا دینا کہ میں کس کمرے میں رہی اور نہ یہ بتانا کہ میرا کمرہ کسے الاٹ ہوا۔"

لالی کو اس کی یہ بدگمانی ناگوار گزری۔ "کیا سمرا صاحب سے بھی یہی بات کہی تھی؟"

"نہیں۔" نوشابہ نے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔ "تم سمرا صاحب نہیں ہو۔ وہ ذمے دار اور قابل اعتماد شخص ہیں۔ سیشن جج رہ چکے ہیں اور تم جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہو' عادی مجرم ہو۔"

لالی امپائری کی ترنگ میں تھا' وہسکی کے نشے نے بھی اثر دکھایا' بے رخی سے بولا۔ "جب یہ پتہ تھا' میں عادی مجرم ہوں تو....."

نوشابہ نے اس کی بات کاٹ کر ترشی سے کہا۔ "تمہارا اس طرح بات کرنے کا انداز مجھے بالکل پسند نہیں۔"

"بی بی جی! میں نے ہاتھ تو نہیں جوڑے تھے کہ مجھے امپائر بناؤ۔ میں تو خود اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔" لالی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

"یہ میرا نہیں ہمدانی اور سلیمان کا فیصلہ تھا۔"

"کھسم کا اتنا ہی ڈر تھا تو یہاں آئی کیوں؟" لالی اور زیادہ بے باک ہو گیا۔ "اس وقت تو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر خوب بن ٹھن کر چلی آئیں اور اب۔"

نوشابہ نے لالی کو پوری بات نہیں کہنے دی' تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

لالی اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ڈر گیا۔ اسے فوراً احساس ہوا کہ وہ ڈپٹی کمشنر کی بیوی ہے۔ نرم لہجے میں بولا۔ "میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں' ساب کو پتہ چل گیا تو کیا ہو گا؟ وہ سب ہی کچھ جانتے ہیں۔ سب کچھ ان کے سامنے ہی ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" نوشابہ کا لہجہ بھی نرم پڑ گیا۔ "مگر یہاں سے جانے کے بعد ہم ساری باتیں بھول جاتے ہیں۔ کبھی اس کے بارے میں بات نہیں کرتے۔"

دونوں کمرہ نمبر ۱۰ کے قریب کی محراب کے نیچے کھڑے تھے۔ محراب کے کونے میں سیاہ مجسمہ نصب تھا۔ مجسمے میں ایک صحت مند اور جوان عورت کو ایک مرد کی آغوش میں دکھایا گیا تھا۔ عورت مرد کا سہارا لیے لیٹی تھی۔ مرد کی گردن جھکی ہوئی تھی وہ عورت کی جانب دیکھ رہا تھا۔



عورت کی نظریں بھی اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے اور دونوں بالکل برہنہ تھے۔ لالی نے مجسمے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ سب چکر کیا ہے؟"

"کوئی چکر وکر نہیں۔" نوشابہ نے رسان سے کہا۔ "دیکھو نا' یہ کتنا اجاڑ علاقہ ہے۔ ایک زمانے میں تو سرکاری افسر اسے کالا پانی کہتے تھے۔ اب تو ویسے حالات نہیں رہے۔ پھر بھی کوئی سوشل لائف نہیں۔ ویرانے میں الگ تھلگ پڑے ہیں۔ تمہیں کیا پتہ' یہاں دل کتنا گھبراتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرائی۔ "مہینے میں ایک رات سب کچھ بھول بھال کر ذرا دل بہلا لیتے ہیں۔"

لالی بھی مسکرانے لگا۔ "دل بہلانے کی ترکیب بہت چنگی نکالی ہے۔"

"یہاں کوئی مرد کسی کا شوہر اور کوئی عورت کسی کی بیوی نہیں ہوتی' صرف رات بھر کے لیے۔" نوشابہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "جب ایک سا کھانا کھاتے کھاتے اور ایک سا لباس پہنتے پہنتے طبیعت اکتا سکتی ہے تو ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت کے ساتھ رہتے رہتے بھی طبیعت اکتا سکتی ہے۔" وہ کچھ ٹھہری۔ "چھپ کر گناہ کرنے سے کیا یہ اچھا نہیں کہ گناہ' زندگی کی ایک ضرورت سمجھ کر کیا جائے۔ اس میں کتنا رومانس ہے' کتنا مزا ہے۔"

"وہ تو جی ضرور ہے۔ مجھے بھی بہت مزا آ رہا ہے۔" لالی چند لمحے خاموش رہا۔ "پر ساب یہ بات کیسے برداشت کر لیتے ہیں؟ بعد میں جھگڑا ٹنٹا نہیں ہوتا؟"

"نہیں' بالکل نہیں۔" نوشابہ نے بے نیازی سے کہا۔ "تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔ ہر ایسی رات کے بعد ہمارے درمیان محبت کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتی ہے۔ سچ کہتی ہوں' میرا تجربہ یہی ہے۔ کلب کی دوسری ممبر عورتوں کا بھی یہی خیال ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو یہاں آتی کیوں؟ تم نے دیکھا نہیں' خوشی سے کیسی چہک رہی ہیں؟"

"کچھ سمجھ نہیں آتی جی۔" لالی نے رسان سے کہا۔ "دیر ہو رہی ہے۔ چلو' میں تمہیں کمرے تک پہنچا دوں۔" وہ آگے بڑھا۔ کمرے کا تالا کھولا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ نوشابہ کمرے میں داخل ہونے لگی تو لالی بولا۔ "اطمینان رکھو۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ اور ساب کو تو پوچھنے پر بھی ایک لفظ نہیں بتاؤں گا۔ بلکہ کسی کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔" لالی نے لگن اور جذبے سے اسے یقین دلایا۔ "مرد آدمی ہوں۔ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جو کہوں گا پورا کروں گا۔"

نوشابہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی اور آہستہ سے بولی۔ "شکریہ۔"

لالی نے دروازہ بند کیا، تالا لگایا اور کنجی ہاتھ میں دبا کر تیز تیز قدموں سے واپس ہوا۔ ہال میں پہنچا تو وہ گھبرایا ہوا تھا۔ سب اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ لالی اپنی کرسی پر بیٹھا، چند لمحے خاموش رہا پھر کسی طرف دیکھے بغیر اس نے صفائی پیش کرنے کے انداز میں اونچی آواز سے کہا۔

"معاف کرنا جی! تالے میں کچھ گڑبڑ تھی، اسے کھولنے میں دیر ہوگئی۔"

اندھیرے میں مہر سلیمان کی آواز ابھری۔ "کوئی بات نہیں، آپ امپائر ہیں جی! آپ کو کوئی معذرت شازرت کرنے کی ضرورت نہیں۔"

لالی چپ چاپ صندوقچیوں سے عورتوں کے نام اور نمبر نکالنے لگا۔ راحیلہ کا نمبر آٹھ، فاخرہ کا ۶، امینہ کا ۲ اور سائرہ کا ۴ نکلا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ باری باری بالائی منزل پر گیا۔ دروازہ کھولا ہر ایک کو تالا لگا کر کمرے میں بند کیا اور واپس آکر ہر کمرے کی کنجی اسی نمبر کے خانے میں رکھتا گیا۔ راستے میں کسی سے اس کی بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ چپ چاپ جاتا اور خاموشی سے لوٹ آتا۔ البتہ امینہ کے ہم راہ جاتے ہوئے کئی بار اس پر وارفتگی طاری ہوئی۔ وہ نہایت ہیجان انگیز خوشبو لگائے ہوئے تھی۔ آنکھوں سے شراب کا نشہ جھلک رہا تھا۔ بدن کا ایک ایک عضو بولتا تھا، چھلکتا تھا۔ وہ تند و تیز شراب سے بھرا ہوا ایسا پیالہ تھی جس میں طوفان اٹھتے تھے۔

لالی، غلام گردش میں کچھ دور تک امینہ کے آگے آگے چلتا رہا پھر خود بخود اس کے قدم ست پڑ گئے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ چلتے چلتے امینہ ایک بار لڑکھڑائی۔ اس کی ساڑی کا آنچل ڈھلک کر نیچے گر گیا۔ دور تک نشیب میں کھلی ہوئی برہنہ پیٹھ لالی کے سامنے آگئی۔ لالی تڑپ اٹھا۔ اس نے جھٹ امینہ کا نرم بازو تھام لیا اور اس وارفتگی سے تھاما گویا اب چھوڑے گا نہیں۔ امینہ نے ٹھہر کر اپنا آنچل درست کیا۔ مدھ ماتی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ مسکرائی اور اپنا بازو چھڑانے کے لیے آہستہ سے کسمسائی۔

لالی نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہسکی کا نشہ اچانک تیز ہوگیا۔ اس کے قدم بہکنے لگے۔

لالی نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ امینہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے نہ لالی سے کوئی بات کی، نہ اس کا شکریہ ادا کیا۔ صرف خمار آلود نظروں سے لالی کو دیکھا، مسکرائی اور کمرے میں چلی گئی۔ لالی نے گہری سانس بھری، دروازہ بند کیا، تالا لگایا اور پیتل کی تختی پر لکھا ہوا نمبر ذرا دیر تک ٹکٹکی باندھے تکتا رہا۔

کمرے کا نمبر ۲ تھا۔ اس کے بند دروازے کے پیچھے ایک دہکتا ہوا شعلہ فروزاں تھا جس سے لالی نے



اپنی انگلیاں جھلسا چکا تھا۔ امینہ کو کمرے میں مقفل کر کے لالی لوٹا تو اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

☆

قرعہ اندازی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ لالی نے تین خالی کمروں کے ٹوکن بے نمبر خانے میں رکھ دیے۔ ان پر نمبر ۱، نمبر ۳ اور نمبر ۹ درج تھے۔ نمبروں کے باقی سات ٹوکن اس نے پھر درمیانی صندوقچی میں ڈال دیے۔ اب ہال کا وہ حصہ بالکل خالی تھا جس میں خواتین کی نشستیں تھیں۔ ہال کے دوسرے حصے میں بھی خاموشی تھی، صرف گہری گہری سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس حصے میں مردوں کی نشستیں تھیں۔ ان کی بے قراری سوا نیزے پر تھی۔ وہ بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ کھنکار کھنکار کر گلے صاف کر رہے تھے۔ مگر کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ لالی نے نظریں اٹھا کر کلاک دیکھا۔ ساڑھے گیارہ بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔ بارہ بجے تک قرعہ اندازی ختم ہو جانا چاہئے تھی۔ اس کے پاس نصف گھنٹہ تھا۔ اتنے وقت میں پروگرام کے مطابق قرعہ اندازی اطمینان سے بھگتائی جا سکتی تھی۔

لالی خاموش بیٹھا مردوں کی بے چینی اور ذہنی کشمکش سے لطف اٹھاتا رہا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان کی بے قراری کا علاج صرف اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایسی لذت تھی جو اس سے پہلے کبھی اس نے محسوس نہیں کی تھی۔

ہال میں صرف ایک شمع روشن تھی۔ اس کی ہلکی ہلکی کافوری روشنی میں سات مرد گم صم بیٹھے تھے۔ ان میں بڑے سرکاری افسر بھی تھے، جو پورے ضلعے کے سیاہ سفید کے مالک تھے۔ ان کے سامنے بڑے بڑوں کے سر جھک جاتے تھے۔ مگر اس وقت وہ لالی کی نگاہ کرم کے منتظر تھے۔ لالی جیل سے بھاگا ہوا قیدی تھا، یہ بات ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو معلوم تھی اور ایس پی بھی جانتا تھا۔ مگر دونوں اس وقت جیل کی کوٹھریوں کے بجائے پلے ژرہاؤس کے بند کمروں کے بارے میں سوچ رہے تھے اور یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ ان کی قسمت کی لاٹری میں کیا نکلتا ہے۔

آخر لالی نے بائیں ہاتھ کی صندوقچی کا ڈھکنا کھولا اور مقررہ قاعدے کے مطابق اپنا بایاں ہاتھ اندر ڈال کر ایک ٹوکن نکالا۔ اسے پڑھا۔ ٹوکن پر چوہدری نواز بھنڈر کا نام درج تھا۔ لالی نے اونچی آواز سے نام پکارا۔

نواز اندھیرے سے نکلا اور لالی کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ لالی نے درمیانی صندوقچی کا ڈھکنا کھولا۔ مردوں کے لیے جو قاعدہ وضع کیا گیا تھا، اس کے مطابق اس دفعہ لالی نے ہاتھ اندر ڈال کر ٹوکن نکالا اور ہاتھ کی آڑ میں اس طرح پڑھا کہ میز کے سامنے کھڑا ہوا شخص اسے نہ دیکھ سکے۔

ٹوکن پر نمبر۷ لکھا تھا۔ لالی نے چوہدری نواز بھنڈر کو ٹوکن کا نمبر دکھایا، نمبر۷ کے خانے سے کنجی اٹھائی اور اسے دے دی۔ کنجی لیتے ہوئے نواز کے ہاتھ میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ لالی نے ٹوکن اسی نمبر کے خانے میں رکھ دیا اور نام کا ٹوکن بے نمبر خانے میں ڈال دیا۔ نواز کنجی لے کر ہال سے چلا گیا۔

لالی نے ایک بار پھر کلاک دیکھا۔ میز پر رکھی ہوئی چاندی کی طشتری سے سگریٹ اٹھا کر سلگائی اور آہستہ آہستہ کش لینے لگا۔ ہال میں سگریٹ پینے کی صرف اسی کو اجازت تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ پر اب چھ مرد بیٹھے تھے۔ وہ نہ بول رہے تھے نہ ہنس رہے تھے۔ لالی بھی خاموش تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ نواز بھنڈر اوپر پہنچ کر اس کی دی ہوئی کنجی سے کمرہ نمبر۷ کھولے اور اندر جا کر دروازہ بند کر لے۔ اس کے لیے تین منٹ مقرر تھے۔

تین منٹ بعد لالی نے دوسرا ٹوکن نکالا اور ڈاکٹر بٹ کو بلایا۔ بٹ آ گیا۔ لالی نے درمیانی صندوقچی سے ٹوکن نکالا اور ڈاکٹر بٹ سے چھپا کر پڑھا۔ اس پر نمبر۵ لکھا تھا۔ لیکن یہ اس کی بیوی ماہ رخ کے کمرے کا نمبر تھا۔ قاعدے کی رو سے یہ کمرہ اسے الاٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ لالی نے ٹوکن پلٹ کر میز پر رکھ دیا۔ ٹوکن کا دوسرا رخ بالکل سادہ تھا۔ لالی نے ڈاکٹر بٹ کی جانب دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میز پر رکھا ہوا ٹوکن کس عورت کے کمرے کا ہے۔ لالی نے پھر درمیانی صندوقچی میں ہاتھ ڈال کر ٹوکن نکالا۔ اس پر نمبر۴ لکھا تھا۔ یہ مرزا ابوالحسن کی بیوی سائرہ کے کمرے کا نمبر تھا۔ لالی نے ٹوکن ڈاکٹر بٹ کو دکھایا اور ریک کے خانے سے کمرہ نمبر۴ کی کنجی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ بٹ اپنی منزل کی جانب چلا گیا۔ لالی نے الٹا رکھا ہوا ٹوکن اٹھا کر پھر درمیانی صندوقچی میں ڈال دیا۔ دوسرے دونوں ٹوکن بھی نام اور نمبر کے خانوں میں رکھ دیے۔
لالی خوش تھا کہ ابھی تک کمرہ نمبر۲ کا ٹوکن نہیں نکلا۔ یہ امینہ کا نمبر تھا۔

ٹھیک تین منٹ بعد سلیمان آیا۔ ٹوکن نمبر۲ اس کے نام بھی نہیں نکلا۔ اس کے لیے نمبر۶ نکلا۔ یہ نواز بھنڈر کی بیوی فاخرہ کا نمبر تھا۔ سلیمان گیا تو ہمدانی آیا۔ اس کے آتے ہی لالی کے ذہن میں ٹوکن نمبر۲ سوالیہ نشان بن کر گردش کرنے لگا۔ لالی نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ڈپٹی کمشنر ہمدانی اس کے روبرو سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹ خشک تھے۔ چہرے کی رنگت اڑی اڑی تھی۔ آنکھوں سے بے قراری جھلک رہی تھی۔ لالی ٹھاٹ سے کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ ڈپٹی کمشنر اس کے سامنے اسی طرح کھڑا تھا جیسے عدالت میں ملزم گردن نیچی کیے بے قراری سے اپنے مقدمے کا فیصلہ سننے کے لیے کھڑا ہو۔ لالی کو معلوم تھا کہ ڈپٹی کمشنر کس کمرے کے الاٹمنٹ



کے لیے بے قرار ہے اور کس نمبر کا ٹوکن چاہتا ہے۔ وہ ٹوکن ابھی تک صندوقچی میں موجود بھی تھا۔

لالی نے درمیانی صندوقچی میں ہاتھ ڈالا۔ اس دفعہ اس کا دل بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ٹوکن نکال کے پڑھا۔ اس کی نظریں دھندلا گئیں۔ قسمت نے ڈپٹی کمشنر کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ ٹوکن نمبر۸ تھا۔ یہ امینہ کا نہیں، راحیلہ کا نمبر تھا۔ راحیلہ کے چہرے پر نرمی سے زیادہ سرخی تھی، اس کی آواز بھاری تھی اور اپنی بھاری بھرکم آواز کے باعث وہ گونگوں کی طرح خاموش رہتی تھی۔ مردوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے سگریٹ کا دھواں اڑاتی تھی۔ اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں لالی کو دھیور، یاد آتا تھا۔ دھیور جو میاں حیات محمد وٹو کے بنگلے کا تنومند خواجہ سرا تھا اور اس کی زبان کٹی ہوئی تھی۔

لالی کو ایسا محسوس ہوا کہ میز کے سامنے ڈپٹی کمشنر ہمدانی نہیں، صرف ہمدانی کھڑا ہے اور اندھیرا بہت گہرا ہے۔ وہ لمحہ بھر تک ٹوکن تکتا رہا اور سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ آخر اس نے ٹوکن پلٹ کے رکھ دیا۔ اس نے صندوقچی سے نیا ٹوکن نکالا، مگر ہمدانی کی قسمت ہی کھوٹی تھی۔ یہ بھی کمرہ نمبر۲ کا نہیں، نمبر۱۰ کا ٹوکن تھا۔ اس میں امینہ نہیں، نوشابہ تھی۔ لالی الجھن میں پڑ گیا۔ یہ ٹوکن وہ پلٹ کر نہیں رکھ سکتا تھا، نہ قاعدے کی رو سے اس کمرے کی کنجی ہمدانی کو دے سکتا تھا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا، فوراً کرنا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ پر تین مرد اندھیرے میں بیٹھے تھے۔ ان کی نظریں لالی کی جانب اٹھی تھیں۔ ان میں مرزا بھی تھا۔ وہ پولیس والا تھا۔ اس کی نگاہیں سب سے زیادہ تیز تھیں۔ لالی کے جرائم پیشہ ذہن نے اس مرحلے پر کام دکھایا۔ اس نے ٹوکن ہمدانی کے سامنے کیا اور کنجی خانے سے نکالنے کے لیے اتنا جھکا کہ اس کا چہرہ اندھیرے میں آ گیا۔ اس نے کنجی خانے سے ٹکرا کر ہولے سے آہٹ پیدا کی اور ساتھ ہی سرگوشی کی۔ "کمرہ نمبر۲۔" اس نے نمبر۲ کی کنجی نکال کے ہمدانی کے حوالے کر دی۔ کنجی لیتے ہوئے ہمدانی کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ اسے مسکراتا دیکھ کے لالی بھی خوش ہوا۔ ہمدانی کی دلی مراد بر آئی۔ وہ کمرہ نمبر۲ کی جانب روانہ ہو گیا۔

اب لالی ایک نئی الجھن میں پڑ گیا۔ کمرہ نمبر۲ کی کنجی ہمدانی کے پاس تھی اور اس نمبر کا ٹوکن صندوقچی میں تھا۔ طرفہ تماشا یہ کہ دو ٹوکن صندوقچی میں تھے اور دو باہر۔ مگر امیدوار صرف تین رہ گئے تھے۔ لالی چند لمحے خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس نے کمرہ نمبر۱۰ کا ٹوکن اسی نمبر کے خانے میں رکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مگر ٹوکن رکھا نہیں انگلیوں کے درمیان دبا لیا۔ اس نے میز پر الٹا رکھا

ہوا کمرہ نمبر ۸ کا ٹوکن نہایت صفائی سے اسی ہاتھ سے اٹھایا اور دونوں ٹوکن درمیانی صندوقچی میں ڈال دیے۔ ہمدانی کے بعد ایس پی مرزا کی باری آئی۔ ایس پی میز کے قریب آکر کھڑا ہوا تو لالی' امپائر سردار نور محمد خاں بزدار سے ایک دم مفرور قیدی بن گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایس پی کی جانب دیکھا۔ ایس پی اسے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سختی تھی۔ لالی اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ اس نے گردن جھکا کر صندوقچی میں ہاتھ ڈالا۔ ساتھ ہی اسے یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ ٹوکن نمبر ۲ نہ نکل آئے۔

اس نے ٹوکن نکالا اور فوراً یہ سوچ کر زیادہ احتیاط سے پڑھا کہ اگر نمبر ۲ ہوا تو اسے پلٹ کر میز پر رکھ دے گا۔ مگر اسے خدشہ تھا کہ بار بار ٹوکن پلٹنے سے ایس پی کو شبہ بھی ہو سکتا ہے۔ لالی نے دھڑکتے دل سے دیکھا۔ ٹوکن نمبر ۲ نہیں' نمبر ۸ تھا۔ ایس پی خاموش کھڑا تھا اور مسلسل لالی کو گھور رہا تھا۔ لالی نے اسے ٹوکن کا نمبر دکھایا اور کمرہ نمبر ۸ کی کنجی اس کے سپرد کر دی۔ ایس پی کنجی لے کر ہال سے جانے لگا۔ لالی کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا۔ کرخت چہرے والے ایس پی کے حصے میں کمرہ نمبر ۸ آیا تھا۔ اس میں مہر سلیمان کی بیوی راحیلہ تھی۔

اب مسعود آیا۔ اس کے نام کمرہ نمبر ۲ کے بجائے نمبر ۵ آیا۔ لالی ایک بار پھر ٹوکن پلٹنے اور دوبارہ قرعہ اندازی کرنے کے جھنجھٹ سے بچ گیا۔ سب سے آخر میں شیخ عبدالحمید مگوں آیا۔ وہ لالی کے لیے خاصا ٹیڑھا مسئلہ بن گیا۔ پیچیدگی یہ پیدا ہوئی کہ امیدوار ایک تھا اور صندوقچی میں ایک کے بجائے ٹوکن دو تھے' نمبر ۲ اور نمبر ۱۰۔ اگر نمبر ۱۰ نکل آتا تو کوئی گڑبڑ پیدا نہ ہوتی۔ وہ کمرہ نمبر ۱۰ کی کنجی اسے دے دیتا۔ لیکن ٹوکن نمبر ۲ نکلتا تو وہ اسے الٹا رکھ کر دوبارہ قرعہ اندازی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ نہ ہی وہ ٹوکن نمبر ۲ کی کنجی دے سکتا تھا۔ اس کے پاس تھی ہی نہیں۔ لالی نے جھٹ پینترا بدلا' مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔

”اب لاٹری شاٹری کیا نکالنی ہے جی! اپنے پاس صرف ایک چابی ہے اور اسی کا ٹوکن ڈبے میں پڑا ہے۔“

وہ کنجی خانے سے نکالنے کے لیے جھکا۔ حمید مگوں نے کچھ کہنا چاہا مگر لالی نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ کنجی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لو جی' یہ رہی نمبر ۱۰ کی چابی۔ جا کر تالا کھولو اور دیکھو تمہارے نصیب میں کون سی لگائی آئی ہے۔“ وہ ذرا کھل کر مسکرایا۔ ”پر اس کمرے کے تالے میں ذرا گڑبڑ ہے۔ ہوشیاری سے کھولنا' بہت دیر میں کھلتا ہے۔ یاد ہے نا' میں اوپر سے دیر میں لوٹا تھا۔ وہ اسی کمرے کے تالے کا چکر تھا۔“



حمید مگوں نے کنجی ہاتھ میں نہیں لی۔ ”ایسی بات ہے جی تو یہ چابی اپنے ہی پاس رہنے دو۔ میرے ساتھ اوپر چل کر تالا کھول دو۔ مہربانی ہوگی۔ میں کہاں تالے کے ساتھ مغز ماری کروں گا۔“

کلاک نے ٹن ٹن بارہ بجائے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ قرعہ اندازی کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ لالی نے حمید مگوں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا' چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ وہ حمید کے ساتھ ہال سے نکلا۔ دونوں زینے طے کر کے اوپر پہنچ گئے۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد شیخ حمید مگوں ٹھہر کر آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ لالی نے ہنس کر کہا۔ ”سیٹھ حمید! تسیں تو ہانپنے بھی لگے۔ نمبر ۱۰ تو ابھی دور ہے۔“ لالی نے کمرہ نمبر ۱۰ کی جانب دیکھا' وہ طویل غلام گردش کے دوسرے سرے پر تھا۔

”میں ادھر کے ۸ چکر لگا چکا ہوں۔ یہ نواں ہے۔“

حمید نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”میں ذرا دیر میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ لالی کی جانب ذرا سا جھکا' آہستہ سے پوچھا۔ ”دس نمبر میں کون ہے جی؟“

”میں تو جی اتنا جانتا ہوں' اس میں تمہاری گھر والی نہیں ہے۔“

”اتنا تو میں نوں بھی پتہ ہے۔“

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ حمید بھی خاموش رہا۔ دونوں غلام گردش میں چلنے لگے۔ لالی نے چلتے چلتے کمرہ نمبر ۲ کو دیکھا۔ اس میں امینہ تھی جس کا انگ انگ چمکتا تھا۔ مدھ ماتی آنکھیں شب خون مارتی تھیں۔ پیٹ ناف سے نیچے تک کھلا تھا' پیٹھ نشیب میں دور تک برہنہ تھی۔ امینہ اب ہمدانی کے پہلو میں تھی۔ اس کا شوہر محکمہ آبادکاری کا بڑا افسر تھا اور مالتھزم کے نظریے کی بنیاد پر آبادی کم کرنے کا فلسفہ بگھارتا تھا۔ وہ اس وقت کمرہ نمبر ۵ میں ڈاکٹر بٹ کی بیوی ماہ رخ کے ساتھ تھا۔ لالی نے گہری سانس بھری اور آگے بڑھتا گیا۔ حمید مگوں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ توند سے پھسلتی ہوئی پتلون بار بار درست کر رہا تھا۔

لالی جس کمرے کے سامنے سے گزرتا' اس کے متعلق سوچتا کہ بند دروازے کے پیچھے کون کس کے ساتھ ہے۔ حمید نے چلتے چلتے ایک بار پھر سرگوشی کی۔

”یار! بتاؤ تو سہی' آج اپنے حصے میں کون آئی ہے؟“

لالی نے اس کی بات نظرانداز کر کے دریافت کیا۔ ”سیٹھ حمید! تم بشیرے کو جانتے ہو؟“

”جانتا تو ہوں۔“ حمید نے مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”پر یہ نہیں جانتا کہ وہ دھندا کیا کرتا ہے؟“

"میں جانتا ہوں۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "وہ ڈرائیوروں کے ساتھ گھر سے بھاگنے والی لڑکیاں برآمد کرنے کا دھندا کرتا ہے۔"

سیٹھ حمید مگوں اس کی بات سن کر بہت سٹ پٹایا۔ "کیا بشیرے نے تم کو یہ بات بھی بتائی تھی؟" اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "لگتا ہے، تم بھی پولیس میں رہ چکے ہو۔" اس نے کچھ رک کے کہا۔ "چلو، یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔" اس نے کوٹ کی جیب سے نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ نکالا اور اسے کھولتے ہوئے آنکھ ماری۔ "کچھ رشوت وشوت لے لو۔ یہ بتادو کہ کمرے میں کون ہے؟"

"ایس ویں گلاں نہ کرو۔ سیٹھ! جو بھی ہوگی، تمہارے جوڑ کی ہوگی۔"

مگر حمید باز نہ آیا، جلدی سے بولا۔ "بات یہ ہے جی۔ آج کی سسپنس نائٹ کے لیے میں بہت شاندار تحفہ لایا ہوں۔ ہوا یوں کہ سویرے ہی سویرے اپنے شاہ جی آگئے۔ بہت وڈے بزرگ ہیں۔ کیا بتاؤں، کیا تاثیر ہے ان کی زبان میں۔ ستے کا بھاؤ جب بھی بتایا، ٹھیک ہی نکلا۔ آئے تو دیر تک میرا متھا تکتے رہے۔ کہنے لگے، حمیدے! اج تین نوں کوئی بہت شاندار چیز ملنے والی ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اب میں یہی خوش خبری تم سے سننا چاہتا ہوں۔" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے چلتا رہا۔ حمید مگوں کو قرار نہ آیا۔

"اتنا تو بتادو راحیلہ پھائیلہ تو نہیں ہے؟"

"پتہ نہیں، وہ بھی ہو سکتی ہے۔" لالی نے اس دفعہ بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ نمبر ۱۰ میں نوشابہ ہے۔ دل کش و دل آرا نوشابہ، جس کی جوانی کافوری شمع کے مانند دھیرے دھیرے پگھل رہی تھی۔ لالی نے نظریں موڑ کر حمید مگوں کو دیکھا۔ اس کا جسم خاصا بے ڈول تھا۔ ناک نقشہ بھی موٹا موٹا تھا۔ سر پر بال کم تھے۔ اندر سے جلد صاف نظر آتی تھی۔ لالی کو نوشابہ پر بڑا ترس آیا۔ وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا اور خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔

آخر کمرہ نمبر ۱۰ آگیا۔ لالی نے کہا۔ "لوجی! تمہارا کمرہ آگیا۔" یہ کہتے ہوئے لالی کمرے کی جانب مڑا۔ لیکن حمید مگوں اس کے ساتھ نہیں بڑھا۔ وہ دروازے کے سامنے رکھے ہوئے نرم نرم صوفے پر بیٹھ گیا۔ لالی نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ حمید نے اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا۔ لالی اس کے پاس چلا گیا۔ حمید نے کوٹ کی جیب سے چھوٹا سا خوش نما کنٹر نکالا، اس کا ڈھکنا کھولا، مسکرایا۔ آنکھ مار کے رنڈی بازوں کی طرح بولا۔ "ذرا گرم ہو جاؤں جی۔ تم دروازہ کھول کر دیکھو اندر کون ہے۔" اس نے کنٹر منہ سے لگایا اور چند گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر کنٹر لالی کی طرف بڑھا دیا۔



"بزدار صاحب! تھوڑی سی تم بھی لگالو۔ بہت سپیشل چیز ہے۔"

لالی نے انکار نہیں کیا۔ کنٹر اس کے ہاتھ سے لیا اور غٹاغٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ بہت تیز شراب تھی۔ منہ کانوں تک جھن جھنا اٹھا۔ حلق جلنے لگا۔ لالی نے کنٹر شیخ حمید کو واپس کیا اور آگے بڑھ کے کمرے کے بند دروازے پر پہنچا۔ تالے میں کنجی ڈالی اور چند لمحے تک خواہ مخواہ اسے ادھر ادھر گھماتا رہا۔ آخر اس نے تالا کھول دیا۔ مڑ کر حمید کو دیکھا۔ حمید کھلا ہوا کنٹر ہاتھ میں دبائے اپنی گول گول آنکھوں سے لالی کو تک رہا تھا۔ لالی کو وہ بالکل الو کا پٹھا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔ شیخ حمید مگوں نے بیل کی طرح گردن ہلا کر انتظار کرنے کی ہامی بھرلی۔

☆

لالی نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا، اندر گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ آگے ایک اور پردہ پڑا تھا۔ لالی نے پردہ سرکا کے اندر جھانکا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں پیڈسٹل لیمپ روشن تھا۔ اس کے سرپوش سے گہری سرخ سرخ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ دروازوں کے پردے بھی سرخ تھے۔ فرش کا قالین بھی سرخ تھا۔ کمرے کی ہر چیز سرخ تھی یا لیمپ کی روشنی میں سرخ نظر آرہی تھی۔ وسط میں جدید طرز کی نہایت نفیس مسہری تھی۔ جھلکتے ہوئے اجلے اجلے بستر پر گلاب کے سرخ سرخ پھول بکھرے تھے۔ مسہری کے سرہانے موتیے اور چنبیلی کے ہار جھول رہے تھے۔ کمرے میں ہر طرف بھینی بھینی خوشبو پھیلی تھی۔

لالی پردہ ہٹا کر کمرے کے اندر پہنچ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے حجلۂ عروسی میں آگیا ہو۔ مگر حجلۂ عروسی سے دلہن غائب تھی۔ وہ ہکا بکا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شیخ حمید مگوں کی "اسپیشل" آہستہ آہستہ رنگ دکھا رہی تھی۔ لالی کی نظروں میں سہانے خوابوں کے دھندلکے منڈلانے لگے۔

چند لمحوں بعد بغلی دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ نوشابہ دروازے سے مسکراتی ہوئی نکلی۔ اس کے گلے میں تازہ پھولوں کا گجرا تھا۔ ہاتھ میں بھی گجرا لٹک رہا تھا۔ اس کا تاب ناک گلابی چہرہ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ابھی ابھی میک اپ کیا ہے۔ آنکھوں میں گہرا کاجل، ہونٹوں پر سرخی، پشت پر مہکتا جوڑا، جوڑے میں موتیے کی کلیوں کا ہار گندھا ہوا اور پیشانی پر قمقمے کے مانند بڑی سی جگمگاتی بندیا۔

وہ جنوبی ہند کے قدیم مندروں میں رقص کرنے والی دیوداسیوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھی۔ سینے پر کلابتو کے جھلملاتے دائرے بناتی مختصر چولی تھی۔ ناف سے نیچے بندھی ہوئی زربفت کی گہری نارنجی ساڑھی۔ ساڑھی کا ایک پلو لانگ لگا کر پیچھے اڑس لیا گیا تھا۔ دوسرا پلو پنکھے کی طرح آگے

جھول رہا تھا۔ اس لباس میں اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے اوپر تک کھلی ہوئی تھیں۔ چولی کے سوا اوپر کا دھڑ بالکل برہنہ تھا۔ دونوں ہاتھ بھی برہنہ تھے۔ ان پر صرف پھولوں کے بازو بند تھے۔ کانوں میں چمپا کے اجلے اجلے پھول تھے۔ نوشابہ کی یہ سج دھج دیکھ کر لالی کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہوگئی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سانس تیز ہوگئی۔

لالی کو دیکھتے ہی نوشابہ کے ہونٹوں پر بکھری ہوئی مسکراہٹ بجھ گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم؟ تم یہاں کیسے آگئے؟"

لالی مسکرانے لگا۔ "بس آگیا جی۔"

وہ غصے سے تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "کیا مطلب؟"

لالی مسکراتا رہا۔ "مطلب یہ کہ جی' یہ کمرہ مجھے الاٹ ہوگیا ہے۔"

"ہش؟" وہ جھنجلا کر بولی۔ "تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟"

"اس میں دماغ خراب ہونے کی کون سی بات ہے۔" اس نے نوشابہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈھٹائی سے کہا۔ "یہ امپائر کا فیصلہ ہے اور اتنا تو تسیں جانتی ہی ہو کہ امپائر کے فیصلے کو کوئی چیلنج نہیں کرسکتا۔"

"بکواس بند کرو اور فوراً کمرے سے نکل جاؤ۔"

لالی ڈھیٹ بنا کھڑا رہا۔ وہ چند لمحوں تک اسے گھورتی رہی پھر اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تم چاہتے کیا ہو۔"

"چاہنا واہنا کیا ہے جی؟" لالی بچوں کی طرح مچل گیا۔ "یہ کمرہ مجھے کیوں الاٹ نہیں ہوسکتا؟" اس نے مسکرا کر نوشابہ کو چھیڑنے کے لیے جھوٹ بولا۔ "اپنی بھی گھر والی ہے' تین بچے ہیں۔ میرا مطلب ہے...."

وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "میں تمہارا مطلب خوب سمجھتی ہوں۔" اس نے سیدھی سیدھی دھمکی دی۔ "جیل جانا چاہتے ہو؟"

لالی مرعوب نہیں ہوا' اڑیل ٹٹو کی طرح اڑا رہا۔ "جیل تو جانا ہی ہے' پہلے بھی تین بار جاچکا ہوں۔ چوتھی بار تم بھجوا دو۔ چلو' اس دفعہ تمہارے نام پر جیل کاٹ لوں گا۔"

نوشابہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی' پھر اس نے ذرا نرم لہجے میں لالی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھو' ضد مت کرو۔ اس کھیل میں تم شریک نہیں ہوسکتے۔ اس کا ایک مقررہ قاعدہ اور مقررہ قانون ہے۔"



لالی نے جل کر طنز کیا۔ "قاعدہ تو میں نے پوری طرح دیکھ لیا۔ رہ گیا کنون تو ساتھ والے کمروں میں کنون کے رکھوالے خود کنون کی ایسی تیسی کر رہے ہیں۔ آج اتفاق سے وہ نہیں ہیں جو کبھی انصاف کی ترازو میں کنون تولا کرتے تھے۔ اندھیرے ہال میں بیٹھ کر کنون کی ایسی تیسی کرنے والوں کے لیے لاٹری نکالتے تھے۔ غلط کہہ رہا ہوں؟"

نوشابہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا' دھیرے دھیرے مسہری کے قریب گئی اور سرہانے کی طرف پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا اور گردن کو ذرا سا خم دے کر بولی۔ "میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تمہیں یہاں آنے کی جرات کیسے ہوئی؟ تم... تم۔" اس نے غصے سے دانت پیسے' آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

لالی اس کا غصہ نظرانداز کرکے بولا۔ "میں اتنا بدصورت تو نہیں ہوں۔ یہاں مجھ سے بھی زیادہ بدصورت بندے موجود ہیں۔ ایک تو باہر ہی بیٹھا ہے۔"

"یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں۔ میں سب کو جانتی ہوں۔ انھیں منتخب کرنے والوں میں کلب کی دوسری ممبر عورتوں کے ساتھ میں بھی شریک تھی۔" اس کے لہجے میں ٹھہراؤ آگیا۔ "اگر سارے مرد اور ساری عورتیں خوبصورت ہی ہوتیں تو پھر قرعہ اندازی کیوں ہوتی؟ اس کھیل میں کوئی رومانس نہ ہوتا۔ کوئی بے قراری' کوئی سسپنس نہ ہوتا۔ مگر تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتے۔"

"سمجھنا چاہتا بھی نہیں۔"

نوشابہ نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ "تم جاؤ گے نہیں یہاں سے؟"

شیخ حمید ملکوں کی شراب دو آتشہ کا تند و تیز نشہ کام کرتا رہا۔ لالی اور بے باک ہوگیا۔ "ارادہ تو نہیں ہے۔ یہ لال لال روشنی' یہ مہکتے پھول' یہ بھینی بھینی خوشبو اور تم۔ تمہاری تو بات ہی کیا ہے۔ ایسے لشکارے مارتی الیلی کہاں نظر آتی ہے؟" اس کی آنکھیں اس طرح جھلملانے لگیں جیسے شیشہ ٹوٹ کر بکھر جائے۔ "یہاں آکر بھی کوئی واپس جاسکتا ہے۔" اس نے ہاتھ میں دبی ہوئی کنجی دکھاتے ہوئے کہا۔

"کمرے کی چابی تو اپنے ہی پاس ہے نا۔"

"تم سمجھتے ہو' میں یہاں اکیلی ہوں اور کمرے کا دروازہ بند ہے۔" نوشابہ نے غصے سے آنکھیں نکال کر خبردار کیا۔ "تم نرے احمق ہو' الو ہو۔" اس نے ہاتھ بڑھایا اور مسہری کے سرہانے لگا ہوا سوئچ دکھاتے ہوئے بولی۔ "یہ سوئچ دیکھ رہے ہو۔ اسے دباتے ہی خطرے کا الارم بجنے لگے گا۔ ذرا دیر میں کمرے کا دروازہ بھی ڈپلی کیٹ چابی سے کھل جائے گا۔ اور تم پکڑ لیے جاؤ گے۔ مگر تم جیل

نہیں جاؤ گے۔ یہ جو نیچے نہر بہہ رہی ہے' تمھاری لاش ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے کنارے دبا دی جائے گی۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوگی کہ ایک مفرور قیدی کا کیا حشر ہوا۔ تم جانتے ہو' اس ضلعے کی حکومت ساتھ والے کمرے میں موجود ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو اس ضلعے کا سب سے بڑا حاکم ڈپٹی کمشنر ہے اور میں اس کی بیوی ہوں۔"

"وہ کیا کرے گا؟" لالی بدستور مسکراتا رہا۔ "وہ تو خود کسی دوسرے کی گھر والی کو لیے بیٹھا ہے۔ پر میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ کون ہے۔"

"میں یہ بات تم سے پوچھنا بھی نہیں چاہتی۔" اس نے سوئچ پر انگلی رکھ دی۔ "میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ دبا دوں یہ سوئچ؟ بولو' کیا کہتے ہو؟"

نشے کا زوردار ریلا آیا۔ لالی اس ریلے میں بہہ گیا۔ اس نے نشے سے جھوم کر نوشابہ کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "دبا دو۔ موت اسی طرح آنی ہے تو یوں ہی سہی۔" وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ "پر ایک شرط ہے۔ تم اپنے سوہنے' سوہنے ہاتھوں سے میرے ٹوٹے کرنا۔ ہائے بھی نہیں کروں گا۔"

وہ جل کر بولی۔ "کم بخت! تو میرا عاشق کب سے بن گیا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی گل ہے۔" لالی نے اس آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "یہ اتنا بہت سا سنگھار تم نے کس کے لیے کیا ہے۔ وہ میں کیوں نہیں ہو سکتا؟"

وہ آہستہ آہستہ نوشابہ کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے' چہرے پر وحشت طاری تھی۔ نوشابہ نے اسے آگے بڑھتے دیکھا تو زور سے ڈانٹا۔ "رک جاؤ۔" لالی اس کی ڈانٹ سن کر چونک پڑا' جھجک کر کھڑا ہو گیا۔ نوشابہ نے تلملا کر کہا۔ "کیا تم یہ چاہتے ہو میں یہ سنگھار نوچ کر پھینک دوں؟" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "لو یہ بھی دیکھ لو۔" اس نے گردن میں پڑا ہوا گجرا پکڑا اور غصے سے جھٹکا دے کر توڑ ڈالا۔ گجرے کے پھول دور تک بکھر گئے۔ نوشابہ نے فرش پر پڑے ہوئے پھول مسلتے ہوئے بازو بند کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

لالی یہ وار جھیل نہ سکا۔ گھبرا کے بولا۔ "نہ' نہ ایسا نہ کرو۔"

نوشابہ کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے خوں خوار نظروں سے لالی کو دیکھا۔ "اگر تم یہ نہیں چاہتے تو فوراً کمرے سے نکل جاؤ۔"

"ناراض کیوں ہوتی ہو۔" اس دفعہ لالی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم کہتی ہو تو چلا جاؤں گا۔" وہ جھینپ کے مڑا۔ پھر ٹھٹکا۔ "جانے سے پہلے اتنا ضرور پوچھوں گا۔ کیا میں صرف اس لیے تمھارے اس ناٹک میں شریک نہیں ہو سکتا کہ میں چھوٹا اور غریب بندہ ہوں؟" اس کے چہرے پر



دکھ کا ہلکا سا سایہ پھیل گیا۔

"یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔" نوشابہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "مگر اور بھی بہت سی باتیں ہیں جنھیں تم نہیں جانتے۔" وہ ذرا رکی۔ "یوں سمجھ لو کہ یہ چند شادی شدہ مردوں اور عورتوں کا خفیہ کلب ہے۔ اس کا نام پولی نیسین کلب ہے۔"

"یہ کیا نام ہوا جی؟"

وہ بیزاری سے بولی۔ "کیا کرو گے جان کر۔ تم کبھی اس کلب کے ممبر نہیں بن سکتے۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں' پر جب بتایا ہے تو یہ گل بھی بتا دو۔"

نوشابہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ "پولی نیسین' جنوبی سمندروں کے علاقے پولی نیسیا کے باشندوں کو کہتے ہیں۔ ان میں مختلف قبائل ہیں۔ تقریباً تین سو پچاس جزیروں میں صدیوں سے آباد ہیں۔ ان جزیروں میں نیوزی لینڈ' ایسٹر آئی لینڈ' ہوائی اور تاہٹی بھی شامل ہیں۔ پولی نیسینوں کے نزدیک عورت اور مرد کے جنسی تعلقات ایسی ہی عام بات ہے جیسے کھانا کھانا' پانی پینا۔ کوئی بھی عورت' جب چاہے کسی بھی مرد سے تعلقات قائم کر سکتی ہے۔ شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی۔ گانے' رقص کرنے' تیراکی اور مچھلی کا شکار کرنے کی طرح وہ اسے بھی تفریح یا کھیل سمجھتے ہیں۔ بلکہ تاڑ اور ناریل کے کنج میں بعض عورتیں گھر بنا کر رہتی ہیں اور جو مرد انھیں پسند آجاتا ہے' اس کے ساتھ جب تک جی چاہتا ہے' رہتی ہیں۔ ایسے گھر پلے ژر ہاؤس کہلاتے ہیں۔ مگر اب یہ باتیں رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہیں۔"

"وہاں ختم ہو رہی ہیں اور یہاں شروع ہو رہی ہیں۔"

"یہ بات نہیں۔" نوشابہ نے لالی کا طنز نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "تم مہر سلیمان سے تو مل ہی چکے ہو۔ دوسری جنگ عظیم میں وہ رائل انڈین نیوی میں افسر تھے۔ جنگ کے دوران ان کا جہاز جاپانی ایئر فورس کے حملوں سے بھاگ کر جزائر مارکوئیس کے ساحلوں پر لنگر انداز ہو گیا تھا۔ یہ جزائر بھی پولینیسیا کا حصہ ہیں۔ سلیمان وہاں دو ہفتے تک پولی نیسین باشندوں کے ساتھ ٹھہرے رہے۔ سچ پوچھو تو یہ کلب انھوں نے ہی قائم کیا' اس کا نام پولی نیسین کلب اور اس عمارت کا نام پلے ژر ہاؤس رکھا۔ شروع میں چار جوڑے اس کے ممبر تھے۔ اب آٹھ ہیں۔ انھیں سب نے مل کر منتخب کیا ہے۔ سبھی نے مل جل کر اس کلب کے اصول اور قاعدے بنائے ہیں۔ راز داری کا باقاعدہ حلف اٹھایا ہے۔" اس نے چند لمحے توقف کیا۔ "ویسے تو میزبان راحیلہ ہے مگر ہر ممبر پانچ سو روپے ماہانہ چندہ دیتا ہے۔ ممبرشپ کی فیس دو ہزار روپے ہے۔ وہ ماہانہ چندے سے الگ ہے۔ یہ جشن

جسے نائٹ آف دی گریٹ سپنس کہا جاتا ہے' مہینے میں صرف ایک رات منایا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ مقرر ہوتی ہے اور پہلے سے باقاعدہ تیاریاں کی جاتی ہیں۔"

لالی خاموش کھڑا نوشابہ کی باتیں سنتا رہا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتی رہی۔ "اس رات کے لیے ہر عورت اپنی پسند کا لباس منتخب کرتی ہے۔ ایسا لباس ہر کمرے کے ڈریسنگ روم میں موجود رہتا ہے۔ اگر پہلے سے کاسٹیوم اسٹور میں نہیں ہوتا تو مہیا کردیا جاتا ہے۔ ہار پھول اور سنگھار کا سارا سامان بھی یہاں موجود رہتا ہے۔ آج کی رات ہر عورت یہاں نئے سرے سے دلہن بنتی ہے۔" نوشابہ نے ہاتھ اٹھا کر ادھر ادھر لہرایا۔

"دیکھ رہے ہو' یہ سب کیا ہے۔ کیا تمہیں یہ پہلی رات کی دلہن کا کمرہ نہیں نظر آتا۔ ویسے آج کی رات عام طور پر عورتیں پولی نیسین لباس پہنتی ہیں۔ یہ لباس باریک جھالر نما ہوتا ہے اور کمر سے گھٹنوں تک ہوتا ہے۔ سینہ بالکل کھلا ہوتا ہے۔ مگر میں نے اپنے لیے آج مختلف لباس چنا تھا۔" وہ کسی قدر افسردہ ہوگئی' دل گرفتہ ہو کر بولی۔ "تم بڑے سنگدل ہو۔ تم نے آج کی رات کا سارا حسن' سارا سہاگ اجاڑ دیا۔ میری ساری امنگیں' سارے ولولے خاک میں ملا دیے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میری خوشیاں چھین کر تمہیں کیا ملا؟"

لالی اس کی باتوں سے متاثر ہو کر صفائی پیش کرنے لگا۔ "بات یہ ہے جی! مجھے تم پر بڑا ترس آیا۔ تسیں اتنی سوہنی ہو' اتنی کہ میں کیا بتاؤں اور وہ.... وہ۔"

نوشابہ اس کی بات کاٹ کر بے رخی سے بولی۔ "وہ کوئی بھی ہے' اسے یہاں بھیج دو اور خدا کے لیے مجھ پر مزید ترس نہ کھاؤ۔"

لالی چپ چاپ دروازہ کھول کر کمرے سے چلا گیا۔ شیخ حمید مگوں صوفے پر پریشان پریشان بیٹھا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی تیکھے لہجے میں بولا۔ "بہت دیر لگا دی جی؟"

"وہ ڈریسنگ روم میں بناؤ سنگھار کر رہی تھی۔ بہت دیر بعد نکلی۔"

"اوہ' یہ بات ہے۔ ٹھیک کہہ رہے ہو جی تم۔ کبھی کبھی تو سنگھار کرنے میں یہ زنانیاں گھنٹہ گھنٹہ بھر لگا دیتی ہیں۔" حمید مگوں کھڑا ہوگیا اور کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے آنکھ مار کر بولا۔ "بزدار صاحب' اب تو بتا دو' اندر کون ہے؟"

لالی نے نظر بھر کر اس کا چہرہ دیکھا' پھر جذباتی ہوگیا۔ "سیٹھ حمید! تو سچ مچ کسمت کا دھنی ہے۔ مٹی کو ہاتھ لگا دے تو سونا بن جائے۔ تو کیوں گھبراتا ہے۔ تیری کسمت تو جاگ رہی ہے۔ جا' اندر کر دیکھ لے۔ دروازہ کھلا ہے۔ تجھے کوئی روکنے والا نہیں۔"



حمید مگوں بدحواس ہوگیا۔ شراب کا خالی کنٹر لالی کے ہاتھ میں تھما کے تیزی سے آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

لالی خواب ناک نظروں سے چپ چاپ دروازہ تکتا رہا۔ چند لمحوں بعد دروازہ آہستہ سے بند ہوگیا۔ لالی نے گہری سانس بھری اور نڈھال ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ گم صم بیٹھا رہا۔ اس نے خالی کنٹر اپنے ہاتھ میں دیکھا۔ سخت تاؤ آیا۔ جی چاہا کہ شیشے کا کنٹر کمرے کے دروازے پر زور سے دے مارے اور وہ چھناکے کے ساتھ ٹوٹ کر بکھر جائے۔ مگر لالی ایسا نہ کرسکا۔ کنٹر صوفے پر ایک طرف رکھ کے اٹھا اور آہستہ آہستہ زینے کی طرف بڑھنے لگا۔ غلام گردش کا نصف سے زیادہ راستہ طے کیا۔ پھر کچھ سوچ کر لوٹ آیا۔

کمرہ نمبر ۱۰ کی کنجی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کمرے کے قریب پہنچ کر تالا کھولا اور دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے سرکا کر اندر چلا گیا۔ پردہ ہٹا کے سامنے نظر ڈالی' زور کا جھٹکا لگا۔ جسم میں بجلی کا کرنٹ سا دوڑ گیا۔ مسہری پر حمید مگوں بیٹھا تھا۔ نوشابہ کی بانہیں اس کے گلے میں پڑی تھیں۔ وہ اس کے زانو پر لیٹی تھی۔ حمید کے گلے میں پھولوں کا گجرا تھا۔ اور نوشابہ کے گلے میں سفید موتیوں کا قیمتی ست لڑا ہار تھا۔ اس کی چولی اتر چکی تھی۔ سینہ بالکل برہنہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں نہایت والہانہ انداز سے جھانک رہے تھے۔ ٹھیک اس مجسمے کے مانند جو کمرے کے باہر محراب کے نیچے ایک گوشے میں رکھا تھا۔

نوشابہ نے آہٹ سنی۔ پلٹ کر لالی کو دیکھا اور غصے سے پھٹ پڑی۔ "تو اپنے کمینے پن سے باز نہیں آئے گا؟"

لالی گھبرا گیا۔ "میں چابی دینے آیا ہوں۔ چابی میرے ہی پاس رہ گئی تھی۔"

نوشابہ نے ڈپٹ کر کہا۔ "ادھر میز پر ڈال دے اور فوراً کمرے سے نکل جا۔"

لالی نظر جھکائے آہستہ آہستہ میز کے پاس گیا۔ میز پر شیخ حمید کے اترے ہوئے کپڑے رکھے تھے۔ لالی دونوں کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہوگیا۔ اس نے مگوں کے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں اور نہایت صفائی سے نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ پار کردیا۔ کنجی میز پر رکھ کر وہ دروازے کی جانب چلا۔ پیچھے سے حمید کی آواز ابھری۔

"دروازہ بند کردینا جی۔"

لالی کو اس کا لہجہ نہایت تحقیر آمیز معلوم ہوا۔ اس نے چلتے چلتے پلٹ کر دونوں کی جانب دیکھا۔ نوشابہ کا ایک ہاتھ ابھی تک حمید کی گردن میں حمائل تھا۔ اس کے عریاں گلابی سینے پر موتیوں کا ہار

جگمگا رہا تھا۔ لالی کے دل کو شدید ٹھیس لگی۔ اس نے مگوں کو مخاطب کیا۔ "سیٹھ حمید! میں نے تیری جیب سے بٹوا نکال لیا ہے۔ تو مجھے رشوت دے رہا تھا نا' یہ رہا تیرا بٹوا۔" اس نے بٹوہ حمید کو دکھایا۔ حمید مگوں گھبرا گیا۔ "نہیں' نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ بٹوے میں پانچ ہزار سے بھی زیادہ روپے ہیں' تم اتنے روپے نہیں لے جا سکتے۔"

لالی نے ہنس کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ "حمیدے! تو بنئے کا بنیا ہی رہا۔ تیرے پاس ایسی بانکی سجیلی مٹیار چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ پنج ہزار کیا' اس کے لیے پنج لاکھ بھی کم ہیں۔ اگر یہ مانگے تو اس کے لیے سرکاٹ کے ہتھیلی پر رکھ کے پیش کر دوں۔" اس کی نظریں نوشابہ کے چہرے پر جم گئیں۔ "آزما لے نوشابہ! فیر کبھی نہیں ملوں گا۔ چاہنے والے تو نے بہت دیکھے ہیں' مرنے والا بھی دیکھ لے۔" وہ نشے سے جھوم رہا تھا۔

نوشابہ کا منہ فق ہو گیا۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے لالی کو دیکھا اور حمید کو مخاطب کرتے ہوئے گھبرا کر بولی۔ "اسے نہ روکو حمید۔ جانے دو اسے۔"

لالی مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور بوجھل قدموں سے چلنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے غلام گردش میں جلتی ہوئی تمام روشنیاں بجھ گئیں اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ اس نے غلام گردش طے کی' زینے سے نیچے اترا اور چند لمحے گم صم کھڑا رہا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا قرعہ اندازی والے ہال میں داخل ہو گیا۔ ہال میں کوئی نہیں تھا۔ تمام نشستیں خالی تھیں۔ شمع دان میں موم بتی ابھی تک روشن تھی اور پگھل پگھل کر چوتھائی سے بھی کم رہ گئی تھی۔

لالی تھکا ہوا امپائر والی اونچی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سامنے دیوار پر لگا ہوا کلاک دیکھا۔ ایک بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ اس نے نمبروں والے خانوں پر نظر ڈالی' دو خانے خالی تھے۔ ان میں کوئی ٹوکن نہیں تھا۔ لالی نے درمیانی صندوقچی کا بالائی ڈھکنا کھولا۔ ہاتھ اندر ڈالا۔ دو ٹوکن ابھی صندوقچی میں موجود تھے۔ اس نے ایک اٹھا لیا اور دھندلی روشنی میں ہتھیلی پر رکھ کے دیکھا۔ اس پر ۱۰ کا ہندسہ لکھا تھا۔ یہ نوشابہ کے کمرے کا نمبر تھا۔ نوشابہ جو حمید مگوں کی گردن میں محبت سے باہیں ڈالے لیٹی تھی۔ لالی بجھی بجھی نظروں سے ٹوکن تکتا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری اور آنکھیں بند کر لیں۔

دو گرم گرم آنسو اس کی پلکوں میں الجھ کر رہ گئے۔

اس نے آنکھیں کھولیں۔ ٹوکن نمبر ۱۰ صندوقچی میں ڈال دیا اور دوسرے ٹوکن بھی خانوں سے



اٹھا اٹھا کر صندوقچی میں ڈالنے لگا۔ جب وہ سب ٹوکن ڈال چکا تو صندوقچی کا ڈھکنا بند کر دیا۔ اس نے ناموں والے خانے دیکھے۔ ان میں سات ٹوکن موجود تھے۔ اس نے ایک ٹوکن اٹھا لیا' اس پر شیخ حمید مگوں لکھا تھا۔ لالی نے نفرت سے ٹوکن دیکھا۔ ہاتھ اٹھایا۔ چاہا کہ اسے دروازے سے باہر پھینک دے' مگر کچھ سوچ کر ہاتھ روک لیا۔ دوسرے ہاتھ سے پتلون کی جیب ٹٹولی جیب میں بٹوہ موجود تھا۔ لالی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

☆

ہال میں چاپ ابھری۔ لالی نے چونک کر دیکھا۔ ہمدانی اندھیرے سے نکل کے یکایک اس کے سامنے آ گیا۔ وہ مسکراتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا۔ جھٹ لالی کا ہاتھ پکڑ کے جوش سے چوما۔

"یار! تو تو زبردست کلاکار ہے۔ بہت اونچی چیز ہے۔ مان گئے تجھے۔"

"مجھے تو یہ خوشی ہے جی' آپ کا کام بن گیا۔" لالی احتراماً کھڑا ہو گیا۔ ہمدانی نے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے بٹھا دیا۔ وہ کھلنڈرے موڈ میں تھا۔ ہنس کر گویا ہوا۔ "یار بیٹھا رہ۔ تکلف وکلف چھوڑ۔" وہ اچک کر میز پر بے تکلفی سے بیٹھ گیا' ہلکا قہقہہ لگا کے بولا۔ "ایسا ویسا کام بنا ہے۔ نہ پوچھ' اپنے ساتھ کیا واردات گزری۔ جیسے ہی کمرے میں پہنچا' وہ ڈریسنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ وہ کیا آئی۔ قیامت ہم رکاب آئی۔ امینہ پولی نیسین کے سموا قبیلے کی دوشیزاؤں کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ بال کھلے تھے۔ ایک کان کے اوپر بالوں میں سفید گلاب کا بڑا سا پھول لگا تھا۔ گلے میں چمپا کی کلیوں کا گجرا تھا۔ کمر سے گھٹنوں تک سنہرے ریشمی دھاگے میں پروئے ہوئے گل چاندنی کے پتوں کا لباس۔ یار! لباس کیا تھا' چلمن پڑی تھی اور سینہ کچے ناریل کی طرح بالکل عریاں۔" اس نے وارفتگی کے عالم میں لالی کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارا۔ "اف' کیا گدرائی ہوئی عورت ہے امینہ۔ بانکی چتونوں کے کیا بان چلاتی ہے۔ ہائے' نہ پوچھو' ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے!" ہمدانی نے گہری سانس بھری اور آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔

جس کو ہو زندگی عزیز' اس کی گلی میں جائے کیوں!

"یہ بات ہے جی' تو آپ چلے کیوں آئے؟"

"یار! یہ پوچھنے چلا آیا' بعد میں کوئی فوپا تو نہیں ہوا؟ میرا مطلب ہے' کسی قسم کی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں جی! سب کام بالکل ٹھیک ٹھاک ہوا۔ اناڑی نہیں ہوں۔ برسوں لاٹری کھلاتا رہا ہوں۔"

"مگر یار تو نے تو کمال کر دیا۔ ایسی ہاتھ کی صفائی دکھائی' میں تو دنگ رہ گیا۔" ہمدانی نے ہنستے

ہوئے کہا۔ ”بات یہ ہے کہ ہم نے ایسا فول پروف سسٹم رکھا ہے کہ کسی ہیرپھیر کی گنجائش ہی نہیں۔“

”میں نے تو جی آپ کے لیے دوبار ٹوکن نکالے اور دونوں ہی بار معاملہ الٹا گیا۔“

”دوبار؟“ ہمدانی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”کیا پہلا ٹوکن نوشابہ کے کمرے کا نہیں تھا؟“

”پہلا نہیں‘ دوسرا تھا۔ پہلا تو راحیلہ کے کمرے کا تھا۔“

”ارے مار دیا ظالم!“ ہمدانی نے حیرت سے پلکیں پٹ پٹائیں۔ ”تب تو یار! تونے زبردست کام دکھایا۔“ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگیا پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”اچھا‘ اب کام کی بات ہوجائے۔ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ وہ سالا ایس‘ پی تمہاری گھات میں ہے۔ تمام وقت بیٹھا مکھی کو گھورتا رہا۔ وہ ضرور اپنی کارگزاری دکھانے کی کوشش کرے گا۔ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ الہ آباد میں میرے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ وہ تو پیدائشی پولیس والا ہے۔ باپ بھی اس کا پولیس انسپکٹر تھا۔“ اس نے مڑ کر کلاک کی جانب دیکھا۔ ”یہ بتاؤ ایس پی مرزا کے ساتھ کمرے میں ہے کون؟“

لالی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”ساب! یہ بات نہیں بتاؤں گا‘ چاہے آپ ناراض ہوجائیں۔“

”ناراض واراض ہونے کی بات نہیں۔“ ہمدانی نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تمہارے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ اگر مہ جبین یا راحیلہ اس کے پلے پڑگئیں‘ تب تو سالا مارا گیا۔ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے اجازت لے کر باہر آجائے تو تعجب کی بات نہیں۔ وہ بالکل کاٹھ کا الو ہے۔ البتہ اس کی جورو سائرہ بڑی کانٹے کی عورت ہے۔ اس پر تو کبھی کبھی عاشق ہوجانے کو دل چاہتا ہے۔“

لالی نے بے چین ہو کر کہا۔ ”تب تو جی‘ مجھے اب چلنا چاہیے۔“

”قادر آباد اسٹیشن تو تم اس وقت نہیں پہنچ سکتے۔ وہ تو بہت دور ہے‘ مگر تمہیں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہیے۔“

”آپ تو میرے ساتھ سٹیشن جائیں گے نہیں؟“

”یار! یہ ظلم نہ کرو‘ میں کیسے جاسکتا ہوں۔ آج تو وصل کی رات ہے۔“ ہمدانی ہنس کر بولا۔

”تمہیں راستے کا بھی کچھ اتا پتا ہے؟“

”مجھے تو جی کچھ پتہ نہیں۔ یہ بھی نہیں ملوم‘ یہاں سے کون سا رستہ جاتا ہے۔“

”تم ایسا کرو۔ یہ جو نیچے نہر بہتی ہے‘ اسے پار کر کے دوسری طرف چلے جاؤ۔ میل سوا میل بعد



کچی سڑک آئے گی۔ وہ بڑی نہر تک جاتی ہے۔ نہر عبور کرنے کی ضرورت نہیں۔ کنارے کنارے چلے جاؤ۔ عارف والا روڈ آئے گی‘ اور آگے بڑھو گے تو پاک پتن روڈ آجائے گی۔ تم اس پر نہ جانا۔ آگے نکل جانا۔ قادر آباد کے نزدیک ہوجاؤ گے۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”اس سڑک سے جاؤ گے جو سلیمان کے بنگلے کے سامنے سے گزرتی ہے تو یہ راستہ بھی لمبا ہے اور اگر ایس پی تمہاری تلاش میں نکل آیا تو راستے ہی میں دھرلے گا۔“

لالی جلدی جلدی ناموں کے ٹوکن خانے سے نکال کر بائیں ہاتھ کی صندوقچی میں ڈالنے لگا۔ اس نے ڈھکنا بند کیا اور کھڑا ہوگیا۔

”چلو میں تمہیں یہاں سے تو اپنی حفاظت میں باہر نکال دوں۔ یہاں سے نکلنا بھی آسان کام نہیں۔ ہر طرف سخت پہرا ہے۔“

اس نے پھونک مار کر موم بتی بجھائی اور لالی کے ساتھ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا ہال سے باہر آگیا۔ دونوں ایک طویل غلام گردش میں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ لالی نے چلتے چلتے کہا۔ ”ایک بات پوچھوں جی! آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟“

”پوچھو‘ ضرور پوچھو۔“ ہمدانی نے ہلکا قہقہہ لگا کر کہا۔ ”اس وقت تو تمہیں سات خون معاف ہیں۔“

”آپ کو جی‘ اس بات پر ذرا بھی برا نہیں لگتا کہ آپ کی گھروالی ساتھ والے کسی کمرے میں دوسرے مرد کے ساتھ سو رہی ہے؟“

”برا لگتا تو ہے۔“ ہمدانی نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”مگر اتنا زیادہ نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔“

”یہ بات سمجھ نہیں آئی جی!“

”یار! سیدھی سادی بات ہے۔ یہ تو تم نے سنا ہی ہوگا کہ پرائی عورت اور پرائی دولت سب کو اچھی لگتی ہے۔ اسے اڑا لینے کو ہر ایک کا دل مچلتا ہے۔ تم نے کبھی سوچا‘ ایسا کیوں ہے؟“ ہمدانی نے لالی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ”مگر یہ بات تم نہیں سمجھ سکتے۔ یہ بتاؤ‘ تمہاری جورو ورو ہے؟“

”وہ تو نہیں ہے جی۔“ لالی نے انکار میں گردن ہلائی۔

”پھر تم کیسے سمجھ سکتے ہو۔“ ہمدانی ہنسنے لگا۔ ”ایک عدد جورو بیاہ کرلے آؤ۔ کبھی نہ کبھی تو تمہارا دل اس سے بھر ہی جائے گا۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ شروع میں عورت محبوبہ ہوتی ہے بیوی بن جاتی ہے۔ پھر ایسا وقت آتا ہے کہ محبوبہ اور بیوی ختم ہوجاتی ہے اور عورت صرف

بچوں کی ماں رہ جاتی ہے۔ جب وہ صرف بچوں کی ماں رہ جائے اور اس میں تمہارے لیے کوئی کشش، کوئی دلچسپی نہ رہے تو اس کا ایک عدد یار پیدا کردو۔ پھر دیکھو، کیا ہوتا ہے؟"

"ساب، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ جب اس کا یار پیدا ہو جائے گا تو وہ جوان اور خوبصورت ہونا شروع ہو جائے گی۔ بچوں کی ماں ایک دم محبوبہ بن جائے گی اور تم اس کے عاشق بن جاؤ گے۔ ہر وقت اس کے یار سے اسے چھین لینے کے چکر میں رہو گے، اور جب وہ واپس ملتی نظر نہ آئے گی تو اس کے عشق میں ایسے پاگل دیوانے ہو جاؤ گے کہ اس کے یار کو قتل کردو گے۔ بلکہ اسے بھی قتل کردو گے اور ٹھنڈے ٹھنڈے جا کر پھانسی کے پھندے سے لٹک جاؤ گے۔"

لالی قائل نہ ہوا۔ "ساب! عزت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"یار! یہ عزت وزت سب بکواس ہے۔" ہمدانی بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔ "چلو، تمہاری بات مان لی۔ جب تمہاری جورو صرف بچوں کی ماں رہ جائے اور تمہارا دل اس سے اکتا جائے تو اسے طلاق دے دینا۔ پھر تو عزت کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ طلاق کے بعد وہ کسی اور سے نکاح پڑھا کر بیٹھ جائے گی۔ تم اسے دوسرے کے پہلو میں دیکھو گے تو دل میں کڑھو گے۔ اپنی آگ میں خود جلو گے۔ اس سے چھپ چھپ کر ملنے کی کوشش کرو گے۔ اس کی منت سماجت کرو گے کہ پھر تمہارے قبضے میں آ جائے اور اگر وہ راضی نہ ہوئی یا اس کا شوہر آمادہ نہ ہوا تو تم شوہر کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کرو گے اور وہ تمہیں اپنی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرے گا۔"

"ساب! کیا ایسا ہوتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہوتا؟ میرے سامنے روز ایسے مقدمات پیش ہوتے ہیں اور اکثر اس وقت پیش ہوتے ہیں جب کسی کا قتل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے تو فساد کی جڑ زر اور زمین کے ساتھ زن کو بھی قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ کہا تو یہاں تک جاتا ہے کہ ہر قتل کے پیچھے کوئی عورت ہوتی ہے۔" ہمدانی بولتا رہا۔ "یار! بات صرف اتنی ہے کہ ہم نے اپنی جورووں کے ایک چھوڑ، چھ سات یار پیدا کر دیے ہیں۔ جب سے ان کے یار پیدا ہوئے ہیں، وہ روز بہ روز زیادہ جوان اور زیادہ خوبصورت ہوتی جا رہی ہیں۔ ادھر ہم رقابت کی آگ میں اندر ہی اندر سلگتے ہیں اور اپنی اپنی جورووں کے عشق میں دیوانے رہتے ہیں۔ کل صبح سے عشق کا شدید دورہ پڑے گا۔ سچ پوچھو تو ابھی سے ہولے ہولے ابھرنے لگا ہے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "اس یاری آشنائی کا فائدہ یہ ہے کہ اپنی جورو بھی ہاتھ سے نہیں جاتی اور پرائی جورو کا ذائقہ بھی چکھنے کو مل جاتا ہے۔ نہ اغوا کرنے یا پھانسنے کا چکر۔ نہ



نئی شادی رچانے کا جھنجٹ۔ اس میں عجب مزہ، عجب نشہ ہے۔ میاں بھی خوش، بیوی بھی خوش۔" اس نے مسکراتے ہوئے مڑ کر پلے ژر ہاؤس کی دوسری منزل پر جانے والے زینے کی جانب نظر ڈالی۔ "اوپر کے کسی کمرے میں جا کر دیکھو۔ یہی عورتیں جو چند مہینے پہلے باسی ٹماٹروں کی طرح بھدی اور پلپلی لگتی تھیں، اس وقت ایسے جوبن پر ہیں کہ کوہ قاف کی پریوں کو بھی مات کر رہی ہیں۔"

لالی کسی قدر پریشان ہو گیا۔ "ساب ایسا کہاں ہوتا ہے؟ ہو بھی نہیں سکتا۔"

"ہو کیوں نہیں سکتا۔" ہمدانی نے بے نیازی سے کہا۔ "ٹنڈرا کے رہنے والے اسکیمو، بڑی خوشی سے اپنی بیویوں کا ایک دوسرے سے تبادلہ کرتے ہیں اور جب تک جی چاہتا ہے، ساتھ رہتے ہیں۔ نہ بیوی کو اعتراض ہوتا ہے نہ شوہر کو۔ ان کے نزدیک یہ کوئی عیب نہیں۔ جب جی چاہا، جس وقت جی چاہا، آپس میں بیویاں بدل لیں۔ پولی نیسین قبائل تو نہ صرف بیویوں کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں بلکہ گھر میں مہمان آئے تو میزبان خوشی سے اپنی بیوی رات کے وقت مہمان کو پیش کرتا ہے۔ یہی نہیں، جس کا جس وقت جی چاہا، دوسرے کی جورو کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ مگر اس کے لیے ایک دوسرے کی رضامندی ضروری ہے۔"

"ساب! میں نے تو ایسی بات نہ دیکھی، نہ سنی۔"

"تم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔" ہمدانی کھل کھلا کر ہنسا، چند لمحے خاموش رہا پھر کسی قدر سنجیدہ ہو کر بولا۔ "یار! راز کی بات یہ ہے کہ ڈپٹی کمشنری خوب صورت بیوی کے بغیر نہیں چلتی۔ خصوصاً انگریز کے راج میں تو چل ہی نہیں سکتی تھی۔ انگریزوں نے اپنے آئی سی ایس افسروں کے لیے خوبصورت بیوی رکھنا، خوب صورت انگریزی بولنا اور خوب صورت انگریزی لکھنا بنیادی شرط رکھی تھی اور یہ بنیادی شرط آج بھی نہیں بدلی۔ کیا سمجھے؟"

لالی نے معصومیت سے پوچھا۔ "تو کیا سارے ڈپٹی کمشنر اور وڈے افسر یہی دھندا کرتے ہیں؟"

"نہیں یار!" ہمدانی نے تردید کی۔ "بہت سے تو بالکل ہی صوفی ہیں۔ رؤف اسی لیے اپنی جورو کو لے کر کینڈا چلا گیا۔ جورو بھی ایسی چھانٹ کر لایا ہے، بالکل مرقع چغتائی لگتی ہے، پھولوں کی طرح نازک اور شفاف۔ ایسی اجلی کہ ہاتھ لگاؤ تو میلی ہو جائے۔ پچھلی قرعہ اندازی میں وہ میرے حصے میں آئی تھی۔ عورت کیا ہے، لنسن بلیک لیبل شیمپین ہے۔ جس قدر آہستہ آہستہ پیو، اتنا ہی خمار ہوتا جائے اور رؤف تو ایک دم کاٹھ کا الو ہے۔ صبح جب وہ اسے اپنے ساتھ لے کر گیا تو گاڑی میں بیٹھتے ہی سینے سے چمٹا کر رونے لگا۔ میں نے اسی روز بھانپ لیا تھا، اب یہ دوبارہ سپنس نائٹ میں شریک

نہیں ہوگا۔ یہی ہوا چند روز پہلے ہی وہ سرکاری دورہ نکال کر جورو کے ساتھ کینڈا چلا گیا۔"

لالی چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "ساب! برا نہ منائیے گا' میں چھوٹا اور غریب بندہ ہوں۔ میں تو یہ جانتا ہوں میری ماں کے ساتھ لمبردار نے زبردستی منہ کالا کرلیا تھا۔ وہ بہت غریب زنانی تھی۔ میرے پیو نے اس کا یہ گناہ کبھی معاف نہیں کیا۔ روز گالاں نکالتا تھا' مارتا تھا اور مارتے مارتے آخر اس نے اس کا کام تمام کردیا۔ بات یہ ہے جی! دنیا میں سارا کھیل پیسے کا ہے۔ پیسہ آدمی کے سب عیب چھپا دیتا ہے۔" لالی غم زدہ ہوگیا۔ اس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔

ہمدانی نے مزید بات چیت نہیں کی۔ دونوں چپ چاپ چلتے ہوئے پلے ژرہاؤس کی دو منزلہ عمارت سے نکل کر باغ میں آگئے۔ چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ قریب کے درختوں کے نیچے آہٹ ہوئی' ساتھ ہی آواز آئی۔

"کون ہے۔"

انہوں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ ہمدانی فوراً ڈپٹی کمشنر بن گیا۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ اور شگفتگی غائب ہوگئی' گردن تن گئی۔ اس نے حکم دینے کے انداز میں بلند آواز سے کہا۔ "سامنے آؤ۔" درختوں تلے آہٹ تیز ہوگئی۔ اندھیرے سے ایک مسلح پہرے دار نکل کر سامنے آگیا۔ اس نے ڈپٹی کمشنر کو دیکھتے ہی دونوں جوتے بجا کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور اٹینشن ہو کر کھڑا ہوگیا۔ ڈپٹی کمشنر نے اس پر اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر بے نیازی سے پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

پہرے دار نے مستعدی سے جواب دیا۔ "تاج محمد۔ میں جی ساہیوال کا رہنے والا ہوں۔" اس کے لہجے سے گھبراہٹ صاف عیاں تھی۔ "منٹگمری کو جی پہلے ساہیوال ہی کہا جاتا تھا۔"

ڈپٹی کمشنر نے اس کی گھبراہٹ نظر انداز کرتے ہوئے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "تاج محمد! اسے اپنے ہم راہ لے جاؤ اور جہاں یہ جانا چاہے' اس جگہ کا پتہ معلوم ہو تو بتادو۔ یہ نہر کے اس پار جائے گا۔ یہ اسی راستے سے جانا چاہتا ہے۔" ہمدانی مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھر عمارت میں داخل ہوگیا۔

ڈپٹی کمشنر چلا گیا تو پہرے دار نے لالی سے پوچھا۔ "تیں نوں کتھے جانا ہے؟"

لالی نے مختصر جواب دیا۔ "کادر آباد سٹیشن۔"

پہرے دار نے کسی قدر حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "ٹیشن تو یہاں سے دور ہے۔ توں سویرا ہونے تک وہاں نہیں پہنچ سکتا۔"



"فکر نہ کر۔ مجھے نہر کے اس پار پہنچا دے۔"

دونوں درختوں کے نیچے ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ کچھ دور جاکر نشیب میں اتر گئے۔ سامنے نہر تھی۔ دونوں نہر کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ اس جگہ روشنی تھی اور یہ جگہ پلے ژرہاؤس کے عین نیچے تھی۔ لالی اور پہرے دار جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ سے نکل کر کھلے میدان میں آگئے تھے۔ لالی نے چلتے چلتے گردن اٹھا کر پلے ژرہاؤس کی دوسری منزل کی طرف دیکھا۔ کھڑکیوں سے گہری سرخ سرخ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ایک کھڑکی پر اس کی نظر پڑی تو وہ دم بخود رہ گیا۔ ایس پی مرزا کھڑکی میں کھڑا تھا اور گردن جھکائے دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ یہ کمرہ نمبر ۸ تھا۔ جس میں اس کے ساتھ راحیلہ تھی۔ لالی نے پہرے دار سے کہا۔

"اب میں چلا جاؤں گا۔"

"نہر یہاں گہری ہے۔ یہاں سے جائے گا تو بھیگ جائے گا۔ کمر تک پانی ہے۔ نہر کا بہاؤ بھی آج کل تیز ہے۔ رات کا ٹیم ہے' کہیں پیر ڈگمگا گئے تو بہتا ہوا نہ جانے کدھر نکل جائے گا۔"

لالی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "فیر نہر کے اس پار کیسے جاؤں؟"

"گھبرا نہیں۔ پوری گل سن لے۔" پہرے دار نے جواب دیا۔ "فرلانگ' سوا فرلانگ آگے جاکر نہر میں پانی بھی کم ہے اور بیچ میں جگہ جگہ اونچے اونچے پتھر ہیں' انھی پتھروں پر چل کر سارے بندے اس پار جاتے ہیں۔ نہر کے پار جانے کے بعد سجے ہاتھ کو مڑ جانا۔ میل بھر آگے کچی سڑک ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔ تو فکر نہ کر۔"

"جیسی تیری مرضی۔ میں تو چاہتا تھا' تجھے نہر کے اس پار پہنچا دوں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب کا حکم ہے۔"

لالی نے اصرار نہیں کیا تو پہردار بھی خاموش ہوگیا۔ وہ آہستہ آہستہ مڑا اور کچھ دور جاکر نشیب سے اوپر چڑھنے لگا۔ لالی مڑ مڑ کر اسے دیکھتا رہا۔ جب پہریدار نظروں سے اوجھل ہوگیا تو لالی نے پلے ژرہاؤس کی جانب گردن اونچی کرکے دیکھا' کمرہ نمبر ۸ میں سرخ بتی جل رہی تھی۔ مگر ایس پی کھڑکی پر نہیں تھا۔ لالی پریشان ہوگیا۔ اس نے رفتار تیز کردی۔ آگے گھنی جھاڑیاں تھیں۔ ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے اسے بار بار ٹھہرنا پڑتا۔ مشکل یہ تھی کہ جھاڑیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ لالی کچھ دور تک جھاڑیوں سے الجھتا ہوا چلتا رہا۔ آخر اس نے آگے جانے کا ارادہ ترک کردیا۔ اسے ڈر تھا' کہیں ایس پی نہ پہنچ جائے۔ وہ کھڑکی سے اسے دیکھ ہی چکا تھا۔ لالی جلد سے جلد

نہر کے اس پار پہنچ کر دور نکل جانا چاہتا تھا۔

اس نے جلدی جلدی جوتے اتارے، پتلون کے پائنچے چڑھائے اور نہر میں اتر گیا۔ کنارے پر پانی کم تھا۔ وہ رفتہ رفتہ آگے بڑھتا گیا، پانی اونچا ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ کمر تک آ گیا۔ لالی نہر کے بیچوں بیچ پہنچ چکا تھا۔ پہرے دار نے ٹھیک کہا تھا۔ پانی کا دھارا تیز تھا۔ لالی کے قدم بار بار ڈگمگا جاتے۔ مگر وہ سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتا گیا۔ اچانک پانی کا زور دار ریلا آیا۔ لالی کے قدم لڑکھڑائے۔ وہ سنبھل نہیں سکا۔ اس کے قدم اکھڑ گئے اور وہ پانی کے تیز ریلے میں بہتا ہوا آگے نکل گیا۔



## ۱۵

نہر، نیم دائرہ بناتی ہوئی مغرب کی سمت مڑ گئی تھی۔ موڑ پر بائیں جانب کھال تھا، جو کنارے کاٹ کر آب پاشی کے لیے بنایا گیا تھا۔ کھال تنگ تھا۔ گہرائی بھی کم تھی۔ لالی، پانی کے تیز ریلے کے ساتھ بہتا ہوا کھال میں داخل ہو گیا۔ وہ گردن، پانی سے باہر نکالے آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔

کھال کے ایک طرف گندم اور جو کے کھیت لہلہاتے تھے۔ کھال کی گہرائی اتنی کم تھی کہ کچھ ہی دور جانے کے بعد لالی آسانی سے چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ مگر اس طرف گندم اور جو کے کھیت نہ تھے۔ سرکنڈوں اور بھیلچی کے اونچے، اونچے گھنے پودوں کی جھاڑیاں تھیں اور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لالی، پانی سے شرابور اور تھکن سے نڈھال تھا۔ وہ کھال کے کنارے ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ کر ستانے لگا۔

ذرا سکون ملا تو اس نے پتلون کی جیب ٹٹولی۔ بٹوہ موجود تھا۔ لالی نے بٹوہ نکالا۔ بٹوہ بھیگا ہوا تھا۔ ں میں رکھے ہوئے نوٹ بھی کسی قدر بھیگ گئے تھے۔ لالی نے مسکرا کر بٹوہ دیکھا اور سنبھال کر پھر یب میں رکھ لیا۔

رات کے آنگن میں ستاروں کے کنول جھلملا رہے تھے۔ ہلکے ہلکے جھونکوں سے پودوں میں سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ لالی کئی منٹ خاموش بیٹھا گہری گہری سانسیں بھرتا رہا، پھر اٹھ کر کھڑا گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

کھیتوں کے اس پار جوہڑ تھا اور اس کے آگے گاؤں کے مکانات تھے۔ ستاروں کی مدھم روشنی ماٹی کے مکانات دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ رات کے پچھلے پہر کی گہری خاموشی میں

گاؤں بالکل سنسان تھا۔ لالی اس طرف نہ گیا۔ وہ کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے پی بے پر چلنے لگا۔

کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو جھنگر شروع ہوگیا۔ جھنگر کے آگے چٹیل میدان تھا۔ وہ جھنگر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ مگر تین میل سے زیادہ نہ چل سکا۔ اس کے برہنہ پیر جنگلی جھاڑیوں کے کانٹوں سے لہولہان تھے۔ اب اس میں آگے جانے کی سکت نہیں تھی۔ وہ بہت تھک چکا تھا اور کہیں ٹھہر کر آرام کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایسی جگہ مل بھی گئی۔ یہ فراش کے درختوں کا کنج تھا۔ کنج کی زمین ہموار تھی اور خاردار جھاڑیوں سے صاف تھی۔ وہ کنج میں روپوش ہو کے رات بسر کر سکتا تھا۔

لالی فراش کے درختوں تلے چلا گیا اور نڈھال ہو کے اندھیرے میں زمین پر لیٹ گیا۔ اس کے کپڑے ابھی تک گیلے تھے۔ اسے سردی محسوس ہوئی۔ اس نے کروٹ لے کر جسم سکیڑ لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ ذرا دیر بعد اسے نیند آگئی۔

وہ گہری نیند سوتا رہا۔ رات گزری، صبح ہوئی۔ سورج چڑھ کر بیچ آسمان پر آگیا۔ آنکھ کھلی تو چونک کر دیکھا، ایک شخص اس پر جھکا ہوا کلائی سے گھڑی اتارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لالی نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ شخص بھاگنے کے لیے تیزی سے مڑا۔ لیکن لالی نے اسے فرار ہونے کا موقع نہیں دیا۔ جھٹ اس کی ٹانگ پکڑلی اور زور سے کھینچی۔ وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔

لالی نے چیل کی طرح جھپٹ کے اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ اس شخص کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جسم لمبا اور مضبوط تھا۔ اس نے زور لگایا اور لالی کی گرفت سے خود کو آزاد کرالیا۔ لالی پھر اس سے لپٹ گیا۔ دونوں گتھم گتھا ہوگئے اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگے۔

دونوں خاک میں لتھڑے ہوئے ہانپ رہے تھے۔ اس شخص نے ایک بار پھر نکل بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر اس کی دھوتی لالی کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے جھٹکا دے کر دھوتی کھینچ لی۔ اس شخص کا نچلا دھڑ برہنہ ہوگیا۔

وہ ٹھٹک کر جہاں تھا وہیں رک گیا۔ لالی نے ہاتھ میں دبی ہوئی دھوتی ایک طرف پھینکی اور اچھل کر اس کی کمر پر زور سے لات ماری۔ وہ گرا اور زمین پر لڑھکتا چلا گیا۔ لالی نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ جلدی سے اس کے سینے پر سوار ہوگیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہ بے



بس ہو کر غیں غیں کرنے لگا۔

لالی نے غصے سے اس کے منہ پر تڑاق سے تھپڑ مارا۔ ڈپٹ کر پوچھا۔ "ہند کی ہے توں؟"

"نہیں جی، میں چوری چکاری نہیں کرتا۔ میں ڈھڈی راج پوت ہوں۔" اس نے ہانپتے ہوئے رک رک کر کہا۔ "میرا ناں اللہ دتا ہے۔"

لالی نے ایک ہاتھ سے پتلون کی جیب ٹٹولی۔ یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ بٹوہ موجود ہے۔ لالی نے اللہ دتا کے گلے پر رکھا ہوا ہاتھ علیحدہ کیا اور اس کے سینے سے اتر کر ایک طرف ہوگیا۔ اللہ دتا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی پگڑی کھل کر نیچے گر گئی تھی۔ دونوں خاموش بیٹھے ہانپتے رہے۔ ذرا دیر بعد اللہ دتا نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے عاجزی سے کہا۔

"میری دھوتی دے دے۔"

"اٹھا لے۔" لالی نے قریب پڑی ہوئی دھوتی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔ "پر بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ تو مجھ سے زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتا۔ میں تجھے ابھی جانے نہیں دوں گا۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "اطمینان رکھ، میں بھاگوں گا نہیں۔" اس نے دھوتی اٹھا کے باندھی اور لالی کے نزدیک آکر بیٹھ گیا۔

لالی نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا۔ "سچ سچ بتا، کیا کرتا ہے تو؟"

"میں جی چاک ہوں۔ داؤد پور کے زمیں دار کے چوکھر اور مویشی چراتا ہوں۔"

"یہ داؤد پور کدھر ہوا؟"

"یہاں سے بہت دور ہے۔" وہ مشرق کی جانب ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "آگے عارف والا روڈ ہے۔ لال ٹبے سے اوپر چلو تو پاک پتن روڈ آجاتی ہے۔ روڈ کے اس پار پنج میل دور داؤد پور ہے۔"

"تب تو بہت دور ہوا۔ تو یہاں کیسے آگیا۔"

"بس جی آہی گیا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "جھنگر کے ادھر علی شاہ ہے۔ میں پہلے اس پنڈ میں مزارع تھا۔"

لالی کو یاد آیا کہ پچھلی رات وہ اسی گاؤں کے کھیتوں سے گزرتا ہوا ادھر آیا تھا۔ اس نے اللہ دتا سے دریافت کیا۔ "تو مزارع تھا۔ کھیتی باڑی چھوڑ کر چاک کیوں بن گیا۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ "مزارع تو زمیں دار بننے کی سوچتا ہے، تو کمی کیسے بن گیا؟"

"گل ایہہ ہے جی، علی شاہ کا زمیں دار نور علی کھوکھر ہے۔ وڈا زمیں دار ہے۔" اس نے بنجر

میدان کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ہزاروں کلّا زمین اسی کی ہے۔"

"پر یہ بنجر کیوں پڑی ہے؟" لالی نے حیرت سے کہا۔ "پاس ہی نہر بھی بہتی ہے۔"

"یہ نہر شہر کہاں ہے جی' یہ تو رانی واہ ہے۔ اس میں تو جی برسات کا پانی آتا ہے۔ کچھ راجباہ بیروالا سے آجاتا ہے۔ اوپر کرم والا میں مہر سلیمان خاں کے باغ ہیں۔ سینکڑوں کلّے پر کھیتی باڑی بھی ہے۔ سارا پانی تو اس کے باغ اور کھیت کھا جاتے ہیں۔ ویسے بھی جی یہ مہر سلیمان کی اپنی نہر ہے۔ پہلے یہاں سک نالا ہوتا تھا۔ اس میں صرف برکھا کا پانی آتا تھا۔ مہر سلیمان نے سک نالہ بیروالا کی وڈی نہر سے ملا دیا۔ آٹھ نو برس ادھر کی بات ہے۔ میرے سامنے ہی یہ سک نالے سے نہر بنی۔ تیں نوں پتہ ہوگا' پہلے زمیں دار اپنی نہریں بنوا سکتے تھے اور آبیانہ بھی نہیں دیتے تھے۔ اب ادھر پچھلے کئی سال سے سرکار نے یہ کنون بنا دیا ہے' کوئی زمیں دار اپنی نہر نہیں بنوا سکتا۔"

"اس وکت تو نہر میں بہت پانی ہے اور اتنی تیزی سے بہہ رہا ہے کہ میں نے پچھلی رات کرم والا میں نہر کے پار جانا چاہا تو دھارے میں بہہ گیا۔ پانی گہرا بھی ہے۔ تیرنا نہ جانتا تو کب کا ڈوب گیا ہوتا۔ گھبرا بھی اتنا گیا تھا کہ ہاتھ میں دبے ہوئے جوتے چھوٹ گئے۔ رات کے اندھیرے میں بہہ کر جانے کدھر چلے گئے۔" اس نے اپنے برہنہ پیروں کو دیکھا۔

"توں اس طرح یہاں پہنچا۔" اللہ دتا نے حیرت کا اظہار کیا۔ "لگتا ہے مہر سلیمان نے نہر کے افسروں سے مل کر بیروالا کی نہر میں شگاف ڈال دیا۔ اس دفعہ کچھ زیادہ ہی چوڑا شگاف ڈالا ہے۔ جبھی تو اتنا بہت سا پانی یہاں تک آگیا۔ بات یہ ہے جی' گرمیوں میں جب نہر سوکھ جاتی ہے تو مہر سلیمان اپنے باغوں اور کھیتوں میں پانی دینے کے لیے ایسا ہی کرتا ہے۔ اس کے خلاف پانی کی چوری پر نہ پرچہ کٹتا ہے نہ کوئی کارروائی ہوتی ہے۔ وہ تو جی جگیر دار ہے۔ سارے ہی وڈے افسروں سے اس کی یاری ہے۔"

"علی شاہ کا زمین دار نور علی کھوکھر بھی تو جگیر دار ہے۔" لالی نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "اس کے پاس بھی ہزاروں ایکڑ زمین ہے۔ سرکاری افسروں سے اس کی بھی یاری ہوگی۔ فیر اس نے اپنی زمیں کیوں بنجر اور کلّر بنا رکھی ہے؟"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ کھوکھر کی بھی افسروں سے یاری ہے۔ اس کا میرا اسمبلی کا ممبر ہے۔ پر کھوکھر اپنی زمین بنجر اور کلّر ہی رکھنا چاہتا ہے۔" اللہ دتا نے سامنے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہاں سے ڈیڑھ میل آگے کلراٹھی ہے۔ وہاں بھٹیاں لگی ہیں۔ ان میں شورہ بنتا ہے۔ اسے اوٹھوں پر لاد کر ٹیشن پہنچایا جاتا ہے۔ فیر ریل گاڑی سے اوکاڑے بھیجا جاتا ہے۔ وہاں بہت وڈا کارخانہ ہے۔



اس میں مشینوں سے شورہ صاف کیا جاتا ہے اور صاف کر کے کلمی شورہ بنا دیا جاتا ہے۔ میں نے جی وہ کارخانہ دیکھا ہے۔"

"تو کیا ادھر کلراٹھی میں بہت کلّر ہے؟"

"بہت زیادہ ہے جی۔" اللہ دتا نے لالی کو بتایا۔ "کلراٹھی کے آس پاس کی ساری زمین اتنی کلّر ہے' جدھر نظر ڈالو' سب کچھ سفید ہی سفید نظر آتا ہے۔ کلراٹھی کے نزدیک کسی پرانی اور اجاڑ بستی کے کھولے اور کھنڈر ہیں۔ اس کی دیواروں پر' زمین پر ہر جگہ اتنا کھارا چڑھتا ہے کہ سارا ہی کھنڈر دور سے کپاس کی ڈھیری دکھائی پڑتا ہے۔ ہر سال یہ سارا کھرچ کر اتار لیا جاتا ہے۔ بھٹیوں میں اس کا شورہ بنایا جاتا ہے اور جی سال گزرتا بھی نہیں کھنڈر' کھارے سے فیر ایک دم سفید پڑ جاتا ہے۔"

"ادھر بہت زیادہ کلّر ہوگا پر یہاں تو اتنا نہیں ہے۔ یہ تو زیادہ تر بنجر ہی زمین ہے۔ یہ کھیتی باڑی کے کام آسکتی ہے۔"

"پر کھیتی باڑی کے لیے پانی بھی تو چاہیے۔ یہ تو نہر کی پونچھڑی ہے۔ تیں نوں پتہ ہے پونچھڑی میں تو پانی ہمیشہ کم ہی پہنچتا ہے۔ تب ہی تو سوکھی پڑی رہتی ہے۔ سارا پانی تو اوپر ہی اوپر ہضم کر لیا جاتا ہے۔ ادھر تو اتنا ہی پانی ملتا ہے کہ علی شاہ یا ایسے دو چار اور پنڈ اس نہر کے کنارے آباد ہو سکتے ہیں۔ پر بنجر زمین بھی بالکل بیکار نہیں جاتی۔ اس پر لانے کے بوٹے اگتے ہیں اور ادھر تو کاؤگان لانا اور پھوگ کے بوٹے ہوتے ہیں۔ آگے جاؤ تو بہت نظر آئیں گے۔ تو نے لانے کا بوٹا دیکھا ہے؟"

"دیکھا تو ہے۔ یہ بھی پتہ ہے' لانا کے بوٹے سے سجّی بنتی ہے اور سجّی سے کپڑے لتے دھو کر صاف کیے جاتے ہیں۔"

"کاؤگان لانا سے بہت زیادہ سجّی نکلتی ہے۔" اللہ دتا نے پوچھا۔ "تو نے کبھی سجّی دیکھی ہے؟ میں تجھے بتاتا ہوں' سجّی کیسے بنتی ہے۔ سجّی بنانے کے لیے لانے کے بوٹے جڑ کے پاس سے کاٹ لیے جاتے ہیں۔ زمین میں گڑھا کھود کر کٹے ہوئے بوٹے اس طرح بھر دیے جاتے ہیں کہ اوپر تک ڈھیری بن جاتی ہے' ڈھیری میں آگ لگا دی جاتی ہے۔ پتیاں جل جاتی ہیں اور ڈنٹھلوں سے رس بہہ بہہ کر نیچے گڑھے میں جمع ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈا پڑ کر ایسا جم جاتا ہے کہ پتھر کی طرح سخت لگتا ہے۔ سجّی اسی طرح بنتی ہے' پر کلراٹھی کے پاس تو سجّی بنانے کی بھٹیاں لگی ہیں۔ ڈھیروں سجّی روزانہ بنتی ہے۔ کچا شورہ بھی اتنا ہی ڈھیر کا ڈھیر ہر روز تیار ہوتا ہے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کچے شورے اور سجّی سے کھوکھر کو بہت زیادہ آمدنی ہوتی ہوگی۔ جبھی تو اس نے اتنی بہت سی زمین کلّر اور بنجر بنا رکھی ہے۔"

"ایسا ہی ہو گا جی۔ میں نوں ٹھیک سے پتہ نہیں۔"

لالی نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "تو نے علی شاہ کیوں چھوڑ دیا؟ تو مزارع تھا نا؟"

"مزارع ہی تھا پر کچھ ایسا چکر چلا میں نوں پنڈ چھوڑنا پڑا۔"

"کوئی خاص بات ہو گئی؟"

"یہ نہ پوچھ۔ یوں سمجھ کیا نہیں ہوا۔" اللہ دتا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اپنا تو سبھی کچھ تباہ ہو گیا۔ میرے ساتھ چھوٹا بھائی اللہ دینو بھی تھا۔ دو ہل تھے۔ سولاں کلّے سے اوپر زمین پر اپنے کھیت تھے۔" اس کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیلنے لگے۔ "سچ پوچھ تو اس کلراٹھی نے اپنا ناس مار دیا۔ پہلے اس کا مالک سردار سنتوکھ سنگھ ہوتا تھا۔ بہت زور آور جوان تھا۔ رہتا تو ادھر کھوکھراں میں تھا پر روز ہی اپنی سفید گھوڑی پر بیٹھ کر کلراٹھی آتا تھا۔ علی شاہ بھی آتا جاتا رہتا تھا۔ کلراٹھی پر کام کرنے کے لیے ادھر سے مزدور بھی لے جاتا تھا۔ فصل پکنے لگتی تو پنڈ کے مزارعے بھی کمّیوں کے ساتھ کلراٹھی پر کام کرنے آتے۔ سنتوکھا مزدوری بھی چنگی دیتا تھا۔ شام کو جب چٹّھا بٹتا تو منشی کے ساتھ خود بھی موجود ہوتا تھا۔ اس نے کبھی کسی کی مزدوری نہیں ماری اور نہ مزدوری پر جھگڑا کیا۔"

"تو نے بھی کلراٹھی پر مزدوری کی ہے؟"

"کی تو ہے' پر جی وہاں کام کرنے سے مجھے ایسی کھانسی ہو گئی تھی کہ کھانستے کھانستے رات جاگتے ہوئے کٹتی۔ وہ ایسا ہے جی' کلر کھودتے ہوئے کھارا ایسے اڑتا ہے جیسے دھواں ناک میں گھس کر اندر چلا جاتا ہے۔ اسی لیے منہ پر منڈاسا باندھ کر کلراٹھی پر کام کرنا پڑتا ہے۔ فیر بھی بہت کھانسی آتی ہے۔ کتنے ہی مزدوروں کو دمہ ہو گیا۔" اللہ دتا چند لمحے چپ رہا۔ "پاکستان بنا اور فسادات ہوئے تو سنتوکھ سنگھ بھی بھاگ کر سرحد پار چلا گیا۔ کلراٹھی پر مہینوں کام بند رہا۔ نور علی کھوکھر بھی کھوکھراں ہی میں رہتا ہے۔ وہاں اس کی حویلی ہے۔ سردار سنتوکھ سنگھ کے جانے کے بعد کھوکھر نے افسروں سے مل کر ایسا چکر چلایا کہ کلراٹھی اور سنتوکھ سنگھ کی ساری زمین اس کے کبضے میں چلی گئی۔ یہ بنجر اور کلّر زمین پہلے سنتوکھ سنگھ ہی کی ہوتی تھی۔"

"سنتوکھے نے بھی بنجر زمین پر کھیتی باڑی کی کوشش نہیں کی؟"

"اس کی زمین کئی میل آگے ہے۔ ادھر بالکل پانی نہیں۔ کنواں کھودو تو بہت زیادہ گہرائی میں جا کر پانی ملتا ہے۔ چند ہی برسوں میں سوکھ کر ڈل بن جاتا ہے۔ پر کلراٹھی جب کھوکھر کے کبضے میں آئی تو علی شاہ کے مزارعوں اور کمّیوں کے لیے مصیبت آ گئی۔ کھوکھر نے سب سے وگار لینی شروع کر دی۔ پہلے پہلے تو تھوڑی بہت مزدوری بھی دیتا تھا' فیر وہ بھی بند کر دی۔ پنڈ والوں نے گلہ کیا۔ کئی



نے تو کلراٹھی پر کام کرنے سے انکار بھی کر دیا۔ فیر تو جی کھوکھر ایسا ناراض ہوا' جس جس نے انکار کیا' اسے زمین سے بے دخل کرنا شروع کر دیا۔"

"تو نے بھی کلراٹھی پر کام کرنے سے انکار کر دیا تھا؟"

"ہاں جی' میں نے بھی انکار کر دیا تھا۔ ایک تو وگار کرنی پڑتی تھی۔ اوپر سے مجھے کھانسی بھی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بے دخل کرنے کے لیے طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میرے مویشی اور چوکھر اٹھوا لیے۔ ربیع کی واڈھو فصل بھی کٹوا کر اٹھا لے گیا۔ میں نے تھانے میں اس کے منشی اور کرندوں کے خلاف پرچہ چاک کرایا تو پولیس نے الٹا میرے خلاف مویشی چوری کا مکدمہ بنا دیا اور مجھے جیل میں بند کر دیا۔ چار مہینے سے بھی زیادہ مکدمہ چلا۔ میں چھوٹ گیا۔ پر ہفتہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ کھوکھر نے میری گھر والی کو اٹھوا لیا اور کھوکھراں میں اپنی حویلی کے اندر بند کر دیا۔ اس وکھت میرے دو چھوٹے چھوٹے نکّے تھے۔ ماں کے بنا روتے تھے' مچلتے تھے' ضد کرتے تھے۔ اللہ دینو کا ویاہ نہیں ہوا۔ گھر میں کوئی زنانی نہیں تھی جو بچوں کی دیکھ بھال کرتی' روٹی پکا کر کھلاتی' مویشیوں اور چوکھروں کا سویرے پٹھا دھتا کرتی' دوپہر کو کھیت پر بھتّا پہنچاتی۔ میں تو جی گھر والی کے بنا بالکل تباہ ہو گیا۔ وہ تو میرا بازو ہے۔"

"تو نے پولیس میں پرچہ چاک نہیں کرایا؟"

"ایک بار کرایا تھا تو چار مہینے جیل میں بند رہا۔" اللہ دتا کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "اس دفعہ نہ جانے کتنے جھوٹے مکدمے میرے خلاف بنائے جاتے۔ اس ڈر سے میں نے پرچہ شرچہ تو چاک کرایا نہیں۔ کھوکھر کو سفارشیں پہنچائیں پر اس نے کسی کی نہ مانی۔ اس چکر میں ڈیڑھ سال گزر گیا۔ میری گھر والی کھوکھر کی حویلی میں تھی۔ اس کے ایک بچہ بھی ہو چکا تھا۔ میں ہر طرف سے مایوس ہو کر آخر ایک روز خود اس کے پاس کھوکھراں گیا۔ پگڑی اتار کر اس کے پیروں پر ڈال دی۔ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔ "زمیں دار! میرا بازو مجھے واپس دے دے۔ پہلے تو وہ بہت گرم ہوا۔ دیر تک گالاں نکالتا رہا۔ میں نے منت سماجت کی تو اس نے گھر والی کی واپسی کے تین ہزار روپے مانگے اور دو ہفتے کی مہلت دی۔ میں پہلے ہی تباہ ہو چکا تھا۔ اتنی زیادہ رکم کہاں سے لاتا۔"

"دوبارہ کھوکھر کے پاس جاتا۔ اس کے فیر پیر پکڑ لیتا۔"

"یہی کیا جی۔ اس دفعہ اس نے گھر والی کو واپس کرنے کی یہ شرط لگائی کہ مجھے اور اللہ دینو کو سال بھر تک کلراٹھی پر وگار کرنی پڑے گی۔ میں نے اللہ دینو سے بات کی۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے' جھٹ تیار ہو گیا۔ میں نے کھوکھر سے وگار کرنے کی ہامی بھر لی۔ اس طرح مجھے اپنا بازو واپس مل

گیا۔"

لالی نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ "آگے کیا ہوا؟"

"آگے کیا ہونا تھا جی۔ کھوکھر نے کلراٹھی کے پاس اپنی جیل بنا رکھی ہے۔ مجھے اور اللہ دیتو کو اس میں ڈال دیا گیا۔ دن بھر ہم دونوں بھائی کلراٹھی پر کام کرتے اور شام کو دوسرے کیدی مزدوروں کے ساتھ بند کردیے جاتے۔ دیواریں اتنی اونچی ہیں انھیں کوئی پھاند نہیں سکتا۔ صرف ایک دروازہ ہے اور اس پر تالا ڈال دیا جاتا ہے۔ باہر راکھے رےفل سنبھالے کڑی نگرانی کرتے ہیں۔ فیر بھی کیدی مزدور جب تک اندر رہتے ہیں' دو کیدیوں کے ایک ایک پیر ملا کر پنڈلیوں میں لوہے کے کڑے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ درمیان میں ہاتھ بھر لمبی زنجیر ہوتی ہے۔ کڑوں میں تالے پڑے ہوتے ہیں اور ان کی چابیاں راکھوں کے انچارج کے پاس رہتی ہیں۔ ان پر نمبر پڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح جی ایک زنجیر کے دونوں کیدی ایک ساتھ لیٹتے ہیں' ایک ساتھ اٹھتے ہیں' ایک ساتھ سوتے ہیں۔ ایک کروٹ بدلے تو دوسرا جاگ اٹھتا ہے۔ ایک کو ٹٹی پیشاب لگے تو دوسرے کو بھی ساتھ ساتھ جانا پڑتا ہے' ساتھ ساتھ بیٹھنا پڑتا ہے۔ اسی لیے کیدیوں میں روز جھگڑا ہوتا ہے' مارکٹائی ہوتی ہے۔ جب دنگا زیادہ ہوتا ہے تو راکھے اندر آکر دونوں ہی کیدیوں کو ٹھڈے مارتے ہیں۔"

لالی نے تشویش کا اظہار کیا۔ "یہ تو سرکاری جیل سے بھی زیادہ کڑی سزا ہوئی۔"

"نہ پوچھ میں نے اٹھ مہینے کس طرح کلراٹھی پر گزارے۔" اللہ دتا نے گہری سانس بھری۔ "دن بھر مویشیوں اور چوکھروں کی طرح بھٹیوں پر کام کرنا پڑتا۔ کھدائی کرنی ہوتی۔ راکھے چمڑے کے لمبے لمبے چھانٹے اور کوڑے ہاتھوں میں دبائے شکاری کتوں کی طرح مزدوروں کو تاکتے رہتے ہیں۔ کسی نے ذرا سستی سے کام لیا' راکھا جھپٹ کے اس پر سڑاک سڑاک چھانٹے لگاتا ہے۔ میری کمر دیکھ۔"

اس نے کرتا الٹ کر اپنی پیٹھ برہنہ کردی۔ اس کی کمر اور پیٹھ پر اب تک سیاہ اور بھوری لکیریں موجود تھیں۔ "یہ لاسے' چھانٹوں کے نشان ہیں۔ کھارے میں کام کرنے سے مجھے کھوکھری بھی ہوگئی تھی۔ بار بار کھانستا۔ دن کا تو کچھ نہیں تھا پر رات کو کھانستا تو دوسروں کی نیند خراب ہوتی۔ وہ نراض ہو کر گالاں نکالتے۔ میں جب کلراٹھی پر وگار کرتا تھا تو ۵۲ کیدی مزدور تھے۔ شام کو ان کی گنتی ہوتی تھی اور بند کرنے سے پہلے ہی روٹی کھلادی جاتی تھی۔"

"سارے کیدی تیرے ہی پنڈ کے تھے؟"



"نہیں جی' اپنے پنڈ کے تو اس وکھت اٹھ کیدی تھے اور ان میں ہم دونوں بھائی بھی شامل تھے۔ کھوکھر جس مزارعے یا کمّی سے نراض ہوتا ہے اسے کلراٹھی میں وگار پر لگا دیتا ہے۔ کھوکھر بہت وڈا زمیں دار ہے۔ اس کے اور بھی کئی پنڈ ہیں۔ ہزاروں کلا زمیں داری ہے اور اب تو جی ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی زمینوں پر کبضہ کر کے اس نے اپنی زمیں داری بہت بڑھالی ہے۔ اس کی پوری جگیر ہے جی۔ لہور میں کوٹھی بنوا رہا ہے۔ یہ لمّی موٹر خریدی ہے۔ دو پتر ولایت پڑھنے بھیجے ہیں۔ بہت عیش ہیں جی اس کے۔"

"کلراٹھی کی جیل میں تیری گھر والی تجھ سے ملنے نہیں آئی؟"

"کیدی مزدوروں سے کسی کو ملنے کی بالکل اجازت نہیں۔" اللہ دتا نے جواب میں مطلع کیا۔ "کسی کو ان کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں جاتا۔ انھیں پکڑ کر رات کے اندھیرے میں اوٹھ پر بٹھا کر کلراٹھی میں لایا جاتا ہے اور جیل میں بند کردیا جاتا ہے۔ ان کے گھر والوں کو بالکل پتہ نہیں چلتا وہ کہاں گئے؟ میری گھر والی کو بھی دو ہفتے تک میرے اور اللہ دیتو کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا' ہم دونوں کہاں ہیں؟ وہ نور علی کھوکھر کی حویلی پر گئی' پر وہ اسے نہیں ملا۔ فیر وہ اس کے منشی دلاور لنگاہ کے پاس گئی۔ وہ اسے لارے لپے دیتا اور رات کو اپنے پاس بلا لیتا۔ ایک روز اس نے شراب پی رکھی تھی۔ اس رات میری گھر والی اس کے پاس تھی۔ لنگاہ نے نشے میں مست ہو کر بتادیا کہ مجھے اور اللہ دیتو کو کلراٹھی کی جیل میں رکھا گیا ہے۔ پر وہ ہم دونوں کو چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔"

"اللہ دتا! تجھے تو کھوکھر نے سال بھر کے لیے وگار پر کید میں ڈالا تھا۔ تو چار مہینے پہلے کیسے باہر نکل آیا؟"

"جب میں نے تجھے سبھی کچھ بتادیا' تو ایہہ گل بھی سن لے۔" اللہ دتا نے جواب دیا۔ "علی شاہ یہاں سے نزدیک ہے۔ کلراٹھی کے راکھے کبھی کبھار وہاں جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک راکھے میران خاں سے میری گھر والی نے میل جول پیدا کرلیا۔"

لالی نے ہنس کر کہا۔ "یاری لگالی ہوگی۔"

"ایسی ہی گل تھی۔" اللہ دتا نے جھینپ کر نظریں جھکالیں۔ "پر میران کے ذریعے وہ چپکے چپکے مجھے گھیور' مرونڈے اور حلوہ پکا کر بھجوا دیتی' میں اور اللہ دیتو چھپ چھپ کر کھا لیتے۔"

"دوسرے بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے؟ ایسے ہی جیسے سرکاری جیلوں میں باہر سے چوری چھپے سامان اندر آجاتا ہے۔"

"ایسا ہوتا تو ہوگا پر مجھے پتہ نہیں۔ اب اگے کی سن۔ ایک رات ڈیوٹی پر میران خاں اکیلا رکھوالی پر تھا۔ دوسرے روز عید کی چھٹی تھی۔ کام بند تھا۔ کلراٹھی پر چار راکھے تھے۔ ان میں سے تین شام کو کام بند ہوتے ہی اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ میران خان کا گھر میاں والی میں تھا۔ اس لیے وہ ٹھیر گیا۔ یہ بات اس نے میری گھروالی کو بتا دی تھی اور اسے رات کو کلراٹھی پر اپنے پاس بلایا۔ اندھیرا ہوتے ہی وہ اس کے پاس پہنچ گئی۔ آدھی رات تک اس کے ساتھ رہی۔ پنج سو روپے رشوت بھی دی تاکہ وہ مجھے چھوڑ دے۔"

"لگتا ہے' تیری گھروالی بہت تیز ہے۔ سوہنی بھی ہوگی۔"

اللہ دتا اس کی بات نظرانداز کر کے بولا۔ "فیر ایسا ہوا جی' آدھی رات کے بعد میران خان اندر آیا۔ اس رات اس نے مجھے اور میرے ساتھی کیدی کو کونے والی کوٹھڑی میں سلایا تھا۔ کیدیوں کو راکھے اپنی مرضی کی جگہ سلاتے ہیں اور سونے سے پہلے ان کے معائنے پر بھی آتے ہیں۔ ان کی گنتی بھی کرتے ہیں۔ اس وکھت سارے کیدی بے خبر سو رہے تھے۔ کئی کوٹھڑیوں میں اور کئی کوٹھڑیوں کے باہر دلان میں سو رہے تھے۔ میران خان میری کوٹھڑی میں آیا۔ چپکے سے میرے کڑے کا تالا کھولا' کڑا پیر سے نکال دیا' آہستہ سے جھنجوڑ کر مجھے جگایا۔ میں نے گھبرا کر بولنا چاہا تو اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرا پیر ہلا کر بتایا' کھلا ہوا ہے۔ کوٹھڑی میں اتنا اندھیرا تھا کہ میں میران خان کو پہچان نہیں سکا۔ وہ کوٹھڑی سے باہر چلا گیا اور میں دم سادھے پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے آہستہ سے کروٹ لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ والا گہری نیند سو رہا تھا۔ میں کوٹھڑی سے باہر آیا۔ دلان سے گزر کر وہڑے میں گیا اور دبے دبے چلتا ہوا دروازے پر پہنچا۔"

"تیں نوں پتہ تھا دروازہ کھلا ہے؟"

"ہاں جی' میں نوں اسی وکت کچھ اندازہ ہوگیا تھا جب میرے پیر کا کڑا کھولا گیا تھا۔" اللہ دتا نے بتایا۔ "میرا وچار ٹھیک نکلا۔ میں نے باہر والے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھل گیا۔ میں باہر نکلا۔ گھروالی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میران خاں دروازے کا تالا بند کرنے لگا اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ کلراٹھی سے نکل کر پنڈ پہنچے' بچوں کو ساتھ لیا' ضرورت کا سامان گٹھڑی میں باندھا اور نکل کھڑے ہوئے۔ سویرا ہونے تک ہم پنڈ سے بہت دور نکل جانا چاہتے تھے۔"

"تیری گھروالی نے بتایا' اس نے تجھے کس طرح چھڑایا؟"

"اس نے رستے میں مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے میران خاں سے اس کی یاری کی گل سنی تو بہت گرم ہوا۔ وہ بھی گرم ہوگئی' بگڑ کر بولی۔ زمیں دار کے پاس جب میں ڈیڑھ برس سے بھی اوپر



رہی اور حرام کا ٹکا بھی جن کر ساتھ لائی تب توں نے کچھ نہ کہا۔ اب میں نے تجھے چھڑانے کے لیے میران سے یاری لگالی تو ناراض کیوں ہوتا ہے؟"

"گل تو اس نے ٹھیک ہی کہی تھی۔" لالی ہنس کر بولا۔ "پر تونے اپنے بھائی اللہ دینو کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کا کیا بنا؟"

"وہ جی' ابھی تک کلراٹھی کی جیل میں ہے۔ نور بخش کھوکھر نے اسے سال بھر بعد بھی نہیں چھوڑا۔ وہ میرا بدلہ اس سے لے رہا ہے۔" اللہ دتا نے لالی کو مطلع کیا۔ "وہ ایسا ہوا جی کہ اللہ دینو اور میں شروع میں رات کو ایک ہی زنجیر سے پیروں میں کڑے ڈال کر جکڑ دیئے جاتے پر بعد میں ہم دونوں کو الگ الگ کیدیوں کے ساتھ کر دیا گیا۔ میں نے جیل سے باہر آنے کے بعد میران خاں کی بہت منت کی۔ گھروالی نے بھی اس کو منانے کی کوشش کی پر وہ کسی طرح اللہ دینو کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوا۔ بلکہ میرے گڑگڑانے پر ایک دم بھڑک اٹھا۔ ایسا ناراض ہوا کہ مجھ پر بندوک تان کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اسے اتنا گرم دیکھا تو ڈر گیا۔ بات یہ ہے کلراٹھی کے سارے ہی راکھے بہت ظالم اور خوں خوار ہیں۔ میران خاں تو سب سے زیادہ ظالم اور خونی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' ایک کیدی کو جھگڑا کرنے پر میران خاں نے گولی سے اڑا دیا۔ ڈز ڈز فیر کیے۔ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ وہ گھبرو جوان تھا۔ کچھ دیر اپنے ہی خون میں پڑا تڑپتا رہا۔ فیر اس نے دم توڑ دیا۔ کسی نے ڈر کے مارے اس کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ سب اپنا کام کرتے رہے۔"

"کسی کیدی نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی؟"

"دو نے ایسی کوشش کی تھی۔ ان میں سے ایک تو بھاگتے ہوئے راکھوں کی گولیوں سے مارا گیا۔ دوسرا نکل گیا۔ مگر راکھے بعد میں اسے بھی پکڑ لائے اور گولی مار کر اس کا بھی خون کر دیا۔ جو بھی راکھوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے' اسے کلراٹھی سے کچھ دور گڑھا کھود کر دبا دیتے ہیں۔ نہ اس پر کفن ڈالا جاتا ہے نہ اسے نہلایا جاتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں چپ چاپ زمین میں گاڑ دیتے ہیں۔ میرے سامنے تین کیدی مارے گئے۔"

"اللہ دینو کے بارے میں تیں نوں پتہ ہے' وہ زندہ ہے؟" لالی نے پوچھا۔

"ہن جی' یہ تو پتہ ہے۔ ویسے وہ ہے تو تکڑا جوان' پر اسے غصہ کم ہی آتا ہے۔ ویسے بھی سارے ہی کیدی راکھوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ جیسا راکھے کہتے ہیں' ویسا ہی کرتے ہیں۔ ہر بات چپ کر کے مان لیتے ہیں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "زمیں دار تو میرے سامنے کبھی کلراٹھی پر نہیں آیا' پر اس کا منشی دلاور لنگاہ ہفتے میں ایک بار دورے پر ضرور آتا ہے۔"

"یہ بتا' تونے اللہ دینو کو چھڑانے کے لیے کیا کیا؟"

"نہ پوچھ' کیا نہیں کیا۔ میں نے پولیس میں پرچہ چاک کرایا۔ اس پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی تو اوپر درخواستیں لگائیں' چٹھیاں بھیجیں' خود شہر گیا۔ افسروں کے سامنے گڑگڑایا' فریاد کی پر کچھ بھی نہ بنا۔ نور علی کھوکھر کو ان باتوں کا پتہ چل گیا۔ اس نے مجھ پر حملہ کرادیا۔ میں ان دنوں نیلا ڈوبا میں تھا۔ علی شاہ چھوڑ کر وہیں چلا گیا تھا۔ ادھیارے پر نو کلّا زمین لے لی تھی۔ اس طرح میں باہی بن گیا۔ ادھیارے کی پہلی فصل خریف کی تھی۔ میں نے بڑی محنت کی۔ پھٹی اور کماد بہت چنگی رہی۔ فصل تیار کھڑی تھی۔ پھٹی کی چنائی شروع ہونے والی تھی۔ میں نے چنائی کے لیے چوگیوں سے بات بھی کرلی تھی۔ لو جی' ایک رات کھوکھر کے کرندے رائفلوں اور برچھیوں سے مسلح ہو کر نیلا ڈوبا پہنچے۔ سردی تو اس رات زیادہ نہیں تھی۔ پر دھند بہت تھی۔ انھوں نے پنڈ میں گھستے ہی اندھا دھند گولیاں چلانی شروع کردیں۔ پر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی میں نے گھروالی کا ہاتھ پکڑا اور گھر سے نکل کر مکئی کے کھیت میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہ دروازہ توڑ کر گھر میں گھس گئے اور توڑ پھوڑ کر کے چلے گئے۔ جاتے جاتے میری واڈھو فصل کو آگ لگادی' گھر کو نہیں لگائی۔ اس میں تینوں بچے تھے' جل کے راکھ ہوجاتے۔ میں نے تب نیلا ڈوبا چھوڑ دیا اور اپنے ایک شریکے کے پاس داؤد پور چلا گیا۔ نیلا ڈوبا نہ چھوڑتا تو کھوکھر مجھے جان سے ماردیتا۔"

"جب یہ بات ہے تو ادھر کیسے آگیا؟"

"میں جی اللہ دینو کو چھڑانے آیا ہوں۔ کل کلراٹھی پر کام بند رہے گا۔ آج رات بھی ایک ہی راکھا ڈیوٹی پر رہے گا۔"

"پر کل تو عید نہیں ہے۔ کلراٹھی پر چھٹی کیسے ہوگئی؟"

"کل رات نور علی کھوکھر کی ماں کی موت ہوگئی۔ اس لیے کلراٹھی پر دو روز کام بند رہے گا۔ یہ بات مجھے کل سویرے کلراٹھی کے ایک راکھے کے ذریعے ملوم ہوگئی۔"

"وہ راکھا میران خاں ہوگا؟"

"نہیں جی' میران خاں کو تو کھوکھر نے نوکری سے نکال دیا۔ اسے تو کلراٹھی چھوڑے ہوئے بھی دو مہینے سے اوپر ہوگئے۔ پتہ نہیں کہاں گیا۔ مجھے کلراٹھی کا جو راکھا ملا تھا' اس کا ناں طور محمد لکھیرا ہے۔ آج رات وہ اکیلا کلراٹھی کی رکھوالی کرے گا۔ دوسرے راکھے شام کو اپنے گھروں کو چلے جائیں گے۔"

لالی نے اسے چھیڑا۔ "آج بھی تو اپنی گھروالی کو ساتھ لایا ہوگا؟"



"ناجی' ایسی کوئی گل نہیں۔" اللہ دتا نے انکار میں گردن ہلائی۔ "طور محمد لکھیرا ایک ہزار روپے لے کر اللہ دینو کو چھوڑنے پر راضی ہوگیا ہے۔ طور محمد لکھیرا خود بھی کلراٹھی چھوڑ کر بھاگنا چاہتا ہے۔ ہزار روپے مل گئے تو وہ آج ہی بھاگ جائے گا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کا چہرہ افسردہ ہوگیا۔ "تو جانتا ہے' میرے پاس اب کچھ بھی نہیں رہا۔ چوکھر چرانے والا غریب چاک ہوں۔ ہزار روپیہ کہاں سے لاتا۔ جب کچھ بن نہ پڑا تو گھروالی کو داؤد پور کے سنار کے پاس سرگانے پر رکھ کر ہزار روپیہ ادھار لیا۔ تیں نوں تو پتہ ہی ہے' جب تک ادھار ادا نہ ہوگا تب تک وہ اس کے گھر میں ویگار کرے گی۔ ہر طرح کا کام کرے گی۔ یوں سمجھو اس کے پاس گروی رہے گی۔ کیا کریں جی' اللہ دینو کو رہائی دلانی بھی تو ضروری ہے۔ وہ اہری اور محنتی ہے۔ وہ آگیا تو ہم دونوں بھائی محنت کر کے گھروالی کو سال بھر میں ادھار ادا کر کے سرگانے سے چھڑا کر واپس لے آئیں گے۔"

لالی نے اس کی بات نظرانداز کرکے پوچھا۔ "تو کبھی جہانگیرہ گیا ہے؟"

"کیوں نہیں گیا۔ سڑک کے ساتھ ہی ہے۔ وہاں میرا ایک پچیرا رہتا ہے۔ میں تو جہانگیرہ کے لمبردار ملک اللہ نواز خاں کو بھی جانتا ہوں۔ ویسے تو اس کی کوم کھٹیانہ ہے' پر اس کا پیو خوشاب سے ملکوں کی کڑی ویاہ لایا تو خود ملک بن گیا اور اس کا پت تو بالکل ملک بن گیا۔ یہ لمے طرے کی پگ لگاتا ہے۔ گھوڑی پر بیٹھ کر ایسی آکڑ کے ساتھ نکلتا ہے جیسے بہت وڈا زمیں دار ہے۔ تیں نوں پتہ نہیں وہ زبردست رسا گیر ہے اور جب سے اس کا ایک بھرا تھانے دار لگ گیا ہے' اس وکت سے تو وہ ایسا نڈر ہوگیا کہ کھلم کھلا رسا گیری کا دھندا کرتا ہے۔ میں تجھے اس کے بارے میں ایک گل بتاؤں۔"

"نہ بتا تو ٹھیک ہے۔" لالی جہانگیرہ کے زمیں دار ملک اللہ نواز کے ذکر سے بے زار ہو کر بیچ میں بول پڑا۔ "یہ بتا' داؤد پور سے جہانگیرہ کتنی دور ہے؟"

"باراں میل سے زیادہ نہیں ہوگا۔ پر تسیں جہانگیرہ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟ تیں نوں تجھے وہاں جانا ہے؟"

"ہاں میں نوں وہاں جانا ہے۔ مجھے جہانگیرہ پہنچا دینا' میں ہزار روپے رشوت دیئے بنا اللہ دینو کو نکال لاؤں گا۔ اللہ دینو کو بھی اپنے ساتھ لے جانا اور ہزار روپے سرگانے کے دے کر اپنی گھروالی کو لے آنا۔ وہ سرگانے پر گروی نہیں رہے گی۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" اللہ دتا نے حیرت سے منہ پھاڑ کر کہا۔ "تیری گل بالکل سمجھ نہیں آئی۔"

"آبھی نہیں سکتی۔" لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اسے مجھ پر چھوڑ دے۔"

اللہ دتا نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

☆

فراش کے گھنے درختوں کے نیچے روشنی دھندلی تھی۔ آس پاس جھنگر تھا جو دور تک چلا گیا تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ سامنے چٹیل میدان تھا، جس پر تیز دھوپ پھیلی تھی۔ میدان کے آخری سرے پر اونٹوں کی قطار گرد کے بادل اڑاتی گزر رہی تھی۔ اونٹوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی پیتل کی گھنٹیاں آہستہ آہستہ جھنکار رہی تھیں۔

اللہ دتا نے لالی کو مخاطب کیا۔ "یہ اونٹھ دیکھ رہا ہے۔ لگتا ہے، کلراٹھی سے آ رہے ہیں۔ ان پر کچا شورہ لاد کر ٹیشن بھیجا جا رہا ہے۔ وہاں کھوکھر کا منشی ہو گا۔ وہ ریل سے اوکاڑے بھیج دے گا۔ وہاں کارخانے میں اسے صاف کیا جائے گا۔"

مگر لالی کو شورے سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے سویرے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ اسے سخت بھوک لگی تھی۔ اس نے اللہ دتا سے پوچھا۔

"تو یہاں کب آیا تھا؟"

"سویرے ہی آ گیا تھا۔ میں نے تجھے دیکھا تھا۔ دو تین بار نزدیک سے گزرا، توں بے خبر سو رہا تھا۔ میں سمجھا کوئی تجھے مار کر یہاں ڈال گیا ہے۔ تیرے ہاتھ کی گھڑی دیکھ کر میں نوں لالچ آ گیا۔" اس نے شرمندہ ہو کر نظریں جھکا لیں۔ "معاف کرنا جی، غلطی ہو گئی۔ میں تو یہاں چھپنے کے لیے آیا تھا۔"

"پر تو نے صبح سے کچھ کھایا نہیں۔ تجھے بھوک نہیں لگی؟"

"لگ تو رہی ہے، گھر سے روٹی لایا تھا۔" اس نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "ادھر جھنگر میں چدر سے باندھ کر رکھ دی ہے۔"

"یہ چنگا کام کیا۔ میں تو تجھے علی شاہ بھیجنے والا تھا، وہاں سے جا کر روٹی شوٹی لے آ۔"

"نہیں جی، علی شاہ جانا ٹھیک نہیں۔ وہاں گیا تو کھوکھر کو پتہ چل جائے گا۔ سارے کمی اور مزارعے اسی کے بندے ہیں۔ کسی نے کھوکھراں جا کر اسے میرے بارے میں بتایا تو وہ چوکنا ہو جائے گا۔ فیر تو اللہ دینو کو نکال لانا مشکل ہو جائے گا۔ وہ ضرور اپنے کسی کرندے کو شام سے پہلے پہلے کلراٹھی پر بھیج دے گا۔ میں تو کہتا ہوں جی، علی شاہ میں کسی کو بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے۔"

"اب باتیں چھوڑ، جا کر روٹی ٹکر لا۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں نوں سخت بھوک لگی ہے۔ میں بھی تیرے ساتھ کچھ کھا لوں گا۔"



"پروا نہ کر۔ روٹی اتنی ہے، دونوں کھا سکتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "پینے کو ٹین کے ڈبے میں پانی بھی ساتھ لایا ہوں۔ نہر کا تو میں نوں پتہ ہی نہیں تھا اس میں پانی ہو گا۔ آج کل تو بالکل سوکھی رہتی ہے۔"

اللہ دتا اٹھ کر درختوں کے نیچے چلنے لگا۔ کچھ دور جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد اللہ دتا ایک گھنے درخت کی آڑ سے نمودار ہوا۔ قریب آیا تو اس کے ہاتھ میں پوٹلی اور ٹین کا ڈبا لٹک رہا تھا۔

وہ لالی کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے چادر کھولی۔ اندر سے چار موٹی موٹی روٹیاں نکلیں۔ ان کے ساتھ چنے کی نرم کونپلوں کا پکایا ہوا پلی کا ساگ اور پیاز کی دو گٹھیاں تھیں۔ اللہ دتا نے مسکرا کر روٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ گوگیاں ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے ہی پکائی تھیں۔ کیا کریں جی، گھر والی تو ہے نہیں۔ خود ہی روٹی پکانی پڑتی ہے۔"

لالی نے کچھ نہیں کہا، لقمہ توڑا اور ساگ ملا کر کھانے لگا۔ اللہ دتا بھی کھانے لگا۔ روٹی باسی تھی۔ سخت بھی تھی، مگر دونوں بہت بھوکے تھے۔ اطمینان سے بیٹھے کھاتے رہے۔ نوالہ حلق میں پھنستا تو ڈبا منہ سے لگا کر پانی پی لیتے۔ چار روٹیوں میں دونوں کا پیٹ بھر گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اللہ دتا نے پوچھا۔ "یہ تو بتایا نہیں توں طور محمد لکھیرا کو ہزار روپے دیئے بنا اللہ دینو کو کیسے نکال لائے گا؟"

"اندھیرا ہو جانے دے۔ میں تیرے ساتھ کلراٹھی چلوں گا۔" لالی نے جواب دیا۔ "وہاں جا کر آس پاس کا معائنہ کروں گا۔ جیسا تجھ سے کہوں ویسا ہی کرنا۔"

"پر یہ جان لے۔ راکھے کے پاس بھری ہوئی رائفل رہتی ہے۔" اللہ دتا کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں منڈلانے لگی۔ "کوئی گڑبڑ ہو گئی تو دونوں مارے جائیں گے۔"

"حوصلے سے کام لے۔" لالی نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ "پروا نہ کر، سب ٹھیک ہی ہو گا۔"

"توں پولسیا تو نہیں ہے؟" اللہ دتا نے لالی کی ملگجی پتلون اور بش شرٹ غور سے دیکھی۔ "لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔"

"نہیں جی، میں پولسیا سلسیا نہیں ہوں۔ خاماخا کی باتیں سوچنا چھوڑ۔ اب توں آرام کر اور اندھیرا پھیلنے کا انتظار کر۔"

اللہ دتا نے زمین پر چادر پھیلا دی۔ دونوں اس پر لیٹ گئے۔ لالی ذرا دیر آنکھیں بند کیے پڑا رہا، پھر اسے نیند آ گئی۔

دن ڈھلنے لگا۔ سورج رفتہ رفتہ مغرب میں اترنے لگا۔ دھوپ کی رنگت بدلنے لگی۔ سائے طویل ہوتے گئے۔ فراش کے درختوں کے نیچے اندھیرا پھیلنے لگا۔ جھاڑیوں میں چڑیوں نے شور مچانا شروع کردیا۔

شام کی آمد آمد تھی۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اللہ دتا موجود نہیں تھا۔ لالی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر نظریں دوڑا کر اللہ دتا کو تلاش کرنے لگا۔ مگر اس کا دور دور پتہ نہ تھا۔ لالی کو تشویش ہوئی۔ وہ حیران و پریشان بیٹھا سوچتا رہا کہ اللہ دتا کہاں چلا گیا۔ دو منٹ گزرے' پانچ منٹ گزرے' دس منٹ گزر گئے۔

لالی کی تشویش بڑھتی گئی۔ وہ اٹھ کر میدان میں جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ درختوں کے خشک پتوں پر آہٹ ابھری۔ لالی چوکنا نظروں سے اس طرف دیکھنے لگا۔ آہٹ قریب' اور قریب آتی گئی۔ ایک درخت کے تنے کے پیچھے سے اللہ دتا نکل کر سامنے آگیا۔

"کہاں چلا گیا تھا؟"

"میں جی' ادھر جھنگر میں ٹٹی کرنے گیا تھا۔"

اللہ دتا آگے بڑھا اور لالی کے قریب بیٹھ گیا۔ دونوں خاموش رہے۔ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھتا گیا۔ سناٹا گہرا ہوگیا۔ جھنگر میں جھینگروں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اندھیرا گہرا ہوگیا۔ رات ہوگئی۔

جب پہر رات گزر گئی اور ہر طرف ہو کا عالم طاری ہوگیا تو دونوں اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ اللہ دتا نے چادر اٹھا کر کندھے پر ڈالی۔ لالی آگے بڑھا۔ اللہ دتا اس کے ساتھ چلا۔ دونوں درختوں کے نیچے سے نکل کر کھلے میدان میں آگئے۔

آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ نرم نرم جھونکے چل رہے تھے۔ وہ چوکنّا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے احتیاط سے کلراٹھی کی جانب بڑھنے لگے۔ دونوں کچھ دور آگے گئے تو میدان میں جگہ جگہ لانا کے پودوں کے جھنڈ نظر آنے لگے۔ لانا کے پودے کمر کمر تک اونچے تھے۔ وہ کھلے میدان سے ہٹ کر لانا کے پودوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ خطرے کے وقت وہ لانا کے پودوں کی اوٹ میں چھپ سکتے تھے۔ انھوں نے نصف میل سے زیادہ راستہ لانا کے پودوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے طے کیا۔ آگے لق ودق ریتلا میدان تھا۔

میدان کے سرے پر ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں پانی کی وسیع جھیل جھلملا رہی تھی۔ لالی نے



اسے حیرت سے دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر اس طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ادھر اتنا پانی کہاں سے آگیا؟"

"تو اسے پانی کی چلھ سمجھ رہا ہے؟" اللہ دتا ہنس کر بولا۔

"تب تو یہ ڈاہر ہوگا۔ روہی کے علاقے میں ریت کے ٹیلوں کے درمیان میں نے ایسے ڈاہر دیکھے ہیں۔ بہت دن ہوئے' میں ایک بار گرمیوں میں ادھر گیا تھا۔"

اللہ دتا نے انکار میں گردن ہلائی۔ "نہیں جی! یہ تو باڑہ ہے۔ اس سے بہت دھوکا ہوتا ہے۔ اس وکت تو خشک ہے اور بہت سخت ہے۔ پر جب بارش ہوتی ہے تو باڑھے کی مٹی بھیگ کر اتنی نرم پڑ جاتی ہے کہ دلدل بن جاتی ہے۔ یہ دلدل بہت خطرناک ہوتی ہے۔ پیر رکھتے ہی بدن اندر دھنستا چلا جاتا ہے۔"

لالی نے اس کی باتیں توجہ سے سنیں۔ دونوں آگے بڑھتے رہے۔ اللہ دتا کی بات ٹھیک تھی۔ باڑہ مانند سراب تھا۔ دونوں جس قدر آگے بڑھتے' پانی کی جھلملاتی جھیل نظروں سے دور ہوتی جاتی۔ کچھ دیر بعد وہ باڑھے کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ اس کی مٹی سخت' چکنی اور چمک دار تھی۔ اس میں نمکیات اور اقلی کی آمیزش تھی۔ زمین اتنی سخت تھی کہ چلتے ہوئے قدموں کی آہٹ صاف سنائی دیتی تھی۔

دور دور تک سبزے کا نام ونشان نہ تھا۔ پودوں اور جھاڑیوں کا ذکر کیا' جنگلی جڑی بوٹیاں تک نہ تھیں۔ صرف اجلا اجلا سفید چٹیل میدان تھا۔ دونوں نے باڑہ عبور کیا تو ایک مرتبہ پھر لانا اور پھوگ کے جھنڈ نظر آنے لگے۔

وہ آگے بڑھتے گئے۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔ خاموشی بہت گہری تھی۔ انھوں نے لگ بھگ چار میل فاصلہ طے کیا تو دور سے روشنی ٹمٹماتی نظر آئی۔

اب لانا کے پودوں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں جال کے درخت بھی سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان کے تنے چھوٹے چھوٹے تھے۔ مگر شاخیں خوب گھنی اور گول دائرے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جال' خودرو صحرائی درخت ہے۔ اس کی شاخوں اور جڑوں کی مسواک بنتی ہے۔ جون کا تپتا ہوا مہینہ ختم ہوتے ہی جب بادل گھر کر آتے ہیں اور رم جھم مینہ برستا ہے تو جال کے درختوں میں پھل لگتے ہیں۔ یہ سرخ سرخ پیلو ہوتے ہیں جنھیں ذوق وشوق سے کھایا جاتا ہے۔ میانوالی کے تھل میں' چولستان اور بھاول پور کے ریگستانوں مین جال کے درخت کثرت سے ہوتے ہیں۔ ان میں پیلو لگتے ہیں تو ریگ زاروں کی پروردہ الھڑ دوشیزاؤں کی ٹولیاں پیلو چننے کے لیے صحرا میں نکل جاتی ہیں۔ پیلو

چن چن کر جگہ جگہ اونچی اونچی ڈھیریاں لگاتی ہیں۔ جال کے گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر پیلو کے گیت گاتی ہیں۔

آچنوں رل مل یار
پیلو پکیاں نی
پکیاں گل گلنار
پیلوں پکیاں نی
پیلوں چٹروین جیٹھ مہینے
تھل دیاں جٹیاں مارن سینے

وہ پیلو چنتی ہیں۔ قہقہے لگاتی ہیں۔ لہک لہک کر گاتی ہیں اور گیت کے بولوں کے ذریعے آپس میں یوں چھیڑ چھاڑ کرتی ہیں۔ ''آ' میرے محبوب! مل جل کر پیلو چنیں۔ پیلو پک کر گل گلنار کے مانند سرخ پڑ گئے ہیں۔ جیٹھ کا مہینہ ہے۔ ریگستان میں پلنے والی کنواریں سینہ ابھار کر چلتی ہیں اور پیلو چنتی ہیں۔''

مگر اس سنسان رات میں نہ جال کے درختوں میں پیلو لگے تھے اور نہ صحرائی دوشیزائیں پیلو چنتے ہوئے لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اللہ دتا اور لالی روشنی کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔ روشنی قریب آ گئی۔ اللہ دتا نے روشنی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مدھم لہجے میں لالی کو بتایا۔

''سامنے کلراٹھی ہے۔ بول آگے کیا کرنا ہے؟''

''سیدھا پہرے دار طور محمد لکھیرا کے پاس چلا جا۔ ہزار روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دینا۔ روپے دیکھ کر وہ مگن ہو جائے گا۔ میں جال کے درختوں کی آڑ لیتا ہوا اس کے نزدیک پہنچ جاؤں گا۔''

اللہ دتا نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ''فیر کیا ہو گا؟''

''آگے جو کچھ ہو گا' اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔'' لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ''تو آگے بڑھتا جا۔''

اللہ دتا نے ایک بار پھر خدشہ ظاہر کیا۔ ''سوچ لے' کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ راکھے کے پاس بھری ہوئی رائفل ہے۔'' اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ وہ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''میں نوں پتہ ہے پہرے دار کے پاس بھری ہوئی رائفل ہے۔'' لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔



''ڈر نہیں' حوصلے سے کام لے۔ سب ٹھیک ہو گا' پروا نہ کر۔''

ہلکی روشنی میں بیگار کیمپ کے دھندلے دھندلے نشانات نظر آنے لگے تھے۔ آگے بہت وسیع کلر میدان تھا جس کی تھور زدہ زمین پر کھار کی جمی ہوئی سفید تہہ دور سے اجلی اجلی نظر آ رہی تھی۔ میدان کے آس پاس جال کے گھنے درخت تھے۔ میدان سے ذرا ہٹ کر ایک کچا راستہ بیگار کیمپ تک جاتا تھا۔

لالی نے اللہ دتا کو اس راستے پر چلنے کا اشارہ کیا اور خود علیحدہ ہو کر درختوں کی آڑ میں دبے دبے قدموں چلنے لگا۔

اللہ دتا آگے بڑھا۔ اس کی چاپ ابھری تو دور سے آواز آئی۔ ''کون ہے؟''

اللہ دتا نے آواز پہچان لی۔ یہ پہرے دار کی آواز تھی۔ اللہ دتا نے جواب دیا۔ ''میں ہوں جی' اللہ دتا۔'' وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔

پہرے دار ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں بندوق سنبھالے اس کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچ کر ٹھٹکا۔ ہاتھ اٹھا کر لالٹین اونچی کی اور اللہ دتا کو پہچاننے کی کوشش کی۔ جب اسے اطمینان ہو گیا تو اس نے کہا۔ ''توں آ گیا؟''

اللہ دتا نے جواب دیا۔ ''توں نے بلایا جو تھا۔''

اللہ دتا اس کے بالکل قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ طور محمد لکھیرا نے مسکرا کر کہا۔ ''بہت دیر کر دی توں نے۔ میں دیر سے تیرا انتظار کر رہا ہوں۔''

اللہ دتا نے معذرت کے انداز میں کہا۔ ''ہاں جی' کچھ دیر ہو گئی۔''

''روپے لایا ہے؟''

اللہ دتا نے مستعدی سے جواب دیا۔ ''بالکل لایا ہوں۔ روپے نہ لاتا تو تیرے کول کیوں آتا۔''

''آ میرے ساتھ' ادھر منجی پر بیٹھ کر آرام نال گل بات ہو گی۔''

دونوں کلراٹھی کی اس عمارت کی جانب بڑھنے لگے جس میں بیگار کرنے والے مزدور قیدی رکھے جاتے تھے۔

لالی ایک درخت کی آڑ میں دم سادھے کھڑا تھا۔ عمارت اس کے بالکل سامنے تھی۔ یہ عمارت مٹی کی بنی ہوئی تھی اور کسی پرانے قلعے کے مانند نظر آتی تھی۔ اس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواروں کی فصیل تھی۔ قریب ہی چند نیم پختہ مکانات تھے۔ ان میں پہرے دار اور نوکر چاکر رہتے تھے۔ کلراٹھی میں جگہ جگہ بھٹیاں تھیں۔ ایک بڑی بھٹی بھی تھی جس کی پختہ چمنی بلندی تک چلی

گئی تھی۔

کلراٹھی اور اس کے بیگار کیمپ پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ صرف ایک پہرے دار طور محمد لکھیرا ڈیوٹی پر تھا۔ دوسرے پہرے دار اور نوکر چاکر شام کو اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ کلراٹھی پر کام بند ہوتا تو وہ اسی طرح چپکے سے کھسک جاتے تھے۔ حالانکہ ان کے لیے یہ حکم تھا کہ منشی کی اجازت کے بغیر بیگار کیمپ چھوڑ کر نہ جائیں۔ مگر رات کو اس ویرانے میں نور علی کھوکھر اور اس کے منشی کے آنے کا کوئی امکان نہیں تھا' لہٰذا وہ چھٹی کے موقعے پر رات کو چلے جاتے اور صبح تڑکے واپس آجاتے۔

پہرے دار اور اللہ دتا آہستہ آہستہ قید خانے کی عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ قید خانے میں آمدورفت کے لیے صرف ایک دروازہ تھا اور اس پر تالا پڑا تھا۔ دروازے کے عین سامنے چارپائی بچھی تھی۔ پہرے دار نے لالٹین چارپائی کے قریب رکھ دی۔ البتہ بندوق اس کے ہاتھ میں بدستور دبی ہوئی تھی۔

وہ اللہ دتا کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اپنے ڈیل ڈول کے اعتبار سے برچھا لگتا تھا۔ اس کا قد لمبا' جسم چوڑا چکلا اور مضبوط تھا۔ مونچھیں گھنی تھیں۔ چہرہ ایسا کرخت اور درشت تھا کہ سخت ہیبت ناک نظر آتا تھا۔

لالی درختوں کی آڑ لیتا کھنڈر کے قریب پہنچ گیا۔ یہ کوئی اجڑی ہوئی قدیم بستی تھی۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں اس قدر شور زدہ تھیں اور ان پر کھار کی تہہ اس طرح بہتات سے چڑھی تھی کہ وہ برف پوش نظر آتی تھیں۔

شور زدہ کھنڈر سے قید خانے کی عمارت زیادہ دور نہیں تھی۔ لالی وہاں سے پہرے دار اور اللہ دتا کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ وہ شکستہ دیوار کی آڑ میں دبکا ہوا تھا۔ اس کی نظریں پہرے دار اور اللہ دتا کی جانب تھیں۔

لالی سانس روکے چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا۔ اللہ دتا نے دھوتی کے ڈب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور پہرے دار کو تھما دی۔ پہرے دار گردن جھکا کر نہایت انہماک سے نوٹ گننے لگا۔ کھنڈر اور عمارت کے درمیان کھلی جگہ تھی۔ اسے عبور کرنا سخت خطرناک تھا۔ پہرے دار کی نظر لالی پر پڑ سکتی تھی۔ مگر وہ اپنے گردوپیش سے بے خبر نوٹ گننے میں محو تھا۔

لالی نے جھپاک سے درمیانی فاصلہ طے کیا۔ لالٹین کی دھندلی روشنی میں اس کا سایہ لہرایا۔ پہرے دار نے پلٹ کر دیکھا۔ لالی فوراً قید خانے کی دیوار سے چمٹ کر کھڑا ہوگیا۔ پہرے دار گردن



موڑے دیکھتا رہا۔ اللہ دتا کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ چھا گئی۔ وہ نظریں جھکائے پہرے دار کے برابر خاموش بیٹھا رہا۔ کوئی نظر نہیں آیا تو پہرے دار نے گردن جھکا کر پھر نوٹ گننا شروع کر دیئے۔

لالی دیوار سے لگا دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ اس کے عقب میں پہنچا۔ تیزی سے اچھلا' پہرے دار کے سر پر پہنچا اور ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کی گردن دبوچ کے تیزی سے جھٹکا دیا۔ پہرے دار کے زانو پر رکھی ہوئی بندوق پھسل کر نیچے گر گئی۔ اللہ دتا ہکا بکا ہو کر خوف زدہ نظروں سے لالی کو تکنے لگا۔ لالی نے اسے زور سے ڈانٹا۔

"منہ کیا تک رہا ہے۔ اٹھا لے بندوق۔"

اللہ دتا نے جھک کر بندوق اٹھالی۔ پہرے دار نے گردن نیچی کرتے ہوئے زور آزمائی کی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر لالی کی کلائی پکڑلی اور اسے زور سے کھینچا۔ اس طرح لالی کی گرفت سے اس نے اپنی گردن چھڑالی۔

پہرے دار طور محمد لکھیرا بندوق چھیننے کے لیے اللہ دتا پر جھپٹا۔ لالی نے تیزی سے بڑھ کر پھر اس کی گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ مگر پہرے دار بہت مضبوط اور طاقت ور تھا۔ اس دفعہ وہ لالی کی گرفت میں نہیں آیا۔ اس نے اٹھ کر اللہ دتا کے ہاتھ پر زور سے تھپکی دی۔ بندوق اللہ دتا کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

پہرے دار اسے اٹھانے کے لیے لپکا۔ لیکن لالی نے اسے اتنی مہلت نہیں دی۔ وہ پیچھے ہٹ کے اچھلا اور سر جھکا کے پہرے دار کے منہ پر پوری قوت سے ٹکر ماری۔ چوٹ کاری آئی۔ پہرے دار سنبھل نہ سکا' چارپائی پر چاروں خانے چت گرا۔ لالی نے اسے کروٹ بھی نہ لینے دی۔ چارپائی اٹھا کر پلٹ دی۔

پہرے دار لڑھک کر نیچے آگیا۔ چارپائی اس کے اوپر گری۔ اس نے چارپائی کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ چارپائی ہٹا کر باہر آتا' لالی نے جھٹ بندوق اٹھالی۔ بندوق ہاتھ میں لیتے ہی لالی کو اندازہ ہوگیا کہ وہ بندوق نہیں رائفل ہے۔ لالی نے رائفل کی نال پہرے دار کی جانب کر دی۔ ڈپٹ کر خبردار کیا۔

"اٹھنے کی کوشش کی تو گولی چلا دوں گا۔"

پہرے دار نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ جس طرح چارپائی کے نیچے فرش پر پڑا تھا' ویسے ہی پڑا رہا۔ اس کا چہرہ اور دھڑ کا اوپری حصہ چارپائی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ لالٹین اپنی جگہ رکھی تھی۔

اس کی روشنی میں نوٹ ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ پہرے دار خاموش پڑا لالی کو خوں خوار نظروں سے گھورتا رہا۔

لالی رائفل تانے کھڑا رہا۔ اللہ دتا جلدی جلدی بکھرے ہوئے نوٹ اٹھانے لگا۔ نوٹ اکٹھے کرکے اس نے دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔ لالی نے اسے مخاطب کیا۔ "اللہ دتا! پگڑی اتار۔" اس نے پہرے دار طور محمد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے دونوں ہاتھ پگڑی سے باندھ دے۔"

اللہ دتا نے سر سے پگڑی اتاری۔ لکھیرا کے پاس گیا اور اس کے دونوں ہاتھ پگڑی سے کس کر باندھنے لگا۔ پہرے دار غصے سے بولا۔ "توں نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔"

اللہ دتا تو خاموش رہا لیکن لالی نے اسے ڈانٹا۔ "بکواس نہ کر' چپ کرکے پڑا رہ۔" پہرے دار نے پھر کچھ نہیں کہا۔

اللہ دتا نے اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر مضبوط گرہ لگادی۔ لالی نے اسے حکم دیا۔ "اب منجی اٹھادے۔" اللہ دتا نے پہرے دار پر پڑی ہوئی چارپائی اٹھادی۔

لالی نے پہرے دار سے پوچھا۔ "اٹھ کر بیٹھ۔ بتا جیل کے دروازے کی چابی اور دوسری چابیاں کہاں ہیں؟"

لکھیرا نے کمر پر کہنی مار کر اشارہ کیا۔ اللہ دتا نے بڑھ کر اس کا کرتا اٹھایا۔ کمر پر کنجیوں کا گچھا لٹک رہا تھا۔ اللہ دتا نے گچھا کھول کر اپنے قبضے میں کرلیا۔ لالی نے کہا۔ "اللہ دتا! دروازہ کھول کے اندر جا اور اللہ دینو کو نکال لا۔"

اللہ دتا آگے بڑھا۔ اس نے لالٹین اٹھائی' تالا کھولا اور قید خانے کے اندر چلا گیا۔ لالی رائفل کی نال پہرے دار پر تانے چوکس کھڑا رہا۔ پہرے دار گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

☆

اللہ دتا ہاتھ میں لالٹین لٹکائے دروازے سے نکلا۔ اس کے ہم راہ اللہ دینو بھی تھا۔ اس کی عمر اکیس بائیس سال ہوگی۔ چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ ڈاڑھی اور مونچھیں بڑھ کر بے ترتیب ہوگئی تھیں۔ وہ پھٹی ہوئی بوسیدہ قمیص پہنے تھا۔ دھوتی بھی میلی کچیلی تھی۔ نہ پیروں میں جوتے تھے نہ سر پر پگڑی۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے لالی کو دیکھنے لگا۔

اللہ دتا بولا۔ "یہ اللہ دینو ہے جی۔"

لالی نے اللہ دینو کو قریب بلایا اور ایک ہاتھ سے اس کی پیٹھ تھپک کر دل جوئی کی۔ "اتنا ڈرا ہوا



کیوں ہے؟ اب تو اس جیل سے چھوٹ گیا۔" اس نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ "فٹافٹ اس کی ادوائن کھول لے۔"

اللہ دینو خاموشی سے آگے بڑھا اور ادوائن کھولنے لگا۔ اللہ دتا نے بھی اس کی مدد کی۔ دونوں نے ادوائن کھول کر رسی نکال لی۔ لالی نے پہرے دار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ دینو سے کہا۔

"پگڑی کھول۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کرکے رسی سے باندھ دے۔ اللہ دتا! تو بھی لگ جا۔ فٹافٹ باندھ۔ وقت کم ہے۔"

دونوں بھائیوں نے پگڑی کھول کر چارپائی کی مضبوط ادوائن سے پہرے دار کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ وہ چپ بیٹھا رہا۔ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔

لالی نے لالٹین کی روشنی میں رائفل کا میگزین کھول کے دیکھا اس میں نو کارتوس موجود تھے۔ دسواں چیمبر میں تھا۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر رائفل اللہ دتا کو دی اور کنجیوں کا گچھا اس سے لے لیا۔

اللہ دتا نے پوچھا۔ "ان کا کیا کرے گا؟ اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

"ابھی چلتے ہیں' تھوڑا سا کام اور کرنا ہے۔ دوسروں کو بھی تو رہا کرنا ہے۔"

"انھیں چھوڑ' ہم نے ان سے کیا لینا؟"

"بیکار کی کڑ کڑ نہ کر' چپ کرکے کھڑا رہ۔" لالی نے اسے ڈانٹا۔ "انھیں رہا کرنا ضروری ہے۔ اگر سب نہ چھوٹے تو نور علی کھوکھر تجھے اور دینو کو اپنے کرندوں سے قتل کروادے گا۔ سب چھوٹ گئے تو کس کس کو قتل کرائے گا۔ ویسے وہ بھی تو اللہ دینو کی طرح ویگار کے لیے پکڑ کر بند کیے گئے ہیں۔ انھوں نے کوئی جرم تو نہیں کیا اور یہ بھی تو سوچ' ان کے بھی گھر والے پریشان ہوں گے' انتظار کرتے ہوں گے۔"

پہرے دار طور محمد بولا۔ "ایسا نہ کر۔ سب نکل گئے تو منشی مجھے جان سے مار دے گا۔"

لالی قریب گیا اور اس کی پیٹھ پر ہولے سے دھپ مار کر بولا۔ "فکر نہ کر لکھیرے۔ تجھے بھی رہا کردوں گا۔ تو بھی بھاگ جانا۔ کوئی اور دھندا کرلینا۔ یہاں رہے گا تو ایک نہ ایک دن مارا جائے گا۔ ویسے بھی یہاں کی پہریداری گندہ کام ہے۔ تجھے ان بے چارے کیدیوں پر ظلم کرتے دکھ نہیں ہوتا؟ انھوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟ اب چپ کرکے بیٹھا رہ۔ گڑبڑ کی کوشش کی تو گولی چلادوں گا۔ اور جیسے تو نے کیدیوں کو قتل کرکے ان کی لاشیں دبائی ہیں' ویسے ہی گڑھا کھود کر تجھے بھی دبادوں گا۔ کسی کو پتا بھی نہ چلے گا۔ بول کیا کہتا ہے؟"

پہرے دار نے اسے یقین دلایا۔ "جیسا کہتا ہے' ویسا ہی کروں گا۔ پر مجھے بھی رہا کر دینا۔" اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔ "میں یہاں بندھا پڑا رہا تو زمیں دار اور اس کا منشی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

اس نے اللہ دتا کی طرف اشارہ کیا۔ "میران خاں راکھے نے یہاں سے نکل جانے میں اس کی اور دو کیدیوں کی مدد کی تھی۔ اس پر منشی نے پچھلے دنوں میران خان کو قتل کرا دیا اور اس کی لاش جال کے درخت کے نیچے دبا دی۔ مشہور کر دیا اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی کرے گا۔"

لالی نے اسے باور کرایا۔ "پروا نہ کر' تجھ سے جو وعدہ کیا ہے' پورا کروں گا۔"

لالی نے اللہ دتا سے رائفل لے کر اپنے ہاتھ میں تھام لی۔ اللہ دتا کو چوکس رہنے کی ہدایت کی۔ اسے پہرے دار کی نگرانی پر مامور کیا اور اللہ دیتو کے ہم راہ قید خانے کے اندر چلا گیا۔ اللہ دیتو لالٹین اٹھائے آگے آگے تھا۔ لالی اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

لالی نے عمارت میں داخل ہو کر دیکھا۔ اندر بہت وسیع صحن تھا۔ اس میں دو طرف سلسلے سے تنگ و تاریک کوٹھریاں تھیں۔ نہ کسی کوٹھری میں کھڑکی تھی نہ روشن دان تھا۔ کوٹھریوں کے آگے طویل برآمدہ تھا۔ اس پر پھوس کی خمیدہ چھت تھی۔

قید خانے میں ہر طرف بدبو اور سڑاند پھیلی تھی۔ شام کو جب تمام قیدی ایک بار بند کر دیئے جاتے تو کسی کو باہر جانے کی مطلق اجازت نہ ہوتی۔ رات کو وہ صحن ہی کے ایک حصے میں پیشاب اور رفع حاجت کرتے تھے جسے صاف کرنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ قید خانے کی تمام عمارت ب تھی اور اس کی دیواریں شور زدہ تھیں۔

قید خانے میں اس وقت ۴۳ قیدی تھے۔ وہ برآمدے میں مونج کی بوسیدہ اور کھردری چٹائیوں لیٹے تھے۔ ان کے پاس نہ تکیے تھے اور نہ اوڑھنے کے لیے چادریں تھیں۔ ویسے گرمی شروع ہو تھی۔ چٹائیوں میں کھٹمل تھے۔ قیدی اپنی کمر اور ٹانگیں بار بار کھجاتے۔ وہ خوف زدہ اور گھبرا ہوئے نظر آتے تھے۔

قیدی جوڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کے ایک ایک پیر میں لوہے کے کڑے پڑے کڑوں کے درمیان فٹ بھر کی زنجیر تھی اور ان میں تالے لگے تھے۔

لالی ہاتھ میں رائفل سنبھالے ہوئے تمام قیدیوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا۔ تمام قیدی خاموش بیٹھے رہے۔ انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔ لالی ان کا معائنہ کر چکا



نے اونچی آواز سے کہا۔ "میں تالے کھول کر تم سب کو رہا کر دوں گا پر کوئی گڑبڑ نہ ہو۔" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "کسی نے گڑبڑ کی کوشش کی تو گولی سے اڑا دوں گا۔"

چند لمحے وہ خاموش بیٹھے رہے پھر ایک قیدی نے' جو دوسروں سے کسی قدر سن رسیدہ تھا' سب کی ترجمانی کرنے کے انداز میں کہا۔ "ہمیں جی گڑبڑ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تو ہمیں رہا کر دے گا تو دعا ہی دیں گے۔ گڑبڑ کیوں کریں گے؟ تو جیسا کہے گا' ویسا کریں گے۔"

"میں یہی چاہتا ہوں۔" لالی نے نرم لہجے میں کہا۔ اللہ دیتو کو کنجیوں کا گچھا دیا۔ "دیتو! باری باری سب کے تالے کھول دے۔"

اللہ دیتو ہاتھ میں لالٹین سنبھالے آگے بڑھا۔ وہ ایک ایک قیدی کے پاس گیا اور کڑوں کے تالے کھولنے لگا۔ اس نے جلدی جلدی سارے قیدیوں کے تالے کھول دیئے۔ جب سب آزاد ہو گئے تو لالی نے باہر چلنے کی ہدایت کی۔ وہ اٹھے' دلان سے نکل کر صحن میں آئے اور دروازے کی جانب بڑھنے لگے۔

آگے آگے لالٹین سنبھالے اللہ دیتو تھا۔ اس کے پیچھے قیدیوں کا غول تھا۔ سب سے پیچھے رائفل سنبھالے لالی چل رہا تھا۔ قیدی دروازے سے گزر کر باہر آ گئے۔

لالی بھی باہر آ گیا۔ اس نے انھیں ایک بار پھر مخاطب کیا۔ "سنو' اب تم سب آزاد ہو۔ جس کا جہاں جی کرے نکل جائے۔ ابھی تو رات آدھی بھی نہیں ہوئی۔ بھاگنے کے لیے تمھارے پاس بہت وقت ہے۔ پر یہاں سے نکل بھاگنے سے پہلے تم سب کو ایک کام کرنا ہوگا۔" اس نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔

"کلراٹھی پر کھدائی کرنے کے لیے کدالیں تو ہوتی ہیں نا؟"

"ہاں جی' کیوں نہیں ہوتیں۔" کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ "بہت ہیں۔"

"کدالیں جہاں رکھی ہیں' تم سب جا کر وہاں سے نکال لاؤ۔" لالی نے مٹی اور اینٹوں سے بنی ہوئی بھٹیوں کی جانب ہاتھ لہرایا۔ "یہ ساری بھٹیاں توڑ پھوڑ کر برابر کر دو' فٹافٹ۔ اس کے بعد یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

بیگار کیمپ کے پہرے داروں اور نوکروں کی کوٹھریاں سامنے تھیں۔ ان کے قریب ہی ٹین کا لمبا سائبان تھا۔ اس کے نیچے کھدائی کا ساز و سامان رکھا تھا۔ اس میں کدالیں اور بیلچے بھی تھے۔ سارے قیدی سائبان کے اندر چلے گئے اور کدالیں ہاتھ میں سنبھالے باہر آ گئے۔ وہ ادھر ادھر بکھر گئے اور کدالوں سے بھٹیاں کھودنے لگے۔ کھدائی اور توڑ پھوڑ کی آوازیں رات کے سناٹے میں

ابھر رہی تھیں۔

لالی اور اللہ ڈینو پہریدار کے پاس چلے گئے۔ اس کے ہاتھ اور پیر رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے عین سامنے کچھ فاصلے پر اللہ دتا کھڑا تھا۔

لالی کو دیکھ کر پہرے دار نے حیرت سے پوچھا۔ "توں بھٹیوں دی توڑ پھوڑ کیوں کروا رہا ہے؟"

لالی نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے اللہ دتا اور ڈینو سے کہا۔ "تم دونوں بھی کدالیں لے کر کھدائی میں لگ جاؤ۔ کام چھیتی نال ہونا چاہئے۔ ابھی بہت دور جانا ہے۔"

اللہ دتا نے کہا۔ "میں تو کہتا ہوں' توں بھٹیوں شٹیوں کے چکر میں نہ پڑ۔ ہم نے اب چھیتی نال یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

"بیچ میں ٹانگ نہ اڑا۔" لالی نے اسے ڈانٹا۔ "جیسا کہتا ہوں' ویسا کر۔"

اللہ دتا خاموش ہوگیا اور اللہ ڈینو کے ہم راہ کدالیں لینے سائبان کی جانب چلا گیا۔ لالی نے رائفل ایک طرف رکھی' الٹی چارپائی اٹھا کر بچھائی۔ رائفل سنبھالی اور چارپائی پر چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ توڑ پھوڑ کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ ملبے سے گرد و غبار اڑ اڑ کر پھیل رہا تھا۔ پہرے دار سر جھکائے لالی کے سامنے فرش پر خاموش بیٹھا تھا۔

رات کا اندھیرا بڑھتا گیا۔ کدالیں چلنے اور ملبہ گرنے کی آوازیں سناٹے میں ابھرتی رہیں۔ آخر آوازیں بند ہوگئیں۔ خاموشی چھاگئی۔ قیدی ٹولیوں میں بکھرے ہوئے لالی کے قریب آئے۔ لالی چارپائی سے اتر کر کھڑا ہوگیا۔ اللہ دتا آگے آگے تھا۔

لالی نے پوچھا۔ "ساری بھٹیاں توڑ ڈالیں؟"

"ہاں جی۔" اللہ دتا نے جواب دیا۔ "جا کر دیکھ لے' سب توڑ کر برابر کردیں۔"

قیدی اس کے سامنے ہجوم کی صورت میں چپ کھڑے تھے۔ لالی نے لالٹین کی روشنی میں انھیں دیکھا۔ سب کے چہرے اور بال گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کدالیں دبی تھیں۔

لالی نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے ہدایت کی۔ "کدالیں وہیں رکھ دو جہاں سے اٹھا کر لائے تھے اور جدھر تمہارا جی کرے' چلے جاؤ۔"

ان کے چہروں پر مسرت پھیل گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے سائبان کی طرف چلے گئے۔ ذرا دیر بعد سائبان کے نیچے کدالیں رکھنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لالی نے لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں دیکھا۔ قیدی سائبان کے نیچے سے ٹولیوں میں باہر نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے مختلف سمتوں میں



چلے گئے۔ کچھ دیر تک وہ دھندلی دھندلی پرچھائیوں کی مانند نظر آتے رہے' پھر رات کے اندھیرے میں گم ہوگئے۔

بیگار کیمپ پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ اللہ دتا اور ڈینو موجود تھے۔ وہ لالی کے قریب کھڑے تھے۔ لالی نے اللہ دتا کو پہرے دار کی نگرانی پر مقرر کیا اور اللہ ڈینو کے ساتھ سائبان کی جانب بڑھا۔ ہر طرف ٹوٹی پھوٹی بھٹیوں کا ملبا بکھرا ہوا تھا۔ اللہ ڈینو ہاتھ میں لالٹین سنبھالے آگے آگے چل رہا تھا۔ سائبان کے قریب پہنچ کر لالی رک گیا۔ اس نے اللہ ڈینو سے پوچھا۔

"کلراٹھی پر شورہ لے جانے کے لیے اوٹھ بھی رہتے ہیں' ان کا ڈھارا کتھے ہے؟"

"اتھے ہے۔" اللہ ڈینو نے عمارت کے پچھواڑے کی جانب ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ "پر سارے اوٹھ تو آج شورہ لاد کر ٹیشن چلے گئے۔ سویرے واپس آئیں گے۔"

"تیرا مطلب ہے' اب ڈھارے میں کوئی اوٹھ نہیں رہا؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔ آج بہت مال بھیجا گیا تھا۔"

"مجھے ڈھارا تو دکھا۔ شاید کوئی اوٹھ مل جائے ورنہ صبح تک ہم تینوں داؤد پور کیسے پہنچ سکیں گے؟" لالی کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

دونوں عمارت کے عقب میں گئے۔ جال کے ایک درخت کے قریب مٹی کی اونچی اونچی دیواروں پر چھپر کی چھت تھی۔ یہ اونٹوں کا باڑا تھا۔ دونوں اس طرف بڑھے۔ لالٹین کی روشنی میں انھیں دو اونٹ چھپر کے نیچے بیٹھے نظر آئے۔ لالی کے چہرے پر مسرت پھیل گئی۔

"کام بن گیا۔ تجھے اوٹھ کی سواری آتی ہے؟"

"کیوں نہیں آتی جی۔ یہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔ میں تو بچپن سے اوٹھ چلا رہا ہوں۔"

"اللہ دتا بھی جانتا ہوگا؟" لالی نے دریافت کیا۔

"بالکل جانتا ہے جی۔ وہ تو کئی مہینے اوٹھ چلانے والا جتوال بھی رہ چکا ہے۔" اللہ ڈینو نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ "دونوں اوٹھ کھول کر باہر نکال لوں؟ ان پر بیٹھ کر نکل جائیں گے۔ اب زیادہ دیری نہیں کرنی چاہئے۔"

"ابھی نہیں۔ پہلے میرے ساتھ اس طرف چل جہاں کلراٹھی کا سامان رکھا جاتا ہے۔"

اللہ ڈینو خاموش رہا۔

دونوں ایک بار پھر سائبان کی جانب چلے۔ وہاں کدالیں اور بیلچے رکھے تھے۔ مٹی کے تیل کے دو پیپے بھی تھے۔ پھٹے پرانے کپڑے اور بہت سا کاٹھ کباڑ تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ خالی

بوریوں کا ڈھیر تھا۔ شورے اور سجّی سے بھری ہوئی بوریاں بھی تھیں' مگر زیادہ نہیں تھیں۔

لالی نے اللہ ڈینو کی مدد سے مٹی کے تیل کے پیپے سائبان سے نکال کر باہر رکھ دیئے۔ اس کے بعد وہ اللہ ڈینو کے ساتھ پہرے دار طور محمد لکھیرا اور اللہ دتا کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پہریدار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اللہ دتا سے کہا۔ "اس کے ہاتھ اور پیر کھول دے۔" اللہ دتا اس کے ہاتھ پیر کھولنے لگا۔ پہرے دار خاموش بیٹھا رہا۔ لالی نے رائفل اس کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

"تو بھی بھاگ جا۔"

پہرے دار چپ چاپ اٹھ کر ایک طرف چل دیا۔ لالی' رائفل سنبھالے اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ کچھ دور جا کر اس نے ڈانٹا۔ "زنانیوں کی چال نہ چل۔ دوڑ لگا۔" پہرے دار تیزی سے بھاگا اور اندھیرے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

لالی نے واپس آ کے اللہ دتا اور اللہ ڈینو سے کہا۔ "ڈھارے میں جا کر دونوں اوٹھ باہر نکال لو۔" اس نے جال کے ایک درخت کی جانب اشارہ کیا جو بیگار کیمپ سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ "تم دونوں اوٹھ اتھے لے جاؤ اور میرا انتظار کرو۔ میں نوں ابھی ایک کام اور کرنا ہے۔ میں چھیتی نال تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

دونوں بھائی اونٹوں کے باڑے کی طرف چلے گئے۔ لالی سائبان کی سمت بڑھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے میں لالٹین تھی۔ اس نے رائفل ایک طرف میدان میں رکھ دی۔ سائبان کے نیچے گیا۔ وہاں سے پھٹے پرانے کپڑے اور خالی بوریاں نکالیں۔ انھیں اٹھا کر باہر لایا۔ مٹی کے تیل کے پیپے کھولے۔ تیل پھٹے پرانے کپڑوں اور بوریوں پر چھڑکا۔ لالٹین ہاتھ میں لی اور تیل سے بھیگی ہوئی دو بوریاں اٹھا کر قید خانے کی عمارت میں گیا۔ لالٹین کی چمنی اونچی کی اور اس کی لو سے ایک چیتھڑا جلایا۔ جلتے ہوئے چیتھڑے سے اس نے ایک بوری میں آگ لگائی اور جلتی ہوئی بوری برآمدے کے چھپر کی جانب اچھال دی۔ چھپر جلنے لگا۔ لالی نے دوسری بوری میں بھی آگ لگائی اور دالان میں بچھی ہوئی مونج کی چٹائیوں پر ڈال دی۔ اس نے چمنی نیچے کی اور لالٹین اٹھائے باہر نکل آیا۔

لالی نے تیل سے بھیگے ہوئے کپڑوں اور بوریوں میں لالٹین کے ذریعے آگ لگائی اور انھیں جلدی جلدی کوٹھریوں کی چھتوں پر پھینک دیا۔ کچھ جلتے ہوئے کپڑے سائبان کے نیچے رکھے ہوئے سامان پر ڈال دیئے' کچھ جلتی ہوئی بوریوں سے دروازوں میں آگ لگا دی۔ اس نے رائفل اٹھائی۔ لالٹین ہاتھ میں لٹکائی اور اونٹوں کے باڑے میں پہنچا۔ تیل سے بھیگی ہوئی ایک بوری میں اس نے



آگ لگائی اور اسے پھوس کی بنی ہوئی باڑے کی چھت پر پھینک دیا۔ لالٹین اس نے چھت کے نیچے بکھری ہوئی خشک گھاس پر ڈال دی اور تیز تیز قدموں سے جال کے اس درخت کی جانب لپکا جہاں اللہ دتا اور ڈینو اونٹوں کے ساتھ کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اللہ دتا نے لالی کو اپنے ساتھ اونٹ کی پیٹھ پر بٹھایا' دوسرے اونٹ پر اللہ ڈینو سوار ہوا۔ دونوں نے اونٹ آگے بڑھائے اور تیز رفتار سے دوڑانے لگے۔ لالی نے مڑ کر دیکھا۔ بیگار کیمپ کے در و دیوار جل رہے تھے۔ سرخ سرخ شعلے بھڑک رہے تھے۔ دیواریں چیخ رہی تھیں' چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ ہر طرف آگ ہی آگ پھیلی تھی۔ دھویں کے سیاہ بادل فضا میں پھیلتے جا رہے تھے۔

☆

دونوں اونٹ داؤد پور میں داخل ہوئے تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اللہ دتا نے اونٹ اپنے گھر کے سامنے ٹھہرائے۔ تینوں نیچے اترے۔ اللہ دتا نے آگے بڑھ کر تالا کھولا۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ اللہ دتا کے تینوں بچے گھر میں نہیں تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے وہ انھیں بیوی کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ یہ مٹی کا بنا ہوا چھوٹا سا گھر تھا۔ اس میں صرف ایک کمرہ اور دو کوٹھریاں تھیں۔ اللہ ڈینو نے گھر پہلی بار دیکھا تھا۔ مگر وہ بالکل خاموش تھا۔

اللہ دتا نے کمرے میں داخل ہو کر چارپائی پر بستر بچھا دیا' لالی کے پاس آیا۔ "تو اب سو جا۔ تھکا ہوا بھی ہے اور رات بھر جاگا ہے۔" لالی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ کمرے میں گیا اور نڈھال ہو کے بستر پر لیٹ گیا۔ دوپہر کو اللہ دتا نے اسے جگایا۔ لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اللہ دتا اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"بہت سو لیا' اب روٹی کھا لے۔"

لالی خاموشی سے نیچے اترا۔ اللہ دتا کے ساتھ صحن میں گیا۔ منہ دھویا' کلی کی اور کمرے میں واپس آ گیا۔ ابھی تک اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک نوجوان عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چنگیری تھی۔ اس میں روٹیاں تھیں۔ دوسرے ہاتھ میں دال سے بھرا ہوا پیالہ تھا۔

اس نے چنگیری اور پیالہ فرش پر بچھی ہوئی چٹائی پر رکھ دیا اور دوپٹے کا پلو سر سے کھینچ کر آگے گرا لیا۔ وہ ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔

اللہ دتا نے کہا۔ "یہ سرداراں ہے' میری گھر والی۔"

لالی نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ اس کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ رنگت گیندے کے

پھول کی طرح زردی مائل تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں' چہرہ بیضوی تھا' جسم بھرا بھرا گداز اور سڈول تھا۔ وہ خوش شکل عورت تھی مگر اپنے سن سے کچھ زیادہ ہی لگتی تھی۔ سرداراں نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ وہ کسی طور اتنی تیز اور ہوشیار نظر نہیں آتی تھی جیسا اللہ دتا نے بتایا تھا وہ سیدھی سادی عام دیہاتی عورت تھی۔

لالی نے مسکرا کر قریب کھڑے ہوئے اللہ دتا کو دیکھا اور سرداراں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "اسے سرگانے سے چھڑا کر کب لایا؟"

"سویرے ہی سویرے سنار کے گھر پہنچا۔ اس کے ہزار روپے واپس کئے اور سرداراں کو لے آیا۔ بچے بھی آ گئے' باہر کھیل رہے ہیں۔"

لالی نے پوچھا۔ "تو سویا نہیں؟"

"کیسے سوتا؟ میں نے کئی کام کرنے تھے۔" وہ کھانے کے سامنے چٹائی پر بیٹھ گیا۔ "پہلے روٹی کھا لے۔ آرام سے باتیں کریں گے۔" لالی بھی چٹائی پر بیٹھ گیا۔

سرداراں باہر چلی گئی۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد دو کٹوروں میں لسی لے کر واپس آ گئی۔ لالی اور اللہ دتا کھانا کھانے لگے۔ لالی نے لسی کا گھونٹ بھرا اور کٹورا رکھتے ہوئے بولا۔ "داؤد پور تو موضع لگتا ہے۔"

"بالکل موضع ہے جی۔" اللہ دتا نے مستعدی سے جواب دیا۔ "یہاں پٹواری ہے۔ تین زمیں دار رہتے ہیں۔ ان کی اونچی اونچی ماڑیاں ہیں۔ سنار نے بھی اپنی ماڑی بنوالی ہے۔ بچوں کی پڑھائی کا سکول بھی ہے۔ داؤد پور میں دکانیں ہیں۔ بازار ہے۔ اس موضعے کے کئی پنڈ ہیں۔"

"اللہ دتا! تو مجھے بازار سے ایک دھوتی' ایک چدّر' جوتا' سر پر باندھنے کی پگڑی لا دے۔ جہانگیرہ اتنا وڈا نہیں ہے۔ وہاں یہ چیزیں نہیں ملتیں اور ہاں روپے رکھنے کے لیے ہمیانی بھی چاہئے۔ مل جائے گی؟"

"مل جائے گی اور بھی چیزیں مل جائیں گی۔" یہ کہتے کہتے اس نے سرداراں کی طرف دیکھا۔ "بازار جا کر یہ چیزیں خرید لا۔" وہ مسکرایا۔ "تو سستا ہی خرید کر لائے گی۔ دکان داروں سے مول تول پر جھگڑا بھی کر سکتی ہے۔"

"میں تو کسی سے جھگڑا ونگا نہیں کرتی۔" سرداراں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تجھ سے جھگڑا کرتی ہوں؟ ایمان نال بتا' جو کہتا ہے' وہ کرتی ہوں۔"

"کرماں بھری نراض کیوں ہوتی ہے؟" اللہ دتا مسکرا کر بولا۔ "میں نے تو ایسے ہی گل بات کی



تھی۔"

لالی ان دنوں کی نوک جھونک نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ "سرداراں! میری بش شرٹ اور پتلون دھو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں دھو سکتی۔" اس نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ "توں نے اللہ دتا کی اتنی مدد کی۔ میں تیرے لیے کیا نہیں کر سکتی۔ کپڑے اتار کر چدّر یا دھوتی باندھ لے۔ میں تیرے کپڑے دھو کر دھوپ میں ڈال دوں گی۔ شام تک سوکھ جائیں گے۔ پہن لینا۔"

"اللہ دتا تیرے بارے میں ٹھیک ہی کہتا ہے۔ تو زبردست اہری ہے۔" لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے کوئی چدّر یا اللہ دتا کی دھوتی لا دے۔ میں اپنے کپڑے اتار کر دھونے کے لیے تجھے دے دوں گا۔"

سرداراں باہر چلی۔ لالی اور اللہ دتا کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ لالی نے بٹوہ نہیں نکالا۔ جیب سے تیس روپے کے کھلے ہوئے نوٹ نکالے اور اللہ دتا کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ "اتنے روپے سے کام چل جائے گا؟"

اللہ دتا نے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔ "چل تو جانا چاہئے۔"

سرداراں' ملگجی سی دھوتی ہاتھ میں دبائے اندر آئی اور لالی کو دے دی۔ اس نے کھانے کے برتن اٹھائے اور کمرے سے چلی گئی۔ لالی نے بش شرٹ اور پتلون اتار کر دھوتی باندھ لی اور اللہ دتا سے کہا۔ "یہ کپڑے دھونے کے لیے سرداراں کو دے دے۔ بازار جا اور جو کچھ میں نے بتایا ہے' خرید لا۔ میں تب تک سوتا ہوں۔ مجھے اونگھ لگ رہی ہے۔"

اللہ دتا نے لالی کے میلے کپڑے اٹھائے اور باہر جانے لگا۔ لالی نے اسے ٹوکا۔ "اندھیرا ہوتے ہی میں تیرے ساتھ جہانگیرہ چلوں گا۔ لے چلے گا نا؟"

"کیوں نہیں لے چلوں گا؟" اللہ دتا نے مسکرا کر کہا۔ "جہانگیرہ کیا' جہاں کہے وہاں لے چلوں گا۔ اب تو میرے پاس ایک چھوڑ دو اوٹھ ہیں۔"

لالی نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔ "دونوں اوٹھ جتنی جلدی ہو سکے' بیچ دے۔ انھیں رکھنا ٹھیک نہیں۔ نور علی کھوکھر کے کرندے تیری تلاش میں ہوں گے۔ وہ اوٹھوں سے تیرا پتہ چلا لیں گے۔ اس دفعہ وہ تجھے چھوڑیں گے نہیں۔ تجھے اور اللہ دینو' دونوں کو مار کے گھر میں آگ لگا دیں گے۔"

"کہتا تو ٹھیک ہے۔" اللہ دتا سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔ "کھوکھر بہت ظالم ہے۔ وہ ضرور مجھ پر حملہ

کرائے گا۔ پتہ ہے، وہ کتنا ظالم ہے؟"

"داؤد پور بھی چھوڑ دے۔ کسی اور طرف نکل جا۔" لالی نے خبردار کیا۔ "یہاں رہے گا تو تیرے لیے ہر وقت خطرہ ہی رہے گا۔ کھوکھراں یہاں سے دور تو ہے پر بہت زیادہ دور نہیں، ایک ہی تحصیل ہے۔"

اللہ دتا خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ چند لمحوں بعد اس نے کہا۔ "حاصل پور میں سرداراں کی ایک پھپھی ہے، اس سے پیار بھی کرتی ہے۔ اس کے پاس بھی جا سکتا ہوں۔ حاصل پور تو بھاول نگر میں ہے۔ میں وہاں جاتا رہتا ہوں۔"

"اوٹھ بیچ کر ہل خرید لینا۔ کسی زمیں دار کا مزارع بن جانا۔" لالی نے اللہ دتا کا سہما ہوا چہرہ غور سے دیکھا۔ "آج ہی رات اللہ دیتو اور بال بچوں کے ساتھ دونوں اوٹھ لے کر یہاں سے نکل جا۔ رستے میں اوٹھ بیچ دینا۔"

اللہ دتا نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ "ایسا ہی کروں گا۔ تیں نوں جہانگیرہ چھوڑ کر واپسی پر حاصل پور نکل جاؤں گا، سرداراں سے کہتا جاؤں گا، چلنے کی تیاری کر لے۔" اللہ دتا چلا گیا۔ لالی بستر پر لیٹ کے سو گیا۔

شام کو لالی بیدار ہوا۔ کمرے میں چراغ روشن تھا۔ سرداراں دہلیز پر خاموش بیٹھی تھی۔ لالی اٹھ کے بیٹھ گیا۔ سرداراں مسکرا کر بولی۔ "توں سوتا بہت ہے۔ اللہ دتا تو بالکل نہیں سویا۔ تیری ساری چیزیں بازار سے لے آیا۔ میں نے تیرے کپڑے لتے بھی دھو دیئے، سوکھ بھی گئے۔ یہ سامنے پڑے ہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کے چٹائی کی طرف اشارہ کیا۔

لالی نے دیکھا، چٹائی پر پتلون اور بش شرٹ کے علاوہ دیسی جوتوں کی ایک جوڑی، دھوتی، چادر اور ہمیانی رکھی ہے۔ لالی بستر سے اتر کر نیچے آ گیا اور انگڑائی لے کر بولا۔

"سب ہی کچھ آ گیا۔ اللہ دتا بہت کام کا بندہ ہے۔"

"پر دوسری کمیص تو تیرے پاس ہے نہیں۔ اللہ دتا کے پاس ایک پرانی کمیص پڑی ہے، پر بہت پھٹ گئی۔ توں اسے پہن نہیں سکتا۔ میں سنارے کے گھر سے ایک کمیص مانگ کر لائی ہوں۔ ہے تو وہ بھی پرانی پر پھٹی ہوئی نہیں ہے۔ یہ رہی۔" اس نے زانو پر پڑی ہوئی قمیص لالی کے سامنے ڈال دی۔

لالی نے قمیص الٹ پلٹ کے دیکھی۔ "ٹھیک ہی ہے۔ یہ تو نے بہت چنگا کام کیا۔" لالی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "سرداراں! تو بہت کام کی زنانی ہے۔ اللہ دتا نصیبوں والا ہے کہ



اسے تیری ایسی اہری اور سمجھ دار گھر والی ملی۔"

"کیا کریں جی! ہنسی خوشی علی شاہ میں رہتے تھے۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کھوکھر کا بیڑا گرک ہو۔ اس نے ہمیں تباہ کر دیا، کچھ بھی نہیں رہا۔ اللہ دتا حاصل پور چلنے کو کہتا ہے، پر اپنے پاس تو کھانے کو بھی نہیں۔ تجھ سے تو کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ تجھے تو سب پتہ ہے۔ اللہ دتا مجھے بتا چکا ہے، تیری اس سے کیا کیا بات ہوئی۔ وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتا۔"

لالی نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ جیب سے بٹوا نکالا۔ سو روپے کا ایک نوٹ کھینچ کر انگلیوں میں دبایا۔ سرداراں کی جانب بڑھا کے گویا ہوا۔ "لے یہ رکھ لے۔ اپنا کام چلا۔ اوٹھ بک گئے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے اللہ دتا سے یہی کہا ہے۔"

سرداراں نوٹ لیتے ہوئے بولی۔ "توں نے پہلے ہی ہماری بہت مدد کی ہے۔ اللہ دتا کی مدد نہ کرتا تو جانے میں کب تک سرگانے پر سنار کے گھر میں بندھک رہتی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "دن بھر اس کی ماڑی میں کام کاج کرتی تھی۔ سنار کی گھر والی بھلی زنانی نہیں ہے۔ مجھے بالوں سے پکڑ کر مارتی۔ نوچتی کھسوٹتی، چیخ چیخ کر گالاں نکالتی۔" سرداراں کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

"رونا دھونا چھوڑ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تو اب ٹر جا۔ میں ذرا کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤں۔ شام ہو گئی، مجھے اللہ دتا کے ساتھ جہانگیرہ جانا ہے۔"

سرداراں چلی گئی۔ لالی نے قمیص پہنی، دھوتی باندھی۔ سر پر پگڑی لپیٹی۔ جوتے پہنے اور وضع قطع سے دیہات کا رہنے والا پینڈو بن گیا۔ اس نے ہمیانی میں بٹوے سے روپے نکال کر رکھے اور اسے کمر کے گرد مضبوطی سے باندھ لیا۔ تھوڑے سے روپے رکھ کر بٹوے کو قمیص کی جیب میں ڈال لیا۔

اس نے کونے میں رکھی ہوئی رائفل اٹھائی۔ اس میں بھرا ہوا کارتوس نکال کر میگزین میں لگا دیا۔ رائفل اپنے کپڑوں میں لپیٹی، چادر پر رکھی اور لمبی سی گٹھری بنالی۔ یہ تیاری کر کے وہ اللہ دتا کا انتظار کرنے لگا۔

باہر صحن میں شام اتر آئی تھی۔ اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اللہ دتا آ گیا۔ اس کے پہنچتے ہی سرداراں کھانا لے کر آ گئی۔ کھانے میں پراٹھے اور تلا ہوا مرغ تھا۔ سرداراں نے مرغ کی طرف اشارہ کر کے لالی سے کہا۔

"یہ ککڑ میں نے تیرے ہی لیے تلا ہے۔"

اللہ دتا نے مسکرا کر کہا۔ "میرے لیے نہیں؟"

"توں بھی کھالینا۔" وہ شرما گئی۔ "ویسے یہ تیرا بھی مہمان ہے۔ توں مجھ سے الگ تو نہیں ہے۔" وہ ذرا دیر بعد چلی گئی۔

لالی کو بھوک نہیں تھی۔ اس نے تلے ہوئے مرغ سے تھوڑا گوشت نوچ کر کھایا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ اللہ دتا نے اصرار بھی کیا۔ مگر اس نے کھانا نہیں کھایا۔ اللہ دتا کھانا کھاتا رہا۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہوا تو لالی اور اللہ دتا گھر سے باہر چلے گئے۔ دروازے کے قریب ہی اونٹ موجود تھا۔ اللہ دتا نے ساری تیاری پہلے ہی مکمل کرلی تھی۔ اندھیرا خاصا بڑھ گیا تھا۔ دونوں اونٹ پر سوار ہوئے اور جہانگیرہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

اللہ دتا کا اندازہ غلط تھا۔ جہانگیرہ بارہ نہیں' سترہ میل سے بھی زیادہ فاصلے پر تھا۔ جب وہ جہانگیرہ پہنچے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ لالی گاؤں سے دور اتر گیا۔

☆

جہانگیرہ میں داخل ہو کر لالی نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور بستی کی جانب بڑھنے لگا۔ رائفل گٹھری میں بندھی ہوئی اس کی پشت پر لٹک رہی تھی۔ ذرا دیر بعد وہ نیم کے درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑا تھا۔ گاؤں پر گہری خاموشی طاری تھی۔ کہیں کہیں مکانوں میں چراغوں کی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ جب دیر تک کوئی آہٹ اور آواز نہیں ابھری تو وہ دبے دبے قدموں چلتا ہوا شاداں کے گھر کے قریب پہنچا اور آنگن کی چار دیواری سے لگ کر اندھیرے میں کھڑا ہوگیا۔ اس نے اچھل کر دونوں ہاتھوں سے دیوار پکڑی اور اوپر پہنچ گیا۔ وہ چند لمحوں تک دیوار سے چمٹا ہوا لیٹا رہا۔ آنگن بالکل سنسان تھا۔

لالی دھیرے سے نیچے اترا۔ آنگن میں پہنچ کر سب سے پہلے اس نے دالان کی جانب دیکھا۔ دالان کے ایک کونے میں لالٹین روشن تھی۔ اس کی لو مدھم تھی۔ دالان میں چارپائی بچھی تھی اس پر کوئی سو بھی رہا تھا۔

لالی ہولے ہولے چلتا ہوا دالان میں پہنچا۔ بستر کے قریب گیا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگالیا کہ وہ شاداں ہے۔ شاداں بستر پہ بے خبر سو رہی تھی۔ لالی نے پشت پر لٹکتی ہوئی گٹھری اتار کر دالان میں ایک طرف رکھی۔ ایک بار پھر شاداں کے نزدیک گیا اور اسے آہستہ سے جھنجوڑا۔ شاداں نے آنکھیں کھول کر لالی کو دیکھا اور خوف و حیرت کے ملے جلے لہجے میں بولی۔ "لالی!" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔



لالی نے کمرے کے بند دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ "اندر تو کوئی نہیں ہے؟"

"نہیں۔" وہ اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر جوڑا باندھتے ہوئے بولی۔ "میرے سوا گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

لالی اس کے قریب ہی چارپائی پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ شاداں نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ "اب کس لیے آیا ہے؟"

"تو کہتی ہے تو نہیں آؤں گا۔"

"یہ بات نہیں۔" شاداں نے آہستہ سے بتایا۔ "پولیئے تیری تلاش میں دو بار یہاں آچکے ہیں تھانیدار نے بھی ایک روز مجھے بلایا تھا۔ تیں نوں پتہ ہے' وہ ملک کا بھرا ہے۔ اس نے ڈرایا دھمکایا' الٹے سیدھے سوال کر کر کے میرا مگر خراب کردیا۔"

"تو نے کیا کہا؟"

"کہنا کیا تھا۔" شاداں نے جواب دیا۔ "میں نے ہر بار یہی کہا' وہ بالے کا یار ہے۔ اسی سے ملنے آیا تھا۔"

"بالے کے بارے میں تو کچھ نہیں پوچھا؟"

"کیوں نہیں پوچھا۔ پر میں نے یہی کہا' مجھے کیا پتہ' وہ کہاں ہے؟ وہ تو تین مہینے سے اوپر ہوگئے' میرے پاس آیا نہیں۔ تاجی جانتی ہوگی۔ بالے اسی کے پاس رہتا تھا۔ اس نے ویاہ بھی کرلیا تھا۔"

"تاجی کہاں ہے؟"

"اس کا بھرا کراچی سے آیا ہے۔ وہ اسی کے پاس رہتی ہے۔ کہتی تھی' کراچی جاؤں گی۔ بالے وہیں گیا ہے۔"

چل' یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ تاجی کا تیرے ساتھ رہنا ٹھیک نہیں تھا۔"

"نہیں' یہ ٹھیک نہیں ہوا۔" شاداں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں چاہتی تھی' وہ میرے ساتھ رہے۔ اس کے بچہ پیدا ہو۔ وہ بالے ہی کا تو ہوگا۔ میں اسے پالتی' اپنے پاس رکھتی۔"

"تجھے اپنے بچے یاد نہیں آتے؟"

"یاد کیوں نہیں آتے۔" شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "پر جس دن میں نے بالے کے سنگ گھر چھوڑا' اسی دن بچوں کو بھی چھوڑ دیا۔ اب وہ میرے پاس کیسے آسکتے ہیں؟"

"کیسے نہیں آسکتے۔" لالی نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "پچھلے دنوں تیرا کھصم آیا تھا' بچے بھی

آئے ہوں گے۔ ان میں سے کسی کو اپنے پاس رکھ لیتی۔ گھر میں اکیلی پڑی رہتی ہے۔ تیرا جی نہیں گھبراتا؟"

شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "جی تو بہت گھبراتا ہے پر میرا گھر والا مانے گا نہیں۔ کہتا تھا، میرے ساتھ چل۔"

"چلی جا اس کے پاس۔ یہاں کب تک اکیلی پڑی رہے گی۔ اب تو بالے بھی نہیں رہا جس کے لیے تونے گھربار چھوڑا، بچے چھوڑے۔"

شاداں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لالی بھی ذرا دیر خاموش رہا۔ اس نے اصرار کرکے پوچھا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

مگر شاداں نے پھر بھی جواب نہ دیا، بات کا رخ پلٹتے ہوئے بولی۔ "تیں نوں پتہ نہیں، آج کل مجھ پر کیا بیت رہی ہے؟"

لالی نے کسی قدر پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیوں، کیا ہو گیا تجھے؟"

"مجھے تو کچھ نہیں ہوا پر بوری کا دودھ روز بہ روز کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔ وہ گبھن ہے۔" وہ لمحے بھر خاموش رہی۔ "تو ہی بتا، وہ دودھ دینا بالکل بند کردے گی تو کیا ہوگا۔ اسے کہاں سے کھلاؤں گی اور اپنا گزارہ کیسے کروں گی؟ مجھے ہردم یہی فکر رہتی ہے۔" شاداں غم زدہ ہو گئی۔

مگر لالی ذرا بھی متاثر نہ ہوا، مسکرا کر بولا۔ "پروا نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلے مجھے روٹی ٹکر دے۔ سخت بھوک لگی ہے۔"

"شام کو تو میں نے کچھ پکایا نہیں۔ دن کی روٹی پڑی ہے، کہے تو لے آؤں؟"

"لے آ، پر جھیتی نال۔"

شاداں خاموشی سے اٹھی، کمرے کا دروازہ کھولا۔ لالٹین کی لو اونچی کی۔ چھت سے لٹکے ہوئے چھینکے سے چنگیری اتاری اور لا کر لالی کے سامنے رکھ دی۔ چنگیری میں دو روٹیاں تھیں۔ لالی نے روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا اور اسے چبانے لگا۔ شاداں نے اسے روکھی روٹی کھاتے دیکھا تو مسکرا کر بولی۔ "بہت بھکا لگتا ہے۔ روکھی روٹی کیسے کھائے گا۔ ذرا صبر کر۔" وہ دالان سے نکل کر آنگن میں چلی گئی۔

لالی ایک کے بعد دوسرا لقمہ چباتا رہا۔ ذرا دیر بعد شاداں واپس آئی۔ وہ پیالے میں مکھن لے کر آئی۔ دوسرے ہاتھ میں پیاز کی گٹھی تھی۔ اس نے مکھن اور پیاز لالی کے سامنے رکھ دی۔ "گھر میں



اور کچھ نہیں تھا۔ یہی ملا، پر اس سے کام چل جائے گا؟" اس نے بے زاری سے منہ بگاڑا۔ "مجھے تو ڈھیر سی نصیحت کرتا ہے۔ کبھی یہ بھی سوچا، تیرا کام اس طرح کب تک چلے گا؟"

لالی نے کھانا کھاتے کھاتے مسکرا کر شاداں کی جانب دیکھا، مگر کوئی بات نہیں کی۔ چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔ دونوں روٹیاں، مکھن اور پیاز سب چٹ کر گیا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے شاداں سے پانی منگوایا اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس غٹاغٹ پی گیا۔ وہ شاداں کی جانب متوجہ ہوا۔

"اب بتا، کیا کہہ رہی تھی؟"

"کہنا کیا ہے۔" شاداں نے لالٹین کی لو دھیمی کی۔ اسے کونے میں رکھا اور لالی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ "یہ تو سوچ تیرا کیا بنے گا؟ کب تک پولیس سے چھپتا پھرے گا۔"

"میری فکر نہ کر۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "پہلے اپنے بارے میں سوچ۔"

"وہ تو میں ہر وقت سوچتی رہتی ہوں۔" شاداں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب سے تیری لائی ہوئی بوری کے گبھن ہونے کا پتہ چلا ہے، میرا تو سوچتے سوچتے برا حال ہو گیا۔"

"مجھے پکڑوا دے۔ دو ہزار روپے انعام ملے گا۔"

شاداں نے غصے سے لالی کو دیکھا۔ "تیرے دل میں ابھی تک میل ہے۔ مجھے تیری یہ گل بالکل پسند نہیں۔ تو یہاں نہ آیا کر۔ کسی روز دوڑ آ گئی۔ پولیس نے تجھے پکڑ لیا تو یہی سمجھے گا، میں نے پکڑوا دیا۔" اس نے اپنی بات پر زور دے کر ترش روئی سے کہا۔ "تیری باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے، ضرور یہی سمجھے گا۔ رب سوں......"

لالی نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اب چپ بھی کر، بہت کہہ لیا۔" لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سچ سچ بتا، تو مجھے کیسا بندہ سمجھتی ہے؟"

"تو برا بندہ نہیں، حوصلے والا بھی ہے پر......"

لالی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں نوں پتہ ہے، تو کیا کہنا چاہتی ہے۔"

شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی بھی ذرا دیر چپ رہا۔ اس نے کمر سے بندھی ہوئی ہمیانی کھولی اور دو ہزار روپے نکال کر شاداں کو دیتے ہوئے بولا۔ "لے، ان سے دوسری مج خرید لینا۔"

شاداں نے روپے ہاتھ میں لے لیے۔ چند لمحے حیرت سے لالی کا منہ تکتی رہی۔ اس نے دریافت کیا۔ "اتنے ڈھیر سے روپے کہاں سے لے آیا؟" اس نے تامل کیا۔ "چوری کی ہو گی؟"

"چوری چکاری تو میں نے بہت کی ہے۔ پر اس دفعہ چوری نہیں کی، ایک زنانی کا سودا کیا تھا۔" شاداں کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مگر لالی اس کے تاثرات سے بے نیاز کہتا رہا۔ "نہ پوچھ کیسی

باتکی سجیلی نار تھی۔ ایسی سوہنی کہ تجھے کیا بتاؤں۔"

شاداں نے جھنجلا کر لالی کو دیکھا۔ "تو جانگلی ہے' یہ تو میں جانتی ہوں۔" اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "جانگلی ہو کر چوری چکاری کر سکتا ہے پر تو یہ دھندا بھی کرتا ہے' یہ میں نوں پتہ نہیں تھا۔" وہ لمحے بھر رکی اور ہاتھ میں دبے ہوئے روپے لالی کی جانب پھینک کر بولی۔

"مجھے ایسے روپے نہیں چاہئیں۔ میں تجھے ایسا بندہ نہیں سمجھتی تھی۔" وہ چارپائی سے نیچے اتری اور لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "اب سمجھی' تو کیوں بار بار میرے پاس آتا ہے۔"

لالی نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "گل تو سن۔"

شاداں نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑا لیا۔ "میں نے اب تیری کوئی گل بات نہیں سن نی۔" اس نے غصے سے ڈپٹ کر کہا۔ "اٹھا اپنے روپے اور ابھی میرے گھر سے ٹر جا۔"

"اتنا نراض کیوں ہوتی ہے؟" لالی بھی چارپائی سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "تو میری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔"

مگر شاداں کی برہمی کم نہ ہوئی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا اور تیکھے لہجے میں کہا۔ "تو مجھے کوم کا باہنی وال لگتا ہے۔"

"تو کوم کی بات کرتی ہے' میں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں' میرا پیو کون تھا۔" لالی بے نیازی سے مسکرا کر بولا۔ "ویسے تو کہاں کی لنگریال ہے۔ کون سے تیرے گھر پر لنگر کھلے ہیں۔"

"لنگریال تو نہیں ہوں۔ پر میرا پیو داد ختیانے کا تھا۔" شاداں نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ "میں ختیانوں کی بیٹی ہوں۔"

"ہو گی' ضرور ہو گی۔" لالی نے اسے منانے کی کوشش کی۔ "پہلے میری بات تو سن لے۔"

"میں اب تیری کوئی بات نہیں سنوں گی۔" وہ غصے سے ہانپ رہی تھی۔ "دلا' کنجر' عورتوں کو بھگا کر چکلوں میں بیچتا ہے۔ بے غیرت' آخ تھو۔" اس نے حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔

لالی کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے شاداں کو دیکھا۔ "زیادہ کڑ کڑ نہ کر۔ ورنہ....." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ورنہ کیا کرے گا؟" شاداں کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔ "دلا گیری کرتا ہے' اوپر سے آنکھیں دکھاتا ہے۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ غصے سے بے قابو ہو کر بھڑکتا شعلہ بن گیا۔ اس نے ایک ہونٹ دانتوں میں دبا کر شاداں کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ ہاتھ ایسا بے ڈھب پڑا کہ شاداں سنبھل نہ



سکی۔ لڑھکتی ہوئی دہلیز پر جا کے گری۔ اس کا سر دروازے کی چوکھٹ سے زور سے ٹکرایا۔ چند لمحوں تک وہ خاموش پڑی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ غصے سے ہانپتے ہوئے بولی۔

"یہاں سے چلا جا۔ نہیں تو چیخ چیخ کر سارے پنڈ کو اکٹھا کر لوں گی۔"

"سب کو اکٹھا کر لے۔ مجھے پکڑوا دے' پر تو ایسی بات نہیں کہہ سکتی۔ میں ایسی گالی نہیں سن سکتا۔" لالی نے اس کی دھمکی سے بے نیاز ہو کر کہا۔ "میں چوری ڈکیتی ضرور کرتا ہوں پر ایسا گندا دھندا نہیں کرتا۔ اور یہ بھی سن لے' میں بالے نہیں ہوں۔ زنانی کی کمائی نہیں کھاتا۔ اسے دینا جانتا ہوں' اس سے لینا نہیں جانتا۔"

شاداں دروازے سے پیٹھ ٹکائے خاموش بیٹھی رہی۔ لالی نے لالٹین کی دھندلی روشنی میں دیکھا' خون کی ایک پتلی دھار شاداں کے سر سے بہہ کر ماتھے اور کنپٹی پر پھیلتی جا رہی ہے۔ لالی کا سارا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ تڑپ کر شاداں کی جانب بڑھا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے خون پونچھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو شاداں نے غصے سے جھٹک دیا۔ منہ بگاڑ کر بولی۔

"رہنے دے اپنا لاڈ۔ بڑا آیا' میرا سگا بن کر۔"

"پاگل نہ بن۔" اس نے شاداں کا خون پونچھا تو اس کا ہاتھ تر بتر ہو گیا۔ لالی نے گھبرا کر کہا۔ "تیرے تو بہت چوٹ آ گئی۔"

شاداں چپ رہی۔ خون کے سرخ سرخ قطرے ٹپ ٹپ شاداں کے رخساروں پر گرتے رہے لالی نے جھٹ اس کا دوپٹا اتارا' جھٹکا دے کر جھر سے پھاڑا اور اس کے ایک ٹکڑے سے خون صاف کرنے لگا۔ مگر خون نہیں رکا۔ چوٹ گہری آئی تھی۔ لالی تیزی سے آنگن میں گیا۔ کٹورے میں پانی بھر کر لایا۔ اس نے دوپٹے کا ایک ٹکڑا اور پھاڑا۔ اسے پانی میں بھگو کر سر اور رخساروں سے خون صاف کرنے لگا۔ خون پونچھنے کے بعد اس نے زخم پر کپڑے کی گدی بنا کر رکھی اور دوپٹے کا جو حصہ باقی بچا تھا' اسے سر سے لپیٹ کر پٹی باندھ دی۔ شاداں نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔

لالی نے اس کا بازو تھام کر آہستہ سے کہا۔ "چل' بستر پر لیٹ جا۔"

شاداں نے بے رخی سے کہا۔ "مجھے یہیں بیٹھا رہنے دے' میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ "تو نے اکیلی اور لاوارث جان کر مجھے مار لیا۔" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے چہرے پر رکھ لیے اور تڑپ کر بولی۔ "ہائے ربا! میں مر گئی۔ میرا کوئی نہیں۔"

رات کے گہرے سناٹے میں شاداں کی سسکیاں ابھرتی رہیں۔ لالی اس کے قریب چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس نے شاداں کے سر پر ہاتھ رکھ کر اظہار معذرت کیا۔ "شاداں! معاف کردے۔ میں نوں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں نے بہت برا کیا۔" شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سسکیاں بھرتی رہی۔ لالی نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر چہرے سے ہٹائے۔ چہرہ اوپر اٹھایا' مگر شاداں نے نظریں نہیں ملائیں۔ لالی نے نرمی سے کہا۔ "نہ رو شاداں!" وہ پھر بھی روتی رہی' آنسو ٹپکتے رہے۔ لالی جذبات سے بے قرار ہوگیا۔ تڑپ کر بولا۔

"تونے رونا بند نہ کیا تو میں بھی اپنا سر پھوڑ لوں گا۔"

وہ تڑپ کر اٹھا۔ آگے بڑھا اور پاگلوں کی طرح دیوار پر دھم سے ٹکر ماری۔

شاداں نے رونا بند کردیا۔ پریشان ہوکر لالی کو دیکھا۔ لالی نے ٹکر مارنے کے لیے دوبارہ سر جھکایا۔ شاداں نے جھٹ اس کا سر تھام لیا۔ گھبرا کر بولی۔ "یہ کیا کر رہا ہے؟ تیرا مگر تو نہیں چل گیا؟"

"ہاں' میرا مگر ہی چل گیا ہے۔" لالی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں تجھے روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔"

شاداں نے آنکھیں مل کر آنسو پونچھے۔ "لے' میں نے رونا بند کردیا۔ سمجھ نہیں آتی تو کیسا بندہ ہے؟"

"بات یہ ہے شاداں! تو لاوارث نہیں' لاوارث تو میں ہوں۔ میرا تو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔" لالی کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ اس کا لہجہ اور جذباتی ہوگیا۔ "تو نوجوان ہے' سوہنی اور متصیلی ہے۔"

شاداں بات کاٹ کر جھٹ بولی۔ "کہاں رہی جوان اور متصیلی۔ اب تو جل کر راکھ ہوگئی ہوں۔"

لالی نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا' پھر اس نے پوچھا۔ "ایک بات شاداں! تیری کتنی عمر ہوگی؟"

"پتہ نہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "جب میرا ویاہ ہوا تھا تو میں تیراں سال کی تھی۔ تین سال بعد میری پہلی نکی پیدا ہوئی پر وہ چھ مہینے بعد مرگئی۔ دو سال بعد جیجا پیدا ہوا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "کتنے سال ہوئے یہ؟"

"تیراں اور تن' سولاں' ساڑھے سولاں اور دو اٹھاراں۔" یہ حساب لگا کر اس نے شاداں سے پوچھا۔ "جیجا اب کتنے برس کا ہے؟"



"پچھلے جاڑوں میں نویں سال میں لگ گیا۔"

"اس حساب سے تو تیری عمر ۲۷ سال ہوگی۔"

"تو یہ کم عمر ہوئی؟" شاداں مسکرا کر بولی۔

"ارے یہ تو کچھ بھی نہیں ہوئی۔" لالی کھل کر مسکرایا۔ "میں نے تو ۴۵ سے بھی اوپر کی زنانیاں دیکھی ہیں۔ ایسی جوان' ایسی بانکی سجیلی۔ دیکھو تو دیکھتے رہ جاؤ۔ بالکل مٹیار لگتی تھیں۔"

"ہٹ' ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟"

"میں کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔" لالی نے اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "کل ہی رات کی تو بات ہے۔ پوری سات زنانیاں تھیں۔ کوئی بھی ۴۰ سال سے کم نہیں تھی پر اتنا زوردوں کا سنگھار کیے ہوئے تھیں کہ ہر ایک اتنی سوہنی اور جوان لگتی تھی' میں تجھے بتا نہیں سکتا۔"

شاداں نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "کسی چکلے میں تو نہیں چلا گیا تھا؟"

"نہیں جی' ایسی کوئی گل بات نہیں۔ بہت وڈے افسروں کی گھروالیاں تھیں۔ ان کے کھسم بھی موجود تھے۔"

"پر تو وہاں کیسے پہنچ گیا؟ تیں نوں ڈر نہیں لگا؟"

"وہ کچھ اور ہی چکر تھا۔" لالی نے مسکرا کر بتایا۔ "سب لاٹری ڈال کر ایک دوسرے سے اپنی گھر والیاں بدلتے تھے اور میں اس لاٹری کا امپائر تھا۔ امپائر جانتی ہے؟ وہ لاٹری کا جج ہوتا ہے۔ میں باری باری ہر ایک کی لاٹری نکالتا تھا۔ جو زنانی جس مرد کے حصے میں آتی' وہ رات بھر کے لیے اسے لے جاتی۔"

شاداں نے حیران و پریشان ہوکر پوچھا۔ "کیسی زنانیاں تھیں' انھیں ذرا بھی لاج نہ آئی؟"

"تو زنانیوں کی بات کرتی ہے۔ مرد تو زنانیوں سے بھی زیادہ بے غیرت تھے۔ ہنسی خوشی اپنی گھر والی کو دوسرے مرد کے پاس سونے کے لیے بھیجتے تھے۔ اسی چکر میں تو میں نے نوٹوں سے بھرا ہوا یہ بٹوا اڑا لیا۔" لالی نے جیب سے بٹوا نکال کر دکھایا۔ "چوری کرکے نہیں لایا۔ دکھا کر اور بتا کر لایا ہوں۔ بعد میں اس میں سے روپے نکال کر میں نے ہمیانی میں باندھ لیے۔"

شاداں ابھی تک حیرت زدہ تھی۔ "یہ تونے عجب گل سنائی۔"

"عجب گل تو ہے' پر تیں نوں کیہہ پتہ' دنیا میں کیا کیا ہوتا ہے۔"

"میرا پیو ٹھیک ہی کہتا تھا۔ یہ چودھویں صدی ہے۔ کلجگ ہے کلجگ۔ جو کچھ نہ ہوجائے' تھوڑا

ہے۔"

"چھوڑ یہ کلجگ بھلجگ۔" لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "اب یہاں کب تک بیٹھی رہے گی۔ چل اٹھ' منجی پر جا کر لیٹ۔ تیں نوں بہت چوٹ آگئی ہے۔ یہ گھ بھی بہت حرام دا ہوتا ہے۔" اس نے شاداں کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اٹھایا۔ شاداں خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور لالی کے جسم کا سہارا لیے ہوئے چارپائی پر جا کر بیٹھ گئی۔ مگر بستر پر لیٹی نہیں۔ لالی کے اصرار پر بھی نہیں لیٹی۔

لالی نے بستر پر بکھرے ہوئے دو ہزار کے نوٹ اٹھائے اور شاداں کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لے اب تو انھیں رکھ لے۔ دوسری مج خرید لینا۔"

شاداں نے نوٹ لینے سے انکار کردیا۔ "انھیں اپنے ہی پاس رہنے دے۔"

"ابھی تک ناراض ہے؟"

"نہیں' یہ بات نہیں۔" شاداں نے آہستہ سے کہا۔ "بوری مرگئی تھی تو تو نے مجھے دوسری لا دی۔ اب تو مجھے اتنے روپے کیوں دینا چاہتا ہے؟"

"خاما خا کی باتیں نہ کر۔" لالی نے پیار سے ڈانٹا۔ "انھیں یہ سمجھ کر رکھ لے کہ بالے مرگیا۔"

"پر وہ تیرا کون لگتا تھا۔"

"میرا تو کوئی نہ تھا پر تیرا تو تھا۔ جب کسی کا کوئی مرجاتا ہے تو جات برادری والوں کو کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے۔" اس نے ذرا سا تامل کیا۔ "میں اس کا نہیں پر تیرا تو کچھ لگتا ہی ہوں۔ نہ مان' یہ بات دوسری ہے۔" شاداں خاموش بیٹھی رہی مگر لالی خاموش نہیں رہا۔ "میرا پیو کوم کا کھل تھا۔ میں نے سنا ہے 'کھل' ہرل' لکھیرے' اپیرے اور فتیانے' سب ایک ہی کوم کے ہوتے ہیں۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "لے' اب انکار نہ کر۔"

لالی نے اصرار کرکے نوٹ شاداں کو دے دیئے۔ اس دفعہ اس نے انکار نہ کیا' خاموشی سے سارے نوٹ لے کر دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔ لالی اس کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ذرا دیر بعد خاموشی میں شاداں کی آواز ابھری۔

"لالی! ایک بات پوچھوں' میج سچ بتائے گا؟"

"پوچھ! ضرور پوچھ۔"

شاداں نے ہچکچاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "یہ بتا' تو اس طرح راتوں کو چھپ لک کر میرے کول کیوں آتا ہے؟ میری ہر طرح مدد بھی کرتا ہے۔ یہ سب کچھ کیوں کرتا ہے؟"



"سچ سچ بتا دوں؟"

"میں سچ سچ ہی سننا چاہتی ہوں۔"

"سچ تو یہ ہے شاداں! میں نوں خود نہیں ملوم' میں تیرے کول کیوں آتا ہوں۔" لالی آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ "مجھے پتہ ہے' تو نے زندگی میں صرف بالے سے پیار کیا۔ وہ مرگیا پر تو آج بھی اسی سے پیار کرتی ہے اور اسی کے پیار کی کارن ابھی تک اسی گھر میں رہتی ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"نہیں! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شاداں نے اعتراف کیا۔

"اور میں یہ بھی جانتا ہوں' مجھ سے تجھے ذرا بھی پیار نہیں' ہو بھی نہیں سکتا۔ میں چور اچکا جو ہوں۔ جیل سے بھاگا ہوا کیدی ہوں۔ ایسے بندے سے کوئی زنانی' کوئی ٹیار' پیار نہیں کرسکتی اور تو تو بالکل نہیں کرسکتی۔" اس نے شاداں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "تو مجھ سے ڈرتی ہے اور اس لیے ڈرتی ہے کہ میں بالے کے کتل کا راز جانتا ہوں۔"

شاداں چپ بیٹھی رہی۔ لالی ذرا دیر خاموش رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "مجھے ایک چدّر دے دے' رحیم داد کو دوں گا۔ ویسے میرے پاس چدّر ہے۔ ایک اور دے دے۔ میں اب سیدھا اسی کے پاس جاؤں گا۔ جانے وہ کس حال میں ہوگا۔"

شاداں خاموشی سے اٹھی۔ کمرے کے اندر گئی اور ایک چادر لے کر واپس آئی۔ چادر دیتے ہوئے اس نے لالی سے کہا۔ "ذرا دیر ٹھیر جا۔ میں تیرے لیے روٹی پکا دوں۔ کل کیا کھائے گا؟"

"تو نے پہلے کبھی یہ بات نہیں کہی' آج کیا بات ہے؟"

"میں نے پہلے بھی کہا تھا' میں تجھے برا بندہ نہیں سمجھتی۔ تجھ سے نفرت بھی نہیں کرتی۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکی۔ "لالی! تو چوری چکاری کا دھندا نہیں چھوڑ سکتا؟"

"تو کہتی ہے تو چھوڑ دوں گا' پر ایک شرط ہے۔"

"کیا شرط ہے؟" شاداں نے بے چین ہوکر پوچھا۔ "بتا' وہ بھی بتا۔"

"میرے ساتھ بھاگنے پر تیار ہوجا۔"

"تو نے فیر مسکری شروع کردی۔"

"نہیں! میں مسکری بالکل نہیں کر رہا۔" لالی نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں تجھے بھگا کر لے جانا چاہتا ہوں۔ اسی طرح جیسے بالے تجھے بھگا کر یہاں لایا تھا۔"

شاداں چند لمحے خاموش رہی پھر مسکرا کر بولی۔ "مان لے' میں تیرے ساتھ جانے کو تیار بھی ہوجاؤں تو مجھے کہاں لے جائے گا۔ خود بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ پولیس کے ڈر سے چھپتا لکتا رہتا

ہے۔"

"میرا انتظار کر سکے گی؟" لالی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں ایک رات آؤں گا اور بھیتی آؤں گا۔ تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اس روز میں نئی زندگی شروع کروں گا، تیرے ساتھ لہور یا کراچی چلا جاؤں گا۔ محنت مزدوری کروں گا۔ کوئی بھی دھندہ کر لوں گا پر چوری ڈکیتی ہرگز نہیں کروں گا۔ تجھے خوش رکھوں گا۔" اس نے شاداں کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چراغ جھلملانے لگے۔ "بول، کیا کہتی ہے؟" لالی بہت جذباتی ہو گیا۔ اس نے اپنے بازو پھیلا کر شاداں کو اپنے سینے سے لگایا اور اس کے سر کا زخم چوم لیا۔ "اب تو ہاں کہہ دے۔"

وہ آہستہ سے بولی۔ "مجھ سے دھوکا تو نہیں کرے گا؟"

"یہ مرد کا وعدہ ہے۔ تجھ سے دھوکا کروں تو مجھے بھی بالے کی طرح چھری سے ٹوٹے کر کے زمین میں دبا دینا۔ میں نے تیرا پیار دیکھا ہے، تیری نفرت اور گھن بھی دیکھی ہے۔ میں تجھے پہچان گیا ہوں۔ مجھے پتہ ہے، تو کیسی زنانی ہے۔" شاداں، لالی کے سینے سے لگی خاموش کھڑی رہی۔ رات ساکت اور نڈھال تھی۔ دونوں کونے میں رکھی ہوئی لالٹین کی دھندلی روشنی میں چپ چاپ کھڑے تھے۔ چند لمحوں بعد لالی کی آواز ابھری۔ "شاداں! مجھے اپنے پیو کا لاڈ ملا، نہ ماں کی ممتا ملی اور نہ بہین بھائیوں کا پیار۔ مجھے دنیا میں کچھ بھی نہیں ملا۔ تو مجھے سب کچھ دے سکتی ہے۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ وہ بے قرار ہو کر رو پڑا۔ اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو ٹپک کر شاداں کے سر اور ماتھے پر گرنے لگے۔

شاداں کسمسائی۔ اس نے پریشان ہو کر گردن اٹھائی۔ لالی کو دیکھا۔ "رو رہا ہے؟" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا، روتا رہا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ شاداں نے پیچھے ہٹ کر ہاتھ اٹھایا۔ لالی کے آنسو پونچھے۔ "میں تیرا انتظار کروں گی، یہ شاداں کا وعدہ ہے۔ میں نے کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔" وہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی، پھر تڑپ کر بولی۔ "سمجھ لے، آج بالا میرے لیے مر گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مر گیا۔"

لالی نے دونوں ہاتھوں سے شاداں کے رخسار تھام کر اس کا چہرہ اوپر کیا، چند لمحے اس کی کنول کے مانند خوبصورت اور شفاف آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ پھر رخسار اور آنکھیں چوم کر بولا۔

"شاداں! اب میں چلوں گا۔"

شاداں نے آہستہ سے کہا۔ "ٹھیر جا، کل چلا جانا۔ میں تیرے لیے روٹی پکا دوں، ساتھ لے جانا۔



جانے اب تو کب آئے۔"

"تو کہتی ہے تو کل ہی چلا جاؤں گا۔"

شاداں چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ لالی دالان میں رکھی ہوئی لالٹین کی جانب بڑھا۔ اسے اٹھایا اور پھونک مار کر بجھا دیا۔ دالان میں اندھیرا چھا گیا۔ باہر صحن میں ستاروں کی روشنی پھیلی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے۔ لالی آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ شاداں اب کروٹ کے بل خاموش لیٹی تھی۔

رات دھیرے دھیرے گزرتی رہی۔

☆

اچانک آہٹ ہوئی۔ لالی نے نظریں گھما کر دیکھا۔ آنگن کی دیوار پر دھندلی روشنی میں ایک سر ابھرا ہوا نظر آیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک شخص چڑھ کر دیوار پر آ گیا۔ وہ آہستہ سے نیچے اترا اور گردن ادھر ادھر موڑ کر چوکنا نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ دروازے پر گیا اور اس کی کنڈی آہستہ سے کھول دی۔

وہ دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ وہاں سے دبے قدموں پتل کی جانب بڑھا۔ چھپر کے نیچے شاداں کی بھوری بھینس بندھی تھی۔ لالی چپ رہا۔ چند لمحے گزر گئے۔ وہ شخص چھپر کے نیچے سے نہیں نکلا۔ لالی فوراً تاڑ گیا کہ وہ کس ارادے سے دیوار پھاند کر گھر میں آیا ہے۔

لالی آہستہ سے اٹھا۔ اس نے جوتے اتار دیے۔ دالان سے اتر کر آنگن میں آ گیا۔ جھک کر دبے دبے قدموں پتل کی سمت بڑھا۔ قریب پہنچا تو اس نے دیکھا، دھندلی روشنی میں وہ شخص اکڑوں بیٹھا ہے۔ اس کی پشت لالی کی طرف تھی۔ وہ بھینس کی رسی آہستہ آہستہ کھونٹے سے کھول رہا تھا۔ لالی تیزی سے جھپٹا اور ہاتھ بڑھا کر اس کا منہ مضبوطی سے دبوچ لیا۔ وہ آواز بھی نہ نکال سکا۔ لالی کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ وہ اکہرے بدن کا نوجوان تھا۔ لالی نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کنپٹی پر زناٹے کا تھپڑ مارا۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ لالی نے ہاتھ ہٹا لیا۔ ساتھ ہی ایک تھپڑ اور رسید کیا۔ وہ گڑگڑا کر بولا۔

"مارو نہیں۔"

"کون ہے تو؟ مجھ اٹھانے آیا تھا؟"

"ہن جی! آیا تو اسی لیے تھا۔" وہ گھگھیا کر بولا۔ "زمیں دار نے بھیجا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر چار میل ادھر اہر لے جانا تھا۔"

لالی نے عقب میں چاپ سنی' وہ پلٹا۔ دھندلی روشنی میں شاداں کھڑی تھی۔ وہ حیران و پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس نے لالی سے پوچھا۔ "یہاں پٹل کے نیچے کیا کر رہا ہے؟"

لالی نے مویشی چور کی گردن دبوچی اور اسے اٹھا کر شاداں کے سامنے لایا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "ہائے! یہ کہاں سے آ گیا؟"

"تیری مج اٹھانے آیا تھا۔ اس سے پوچھ لے۔" اس نے مویشی چور کے منہ پر ایک اور تھپڑ رسید کیا۔ "بتا' اسی لیے آیا تھا نا؟"

وہ گردن ہلا کر مری ہوئی آواز میں بولا۔ "ہن جی! اسی لیے آیا تھا۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "مجھے جانے دے۔ غلطی ہو گئی معافی دے دے۔" وہ لالی کے قدموں پر گر پڑا۔ پیر پکڑ کر گڑگڑانے لگا۔ "اب کبھی ادھر نہیں آؤں گا' اگر آؤں تو جان سے مار دینا۔"

شاداں نے لالی سے کہا۔ "جانے دے اسے۔"

لالی نے جھک کر ایک بار پھر گردن دبوچی۔ اسے اٹھایا اور کھینچتا ہوا دروازے تک لے گیا۔ دروازہ کھول کے اس نے چور کو زور سے دھکا دیا۔ وہ اندھیرے میں دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ لالی نے دروازہ بند کر لیا۔

پاس پڑوس کے گھروں سے کھانسنے کھنکارنے کی آوازیں ابھرنے لگیں تھیں۔ لالی پریشان ہو گیا۔ لپک کر دالان میں گیا۔ چادر کھول کر رائفل نکالی۔ شاداں بھی اس کے قریب پہنچ گئی۔ رائفل دیکھ کر گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "ہائے تیرے پاس تو بندوق بھی ہے۔" لالی خاموش رہا۔ چیمبر میں کارتوس چڑھا کر رائفل لوڈ کرنے لگا۔ اس نے بھری ہوئی رائفل کندھے پر لٹکائی۔ شاداں کی دی ہوئی چادر' قمیص اور شلوار کے ساتھ رکھ کر گٹھری بنائی اور اسے بھی پیٹھ پر لٹکا لیا۔ شاداں حیرت سے دیکھتی رہی۔ بے چین ہو کر پوچھا۔

"یہ سب کیا کر رہا ہے؟"

"مجھے اب جانا ہے۔ یہاں ٹھیرنا میرے لیے خطرناک ہے۔"

شاداں کھسک کر اس کے قریب آ گئی۔ "کب آئے گا؟"

"میرا کہا مان' اپنی مج فوراً بیچ دے۔ ملک اللہ نواز اسے اٹھوا لے گا اور یہاں رہی تو تجھے بھی اٹھوا لے گا۔ وہ زبردست رسّا گیر ہے۔ تیں نوں پتہ ہی ہے' اس کا بھائی ادھر تھانے دار لگا ہے۔"

"پر میں جاؤں گی کہاں؟"

"کادر آباد جانتی ہے؟"



"جانتی ہوں۔ ادھر تو سٹیشن بھی ہے۔"

"وہاں تیرا کوئی جاننے والا ہے؟"

وہ سوچنے لگی۔ لالی نے کہا۔ "جھیتی نال بتا۔ میں نوں اب جانا ہے۔"

شاداں نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا۔ "ادھر میرا ایک ماماں ہے۔ چھوٹی تھی تو اس کی پاس جا کر رہتی بھی تھی۔ پر یہ بات کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"تو اس کے پاس چلی جا۔ میں تجھے وہیں آ کر ملوں گا۔"

"پر مجھے وہاں کیسے ملے گا؟" شاداں نے دریافت کیا۔ "ویسے میرے ماماں کا نام کرامت ہے۔ وہ دودھی ہے۔ گھروں سے دودھ اکٹھا کر کے دکان داروں کو بیچتا ہے۔"

"بس اتنا کافی ہے۔ میں تیرے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"پر مجھے کادر آباد کیوں بھیجنا چاہتا ہے؟ صاف صاف بتا' مجھ سے چھپا نہیں۔"

"تجھ سے اب کیا چھپانا' اب تو میری بن ہی چکی ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "میں کادر آباد کے اس پار لوئر باری دو آب نہر کے پیچھے ٹبوں پر رحیمے کے ساتھ چھپا ہوا ہوں۔ پر جلد ہی وہ ٹھکانا چھوڑ دوں گا۔ شام کو نہر پر آ جائے گی تو تجھے آسانی سے مل لوں گا۔ نہر تو کادر آباد سے بالکل نزدیک بہتی ہے۔ بیچ میں صرف سڑک ہے۔"

"وہاں کب تک پہنچے گا؟"

"میں وہیں جا رہا ہوں۔ تو جلد سے جلد وہاں پہنچ جا۔ کادر آباد جا کر جی چاہے تو دوسری مج خرید لینا۔ تیرے پاس روپے ہیں اور تیرا ماما دودھی بھی ہے۔ تجھے کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔"

لالی آگے بڑھا۔ شاداں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دروازے پر پہنچ کر بولی۔ "میں تیرے ساتھ رڑی تک چلوں گی۔"

"نہیں' تو گھر ہی میں رہ۔" لالی نے اسے منع کر دیا۔ "آج خطرہ بہت ہے۔ ڈنگر چور مار کھا کر سیدھا اللہ نواز کے پاس گیا ہو گا۔ ویسے اس کے ساتھی بھی باہر ہوں گے۔ تیرا اس وکھت میرے ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔"

لالی نے رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی۔ شاداں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ لالی نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا۔ "جھیتی نال کادر آباد پہنچ جانا۔" لالی دروازے سے گزر کر باہر گلی میں آ گیا۔

وہ رائفل سنبھالے' چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا' گلی سے نکلا۔ رڑ میں پہنچ کر اس نے

نصف سے بھی کم راستہ طے کیا تھا کہ سامنے سے کسی نے اونچی آواز میں ٹوکا۔ ”کون ہے جی؟“ لالی نے جھٹ راستہ بدل لیا۔ تیزی سے کھیتوں کی جانب لپکا اور گندم کے ایک کھیت میں گھس گیا۔ اسے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ لالی گندم کے پودوں کی اوٹ میں چھپا ہوا کھسک کر آگے بڑھنے لگا۔

رات ڈھل رہی تھی اور سناٹے میں رڑکی طرف سے بولنے کی ملی جلی مدھم آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ لالی کے لیے پودوں کے درمیان سے گزرنا مشکل تھا۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح کھیت سے نکل کر پگڈنڈی پر آگیا اور گردن جھکا کر راستے کا اندازہ کیے بغیر تیزی سے آگے بڑھا۔



# ۱۱

لالی ایک لق دوق میدان کے نشیب میں آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ یہ دریائے بیاس کی قدیم
رگاہ سے نکلنے والا بڈہ تھا' جو کسی زمانے میں مشرق سے جنوب کی جانب بہتا تھا۔ بیاس اور ستلج
اپنے راستے بدلے تو بیاس' فیروز پور کے قریب' ہری کے پتن پر' دریائے ستلج سے مل گیا۔
ں کی پرانی گزرگاہ خشک اور بنجر ہوگئی۔ اس کا یہ بڈہ بھی خشک ہو کر اجاڑ ہوگیا۔ نہ جانے یہ بڈہ
ب سے خشک پڑا تھا۔ اس کی مٹی نرم اور ریتلی تھی۔ جگہ' جگہ ریت کے تودے تھے۔ تودوں کے
ں پاس کہیں کہیں کیکر' کریل اور لانا کے اکا دکا پودے بکھرے ہوئے تھے۔

دور' دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ اجالا
رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لالی مسلسل چلتے چلتے تھک چکا تھا۔ مگر اسے اپنی تھکن کی فکر نہیں تھی۔
ا ایسے ٹھکانے کی تلاش تھی جس میں روپوش ہو کر دن بسر کیا جا سکے۔ ایسا کوئی ٹھکانا نظر نہیں
ا تھا۔ نہ کہیں جھنگر تھا نہ جنگلی پودوں کی کوئی بڑی جھاڑی تھی۔ اس کی تشویش بڑھتی جا رہی
۔ وہ ادھر ادھر نظریں دوڑاتا ہوا آگے اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

اجالا اب گہری سرخ روشنی میں بدلتا جا رہا تھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ لالی کی تشویش اور بڑھ
۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا۔ خشک اور بنجر بڈہ سے کچھ فاصلے پر ایک اجڑی ہوئی بستی کے کھنڈر نظر
ئے۔

ہ نشیب سے نکل کر اوپر آگیا اور کھنڈر کی جانب بڑھنے لگا۔ کھنڈر کی دیواریں مٹی کی تھیں اور
پھوٹ کر ملبے کا ڈھیر بن گئی تھیں۔ نہ کہیں چھت تھی' نہ کوئی دروازہ بچا تھا۔ صرف اونچی

اونچی دیواریں تھیں اور خود رد پودوں کی جھاڑیاں تھیں۔ لالی کو یہ کھنڈر غنیمت نظر آیا۔ وہ اس میں ٹھہر کر دن گزار سکتا تھا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا' آگے بڑھا اور کھنڈر میں داخل ہو گیا۔

یہ کھنڈر کوئی قدیم گاؤں تھا۔ قحط سالی کے باعث اجاڑ اور ویران ہو گیا تھا۔ کھنڈر میں گھس کر اس نے چھپنے کی جگہ تلاش کی اور اسے ایسی جگہ مل بھی گئی۔ یہ قد آدم دیواروں کے درمیان صاف ستھری اور ہموار زمین کا ٹکڑا تھا جو کبھی کمرے یا کوٹھری کے طور پر استعمال ہوتا ہو گا۔ اس نے کندھے پر لٹکی ہوئی گٹھری اتار دی۔ اسے ایک طرف رکھا۔ رائفل بھی پاس رکھ دی اور زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔

وہ بہت تھکا ہوا اور نڈھال تھا۔ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ دھوپ آہستہ آہستہ کھنڈر کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں پر پھیلتی جا رہی تھی۔ دن کا آغاز ہو چکا تھا۔ مگر ابھی تک ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔

لالی رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ جلد ہی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ غنودگی بڑھنے لگی۔ اس نے گٹھری کھولی' اندر سے وہ چادر نکالی جو پچھلی رات شاداں نے دی تھی۔ لالی نے زمین پر بکھرے ہوئے سنگریزے صاف کیے۔ چادر بچھائی۔ گٹھری ایک بار پھر باندھی اور تکیے کے طور پر سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ رائفل بھی اس نے اپنے سرہانے ہی رکھ لی۔ تھوڑی دیر تک وہ آنکھیں بند کیے چپ لیٹا رہا پھر سو گیا۔

دوپہر کو اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ ہر طرف تیز دھوپ پھیلی تھی۔ سورج ٹھیک اس کے سر کے اوپر تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کہیں سایہ نہیں تھا اور اسے سخت پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ پانی کی تلاش میں نکلا۔ کھنڈر خاصی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اور اونچی نیچی دیواروں کے درمیان سے گزرتا' خود رو پودے روندتا' خاردار جھاڑیوں سے الجھتا' ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا۔ مگر کہیں پانی کا گڑھا تک نہ تھا۔

وہ اپنے ٹھکانے کی جانب لوٹ رہا تھا کہ کچھ دور دو راہ گیر نظر آئے۔ وہ بڈہ کے نشیب سے گزر کر اوپر آئے اور آگے بڑھنے لگے۔ مگر وہ کھنڈر کی جانب نہیں آئے۔ لالی بھی ان کے پاس نہیں گیا اور نہ اس کا کوئی ایسا ارادہ تھا۔ ان سے ملنے میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ لیکن انھیں دیکھ کر اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ میل دو میل کے گرد و نواح میں کوئی بستی ہے۔ وہ راہ گیروں کی نظروں سے بچنے کے لیے



یک ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ میں دبک گیا۔ قریب ہی ملّھا تھا۔ یہ خاردار جھاڑی تھی۔ اس میں ہوٹے کوکن بیر لگے تھے۔

کوکن پک کر پیلے پڑ گئے تھے۔ لالی انھیں توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ کوکن کھانے سے پیاس کم ہو گئی۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گردن اونچی کی۔ کھنڈر کے باہر دیکھا۔ دونوں راہ گیر بہت دور جا چکے تھے۔

لالی ہاتھ میں دبے ہوئے کوکن کھاتا ہوا اس طرف چلا جہاں کچھ دیر پہلے وہ سو رہا تھا۔ مگر وہاں بھی تک تیز دھوپ پھیلی تھی۔ گٹھری پر ایک کالا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ لالی اسے دیکھ کر ائف ہوا اور شش و پنج میں پڑ گیا۔

رائفل بھی گٹھری کے پاس ہی رکھی تھی' ورنہ وہ اس کے بٹ سے سانپ کا منہ کچل دیتا۔ ایک ار پھر وہ باہر آیا۔ ببول کے درخت سے موٹی شاخ توڑی' اس کے پتے صاف کیے اور شاخ ہاتھ میں با کر گٹھری کے پاس پہنچا۔ مگر سانپ اب گٹھری سے نیچے اتر رہا تھا۔ لالی نے اسے چھیڑنا مناسب ہیں سمجھا۔

سانپ لگ بھگ دو گز لمبا تھا۔ وہ زمین پر رینگتا ہوا آگے بڑھا اور دیوار میں بنے ہوئے ایک بل یں گھس گیا۔ لالی یہ سوچ کر لرز گیا کہ چادر پر سوتے وقت اس کا ایک پیر بل کے عین منہ پر تھا۔ ب یہ جگہ محفوظ نہیں رہی تھی۔ دھوپ بھی بہت تھی۔ اس نے چادر سمیٹ کر کندھے پر ڈالی۔ رائفل اٹھائی اور سائے کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ اسے ایک ایسی دیوار نظر آئی س کے قریب ہی ببول کا گھنا درخت تھا۔ درخت زیادہ اونچا نہیں تھا۔ دیوار اور درخت کے رمیان کھلی جگہ تھی۔ اس پر سایہ بھی تھا۔ یہ جگہ صاف ستھری نہیں تھی۔ اس پر گھاس پھوس اور ہوٹے چھوٹے خود رو پودے تھے۔ مگر سایہ ہونے کے باعث اس نے یہی جگہ منتخب کی اور چادر بچھا ر بیٹھ گیا۔

لالی زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا۔ ایک بار پھر نیند کا غلبہ ہوا۔ اس نے گٹھری سر کے نیچے رکھی۔ رائفل ی اس کے ساتھ ہی پڑی تھی۔ وہ ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا اور دوبارہ گہری نیند سو گیا۔

آنکھ کھلی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب پیاس کے اتھ ساتھ بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چادر تہہ کی اور گٹھری میں رکھ دی۔ شام ہستہ آہستہ کھنڈر کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں سے نیچے اترنے لگی۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ کھنڈر زیادہ ویران ور پر ہول نظر آنے لگا۔

اب وہاں ٹھہرنا مناسب نہ تھا۔ ایک سانپ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ نہ جانے کھنڈر میں اور کتنے

سانپ ہیں۔ وہ کھنڈر سے نکلا مگر زیادہ دور نہیں گیا۔ ٹھہر کر اندھیرا بڑھنے اور پھیلنے کا انتظار کرنے لگا۔ ہر طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔

شام تاریک ہو کر رات میں ڈھل گئی۔ لالی نے اپنے سفر کا آغاز کیا اور اس سمت چلنے لگا جدھر اس نے دوپہر کو دو راہ گیر جاتے ہوئے دیکھے تھے۔ وہ بنجر میدان میں آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اس نے دو ڈھائی میل راستہ طے کیا تھا کہ کھیت نظر آنے لگے۔ جگہ جگہ سرس اور جنڈ کے درخت تھے۔ وہ کھیتوں سے دور درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے ٹھہر گیا۔ اسے کھیتوں کے اس پار گاؤں میں ٹمٹماتے چراغوں کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ اسے یہ آوازیں ختم ہونے اور خاموشی میں ڈوب جانے کا انتظار تھا۔ بھوک اور اس سے بھی زیادہ پیاس اسے پریشان کر رہی تھی۔

مگر اس نے پیاس اور بھوک قابو میں رکھنے اور دبانے کی کوشش کی۔ وہ گاؤں میں جانا چاہتا تھا' مگر سناٹا پھیلنے سے پہلے گاؤں میں داخل ہونا خطرناک تھا۔

پہر رات گزر گئی۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ خاموشی اور گہری ہو گئی۔ لالی کے حلق میں شدید پیاس سے کانٹے چبھ رہے تھے۔

گرمیوں کی رات تھی۔ نو بجے کا عمل تھا۔ گاؤں کی طرف ابھی جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مگر لالی کے لیے پیاس اب ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گٹھری کندھے پر لٹکائی' رائفل ہاتھ میں سنبھالی اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا کھیتوں کی جانب بڑھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔

کھیتوں کے درمیان سے ایک پیہا گزرتا تھا۔ لالی دبے دبے قدموں پیہے پر چلنے لگا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ گھپ اندھیرے میں اس کا ایک پیر آڈ میں چلا گیا۔ آڈ کے ذریعے کھیتوں میں پانی پہنچایا جا رہا تھا۔ لالی کو اسی کی تلاش تھی۔ اس نے جھٹ اپنا پیر آڈ سے باہر نکالا اور ایک کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کے چلو بھر بھر کے بے صبری سے پانی پینے لگا۔ پانی پی کر ذرا قرار آیا تو بھوک کا غلبہ بڑھا۔ اس نے کھڑے ہو کر نظریں دوڑائیں۔ وہ چنے کے کسی کھیت میں گھس جانا چاہتا تھا' جہاں کچے چنوں سے اپنی بھوک مٹا سکتا۔ مگر چنے کا کوئی کھیت قریب نہیں تھا۔ دونوں طرف کھیتوں میں چری کے پودے کھڑے تھے۔ گندم کے نہیں تھے' ورنہ وہ گندم کے دانے کھا کر بھی کام چلا سکتا تھا۔ لیکن دور دور تک صرف چری کے کھیتوں کا سلسلہ پھیلا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔



چلتے چلتے وہ ایک موڑ پر پہنچا تو خاموشی میں یکایک کہیں قریب ہی زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ ساتھ ہی ں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ ٹھٹکا' کچھ دیر سہما ہوا چپ چاپ کھڑا رہا' پھر چند قدم آگے بڑھا۔ ں کے پودوں کی آڑ سے اس جانب دیکھا جدھر سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔ سامنے کھیتوں کے یان کچھ فاصلے پر کھلی جگہ تھی۔ وہاں دھیمی دھیمی آگ جل رہی تھی۔ آگ پر لوہے کا لہانڈا ا تھا۔ قریب ہی دو آدمی لہانڈے میں گھی ڈال کر مرغ تل رہے تھے۔ مرغ تلنے کی تیز خوشبو فضا پھیلتی جا رہی تھی۔

آگ سے ذرا ہٹ کر آڈ سے کھیتوں کو سیراب کرنے کا نکا تھا۔ نکا اس وقت کھلا تھا۔ نکے پر بھی ادمی بیٹھے تھے۔

لالی نے آگ کی سرخ روشنی میں انھیں دیکھا۔ وضع قطع سے وہ مزارعے نظر آتے تھے۔ آڈ کے ے نکے سے اپنے کھیتوں میں پانی پہنچا رہے تھے۔ مرغ تلنے کی مہک نے لالی کی بھوک اور بڑھا ا۔

وہ ابھی یہ طے نہ کر سکا تھا کہ کس طرف جائے۔ معاً نکے سے ایک شخص اٹھا اور اس کی جانب ا۔ بھاگنے کی گنجائش نہیں تھی۔ لالی جھٹ چری کے قریبی کھیت میں دبک گیا۔ اس نے رائفل وں ہاتھوں میں سنبھالی اور آنے والے خطرے سے نمٹنے کے لیے خود کو تیار کر لیا۔ قدموں کی ٹ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ لالی چوکس بیٹھا راستہ تکتا رہا۔ آنے والا عین اس کے سامنے یا۔

وہ چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔ مگر نہ وہ ٹھٹکا نہ جھجکا بلکہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ جب وہ دور چلا تو لالی کو اپنے اردگرد منڈلاتے ہوئے خطرے کا شدت سے احساس ہوا۔ اب کھیتوں میں ٹھہرنا طور مناسب نہ تھا۔ لالی پلٹا اور پیہے پر چلتا ہوا کھیتوں سے باہر نکل گیا۔ سامنے جوہ تھا۔ اس ی چراگاہ میں دن کو گاؤں کے چاک اور چرواہے مویشی چراتے تھے۔ اس وقت جوہ بالکل سان تھا۔ اس میں جگہ جگہ جنڈ' ٹاہلی اور بیری کے پیڑ تھے۔ جوہ کے اس پار گاؤں تھا۔ لالی جوہ میں ل ہوا اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا گاؤں کی جانب بڑھا۔ گاؤں پر سناٹا چھایا تھا۔ گلی کوچے ویران ے۔

لالی ایک گلی میں داخل ہوا مگر آگے نہیں گیا۔ وہ نکڑ کے مکان کی چاردیواری کے قریب جا کر ٹھہر چند لمحے دم سادھے خاموش کھڑا رہا' پھر اس نے زقند بھری اور دونوں ہاتھوں سے دیوار پکڑ کر پہنچ گیا۔

اس نے گردن جھکا کر اندر جھانکا۔ گھر پر خاموشی چھائی تھی۔ صحن میں ایک طرف جھلیانی تھی۔ یہ مختصر سا باورچی خانہ تھا۔ اس میں چراغ جل رہا تھا۔ لالی دبے دبے قدموں چلتا ہوا جھلیانی کے قریب گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ جھلیانی میں داخل ہو گیا۔ چولھا ابھی گرم تھا۔ انگارے دہک رہے تھے۔ چولھے پر المونیم کی گڑوی رکھی تھی۔ اس میں دودھ گرم ہو رہا تھا۔ لالی چولھے کی جانب بڑھا۔ عین اسی وقت صحن میں آہٹ ہوئی۔ لالی دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔

جھلیانی میں تیکھے نقش و نگار کی ایک سانولی سلونی نوجوان عورت داخل ہوئی۔ وہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کا جوڑا باندھتی ہوئی چولھے کی سمت بڑھی۔ لالی نے جھٹ ہاتھ بڑھا کر اس کا منہ دبوچ لیا۔ عورت کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ مگر لالی نے اس قدر زور سے منہ بھینچا کہ اس کی آواز نہ نکل سکی۔

وہ دہشت زدہ ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے لالی کو دیکھنے لگی۔ لالی ذرا دیر اس کا منہ دبائے خاموش کھڑا رہا' پھر اس نے سرگوشی کی۔ "گھر میں تیرے علاوہ اور کوئی بھی ہے؟" عورت نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر اقرار کیا۔

لالی نے کرید کر پوچھا۔ "تیرا کھسم ہے؟" عورت نے انکار میں صرف گردن ہلا دی۔ لالی نے مسکرا کے استفسار کیا۔ "تیرا یار ہے؟" عورت نے کوئی جواب نہیں دیا' نظریں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

لالی نے دریافت کیا۔ "تیرا گھر والا کہاں ہے؟"

عورت نے دھیرے سے جواب دیا۔ "کھیتوں کو پانی لگانے گیا ہے۔"

"کب تک واپس آئے گا؟"

"وہ تو پوہ پھٹے آئے گا۔ رات بھر کھیتوں پر رہے گا۔" عورت نے لالی کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "پر تو ہے کون؟"

"میں کوئی بھی ہوں' پہلے مجھے روٹی ٹکر کھلا۔ سخت بھوک لگی ہے۔"

عورت نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "تو چور تو نہیں ہے؟"

"بکواس نہ کر۔" لالی نے اسے ڈانٹا۔ "فٹافٹ روٹی دے۔ میں روٹی کھا کر چلا جاؤں گا۔ میں نے تجھ سے اور کچھ نہیں لینا۔" اس نے چولھے پر رکھی ہوئی گڑوی کی طرف اشارہ کیا۔ "پہلے مجھے دودھ دے' بجھیتی نال۔ ڈرنا شرنا چھوڑ۔ میں نوں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھیرنا۔"



عورت نے کچھ کہے بغیر بڑھ کر گلاس اٹھایا۔ چولھے کے پاس گئی اور گڑوی اٹھا کر گلاس میں دودھ انڈیلنے لگی۔ اسی اثناء میں باہر کوئی آہستہ سے کھنکارا۔ ساتھ ہی چاپ بھی ابھری۔ لالی نے رائفل اٹھائی اور نشانہ باندھ کر باہر صحن کی جانب دیکھنے لگا۔ عورت گلاس چھوڑ کر تیزی سے لالی کی طرف لپکی۔ رائفل پر ہاتھ رکھ کر بے قراری سے بولی۔

"وے گولی نہ چلانا۔"

"چپ کر۔" لالی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "میں نے گولی چلا کر سارے پنڈ کو جگانا ہے؟" وہ اس کی جانب دیکھے بغیر کھل کر مسکرایا۔ "تو بھی پکڑی جائے گی' تیرا یار بھی پکڑا جائے گا اور میں بھی پکڑا جاؤں گا۔ میں ایسے خطرناک کام نہیں کرتا۔"

عورت چپ چاپ اس کے قریب کھڑی رہی۔ چند لمحوں بعد جھورا نمودار ہوا۔ وہ مضبوط جسم کا اچھا خوش شکل جوان تھا اور دھوتی باندھے ہوئے تھا۔ اوپر کا دھڑ بالکل برہنہ تھا۔ اس نے لالی کو دیکھا اور اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل دیکھی تو خوف زدہ ہو کر جہاں تھا' وہیں رک گیا۔ چند لمحے سہا کھڑا رہا پھر اس نے عاجزی سے کہا۔ "میرا کرتا ادھر حجرے میں پڑا ہے۔ اس میں جو کچھ ہے' لے لے' اور بھی جو جی چاہے اٹھالے۔" اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"دھیما بول۔ میں نوں کچھ نہیں لینا۔" لالی نے عورت کو ٹھوکا دیا۔ "اسے اندر لے آ۔"

عورت آگے بڑھی اور جھورا کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "اندر آجا۔" اس نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے چوری چکاری نہیں کرنی' بھکھا ہے۔ روٹی کھا کر چلا جائے گا۔"

جھورا' عورت کے ساتھ جھلیانی کے اندر آگیا۔ لالی نے رائفل نیچے جھکالی۔ جھورا نے عورت سے پوچھا۔ "میداں! یہ ہے کون؟ اور یہاں آیا کیسے؟" میداں نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "میں نوں کیہہ پتہ؟ اے نوں پچھ۔" وہ چولھے کے پاس گئی' گلاس دودھ سے بھرا اور لالی کو دے دیا۔

لالی نے گلاس منہ سے لگایا اور غٹاغٹ پورا گلاس چڑھا گیا۔ اس نے میداں کی طرف مڑ کر دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ "روٹی شوٹی بھی لے آ۔ ابھی پیٹ نہیں بھرا۔"

میداں نے بڑھ کر چبوترے پر رکھی ہوئی چنگیری اٹھائی۔ دوسرے ہاتھ سے قریب رکھا ہوا پیالہ اٹھایا اور لالی کے نزدیک آگئی۔

وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے رائفل اپنے زانو پر رکھ لی۔ میداں نے چنگیری اس کے سامنے رکھ دی۔ سالن بھی رکھ دیا۔ میداں اس کے روبرو بیٹھ گئی۔ لالی نے جھورا سے کہا۔ "کھڑا کیوں ہے؟ تو

بھی بیٹھ جا۔"

وہ دیوار سے ٹیک لگا کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ لالی نے لقمہ توڑ کر منہ میں رکھتے ہوئے مڑ کر جھورا کو دیکھا۔ وہ ابھی تک سہا ہوا نظر آ رہا تھا۔ لالی نے لقمہ چبا کر حلق سے نیچے اتارا اور مسکرا کر جھورا سے مخاطب ہوا۔ "رات کو چھپ کر مشوکا سے ملنے آیا اور دل چڑی کی طرح اتنا چھوٹا سا ہے۔" لالی نے دوسرا لقمہ توڑا۔

"جھورے! تو رہتا کہاں ہے؟"

"رہتا تو میں ساتھ والے چک میں ہوں۔" جھورا نے رسان سے پوچھا۔ "پر تو ہے کون؟"

"کیا کرے گا جان کر۔" لالی بے تکلفی سے بولا۔ "میں نوں تو صرف روٹی کھانی ہے۔ میداں سے یاری نہیں لگانی۔" اس نے مڑ کر میداں کو دیکھا۔ "ویسے تو ہے سوہنی اور جھورے سے زیادہ حوصلہ رکھتی ہے۔ تو مجھ سے اتنا نہیں ڈری جتنا یہ ڈرا سہا نظر آتا ہے۔"

جھورے نے کچھ نہیں کہا۔ میداں بھی خاموش رہی۔ لالی نے ایک روٹی ختم کرنے کے بعد دوسری روٹی سے لقمہ توڑا اور میداں سے مخاطب ہوا۔ "پینے کو پانی تو دے۔" وہ چپ چاپ اٹھی۔ گلاس سنبھالا اور باہر جانے کے لیے مڑی۔

جھورا نے اسے ٹوکا۔ "گل سن میداں! حجرے سے وہ مٹھائی بھی لیتی آ جو تو نے اپنے گھر والے کے لیے رکھ چھوڑی ہے۔" اس کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ وہ زیر لب مسکرایا اور لالی کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ تیرا مہمان ہے۔ مہمان کو ٹھیک سے روٹی ٹکر کھلا۔" میداں خاموشی سے باہر چلی گئی۔

"جھورے! تو میداں سے ملنے روز اسی طرح چھپ کر آتا ہے؟"

"نہیں جی۔ ایسی گل بات نہیں ہے۔ بہت دنوں بعد آج رات موکا ملا تھا۔" اس نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "میداں کا گھر والا روز روز رات کو پانی نہیں لگاتا۔ آج ہی سے رات کو اس کی پانی لگانے کی باری شروع ہوئی ہے' پر تو نے سارا معاملہ گڑبڑ کر دیا۔"

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ ابھی تو ساری رات پڑی ہے۔" وہ آہستہ سے ہنسا۔

جھورا نے پریشان ہو کر سرگوشی کی۔ "دھیما بول۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "ساتھ والے مکان میں میداں کے گھر والے کا پیو رہتا ہے۔ اسے نیند بھی کم آتی ہے۔ تیرے آنے سے پہلے وہ دیر تک کھانستا رہا۔"



لالی خاموش رہا۔ جھورا نے بھی کچھ نہیں کہا۔ میداں واپس آگئی۔ اس نے پانی سے بھرا ہوا ں لالی کے سامنے رکھ دیا۔ لالی نے گلاس اٹھا کر پانی پیا۔ جب وہ پانی پی چکا تو میداں نے دوپٹے ڈ کھول کر کاغذ میں لپٹی ہوئی مٹھائی نکالی اور لالی کے سامنے رکھ دی۔ لالی نے دیکھا کہ کاغذ میں کے تین ٹکڑے رکھے ہیں۔ لالی نے ایک ٹکڑا اٹھایا اور دانتوں سے توڑ کر کھانے لگا۔ برفی ں ذائقہ تھی۔ لالی کو پسند آئی۔

جھورا خاموش بیٹھا تھا۔ میداں بھی چپ تھی۔ لالی نے نصف ٹکڑا کھایا تھا' ناگاہ جھورا پر اس نظر پڑی۔ اسی وقت جھورا نے میداں کی جانب دیکھ کر آنکھ ماری۔ آنکھ مارنے کا انداز کچھ ایسا لہ لالی کو شبہ ہوا۔ اس نے فوراً ہاتھ روک لیا۔ برفی کا بچا ہوا ٹکڑا کاغذ میں ڈال دیا۔ گلاس اٹھا پانی پیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جھورا نے حیرت کا اظہار کیا۔ "کہاں چلا؟ تو نے مٹھائی بھی نہیں کھائی۔ تھوڑی ہی سی تو ہے۔ ے کھالے۔ فیر چلا جانا۔"

"میں نوں اب جانا ہے۔" لالی نے گٹھری کندھے پر ڈالی' رائفل سنبھالی اور چلنے کے لیے تیار یا۔ اس نے جھورا سے پوچھا۔ "جھورے! تجھے کادر آباد کے رستے کا پتہ ہے؟ میں نے وہیں جانا ہے۔"

"کادر آباد تو یہاں سے بہت دور ہے۔ ایسا کر یوسف والا چلا جا۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ ں سے کادر آباد چلا جانا۔ یوسف والا ٹیشن ہے۔ تجھے کادر آباد کے لیے گڈی مل جائے گی۔ لاری ی ہے۔ تانگے بھی جاتے ہیں۔"

"یوسف والا کا رستہ بتا دے۔"

"پنڈ سے نکل کر پورب کو جائے گا تو نہر ملے گی۔" جھورا نے بتایا۔ "نہر پر پلی آئے گی۔ اس پار جانا۔ سامنے ہی سڑک ہے۔ سڑک پر آگے جائے گا تو نہر ملے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ چلا جانا۔ ف والا پہنچ جائے گا۔"

لالی نے مڑ کر میداں کو دیکھا۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ خاموش تھی۔ اس کے چہرے پر راہٹ اور پریشانی تھی۔

لالی نے مسکرا کر کہا۔ "میداں! مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تجھے بہت پریشان کیا۔ تو سوہنی ہے رطبیعت کی بھی چنگی ہے۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا' پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور میداں کی رف بڑھا دیا۔ "یہ روٹی ٹکر کی کیمت نہیں۔ تیری مہمان داری کا وٹا ہے۔ اسے رکھ لے۔ دیکھ'

انکار نہ کرنا۔" لالی نے نوٹ میداں کے ہاتھ میں دے دیا۔ میداں کا ہاتھ کپکپایا۔ نوٹ نیچے گر گیا۔ لالی نے جھک کر نوٹ اٹھایا اور میداں کے ہاتھ میں رکھ کر آہستہ سے اس کی مٹھی بھینچ دی۔

لالی نکل کر صحن میں آگیا۔ میداں جھلیانی میں گم صم کھڑی رہی۔ مگر جھورا اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں نے آنگن عبور کیا۔ جھورا نے آگے بڑھ کر آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھولی۔ لالی نے اس کی پیٹھ تھپک کر مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔ "جا موجاں کر۔ ابھی سویرا ہونے میں بہت دیر ہے۔"

جھورا نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ لالی دروازے سے گزر کر باہر گلی میں آگیا۔

گلی بالکل سنسان تھی۔ لالی آگے بڑھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گاؤں سے نکل کر ایک بار پھر جوہ میں آگیا۔ اس نے جوہ عبور کیا اور جھورا کے بتائے ہوئے راستے پر پورب کی سمت کھیتوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہوا نرم اور سبک تھی۔ کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا' نہر آگئی۔ لالی نہر کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور جا کر پلیا آگئی۔ پلیا سے گزر کر وہ نہر کے دوسری جانب چلا گیا۔

نہر کے کنارے کھجور کے درخت تھے۔ وہ ان کے نیچے پہنچا۔ گٹھری کھولی۔ ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل اس میں رکھ کر پھر گٹھری باندھی اور کندھے پر لٹکالی۔ درختوں کے نیچے سے نکل کر وہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے دو ڈھائی فرلانگ راستہ طے کیا ہوگا کہ ستاروں کی مدھم روشنی میں اسے پاک پتن روڈ چمکتی نظر آئی۔

وہ سڑک کی سمت بڑھا۔ یکایک اسے گھبراہٹ اور بے کلی محسوس ہوئی۔ پیٹ میں سخت مروڑ اٹھی۔ جی متلایا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو سنبھالا اور سڑک کی جانب بڑھنے لگا۔

سڑک کے کنارے پہنچتے پہنچتے اس کی طبیعت اور بگڑ گئی۔ قدم لڑکھڑانے لگے۔ وہ ہمت کر کے کچھ اور آگے بڑھا۔ مگر سڑک کے کنارے پہنچ کر اس کے قدم ڈگمگائے۔ وہ خود کو سنبھال نہیں سکا۔ نڈھال ہو کر زمین پر گر گیا۔ اسے زور کی ابکائی محسوس ہوئی۔ وہ اٹھا۔ اندھیرے میں قے کی۔ پھر لیٹ گیا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا۔ نقاہت بڑھ گئی تھی۔ اس کا سارا جسم پسینے سے



شرابور تھا۔ آنکھوں کے آگے سیاہ پردے لہرا رہے تھے۔ وہ زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

☆

لالی سڑک کے کنارے بے سدھ پڑا تھا۔ یکایک تیز روشنی نمودار ہوئی۔ ایک کار سڑک پر تیزی سے دوڑتی نظر آئی۔ لیکن لالی کے قریب پہنچتے پہنچتے کار کی رفتار سست پڑگئی۔ ڈرائیور نے گردن نکال کر جھانکا' نیچے اترا۔ لالی کے نزدیک گیا۔ حیران اور پریشان ہو کر اسے دیکھا اور آہستہ آہستہ جھنجوڑ کر بولا۔ "لالی! لالی!" اس نے لالی کا سر پکڑ کر ادھر ادھر ہلایا۔ لالی نے آنکھیں کھول دیں۔

"کون ہے؟" اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

"لالی! میں شادو ہوں۔ تیرا لائل پور والا یار' شادو۔"

لالی نے ہمت سے کام لیا۔ اٹھ کر بیٹھا۔ شادو کو دیکھا۔ شادو کار کی تیز روشنی میں اس پر جھکا ہوا تھا۔ لالی نے اسے پہچان لیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا جی متلایا اور اس نے ابکائی کے ساتھ قے کر دی۔

قے میں خون ہی خون نکلا۔ لال لال خون سڑک پر پھیل گیا۔ خون دیکھ کر شادو پریشان ہو گیا۔ لالی پر قے کرتے کرتے ہی پھر غشی کا دورہ پڑا۔ وہ بے حال ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔ شادو نے اسے دھیرے دھیرے جھنجوڑا۔ "لالی! لالی! تجھے کیا ہو گیا۔ تو بہت بیمار لگتا ہے۔" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شادو نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ لالی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ شادو نے گٹھری اٹھائی۔ اسے بھی لالی کے قریب ہی کار میں رکھ دیا۔ کار نئے ماڈل کی کوئزلر تھی۔ لمبی چوڑی تھی۔ سیٹیں بھی کشادہ اور نرم تھیں۔ لالی کار میں آرام سے لیٹا رہا۔ شادو اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھا۔ کار کا انجن اسٹارٹ تھا۔ اس نے گیئر بدلا۔ ایکسی لیٹر پیر سے دبایا۔ کار سڑک پر دوڑنے لگی۔

رات ڈھلتی گئی۔ کار سڑک پر دوڑتی رہی۔ تیز جھونکے کار کے اندر آتے رہے۔ لالی کی طبیعت قدرے سنبھلی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ذہن پر زور دے کر سوچا۔ اسے شادو یاد آگیا۔ لالی نے نحیف آواز میں کہا۔

"شادو! تو شادو ہی ہے نا؟"

شادو نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہاں میں شادو ہی ہوں۔ اب تیری طبیعت کیسی ہے؟"

"شادو! تو مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟"

"میں تجھے سرکاری اسپتال لے جا رہا ہوں۔ منٹگمری آگے ہی ہے۔"

"تو مجھے وہاں نہ لے جا۔" لالی نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں اسپتال نہیں جاؤں گا۔"

"بکواس نہ کر۔ چپ کر کے پڑا رہ۔" شادو نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ "تیری طبیعت بہت خراب ہے۔ تجھے اسپتال لے جانا ضروری ہے۔"

لالی تھوڑا سا اوپر ہو کر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "شادو! تیں نوں پتہ ہے، میں جیل سے بھاگا ہوا ہوں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "میری گل سن رہا ہے شادو؟"

"سن رہا ہوں۔ میں نوں پتہ ہے، تو جیل سے بھاگا ہوا ہے۔"

"تب بھی تو مجھے اسپتال لے جانا چاہتا ہے؟" لالی نے شکوے کے انداز میں کہا۔ "تو مجھے گرفتار کروانا چاہتا ہے؟"

"بکواس نہ کر۔" شادو نے اسے پھر ڈانٹا۔ "اسپتال میں اس ٹیم رات کو تجھے کون پہچانے گا۔"

لالی آمادہ نہیں ہوا۔ "گڈی روک لے۔ مجھے یہیں اتار دے۔ میں اسپتال نہیں جاؤں گا۔ تو مجھے کادر آباد پہنچا دے۔"

"وہاں جا کر کیا کرے گا؟ ادھر تیرا جاننے والا کوئی ڈاکٹر یا حکیم ہے؟"

"کادر آباد کے نزدیک نہر کے اس پار ٹبّوں میں رحیم داد چھپا ہوا ہے۔ تو اسے نہیں جانتا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی جیل سے بھاگا تھا۔ وہ میرا وہاں انتظار کرتا ہو گا۔ تو مجھے کادر آباد پہنچا دے۔" لالی کے لہجے میں عاجزی آ گئی۔

"شادو تیری مہربانی ہو گی۔"

"پر تیری طبیعت بہت خراب ہے۔ تجھے خون کی الٹی ہوئی تھی۔" شادو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ٹبّوں پر تیرا علاج کون کرے گا؟ وہاں جنگل اور ویرانہ ہے۔"

"پر میں اسپتال ہرگز نہیں جاؤں گا۔ ویسے میری طبیعت اب ٹھیک ہے۔"

"ہرگز ٹھیک نہیں ہے۔ تو اسپتال جانا نہیں چاہتا تو میں تجھے حکیم چشتی کے پاس لے جاؤں گا۔ منٹگمری سے آگے کمال گڑھ ہے۔ حکیم وہیں رہتا ہے۔ بہت ٹھیک ٹھاک علاج کرتا ہے۔ اس کی دوائی سے تو بالکل چنگا ہو جائے گا۔"

"اسی کے پاس لے چل۔ حکیم سے دوائی لینے کے بعد تو مجھے کادر آباد پہنچا دینا۔ میں نوں رحیم



داد کے پاس ضرور جانا ہے۔"

"چلا جانا۔ ضرور چلا جانا۔ پر ابھی اس کے پاس نہیں جا سکتا۔ میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ فیر جہاں کہے گا، وہیں پہنچا دوں گا۔"

لالی رک رک کر گہری سانسیں بھرتا رہا۔ شادو اسٹیرنگ وھیل سنبھالے سامنے دیکھتا رہا۔ کار سڑک پر دوڑتی رہی۔ کئی منٹ گزر گئے۔ پھر لالی کی آواز ابھری۔ "شادو! تو یہ کار کہاں سے لے آیا؟"

"یہ میاں عبدالسبحان کی کار ہے۔ میں نے اس کی نوکری کر لی ہے۔ ڈرائیور لگ گیا ہوں۔ میاں سبحان وڈا زمیں دار ہے اور بہت نیک بندہ ہے۔"

لالی خاموش رہا۔ اس کی طبیعت پھر بگڑنے لگی تھی۔ پیٹ میں مروڑ اٹھی۔ ماتھے پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ وہ لیٹ گیا اور رک رک کر سانس لینے لگا۔ اس کی طبیعت بگڑتی گئی۔ ایک بار پھر غشی طاری ہوئی اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ بے حال پڑا رہا۔

کار منٹگمری شہر سے گزری۔ لالیاں والا سے آگے نکلی۔ لالی نے کار رکوائی، ایک بار پھر خون کی قے کی اور بے سدھ ہو کر کار میں لیٹ گیا۔

☆

کار کمال گڑھ کی جانب مڑنے لگی۔ لالی کو کچھ خبر نہ تھی کہ کار کہاں جا رہی ہے۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ کار کمال گڑھ میں داخل ہوئی اور حکیم نذر محمد چشتی کے گھر کے سامنے جا کر رک گئی۔ شادو کار سے نکلا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ کسی نے دروازے کی آڑ سے پوچھا۔ "کون ہے؟" یہ حکیم کی بیوی تھی۔ اس کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

شادو نے پوچھا۔ "حکیم جی ہیں، جی؟"

"وہ تو سو رہے ہیں۔ آج تو ویسے بھی دیر سے سوئے ہیں۔ اب تو نہیں اٹھ سکتے۔"

شادو کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دروازے کے پیچھے سے حکیم چشتی کی آواز ابھری۔ وہ اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ "نیک بخت! میں نے ہزار بار کہا، کوئی مریض آئے تو مجھے فوراً جگا دیا کر۔" حکیم نے دروازہ کھولا۔ باہر آیا اور نرم لہجے میں پوچھا۔

"اس وقت کون آیا ہے؟"

"میں ہوں جی شادو۔"

"اچھا تو ہے۔" حکیم آنکھیں ملنے لگا۔ "میں سویرے بوٹیاں چننے ٹبّوں کی طرف چلا گیا۔ شام کو

لوٹا۔ بہت تھک گیا تھا۔ ایسی گہری نیند سویا کہ تیرے بار بار کھٹ کھٹانے پر بھی آنکھ نہیں کھلی۔“

حکیم نے تامل کیا۔ مسکرا کر پوچھا۔ ”یہ بتا‘ کیسے آیا اتنی رات کو؟ تیری گھر والی اور بچے تو خیریت سے ہیں؟“

”رب کا شکر ہے جی۔ وہ سب تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میں تو جی ایک مریض کو دکھانے لایا تھا۔“

”کہاں ہے مریض؟“

شادو نے کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کار کے اندر پڑا ہے۔ اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔“

”کار میں تو اندھیرا ہوگا۔ تو اسے اٹھا کر لے آ۔ میں ابھی مطب کھولتا ہوں۔ تو اسے لے کر مطب میں آجا۔“ حکیم گھر میں چلا گیا۔

شادو کار کی جانب بڑھا‘ دروازہ کھولا۔ وہ مضبوط جسم کا لمبا چوڑا جوان تھا۔ لالی کو ایک بار پھر اس نے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ لالی ابھی تک بے حال تھا‘ اسے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ شادو اسے اٹھائے ہوئے مطب کی جانب بڑھا۔ مطب کا دروازہ کھلا تھا۔ شادو اندر داخل ہوا۔ حکیم چشتی ہاتھ میں لالٹین لٹکائے اس کا منتظر تھا۔ مطب میں دیوار سے لگا ہوا تخت تھا۔ اس پر چٹائی بچھی تھی۔ چٹائی پر سفید چادر کا فرش تھا۔ تخت پر گاؤ تکیہ بھی رکھا تھا۔ تخت کے سامنے کئی مونڈھے پڑے تھے۔

حکیم نے اشارہ کیا۔ شادو نے لالی کو تخت پر لٹا دیا۔ وہ آنکھیں بند کیے بے سدھ پڑا رہا۔ حکیم نے شادو سے دریافت کیا۔ ”اسے کیا ہوگیا؟“

”یہ تو جی پتہ نہیں۔ یہ میرا پرانا یار ہے۔ میں میاں صاحب کے ایک دوست کو چھوڑ کر حسین والا سے واپس آرہا تھا۔ مجھے یہ سڑک کے کنارے پڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے اسے جھنجوڑا تو اس نے آنکھ کھولی۔ مجھے پہچان لیا۔ اٹھ کر بیٹھ بھی گیا۔ اسے الٹی آئی۔ الٹی کے ساتھ خون ہی خون تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر کار میں ڈالا اور ادھر لے آیا۔ رستے میں اس نے مجھ سے بات چیت بھی کی تھی۔ فیر ایک الٹی اور آئی اور اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ اس کے بعد سے اسے کچھ ہوش نہیں ہے۔“

حکیم نے ہاتھ بڑھایا اور لالی کی نبض دیکھنے لگا۔ نبض دیکھنے کے بعد اس نے شادو سے کہا۔

”اسے کسی نے سنکھیا کھلا دی ہے۔“

شادو نے گھبرا کر پوچھا۔ ”حکیم جی! اب اس کا کیا بنے گا؟ سنکھیا کھانے سے تو موت ہوجاتی ہے۔“



”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس کے پیٹ میں سنکھیا کی زیادہ مقدار نہیں گئی ہے۔“ حکیم نے اس کو اطمینان دلایا۔ ”دو چار دن میں بھلا چنگا ہوجائے گا۔ کسی سے دشمنی تھی اس کی؟“

شادو نے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے بتایا۔ ”پتہ نہیں جی! یہ تو مجھے سڑک پر پڑا ہوا ملا تھا۔“

اسی اثناء میں لالی نے آنکھیں کھولیں۔ حکیم کو اپنے قریب بیٹھے دیکھا۔ حکیم نے اسے ہوش میں آیا پایا تو نرم لہجے میں پوچھا۔ ”کیا کھایا تھا؟“

لالی نے نحیف آواز میں رک رک کر جواب دیا۔ ”روٹی تھی‘ سرسوں کا ساگ تھا۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا اور گہری گہری سانسیں بھرتا رہا۔ ”برفی بھی کھائی تھی۔ لگتا ہے‘ اس میں زہر تھا۔ میں نے آدھا ہی ٹکڑا کھایا تھا۔“

”جبھی تو بچ گیا۔ برفی میں زہر ہی تھا۔“ حکیم نے تسلی دی۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تو خاموش پڑا رہ۔ زیادہ بات چیت نہ کر۔“

حکیم گھر میں کھلنے والے دروازے تک گیا۔ ایک پٹ کھولا اور جھانک کر اونچی آواز سے کہا۔ ”عائشہ کی ماں! جاگ رہی ہو؟“

اندر سے آواز ابھری۔ ”کیا کام ہے جی؟“

”گھر میں دودھ تو ہوگا اور گرم بھی ہوگا۔ پیتل کے بڑے گلاس میں دودھ ڈالو اور اس میں تقریباً آدھا پاؤ گھی ملا کر مجھے دے دو۔“

حکیم یہ ہدایت دے کر لالی کے پاس آگیا اور تخت پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ مگر اس نے لالی سے بات چیت نہیں کی۔ لالی آنکھیں کھولے چت لیٹا تھا اور چپ چاپ چھت تک رہا تھا۔ حکیم نے شادو سے پوچھا۔

”میاں سبحان کا کیا حال چال ہے؟ لائل پور میں ہیں یا رحیم یار خاں گئے ہیں؟“

”رحیم یار خاں تو جی وہ کم ہی جاتے ہیں۔ ادھر کی زمین داری کی دیکھ بھال ان کا چھوٹا پت کرتا ہے۔ ویسے میاں صاحب ان دنوں ذخیرے کے جھل میں شکار کی تیاریاں کر رہے ہیں۔“

”وہ تو ہر سال کرتے ہیں‘ سنا ہے۔ بہت شاندار شکار ہوتا ہے۔ دور دور سے بڑے بڑے افسر اور زمین دار شکار کھیلنے آتے ہیں۔“

حکیم نے بات ختم ہی کی تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ حکیم اٹھ کر گیا۔ اس کی بیوی نے دروازے کی آڑ سے دودھ کا گلاس دیا۔ حکیم نے گلاس سنبھالا اور لالی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”شادو! اسے گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا دے۔“ شادو بڑھ کر لالی کے پاس گیا۔ کمر اور گردن کے نیچے

ہاتھ ڈال کر اسے اٹھایا اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ لالی خاموش رہا۔ اس کا چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ حکیم اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا اور گلاس اس کے منہ سے لگا کر بولا۔

"اسے پی لے۔"

لالی نے چند گھونٹ پیے اور منہ ہٹا لیا۔ حکیم نے دل جوئی کی۔ "حوصلے سے کام لے۔ اسے پینے کے بعد تو بھلا چنگا ہو جائے گا۔" لالی نے گلاس سے منہ لگایا اور آنکھیں بند کر کے دھیرے دھیرے سارا دودھ پی گیا۔

دودھ پیتے ہی اسے ابکائی آئی۔ حکیم آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔ لالی کو ذرا قرار آیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد بے چین ہو کر ادھر ادھر گردن ہلانے لگا۔ حکیم نے پوچھا۔ "الٹی کرے گا؟" لالی نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔ حکیم نے شادو سے کہا۔

"اسے اٹھا کر باہر لے جا۔"

شادو نے لالی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور مطب سے باہر لے گیا۔ لالی اکڑوں بیٹھ گیا اور ابکائیاں لینے لگا۔ پھر اس نے قے کی۔ حکیم نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا۔ قے میں دودھ کے ساتھ خون بھی نکلا۔ قے کرتے ہی لالی نڈھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔ شادو نے اسے اٹھانا چاہا۔ مگر حکیم نے منع کر دیا۔

"اسے یوں ہی پڑا رہنے دے۔ یہاں ہوا اور ٹھنڈک ہے' اسے آرام ملے گا۔"

قے کرنے کے بعد لالی کو سکون محسوس ہوا۔ الجھن اور گھبراہٹ کم ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پچھلی رات کی ہوا کے نرم اور خنک جھونکے جسم کو لگے تو لالی کو نیند آ گئی۔ حکیم نے اسے سوتے دیکھا تو شادو سے کہا۔ "اسے گاڑی میں لٹا دے۔" شادو نے آہستہ سے لالی کو ہاتھوں پر اٹھایا اور کار کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔

شادو واپس حکیم کے پاس آیا۔ حکیم نے کہا۔ "اب اسے لے جا۔ راستے میں الٹی ہو تو کرا دینا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سنکھیا کا سارا زہر الٹی کے ساتھ نکل جائے گا۔ اسے کوئی اور دوائی دینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کا صحیح علاج کر دیا۔ کل شام تک بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے کل تک صرف دودھ یا لسی پلانا۔ دو ایک روز کمزوری رہے گی پھر ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔



ان ہے اور حوصلے والا بھی ہے۔"

شادو اظہار معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "حکیم جی! میں نے اتنی رات کو تمہیں تکلیف دی۔"

"کوئی بات نہیں۔" حکیم نے مسکرا کر نرم لہجے میں کہا۔ "اپنا تو کام ہی بیماروں کی خدمت کرنا ہے۔ میرے لیے دن رات سب برابر ہیں۔ تو بالکل فکر نہ کر۔"

شادو نے جیب سے دو روپے نکال کر حکیم کو دیئے۔ اس نے خاموشی سے روپے لے لیے۔ شادو نے کار میں بیٹھ کے اسے اسٹارٹ کیا۔ کار آگے بڑھی۔ چند میل کچے راستے پر چلنے کے بعد ملتان وڈ پر آ گئی اور تیز رفتار سے سڑک پر دوڑنے لگی۔

☆

کار ضلع لائل پور کی حدود میں داخل ہوئی۔ کمالیہ پہنچی۔ آگے جا کر سمندری کی جانب مڑی۔ ریڈ والا کے قریب لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کار رکوا کے قے کی۔ اس دفعہ خون کی مقدار ت کم تھی۔

شادو نے سہارا دے کر لالی کو پھر پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ وہ نڈھال ہو کر دھیرے دھیرے ہانپنے لگا۔ ب دن نکل آیا تھا۔ سورج چڑھ کر اوپر آ گیا۔ ہر طرف دھوپ پھیلی تھی۔ لالی پھر سو گیا۔

کار سمندری تک نہیں گئی۔ راستے ہی میں شادو نے کار موڑی اور اسے سنڈیانوالا جانے والی چی سڑک پر دوڑانے لگا۔ گاؤں سنڈیانوالا سے آگے تھا۔ گاؤں پہنچ کر اس نے پرانی وضع کی ایک ویلی کے سامنے کار روک لی۔ حویلی کی دیواروں پر کائی جمی تھی۔ اس نے لالی کو بیدار کیا۔ اب لالی ی طبیعت قدرے سنبھل چکی تھی۔

وہ شادو کے سہارے چلتا ہوا حویلی کے مہمان خانے میں گیا۔ مہمان خانے کے پچھواڑے کروں کے لیے ایک ہی قطار میں سلسلے وار کئی کوٹھریاں تھیں۔ ان کے آگے ٹین کی چھت کا ائبان تھا۔

شادو اسے مہمان خانے کے اسی حصے کی ایک کوٹھری میں لے گیا۔ کوٹھری خاصی کشادہ تھی۔ ں میں چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی پر بستر لگا تھا۔ شادو نے لالی کو بستر پر لٹا دیا' باہر گیا۔ کار سے لالی ی گٹھری اٹھا کر لایا اور چارپائی کے سرہانے ایک کونے میں رکھ دی۔ لالی کچھ دیر آنکھیں بند کیے پڑا ہا' پھر سو گیا۔

شام کو اس کی آنکھ کھلی۔ شادو اسی وقت واپس آیا تھا۔ اس نے لالی کو بیدار پایا تو قریب ہی بستر بیٹھ گیا۔ "اب طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" لالی نے نقاہت سے کہا۔ "پر کمزوری بہت ہے۔"

"فکر نہ کر۔ کمزوری بھی ختم ہوجائے گی۔ تو جلد ہی بھلا چنگا ہوجائے گا۔" شادو نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔ "بھوک تو نہیں لگ رہی ہے؟"

"بھوک بالکل نہیں ہے۔"

"ایسا کر' تو گرم دودھ پی لے۔ کمزوری کم ہوجائے گی۔ حکیم جی نے دودھ پینے کو بتایا ہے۔ میں تیرے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھیر سکوں گا۔ میں نے جیپ لے کر ٹوبہ ٹیک سنگھ جانا ہے۔ کل دوپہر تک واپسی ہوگی۔ میں خداداد خاں سے کہتا جاؤں گا۔ وہ تجھے دودھ پلا دے گا۔" اس نے دروازے کی طرف منہ کیا اور اونچی آواز سے پکارا۔ "بابے! ادھر آ۔" خداداد خاں کوٹھری میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین لٹک رہی تھی۔

کوٹھری میں روشنی ہوگئی۔ خداداد نے لالٹین طاق میں رکھ دی۔ وہ بوڑھا اور لاغر تھا۔ سر اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ شادو نے کہا۔ "بابے! اسے دودھ لا دے۔ روٹی نہ دینا۔ ویسے اسے بھوک ہے بھی نہیں۔" وہ کھڑا ہوگیا۔ "بابے! یہ بیمار ہے۔ اس کی ٹھیک سے دیکھ بھال کرنا۔ میرا پرانا اور گہرا یار ہے۔"

خداداد نے مسکرا کر اسے اطمینان دلایا۔ "پروا نہ کر۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں نوں پتہ ہے' یہ بیمار ہے۔ آیا تھا تو چلا بھی نہیں جاتا تھا۔"

شادو نے لالی سے کہا۔ "اب میں چلوں گا۔ بابا خداداد موجود ہے' بہت بھلا اور نیک بندہ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے تجھے یہاں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔" شادو کوٹھری سے چلا گیا۔ خداداد خاں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا گیا۔

لالی چپ لیٹا رہا۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی پھیلی تھی۔ باہر صحن میں اندھیرا تھا۔ لالی پچھلی رات کے واقعات یاد کرنے لگا۔ اسی اثناء میں بوڑھا خداداد خاں آہستہ آہستہ کھانستا ہوا آیا۔

اس کے ہاتھ میں دودھ سے بھرا ہوا گلاس تھا۔ لالی تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے خداداد سے دودھ کا گلاس لیا اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ دودھ گرم اور میٹھا تھا۔ اس نے دودھ پی کر خالی گلاس خداداد کو دے دیا۔ وہ گلاس لے کر چلا گیا۔

لالی تنہا رہ گیا۔ وہ کچھ دیر تکیے کے سہارے بیٹھا رہا پھر لیٹ گیا۔ مگر اسے نیند نہیں آئی۔ خداداد خاں واپس آگیا اور کوٹھری کے باہر سائبان کے نیچے برآمدے میں فرش پر



دہلیز کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ مگر لالی نے اس سے بات چیت نہیں کی۔ خاموش لیٹا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اسے نیند آگئی۔

دوسرے روز بھی وہ بستر پر لیٹا ہی رہا۔ سویرے اس نے لسّی پی۔ دوپہر کو خداداد نے اسے دودھ میں بھگو کر روٹی کھلائی۔ شادو سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے آیا۔ وہ لالی کے لیے تازہ پھل لایا تھا۔ اپنی ایک اجلی قمیص اور شلوار بھی لایا تھا۔

"کل صبح نہا کر کپڑے بدل لینا۔ تیرے کپڑے بہت میلے ہو رہے ہیں۔"

"یہ تو نے بہت چنگا کام کیا۔ کچھ اور میلے کپڑے بھی ہیں۔" لالی نے سرہانے رکھی ہوئی گٹھری کی جانب اشارہ کیا۔ "انھیں میں سویرے دھو ڈالوں گا۔"

"یہ کام تجھے کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کل میاں سبحان کو لے کر لائل پور جا رہا ہوں۔ گھر والی کو تیرے کپڑے دے دوں گا' وہ انھیں دھو ڈالے گی۔ میں نے سویرے گھر والی سے تیری بیماری کا کہا تو وہ گھبرا گئی۔ یہاں آنے کو کہتی تھی پر بچے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ انھیں گھر میں چھوڑ کر وہ کیسے آسکتی ہے۔ اسی لیے میں اسے نہیں لایا۔"

"ٹھیک ہی کیا۔ خاما خا پریشان ہوتی۔ ویسے میری طبیعت اب ٹھیک ٹھاک ہے۔" لالی نے مسکرا کر شادو کی طرف دیکھا۔ "بھابی اب تجھ سے جھگڑا ٹنٹا تو نہیں کرتی؟"

"جب سے میں نے نوکری کی ہے' بہت راضی خوشی ہے۔" شادو بھی مسکرانے لگا۔ "ویسے اس کی ناراضی ٹھیک ہی تھی۔ روز پولیس والے گھر پر رات کو آواز لگاتے تھے۔ تھانے بلاتے تھے۔ اسے تکلیف ہوتی تھی۔ پاس پڑوس میں بدنامی ہوتی تھی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنا ایک کان پکڑا۔ "یار' اللہ کسی کو ہسٹری شیٹر نہ بنائے۔ پولیسے ایک بار پیچھے لگ جائیں تو جان نہیں چھوڑتے۔ ہزار نیک چلنی کا ثبوت دو' مانتے ہی نہیں۔"

"تجھے میاں سبحان نے پولیس کے چکر سے نکلوا دیا۔ تو بال بچے والا ہے' تیرے لیے یہ بہت ٹھیک ہوا۔"

"سوچتا ہوں' تیرا کیا بنے گا؟" شادو نے تشویش کا اظہار کیا۔ "تو کہہ تو میاں سبحان سے تیرے لیے بات کروں؟ اس کا بہت اثر و رسوخ ہے۔ سارے سرکاری افسر اس کی بات مانتے ہیں' اس کے دو پت بھی وڈے افسر لگے ہوئے ہیں۔"

"تو میرے بارے میں میاں سبحان سے بالکل بات نہ کرنا۔ جانے کیا گڑبڑ ہوجائے۔" لالی نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ "تو مجھے جھیتی تال کادر آباد پہنچا دے۔ میں نوں رحیم داد سے ملنا

ہے۔ وہ میرے لیے بہت پریشان ہوگا۔"

"جیسی تیری مرضی۔ میں نوں اب جانا ہے۔ میاں صاحب انتظار کرتے ہوں گے۔"

شادو نے لالی کے سرہانے سے گٹھری اٹھائی۔ اسے کھول کر میلے کپڑے نکالے۔ رائفل الٹ پلٹ کر دیکھی۔ "یہ رائفل تیرے ہاتھ کیسے آ گئی؟"

"بس ایک چکر میں مل گئی۔ آگے کام دے گی۔"

شادو نے کچھ نہیں کہا۔ رائفل پھر چادر میں لپیٹ کر رکھ دی۔ وہ لالی کے کپڑے اپنے ساتھ نہیں لے گیا۔ کہنے لگا۔ "کل لائل پور جاتے ہوئے تیرے کپڑے لے جاؤں گا۔" وہ چلا گیا۔

لالی نے رات کا کھانا کھایا اور کوٹھری سے نکل کر کھلے صحن میں ٹہلنے لگا۔ اب اس کے جسم میں دھیرے دھیرے توانائی لوٹ رہی تھی۔ دوسرے روز اس نے غسل کیا۔ اجلے کپڑے پہنے۔ اب کمزوری بھی بہت کم رہ گئی تھی۔ غسل کے بعد وہ تازگی اور سکون محسوس کر رہا تھا۔ مگر مہمان خانے سے باہر نہیں گیا۔

شام کو اس نے چارپائی کوٹھری سے نکال کر باہر صحن میں ڈالی۔ بستر بچھایا اور اس پر لیٹ گیا۔ اسے شادو کا انتظار تھا۔ شادو چراغ جلے آیا مگر ٹھہرا نہیں۔ لالی کے میلے کپڑے لے کر چلا گیا۔

بابا خداداد خاں آ گیا۔ وہ کھانا لایا تھا۔ لالی کھانا کھانے لگا۔ خداداد چارپائی کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔

مہمان خانے میں خاموشی طاری تھی۔ لالی نے کھانا کھاتے ہوئے بوڑھے سے پوچھا۔ "بابے! یہاں تیرے سوا کوئی دوسرا نوکر چاکر نہیں ہے؟"

"کئی ہیں جی' پر سارے ہی نوکر ادھر جالی فت یا نہ سے آگے جھل کے سامنے میدان میں خیمے لگا رہے ہیں' شکار کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ کل سویرے سے شکار شروع ہوگا۔ نوکروں کے علاوہ پنڈ کے لگ بھگ سو مزارعے اور کمّی بھی شکار کے لیے ویگار پر لگائے گئے ہیں۔"

"تیری باتوں سے لگتا ہے' بہت زوروں کا شکار ہوتا ہے۔"

"نہ پوچھ' کیسا زور دار شکار ہوتا ہے۔" خداداد خاں نے بتایا۔ "شکار کھیلنے والے بھی بہت ہوتے ہیں۔ اونچے اونچے افسر' وڈے وڈے زمیں دار' دوسرے ضلعوں تک سے شکار کھیلنے والے آتے ہیں۔ کئی تو اپنی گھر والیوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں۔ سارے ہی مہمان چھولداریوں میں ٹھیرتے ہیں۔ دن بھر شکار کھیلا جاتا ہے۔ رات کو زبردست دعوت ہوتی ہے۔ دبا کے شراب پی جاتی ہے' ناچ گانا ہوتا ہے۔ زبردست موج میلا ہوتا ہے۔"



"ہر سال ایسے ہی شکار کھیلا جاتا ہے؟"

"ایک بار نہیں' سال میں دو بار کھیلا جاتا ہے۔ گرمیوں میں پت جھڑ لگنے کے بعد ادھر شکار ہوتا ہے۔ یہ تو سرکاری جھل ہے۔ میاں سبحان کے پاس برسوں سے اس کا ٹھیکا ہے۔ پر اصلی شکار تو برسات کے بعد ادھر رحیم یار خاں میں ہوتا ہے۔ وہاں ریتی میں میاں سبحان کی اپنی شکار گاہ ہے۔ میں تو شکار کے دنوں میں وہاں بھی جاتا ہوں۔ بہت شان دار شکار گاہ ہے۔ میاں سبحان نے شکار کے لیے ادھر طرح طرح کے پرندے' خرگوش اور دوسرے جانور پال رکھے ہیں۔ شکار کا مزہ تو رحیم یار خاں میں آتا ہے۔"

لالی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہوا۔ میاں سبحان وڈا زمیں دار ہے؟"

"تیں نوں پتہ ہے' وہ کتنا وڈا زمیں دار ہے؟ جگیر دار ہے' جگیر دار۔" خداداد نے جوش و خروش سے اظہار کیا۔ "ادھر لائل پور میں تو اس کے صرف ۳۰ مربعے ہیں' پر رحیم یار خاں میں تو لگ بھگ چار سو مربعے ہوں گے۔ ۲۵ مربعے پر تو اس کی شکار گاہ ہے۔ دو سو مربع زمین پر کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ سو پر آم' امرود اور مالٹے کے باغ ہیں۔ باقی زمین پر جھاڑیاں اور جھنگر ہیں۔ سنا ہے میاں سبحان اسے بھی صاف کرا کے مویشی فارم بنانا چاہتا ہے۔"

"جب ادھر اس کی دس ہزار ایکٹر زمین ہے تو یہاں لائل پور میں کیوں رہتا ہے؟"

"یہاں وہ اپنے تیسرے پت کے لیے کپڑا بنانے کا کارخانہ لگانے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اس کا پت ابھی لہور میں پڑھ رہا ہے۔ میاں سبحان اسے کاروباری لین میں ڈالنا چاہتا ہے۔ سننے میں تو یہی آیا ہے۔ ویسے جی' اسے کیا پروا۔ اللہ نے بہت دے رکھا ہے۔ اس کے دو پت وڈے افسر لگے ہیں۔ ایک لہور میں ہے۔ دوسرا پنڈی میں لگا ہے۔ فوج میں کرنیل ہے۔" خداداد کو کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ چند لمحے وہ کھانستا رہا۔ ذرا قرار آیا تو بتانے لگا۔

"سچ پوچھو تو جی' شکار کا بندوبست تو میاں کا لہور والا پت ہی کرتا ہے۔ میاں سبحان تو آج لائل پور چلا گیا۔ اب نہیں آئے گا۔"

"ویسے شکار کا سلسلہ تو میاں سبحان نے شروع کیا ہوگا؟"

"نہیں جی' یہ بات نہیں ہے۔" خداداد خاں نے بتایا۔ "شکار تو اس کا پیو بھی اسی شان سے چلاتا تھا۔ یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ میں پہلے اسی کے پاس نوکر تھا۔ اسی نے رحیم یار خاں میں شکار گاہ کے لیے جنگل لگوایا تھا۔ انگریز افسروں' راجوں اور نوابوں کو شکار کھیلنے کے لیے

بلاتا تھا۔ سردی شروع ہوتے ہی شکار کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ شکاریوں کے ٹھہرنے کے لیے چھولداریاں لگائی جاتیں۔ انگریز افسروں کے ساتھ ان کی میمیں بھی شکار کے پیچھے گھوڑے دوڑاتیں۔ شام کو شکار سے تھک کر آتیں تو ٹبوں میں نہانے کے لیے گرم گرم پانی بھرا ہوتا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "بالکل ننگی ننگی نہاتیں۔ انھیں ذرا لاج نہ آتی۔ زور زور سے ہنستیں۔ ٹھٹھے لگاتیں۔"

"اب ایسا نہیں ہوتا؟"

"ہوتا تو اب بھی ایسا ہی ہے۔ پر اب وہ بات نہیں رہی۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بات یہ ہے جی! وہ اپنی جوانی کے دن تھے۔ اب بڑھاپے میں کچھ چنگا نہیں لگتا۔ اسی لیے ادھر پڑا رہتا ہوں۔ شکار دیکھنے نہیں جاتا۔"

"میاں سبحان کا دادا بھی وڈا زمیں دار ہوگا؟"

"پہلے تو نہیں تھا' بعد میں وڈا زمیں دار بن گیا۔ میں نے تو اسے دیکھا نہیں' پر سننے میں ایسا ہی آیا ہے۔"

لالی نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ "بابے! وہ اتنا وڈا زمیں دار کیسے بن گیا؟ کہاں سے اس کے پاس اتنی بہت ساری زمین آگئی؟"

"میرا پیو اسے ٹھیک طرح جانتا تھا۔ وہی اس کے بارے میں بتاتا تھا۔ میاں سبحان کے دادا کا نام رحمان تھا۔ وہ ملتان کے انگریز کمشنر برکلے کا سائیس تھا۔"

لالی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "سائیس تھا؟"

"ہاں جی' سائیس ہی تھا۔" خداداد خاں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "برکلے تھا تو اسسٹنٹ کمشنر' پر اس نے بہادری میں بہت نام پیدا کیا۔ میراثی اس کی بہادری کے گیت بنا بنا کر گاتے تھے۔ جگیرداروں' سرکاری افسروں اور انگریزوں سے خوب انعام پاتے تھے۔ کچھ تو ڈھڈے اور سارنگی پر مرزا صاحباں کی دھن پر گاتے تھے۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کر لمبی تان سے برکلے کی بہادری کی سد لگاتے تھے۔ کچھ میراثی برکلے کی شان میں وار بھی گاتے تھے۔ میں نے ایسے سد اور وار بہت سنے ہیں۔ اب بھی کوئی بوڑھا میراثی مل جائے تو اسے ایسے گیت یاد ہوں گے۔ اب ان کا رواج نہیں رہا۔ انگریزوں کے راج میں تو بہت گائے جاتے تھے۔"

"یہ تو نے عجب گل سنائی۔" لالی نے مسکرا کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "میاں سبحان کا دادا برکلے کا سائیس ہوتا تھا۔ پر سائیسی کرتے کرتے وہ اتنا وڈا زمین دار کیسے بن گیا؟"



"وہ ایسا ہوا جی' جب ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا تو احمد خاں کھرل بھی انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ تو تینوں پتہ ہی ہوگا کہ کھرل گوگیرہ اور اس کے آس پاس راوی کے دونوں کناروں پر آج بھی بسے ہیں۔ جڑانوالا' تاندلیانوالا' کھڑیانوالا اور اس سے بھی آگے داربرٹن اور سیدوالا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان دنوں گوگیرہ سرکاری ہیڈکوارٹر ہوتا تھا۔ برکلے بھی وہیں ہوتا تھا۔"

لالی خود بھی گوگیرہ میں پیدا ہوا تھا اور اس کا باپ بھی کھرل تھا۔ مگر اس نے اس کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا خداداد خاں کی باتیں سنتا رہا۔

"پر احمد خاں کا گھر جھمرے میں تھا۔ وہ کھرل اپیروں کا سردار ہوتا تھا۔ تب ہی تو اسے احمد خاں اپیرا بھی کہا جاتا ہے۔ بہت ہی بہادر اور حوصلے والا بندہ تھا۔ سنا ہے ڈیڑھ ڈیڑھ گز لمبے تو اس کے ہاتھ تھے۔ پہاڑ کی طرح اونچا اور یہ چوڑا سینہ۔" خداداد نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ "بہت لمبا تڑنگا اور زور آور تھا۔ ایسا زور آور تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ شیر کی طرح جھپٹ' جھپٹ کر حملے کرتا تھا۔"

لالی کھانے سے فارغ ہو چکا تھا' لیکن اس نے مداخلت نہ کی۔ خداداد خاں پرجوش لہجے میں بولتا رہا۔ "گوگیرہ کا سردار رائے ساون خاں اور اس کا پت' سادو خاں بھی احمد خاں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ فت یانوں اور وٹوؤں کو بھی احمد خاں نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ سچ پوچھ تو راوی سے ستلج تک سارے ہی سردار لڑائی میں احمد خاں کے ساتھ تھے۔ صرف جویا الگ رہے۔ ستلج کے اس پار جو وٹو تھے وہ بھی اس کے ساتھ نہ آئے بلکہ انگریزوں سے مل گئے۔ اسی وفاداری کے صلے میں ان کو مربعے ملے۔ جائیدادیں اور لمبرداریاں ملیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پاکستان بنا تو وہ پناہ گیرے بن کر ادھر آگئے اور جی انگریزوں کی دی ہوئی زمینوں کے بدلے یہاں بھی متروکہ جائیداد میں سے اتنی اراضی الاٹ کرائی کہ کئی تو وڈے جگیردار بن گئے۔"

"ایسا تو بہت ہوا۔ متروکہ جائیداد کی الاٹمنٹ کرنے والے افسر تو وہی تھے جو انگریزوں کے وفادار رہ چکے تھے۔" لالی نے تبصرہ کیا۔ "وہی کیا' سارے ہی افسر ایسے تھے۔ کسی کو بھی ہٹایا نہ گیا بلکہ میں نے تو سنا ہے' ان کے عہدے اور بڑھا دیے گئے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ بالکل ایسا ہی ہوا۔"

"بابے! تو احمد خاں کھرل کے بارے میں بتا رہا تھا۔" لالی نے خداداد کو یاد دلایا۔

"ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا' احمد خاں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکانا شروع کر دی۔" خداداد خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اس نے گوگیرہ میں بھی بغاوت کرا دی اور

ایسی بغاوت کرادی کہ کیدیوں نے جیل کا پھاٹک توڑ ڈالا' پر باہر نکلنے نہ پائے۔ تب تک دہلی سے انگریزوں کی مدد پہنچ گئی۔ اس فوج نے نہتے کیدیوں پر فائر کھول دیا۔ کیدیوں کے پاس صرف پتھر اور لوہے کی سلاخیں تھیں۔ اندھا دھند فائرنگ کے سامنے کب تک ٹھیرتے؟ ۵۱ مارے گئے اور زخمی تو بہت ہوئے۔ جیل کی زمین اور دیواریں ان کے خون سے لال ہو گئیں۔"

"احمد خاں کھرل نے ان کی کوئی مدد نہیں کی؟"

"اس کے پاس ان دنوں بہت تھوڑی فوج ہوتی تھی۔ تب تک وہ چھپ چھپ کر انگریزوں کی فوجوں پر حملے کرتا تھا اور اس کے ساتھ' ساتھ اپنی طاکت بھی بڑھاتا جا رہا تھا۔" خداداد نے لالی کو مطلع کیا۔ "میں نے تو سنا ہے تھوڑی فوج ہونے پر بھی احمد خاں نے جیل کے کیدیوں کی مدد کے لیے جم کر لڑائی لڑی۔ پر انگریزوں کے پاس بہت زیادہ فوج تھی۔ احمد خاں کے کتنے ہی ساتھی اس لڑائی میں مارے گئے۔ ان میں رائے ساون خاں بھی شامل تھا۔ ساون خاں بہت بہادر سردار تھا۔ اس کے مرنے پر احمد خاں کھرل کمزور پڑ گیا۔ وہ گوگیرہ سے نکل کر اپنے پنڈ جھمرے کی طرف پلٹا۔ برکلے اپنی فوج لے کر اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ راوی پار کرنے سے پہلے ہی احمد خاں کو گرفتار کر لینا چاہتا تھا۔ پر وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں راوی کے بیچ سے گھوڑا دوڑاتا ہوا صاف نکل گیا۔"

"برکلے نے راوی پار کرنے کی کوشش نہیں کی؟" لالی نے دریافت کیا۔

"نہیں وہ راوی سے آگے نہ بڑھا۔" بوڑھے خداداد خاں نے بتایا۔ "جھمرے پہنچ کر احمد خاں نے دوبارہ اپنی فوج اکٹھی کی اور دلّی کے بادشاہ کے ساتھ کھل کر وفاداری کا اعلان کر دیا۔ دوسرے سرداروں نے بھی اس کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کیا۔ فیر تو جی چناب سے ستلج تک ہر طرف بغاوت پھیل گئی۔ باغیوں نے کمالیہ پر کبضہ کر لیا۔ کمالیہ کا سردار رائے سرفراز خاں انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ سکھ سردار بیدی بھی شریک تھا۔ دونوں بھاگ کر گوگیرہ چلے گئے۔ احمد خاں کھرل اور اس کے ساتھی سرداروں نے ان کا پیچھا کیا۔ راوی سے گزر کر دوبارہ گوگیرہ پہنچے۔ زبردست معرکہ ہوا۔ احمد خاں اور اس کے ساتھی ایسی بہادری سے لڑے کہ انگریزوں کی فوجیں ٹھہر نہ سکیں۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ میدان جنگ سے بھاگ کھڑی ہوئیں۔ اس فتح نے احمد خاں کھرل کا حوصلہ اور بڑھا دیا۔"

"انگریزوں کا کیا بنا؟" لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"انگریز بہت گھبرا گئے۔ انھوں نے مدد کے لیے الفسٹن کو بھاری فوج دے کر بھیجا۔ اس میں زیادہ تر سکھ فوجی تھے۔ فیر یہ بھی ہوا کہ بھاول پور کے نواب صادک محمد خاں نے بھی



ر ریاستی فوج انگریزوں کی مدد کے لیے دے دی۔" اس نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔ دھر احمد خاں کھرل نے سیدوالا کے نزدیک راوی کے کنارے ایک پنڈ' مہر آباد' میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا انگریزوں کو پنجاب سے نکال دینے کی تیاری کر رہا تھا۔"

"انگریزوں کو اس کی تیاریوں کا پتہ نہیں تھا؟"

"بالکل پتہ تھا۔ اسی لیے تو انھوں نے اپنی فوجی طاکت بڑھانے کے لیے یہ چال چلی کہ اپنے رندوں کے ذریعے ایک رات چپکے سے جھمرے میں آگ لگوا دی۔ ساری بستی جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئی۔ جھمرے اور آس پاس کے دوسرے سرداروں میں یہ افواہ پھیلا دی' آگ احمد خاں نے لگوائی ہے اور ان کے سیکڑوں مویشی بھی اٹھا کر لے گیا۔ کھرل سردار انگریزوں کے بہکانے میں آ گئے اور اتنے نراض ہوئے کہ احمد خاں کا ساتھ چھوڑ دیا۔"

خداداد خاں کو کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ وہ دیر تک کھانستا رہا۔ جب ذرا قرار آیا تو بتانے لگا۔ "ہاں تو جی میں یہ کہہ رہا تھا۔ کھرل سرداروں نے احمد خاں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس طرح وہ بہت کمزور پڑ گیا۔ پریشان بھی ہوا۔ پر اس نے حوصلے سے کام لیا۔ ادھر کے وٹو اور فت یانے تو اس کے ساتھ تھے ہی' بک کے کھرلوں کے سردار سارنگ خاں کو بھی اس نے اپنی ساتھ ملا لیا۔ مہر آباد کو چھوڑا اور اس بار گشکوری کے جنگل میں اپنا ٹھکانا بنایا۔ انگریزوں کی اتنی وڈی فوج سے کھل کر لڑنے کی تو اس کے پاس طاکت نہیں تھی۔ اب اس نے نئی طرح کی لڑائی شروع کی۔ جنگل سے اچانک نکلتا۔ انگریزوں کی فوج پر چھاپے مارتا اور فیر جنگل میں گھس جاتا۔ انگریز اس کے ان اچانک حملوں سے بہت پریشان ہو گئے۔ انھوں نے فوجی مدد منگوائی۔ بہت زبردست فوج اکٹھی کی اور گشکوری کے جنگل کا محاصرہ کر لیا۔ ایسی سخت ناکہ بندی کی کہ احمد خاں کی فوج کو رسد ملنی بالکل بند ہو گئی۔"

"تب تو وہ انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا ہو گا۔" لالی نے قیاس آرائی کی۔

"نہیں جی' اس نے ایسا نہیں کیا۔" بوڑھے خداداد نے کڑک کر کہا۔ "وہ بہادر بندہ تھا۔ بزدلوں کی موت مرنا نہ چاہتا تھا۔ جب حالات بہت خراب ہو گئے تو ایک روز وہ جنگل سے نکل کر انگریزوں کی فوجوں کے سامنے آیا۔ ایسی زبردست لڑائی ہوئی کہ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں دکھائی دیتی تھیں۔ احمد خاں اور سردار سارنگ اس لڑائی میں مارے گئے۔ کہتے ہیں احمد خاں آخر دم تک لڑتا رہا۔ اس کے بدن پر زخم ہی زخم تھے۔ وہ خون میں نہایا ہوا تھا۔ جب وہ زخموں سے نڈھال ہو کر گھوڑے سے گرا تو ایک گورا اس کا سر کاٹنے کے لیے جھپٹا' پر احمد خاں کھرل نے گرتے گرتے بھی تلوار کا ایسا ہاتھ مارا کہ حملہ کرنے والے انگریز فوجی کا سر گردن سے کٹ کر دور جا گرا۔" خداداد

کے چہرے پر دکھ کا سایہ پھیل گیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "زمین پر آکر احمد خاں کھرل نے سجدے کے لیے سر جھکا دیا اور کلمہ پڑھنے لگا۔ سردار سرفراز خاں اور سردار بیدی گھات میں تھے۔ جھٹ آگے بڑھے اور احمد خاں کھرل کا سر کاٹ دیا۔ اسے لے کر خوشی خوشی انگریز افسر کے سامنے پہنچے۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اس کی سفارش پر سردار سرفراز خاں کو نواب کا خطاب اور کمالیہ کی جاگیر ملی۔ سردار بیدی کو پاک پتن میں سیکڑوں مربعے ملے۔ یہ مربعے اب انگریزوں کے وفادار وٹوؤں کو الاٹ کردیئے گئے ہیں۔"

خداداد خاں کی آواز بھرا گئی۔ وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ لالی دم بخود بیٹھا رہا۔ چند لمحے خاموشی رہی، پھر خداداد کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "آج احمد خاں کھرل کو کوئی نہیں جانتا۔ کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کی بہادری کی شان میں کسی میراثی نے گیت نہیں گایا۔ کوئی سد نہیں لگایا۔ لگاتا تو جیل میں بند کردیا جاتا یا گولی سے اڑا دیا جاتا۔ میں تو کہتا ہوں ایسا سد بھی کسی نے انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے بنایا ہوگا۔

بونڈیاں دے گیت کوئی نہیں گاوندا
بزدلاں دی سد کوئی نہیں لاوندا

لالی مسکرا کر بولا۔ "بابے! تو سچ مچ بوڑھا ہوگیا ہے۔ اب تیرا بھیجا کام نہیں کرتا۔ میں نے میاں سبحان کے دادا کے بارے میں پوچھا اور تو نے احمد خاں کی گل چھیڑ دی۔"

"تیں نوں کیہہ پتہ، میرا دادا بھی احمد خاں کھرل کے ساتھ انگریزوں کے خلاف لڑا تھا۔ اسے پکڑ کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ وہ بھی اپیرا سردار تھا اور بہت جی دار بھی تھا۔" خداداد خاں نے گردن اونچی کرتے ہوئے فخر سے کہا۔ "اب اپنے مطلب کی گل سن۔ احمد خاں کے مارے جانے کے بعد بھی باغیوں نے انگریزوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ ان میں فت یانوں اور وٹوؤں کے ساتھ ترانے اور سیال بھی شامل تھے۔ کوڑے شاہ کے نزدیک راوی کے کنارے ان کا برکلے سے ٹاکرہ ہوا۔ اس لڑائی میں انگریزوں کی زبردست ہار ہوئی۔ ان کے ۵۰ فوجی مارے گئے۔ برکلے بری طرح زخمی ہوا۔ سبحان کا دادا رحمان اس کے ساتھ تھا۔ اس نے زخمی برکلے کو گھوڑے پر ڈالا اور لڑائی کے میدان سے نکال کر نزدیک کے بیلے میں لے گیا۔ اس نے برکلے کی جان بچانے کی بہت کوشش کی۔ وہ بچ تو نہیں سکا پر رحمان کی وفاداری اور خدمت سے اتنا خوش ہوا کہ مرتے دم اس نے اپنے خون سے کاغذ کے ایک پرزے پر یہ لکھ دیا کہ رحمان انگریزوں کا زبردست وفادار ہے۔ اس نے میری جان بچانے کے لیے اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ اس کی وفاداری اور خدمت کو تسلیم کیا جائے اور



مت کی جانب سے اسے وفاداری کا صلہ دیا جائے۔ لو جی اس کاغذ سے رحمان کا نصیب جاگ ا۔"

لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"ہوا یہ کہ انگریزوں نے جب بغاوت کچل ڈالی اور ان کی فتح ہوئی تو وہ فتح کے نشے میں جگہ جگہ پھریاں لگاتے، باغیوں کو پکڑ کر پھانسی پر لٹکاتے اور انگریزوں کے وفاداروں کو انعام اور بخشش یتے۔ کرنیل ہیٹن ادھر کی انگریز فوج کا کمانڈر تھا۔ وہی ہر جگہ جاکر کچہری لگاتا۔" بابا خداداد خاں ہر ٹھہر کر بتاتا رہا۔

"رحمان سیدھا کرنیل ہیٹن کے پاس پہنچا۔ کرنیل ان دنوں رحیم یار خاں میں تھا۔ اس نے اپنی کچہری لگا رکھی تھی۔ رحمان کچہری میں گھس گیا۔ کرنیل نے ناراض ہو کر اسے گھورا۔ رحمان نے جوتی کے ڈپ سے جھٹ برکلے کا خون سے لکھا ہوا پرچہ نکالا اور اس کے سامنے پیش کیا۔ کرنیل ہیٹن نے اسے پڑھا تو اس کی ساری ناراضی جاتی رہی۔ جھیتی نال اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ سر سے ٹوپی اتار کر رحمان کو سلام کیا، ہاتھ ملایا اور اپنے برابر کرسی پر بٹھا کر بولا۔ ول مسٹر رحمان! کمپنی بہادر کی حکومت تمہاری وفاداری کی پوری پوری کدر کرتی ہے۔ تمہیں اس وفاداری کا صلہ بھی ملے گا۔ تم اصطبل سے ہمارا گھوڑا لو، اس پر بیٹھو، جتنی زمین پر تم گھوڑا دوڑاؤ گے وہ سب تمہاری ہوگی۔ اس نے فوراً حکم بھی جاری کردیا۔"

"رحمان نے فیر کیا کیا؟"

"کرنا کیا تھا جی، اس نے جاکر اصطبل سے گھوڑا نکالا۔ اس پر سوار ہوا۔ اسے دوڑایا اور دوڑاتا چلا گیا۔ جب وہ لوٹا تو گھوڑا تھک کر اتنا نڈھال ہوچکا تھا کہ رکتے ہی لڑکھڑا کر گرا اور مرگیا۔ رحمان کا یہ حال ہوا کہ ہانپتے ہانپتے زمین پر لیٹ گیا۔ کرنیل ہیٹن نے اپنے گھوڑے کی موت کا بالکل برا نہیں منایا۔ اس نے رحمان کو شاباشی دی۔ خوش ہو کر اس کی پیٹھ ٹھونکی اور جتنی زمین پر رحمان نے گھوڑا دوڑایا تھا، ساری کی ساری رحمان کو بخش دی۔"

لالی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "تو اس طرح میاں سبحان کے دادا کو اتنی وڈی زمیں داری ملی۔"

"ہاں جی بالکل اسی طرح۔ میرا پیو یہی بتاتا تھا۔" خداداد خاں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "میاں سبحان کے دادا نے انگریزوں کا ساتھ دیا، وفاداری دکھائی، وہ سائیں سے جگیر دار بن گیا۔ خان بہادری کا خطاب بھی پایا۔" اس کے لہجے میں تلخی پیدا ہوگئی۔ "میرے دادا محمد خاں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی۔ کرنیل ہیٹن ہی کے حکم پر پھانسی پر لٹکایا گیا۔ وہ بھی کھرلوں کا

سردار ہوتا تھا۔ اس کی تمام جائیداد اور زمین ضبط کر لی گئی۔ مویشی بھی سارے کے سارے چھین لیے گئے۔ سب کچھ چلا گیا۔ سرداری بھی گئی۔ انگریز، باغی سرداروں اور ان کی آل اولاد کو جانگلی کہتے تھے، سو میں اور میرا پیو جانگلی کہے جانے لگے۔ سبحان اور اس کا پیو میاں بن گئے۔ اب رحمان سائیں کا پوتا زمیں داری کرتا ہے اور سردار محمد خاں کھرل کا پوتا خداداد خاں اس کی نوکری کرتا ہے۔" اس نے دل گرفتہ ہو کر آہ سرد کھینچی۔ "اپنا اپنا نصیب ہے جی۔"

"بابے! تیرا کوئی پتر نہیں ہے؟"

"دو ہیں جی۔" خداداد نے بے نیازی سے کہا۔ "وڈا پت تو ایک رسا گیر زمیں دار کے لیے ڈنگر چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اب جیل کاٹ رہا ہے۔ دوسرا میاں سبحان کے فارم پر رحیم یار خاں میں مزدوری کرتا ہے۔" اس کے لہجے میں درد کی چبھن تھی۔ "جانگلی پیو کے جانگلی پتر اور کر بھی کیا سکتے ہیں جی!"

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ بوڑھا خداداد خاں کھرل بھی خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے کی جھریاں اور نمایاں ہو گئیں۔ آنکھوں سے ویرانی جھلکنے لگی۔ وہ کچھ زیادہ بوڑھا اور کمزور نظر آنے لگا۔ کچھ دیر اسی عالم میں گم صم بیٹھا یادوں کی دھندلی پگڈنڈیوں پر بھٹکتا رہا، پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی کے سامنے سے اس نے کھانے کے برتن اٹھائے اور باورچی خانے کی جانب چلا گیا۔

☆

شادو سویرے آیا اور لالی کو اپنے ہم راہ جیپ میں بٹھا کر شکار دکھانے لے گیا۔ جیپ گلیوں سے گزرتی ہوئی گاؤں سے باہر نکلی اور ایک کچے راستے پر جنگل کی جانب دوڑنے لگی۔ جنگل زیادہ دور نہیں تھا۔ خوب گھنا تھا اور دریائے راوی کے کنارے دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جنگل کے سامنے کھلا میدان تھا۔ میدان میں جگہ جگہ خیمے لگے تھے۔ ہر طرف چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ شکاری رات ہی کو پہنچ گئے تھے۔

جیپ خیموں کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ لالی نیچے اترا۔ شادو بھی اترا اور ایک خیمے میں داخل ہو گیا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ آسمان پر اجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ شکاری بیدار ہو چکے تھے۔ خیموں کے اندر ان کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ سور کے شکار کا ہانکا کرنے والے کمی اور مزارعے لمبی لمبی لاٹھیاں اور برچھے ہاتھوں میں دبائے ایک جگہ جمع تھے۔ ان کے ساتھ شکاری کتے اور ان کے راکھے بھی تھے۔

سورج نکلا۔ زرد زرد دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر جگمگانے لگی۔ ہانکا کرنے والے اور راکھے



ری کتوں کے ساتھ جنگل میں گھس گئے۔ وہ جنگل کے دلدلی حصے کی جانب جا رہے تھے جہاں گھنے ر تھے۔ ان چھتروں کے اندر جنگلی سور دن میں چھپے رہتے ہیں۔ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی ان کے ں کے غول جنگل سے نکلتے ہیں۔ آس پاس کے دیہات کی جانب جاتے ہیں۔ کھیتوں میں گھس تے ہیں۔ ربیع کی فصل ہو تو گندم اور جو کے خوشے اور چنے اور سرسوں کے پودے کھا جاتے ں۔ خریف کی فصل ہو تو مکئی کے ٹنے اور کپاس کے ڈوڈوں سے نکلی ہوئی سیفد پھٹی کھا جاتے ہیں۔ ں کھیت میں گھستے ہیں، اسے روند ڈالتے ہیں۔ ان کھیتوں سے ایسی بدبو نکلتی ہے کہ مویشی بھی ان ، پودے نہیں کھاتے۔

دھوپ رفتہ رفتہ ہر طرف پھیل گئی۔ سورج چڑھ کر اوپر آ گیا۔ شکاری ناشتے سے فارغ ہو کر وں سے باہر نکلنے لگے۔

وہ تین ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ایک ٹولی جیپوں میں بیٹھ کر سور کے شکار کے لیے چھتروں کی جانب انہ ہو گئی۔ اس میں اکثریت زمیں داروں کی تھی۔ دوسری ٹولی کے شکاری جیپوں کے علاوہ وڑوں پر بھی سوار تھے۔ ان کے ساتھ شکاری کتے بھی تھے۔ وہ خرگوش اور ہرن کا شکار کھیلنے جا ہے تھے۔ تیسری ٹولی کے شکاری بھی جیپیں اور گھوڑے دوڑاتے ہوئے جنگل میں گھس گئے۔ وہ ندوں کے شکاری تھے۔

بیشتر شکاری بڑے افسر تھے۔ شکاریوں میں اسمبلیوں کے ممبروں کے علاوہ بڑے زمیندار بھی ے۔ بہت سے شکاریوں کے ساتھ ان کی بیویاں بھی تھیں۔ وہ تیز خوشبوؤں سے مہکتی، بنی سنوری پنے شوہروں کے پہلو سے لگی جیپوں میں بیٹھی تھیں۔ لالی نے حیرت سے دیکھا، کئی پالکیاں بھی یں اور انھیں کمی اور مزارعے اٹھائے ہوئے چل رہے ہیں۔ پالکیوں میں بھی شکاریوں کی بیویاں ر بیٹیاں سوار تھیں۔ وہ نئے نئے فیشن کے خوب صورت لباس پہنے ہوئے تھیں۔ انھوں نے ایت اہتمام سے میک اپ کیا تھا۔ بال طرح طرح سے سنوارے تھے۔ وہ خوبصورت اور طرح ر نظر آ رہی تھیں۔ کھلی پالکیوں میں بیٹھی وہ ہنستی مسکراتی، پرندوں، خرگوشوں اور ہرنوں کا شکار ھیلنے جا رہی تھیں۔

سور کا شکار کھیلنے والی پارٹی میں صرف دو شکاریوں کی بیویاں شریک تھیں۔ وہ نصف آستینوں کی اکی قمیص اور پتلونیں پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے ہاتھ میں بندوقیں دبی تھیں۔ وہ صرف شکار دیکھنے یں آئی تھیں بلکہ سور کا خطرناک شکار کھیلنے کا حوصلہ بھی رکھتی تھیں۔ لیکن پرندوں، خرگوشوں ر ہرنوں کا شکار کھیلنے والی بیگمات کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں بھی قمیص اور پتلون پہنے والیاں

شامل تھیں۔

شادو نے لالی کو بھی جنگل میں لے جانا چاہا مگر وہ نہیں گیا۔ کچھ دیر بعد شکاری اپنی بیویوں کے ساتھ جنگل میں داخل ہو کر گھنے درختوں کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ لالی خیموں کے اردگرد گھومتا رہا' پھر حویلی کی جانب واپس ہوا۔ مہمان خانے میں پہنچا۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور سو گیا۔

دن ڈھلے وہ سو کر اٹھا۔ اس نے غسل کیا اور تروتازہ ہو کر شادو کا انتظار کرنے لگا۔ اب اس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ کمزوری بھی بڑی حد تک ختم ہو گئی تھی۔ وہ قادر آباد جانا چاہتا تھا اور اسی روز جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

سورج غروب ہو گیا۔ مگر شادو نہیں آیا۔ لالی اس سے ملنے کے لیے اس میدان کی جانب چل دیا' جس میں شکاریوں کے خیمے تھے۔ شادو وہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے لالی کو یہی تاثر دیا تھا۔ لالی میدان میں پہنچا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جنگل میں منگل کا سماں ہے۔ مٹی کے تیل سے چلنے والے جنریٹر کے ذریعے بجلی پیدا کی جا رہی تھی۔ ابھی شام ہی تھی مگر خیموں کے اندر اور باہر ہر طرف بلب روشن تھے۔

نوکر چاکر نہایت مستعدی سے ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ خیموں سے کچھ فاصلے پر میدان میں بڑے بڑے چولھوں میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ ان پر رکھی ہوئی دیگوں میں طرح طرح کے کھانے پکائے جا رہے تھے۔ کہیں دہکتے ہوئے سرخ سرخ انگاروں پر مرغ تلے جا رہے تھے کہیں کباب بنائے جا رہے تھے۔

شادو کی تلاش میں لالی ادھر ادھر نظریں دوڑاتا خیموں کے درمیان گھومتا پھرتا رہا۔ مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اس نے ایک ملازم کو ٹوکا جو قریب کے خیمے سے نکلا تھا۔

"گل سن! تیں نوں پتہ' شادو کتھے ہے؟"

ملازم نے ایک خیمے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "وہ تو جی' میاں سبحان کے وڈے پت میاں سلیم کے پاس اس خیمے میں ہے۔"

لالی نے مزید بات چیت نہیں کی۔ وہ اس خیمے کی طرف بڑھا' قریب پہنچا' خیمے کا پردہ کھلا تھا۔ میاں سلیم چوڑی چوڑی دھاریوں کی ریشمی قمیص اور ویسا ہی پاجامہ پہنے' آنکھیں بند کیے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ و سفید تھا' سر کے بال آگے سے کسی قدر اڑے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی مونچھ صاف تھی۔ قد اونچا تھا اور جسم خاصا بھاری بھرکم تھا۔ عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ صوبائی حکومت کے محکمہ زراعت و خوراک کا سیکرٹری تھا۔

شادو فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا میاں سلیم کے پیر دبا رہا تھا۔ شادو نے مڑ کر لالی کو دیکھا' رایا اور اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔ لالی خیمے میں چلا گیا۔ شادو نے میاں سلیم کو مخاطب تے ہوئے کہا۔ "صاحب جی! یہ خود یہاں آگیا۔ میں اسی کے پاس جانا چاہتا تھا۔ میرا بہت پرانا ہے۔"

سلیم نے آنکھیں کھول کر لالی کو دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "تب تو یہ بھی جرائم پیشہ ہوگا؟"

شادو نے جھٹ بات بنائی۔ "نہیں جی' ایسی کوئی گل بات نہیں۔ یہ بہت نیک بندہ ہے۔"

سلیم نے لالی سے کہا۔ "تو میرے کندھے اور بازو دبا دے۔ آج تو میں بہت تھک گیا۔ سارا جسم رہا ہے۔" اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

شادو نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لالی کرسی کے پیچھے گیا اور چپ چاپ میاں سلیم کے کندھے اور دبانے لگا۔

خیمے میں خاموشی تھی۔ خیمہ خاصا بڑا اور کشادہ تھا۔ ایک طرف لوہے کا فولڈنگ پلنگ تھا۔ اس اسپرنگ لگے ہوئے تھے۔ پلنگ پر موٹا گدا بچھا تھا اور اس پر اجلی چادر اور نرم نرم تکیوں کا بستر ۔

پلنگ کے اوپر مچھردانی تھی۔ قریب ہی میز رکھی تھی۔ اس کے سامنے کرسی تھی۔ میز پر سنگھار کا امان اور ملکی و غیر ملکی عطریات کی چھوٹی بڑی شیشیاں تھیں۔

☆

پینتیس چھتیس سال کی ایک عورت خیمے میں داخل ہوئی۔ وہ سلیم کی بیوی تھی۔ سرو قامت' وری چٹی اور طرح دار۔ اس کا باپ' مخدوم نور علی شاہ گیلانی' خانقاہ عالیہ کا گدی نشیں تھا' ملتان کے بڑے جاگیرداروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ بڑے باپ کی بیٹی ہونے کے باعث اس کا غصہ بھی ت زیادہ تھا۔

آہٹ سن کر سلیم نے آنکھیں کھول دیں۔ بیوی کو مسکرا کر دیکھا اور نرم لہجے میں گویا۔ فرخندہ! تم نے ابھی غسل نہیں کیا؟"

وہ اٹھلا کر بولی۔ "میں برابر کے ٹینٹ ہی سے ہو کر آرہی ہوں۔ نہانے کا پانی بہت گرم ہے۔ پتہ یں' اس موسم میں اتنا گرم پانی ٹب میں بھرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"مگر یہاں تو ایسی گرمی نہیں ہے۔ ڈارلنگ! ویسے گرم پانی سے نہانے کے بعد ساری تھکن دور دجاتی ہے۔ آج تم نے بھاگ دوڑ بھی بہت کی ہے۔ تھک گئی ہوگی۔"

"تھکن تو بہت معلوم ہوتی ہے۔ مگر میں غسل ابھی نہیں کروں گی۔"

وہ میز کے سامنے جاکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ "میں دائی کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ اب تک آئی کیوں نہیں؟"

"اسے اب تک آجانا چاہئے تھا۔ آتی ہی ہوگی۔" میاں سلیم نے قیاس آرائی کی۔

فرخندہ نے کچھ نہیں کہا۔ کنگھا اٹھا کر اپنے بال سنوارنے لگی۔ اس کے بال گردن تک ترشے ہوئے تھے۔ ان پر خاک کے ذرات چمک رہے تھے۔ سلیم نے آنکھیں بند کرلیں۔ لالی اس کے کندھے اور بازو دباتا رہا اور شادو سامنے فرش پر بیٹھا انگلیوں سے اس کی پنڈلیوں کا مساج کرتا رہا۔

فرخندہ بالوں میں کنگھا پھیرتی رہی اور آئینے میں اپنا چہرہ مختلف زاویوں سے دیکھتی رہی۔

چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک ایسی عورت خیمے میں داخل ہوئی جو وضع قطع سے حویلی کی خادمہ یا کسی مزارعے کی بیوی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی عمر فرخندہ سے کم تھی۔ رنگت کبھی گوری رہی ہوگی مگر تیز دھوپ میں محنت مشقت کرنے سے اس کا رنگ جھلس کر زردی مائل مٹیالا پڑگیا تھا۔ چہرے پر ابھی سے بڑھاپے کی لکیریں ابھرنے لگیں تھیں۔ اس کا بدن مضبوط اور چھریرا تھا۔ اسے دیکھ کر فرخندہ نے پوچھا۔

"کیا نام ہے تیرا؟"

وہ نظریں جھکا کر بولی۔ "میرا ناں کریماں ہے جی۔"

"ادھر آ میرے نزدیک۔" فرخندہ نے نہایت رعب اور دبدبے سے اسے بلایا۔ وہ چپ چاپ اس کے نزدیک جاکر کھڑی ہوگئی۔ فرخندہ نے اپنی ناک آگے بڑھا کے اس کا لباس سونگھا۔

"نہا دھو کر آئی ہے؟"

"ہاں جی' ٹھیک طرح نہا کر آئی ہوں۔ کپڑے لتے بھی آج ہی دھو کر پہنے ہیں۔ انھیں سوکھنے میں دیر ہوگئی۔ اسی لیے آنے میں دیر ہوگئی جی۔"

فرخندہ نے نظریں اٹھا کر کریماں کے لباس کا جائزہ لیا۔ وہ سفید دھوتی باندھے ہوئے تھی۔ جھگی بھی سفید ہی تھی۔ البتہ دوپٹا گہرا نیلا تھا۔ فرخندہ منہ بگاڑ کر بولی۔ "پتہ نہیں' کیسے نہائی تھی۔ ابھی تک پسینے کی سڑی ہوئی بو نکل رہی ہے۔"

فرخندہ نے میز پر سے صندل کے عطر کی شیشی اٹھائی اور کریماں کی جانب مڑی۔ "ہاتھ کھول۔" کریماں نے ہاتھ بڑھا کر کھول دیا۔ فرخندہ نے شیشی کھولی اور کریماں کی ہتھیلی پر عطر کی چند بوندیں ٹپکا دیں۔



"اسے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں چپڑ کر گردن' ناک' ہاتھوں اور کپڑوں پر لگا لے۔"

کریماں اس کی ہدایت کے مطابق عطر لگانے لگی۔ وہ عطر لگا چکی تو فرخندہ نے کہا۔ "یہ شیشی لے ر انگلیوں کے ناخنوں پر بھی خوشبو لگا لے۔" اس نے عطر کی شیشی کریماں کو دے دی اور ایک بار ر منہ بگاڑا۔ "نہ جانے ان جانگلی عورتوں کے ناخنوں سے اتنی بدبو کیوں نکلتی ہے۔ دماغ سڑ جاتا ہے۔" کریماں خاموش رہی۔ اس نے عطر کی شیشی کھولی اور گردن جھکا کر اپنے ناخن خوشبو سے مانے لگی۔

فرخندہ نے کنگھا میز پر ڈالا۔ اٹھ کر کھڑی ہوئی' پلنگ کے پاس گئی' مچھر دانی کا پردہ اٹھا کے اوپر الا اور شلوار کے پائنچے گھٹنوں تک چڑھا کے نرم نرم تکیے پر چہرہ ٹکا کر اوندھی لیٹ گئی۔ کریماں گے بڑھی' مچھر دانی میں داخل ہو کر فرخندہ کے قریب بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گوری وری پنڈلیاں اور کمر ہولے ہولے دبانے لگی۔ فرخندہ کچھ دیر خاموش لیٹی رہی پھر اس نے اپنے وہر کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

"سلیم! تم جا کر غسل کرلو۔ تمہیں اب تیار ہو جانا چاہئے۔ یہ نہ بھولو کہ تم میزبان بھی ہو۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ مجھے اب تیار ہو جانا چاہئے۔" اس نے آنکھیں کھول کر خیمے کے باہر پھیلتا ہوا اندھیرا دیکھا اور کھڑا ہو کر شادو کی جانب متوجہ ہوا۔ "تو منیجر انوار خاں کے پاس چلا جا۔ جو کام وہ بتائے کرنا۔ انوار خاں' میرے پی اے ماجد کے خیمے میں ہوگا۔"

شادو خاموشی سے اٹھا اور خیمے سے چلا گیا۔ لالی بھی اس کے ساتھ نکلا۔ خیمے سے دور جا کر اس نے کہا۔ "یہاں تو عیش ہو رہے ہیں جی!"

"تو کیا تو یہ سمجھ رہا تھا' خالی شکار ہی ہوتا ہے؟" شادو نے ہنس کر بتایا۔ "کچھ دیر بعد شراب کا ور چلے گا۔ فیر زوردار دعوت ہوگی۔ مجرا بھی ہوگا۔ لہور اور ملتان سے کنجریاں بلائی گئی ہیں۔ زوروں کا جشن ہوتا ہے اور برابر تین روز تک ہوتا ہے۔ دیکھے گا تو پھڑک اٹھے گا۔"

"میں تو آج ہی جانا چاہتا ہوں۔ تو مجھے کادر آباد پہنچا دے۔ میں اسی لیے تیرے کول آیا تھا۔"

"چلا جانا' چلا جانا۔" شادو بے نیازی سے بولا۔ "پورا جشن دیکھ کے جانا۔"

"نہیں شادو! میں اب نہیں رک سکتا۔" لالی نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔ "تو مجھے کادر آباد پہنچا دے۔ رحیم داد میرے انتظار میں بہت پریشان ہوگا۔"

شادو آمادہ نہیں ہوا۔ "آج رات تو میرا جانا بہت مشکل ہوگا۔"

"جیسی تیری مرضی۔ میں نے تو آج ہی رات جانا ہے۔ میں اب یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھیر

سکتا۔"

"تیرا دماغ تو نہیں چل گیا؟" شادو نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ "تو پیدل یہاں سے کادر آباد جائے گا۔ کادر آباد پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ تو ہے کس خیال میں؟"

"اسی لیے تو میں تیرے ساتھ آنا نہیں چاہتا تھا۔" لالی نے گلہ کیا۔ "تو مجھے خامخا یہاں لایا۔"

"تو کیا تجھے سڑک پر مرجانے دیتا؟ حکیم کے پاس نہ لے جاتا تو زندہ بچ سکتا تھا؟ پتہ ہے، تجھے سنکھیا کھلائی گئی تھی۔"

"میں تو آج ہی جاؤں گا۔" لالی اڑا رہا۔ "آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔"

"میرا کہا مان، رحیم داد کا چکر چھوڑ۔ وہ اپنی فکر آپ کرلے گا۔" شادو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تو میرے ساتھ لائل پور چل۔ ایک بار ضلع منٹگمری سے نکل آیا، دوبارہ وہاں جانے کی غلطی نہ کر۔ ادھر کی پولیس تیری تلاش میں ہے۔ یہاں تیرے لیے زیادہ خطرہ نہیں ہے۔"

"نہیں جی، یہ نہیں ہوگا۔ میں رحیم داد کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ میں نے اس سے جو وعدہ کیا ہے اسے ضرور پورا کروں گا۔ میں تو آج ہی رات جاؤں گا اور ابھی جاؤں گا۔" لالی کا لہجہ تیکھا ہوگیا۔ "تیری بہت بہت مہربانی۔ آگے مجھے تیری مہربانی کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اتنا ناراض کیوں ہوتا ہے۔" شادو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تیری مرضی جانے ہی کی ہے تو رات ہونے کا انتظار کر۔ روٹی کھانے کے بعد ناچ گانا شروع ہوجائے گا تو میں تجھے کادر آباد لے جانے کی کوشش کروں گا۔ میاں سلیم سے اجازت لینی ہوگی۔ امید تو ہے وہ اجازت دے دے گا۔ طبیعت کا بھلا بندہ ہے۔"

لالی نے اور کوئی بات نہیں کی۔ شادو بھی خاموش رہا۔ دونوں خیموں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ کئی خیموں کے پردے کھلے تھے۔ انھوں نے دیکھا، اکثر خیموں میں سرکاری افسروں کی بیگمات اجلے اجلے بستروں پر لیٹی ہیں۔ حویلی کی خادمائیں یا مزارعوں اور کمیّوں کی عورتیں، ہاتھوں کے ناخنوں میں طرح طرح کی بھینی بھینی خوشبوئیں لگائے بیگمات کے نرم و گداز بدن دبا کر ان کی تھکن اتار رہی ہیں۔

شادو چلتے چلتے ایک خیمے کے قریب رکا اور اندر داخل ہوگیا۔ لالی بھی اس کے ہم راہ چلا گیا۔ یہ خیمہ نوکروں کے لیے تھا، مگر اس وقت خالی تھا۔ اس میں مونج کی چٹائیاں بچھی تھیں۔ شادو نے لالی سے کہا۔

"تھوڑی دیر یہاں لیٹ کر آرام کرلیں۔ تو بھی تھکا تھکا نظر آرہا ہے اور میرا تو دن ھ ھاگتے



تے بلیتھن نکل گیا۔"

"انوار خاں کے پاس نہیں جائے گا؟"

"چلا جاؤں گا، ذرا آرام کرلوں۔ تو بھی لیٹ جا۔ حویلی جاکر کیا کرے گا۔ یہیں میرے ساتھ کھالینا۔ اکٹھے چلیں گے۔"

"تو مجھے کادر آباد لے چلے گا نا؟"

"کہہ تو دیا، پکے کاغذ پر لکھ کر دے دوں؟" شادو نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "پر میاں سلیم سے تو زت لینی ہی پڑے گی۔"

لالی چٹائی پر شادو کے قریب ہی لیٹ گیا۔ اسے تھکن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں رلیں۔ نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سوگیا۔

لالی کی آنکھ کھلی تو شادو موجود نہیں تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ وہ اٹھ بیٹھ گیا۔ ذرا دیر چپ بیٹھا رہا، پھر شادو کی تلاش میں خیمے سے نکلا۔ بیشتر خیموں میں سناٹا تھا۔ وہ گے بڑھا۔

خیموں سے ذرا ہٹ کر کھلے میدان میں ایک جگہ جگمگاتی روشنیوں میں عورتیں اور مرد جمع ،۔ باتیں ہو رہی تھی۔ قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ لالی اس طرف چلا گیا۔ قریب جاکر دیکھا، ایک ف بار بنا ہے۔ کاؤنٹر پر طرح طرح کی شرابیں رکھی ہیں۔ بارمین اجلی اجلی وردیاں پہنے، کمر اور ر کے صافے پر سنہری پٹکے لگائے نہایت مستعدی سے بوتلیں کھول کھول کر گلاسوں اور گوبلٹوں ں طرح طرح کی شرابیں انڈیل رہے تھے۔ شیشے کے بڑے بڑے پیالوں میں برف کے ٹکڑے بھر ہے تھے۔ جگوں میں پانی یا سوڈا ڈال رہے تھے۔

کاؤنٹر خاصا لمبا تھا۔ اس کے ایک حصے میں تلے ہوئے مرغ، کباب اور تکے بھی پلیٹوں میں کھے تھے۔ سفید وردیوں میں ملبوس بیرے خالی گلاس، جگ اور پلیٹیں ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے تے۔ انھیں ایک طرف رکھتے اور دوسری ٹرے اٹھاتے۔ ان پر شراب کے گلاس اور گوبلٹ، ف سے بھرے ہوئے شیشے کے پیالے، پانی اور سوڈے سے لبریز جگ یا تلے ہوئے مرغ، کباب اور تکے رکھتے اور مہمانوں کے پاس پہنچ جاتے۔ یہ کاک ٹیل پارٹی تھی۔ مہمان ہاتھوں میں گلاس بھالے گھونٹ گھونٹ شراب پی رہے تھے۔ بے تکان باتیں کر رہے تھے، ہنس رہے تھے۔ لالی یک طرف کھڑا ہوگیا۔

کچھ در بعد شادو کاؤنٹر کے پاس آیا۔ لالی لپک کر اس کے نزدیک پہنچا، آہستہ سے پوچھا۔ "تو چپکے

سے اٹھ کر کتھے تڑ گیا تھا؟"

"میں دو اڑھائی گھنٹے سو کر ادھر آ گیا۔ تو گہری نیند سو رہا تھا اس لیے تجھے جگایا نہیں۔" وہ ایک بوڑھے بارمین سے مخاطب ہوا۔ "چاچا! دو پیگ وہسکی کے مجھے بھی بنا دے۔" اس نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا یار لہور سے آیا ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر ذرا شغل کرلوں گا۔" بارمین نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ بوتل کھول کر دو گلاسوں میں وہسکی انڈیلی۔ برف کے ٹکڑے ڈالے اور شادو سے پوچھا۔

"پانی ڈالوں یا سوڈا؟"

شادو نے ہنس کر کہا۔ "سوڈا ہی ڈال دے چاچا!"

بارمین نے بوتل کھول کر گلاس میں سوڈا ڈال دیا۔ شادو نے دونوں گلاس اٹھائے اور کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا۔ لالی بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں ایک درخت کی آڑ میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس جگہ روشنی کم تھی۔

شادو نے ایک گلاس لالی کو دیا اور آنکھ مار کر بولا۔ "اسکاچ وہسکی ہے، تھوڑی سی لگا لے، ساری کمزوری اور تھکن دور ہو جائے گی۔" اس نے اپنا گلاس لالی کے گلاس سے ٹکرایا، گلاس ہونٹوں سے لگایا اور کئی گھونٹ چڑھا گیا۔

لالی بھی پینے لگا۔ گلاس ختم ہوئے تو شادو اور لے آیا۔ دونوں نے وہسکی کے دو بڑے پیگ لگائے۔ ان پر سرخوشی طاری ہو گئی۔ لالی اپنے جسم میں حرارت اور توانائی محسوس کرنے لگا۔

کاک ٹیل پارٹی دس بجے ختم ہو گئی۔ مہمان بکھر کر شامیانے کے نیچے چلے گئے۔ شامیانے میں کھانے کا بندوبست تھا۔ شادو اور لالی بھی نوکروں کے خیمے میں چلے گئے۔ خیمہ ابھی تک خالی تھا۔ شادو کھانا وہیں لے آیا۔

دونوں نے کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی شادو کھڑا ہو گیا۔ "میں میاں سلیم کے پاس جا رہا ہوں۔ اس سے اجازت لے کر تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔" شادو چلا گیا۔

لالی خیمے میں خاموش بیٹھا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ ایسا گیا کہ دیر تک نہیں لوٹا۔ لالی بے چین ہو کر خیمے سے نکلا اور شامیانے کی جانب گیا۔ مگر اب وہاں سناٹا تھا۔

☆

میدان کے ایک گوشے میں ایک اور بڑا شامیانہ تھا۔ اس کے چاروں طرف قناتیں لگی تھیں۔ شامیانے میں تیز روشنی تھی۔ اندر سے ناچ گانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ لالی کو اندازہ ہو گیا



شروع ہو چکا ہے۔ شادو بھی وہیں ہو سکتا ہے۔

اسی طرف چل دیا۔ وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ قریب کے خیمے سے ایک شخص نکلا۔ لالی نے
بلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ ہمدانی تھا۔

انی نے بھی لالی کو پہچان لیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی ٹھٹکا، مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔ "یار، تو
ھی آ گیا؟ مگر یہاں پہنچا کیسے؟" اس کے انداز میں بے تکلفی کے ساتھ حیرت بھی تھی۔

نے نظریں جھکا کر کہا۔ "بس جی پہنچ ہی گیا۔"

ہے بہت تیز۔ اس رات ایس پی کے پھندے سے صاف بچ نکلا۔" ہمدانی نے قہقہہ لگایا۔
نے تجھے گرفتار کرنے کا پورا بندوبست کرلیا تھا۔ تو فرار کس راستے سے ہوا؟"

ہ ایسا ہوا جی، نہر میں پانی زوروں سے بہہ رہا تھا۔ میں نہر میں اترا تو پانی کے تیز بہاؤ میں پیر اکھڑ
ر میں دور تک بہتا چلا گیا۔"

اندر خیمے میں آجا۔" ہمدانی نے اپنے خیمے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے
ہمدانی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لالی اس کے سامنے مودب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ذرا دیر خاموشی رہی پھر
ی کی آواز ابھری۔

نہیں لائل پور میں روپوش ہے یا کہیں اور جانے کا ارادہ ہے؟"

صاحب! آپ سے کیا چھپانا۔" لالی نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "میں نے رحیم داد سے ملنے
آباد جانا ہے۔ ابھی تک اس کے پاس نہیں پہنچ سکا۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

وہاں جانا تو تیرے لیے خطرناک ہوگا۔ ایس پی مرزا کو مہر سلیمان خاں کی کوٹھی کے چوکیدار سے
رات اطلاع مل گئی تھی کہ تو قادر آباد جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے وہاں پولیس لگا کر
ی شروع کر دی ہے۔"

صاحب! آپ نے پہلے بھی میری مدد کی ہے۔" لالی نے عاجزی سے کہا۔ "اس بار اتنی مدد اور
ا کہ اپنی موٹر میں مجھے کادر آباد پہنچا دیں۔ آپ کی موٹر دیکھ کر پولیس والے کچھ نہیں بولیں
۔ میں نہر پار کر کے رحیم داد کے پاس ٹبوں پر پہنچ جاؤں گا۔"

نہیں یار! میں تیری ایسی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" ہمدانی نے صاف انکار کر دیا۔ "میں تو تجھے یہ
رہ دوں گا کہ تو خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے۔ رحیم داد کو پکڑوا دے اور خود سرکاری گواہ
بن۔ مقدمہ میری عدالت میں پیش ہوگا۔ میں کوشش کروں گا تو بری ہو جائے، ورنہ تیری سزا کم
بہت کم ہو جائے گی۔ میں تیری یہی مدد کر سکتا ہوں۔"

"صاحب! یہ نہیں ہو سکتا کہ میں رحیم داد کو گرفتار کروا دوں۔ میں اس کے ساتھ دغا نہیں کر سکتا۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو اتنا کوڑھ مغز بھی ہو سکتا ہے۔" ہمدانی چند لمحے خاموش رہا پھر مسکرا کر بولا۔ "پولی نیسین کلب کی نائٹ آف دی گریٹ سسپنس میں تو نے بہت ہوشیاری اور اعتماد سے ایمپائرنگ کی تھی۔ میں تو دنگ رہ گیا۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "ٹوکنوں کے الٹ پھیر میں تو کمال کر دیا تھا۔"

"صاحب! صبح شکاریوں کے ساتھ آپ مجھے دکھائی نہیں دیئے' آپ کدھر تھے؟"

"میں آج دوپہر یہاں پہنچا ہوں۔"

"بیگم صاحبہ بھی آپ کے ساتھ آئی ہیں؟"

"نہیں۔" ہمدانی نے بتایا۔ "نوشابہ ان دنوں اپنے بھائی کے پاس پنڈی میں ہے۔ وہ فوج میں میجر ہے۔"

لالی نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "انھوں نے بعد میں میرے بارے میں تو کچھ نہیں کہا؟"

"کبھی تیرا تذکرہ نہیں کیا۔ یاد ہی نہیں آیا ہو گا۔ البتہ مجھے بعد میں تو بہت یاد آیا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "اس رات تو ایمپائر نہ ہوتا تو امینہ ہرگز میری پارٹنر نہ بنتی۔ تو نے ہاتھ کی ایسی صفائی دکھائی کہ وہ پکے پھل کی طرح میری جھولی میں آگری۔ یار مزا آگیا۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ "آج رات بھی تجھ سے ایک ایسا ہی کام لینا ہے۔"

"کیا یہاں بھی لاٹری شاٹری ڈالی جائے گی؟" لالی نے سادگی سے پوچھا۔ "پر آپ تو آج اکیلے ہی ہیں۔"

"نہیں یار۔ یہ کچھ اور ہی چکر ہے۔ تجھے نواب فخرو کے خیمے جانا ہو گا۔ وہاں سے تو ان کی بیٹی گیتی آرا کو میرے خیمے میں لے آنا۔ وہ نخرا تو بہت کرتی ہے مگر آجائے گی۔ تو اسے لے کر ہی آنا۔"

لالی نے پیچھا چھڑانا چاہا۔ "صاحب! میں تو انھیں جانتا بھی نہیں۔"

"اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ان کے خیمے پر جا کر صرف اتنا کہنا کہ مجھے ہمدانی صاحب نے بھیجا ہے۔ زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ بات پہلے ہی طے ہو چکی ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "میں اپنے ڈرائیور یا اردلی کو ادھر بھیج دیتا' دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔ میاں سلیم کے کسی نوکر چاکر سے بھی کام چل سکتا تھا مگر تو مجھے سب سے موزوں معلوم ہوتا ہے۔ تجھ پر مجھے اعتماد بھی ہے۔ کسی اسکینڈل کا بھی خطرہ نہیں اور ایسے معاملوں میں تو ہوشیار بھی ہے۔"



"نہیں صاحب! میں نے دلاّ گیری کا دھندا ابھی نہیں کیا۔" لالی نے دبی زبان سے انکار کر دیا۔

"یار! خواہ مخواہ کا نخرا نہ دکھا۔ مجھے یقین ہے' تو ضرور پکڑا جائے گا اور یہ بھی جان لے' کبھی نہ کبھی تو میرے ہی سامنے پیش ہو گا۔ اس وقت تجھے معلوم ہو گا میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "تجھے کم سے کم سزا دوں گا۔ میرے فیصلے کے خلاف اپیل نہ کرنا' ورنہ ہو سکتا ہے زیادہ ہی لمبی سزا کاٹنی پڑے۔"

لالی اس کی دھمکی سے ڈر گیا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ نظریں جھکا کر فرش کو تکنے لگا۔ ہمدانی کھڑا ہو گیا۔ خیمے کے پردے کے قریب پہنچا۔ لالی کو اپنے پاس بلایا اور ایک خیمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"دوسری لائن میں وہ جو ساتواں خیمہ ہے' وہی ہے نواب فخرو کا خیمہ۔ وہاں جا کر تجھے اتنی ہی بات کہنی ہے جتنی میں نے تجھ سے کہی ہے۔ اب تو ادھر جا۔ میں تیرا انتظار کرتا ہوں۔"

لالی باہر آیا اور ہمدانی کے بتائے ہوئے خیمے کی طرف روانہ ہو گیا۔ خیموں میں خاموشی چھائی تھی۔ دور شامیانے کے نیچے طبلے کی تھاپ اور گھنگروؤں کے چھناکے کے ساتھ رات کے سناٹے میں گانے کی آواز ابھر رہی تھی۔

لالی آہستہ آہستہ چلتا ہوا نواب فخرو کے خیمے پر پہنچا۔ خیمے کا پردہ ذرا سا سرکا ہوا تھا۔ اس نے بڑھ کر دیکھا۔ گیتی آراء کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے میز پر آئینہ رکھا تھا۔ وہ آئینے میں اپنے چہرے کا عکس دیکھ رہی تھی۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ہلکی ہلکی تہہ جما رہی تھی۔ اس کی روشن آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا۔ چہرہ بیضوی تھا' رخسار گلابی تھے اور بلب کی تیز روشنی میں تمتما رہے تھے۔ بدن نرم اور گداز تھا۔ اس میں دائرے تھے' پیچ و خم تھے۔ وہ تیئس چوبیس سال کی خوبصورت لڑکی تھی۔ سنگھار کے بعد وہ اور زیادہ دل کش نظر آ رہی تھی۔

قریب ہی نواب فخرو بھی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ چہرے پر وقار اور دبدبہ تھا جسے اس کی چڑھی ہوئی مونچھوں نے اور بارعب بنا دیا تھا۔ وہ دراز قد تھا اور گہرے سرمئی سوٹ میں معزز نظر آ رہا تھا۔ نواب فخرو سے ذرا ہٹ کر اس کی بیگم بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔

وہ گوری چٹی عورت تھی۔ چہرے کے اجڑے نقوش بتا رہے تھے کہ جوانی میں وہ بھی گیتی آرا کی طرح حسین اور دل کش ہو گی۔ اس کا جسم خاصا پھیل گیا تھا جس نے اسے بے ڈول اور بدوضع بنا دیا تھا۔ لالی تینوں کو صبح شکاریوں کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ نواب فخرو بندوق سنبھالے جیپ میں بیٹھا

تھا۔ بیٹی اور بیگم پالکی میں سوار تھیں۔

لالی ذرا دیر پردے کے قریب کھڑا رہا پھر آہستہ سے کھنکارا۔ نواب فخرو نے اونچی آواز سے پوچھا۔ "کون ہے؟" وہ اٹھ کر پردے کے پاس آگیا۔

"مجھے جی ہمدانی صاحب نے بھیجا ہے۔"

"اچھا اچھا' تم یہیں بیٹھو۔ تمہیں ذرا دیر انتظار کرنا پڑے گا۔" وہ واپس جاکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ لالی بھی چپ چاپ خیمے کے پردے سے لگ کر فرش پر بیٹھ گیا۔

نواب فخرو نے اپنی بیگم سے کہا۔ "ہمدانی صاحب کا ملازم آیا ہے۔"

"سن رہی ہو گیتی آرا۔" بیگم نے بیٹی کو مخاطب کیا۔ "ہمدانی صاحب کا ملازم لینے آگیا ہے تمہیں۔" گیتی آراء آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی رہی اور لپ اسٹک سے اپنے ہونٹوں کو سرخ گلاب کی پنکھڑیاں بناتی رہی۔

ماں نے چند لمحے بیٹی کے جواب کا انتظار کیا پھر کسی قدر تیکھے لہجے میں بولی۔ "اے' میں نے کہا' گیتی آراء! تم نے سنا نہیں۔ بیٹی' میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

"امی حضور! میں کسی کے پاس نہیں جاؤں گی۔" گیتی آرا نے ماں کی جانب دیکھے بغیر بیزاری سے جواب دیا۔ "میں اسی لیے یہاں نہیں آرہی تھی۔ آپ اصرار کرکے زبردستی مجھے لے آئیں۔ اب یہ حکم صادر کئے جارہے ہیں' اس سے مل لو' اس کے پاس جاؤ۔ واہ' یہ خوب رہی۔"

"اے' میں نے کہا' سن رہے ہو نواب فخرالدولہ' تمہاری صاحب زادی کیا فرما رہی ہیں؟" بیگم نے شکایت کے انداز میں شوہر سے کہا۔ "اب تمھی اسے سمجھاؤ۔ میری تو یہ سنے گی نہیں۔ تمھی مناؤ' تمھی نے سر پر چڑھا کر اس کا دماغ خراب کیا ہے۔"

"سر پر تو ہم نے تمہیں بھی چڑھا رکھا ہے۔"

"اے' بڑے آئے مجھے سر پر چڑھانے والے۔" بیگم تنک کر بولی۔ "تمہارے سر پر تو دل آرام کا بھوت سوار تھا۔ اس موئی حرّافہ کے ہوتے ہوئے تم مجھے کیسے سر پر چڑھاتے۔ تمہیں اتنا ہوش ہی کب تھا۔"

"مگر تمہاری تو ہم نے کبھی حق تلفی نہیں کی۔" نواب فخرو نے رسان سے کہا۔ "ہم نے تمہارے ساتھ تو کوئی زیادتی نہیں کی۔"

"اے میں کہتی ہوں کیا نہیں کیا تم نے؟" بیگم کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔ "لاکھ کا گھر خاک میں ملا دیا۔ ساری جائیداد اور زمیں داری لالہ گردھاری لال رستوگی کے پاس رہن رکھ دی۔ میرا زیور



تک نہ چھوڑا۔ اب بیٹھے فرما رہے ہیں' ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ ریس اور رنڈی بازی میں سب کچھ تباہ کردیا۔"

"یہ طعنہ نہ دو۔" نواب فخرو کا لہجہ بھی تیز ہوگیا۔ "یہ نہ بھولو کہ تمہیں بھی ہم بالاخانے سے اتار کر گھر میں بیگم بنا کر لائے تھے۔ ہم نے شمع محفل سے تمہیں شمع خانہ بنا دیا۔ نہ خلد آشیانی قبلہ ابا حضور کی برہمی سے خائف ہوئے' نہ اماں جان کی پروا کی۔ سارے خاندان سے تمہاری خاطر مخالفت مول لی۔"

"میرا منہ نہ کھلواؤ۔ تمہاری نانی کون سی شریف زادی تھی۔ وہ بھی تو ذات کی ڈومنی تھیں۔ ویسے بھی تم نے کیا احسان کیا مجھ پر۔ گھر میں قیدی بنا کر ڈال دیا۔" وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "ہر وقت تو ایک ایک کے طعنے سنتی تھی۔ تمہارے خاندان والوں نے تو مجھے نکّو بنا دیا تھا۔ تمہیں کیا خبر' میں نے کیا کیا ظلم نہ سہے۔ تم تو اس وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ تم نے میری بات ہی کب سنی۔ میرا کہا مان لیتے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ یہاں آکر یہ ذلت و خواری نہ دیکھنا پڑتی۔ سفارشوں کے لیے یوں ایک ایک در کی خاک نہ چھاننا پڑتی۔"

"سفارشیں بھی تو کام نہیں آئیں۔" نواب فخرو نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "برسوں برسوں تک رسائی حاصل کی۔ صاحب زادے کو کسٹمز میں ایسی اچھی ملازمت دلوائی۔ اب وہ کراچی میں بیٹھے اپنے بال بچوں کے ساتھ عیش کرتے ہیں۔ پلٹ کر یہ بھی خبر نہیں لیتے کہ ماں باپ زندہ ہیں یا مرگئے۔"

"اس کا تو تم میرے سامنے نام بھی نہ لو۔" بیگم بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "وہ تو ہمیشہ کا خود غرض ہے۔ اوپر سے بیوی اس کی ایسی شطّاح ہے۔ ایسا اسے اپنے جال میں پھانسا ہے کہ ہر وقت اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں اسے الّو کا گوشت کھلا دیا ہے۔ دوسرے صاحبزادے ہیں' انھیں ایکٹنگ کا شوق چرّایا ہے۔ بمبئی میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں یا آغا جانی کے در پر پڑے رہتے ہیں۔ کتنے خط لکھے کہ لکھنؤ جاکر جائیداد کے کاغذات بھجوا دو۔ ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔"

"کیا جواب دیتا۔" نواب فخرو نے اپنے چھوٹے بیٹے کی طرف سے صفائی پیش کی۔ "کون سی جائیداد کے کاغذات بھجواتا۔ ساری جائیداد فروخت ہوچکی ہے یا رہن پڑی ہے۔"

"اے میں کہتی ہوں' کس نے ایمانداری سے کلیم حاصل کیا ہے۔" بیگم نے جھنجلا کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "کس نے جعلی دستاویزیں نہیں بنوائیں؟ دور کیوں جاتے ہو' وہ تمہارے بٹ

صاحب کہاں کے مہاجر ہیں۔ زندگی بھر سیالکوٹ میں رہے' اب مہاجر بن بیٹھے۔ لاہور میں ایک کوٹھی الاٹ کروالی۔ آج کل کوئی فیکٹری الاٹ کرانے کی کوشش میں لگے ہیں۔ خود ان کی بیوی نے بتایا ہے مجھے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ متروکہ جائیداد کی تو ایسی لوٹ مار مچی ہے کہ نہ کبھی سنی تھی نہ دیکھی۔ وہ اپنے دلّی کے نواب اختر مرزا ہیں' دو کوٹھیاں اور ایک کارخانہ کلیم میں الاٹ کرا چکے ہیں۔" نواب فخرو نے مسکرا کر کہا۔ "خود کو بہادر شاہ کا پوتا بتاتے ہیں۔ انھوں نے تو لال قلعے کے بدلے لاہور کا شاہی قلعہ الاٹ کرنے کا کلیم بھرا ہے۔ کمال ہو گیا بھئی۔ سنا ہے گلی قاسم جان میں کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ دروازے پر ٹاٹ کا پھٹا پردہ پڑا رہتا تھا۔"

بیگم کی نظر اچانک لالی پر پڑ گئی۔ وہ خیمے کے پردے کے پاس بیٹھا ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ بیگم تلملا کر بولی۔ "اے میں نے کہا' نواب فخرالدولہ! یہ موا جانگلوس یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ کیا دیدے نکالے اجڈپن سے تک رہا ہے۔"

"بیگم تم تو ہر ایک کے سر ہو جاتی ہو۔ اسے ہمدانی نے بھیجا ہے۔ ہم نے اس سے یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا تھا۔" اس نے مڑ کر گیتی آرا کو دیکھا۔ "بیٹی! اب کھڑی ہو جاؤ۔ ہمدانی صاحب انتظار کرتے ہوں گے۔"

گیتی آرا نے باپ کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "ابا حضور! آپ آخر مجھے کس کس کے پاس بھیجیں گے؟ آپ کے حکم پر میں محکمہ بحالیات کے کمشنر کے بنگلے پر چلی گئی۔ آپ کا اتنا بڑا کلیم منظور کرادیا۔ تصدیق کے لیے کاغذات ہندوستان بھی نہیں بھیجے گئے۔ سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گیا۔ چیچہ وطنی میں ڈھائی سو ایکڑ زمین' عارف والا میں آئس فیکٹری اور لاہور میں رہنے کے لیے کوٹھی' آخر کس طرح آپ کے نام ہوئی۔ سب آپ کی مرضی کے مطابق ہی تو ہوا۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ بیٹے تو دونوں ہی نکمے اور خود غرض نکلے۔" نواب فخرو نے نہایت نرم لہجے میں کہا۔ "واللہ' تم نے بیٹی ہو کر بیٹوں کا حق ادا کر دیا۔" نواب نے آہ سرد کھینچی۔ "کیا کریں بیٹی! اللہ نے ہم پر وقت ہی ایسا ڈالا ہے۔ تم اتنی قربانی نہ دیتیں تو فاقے کرتے کرتے مر جاتے۔ اس عمر میں مجھے کون ملازمت دیتا۔ تعلیم بھی میری صرف انٹرنس تک ہے۔" گیتی آرا خاموش رہی۔ نواب فخرو اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ پیار سے گویا ہوا۔ "بیٹی! چلی جاؤ گی تو کام بن جائے گا۔ اب تو صرف آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ زمین اور فیکٹری کا الاٹمنٹ تو ہو گیا مگر قبضہ ہمدانی کے مدد کے بغیر نہیں مل سکتا۔"



وہ اس کا سر آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ "بیٹی عزت کی زندگی گزارنے کا یہ آخری موقع ملا ہے۔ زمین اور فیکٹری کا قبضہ مل گیا تو آرام و سکون سے گزر بسر ہو گی۔ تمہارے لیے رشتہ بھی اچھا مل جائے گا' بلکہ ایک لڑکا میری نظر میں ہے بھی۔ وہ سی' ایس' پی ہے۔ شکل و صورت کا بھی اچھا ہے۔ خاندان بھی ہماری طرح شرفا کا ہے۔" گیتی آرا گم صم بیٹھی رہی۔ نواب فخرو کے لہجے میں عاجزی اور رقت پیدا ہو گئی۔

"بیٹی! تم اپنے بوڑھے باپ کی مدد نہیں کرو گی؟"

گیتی آرا نے آہستہ سے کہا۔ "ابا حضور! میں نے پہلے بھی کب آپ کا حکم ٹالا ہے۔" وہ کھڑی ہو گئی۔ ماں پلنگ سے اتری۔ گیتی آرا کے نزدیک پہنچی۔ اس کے سر پر ہاتھ لگا کر چٹ چٹ بلائیں لیں۔ مسکرا کر نواب فخرو کی طرف دیکھا۔ "دیکھ رہے ہو نواب فخرالدولہ! میری بچی کتنی فرماں بردار ہے۔ چاند کا ٹکڑا لگ رہی ہے۔ اے' میری نظر نہ لگ جائے۔" اس نے پیار سے تھتکارا۔

گیتی آرا مسکرا کر بولی۔ "امی حضور! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔"

وہ آگے بڑھی' خیمے کے پردے تک پہنچی۔ بیگم فخرو بیٹی کی ساتھ ساتھ چلیں اور اسے رخصت کرتے ہوئے بولیں۔ "بیٹی! اللہ کے سپرد۔"

گیتی آرا ریشمی غرارے کے پائنچے ایک ہاتھ سے سنبھالے بڑے ٹھسّے سے باہر نکلی۔ لالی اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گیتی آرا کے ہم راہ چلنے لگا۔ دونوں دھندلی روشنی میں خیموں کے درمیان سے سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ لالی نے چلتے چلتے نشے کی ترنگ میں گیتی آرا کو چھیڑا۔

"صاحب ٹھیک ہی کہتے تھے' تمہارا نکھرا بہت زیادہ ہے۔"

گیتی آرا نے جھنجلا کر اسے ڈانٹا۔ "بدتمیز۔"

"میں تو جی بدتمیز ہوں۔ جانگلی جو ٹھیرا بلکہ جانگلوس ہوں۔ تمہاری ماں نے تو یہی کہا تھا نا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "پر تم تو اس وقت تمیز کا دھندا کرنے جا رہی ہو۔"

"اجڈ' گنوار کہیں کا۔" وہ تلملا کر بولی۔ "ایسی باتیں کیں تو میں نہیں جاؤں گی۔"

"نہ جاؤ۔" لالی مسکرا کر بے نیازی سے بولا۔ "تم میرے لیے تو جا نہیں رہی ہو۔"

وہ روٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھے مسٹر ہمدانی کا خیمہ بتا دو۔ میں خود چلی جاؤں گی۔"

"چلو چلو' خاما خا کا نکھرا نہ دکھاؤ۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "وہ رہا صاحب کا خیمہ۔" گیتی آرا خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔ وہ آگے بڑھی اور غرارے کے پائنچے

سنبھالتی، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی، لالی کے ہم راہ چلتی رہی۔ ہمدانی کے خیمے پر پہنچ کر لالی نے گیتی آرا سے کہا۔ "تم اندر جا کر عیش کرو۔ میں اب چلا۔" گیتی آرا نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور پردہ اٹھا کر خیمے میں داخل ہو گئی۔

لالی مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اب اسے شادو کی تلاش تھی۔ وہ پھر اسی خیمے میں پہنچا جس میں شادو اسے چھوڑ گیا تھا۔ خیمے میں شادو چٹائی پر لیٹا ہوا جاگ رہا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی بولا۔ "کدھر چلا گیا تھا؟ یہاں آکر تجھے نہ پایا تو میں پریشان ہو گیا۔"

"ایک چکر میں پڑ گیا تھا۔" لالی مسکرا کر بولا۔ "میاں سلیم نے تجھے جانے کی اجازت دے دی؟"

"اجازت تو دے دی، پر صبح تک واپس آنے کو بھی کہا ہے۔"

"تو فیر دیر کیوں کر رہا ہے، کھڑا ہو جا۔ گڈی کتھے ہے؟"

شادو کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "باہر میدان میں ہے۔"

دونوں خیمے سے نکلے۔ کار زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ کار میں سوار ہونے سے پہلے لالی نے کھانا منگوایا۔ شادو دیگچی میں قورمہ بھر کر لے آیا۔ قورمے کے ساتھ آٹھ روٹیاں تھیں۔ تلے ہوئے مرغ تھے۔ کباب تھے اور پلاؤ بھی تھا۔ لالی نے صرف دیگچی میں بھرا ہوا قورمہ اور روٹیاں رکھ لیں، باقی کھانا واپس کر دیا۔

شادو نے لالی کو اپنے پاس بٹھایا۔ کار اسٹارٹ کی اور حویلی پہنچا۔ لالی مہمان خانے میں گیا اور چادر میں لپٹی ہوئی رائفل لے آیا۔ کار میں بیٹھ کر لالی نے چادر کھولی۔ رائفل نکال کر پچھلی نشست پر رکھ دی۔ روٹیاں اور کھانے کی دیگچی چادر میں باندھ کر آگے رکھ لی۔ اس نے شادو سے پوچھا۔ "تو میرے کپڑے لائل پور سے دھلوا کر لے آیا نا؟"

شادو نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تو گھر ہی میں پڑے ہیں۔ لائل پور سے واپسی پر میں گھر جا ہی نہیں سکا۔ ویسے بھی میرا خیال تھا تو دو تین روز یہاں ٹھیر کر جائے گا۔"

لالی نے پریشان ہو کر کہا۔ "مار دیا ظالم! سارا کام خراب کر دیا۔" وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کار کچی سڑک پر ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑنے لگی۔ گاؤں سے نکل کر آگے بڑھی اور پختہ سڑک پر آ گئی۔

شادو نے رفتار تیز کر دی۔ کار کمالیہ سے آگے بڑھی۔

ملتان روڈ پر پہنچتے ہی اس نے رفتار اور تیز کر دی۔ شادو بڑا ہوشیار ڈرائیور تھا۔ وہ ستر اسی میل



کی رفتار سے کار دوڑاتا رہا۔ جب کار منٹگمری کے قریب پہنچی اور دور سے شہر کی روشنیاں نظر آئیں تو لالی کے چہرے پر گھبراہٹ پھیل گئی۔ مگر کار "آناً فاناً" شہر سے گزرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ کار سڑک پر تیزی سے دوڑتی رہی۔ یوسف والہ سے آگے بڑھتے ہی لالی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے شادو سے کہا۔

"گڈی کی سپیڈ کم کر دے۔"

"کیوں، کیا تیں نوں قادر آباد نہیں جانا؟"

"نہیں مجھے قادر آباد نہیں جانا۔ تو مجھے پہلے ہی اتار دینا۔"

شادو نے رفتار کم کر دی۔ لالی نے قادر آباد سے میل، سوا میل پہلے ہی کار رکوا لی اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ شادو اس کے پاس آیا۔ دونوں گرم جوشی سے گلے ملے۔ شادو پھر کار میں بیٹھ گیا، اسے موڑا اور تیزی سے دوڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔

☆

رات سنسان اور تاریک تھی۔ دور سڑک کے اس پار اندھیرے میں قادر آباد اسٹیشن کے آؤٹر سگنل کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ قریب ہی نہر لوئر باری دو آب بہہ رہی تھی۔ لالی نہر کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک چلتا رہا۔ وہ مڑا اور جنگلی جھاڑیوں سے بھرے میدان میں گھس گیا۔

اس نے میدان عبور کیا اور اونچے نیچے ٹیلوں پر چڑھنے لگا۔ رات اب ڈھل چکی تھی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔

بلندی پر پہنچ کے وہ رک گیا۔ مڑ کر پیچھے دیکھا۔ نہر کا پانی پچھلے پہر کے روشن ستاروں کی روشنی میں جھلملا رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ لالی ٹیلوں کے درمیان راستے سے گزرتا ہوا اپنے ٹھکانے کی جانب بڑھنے لگا۔

وہ ٹھکانے پر پہنچا۔ اس نے صبح کاذب کی دھندلی دھندلی روشنی میں دیکھا، رحیم داد دو خمیدہ ٹیلوں کے اتصال سے بنی ہوئی محراب کے نیچے ایک کونے میں سکڑا ہوا پڑا ہے۔ وہ کمزور اور لاغر نظر آ رہا تھا۔

اس کے جسم پر ابھی تک جیل کی ملگجی وردی تھی۔ بال بے حد بڑھ گئے تھے۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ لالی نے کھانے کی گٹھری کندھے سے اتار کے ایک طرف رکھی اور رائفل بھی اس کے قریب ٹکا کر کھڑی کر دی۔

وہ رحیم داد کے نزدیک گیا۔ سرہانے بیٹھ کر اس کا بازو ہلایا۔ رحیم داد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ حیرت

سے آنکھیں پھاڑ کے لالی کو تکنے لگا۔ پھر اس نے بے قرار ہو کر کہا۔ "لالی! تو آگیا؟" اس نے دونوں ہاتھ بڑھائے اور چمٹ گیا۔

لالی نے محسوس کیا کہ رحیم داد اس کے شانے پر سر رکھے آہستہ آہستہ رو رہا ہے۔ لالی نے اس کی پیٹھ محبت سے تھپکتے ہوئے پوچھا۔ "تو رو رہا ہے رحیمے؟"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ گہرے سناٹے میں اس کی سسکیاں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ لالی چپ بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد رحیم داد علیحدہ ہوا اور آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "میں تو سمجھا تھا' اب تو لوٹ کر نہیں آئے گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا تھا۔" لالی نے اعتماد سے کہا۔ "پکڑ لیا جاتا' تب تو گل ہی اور تھی ورنہ میرے واپس نہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بھلا میں تجھے چھوڑ سکتا ہوں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"تو تو میرا یار ہے' میرا جگر ہے۔"

"تو نے لوٹنے میں اتنی دیری کر دی۔ میں سمجھا' مجھے چھوڑ کر کسی طرف نکل گیا یا پکڑا گیا۔" وہ لمحے بھر خاموش رہا۔ "یہ بتا' اتنے دنوں رہا کہاں؟"

"ایک چکر کے بعد دوسرے چکر میں پھنستا گیا۔ تجھے کیا کیا بتاؤں' پر میں جہاں بھی رہا' رب سونہہ تجھے ہر دم یاد کرتا رہا۔"

"کیا یاد کرتا رہا۔" رحیم داد نے شکوہ کیا۔ "یہ نہ سوچا ادھر مجھ پر کیا بیتی۔"

"مجھے اس کا اندازہ تھا۔ پر کیا بتاؤں' میں کیسے کیسے چکروں میں الجھا رہا۔"

"شاداں نے پھنسوادیا ہوگا کسی چکر میں۔" رحیم داد نے منہ بگاڑ کر کہا۔ "پتہ ہے' وہ کتنی خطرناک ہے۔"

"اس کی گل نہ کر۔ تو اسے سمجھ ہی نہیں سکا۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہ بتا' روٹی پانی کا کیا بنا؟"

"کیا کرے گا جان کر۔" رحیم داد بیزاری سے بولا۔ "آخر میں تو روٹیاں بالکل سوکھ گئی تھیں' پنیر اور شہد پہلے ہی مک گیا تھا۔ سوکھی روٹیاں پانی میں بھگو بھگو کر کھاتا رہا۔"

"کب تک ان سے کام چلا؟"

"پچھلے دو روز سے نہ روٹی ملی ہے نہ پانی۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "ادھر ایک ٹبے کے پاس جنڈ کا پیڑ ہے۔ اس میں پھلیاں آگئی ہیں۔ انھیں توڑ توڑ کر کھاتا رہا۔ پر اس سے پیاس نہیں جاتی۔"



"نہر سے پانی لے آتا۔" اس نے قریب پڑے ہوئے مشکیزے کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ بوکی تو تیرے پاس موجود ہی تھی۔ اس میں پانی بھر کر لے آتا۔"

"پانی تو تیرے جانے کے بعد تیسرے ہی دن مک گیا تھا۔ میں شام کو اندھیرا بڑھنے کے بعد نہر پر گیا۔ بوکی میں پانی بھر لایا۔ پانی تو ایسے ہی لاتا رہا' پر پچھلے دنوں نہر سے بوکی میں پانی لا رہا تھا تو سڑک پر پلیسے نظر آئے۔ میں پریشان ہوگیا۔ دوسرے دن میں نے ٹبّوں پر سے چھپ کر دیکھا۔ پولیس کی ایک ٹولی گشت کرتی دکھائی دی۔ ان کے پاس بندوکیں بھی تھیں۔ تیسرے دن بھی مجھے سڑک اور نہر کے آس پاس پولیس والے نظر آئے۔ تب سے میں نہر پر نہیں گیا۔ پانی بوند بوند پی کر کام چلایا۔ آخر وہ کب تک چلتا' مک گیا۔"

"مجھے بھی آج رات پتہ چل گیا تھا' پولیس ہم دونوں کی ادھر نگرانی کر رہی ہے۔"

"تجھے یہاں آتے ہوئے پولیس ملی ہوگی۔ تو اس سے بچ کر کیسے نکل آیا؟"

"میں یہاں آتے ہوئے کچھ دور پہلے ہی کار سے اتر گیا تھا۔ میں لائل پور کے ایک پنڈ میں تھا۔ شادو مجھے وہاں لے گیا تھا۔ وہ آج کل میاں سبحان کا ڈرائیور لگ گیا ہے۔ وہی کار میں بٹھا کر لایا بھی تھا۔ تیرے لیے کپڑے نہیں لا سکا۔ میلے تھے۔ شادو انھیں دھلوانے اپنے گھر لائل پور لے گیا تھا۔ واپسی میں بھول گیا۔"

رحیم داد نے جل کر کہا۔ "تو مجھے جیل کی وردی سے چھٹکارا دلانا نہیں چاہتا۔"

"ایسی گل بات نہ کر رحیمے! تیں نوں کیہہ پتہ' مجھے یہ جان کر کتنا دکھ ہوا۔ ویسے چدّر تو ہے' اسے اوڑھ کر تو اپنی یہ وردی تو چھپا ہی سکتا ہے۔" لالی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ "اب چدر کھول کر روٹی ٹکر کھا۔" اس نے مشکیزے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بوکی مجھے دے۔ میں نہر سے جا کر اس میں پانی بھر لاؤں۔"

رحیم داد نے خدشے کا اظہار کیا۔ "نہر پر تیرا جانا ٹھیک نہیں' پولیسے تاک میں لگے ہیں۔"

"ابھی تو وہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے ٹبّوں پر چڑھ کر ادھر دیکھا تھا۔ بالکل سناٹا ہے۔" لالی نے جھک کر باہر دیکھا۔ اب اندھیرا چھٹنے لگا تھا۔ ہلکا ہلکا اجالا پھوٹ رہا تھا۔ "ابھی زیادہ اجالا نہیں ہوا۔ میں جا کر پانی بھر لاؤں۔"

لالی نے مشکیزہ اٹھایا اور ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نہر کی جانب چلا۔ میدان میں اترنے سے پہلے اس نے ٹیلوں کی بلندی سے نہر کی سمت دیکھا۔ وہاں ابھی تک گہرا سناٹا چھایا تھا۔ سڑک بھی سنسان تھی۔ وہ نشیب میں اترا اور جھاڑیوں سے بھرے ہوئے میدان کے آخری سرے پر پہنچ

گیا۔ مگر وہ جھنگر سے باہر نہیں نکلا۔

اس نے گردن اٹھا کر چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اجالا اور بڑھ گیا تھا۔ اسے دور دور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ اسی اثناء میں سڑک پر ایک لاری ملتان کی سمت سے نمودار ہوئی اور تیزی سے گزر گئی۔

لالی آگے بڑھا۔ اس نے مشکیزے میں پانی بھرا اور تیز تیز قدم اٹھاتا پھر جھنگر میں گھس گیا۔ اس نے میدان طے کیا۔ ٹیلوں پر چڑھتے ہوئے بار بار پلٹ کر نہر اور اس سے کچھ فاصلے پر گزرتی ہوئی سڑک دیکھتا رہا۔ مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا۔

وہ درختوں اور ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ رحیم داد محراب کے باہر کھڑا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"پولیسے تو نہر پر نہیں ملے؟"

"مجھے تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ سڑک بھی سنسان ہے۔"

رحیم داد نے بے صبری کے ساتھ مشکیزہ اس کے ہاتھ سے لیا اور منہ سے لگا کر غٹا غٹ پانی پینے لگا۔ پانی پی کر اس نے مشکیزے کا منہ چمڑے کی ڈوری سے بند کیا' لالی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"لگتا ہے جیسے دوبارہ زندگی مل گئی۔"

"تو نے روٹی کھالی؟"

"روٹی تو تیرے جاتے ہی کھالی تھی' پر پیاس بہت ستا رہی تھی۔ جی بھی گھبرا رہا تھا۔ سچ' تجھے نہر پر پولیس نہیں ملی؟"

"میں نے تجھے بتایا نہیں' وہاں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ لگتا ہے' پولیس ہٹا لی گئی۔"

لالی' مٹی کے ایک تودے پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے مشکیزہ رائفل کے قریب رکھا۔ واپس آکر لالی کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ رے فل کہاں سے لے آیا۔ رے فل ہی ہے نا؟"

"تجھے کیسے پتہ چلا کہ یہ بندوک ہے یا رائفل؟"

"میں نوں بالکل ٹھیک طرح پتہ ہے۔ بندوک اور رے فل دونوں چلانا جانتا ہوں۔ نشانہ بھی میرا بہت سچا ہے۔ احمد کوٹ سے آگے بیلا ہے۔ اس کے چھتروں میں باہر والے بہت ہیں۔"

"تیرا مطلب ہے جنگلی سور؟"

"ہاں' میں نے زمیں داروں کے ساتھ سور کا شکار بہت کھیلا ہے۔ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ سور کی کھال اتنی موٹی ہوتی ہے کہ گولی اس پر بیکار ہو جاتی ہے۔"



"میں نوں بھی اتنا پتہ ہے۔"

"یہ بتا' اب پروگرام کیا ہے؟ کپڑے تو میرے لیے لایا نہیں' پر چدّر سے کام چل جائے گا۔ اب یہاں زیادہ ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی یہ روٹی کتنے دن چلے گی۔"

"میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ میں آج رات کادر آباد جاؤں گا۔ کوشش کروں گا تیرے لیے کمیص اور دھوتی لے آؤں۔ یہ کام ہو جائے تو دونوں اطمینان سے سفر کر سکتے ہیں۔"

رحیم داد نے تعجب سے پوچھا۔ "کادر آباد میں تیرا کون ہے؟"

"شاداں ہے۔" لالی نے آنکھ مار کر کہا۔ "میں نے اس سے کادر آباد آنے کو کہا تھا۔ وہ وہاں ضرور پہنچ گئی ہوگی۔ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

"ادھر تیرا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ پولیسے ہمارے پیچھے لگے ہیں۔ میں نے انھیں سڑک اور نہر پر گشت کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تو شاداں کا چکر چھوڑ۔"

"وہ تو اب چھوٹ نہیں سکتا۔" لالی کی آنکھوں سے مسرت جھلکنے لگی۔ "تجھے پتہ نہیں' وہ اب میری بن چکی ہے۔ اب میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔"

رحیم داد نے جل کر کہا۔ "تجھے بھی بالے کی طرح کسی رات سوتے میں چھری سے کاٹ کر ٹوٹے بنا ڈالے گی۔ اتنا سوچ لے۔"

"مجھے پتہ ہے۔ دھوکا کروں گا تو وہ میرا گلا بھی چھری سے کاٹ سکتی ہے۔ پر شاداں اگر جان لے سکتی ہے تو اپنے یار کے لیے جان دے بھی سکتی ہے۔ مجھے ایسی ہی عورت چاہئے تھی۔ تجھے پتہ نہیں' وہ کتنی زور آور اور محبت کرنے والی زنانی ہے۔" لالی کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔

"میں نے اس سے وعدہ کیا ہے۔ میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا۔ کادر آباد میں وہ اپنے مامے کے پاس ٹھیری ہوگی۔" لالی نے گہری سانس بھری۔ "رحیمے! مجھے اس سے بہت پیار ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "اس سے ملنے کے بعد میں تجھے لے کر شادو کے پاس لائل پور جاؤں گا۔ شاداں سے کہوں گا وہ بھی لائل پور پہنچ جائے۔ کچھ دن ہم تینوں لائل پور ٹھیریں گے۔ فیر آگے کا پروگرام بنائیں گے۔"

"جانا ہی چاہتا ہے تو شاداں سے ملنے ضرور جا' میں تجھے نہیں روکتا۔ لیکن لائل پور جانے سے پہلے میں اپنی گھر والی نوراں اور بچوں سے ملنے احمد کوٹ جاؤں گا۔ مجھے نوراں اور اپنے بچے بہت یاد آتے ہیں۔" رحیم داد کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ "تیں نوں پتہ نہیں' میں بھی نوراں سے بہت پیار کرتا ہوں۔ تو نے اسے دیکھا ہی ہے۔ کتنی سوہنی ہے اور مجھے کتنا چاہتی ہے۔ جیل میں

جب ملنے آتی تھی پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔ تونے تو اپنی آنکھوں سے اسے روتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے، پر یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ اس نے دو مہینے بعد اچانک تیرے پاس جیل آنا چھوڑ دیا تھا۔"

"بیمار پڑ گئی ہوگی اور میرے ہی دکھ میں بیمار پڑی ہوگی۔ ورنہ یہ ہو ہی نہیں سکتا وہ میرے پاس نہ آئے۔ بعد میں ضرور مجھے ملنے جیل گئی ہوگی۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "لالی! مجھے نوراں سے بہت پیار ہے۔ میں اسے اور اپنے تینوں بچوں سے ملنے احمد کوٹ ضرور جاؤں گا۔ نہ گیا تو نوراں میرے لیے روتے روتے مرجائے گی۔"

"پر یہ سوچ لے، احمد کوٹ جاتے ہی پولیس تجھے گرفتار کرلے گی یا تیرا خون کردیا جائے گا۔" لالی نے اسے خبردار کیا۔ "میں تجھے یہ بتانا تو بھول ہی گیا، جھگڑے میں جو بندہ تیرے ہاتھوں زخمی ہوگیا تھا، وہ پچھلے دنوں اسپتال میں مرگیا۔"

"تو سیف اللہ کی گل کررہا ہے؟" رحیم داد نے پریشان ہوکر کہا۔ "پر میں نے تو سنا تھا وہ بالکل چنگا ہوگیا تھا۔ اسپتال سے اسے چھٹی بھی مل گئی تھی۔"

"تونے ٹھیک سنا تھا۔ پر اس کا زخم پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ وہ دوبارہ اسپتال میں داخل ہوا اور اس کی موت ہوگئی۔ اب پولیس گرفتار کرکے تجھ پر کتل کا مکدمہ چلانا چاہتی ہے۔ پہلے تجھے دفعہ ۳۰۷ میں سزا ہوئی تھی، اب ۳۰۲ میں مکدمہ چلے گا۔ جب سے سیف اللہ مرا ہے، اس کے بھائی اور شریکے تجھے کتل کرنے کی تاک میں ہیں۔ سیف اللہ کا ایک شریکا بھی آج کل وزیر لگا ہوا ہے۔ اسی کے حکم پر تو پولیس ہم دونوں کی تلاش میں اتنی بھاگ دوڑ کررہی ہے۔ ہماری گرفتاری پر اسی لیے دو ہزار کا انعام بھی رکھا گیا ہے۔"

رحیم داد گردن جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحے بعد اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جھگڑا تو سیف اللہ ہی نے کھڑا کیا تھا۔ کھیتوں کی وٹ بندی پر شروع ہوا تھا۔ فیر اس نے میری کنال سے بھی زیادہ زمین دبالی۔ میں نے اس کے خلاف مکدمہ کردیا۔ دو سال تک مکدمے بازی چلی۔ میں عدالت سے مکدمہ جیت گیا تو سیف اللہ اور اس کے بھائیوں نے مجھ پر حملہ کردیا۔ جمال دین اور اللہ ورایو میرے ساتھ نہ ہوتے تو انھوں نے مجھے مار ہی دیا تھا۔"

"رحیمے! یہ باتیں تو مجھے جیل میں بھی سنا چکا ہے۔ میں تو تجھے یہ بتانا چاہتا ہوں احمد کوٹ جانا تیرے لیے بہت خطرناک ہے۔ گھروالی اور بچوں سے تجھے ملنا ہی ہے تو پڑوس کے کسی پنڈ میں چلا جا



اور چپکے سے انھیں وہاں بلالے۔"

"یہ تونے ٹھیک کہا۔" رحیم داد نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ "تیری بات سمجھ آتی ہے۔ اس میں زیادہ خطرہ بھی نہیں۔ نوراں اور بچوں سے بھی مل لوں گا اور نوراں سے کہوں گا بچوں کے ساتھ لائل پور آجائے۔"

"انھیں لائل پور بلانا ٹھیک نہیں۔ یہ میں تجھے بعد میں بتاؤں گا، انہیں کہاں بلایا جائے۔" لالی نے اسے مشورہ دیا۔ "ایک گل اور سمجھ آتی ہے۔ تو اپنی گھروالی سے کہنا وہ سیف اللہ کے گھر جائے اور اس کی رانڈ کے سامنے اپنے دوپٹے کا پلو پھیلا کر کھڑی ہوجائے۔ جب کاتل کی گھروالی بھین یا دھی، اس طرح پلو پھیلا کر داد فریاد کرتی ہے تو مکتول کے گھروالے خون معاف کردیتے ہیں۔ یہ پرانی ریت ہے۔ اسے کوئی نہیں توڑ سکتا۔"

"نہیں جی، یہ نہیں ہوسکتا۔" رحیم داد نے ترش روئی سے کہا۔ "میرے پاس ویسے تو اب صرف ۱۲ کلا زمین رہ گئی ہے، پر ہوں تو میں زمیں دار۔ میری گھروالی اس طرح پلو پھیلا کر فریاد نہیں کرسکتی۔ میں آباد کار ہوں۔ کوم کا آرائیں۔ آباد کاروں میں ایسا نہیں ہوتا۔ تو جانگلی ہے نا، یہ جانگلیوں کی ریت ہے۔"

"تو فیر جو تیرا جی کرے کر۔" لالی نے تلخی سے کہا۔ "میں کچھ نہیں کہتا۔"

"نراض نہ ہو۔" رحیم داد نرم پڑگیا۔ "بات یہ ہے، آبادکاروں کی زنانیاں خون معاف کرانے کے لیے دہائی نہیں دیتیں۔ یہ عزت آبرو کا سوال ہے۔ یہی تو آباد کاروں اور جانگلیوں میں فرک ہے۔ تو شاداں ہی کو دیکھ۔ گھروالے کو چھوڑ کر بالے کے ساتھ بھاگی۔ فیر اس کا خون کردیا۔ اب اس نے تجھ سے یاری لگالی۔ میری گھروالی ایسا کبھی نہیں کرسکتی۔ وہ مرتے دم تک میرے نام پر بیٹھی رہے گی۔"

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ رحیم داد بھی چپ رہا۔ اب صبح ہوچکی تھی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ دھوپ ٹیلوں کی چوٹیوں اور درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر جھلک رہی تھی۔ لالی نے منہ کھول کر جمائی لی اور کھڑا ہوکر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "مجھے اب نیند لگ رہی ہے۔" وہ محراب کے نیچے گیا اور فرش پر بچھے ہوئے نمدے پر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد گہری نیند سو گیا۔

☆

شام ہونے سے کچھ دیر قبل رحیم داد نے اسے جھنجوڑ کر جگایا۔ لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ

گیا۔ اس نے دیکھا، محراب کے نیچے روشنی دھندلی پڑ چکی ہے۔ دن ختم ہو رہا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔

رحیم داد نے کہا۔ "ابھی روشنی ہے۔ روٹی کھالے۔ تونے تو سویرے سے کچھ بھی نہیں کھایا۔"

لالی خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد روٹیاں اور دیگچی اٹھا کر لے آیا۔

لالی نے دیگچی کا ڈھکنا ہٹا کر سونگھا۔ قورمہ سڑ گیا تھا۔ اندر سے کھٹی کھٹی بو اٹھ رہی تھی۔ اس نے دیگچی ایک طرف رکھتے ہوئے منہ بگاڑا۔

"رحیمے! گوشت تو خراب ہو گیا، کھانے کا نہیں رہا۔"

دونوں نے باسی روٹیاں کھائیں۔ مشکیزے سے پانی پیا اور محراب کے نیچے سے نکل کر باہر آگئے۔ سورج اونچے اونچے ٹیلوں کے پیچھے غروب ہو چکا تھا۔ شام کا دھندلکا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ لالی نے کہا۔

"رحیمے! میں کادر آباد جا رہا ہوں۔"

رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "اندھیرا بڑھ جائے تب جانا، ابھی اجالا ہے۔ اس وکھت جانا ٹھیک نہیں۔"

"بھیتی چلا جاؤں گا تو بھیتی لوٹ بھی آوں گا۔ اب یہاں ٹھیرنا ٹھیک نہیں ہے۔ آج ہی رات ہم دونوں یہاں سے نکل جائیں گے۔ میں شاداں سے تیرے لیے کمیص، دھوتی اور جوتی لے آوں گا۔ شاداں اپنے مامے ہی کے پاس ٹھیری ہوگی۔ اس نے مجھے یہی بتایا تھا۔"

"جیسی تیری مرضی، سوچ لے۔ میرے احمد کوٹ جانے کے بارے میں تونے کیا سوچا؟"

"سویرے تجھ سے اس بارے میں بات تو ہوئی تھی۔" لالی نے جواب دیا۔ "یہاں سے چلنے سے پہلے آگے کا پروگرام بنالیں گے۔"

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ لالی آگے بڑھا۔ ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نیچے میدان میں اترا اور جھنگر میں داخل ہو گیا۔ وہ جنگلی جھاڑیوں سے الجھتا ہوا نہر کی جانب چلنے لگا۔ جھنگر ختم ہوا تو نہر نظر آنے لگی۔ لالی نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا نہر کے کنارے پہنچ گیا۔

وہ پل کی جانب بڑھنے لگا۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اس کے کانوں میں یہ آواز پڑی۔ "یہ تو جی لالی لگتا ہے۔" لالی ٹھٹکا۔ اس نے گھبرا کر نہر کے اس پار نظر دوڑائی۔ کھجور کے ایک درخت کے نیچے دھندلی دھندلی روشنی میں دو کانسٹیبل دکھائی دیے۔ وہ بالکل اس کے سامنے تھے۔ درمیان میں



نہر تھی۔

کانسٹیبلوں کو دیکھتے ہی وہ سراسیمہ ہو کر پلٹا اور تیزی سے جھنگر کی جانب لپکا۔ اسے اپنے عقب میں نہر کے اس پار سے ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ لالی نے آوازوں پر مطلق دھیان نہیں دیا۔ جھنگر میں گھسا اور تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھنے لگا۔ اس نے جنگلی جھاڑیوں سے بھرا ہوا میدان طے کیا اور ٹیلوں پر چڑھنے لگا۔

بلندی پر پہنچ کر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا، پولیس والوں کا ایک جتھا پل عبور کر کے نہر کے دوسری طرف بڑھ رہا ہے۔ لالی اونچے نیچے ٹیلوں پر چڑھتا اترتا تیزی سے اپنے ٹھکانے کی جانب لپکا۔ محراب کے قریب پہنچا تو وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ رحیم داد نے اسے اس عالم میں دیکھا تو پریشان ہو کر پوچھا۔

"تو اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے؟"

"نہر پر پہنچا تو پولیسے مل گئے۔" لالی نے پھولی ہوئی سانس قابو میں کرتے ہوئے کہا۔ "انھوں نے مجھے پہچان لیا۔"

"یہ تو خطرناک بات ہوگئی۔"

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ تیزی سے محراب کے نیچے پہنچا۔ رائفل اٹھائی۔ چیمبر میں کارتوس چڑھایا اور قریب کے ٹیلے پر چڑھتا ہوا بلندی پر پہنچ گیا۔ وہ چوکنا نظروں سے سامنے دیکھنے لگا۔ یکایک پتھریلے راستوں پر بھاری بھاری بوٹوں کی آہٹ ابھری اور اس کے ساتھ ساتھ گہری خاموشی میں ملی جلی انسانی آوازیں بھی سنائی دیں۔ لالی نے گھبرا کر اس طرف نظر ڈالی۔ ایک اونچے ٹیلے کے پیچھے سے پولیس والے نکلے، سب مسلح تھے۔ ان کے ساتھ ایک انسپکٹر بھی تھا۔ اس نے لالی کو ٹیلے کی بلندی پر دیکھ لیا۔

لالی جھٹ ایک ابھرے ہوئے پتھر کی آڑ میں رائفل سنبھال کر بیٹھ گیا۔ پولیس والے تعداد میں درجن بھر سے زیادہ تھے۔ وہ ٹیلے کے عقب سے نکل نکل کر اوپر آ رہے تھے۔ جب پولیس کی پوری ٹکڑی ٹیلے پر پہنچ گئی تو انسپکٹر نے انھیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ وہ اس کی ہدایت پر تین ٹولیوں میں بٹ گئے۔

لالی پتھر کی آڑ سے ان کی نقل و حرکت دیکھتا رہا۔ وہ لالی سے دو ڈھائی سو گز کے فاصلے پر عین اس کے سامنے والے ٹیلے پر تھے۔

لالی نے ان پر گولی نہیں چلائی۔ خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد بھی نشیب سے نکل کر لالی کے قریب

آگیا اور اس کے برابر ہی پتھر کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔

دونوں نے دیکھا' پولیس کی ایک ٹولی دھیرے دھیرے ٹیلے سے نیچے اتری۔ مگر آگے آنے کے بجائے دائیں ہاتھ کو مڑی اور ایک ٹیلے کی آڑ لے کر بڑھنے لگی۔ لالی فوراً بھانپ گیا کہ وہ اس کے عقب میں پہنچنا چاہتی ہے۔ یہ دونوں کو گھیرے میں لینے کا منصوبہ تھا۔ لالی نے نشانہ باندھا اور اس ٹولی پر گولی چلا دی۔

گولی شام کے سناٹے میں چیختی ہوئی تیزی سے گزری۔ پولیس والے گھبرا کر چھپاک سے زمین پر لیٹ گئے اور دھیرے دھیرے رینگتے ہوئے پتھروں کے پیچھے دبکنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کی نقل و حرکت میں اس اچانک تبدیلی سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ لالی کے مسلح ہونے سے قطعی بے خبر تھے۔

پولیس کی جو ٹولی ٹیلے پر موجود تھی' گولی کی آواز سنتے ہی نشیب میں اتر گئی۔ پولیس والے بکھر کر ادھر ادھر دبکنے لگے۔ لالی نے اس ٹولی پر ایک اور گولی چلائی جو دھیرے دھیرے اس کے عقب میں جانے کے لیے کوشاں تھی۔ دوسری گولی چلا کر وہ پولیس کی اس ٹولی کو آگے بڑھنے سے روکنے میں کامیاب ہو گیا۔

مگر اب پولیس نے بھی دو طرف سے اس پر جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ گولیاں چیختی ہوئی لالی اور رحیم داد کے سروں پر سے گزرتی رہیں۔ ایک گولی اس پتھر پر لگی جس کے پیچھے دونوں چھپے ہوئے تھے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر لالی کے کندھے پر لگا مگر چوٹ خفیف سی آئی۔ لالی اور رحیم داد جھٹ زمین پر لیٹ گئے۔

لالی نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر سرگوشی کی۔ "رحیمے! تو پیچھے سے نکل جا۔ میں نے ادھر بڑھنے والی پولیس پارٹی کو روک دیا ہے۔" اس نے ایک گولی اور چلائی۔ "تو ٹیلوں کے اندر اندر ہوتا ہوا ڈھلوان سے اتر کر سکنالے کے اس پار نکل جا۔ آگے اونچائی پر جھل ہے' تو وہاں چھپ کر میرا انتظار کرنا۔"

رحیم داد نے پوچھا۔ "تو نہیں چلے گا؟"

"میری پروا نہ کر۔" لالی نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر ہمیانی کھولی اور اسے رحیم داد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لے' اسے رکھ لے۔ اس میں تین ہزار سے اوپر روپے ہیں۔ اور دیکھ' یہاں سے نکلتے ہوئے چدّر ضرور اوڑھ لینا۔"

رحیم داد نے ہمیانی لیتے ہوئے کہا۔ "تو کتنی دیر میں پہنچے گا؟" وہ آہستہ آہستہ نیچے کھسکنے لگا۔



"جھیتی آنے کی کوشش کرنا۔"

"آجاؤں گا' آجاؤں گا۔" لالی نے اسے ڈانٹا۔ "تو اب پھوٹ جا۔ جھیتی نال ٹر جا۔ ورنہ تیرا نکلنا مشکل ہو جائے گا۔" اس نے گولی چلائی۔ "میگزین میں ابھی چھ کارتوس ہیں۔ میں ان سے پولیس کو روکے رکھوں گا۔ تو فٹافٹ نکل جا۔ دیری نہ کر۔"

رحیم داد کھسکتا ہوا نیچے اترا۔ محراب کے نیچے پہنچا۔ ہمیانی کمر سے باندھی' چادر اٹھا کر اوڑھی۔ باہر نکلا اور ٹیلوں کی آڑ میں دبا دبا پیچھے کی ڈھلان سے نیچے اترا۔ اندھیرے میں اونچے نیچے راستوں پر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے' اور آگے بڑھتا گیا۔

☆

لالی ٹیلے پر پتھر کی آڑ میں مورچا سنبھالے بیٹھا تھا۔ پولیس اس پر دو جانب سے اندھا دھند فائرنگ کرتی رہی۔ اب رات ہو چکی تھی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ اسے پولیس والے دھندلے دھندلے سایوں کے مانند نظر آ رہے تھے۔

وہ رک رک کر گولی چلاتا رہا تاکہ پولیس اس کے عقب میں نہ پہنچ سکے اور اس اثناء میں رحیم داد اس کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔

اندھیرا بڑھتا گیا۔ گولیاں اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان رات کے سناٹے میں چیختی رہیں۔ لالی کی رائفل کے میگزین میں کارتوسوں کا ذخیرہ رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ رحیم داد کو گئے ہوئے لگ بھگ پون گھنٹہ ہو چکا تھا۔ لالی کے اندازے کے مطابق اب رحیم داد کو برساتی نالے کے اس پار جنگل میں پہنچ جانا چاہئے تھا۔

لالی نے گولی چلائی۔ اب اس کی رائفل میں آخری کارتوس رہ گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ نشیب میں آیا اور اس ٹیلے کی جانب بڑھا جس کے قریب سے پیچھے کی ڈھلان کی جانب راستہ جاتا تھا۔

لالی ٹیلے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے گولی چلائی اور آخری کارتوس بھی ختم کر دیا۔ وہ تیزی سے ڈھلان کی جانب دوڑا۔ مگر اندھیرے میں اس نے ٹھوکر کھائی۔ لڑکھڑا کر گرا۔ اس کا سر ایک ابھرے ہوئے پتھر سے اس قدر زور سے ٹکرایا کہ آنکھوں کے سامنے ستارے گردش کرنے لگے۔ وہ ذرا دیر بے سدھ پڑا رہا' پھر ہمت کر کے اٹھا اور آگے بڑھا۔ مگر چکرا کر گرا اور ایسا گرا کہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کوشش کے باوجود نہ اٹھ سکا۔ سنکھیا کھانے کے بعد وہ بہت

جھٹک گیا تھا' کمزور اور لاغر ہو گیا تھا۔ اس میں پہلے جیسی قوت اور توانائی نہیں رہی تھی۔

وہ ٹیلے کے دامن میں پڑا رہا اور گہری گہری سانسیں بھر کر ہانپتا رہا۔ اب ٹیلوں پر بھاری بھاری بوٹوں کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔

ناگاہ بائیں ہاتھ کے ٹیلے سے ٹارچ کی تیز روشنی ابھری۔ روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ لالی نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت قریب کے ٹیلے کی بلندی سے ایک کانسٹیبل کود کر نیچے آیا۔ اس نے جھپٹ کر لالی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ لالی نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔



# ۱۲

رات آدھی ہو گئی' کاجل کی طرح کالی ہو گئی۔ جھل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ رکڑ ویران تھا۔ اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبے دم بخود تھے۔ ہوا کا تیز جھونکا آتا' خشک پتے کھڑکھڑاتے' خاموشی کا طلسم درہم برہم ہو جاتا۔ رحیم داد چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھتا۔ رات ڈھلنے لگی۔ رحیم داد کی نگاہیں رکڑ کے عقب میں ابھرے ہوئے ٹیلوں اور ٹبوں کی سمت اٹھی ہوئی تھیں۔ مگر ٹیلوں پر نہ کوئی چاپ ابھری نہ سایہ نظر آیا۔

رحیم داد تھکن سے مضمحل تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے جسم کو چادر سے ڈھانپے سکڑا سکڑایا ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ نیند بار بار یلغار کرتی۔ وہ جھومنے لگا اور جھومتے جھومتے لڑھک گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے رکڑ پر زرد زرد دھوپ پھیلی تھی۔ مگر لالی اب تک نہیں پہنچا تھا۔ رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ بہت دیر ہو گئی۔ دھوپ درختوں سے چھن چھن کر جھل میں پھیلنے لگی۔

اب جھل میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ رحیم داد کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگا۔ فراش کے گنجان درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آگے جھنگر تھا۔ جھنگر میں گھنی جھاڑیاں تھیں' خودرو جنگلی پودے تھے۔ زمین سخت اور ناہموار تھی۔ جھنگر نشیب میں دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ رحیم داد جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے آگے بڑھتا گیا۔ جھنگر سے نکل کر چٹیل میدان میں پہنچ گیا۔

دھوپ کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے پیاس محسوس ہوئی۔ پانی کی تلاش میں رحیم داد نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کچھ دور سرس کے ایک گھنے درخت کے نیچے کنویں کی منڈیر نظر آئی۔ وہ اس جگہ پہنچا۔ کنواں پرانا اور بہت بڑا تھا۔ آب پاشی کے لیے بنایا گیا تھا۔ منڈیر کے قریب چوبچے جیسا چلھا تھا۔ اس میں رہٹ کے نسیار سے کنویں کا پانی گرتا تھا۔ چلھے سے کھیتوں میں پانی پہنچانے کے لیے آڈ اور نالیاں نکلتی تھیں۔ مگر اب کنوئیں کی منڈیریں منہدم ہو چکی تھیں۔ چلھا ٹوٹ پھوٹ کر گڑھا بن گیا تھا۔ آڈ اور نالیوں کے نشانات دھندلے پڑ چکے تھے۔ کھیت اجڑ کر بنجر میدان میں تبدیل ہو گئے تھے۔ رحیم داد نے جھک کر کنوئیں میں نظر ڈالی۔ کنواں بالکل خشک تھا' اس کی تہہ میں جھاڑیاں اور خود رو پودوں کے جھنڈ تھے۔ یہ اندھا کنواں تھا۔ اسے ڈل کہا جاتا ہے۔

ڈل سے سو سوا سو گز دور کسی ویران بستی کے ٹوٹے پھوٹے مکانات کے کھولے اور کھنڈر تھے۔ کھنڈر کے عقب میں بھی دور تک پھیلا ہوا لق ودق میدان تھا۔ میدان کے ایک حصے میں مزدور کھدائی کرتے نظر آ رہے تھے۔

وہ مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کچھ مزدور کدالوں سے سخت اور پتھریلی زمین کھود کر کنکر نکال رہے تھے۔ کچھ بیلچے سنبھالے زمین کے اندر سے نکلنے والے کنکروں کی ڈھیریوں کے چٹّے بنا رہے تھے' کچھ بڑے اور گہرے گڑھے مٹی سے بھر کر ہموار کر رہے تھے۔ ان گڑھوں سے کنکر نکالے جا چکے تھے۔ دو ڈھائی سال بعد مٹی سے بھرے جانے والے ان گڑھوں میں پھر کنکر پیدا ہو جاتے ہیں۔ انھیں کھود کر نکال لیا جاتا ہے۔

مزدور اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ چمکتی دھوپ میں ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ وہ بار بار پیشانیوں سے پسینہ پونچھتے۔ قریب ہی بوسیدہ چھولداری استادہ تھی۔ چھولداری کے سامنے ٹھیکے دار کا منشی چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ وہ اونچی آواز سے مزدوروں کو ہدایات دیتا اور ڈانٹتا پھٹکارتا۔

رحیم داد منڈیر کی آڑ سے مزدوروں کو کام کرتے دیکھتا رہا۔ منشی کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ رحیم داد خوف زدہ ہو گیا۔ اسے اپنے سر پر خطرہ منڈلاتا محسوس ہوا۔ وہ پلٹا اور تیز تیز قدم اٹھاتا پھر جھنگر میں گھس گیا اور چلتے چلتے جھل میں پہنچ گیا۔ فراش کے درختوں کے نیچے ٹھنڈک تھی۔

وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اسے ابھی تک لالی کے آنے کی توقع تھی۔ ہر



ٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ چونک کر ادھر ادھر نظریں دوڑاتا' مگر لالی کو نہ پا کر سخت س ہوتا۔

وقت گزرتا رہا۔ اسے بھوک نے ستایا مگر پیاس کا غلبہ زیادہ تھا۔ وہ بے قرار ہو کے کھڑا ہو گیا اور ی تلاش میں سک نالے کی جانب بڑھا۔ جھل کے بائیں کنارے پہنچ کے اس نے درختوں کی ے دیکھا۔ سامنے نشیب میں سک نالا ٹیلوں اور ٹبّوں کے درمیان سے بل کھاتا ہوا گزرتا تھا۔ سک نالے کی خشک ریت کے ذرے دوپہر کی زرد' زرد دھوپ میں جھلملا رہے تھے۔ ایک ٹیلے ، دامن میں جگ مگ کرتی چھوٹی سی جھیل تھی۔ یہ ٹوبھا تھا۔ اس میں ابھی تک پچھلی بارش کا پانی بود تھا۔

ہوا کے جھونکوں سے ٹوبھے میں ہلکی ہلکی لہریں ابھر رہی تھیں۔ ٹوبھا زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ پانی تے ہی رحیم داد کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوئی۔ وہ دھیرے دھیرے نشیب میں اترنے لگا۔

کچھ ہی نیچے اترا ہو گا کہ نشیب میں اسے جھاڑیوں کے قریب انسانی سایہ نظر آیا۔ رحیم داد کا۔ گردن بڑھا کر چوکنا نظروں سے دیکھا کہ ایک شخص گردن جھکائے جنگلی پودوں کی پتیاں توڑ توڑ ہاتھ میں دبے ہوئے تھیلے میں ڈال رہا ہے۔

وہ ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے کی سفید قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔ چہرے پر مٹھی' سوا مٹھی ل کترواں ڈاڑھی' آنکھوں پر پرانی وضع کی عینک اور سر پر اونچی باڑ کی سیاہ جناح کیپ۔ وہ حکیم محمد چشتی تھا۔ رحیم داد سے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ لیکن پتیاں توڑنے کی محویت میں سانے رحیم داد کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔

سامنے ٹوبھا تھا۔ اس کا پانی دھوپ میں جگمگا رہا تھا۔ رحیم داد کو بہت شدت کی پیاس لگی تھی۔ نے ہمت سے کام لیا' چادر سے جیل کی وردی اچھی طرح چھپائی اور حکیم چشتی کی نظروں سے ابچاتا ٹوبھے کی سمت بڑھنے لگا۔

وہ احتیاط سے نشیب میں اتر رہا تھا۔ پھر بھی پتھر کا ایک ٹکڑا اس کے پیروں سے ٹکرا گیا اور ملتا ہوا نیچے چلا گیا۔ آہٹ پر حکیم نے گردن موڑی اور رحیم داد کو دیکھ کے سیدھا ہو کر کھڑا لیا۔ رحیم داد اسے نظر انداز کرتے ہوئے نیچے اترنے لگا۔

حکیم نے اسے ٹوکا۔ "گل سنا جی!"

رحیم داد نہیں رکا۔ وہ ڈھلان سے نیچے اترا اور ٹوبھے کی جانب نظریں اٹھائے آگے بڑھتا گیا۔ وں کے درمیان فاصلہ اور کم ہو گیا۔

اس دفعہ حکیم چشتی نے اسے کسی قدر بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ "میں نے کہا' باشاہو! کدھر بڑھے چلے جا رہے ہو؟ بات تو سنو۔" رحیم داد ٹھٹکا لیکن اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ حکیم چشتی نے مسکرا کر پوچھا۔

"ٹوبھے پر پانی پینے جا رہے ہو؟"

رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں جی! پانی ہی پینے جا رہا ہوں۔ سخت پیاس لگی ہے۔"

"ناں ناں۔" حکیم نے انگلی کے اشارے سے منع کیا۔ "ٹوبھے کے پانی میں جونکیں ہیں۔" وہ آہستہ آہستہ رحیم داد کی جانب بڑھا۔ "تم ادھر کھالے کے پاس کنکر تو نہیں نکالتے؟" اس نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔

"تم مجھے نئے مزدور لگتے ہو۔ پہلی بار' ادھر آئے ہو کیا؟"

رحیم داد نے مختصر جواب دیا۔ "ہاں جی!"

"میں نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "میں یہاں اکثر آتا ہوں۔ کنکر کی کھدائی کرنے والے مزدور بھی کبھی کبھار ٹوبھے پر نہانے یا پانی پینے ادھر آ نکلتے ہیں۔" حکیم نے قدرے تامل کیا۔

"ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مزدور میرے سامنے ٹوبھے پر آیا۔ اس نے چلو بھر بھر کر پانی پیا۔ بہت زیادہ پیاسا لگتا تھا۔ پانی پی کر سستانے کے لیے ایک جھاڑی کے سائے میں بیٹھ گیا۔ یہی آتی گرمیوں کے دن تھے۔ نہ جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ میں نے اس کی جانب دھیان نہیں دیا' گردن جھکائے بوٹیاں توڑتا رہا۔ اچانک میں نے ابکائی کی آواز سنی۔ پلٹ کر دیکھا کہ وہ الٹی کر رہا ہے۔ الٹی میں خون ہی خون نکلا۔ الٹی کے بعد وہ نڈھال ہو کے زمین پر لیٹ گیا اور اکھڑی اکھڑی سانسیں بھرنے لگا۔ میں جھٹ اس کے پاس پہنچا اور کلائی تھام کے نبض دیکھنے لگا۔"

"لگتا ہے جی! تسیں حکیم ہو؟" رحیم داد نے پوچھا۔

"ہاں' میں حکیم ہوں۔" اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "میرا نام صوفی حکیم نذر محمد چشتی ہے۔" حکیم نے بات جاری رکھی۔ "ہاں تو جی! میں کہہ رہا تھا کہ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ مگر اس کی بیماری میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بہت غور کرنے پر اتنا پتہ چلا کہ اس کے پیٹ میں کوئی زہریلی چیز چلی گئی ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے پیٹ سے کیسے نکالا جائے۔ اس وقت اپنے پاس کوئی دوائی بھی نہیں تھی۔ فیر ایسا ہوا کہ مریض نے خون کی قے کی۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔"



رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ "اسے بیماری کیا تھی جی؟"

"وہ بیماری کوئی بہت ہوشیار اور تجربہ کار حکیم ہی سمجھ سکتا تھا۔ مریض کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ ' میں خود پریشان ہو گیا تھا۔ فوری طور پر علاج نہ کیا جاتا تو وہ مرجاتا۔ میں نے مرض کی تشخیص تو لی تھی۔ غور کرتے کرتے علاج بھی سمجھ میں آ گیا۔ جھٹ ٹوبھے پر پہنچا۔ پانی پر جگہ جگہ کائی جمع ی۔ میں نے کندھے پر پڑا ہوا پرنا اتارا اور اس میں ڈھیر ساری کائی بھر لی۔ گھڑا بھر کائی ہو گی۔ یض کے پاس پہنچا اور اسے کائی کھلانے لگا۔"

"اس نے کائی کھا لی جی؟"

"نہیں جی! وہ کائی کھانے پر بالکل تیار نہیں تھا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے' بڑی ضد کی۔ مگر میں نے ں کا منہ کھول کے زبردستی ساری کائی کھلا دی۔"

"ذرا دیر بعد اس نے ابکائیاں لینی شروع کر دیں۔ الٹی کی۔ الٹی میں کائی کے ساتھ خون بھی ۔ میں جو چیز باہر نکالنا چاہتا تھا' وہ الٹی کے ساتھ' پیٹ سے باہر آ گئی۔ وہ جونک تھی۔ یہ لمبی۔" ں نے ایک انگلی بڑھا کے رحیم داد کے سامنے کر دی۔ "جونک ٹوبھے کے پانی کے ساتھ اس کے ٹ میں چلی گئی تھی۔ جونک باہر نکلتے ہی مریض کی حالت سنبھلنے لگی۔ الٹی بند ہو گئی۔ بالکل چنگا لیا۔ صرف کمزوری رہ گئی تھی۔"

"یہ کب کی گل ہے جی؟"

"پچھلے ہی سال کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد کنکر کی کھدائی کرنے والوں میں سے کوئی ادھر پانی پینے ں آتا۔ میں نے تو سنا ہے کہ ٹھیکے دار نے پینے کے پانی کا ادھر ہی بندوبست کر دیا ہے۔ تم کیسے ر آ گئے پانی پینے؟"

رحیم داد نے خود کو سنبھالا۔ جھٹ بات بنائی۔ "وہ ایسا ہے جی! میں پہلی بار مزدوری کے لیے ر گیا تھا پر کام نہیں ملا۔ میں اس طرف چلا آیا۔ ٹوبھا دیکھ کر پیاس لگی۔" اس نے مڑ کر ٹوبھے کی ب دیکھا جس میں ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں' چمکیلی دھوپ میں آئینے کی کرچیوں کے مانند لا رہی تھیں۔ رحیم داد کو ایک بار پھر شدت سے پیاس محسوس ہوئی۔ بے قرار ہو کر بولا۔

"زبردست پیاس لگی ہے جی! کیا کروں؟"

"پریشان نہ ہو۔" حکیم نے اسے تسلی دی۔ "میرے پاس پینے کا پانی ہے۔ میں جب بھی یہاں ہوں' روٹی پانی ساتھ لاتا ہوں۔"

رحیم داد نے عاجزی سے کہا۔ "حکیم جی! مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔" اس نے خشک ہونٹوں پر

زبان پھیری اور منہ کھول کر آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ حکیم نے اس کی بے قراری محسوس کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ”آؤ' میرے ساتھ۔“ وہ آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ چلا۔

چند ہی قدم پر ایک گھنی جھاڑی تھی۔ جھاڑی کے قریب پہنچ کر حکیم ٹھہر گیا۔ رحیم داد بھی رک گیا۔ جھاڑی کے نیچے مٹی کے تودے پر المونیم کا ناشتے دان رکھا تھا۔ قریب ہی چھوٹا سا سفری تھرماس بھی تھا۔

حکیم نے آگے بڑھ کر ناشتا دان اور تھرماس اٹھایا اور جھاڑی کے نیچے صاف ستھری جگہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ حکیم نے تھرماس کھولا' ڈھکنے میں پانی انڈیلا اور رحیم داد کی جانب بڑھایا۔ ”لو پیاس بجھانے کے لیے تھوڑا سا پی لو۔“ رحیم داد سارا پانی ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔

حکیم نے تھرماس کا خالی ڈھکنا اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”میں تمہیں پینے کے لیے اور پانی نہیں دوں گا۔ اب روٹی کھالو' پھر پانی پینا۔ خالی پیٹ پانی پینا مناسب نہیں ہوتا۔ لگتا ہے' تم نے سویرے سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے؟“

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ حکیم نے ناشتے دان کھولا۔ اس میں بھنا ہوا گوشت تھا اور روٹیاں تھیں۔ حکیم نے ایک روٹی نکالی' رحیم داد کی جانب بڑھائی۔ دوسری اپنے ہاتھ میں دبا کر بولا۔ ”لو جی! بسم اللہ کرو۔“ اس نے لقمہ لیا۔

رحیم داد بھی کھانا کھانے لگا۔

حکیم نے کھانا کھاتے کھاتے کہا۔ ”میں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا تم پہلی بار ادھر آئے ہو۔ اتفاق سے میں آج یہاں موجود تھا ورنہ تم بھی ٹوبھے کا پانی پی کر بیمار پڑ جاتے۔“

”کیا ٹوبھے کا پانی پی کر سبھی بیمار پڑ جاتے ہیں؟“

”نہیں' صرف وہ بیمار پڑتے ہیں جن کے پیٹ میں پانی کے ساتھ جونکیں چلی جاتی ہیں۔ ویسے ٹوبھے کا پانی پینے سے پیٹ کی دوسری بیماریاں بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ ٹھیرا ہوا پانی صحت کے لیے مضر ہوتا ہے۔“

”حکیم جی! تسیں روز ادھر آتے ہو؟“

”نہیں' مجھے اتنی فرصت کہاں کہ روز روز آؤں۔ کبھی تو مہینوں نہیں آتا۔“ وہ مسکرایا۔ ”تم سوچ رہے ہوگے' میں اس ویرانے میں کس لیے آتا ہوں۔ یہی سوچ رہے ہو نا؟“

رحیم داد نے روٹی کا لقمہ توڑتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ ”ہاں جی۔“

”میں یہاں جڑی بوٹیوں کی تلاش میں آتا ہوں۔“ حکیم چشتی نے ہاتھ اٹھا کر ادھر ادھر لہرایا۔



”یہ جھاڑیاں اور بوٹے دیکھ رہے ہو۔ یہ قدرت کا ان مول خزانہ ہے۔ ان بوٹوں کی پتیوں' جڑوں ڈنٹھلوں میں نہ جانے کیسی کیسی بیماریوں کا علاج چھپا ہوا ہے۔ مگر اسے ڈھونڈنے اور پہچاننے کے لیے نظر چاہیے۔“ عینک کے شیشوں کے پیچھے حکیم چشتی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ دلچسپی اور توجہ سے رحیم داد کو بتاتا رہا۔

”یہ خودرو بوٹے ہیں۔ ہر موسم میں اگتے ہیں۔“

”کئی بوٹے تو جی فصلوں کے ساتھ کھیتوں میں نکل آتے ہیں۔“ رحیم داد نے بھی اپنی معلومات کا اظہار کیا۔

”یہ عجب بات ہے۔“ حکیم مسکرا کر بولا۔ ”کھیتوں میں بوائی سے پہلے پوری طرح صفائی کی جاتی ہے تب بیج ڈالے جاتے ہیں۔ مگر فصل کے ساتھ ایسے خودرو بوٹے ضرور نکلتے ہیں جو دوا کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ہی زمین پر ایک ہی سی کھاد ڈالنے اور ایک ہی طرح پانی لگانے کے باوجود دونوں فصلوں پر مختلف بوٹے اگتے ہیں۔ ربیع کے الگ ہوتے ہیں' خریف کے الگ۔ ان میں السی' سداب' حرمل' کاسنی' کلتھی' منڈی' کچری' سرپھوکہ' شاہترا' بھوا اور ایسی ہی نہ جانے کتنی جڑی بوٹیاں شامل ہوتی ہیں۔“ حکیم نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”پتہ ہے' یہ کتنی مفید اور کارآمد بوٹیاں ہوتی ہیں؟“

”میں نوں ان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں جی؟“

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔“ حکیم کھل کر مسکرایا۔ ”تمہاری طرح اور بھی بہت ہیں جن کو یہ پتہ نہیں کہ السی' اخراج بلغم کے لیے نہایت مفید ہے۔ محلل اورام ہے' مسکن ہے۔ تم نے سداب کا بوٹا دیکھا ہوگا۔ گندم کے بوٹوں کے ساتھ ہی اگتا ہے۔ دو گز تک اونچا ہوتا ہے۔ سداب پیٹ کی کئی بیماریوں کے علاوہ تشنج' قولنج اور نفخ شکم رفع کرتا ہے۔ اسی طرح حرمل' جسے اسپند بھی کہتے ہیں' مقوی اعصاب ہے۔ اس کے بیجوں میں تیل وافر مقدار میں ہوتا ہے جو بدن سے رطوبت خارج کرتا ہے۔ کاسنی کی بوٹی جگر کے امراض کے لیے مخصوص دوا ہے۔ اس کے پتے' بیج اور جڑ' سب کام آتے ہیں۔ یہ حرارت بجھاتی ہے۔ پیاس کی شدت دور کرتی ہے۔ محلل اور مسکن ہے۔ یرقان کے مریض کو شفا دیتی ہے۔“

حکیم نذر محمد چشتی نہایت سنجیدگی سے علم طب کے اسرار و رموز بیان کرتا رہا۔ ”منڈی اور سرپھوکہ' مصفی خون ادویات ہیں۔ کلتھی مشہور بوٹی ہے۔ پتھری توڑتی ہے۔ کچری' پیٹ کے مروڑ اور بلغمی امراض کے لیے نہایت مجرب ہے۔ اسی طرح دوسری جڑی بوٹیوں کے بھی خواص ہیں۔

کہاں تک بیان کروں۔"

"حکیم جی! تسیں انھیں اتنی کام کی بوٹیاں بتاتے ہو پر کھیتوں کی گوڈی اور تلائی کرتے ہوئے ان کو نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔" رحیم داد نے حکیم کو مطلع کیا۔

"یہی تو ظلم ہے۔" حکیم چشتی بے قرار ہو کر بولا۔ "افسوس کہ لاعلمی کے باعث اتنی کار آمد جڑی بوٹیاں کھیتوں سے اکھاڑ کر ضائع کر دی جاتی ہیں۔ جنگل یا ویرانے میں پیدا ہوں تو مویشیوں کی خوراک بن جاتی ہیں۔ موسم کے سرد و گرم کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی ہیں۔" رحیم داد سر جھکائے چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔

حکیم نے بات جاری رکھی۔ "میں ان جڑی بوٹیوں سے مختلف دوائیاں تیار کرتا ہوں۔ کمال گڑھ میں میرا مطب ہے۔ دور دور سے مریض آتے ہیں۔"

کھانے سے فارغ ہو کر حکیم نے ناشتے دان میں بچا کھچا کھانا ڈالا اور اسے تھرموس کے ساتھ ایک طرف سنبھال کر رکھ دیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ میں خشک برساتی نالا' ریگ زار جیسا نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ مگر جھاڑی کے سائے میں سکون تھا' ٹھنڈک تھی۔ ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے۔ ٹوبے کا پانی جھلملا رہا تھا۔ رحیم داد کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ نیند کا غلبہ بہت بڑھا تو وہ کھڑا ہو گیا۔ حکیم نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"کہاں چلے؟"

"میں نے تو جی اپنے پنڈ واپس جانا ہے۔"

حکیم نے اسے جانے نہیں دیا۔ "اس وقت دوپہر میں جا کر کیا کرو گے؟ میرا کہا مانو تو ٹھیر جاؤ۔ دن ڈھلے دونوں اکٹھے چلیں گے۔ میں کمال گڑھ جاؤں گا۔ تم اپنے پنڈ چلے جانا۔" رحیم داد مخمصے میں پڑ گیا۔ وہ ٹھہرنا بھی نہیں چاہتا تھا اور اسے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے؟ وہ خاموش کھڑا رہا۔ حکیم مسکرا کر بولا۔

"دھوپ ڈھلنے تک یہاں ٹھیر جاؤ۔ بوٹیاں چننے میں میری مدد کرو۔ تمہیں اور کوئی کام بھی نہیں ہے۔ گھر ہی تو جانا ہے۔ چلے جانا۔"

"میں نوں تو جی یہ بھی پتہ نہیں کون سی بوٹی توڑنی ہے؟"

حکیم بے تکلفی سے ہنسا۔ "تم فکر نہ کرو۔ آسانی سے شناخت کر لو گے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

دونوں جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ڈھلان کے پاس پہنچے۔ حکیم نے ایک پودے کی



جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ رہا وہ بوٹا۔"

پودا بالشت سوا بالشت اونچا تھا۔ اس کی پتیاں نوکیلی تھیں۔ شاخوں میں باریک باریک کانٹے تھے اور چند ننھے' ننھے زرد پھول بھی لگے تھے۔

حکیم نے جھک کر پودا اکھاڑا اور رحیم داد کو دکھا کر بولا۔ "اس بوٹے کا نام سنگھرنی ہے۔ یہ ندی نالوں کے کنارے پتھریلی زمین میں اگتا ہے۔ اس کی عجب تاثیر ہے۔ اس کی جڑ ابال کر پیو' خونی یا بادی کیسی بھی بواسیر ہو' فوراً افاقہ ہو گا۔ بچوں کے پیٹ میں کیڑے پڑ جائیں' جڑ پیس کر' ذرا سا شہد ملا کر چٹاؤ' سارے کیڑے فضلے کے ساتھ پیٹ سے نکل جائیں گے۔ کالی کھانسی ہو تو اسے جلا کر ہاون دستے میں کوٹ لو' باریک کپڑے سے چھان کر سفوف بنا لو۔ تھوڑا سا نمک ملاؤ' رات کو سوتے وقت مریض کو ایک چٹکی کھلا کر گرم پانی پلا دو۔ چوتھے روز کالی کھانسی جاتی رہے گی۔ جڑ قوت باہ کے لیے بھی نہایت مفید ہے۔ گھیکوار کے ساتھ پیس کر حلوہ بنا لو۔ اس میں حسب ضرورت پستے' بادام ڈالو۔ جاڑوں میں استعمال کرو۔ نہایت ممسک ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔

"لیکن یہ تو رئیسوں کے چونچلے ہیں' تم کہاں اس چکر میں پڑو گے؟"

"اپنی تو جی ساری گل ہی سمجھ نہیں آئی۔ اس چکر میں کیا پڑنا۔"

"اچھا ہی ہے تم اسے نہ سمجھو۔ تم ابھی تگڑے جوان ہو۔ تمہیں کسی ایسے نسخے کی کیا ضرورت لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ آزمودہ اور مجرّب نسخہ ہے۔" حکیم چشتی سنگھرنی کا پودا گھما پھرا کر دیکھنے لگا۔

"جڑ کی اور بھی بہت خوبیاں ہیں' کہاں تک بیان کروں۔"

"پر میں نے تو جی تمہیں اس کی پتیاں توڑ کر تھیلے میں ڈالتے دیکھا تھا۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" حکیم مسکرانے لگا۔ "میں تو تمہیں اس بوٹے کی خصوصیات بتا رہا تھا۔ جڑ کی طرح اس کی شاخیں اور ڈنٹھل بھی بہت سی بیماریوں کا علاج ہیں۔ اسی طرح اس کے پھولوں اور پتیوں کی بھی خصوصیات ہیں۔" وہ پتیاں توڑ توڑ کر ہاتھ میں دبے ہوئے تھیلے میں ڈالنے لگا۔ "مجھے آج کل اس کی پتیوں کی شدید ضرورت ہے۔ میں ان پتیوں سے کئی پیچیدہ امراض کا علاج دریافت کرنے کا تجربہ کر رہا ہوں مجھے اس میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔"

حکیم نے تمام پتیاں توڑ کر تھیلے میں ڈالیں اور پودا ایک طرف پھینک دیا۔ رحیم داد چپ کھڑا رہا۔ حکیم آگے بڑھا۔ چند ہی قدم کے فاصلے پر سنگھرنی کے پودوں کا جھرمٹ نظر آیا۔ حکیم کے

چہرے پر مسرت پھیل گئی۔

"لو جی! اپنا کام تو بن گیا۔" اس نے پودوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ سب سنکھنی کے بوٹے ہیں۔ اب تو تم بھی انھیں پہچان سکتے ہو۔ اچھا' اب ان کی پتیاں توڑ توڑ کر اکٹھی کرو۔" اس نے اپنا تھیلا رحیم داد کو تھما دیا۔

رحیم داد خاموشی سے پتیاں توڑ توڑ کر تھیلے میں ڈالتا رہا۔ حکیم کچھ دور کھڑا تھا۔ رحیم داد کو جھاڑیوں کی الجھی ہوئی شاخوں کی آڑ سے اس کی پیٹھ کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ وہ جھکا ہوا یا تو پتیاں توڑ رہا تھا یا کسی پودے کا معائنہ کر رہا تھا۔

رحیم داد پتیاں توڑ کر تھیلے میں ڈالتا اور متجسّس نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا بھی جاتا۔ اسے ابھی تک لالی کا انتظار تھا۔ ساتھ ہی یہ دھڑکا بھی تھا کہ اگر لالی گرفتار ہو گیا تو پولیس اب سرگرمی سے اس کی تلاش میں ہوگی۔

☆

سائے سمٹتے جا رہے تھے۔ سک نالے کی ریت کے ذرے دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔ گرمی بڑھ گئی تھی۔ رحیم داد سائے میں کھڑا تھا۔ مگر موٹی چادر نے اس کا جسم پسینے سے تر کر دیا تھا۔ حکیم کے سامنے وہ چادر اتارنا نہیں چاہتا تھا۔

رحیم داد نے سنکھنی کے تمام پودوں کی پتیاں تھیلے میں بھر لیں۔ مگر تھیلا ابھی خالی تھا۔ وہ اسے ہاتھ میں دبائے حکیم کی جانب چلا۔ حکیم پتیاں توڑ توڑ کر اپنی ٹوپی میں بھر رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر حکیم نے گردن موڑی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد کیکر کے ایک گھنے درخت کے نیچے سے گزرتا ہوا آگے بڑھا۔ یکایک وہ ٹھوکر کھا کے لڑکھڑایا۔ اس کی چادر کیکر کی خاردار شاخوں میں الجھ گئی۔ رحیم داد دھڑام سے زمین پر گرا۔ سب کچھ آناً فاناً ہوا۔ رحیم داد جیل کی وردی میں زمین پر پڑا تھا اور اس کی چادر ایک شاخ سے الجھی ہوئی لٹک رہی تھی۔ حکیم لپک کے اس کے نزدیک پہنچا۔ رحیم داد گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔

حکیم نذر محمد چشتی نے ہمدردی سے کہا۔ "چوٹ تو نہیں آئی؟" اس نے رحیم داد کے جسم پر جیل کی وردی اور اس پر پڑا ہوا دھندلا نمبر مشتبہ نظروں سے دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر ہکلانے لگا۔

"تم..... تم؟"

رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے چادر شاخ سے اتار کر اوڑھ لی مگر حکیم سے نظریں نہیں ملائیں۔ اس کا تھیلا گرتے وقت ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ تھیلے سے پتیاں بھی نکل کر بکھر گئیں



ہیں۔

رحیم داد اکڑوں بیٹھ کر خاموشی سے پتیاں اٹھا اٹھا کر تھیلے میں ڈالنے لگا۔ حکیم اس کے قریب ہی ھڑا تھا۔ رحیم داد نے ساری پتیاں تھیلے میں بھر دیں اور کھڑا ہو گیا۔

چند لمحے دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے رہے' پھر حکیم کی آواز بری۔ "کیا تم جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہو؟"

رحیم داد گردن جھکا کر آہستہ سے بولا۔ "ہاں جی!"

" تمھارا رویہ اور حلیہ دیکھ کر مجھے پہلے ہی شک گزرا تھا۔" حکیم نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے یہ ا پتہ ہے کہ کل رات نہر کے کنارے ٹبوں پر پولیس کے ساتھ تمھاری گولی چلی تھی۔ تم فرار نے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر تمھارا ساتھی پکڑا گیا۔"

رحیم داد نے گھبرا کر پوچھا۔ "تیں نوں کیسے پتہ چلا وہ پکڑا گیا؟"

"سویرے جب میں ادھر آ رہا تھا تو شہر سے بس میں تین کانسٹیبل بھی سوار ہوئے۔ وہ قادر آباد ۔ آئے۔ ان میں سے ایک کانسٹیبل میرا جاننے والا نکل آیا۔ اس کی گھر والی میرے زیر علاج رہ اہے۔ بے چاری کو عرق النسا کی بیماری ہے۔ اسی کانسٹیبل سے دوران گفتگو معلوم ہوا کہ تمھارا تھی پکڑا گیا اور اب پولیس کی حراست میں ہے۔" رحیم داد کے چہرے پر پریشانی چھا گئی۔ حکیم ،دیر خاموش رہ کر نرم لہجے میں بولا۔

"تم کوئی بھی ہو' مجھے تم سے کیا لینا۔ پر میں اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ پولیس تمھاری تلاش ہے۔"

رحیم داد نے گھبرا کر کہا۔ "فیر تے میں نوں یہاں سے چھیتی نال ٹر جانا چاہئے۔" اس نے خوف نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

تم اس وقت کہاں جاؤ گے؟" حکیم چشتی نے دریافت کیا۔

مجھے خود پتہ نہیں جی کہاں جانا ہے۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے تو یہ ہی نہیں تھا۔ لالی جہاں لے جاتا' میں وہیں چلا جاتا۔ وہی مجھے جیل سے نکال کر لایا تھا۔ آگے کا ی کو پتہ تھا۔"

خطرہ تو تمھارے لیے یہاں بھی ہے۔ مگر اس وقت کہیں جانا اور بھی زیادہ خطرناک ہوگا۔" نے اسے مشورہ دیا۔ "میری مانو تو سورج ڈوبنے تک یہیں رہو۔ شام ہو جائے تو اندھیرے میں تمھارا ہے نکل جانا۔ آگے تمھاری مرضی۔"

رحیم داد نے حکیم کا مشورہ قبول کر لیا اور اس کے ساتھ سنگھرنی کے پودوں سے پتیاں توڑ توڑ کر تھیلے میں ڈالنے لگا۔

دونوں جھاڑیوں کے درمیان ادھر ادھر گھومتے رہے۔ رحیم داد ابھی تک اپنا جسم چادر سے چھپائے ہوئے تھا۔

حکیم نہایت انہماک سے پتیاں توڑ توڑ کر اپنی ٹوپی میں ڈالتا جا رہا تھا۔ ٹوپی بھر جاتی تو پتیاں رحیم داد کے ہاتھ میں دبے ہوئے تھیلے میں ڈال دیتا۔ رحیم داد نے پتیاں توڑتے توڑتے حکیم سے دریافت کیا۔

"حکیم جی! تسیں خالی پتیاں کیوں اکٹھی کر رہے ہو؟"

حکیم چشتی اس کی بات سن کر مسکرایا۔ "جڑ اور ڈنٹھلوں کا میرے پاس پہلے ہی وافر ذخیرہ ہے۔ آج کل مجھے صرف پتیوں کی ضرورت ہے۔ میں ان دنوں ایک نئی دوا تیار کر رہا ہوں۔ اس کی تیاری پر بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔" اس نے ٹوپی میں بھری ہوئی پتیاں تھیلے میں ڈال دیں۔ "انھیں بھیگنے کے لیے رات بھر اوس میں رکھوں گا۔ سویرے سورج نکلنے سے پہلے پہلے اٹھا کر کورے گھڑے میں بھر دوں گا۔ پھر گھڑے پر ڈھکنا رکھ کر گیلی مٹی کے لیپ سے اس کا منہ اچھی طرح بند کر دوں گا۔ اس کے بعد زمین میں کمر تک گہرا گڑھا کھودوں گا، اس میں گھڑا رکھوں گا۔ اسے اپلوں سے بھر کر مٹی سے ہموار کروں گا۔ جب برسات گزر جائے گی تو زمین کھود کر گھڑا باہر نکال لوں گا۔ اس وقت تک گھڑے میں خوب خمیر اٹھ آئے گا۔ پتیاں گل سڑ کر گاڑھی گاڑھی لگدی سی بن جائیں گی۔ اس لگدی میں حسب مقدار عود صلیب، زراوند طویل، عاقر قرحا، زیرہ سیاہ، خولنجان، رب السوس اور اسطوخودوس شامل کروں گا۔ پھر اسے کھرل میں پیس کر مٹر کے دانے برابر گولیاں بنا لوں گا۔ یہ گولیاں سائے میں سکھائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد سمجھو، دوا تیار ہو گئی۔"

رحیم داد حیرت سے حکیم کی باتیں سنتا رہا۔ "دوائی کی تیاری میں تو جی بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔"

"محنت تو واقعی بہت کرنی پڑتی ہے۔" حکیم نے گردن اٹھائی اور کھل کر مسکرایا۔ "مگر یہ ایسے مرض کی دوا ہے جسے لاعلاج کہا جاتا ہے۔ یہ مرگی کا مرض ہے۔ اسے طب یونانی میں ام الصبیان اور عربی میں صرع کہا جاتا ہے۔ تم نے مرگی کے مریض تو دیکھے ہوں گے؟"

"دیکھے ہیں جی، بالکل دیکھے ہیں۔ میرے پڑوسی کرامت کو یہی روگ ہے۔ بہت علاج کیے پر اب تک اس کی بیماری نہیں گئی۔"



"اس مرض کا سبب وہ سدّہ ہوتا ہے جو دماغ کے بعض بطون اور اعصاب کے بعض حصوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ وہی اعصاب ہوتے ہیں جو اعضا کو حرکت دیتے ہیں اور قوت حس ان کی طرف پہنچاتے ہیں۔ جب تک اس سدّے کو رفع نہ کیا جائے مرض ختم نہیں ہوتا۔" حکیم چشتی نہایت بلیغ انداز میں مرگی کے مرض کے بارے میں بتاتا رہا۔ رحیم داد خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ حکیم نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"تم اپنے پڑوسی کو میرے پاس لانا۔ میری گولیوں کے استعمال کے بعد اسے یہ بیماری کبھی نہیں ہو گی۔ بالکل چنگا ہو جائے گا۔ کہتے ہیں، مرگی لاعلاج مرض ہے مگر میں نے اس کا علاج دریافت کر لیا ہے۔" وہ ہاتھ اٹھا کر جوش و خروش سے بولا۔ "کتنے ہی مریضوں کو اس دوا سے بھلا چنگا کر چکا ہوں۔ یہ تیر بہدف علاج ہے۔ نہایت مجرّب اور آزمودہ ہے۔ میرا دعویٰ ہے۔" حکیم کی زبان اچانک لڑکھڑانے لگی۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑا اور خاموش ہو گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں چڑھ گئیں۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ لڑکھڑایا اور دھڑام سے زمین پر گرا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ حکیم پر مرگی کا دورہ پڑا تھا۔

وہ بے ہوش تھا اور رحیم داد اسے حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے جھک کر حکیم کو آہستہ آہستہ جھنجھوڑا۔ مگر حکیم بے سدھ پڑا رہا۔ اس کی سانس رک رک کر چل رہی تھی اور حلق سے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ رحیم داد حیران و پریشان کھڑا اسے تکتا رہا۔

☆

ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ دھوپ ریت کے ذروں پر جھلملا رہی تھی۔ رحیم داد کی آنکھوں میں اچانک تیز چمک پیدا ہوئی۔ اس نے چوکس نظروں سے ادھر ادھر دیکھا مگر دور دور تک نہ آدم تھا، نہ آدم زاد۔

رحیم داد نے جھٹ چادر ایک طرف پھینکی۔ جلدی جلدی جیل کی وردی اتاری اور حکیم کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے حکیم کی شلوار اتاری اور اسے پہن کر قمیص بھی اتارنے لگا۔ اس نے حکیم کی قمیص بھی پہن لی۔

حکیم زمین پر ننگا دھڑنگا پڑا تھا۔ اس کے منہ سے سفید سفید جھاگ نکل کر ہونٹوں کے گوشوں پر پھیل گیا تھا۔ حکیم مردے کے مانند بے جان نظر آ رہا تھا۔

رحیم داد نے حکیم کے کپڑے پہننے کے بعد چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ وہ چند قدم چلا پھر ٹھہر گیا۔ اس نے حکیم کے پیروں سے جوتے نکالے اور انھیں پہننے لگا۔ جوتے ذرا تنگ تھے' مگر اس نے کسی نہ کسی طرح پہن ہی لیے۔ حکیم ابھی تک بے حس و حرکت پڑا تھا۔ رحیم داد قریب کھڑا تیکھی نظروں سے اسے گھورتا رہا۔

اس نے جیل کی وردی حکیم کو پہنا دی۔ حکیم نذر محمد چشتی کی ٹوپی اٹھائی' آنکھوں سے عینک اتاری' ایک بار پھر چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور اس ٹیلے پر چڑھ گیا جس کے نیچے حکیم بے ہوش پڑا تھا۔

ٹیلے پر پہنچ کر اس نے نیچے دیکھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ٹیلے کے نیچے حکیم چشتی نہیں' جیل کی وردی میں ملبوس وہ خود بے سدھ پڑا ہے۔ وہ اسے گھورتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر وحشت اور سختی چھا گئی۔ اس کی سانس تیز ہو گئی۔

حکیم کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ رحیم داد نے جھٹ قریب پڑا ہوا بھاری پتھر اٹھایا' سر سے بلند کیا اور تاک کر حکیم کے چہرے کی جانب پھینکا۔ پتھر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ حکیم کے حلق سے گھٹی ہوئی آواز نکلی اور خاموشی میں ڈوب گئی۔ اس کا چہرہ بھاری پتھر سے کچلنے کے بعد بری طرح مسخ ہو گیا۔ نہ آنکھیں نظر آ رہی تھیں' نہ ناک اور کان۔ اس کا پورا چہرہ گوشت کا کٹا پھٹا لوتھڑا بن گیا تھا۔ حکیم کا جسم ذرا دیر تک پھڑکتا رہا پھر ٹھنڈا پڑ گیا۔

رحیم داد چٹان سے اتر کے حکیم کی لاش کے قریب گیا۔ اس نے پتھر اٹھا کر حکیم کا چہرہ اور مسخ کر دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ بھی پتھر سے کچل ڈالے۔ وہ کوئی ایسا نشان چھوڑنا نہیں چاہتا تھا جس سے اس کی شناخت ہو سکے۔

لاش پوری طرح مسخ کرنے کے بعد وہ اس جھاڑی کے نیچے گیا جہاں حکیم کا ناشتے دان اور تھرماس رکھا تھا۔ اس نے ناشتے دان اور تھرماس پتیوں سے بھرے ہوئے تھیلے میں ٹھونسے۔ حکیم کی ٹوپی اوڑھی' عینک لگائی۔ اپنی چادر لاش کے قریب ڈالی۔ ٹوبھے پر پہنچا۔ خون سے بھرے ہوئے ہاتھ پانی سے دھوئے۔

ہاتھ دھو کے وہ ٹوبھے کے کنارے کنارے کچھ دور چلتا رہا' پھر جھاڑیوں میں گھس گیا اور جھاڑیوں سے گزر کر ایک ٹیلے پر چڑھنے لگا۔

بلندی پر پہنچ کے اس نے دیکھا دور دور تک اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبّے ہیں۔ آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور فراش کے ایک گھنے درخت کے سائے میں ٹھہر گیا۔



درخت سے چند قدم دور ایک اونچے ٹیلے کی چوٹی تھی اور اس کے نشیب میں جنگلی جھاڑیوں اور خود رو پودوں کا بہت گھنا جھنڈ تھا۔

رحیم داد نے سوچا' ہاتھ میں دبا ہوا تھیلا جھاڑیوں کے پیچھے چھپا دے۔ وہ جھاڑیوں کے قریب پہنچا اور خود رو پودے روندتا ہوا جھنڈ کے اندر چلا گیا۔

جھاڑیوں کے پیچھے اسے غار نظر آیا۔ غار دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے گردن جھکا کے غار میں جھانکا۔ غار بالکل خالی تھا۔ اور اتنا گہرا اور کشادہ تھا کہ وہ اس میں اطمینان سے روپوش ہو سکتا تھا۔ مگر وہ ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا' جلد سے جلد کہیں دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس نے تھیلا غار کے ایک گوشے میں رکھ دیا۔

جھاڑیوں سے باہر نکلتے ہوئے اس نے سک نالے کی جانب دیکھا۔ عینک کے موٹے موٹے شیشوں سے صاف نظر نہیں آیا۔ اس نے عینک اتار کر قمیص کی جیب میں رکھ لی۔ اب اس کے سامنے نشیب میں سک نالا تھا جس کی ریت کے ذرے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ بائیں ہاتھ پر ٹوبھا تھا۔ اس کا پانی بھی جھلملا رہا تھا۔ ٹوبھے کے پار ایک جھاڑی کے قریب حکیم چشتی کی لاش پڑی تھی۔

رحیم داد لگ بھگ نصف فرلانگ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ مگر ٹیلے کی بلندی سے لاش صاف نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد سہمی ہوئی نگاہوں سے لاش تکنے لگا۔ پھر اس کی نظر نشیب سے بلندی کی جانب گئی۔ وہاں جھل تھا اور اسی جھل سے گزر کر وہ سک نالے میں اترا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جھل کے گھنے درختوں سے نکل کر ایک شخص باہر آ رہا ہے۔

رحیم داد گھبرا کے جہاں تھا' وہیں دبک گیا۔ مگر چوکنا نظروں سے اسے دیکھتا بھی رہا۔ وہ وضع قطع سے کنکر کی کھدائی کرنے والا مزدور لگتا تھا۔ مزدور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا ڈھلان سے نیچے اترا اور ٹوبھے کی جانب نظریں اٹھائے آگے بڑھنے لگا۔ رحیم داد جھاڑیوں کی آڑ سے بغور اسے دیکھتا رہا۔

چلتے چلتے مزدور نے گردن ذرا جھکا کر حکیم کی لاش کی طرف دیکھا اور جھجک کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے وہ لاش دیکھتا رہا' پھر آہستہ آہستہ لاش کے قریب گیا۔ جھک کر اسے دیکھا' لیکن فوراً سراسیمہ ہو کر پیچھے ہٹا' پلٹا اور تیزی سے چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ بلندی سے اس نے ایک بار پھر لاش دیکھی اور بھاگتا ہوا فراش کے درختوں کے نیچے چلا گیا۔ ذرا دیر میں وہ رحیم داد کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رحیم داد نے چاہا کہ جھاڑیوں سے نکل کر دور چلا جائے مگر وہ سہما ہوا بیٹھا رہا۔ اس کے آس پاس چٹیل ٹیلے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ٹیلوں پر چلنا خطرے کو دعوت دینا تھا۔ خوف اور پریشانی سے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

وہ جنگلی پودوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا خاموشی سے غار میں داخل ہو گیا۔ اس نے تھیلے سے تھرماس نکالا۔ ڈھکنا کھول کر دیکھا کہ تھرماس میں تھوڑا سا پانی موجود ہے۔ اس نے تھرماس منہ سے لگا کر گھونٹ بھر پانی پیا۔ پانی پینے سے کسی قدر سکون ملا۔ اس نے غار سے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

غار کی زمین خشک اور صاف ستھری تھی۔ رحیم داد سورج غروب ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ غار میں نرم نرم جھونکے آ رہے تھے۔ رحیم داد نے تھیلے سے ناشتے دان نکال کر تھرماس کے ساتھ ایک کونے میں رکھ دیا اور پتوں سے بھرا ہوا تھیلا سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ مگر غار اتنا طویل نہیں تھا کہ وہ پوری طرح ٹانگیں پھیلا سکے۔ اس نے اپنا جسم کسی قدر سکیڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں لیکن نیند نہیں آئی۔ اسے بار بار حکیم کا خون میں لتھڑا ہوا خوف ناک چہرہ نظر آتا۔ گھبرا کر وہ آنکھیں کھول دیتا۔

وقت گزرتا رہا۔ رحیم داد بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اسی عالم میں اسے نشیب میں ملی جلی انسانی آوازیں سنائی دیں۔

وہ پریشان ہو کر اٹھا اور غار سے نکل کر دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ اس نے جھاڑیوں کی آڑ سے دیکھا کہ حکیم نذر محمد چشتی کی لاش کے قریب کچھ لوگ کھڑے ہیں۔ وہ کنکر کی کھدائی کرنے والے مزدور تھے۔ ان میں وہ مزدور بھی شامل تھا جس نے لاش سب سے پہلے دیکھی تھی۔ وہ گرد و نواح کے ٹیلے اور ٹبے بھی متجسّس انداز سے دیکھ رہے تھے۔ چند مزدور ٹوبھے پر پہنچے۔ انھوں نے ٹوبھے کے پانی سے منہ ہاتھ بھی دھویا۔ وہ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے اور پریشان اور سہمے ہوئے نظر آتے تھے۔

مزدور لگ بھگ نصف گھنٹے تک لاش کے نزدیک کھڑے رہے یا اس کے آس پاس منڈلاتے رہے۔ آخر بلندی پر چڑھ کر جھل کے گھنے درختوں میں داخل ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد ویرانی چھا گئی۔

حکیم کی لاش جھاڑی کے پاس پڑی تھی۔ سورج اب ایسے رخ پر آ گیا تھا کہ دھوپ پوری طرح لاش پر پڑ رہی تھی۔ رحیم داد دوبارہ غار میں چلا گیا۔ مگر اس دفعہ لیٹا نہیں، سر جھکائے خاموش بیٹھا



رہا۔ اب دن ڈھلنے لگا تھا، سائے طویل ہو گئے تھے۔

رحیم داد بے چین ہو کر پھر غار سے نکلا۔ اس نے جھاڑیوں کی الجھی ہوئی شاخوں کے درمیان سے حکیم کی لاش دیکھی۔

دو گدھ لاش کے کچلے ہوئے چہرے سے گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ گدھوں اور چیلوں کا ایک غول اوپر فضا میں منڈلا رہا تھا۔ دھوپ مٹیالی پڑ گئی تھی۔ سورج مغرب میں فراش کے اونچے اونچے درختوں کی چوٹیوں پر پہنچ چکا تھا۔ سک نالے پر گہرا سناٹا چھایا تھا۔ گدھوں کے ساتھ اب چیلیں بھی لاش سے گوشت نوچ نوچ کر کھا رہی تھیں۔

رحیم داد جھاڑیوں کی اوٹ سے حکیم چشتی کے مردہ جسم کی درگت بنتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دیکھا کہ گدھ بھرا مار کر اڑ گئے۔ چیلیں بھی اڑ کر ادھر ادھر فضا میں بکھر گئیں۔ پولیس کا ایک انسپکٹر چار کانسٹیبلوں کے ہم راہ ڈھلان سے نیچے اتر رہا تھا۔ پولیس کو دیکھتے ہی رحیم داد کے اوسان خطا ہو گئے۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

پولیس والے نشیب میں اترنے کے بعد لاش کی جانب بڑھے اور جھک جھک کر لاش کا معائنہ کرنے لگے۔ گدھوں اور چیلوں کا غول ابھی تک فضا میں منڈلا رہا تھا۔ انسپکٹر نے لاش کے بعد خون سے بھرے ہوئے پتھر کا بھی معائنہ کیا جس سے رحیم داد نے حکیم کا چہرہ اور ہاتھ کچل کر مسخ کر دیے تھے۔

انسپکٹر نے رحیم داد کی چادر بھی دیکھی۔ چادر لاش کے قریب ہی پڑی تھی۔ انسپکٹر لاش کے آس پاس گھومتا رہا۔ وہ قریب کی جھاڑیوں میں بھی گیا۔ چڑھ کر ٹیلے پر پہنچا۔ بلندی سے جھک جھک کر لاش دیکھتا رہا۔ نیچے اترا اور لاش کے نزدیک کھڑے ہو کر قدموں کے نشانات دیکھنے لگا۔

وہ قدموں کے نشانات دیکھتا ہوا ٹوبھے کی جانب بڑھا اور کنارے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ اس کے ہم راہ ایک کانسٹیبل بھی تھا۔ انسپکٹر ہاتھ اٹھا کر کانسٹیبل کو قدموں کے نشانات دکھا رہا تھا۔

جیل میں جرائم پیشہ قیدیوں کے ساتھ رہنے کے باعث رحیم داد جرائم کے بارے میں بہت سے گر اور حربے جان گیا تھا۔ اس نے حکیم چشتی کو قتل کرتے ہوئے اپنے طور پر پوری کوشش کی تھی کہ پولیس کو مغالطے میں ڈال دے۔ وہ اپنی کامیابی پر مطمئن تھا۔ مگر جب انسپکٹر قدموں کے نشانات دیکھتا ہوا ٹوبھے تک پہنچ گیا تو رحیم داد کو اپنے اناڑی پن کا احساس ہوا۔ لاش کے قریب سے فرار ہوتے وقت اسے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ ریت پر اس کے قدموں کے نشان صاف نظر آ رہے ہیں۔

لیکن یہ سوچ کر اسے کسی قدر ڈھارس ہوئی کہ کنکر کھودنے والے مزدوروں کے قدموں کے نشانات بھی اس کے قدموں کے نشانات کے ساتھ گڈمڈ ہوگئے تھے۔ چند مزدور منہ ہاتھ دھونے ٹوبے پر بھی پہنچے تھے۔

رحیم داد نے غور کیا کہ قدموں کے ملے جلے نشانات نے انسپکٹر کو الجھن میں ڈال دیا۔ انسپکٹر ٹوبھے کے کنارے کھڑا تھا اور مڑمڑ کر نشانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک متجسّس نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر ٹوبھے کے کنارے کنارے چلتا جھاڑیوں میں داخل ہوا۔

جھاڑیوں سے گزر کر وہ ٹیلوں پر پہنچنے کے لیے چڑھائی کی جانب بڑھا۔ کانسٹیبل اس کے ساتھ تھا۔

رحیم داد جھاڑیوں کی شاخوں کے پیچھے سے دونوں کو چوکنّا نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر جب اس نے انھیں اوپر آتے دیکھا تو سخت پریشان ہوا۔ وہ جنگلی پودوں کے درمیان سے کھسکتا ہوا غار میں داخل ہوگیا۔ غار کے ایک گوشے میں جاکے وہ دم بخود بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد سخت اور چٹیل زمین پر بھاری بھاری بوٹوں کی آواز ابھری، کھٹ کھٹ کھٹ۔ آواز قریب آتی گئی۔ رحیم داد کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ خوف اور ڈر سے اس کا چہرہ پسینے سے بھیگ گیا۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے جھاڑیوں کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

قدموں کی آہٹ عین غار کے سامنے سنائی دی۔ رحیم داد کو الجھی ہوئی شاخوں کے پیچھے انسپکٹر اور کانسٹیبل نظر آئے مگر وہ ان کا صرف نچلا دھڑ دیکھ سکا۔

کانسٹیبل کہہ رہا تھا۔ "لاش تو جی جیل کی وردی سے رحیم داد ہی کی لگتی ہے۔"

"لیکن اسے اتنی بے دردی سے کیوں قتل کیا گیا؟ لاش ایسی مسخ ہوگئی ہے کہ شناخت کرنا مشکل ہوگیا۔"

"میں تو یہ کہتا ہوں جی...."

رحیم داد کانسٹیبل کی پوری بات نہیں سن سکا۔ دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئے۔ ان کے قدموں کی آہٹیں دھیمی پڑگئیں تو رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ مگر وہ ہنوز خوف زدہ تھا۔ سہما ہوا چپ چاپ دونوں کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ، آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ لیکن وہ واپس نہیں آئے۔ پتھریلی زمین پر ان کے بوٹوں کی آواز نہ ابھری۔ ہر طرف گہری خاموشی چھاگئی تھی۔ غار میں اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ سائے پھیل کر اور طویل ہوگئے تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔



رحیم داد دیر تک ڈرا سہا بیٹھا رہا۔ نہ کوئی آہٹ ابھری نہ آواز آئی۔

وہ غار سے نکلا۔ جنگلی پودوں میں دبک کر گردن ذرا اونچی کی۔ ڈوبتے ہوئے دن کی ہلکی ہلکی روشنی میں حکیم کی لاش جھاڑی کے قریب پڑی تھی۔ مگر اب اس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ کچھ فاصلے پر دو کانسٹیبل بیٹھے لاش کی نگرانی کر رہے تھے۔ انسپکٹر دوسرے کانسٹیبلوں کے ہم راہ جائے واردات سے جاچکا تھا۔

رحیم داد بلندی سے لاش کی نگرانی کرنے والے کانسٹیبلوں کو دیکھتا رہا۔ سورج جنگل کے گھنے درختوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ برساتی نالے کے نشیب میں شام آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ فضا دھواں دھواں تھی۔ سناٹا بڑھتا جا رہا تھا۔

رحیم داد نے غار میں واپس جاکے ناشتے دان کھولا۔ ناشتے دان میں ابھی ایک روٹی باقی تھی۔ تھوڑا سا سالن بھی تھا۔ اس نے آدھی روٹی سالن سے کھائی اور آدھی ناشتے دان میں رکھ کر ڈھکنا بند کردیا۔

رحیم داد نے تھرماس سے پانی کے چند گھونٹ پیے اور غار سے باہر نکلنے کا ارادہ ترک کردیا۔

☆

پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد آنکھیں بند کیے چپ لیٹا تھا۔ کہیں قریب ہی گیدڑوں کی آوازیں گہرے سناٹے میں ابھریں۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عین اسی وقت نشیب میں کانسٹیبل زور سے کھنکارے۔ گیدڑوں کا غول غار کے سامنے سے گزرتا ہوا آگے نکل گیا۔ رحیم داد کو وہ دھندلی پرچھائیوں کے مانند نظر آئے۔ وہ دیر تک بیٹھا رہا۔ بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تو ایک بار پھر لیٹ گیا۔ رات گزرتی گئی، کالی سیاہ ہوگئی۔ سویرا ہونے سے کچھ دیر پہلے رحیم داد کی آنکھ لگ گئی۔ وہ گہری نیند سوگیا۔

آنکھ کھلی تو غار کے باہر دھوپ پھیلی تھی۔ وہ غار سے نکلا۔ پودوں کے درمیان دبک کر اس نے جھاڑیوں کی اوٹ سے نیچے دیکھا۔ چادر سے ڈھکی ہوئی حکیم نذر محمد چشتی کی لاش ابھی تک اپنی جگہ موجود تھی۔

لاش کی نگرانی پر تعینات رات والے دونوں کانسٹیبل جاچکے تھے۔ مگر انسپکٹر موجود تھا۔ اس کے ہم راہ پانچ کانسٹیبل بھی تھے اور لالی بھی تھا۔

رحیم داد نے پہلی ہی نظر میں لالی کو پہچان لیا۔ لالی کا لباس وہی تھا جو لائل پور سے پہن کر آیا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ کانسٹیبلوں کے درمیان خاموش کھڑا تھا۔ قریب ہی انسپکٹر مٹی کے تودے پر بیٹھا تھا۔ وہ گردن جھکائے مشیر نامہ لکھنے میں مصروف تھا۔ لکھتے لکھتے اس نے گردن اٹھائی اور ایک کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ کانسٹیبل نے بڑھ کر لاش پر پڑی ہوئی چادر ہٹادی۔

انسپکٹر کی ہدایت پر لالی لاش کے قریب گیا۔ اس نے جھک کر لاش دیکھی، پھر انسپکٹر کی جانب مڑ کر آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ انسپکٹر اس سے سوالات کرتا رہا۔ لالی جوابات دیتا رہا۔ رحیم داد اتنی دور بیٹھا تھا کہ دونوں کی بات چیت بالکل نہیں سن سکا۔ مگر یہ اندازہ ہوگیا کہ لالی نے لاش اسی کی بتائی ہے۔

لاش پھر ڈھانک دی گئی۔ انسپکٹر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ابھی اس کی تفتیش ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے گھوم پھر کر لاش کے آس پاس کی جھاڑیوں کا معائنہ کیا اور ٹیلے کے نیچے کھڑے ہو کر دیر تک اوپر دیکھتا رہا۔

رحیم داد نے اسی ٹیلے سے حکیم کے چہرے پر بھاری پتھر پھینکا تھا۔

انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ہم راہ ٹوبھے کی جانب بڑھا۔ اسے اپنی سمت آتا دیکھ کر رحیم داد گھبرا گیا۔ اس نے جھٹ گردن نیچے کی اور دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا غار میں چلا گیا۔ وہ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانس بھرنے لگا۔

خوف اور دہشت سے رحیم داد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے کان بھاری بوٹوں کی آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ رحیم داد پچھتانے لگا کہ رات کے اندھیرے میں اس مقام سے دور کیوں نہ چلا گیا۔ تمازت بڑھتی جا رہی تھی مگر ٹیلوں کی پتھریلی زمین پر بوٹوں کی آہٹ نہیں ابھری۔

رحیم داد سہما ہوا بیٹھا رہا۔ نشیب سے رک رک کر مدھم آوازیں ابھرتی رہیں۔ پھر یہ آوازیں بند ہوگئیں۔ گہرا سناٹا چھا گیا۔ لیکن رحیم داد غار سے باہر نہیں نکلا۔ خطرہ ابھی تک سر پر منڈلا رہا تھا۔

سورج چڑھ کر بیچ آسمان پر آگیا۔ دوپہر ہوگئی، گرمی بڑھ گئی۔ رحیم داد غار سے باہر آیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ٹوبھے کے پار دیکھا۔ مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ لاش بھی نہیں تھی۔ جس جگہ لاش پڑی تھی، وہاں پتھروں سے حصار بنادیا گیا تھا۔

رحیم داد نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں مگر ہر طرف ویرانی تھی۔ اسے اطمینان ہوا۔ چہرے سے خوف کے سائے مٹنے لگے۔ وہ دیر تک جنگلی پودوں کے درمیان بیٹھا رہا، پھر غار میں چلا گیا۔ اس



نے ناشتے دان میں پڑی ہوئی باسی روٹی نکالی۔ اسے کھا کے تھرماس سے پانی پیا۔ اب ناشتے دان بالکل خالی تھا لیکن تھرماس میں تھوڑا سا پانی موجود تھا۔ وہ پھر لیٹ گیا اور شام کے اندھیرے کا انتظار کرنے لگا۔

دن ڈھلے تک وہ سوتا رہا۔ بیدار ہوا تو پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے تھرماس منہ سے لگایا اور اسے خالی کردیا۔

لالی کا دیا ہوا چاقو اس کے پاس موجود تھا۔ اس نے جیب سے چاقو نکالا اور غار کے دہانے سے ذرا ہٹ کے گڑھا کھودا۔ گڑھے میں تھرماس، ناشتے دان، مقتول کی ٹوپی اور سنکھنی کی پتیوں سے بھرا ہوا تھیلا رکھ دیا۔

اس نے گڑھا مٹی سے بھر دیا۔ جنگلی پودوں کی شاخیں اور پتھروں کے ٹکڑے اس طرح بکھیر دیئے کہ گڑھا بالکل چھپ گیا۔

رحیم داد غار میں نہیں گیا۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھا رہا۔ وہ بار بار اس طرف دیکھتا، جہاں اب لاش کی جگہ صرف پتھروں کا حصار رہ گیا تھا۔

سورج کا دہکتا ہوا الاؤ سرد پڑ گیا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں میں پرندے شور مچا رہے تھے۔ پھیکی پھیکی دھوپ غائب ہوتی گئی۔ اندھیرا دم بدم پھیلتا گیا۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ فراش کے اونچے اونچے درخت دم بخود نظر آرہے تھے۔

رحیم داد جھاڑیوں سے باہر نکلا۔ اس نے چوکنّا نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔

وہ آگے بڑھا اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا ٹیلوں اور ٹبّوں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ اس نے میل، سوا میل راستہ طے کیا۔ برساتی نالے کے نشیب میں اترا اور خشک ریت پر چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

برساتی نالا دائیں ہاتھ کو نیم دائرہ بناتا ہوا کچھ دور جا کر اونچے اونچے ٹیلوں کی اوٹ میں اوجھل ہوگیا تھا۔ وہ اسی طرف مڑ گیا۔ کچھ دور تک ٹیلوں کے درمیان چلتا رہا، اس نے سک نالا عبور کیا اور دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔

سامنے چڑھائی تھی۔ وہ ناہموار راستوں پر چلتا ہوا بلندی پر پہنچ گیا۔ دور دور تک اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبّے پھیلے ہوئے تھے۔

وہ رکا نہیں بلکہ قدموں کی رفتار کچھ اور تیز کردی اور جھاڑیوں اور خود رو جنگلی پودوں کے

درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے' اور آگے بڑھتا گیا۔

ٹیلوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس نے ٹھٹک کر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور نشیب میں اترنے لگا۔ سامنے کچا راستہ تھا۔ دن میں اس راستے پر آمد و رفت رہتی ہوگی۔ لیکن اس وقت سنسان تھا۔ وہ اس راستے پر چلنے لگا۔



# ۱۴

شام کا دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔ رحیم داد چلتے' چلتے ایک دم چونکا۔ اسے کچھ فاصلے پر دھندلی' دھندلی روشنی میں سڑک کنارے ایک سائیکل نظر آئی۔ قریب ہی ایک شخص زمین پر بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی تھی۔ آنکھیں اندر دبی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر رحیم داد ٹھٹکا۔ اس نے چاہا کہ آگے نکل جائے مگر یہ سوچ کر ٹھہر گیا کہ آگے جانے سے پہلے اس شخص سے راستے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرلے۔ ڈرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ وہ شخص تنہا تھا اور لاغر بھی تھا۔

رحیم داد اس کی جانب بڑھا۔ "میں نے کہا جی! یہ رستہ کدھر جاتا ہے؟"

"یہ رستہ تو تخت ہزارہ جاتا ہے۔" اس شخص نے گردن اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ "تخت ہزارہ جانا ہے تو سدھا چلا جا۔ تجھے وہیں جانا ہے نا؟"

وہ شخص دھیرے دھیرے ہانپتا رہا۔ رحیم داد نے ہمدردی سے دریافت کیا۔ "تسیں کچھ بیمار ہو؟"

"ہاں جی' بیمار ہی ہوں۔ بخار آتا ہے حکیم' ڈاکٹر ٹی۔بی بتاتے ہیں۔"

"جب اتنا بیمار ہے تو سیکل نہیں چلانی چاہئے۔"

"کہتا تو ٹھیک ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "حکیم نے بھی سیکل چلانے سے منع کیا ہے پر ایک کام ایسا پڑ گیا کہ سیکل اٹھائی اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ قادر آباد گیا تھا۔ اب واپس جا رہا ہوں۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"چک ۵۸' رستے ہی میں پڑتا ہے۔" اس کے لہجے میں عاجزی آگئی۔ "توں ادھر ہی جا رہا ہے۔ سیکل چلانی جانتا ہو تو مجھے چک تک چھوڑ دے۔ تیری مہربانی ہوگی۔ میرا پنڈ بہت دور نہیں۔ تین، ساڑھے تین میل سے زیادہ نہیں ہوگا۔"

رحیم داد کو سائیکل چلانا آتی تھی۔ وہ جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا بھی چاہتا تھا۔ اس نے سائیکل کا ہینڈل تھاما' اس شخص سے کہا۔ "آگے بیٹھ جا۔ مجھے بھی اسی طرف جانا ہے۔ تجھے چک ۵۸ پہنچا دوں گا۔"

وہ اپنی پگڑی درست کرتا ہوا اٹھا اور سائیکل پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد سائیکل پر سوار ہوا اور آہستہ آہستہ چلانے لگا۔ سائیکل چلاتے چلاتے رحیم داد نے پوچھا۔ "گھر میں تیرا اور کوئی نہیں جو بیماری میں سیکل چلانی پڑی۔ کوئی تو ہوگا ہی؟"

"نہیں جی' میرا ادھر کوئی نہیں۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔ میرا ناں چوہدری نور الٰہی ہے۔ میں گورداس پور کا مہاجر ہوں۔ پچھلے کئی مہینے سے ادھر چک ۵۸ میں ہوں۔"

"تیرے بال بچے تو ہوں گے؟ وہ کہاں ہیں؟"

"یہ نہ پوچھ۔" چوہدری نور الٰہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پورا ٹبر تھا۔ گھر والی تھی۔ دو بیٹیاں تھیں' تین پتر تھے۔ وڈا پتر تو جوان تھا۔ ۱۷ سال کا رہا ہوگا۔ گورنمنٹ سٹی ہائی اسکول' پٹیالہ میں دسویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ اب وہ ۲۵ سال کا ہوتا۔"

"کدھر ہے وہ؟" رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

"وہ تریموں کے پتن پر میرے سامنے شہید ہوا۔" نور الٰہی بجھے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ "پاکستان بنا تو میں نصیرپور میں تھا۔ نصیرپور' ضلع گورداس پور کا موضع ہے۔ میں پہلے تو ریاست پٹیالہ کے ضلع نارنول میں تھا۔ محلہ لوہاراں میں اپنا مکان بھی تھا۔ جب وہاں گڑبڑ مچی تو مہاراجہ کے حکم پر فوج اور پولیس کے سارے مسلمانوں سے ہتیار رکھوالیے گئے۔ ان کو غیر مسلح کر کے بہادر گڑھ فورٹ میں بھیج دیا گیا۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ لیکن میں وہاں ہفتہ بھر بھی نہ رہا۔ ایک رات جب بارش ہو رہی تھی میں فورٹ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ میرے ساتھ ریاست کے دو مسلمان فوجی بھی تھے۔"

"ان دونوں کا کیا بنا؟"

"پتہ نہیں رات کے اندھیرے میں کدھر نکل گئے۔" چوہدری نور الٰہی نے رحیم داد کو بتایا۔ "گھر والی اور بچوں کو میں نے پہلے ہی نصیرپور بھیج دیا تھا۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح نصیرپور پہنچ گیا۔ ویسے



میں رہنے والا نصیرپور ہی کا ہوں۔ وہاں اپنی زمیں داری تھی۔ شریکے اور کنبے دار تھے۔ پٹیالے میں تو میں نوکری کرتا تھا۔ پولیس میں حوالدار تھا۔ اس وقت سب یہی کہتے تھے گورداس پور تو پاکستان کے حصے میں آئے گا۔ مسلمان تھے بھی وہاں زیادہ' پر نصیرپور کے آس پاس دس باراں میل تک سکھوں کی بستیاں تھیں۔ مسلمانوں کو ذرا بھی فکر نہ تھی۔ مسلمان افسر تو اتنے جوش میں تھے کہ انھوں نے سرکاری دفتروں پر پاکستانی جھنڈے لہرا دیئے۔ فیر ایسا ہوا جی نصیرپور والے عید کا چاند دیکھ رہے تھے۔ اتیسواں یا تیسواں روزہ تھا۔ ٹھیک سے کچھ یاد نہیں۔ بیماری سے اب تو دماغ بھی کام نہیں کرتا پر اتنا ضرور یاد ہے۔ میں چھت پر ممٹی کے پاس کھڑا چاند دیکھ کر دعا مانگ رہا تھا۔ ابھی میں نے دعا ختم بھی نہیں کی تھی کہ سکھوں کی بستیوں کی طرف سے بہت زور کے دھماکے ابھرے۔"

وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ ذرا قرار آیا تو بتانے لگا۔ "میں نے گھبرا کر دیکھا' سامنے رڑی میں پنڈ کا ایک نوجوان تیزی سے سیکل دوڑاتا چلا آرہا ہے۔ اس کے کپڑوں پر خون ہی خون تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اور زور زور سے چیخ رہا تھا۔ فساد ہوگیا' فساد ہوگیا۔ شور سن کر پنڈ کے لوگ اس کے اردگرد اکٹھے ہونے لگے۔ میں باہر جانے کے لیے بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں' مغرب کی طرف گرد کے بادل اٹھ رہے ہیں۔ سکھوں کے غول کے غول گھوڑے دوڑاتے ادھر ہی آرہے ہیں۔ سکھوں کی بستیوں سے بھی ڈھول اور سنکھ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔" اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔

"میری گل سن رہا ہے؟"

رحیم داد نے اس کی طرف توجہ دیئے بغیر آہستہ سے کہا۔ "سن رہا ہوں۔" اسے نور الٰہی کی باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ منٹگمری میں مدت تک مہاجر کیمپ قائم رہ چکا تھا۔ ضلع بھر میں مہاجر جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔

رحیم داد ان لٹے پٹے مہاجرین سے مل چکا تھا۔ ان کی زبانی سکھوں اور ہندوؤں کے حملوں کی ایسی ہی ہول ناک داستانیں سن چکا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر سائیکل چلاتا رہا۔

"ہاں تو جی' میں یہ کہہ رہا تھا۔" نور الٰہی چند لمحے خاموش رہ کر گویا ہوا۔ "میں چھت سے اتر کر بھاگتا ہوا رڑی میں پہنچا۔ پنڈ کے سارے ہی لوگ بھاگ کر وہاں پہنچ رہے تھے۔ سب پریشان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ پورے پنڈ میں کسی کے پاس ایک بھی بندوق نہیں تھی۔ صرف برچھیاں'

کلہاڑیاں اور ڈانگیں تھیں۔ انھی کو لے کر سب نے پنڈ کی حفاظت کے لیے فٹافٹ تمام ناکوں پر مورچے سنبھال لیے۔ سکھ حملہ آور گھوڑے دوڑاتے چلے آرہے تھے۔ وہ نزدیک آگئے پر انھوں نے حملہ نہیں کیا۔ وہ پنڈ سے کوئی فرلانگ بھر دور ٹھیر گئے۔ نہ وہ آگے بڑھے نہ نصیرپور والوں نے انھیں للکارا۔ حملہ آور تعداد میں پنج سو سے اوپر رہے ہوں گے۔ ادھر مسلمان تین سو سے بھی کم تھے۔ نہ بندوق تھی نہ کسی کے پاس پستول تھا۔" نورالٰہی نے گہری سانس بھری۔ "حملہ آور چپ کر کے کھڑے تھے۔ ان کے گھوڑے زور زور سے ہنہنا رہے تھے۔ سکھ بستیوں سے ڈھول اور سکھ کی آوازیں مسلسل ابھر رہی تھیں۔"

"چوہدری' انھوں نے حملہ کیوں نہیں کیا؟"

"وہ جی ڈر گئے تھے۔ اس مغالطے میں رہے کہ نصیرپور کے مسلمانوں کے پاس بہت اسلحہ ہے۔ ان کا خیال غلط بھی نہیں تھا۔ گورداس پور کے مسلمانوں کے لیے اسلحہ پہنچا بھی تھا۔ اس میں زیادہ تعداد میں رائفلیں اور بندوقیں تھیں۔ ضلع کا ایس پی مسلمان تھا۔ پر گورداس پور کے لیگیوں نے یہ اسلحہ مسلمانوں کو دینے کی بجائے ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ مسلمانوں کے پاس ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں اتنا پیسہ ہی کہاں تھا۔ انھوں نے چندا کر کے جو اسلحہ حاصل کیا' وہ بھی ہندوؤں اور سکھوں کو منہ مانگے دام دے کر خریدا تھا۔ ذرا غور تو کر۔ کیسا ظلم ہوا۔ انھی دنوں مجھے کسی نے بتایا بٹالہ کے ایک سکھ زمیں دار نے کسی مسلم لیگی سے رائفل خریدی اور قیمت اپنے گھر چل کر دینے کے بہانے اسے ایک ویران جگہ لے گیا۔ وہاں اس نے کرپان نکالی اور پیسے دینے کی بجائے اس بے غیرت کے پیٹ میں پوری اتار دی۔ وہ وہیں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ ٹھیک ہی ہوا۔ ایسوں کو ایسی ہی سزا ملنی چاہیے۔"

رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ "چوہدری! توں تو سکھ حملہ آوروں کی گل کر رہا تھا؟"

"ہاں جی' یاد آگیا۔" نورالٰہی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ "ہوا یہ کہ سکھ حملہ کرنے سے ڈر رہے تھے اور ادھر مسلمان انتظار میں تھے' سکھ حملہ کریں تو وہ بڑھ کر ان کا مقابلہ کریں۔ اس شش و پنج میں بہت دیر ہو گئی۔"

وہ کھانسنے لگا۔ "فیر ایک عجب گل ہوئی۔ نصیرپور میں ایک سائیں جی تھے۔ وہ پنڈ کے قبرستان کی دیکھ بھال کرتے تھے اور اس کے پاس ہی جھگی میں رہتے تھے۔ بالکل اکیلے تھے' نہ گھر والی نہ بچے۔ پنڈ والے جو دیتے' وہی کھا پی کر گزارا کرتے۔ ادھر تو سب ڈرے سہمے ہوئے تھے۔ ادھر کیا دیکھتے ہیں' سائیں جی کندھے پر تلوار رکھے ایک طرف سے نکلے۔ بڑے زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ پنڈ



والوں کی طرف منہ کیا' ڈپٹ کر انھیں للکارا۔ اوئے تسیں' مسلمان ہو کر ڈرتے ہو۔ میں اللہ کا نام لے کر اکیلا ہی حملہ کروں گا۔ میرے رب نے چاہا تو سب حملہ آوروں کو بھگا دوں گا۔ سائیں جی نے دوبارہ نعرہ تکبیر بلند کیا اور تیزی سے حملہ آور سکھوں پر جھپٹے۔ سائیں جی کو اکیلے بڑھتے دیکھا تو پنڈ کے مسلمانوں کی غیرت بھی جاگ اٹھی۔ سو جوانوں کو پنڈ کی حفاظت پر لگا کر سب سائیں کے پیچھے پیچھے چلے' پر سائیں جی پہلے ہی حملہ آور سکھوں کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔ گھوڑے زور زور سے ہنہنانے لگے۔ گرد کے بادل اٹھنے لگے۔ نزدیک جا کر دیکھا تو حملہ آور بھاگ چکے تھے۔ تین چار سکھ خون میں لت پت زمین پر پڑے تھے۔ سائیں جی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ذرا دیر بعد دور سے سائیں کی آواز آئی' بڑھے چلے آؤ۔ نکل کر جانے نہ دینا۔ پنڈ والے آگے بڑھے۔ پر حملہ آور اپنے گھوڑے بھگاتے دور جا چکے تھے۔ سائیں جی تلوار سونتے ان کے پیچھے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ سب نے پکار کر انھیں آگے جانے سے روکا۔ سائیں واپس ہوئے تو جگہ جگہ سے ان کا بدن زخمی تھا۔ زخموں سے لال لال خون بہہ رہا تھا۔ انھوں نے اپنے سر پر بڑی سی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ اس پر بھی خون کے دھبے تھے۔ مگر زخمی ہونے پر بھی سائیں کا حوصلہ ویسا ہی تھا۔ وہ تو یہ چاہتے تھے' پٹیالے کی ملٹری پہنچنے سے پہلے پہلے آس پاس کی سکھ بستیوں پر چڑھائی کر دی جائے تاکہ انھیں دوبارہ حملے کی جرات نہ ہو' پر پنڈ کے دوسرے مسلمان تیار نہیں ہوئے۔"

رحیم داد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "سائیں بہت زور آور تھا۔ اکیلے نے اتنے بہت سے سکھوں کو بھگا دیا۔"

"ہاں جی' بہت زور آور تھا۔" نورالٰہی نے اس کی تائید کی۔ "حملہ آوروں کو بھگانے کے بعد آگے کا حفاظتی پروگرام طے کیا جا رہا تھا کہ دور سے تیز روشنیاں دکھائی دیں۔ یہ روشنیاں اس طرف سے نہیں ابھر رہی تھیں جدھر سکھ حملہ آور بھاگ کر گئے تھے۔ یہ ریاست پٹیالہ کی ملٹری تھی۔ سکھ فوجی جیپوں اور لاریوں پر مشین گنیں لگائے نصیرپور کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جیسے ہی ریاستی ملٹری کے حملے کا پتہ چلا' سب تیزی سے پنڈ کی طرف لوٹے۔ پر مسلح ملٹری کا حملہ کون روک سکتا تھا۔ سمجھ نہیں آتی تھی کیا کریں۔ فوجی جیپوں اور لاریوں کی تیز روشنی دم بہ دم نزدیک آتی جا رہی تھی۔ ملٹری کا نام سن کر بوڑھے' بچے اور زنانیاں' سبھی گھروں سے نکل نکل کر باہر آگئے۔ موت سروں پر منڈلا رہی تھی۔ سب گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگے۔"

"ریاستی ملٹری آئی بھی کہ نہیں؟"

"آئی تھی' بالکل آئی تھی۔ پر گیانی ہرنام سنگھ نے سب کو بچا لیا۔"

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "ہرنام سنگھ بھی تو سکھ ہی تھا ناں؟"

"ہاں جی۔ وہ سکھ ہی تھا۔" نورالٰہی نے مستعدی سے جواب دیا۔ "وہ بوڑھا سکھ تھا اور نصیرپور ہی میں رہتا تھا۔ ملٹری کو اس نے نصیرپور کی طرف آتے دیکھا تو بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا اور چیخ چیخ کر سب سے کہنے لگا۔ اوئے مسلو! فٹافٹ چھپ جاؤ۔ فصلوں میں گھس کر بیٹھ جاؤ۔ ریاستی ملٹری حملہ کرنے آ رہی ہے۔ جھٹیتی کرو جھٹیتی‘ میں منت کر کے سکھ فوجیوں کو واپس بھیج دوں گا۔ اس کے مشورے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ سب کھیتوں کی جانب دوڑے اور فصلوں میں گھس کر اندھیرے میں چھپ گئے۔ فوجی جیپیں اور لاریاں دھیرے دھیرے نزدیک آتی گئیں۔ پنڈ کے نزدیک پہنچ کر رک گئیں۔ گیانی ہرنام سنگھ اندھیرے سے نکل کر سکھ کمانڈر کی جانب بڑھا۔ ادھر پنڈ کے سارے مسلمان فصلوں میں دبکے سانس روکے بیٹھے تھے۔ ماؤں نے بچوں کے منہ ہاتھوں سے دبا رکھے تھے تاکہ کسی بچے کے رونے اور بولنے کی آواز نہ ابھرے۔ ادھر بوڑھا ہرنام سنگھ فریادیوں کی طرح گلے میں پگڑی ڈالے سکھ فوجی کمانڈر کے آگے ہاتھ جوڑے گڑگڑا رہا تھا۔ سردار جی! پنڈ کے سارے ہی مسلے چلے گئے۔ یہاں سے جاتے ہوئے انھوں نے اپنے سامان کو بھی آگ لگا دی‘ کچھ بھی نہ چھوڑا۔ کمانڈر جیپ سے اترا اور آگے بڑھ کر غصے سے ہرنام سنگھ کے منہ پر دو تین چپیڑیں ماریں۔ چیخ کر بولا۔ بڈھے کھوسٹ‘ تو نے فوراً ہمیں اطلاع کیوں نہیں پہنچائی؟ ہم سارے مسلوں کو ختم کر دیتے‘ انھیں نکل کر نہ جانے دیتے۔ ہرنام سنگھ مار کھا کر بھی گڑگڑاتا رہا‘ معافی مانگتا رہا۔ اس کے سر کے کیس کھل کر بکھر گئے تھے۔ وہ رو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سکھ فوجی گالاں نکالتے ہوئے جدھر سے آئے تھے‘ اسی طرف لوٹ گئے۔"

"ہرنام سنگھ بہت نیک بندہ تھا۔" رحیم داد نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

"بہت ہی نیک بندہ تھا جی۔ ملٹری کے جاتے ہی زور کی بارش شروع ہو گئی۔ کھیتوں سے باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ سب بھوکے پیاسے بھی تھے۔ بوڑھا ہرنام سنگھ ایک ایک کھیت کے اندر جاتا۔ کھانے کو روٹی پہنچاتا۔ زنانیوں کو تسلی دیتا۔ بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرتا۔ سب کے حوصلے بڑھاتا۔ کہتا‘ فکر نہ کرو۔ حوصلے سے کام لو۔ واہ گرو کی کرپا سے سب ٹھیک ہی ہو گا۔ روٹی کھلا کر دو سائیں جی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دونوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔" نورالٰہی نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "خطرہ ابھی تک سروں پر منڈلا رہا تھا۔ ریاستی ملٹری کو آس پاس کی بستیوں کے سکھوں سے خبر ہو سکتی تھی کہ نصیرپور کے مسلمان ابھی تک پنڈ میں موجود ہیں۔ یہ خبر ملتے ہی سکھ فوراً لوٹتے اور کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑتے۔ یہ خطرہ محسوس کرتے ہوئے سائیں جی اور گیانی ہرنام سنگھ نے اسی



رات پنڈ سے نکل بھاگنے کی سکیم بنائی۔ جو جس حالت میں تھا‘ ویسے ہی چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ سب قافلہ بنا کر نصیرپور سے نکلے۔ مڑ مڑ کر گھروں کو دیکھتے اور پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے۔ سائیں جی اور ہرنام سنگھ تلواریں اٹھائے آگے‘ آگے چل رہے تھے۔ بارش اب رک گئی تھی۔ قافلہ رات کے اندھیرے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ چلتے چلتے ہم تریموں کے پتن پر پہنچ گئے۔ سامنے راوی بہہ رہا تھا اور اس پار پاکستان کی سرحد شروع ہوتی تھی۔"

"چوہدری! تیری گھروالی اور بچے بھی ساتھ ہی تھے؟"

"تریموں کے پتن تک تو ساتھ ہی تھے۔" نورالٰہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہم نے صرف راوی پار کرنا تھا۔ پر راوی پار کرنا آسان نہیں تھا۔ پتن پر صرف چند بیڑیاں اور کشتیاں تھیں۔ ملاح دریا کے اس پار لے جانے کے سو روپے فی سواری مانگتے تھے۔ ادھر مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ سبھی لٹے پٹے تھے۔ جیبوں میں چند روپے تھے یا تمباکو اور نسوار کی تھیلیاں تھیں۔ ملاح بھی مسلمان تھے۔ پر وہ تو زیادہ سے زیادہ کمائی پر لگے تھے۔ ایسے ظالم اور بے درد تھے‘ جب مسافر منہ مانگا کرایہ دینے پر جھگڑا ٹنٹا کرتے تو وہ بیڑی بیچ دریا میں کھڑی کر دیتے۔ اوپر سے تیز بارشیں ہو رہی تھیں۔ دریا چڑھا ہوا تھا۔ لہروں کے تیز بہاؤ میں ملاحوں کی ان بدمعاشیوں سے تین بیڑیاں تو میرے سامنے ڈوبیں۔ کہتے ہیں ان میں ۱۹۲ مسافر تھے۔ صرف ۱۴ بچے۔ دوسرے سب دریا کے پیٹ میں چلے گئے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ڈلہوزی سے بٹالے تک جتنے بھی مسلمان تھے‘ ان کے لیے پاکستان پہنچنے کا یہی رستہ تھا۔ ویسے گورداسپور کے کتنے ہی لٹے پٹے قافلے داؤد کے پتن بھی پہنچے‘ پر وہاں امرتسر سے آنے والے زیادہ تھے۔ ملاح ادھر بھی اسی طرح تنگ کرتے تھے۔ راوی کے پار پہنچانے کے لیے اپنی مرضی کا کرایہ وصول کرتے تھے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"تریموں کے پتن کا ان دنوں حال یہ تھا کہ ندی کنارے ہزاروں مسلمان پڑے تھے۔ روز نئے قافلے پہنچتے تھے۔ میرے پاس اس وقت اچھی خاصی رقم تھی۔ میں ملاحوں کو کرایہ دے کر دریا کے پار اپنے ٹبر کے ساتھ جا سکتا تھا۔ پر سب نے منع کیا اور ناراض ہوئے کہ تم اپنے فائدے کے لیے دوسرے غریب بندوں کا بیڑا غرق کر دینا چاہتے ہو۔ ساتھ ہی یہ خبریں بھی سننے میں آ رہی تھیں کہ حکومت پاکستان نے کشتیاں اور ملٹری کے سٹیمر بھیجے ہیں‘ جو مہاجرین کو مفت دریا پار پہنچا دیں گے۔"

سڑک کے دونوں جانب ربیع کی فصلیں تھیں‘ جن میں ہوا کے جھونکوں سے رک رک کر

سرسراہٹیں ابھر رہی تھیں۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ رحیم داد چپ چاپ سائیکل چلاتا رہا۔ نورالٰہی آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ”روز کشتیوں اور سٹیمروں کا انتظار کیا جاتا۔ پر نہ کشتیاں اور بیڑیاں آئیں نہ سٹیمر۔ دوسری طرف تریموں کے پتن پر لٹ پٹ کر آنے والے مسلمانوں کی تعداد ہر روز بڑھتی جا رہی تھی۔ پتن پر دریا کے کنارے جہاں تک نظر جاتی، بندے ہی بندے نظر آتے۔ ان میں بوڑھے تھے، جوان تھے، زنانیاں تھیں اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ بارش تھم جاتی۔ پھر شروع ہو جاتی اور مسلسل ہوتی رہتی۔ کہیں چھپنے کی جگہ نہیں تھی۔ سب کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے بھیگتے رہے، کشتیوں، سٹیمروں کا انتظار کرتے رہے۔ ملاح پار لے جانے کا کرایہ کم کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھے۔ وہ تو دبا کے کمائی کر رہے تھے۔ تباہ حال مہاجرین کی بے بسی اور پریشانی سے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ کئی بار مغربی پنجاب کی حکومت کے ہوائی جہاز بھی دریا کے اوپر اڑتے دکھائی دیے۔ کسی نے بتایا، اس میں وزیر سوار ہیں۔ پتن پر پڑے ہوئے مہاجروں کا معائنہ کرنے آئے ہیں۔ جب بھی جہاز نظر آتے ہر طرف یہ خبریں پھیل جاتیں سرکاری بیڑیاں اور کشتیاں آنے والی ہیں۔“

وہ کچھ دیر کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ آخر نورالٰہی کی آواز ابھری۔ ”اس روز بارش تھمی ہوئی تھی۔ آسمان بالکل صاف اور نیلا نیلا نظر آ رہا تھا۔ سورج ایسے چمک رہا تھا جیسے آگ برسا رہا ہو۔ بہت سخت گرمی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اچانک دور سے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی پڑی۔ ذرا دیر بعد سکھوں کے غول کے غول گھوڑے دوڑاتے نظر آئے۔ دو ہزار سے زیادہ ہی تھے، کم نہیں۔ حملہ آوروں کو دیکھتے ہی جس کا جدھر منہ اٹھا، بھاگا اور نزدیک کے کھیتوں میں گھس گیا۔ میں بھی بھاگ کر فصلوں میں چھپ گیا۔ ہر طرف سے چیخنے چلانے اور زنانیوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ میں کھیت میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ سکھ حملہ آور خون میں ڈوبی ہوئی تلواریں اٹھائے، بندوقوں سے گولیاں چلاتے اپنے گھوڑوں سے کھیت روندتے پھر رہے تھے۔ جو نظر آتا، اسے قتل کر دیتے۔ پتہ نہیں، میں کیسے بچ گیا۔ وہیں مر جاتا تو ٹھیک تھا۔“

چوہدری نورالٰہی کے لہجے میں درد کی چبھن تھی۔ اس نے لمبی سانس لی۔ ”سورج ڈوبا تو میں کھیتوں سے باہر نکلا۔ اب حملہ آور جا چکے تھے۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ زخمی خون میں ڈوبے ہوئے تڑپ رہے تھے، کراہ رہے تھے۔ زنانیوں اور بچوں کے رونے اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں لاشوں اور زخمیوں کے درمیان ادھر ادھر پاگلوں کی



طرح گھوم رہا تھا۔ اپنے بال بچوں کو تلاش کر رہا تھا۔ پتن کے پاس سائیں جی اور گیانی ہرنام سنگھ زخموں سے چور پڑے تھے۔ دونوں مر چکے تھے۔ وہ آخر دم تک حملہ آوروں کے سامنے ڈٹے رہے۔ نزدیک ہی میرا وڈا پتر کرم الٰہی پڑا تھا۔ وہ تب تک زندہ تھا اور بے چینی سے ادھر ادھر گردن ہلا رہا تھا۔ میں اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا، کراہتے ہوئے بولا۔ وہ، وہ صابرہ کو لے گئے۔ وہ مجھے پکارتی رہی پر میں اسے بچا نہیں سکا۔ وہ اسے لے گئے۔ صابرہ میری ۱۶ سال کی جوان بیٹی تھی۔ سکھ حملہ آور اسے اٹھا کر لے گئے۔ کرم الٰہی یہی بتانے کے لیے زندہ تھا۔ اس نے میرے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔“ نورالٰہی گلوگیر ہو گیا۔

رحیم داد ہمدردی کا اظہار بھی نہ کر سکا۔ وہ پھولی ہوئی سانس سے پیڈلوں پر پیر مارتا سائیکل دوڑاتا رہا۔ نورالٰہی نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بتایا۔ ”شام ہو گئی تھی۔ میں کھیتوں کے اندر گھس گیا اور اندھیرے میں اونچی آواز سے گھر والی اور بچوں کو پکارنے لگا، پر گھر والی یا بچوں میں سے کسی کی آواز سنائی نہ دی۔ کچھ ہی دیر بعد فیر شور مچا، سکھ حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ دور سے گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ پتن پر ایک بیڑی کھڑی تھی۔ ملاح دریا پار لے جانے کے اڑھائی سو روپے مانگتے تھے۔ میں نے ایک بار فیر چیخ چیخ کر گھر والی اور بچوں کے نام لے کر ہانک لگائی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ اب صاف سنائی پڑ رہی تھیں۔ میں نے ملاح کے ہاتھ میں کرائے کے اڑھائی سو روپے رکھے اور بیڑی میں سوار ہو گیا۔ اس طرح میں سب کچھ لٹا کر پاکستان پہنچا۔“ نورالٰہی چپ ہو گیا۔

☆

سائیکل کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کچے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ کچھ دور آگے جا کر گاؤں کے گھروں میں جلنے والے چراغوں کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ روشنیاں دیکھ کر نورالٰہی نے کہا۔

”لو جی، چک ۵۸ آ گیا۔“

رحیم داد سائیکل چلاتا ہوا گاؤں میں داخل ہوا۔ نورالٰہی راستہ بتاتا رہا۔ اس کا گھر گاؤں کے شروع ہی میں تھا اور الگ تھلگ بھی تھا۔ گھر کے آس پاس نیم اور شیشم کے گھنے درخت تھے۔ گھر کے قریب پہنچ کر رحیم داد نے سائیکل ٹھہرالی۔ دونوں نیچے اترے۔ دروازے پر تالا تھا۔ نورالٰہی نے تالا کھولا۔

دونوں اندر داخل ہو گئے۔ چھوٹا سا مکان تھا۔ ایک کمرہ اور اس کے ساتھ کوٹھری تھی۔ کمرے

کے آگے برآمدہ تھا جس پر پھوس کا چھپر تھا۔ البتہ آنگن کشادہ اور کھلا ہوا تھا۔ گھر پر ویرانی چھائی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ نورالٰہی نے سائیکل اپنے ہاتھ میں سنبھالی اور چھپر کے نیچے ایک طرف دیوار سے ٹکا کر کھڑی کردی۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا' اندر گیا۔ طاق سے ماچس اٹھائی اور لالٹین روشن کردی۔

دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہوکر نورالٰہی نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ "باہر کیوں کھڑا ہے۔ اندر آجا۔ ذرا دیر آرام کرلے فیر چلا جانا۔"

رحیم داد چپ چاپ کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں چارپائی بچھی تھی۔ اس پر ملگجا بستر تھا۔ بستر کے قریب کی دیوار میں طاق تھا۔ طاق میں دوا کی دو شیشیاں رکھی تھیں۔ کوٹھری کا دروازہ بھی کمرے ہی میں کھلتا تھا مگر اس وقت بند تھا۔

کوٹھری سے ذرا ہٹ کر روشن دان جیسی کھلی کھڑکی تھی جس پر حفاظت کے لیے درختوں کی سوکھی شاخیں کیلوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کے باہر گہرا اندھیرا تھا۔ کھڑکی سے ہلکے ہلکے جھونکے آرہے تھے۔ پھر بھی کمرے میں گرمی تھی۔ نورالٰہی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہاں گرمی تو ہے پر میں یہیں سوتا ہوں۔ مجھے بخار رہتا ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر ماتھے پر رکھا۔ "اس وقت بھی بخار ہے۔ زیادہ ہی تیز لگتا ہے۔" وہ آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ "ٹی بی بھی بہت موذی روگ ہے۔ ایک بار لگ جائے فیر نہیں جاتا۔"

رحیم داد کو شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے نورالٰہی سے پوچھا۔ "چوہدری! گھر میں پانی تو ہوگا؟"

"ضرور ہوگا۔" اس نے کونے میں رکھے ہوئے گھڑے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ رہا پانی' پوری طرح پیاس بجھالے۔ مجھے بھی پانی پلا دے۔"

رحیم داد گھڑے کے پاس گیا۔ قریب ہی المونیم کا گلاس رکھا تھا۔ اس نے گلاس اٹھا کر پانی سے بھرا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ گلاس میں دوبارہ پانی انڈیلا اور اسے لے کر نورالٰہی کے قریب پہنچا۔ نورالٰہی نے گلاس لیتے ہوئے رحیم داد کو مشتبہ نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے پوچھا۔ "تیری قمیص کی آستین اور شلوار پر یہ خون کیسا لگا ہے؟" وہ چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا۔ "مجھے قادر آباد میں پتہ چلا تھا کہ نہرباری دو آب کے اس پار ادھر ٹبوں پر ایک مفرور قیدی کو کسی نے قتل کردیا۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔ "تیرا تو اس واردات میں کوئی ہاتھ نہیں؟" نورالٰہی کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔



رحیم داد کا چہرہ فق ہوگیا۔ مگر اس نے خود کو سنبھال لیا' مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں چوہدری ایسی کوئی گل نہیں۔" وہ مڑا اور دیوار کے قریب رکھے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

نورالٰہی گلاس منہ سے لگا کر دھیرے دھیرے پانی پینے لگا۔ وہ نظریں اٹھا کر بار بار رحیم داد کو دیکھتا رہا۔ پانی پی کر اس نے گلاس فرش پر رکھ دیا۔ یکایک کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام کر دیر تک کھانستا رہا۔ کھانستے کھانستے نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ لمبی لمبی سانس بھر رہا تھا اور خاصا بے چین نظر آرہا تھا۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ نورالٰہی کو قرار آگیا تھا مگر اس نے رحیم داد سے بات نہیں کی۔ خاموش لیٹا رہا اور نظریں اٹھائے چھت تکتا رہا۔ باہر اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ سکوت زیادہ دیر نہیں رہا۔ باہر دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی۔ ساتھ ہی آنگن میں کسی کی چاپ سنائی دی۔

نورالٰہی نے کروٹ بدل کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ دھیرے سے بولا۔ "جیناں روٹی لے کر آئی ہے۔" اس نے کوٹھری کے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ "کوٹھری میں چلا جا۔"

رحیم داد نے گھبرا کر اسے دیکھا' اٹھا اور کوٹھری میں داخل ہوکر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ وہ خوف زدہ اور سہما ہوا تھا۔ اسے جیناں کی آواز سنائی دی۔ وہ کمرے میں پہنچ کر نورالٰہی سے کہہ رہی تھی۔ "چوہدری! توں نے بہت دیر کردی۔ میں روٹی لے کر پہلے بھی آئی تھی۔"

"ہاں' واپسی میں کچھ زیادہ دیر ہوگئی۔"

"کچھ پتہ چلا؟" جیناں نے پوچھا۔ "توں کادر آباد اپنی گھر والی اور بچوں کا کھوج لگانے ہی تو گیا تھا ناں؟"

"ہاں جیناں! انھی کو دیکھنے گیا تھا۔" نورالٰہی کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔ "پر اس دفعہ بھی کوئی پتہ نہیں چلا۔ اطلاع صحیح نہیں تھی۔"

"تیں نوں کس نے بتایا تھا وہ ادھر کادر آباد میں ہیں؟"

"کل دن ڈھلے میں نمبردار کی ماڑی پر گیا تھا۔ وہاں قادر آباد کا سٹیشن ماسٹر بھی موجود تھا۔ وہ بھی مہاجر ہے۔ اسی نے بتایا تھا' گورداس پور کے کچھ مہاجر خاندان ٹرین سے پہنچے ہیں۔ سٹیشن کے پاس ہی درختوں کے نیچے انھوں نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ ان میں ایک لاوارث زنانی ہے۔ ساتھ میں بچے بھی ہیں۔ سٹیشن ماسٹر نے کسی کا نام شام تو بتایا نہیں۔ میں نے سوچا کہیں وہ میرے ہی بال بچے نہ ہوں۔" نورالٰہی چند لمحے خاموش رہا۔ "وہ نبی پور کے نکلے۔ میرا پنڈ تو نصیر پور تھا۔"

"چوہدری! توں نے ان سے اپنی گھر والی اور بچوں کے لیے پوچھا تو ہوتا۔"

"پوچھا تھا۔ ان کے بارے میں انہیں کچھ خبر نہیں۔ آٹھ دس میل کا چکر ہوگیا۔ نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"توں اس طرح کب تک انھیں ڈھونڈتا رہے گا؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے' وہ تریموں کے پتن پر مارے گئے۔"

"ایسا نہ کہہ جیناں!" نورالٰہی نے تڑپ کر کہا۔ "میں انھی سے ملنے کی امید پر زندہ ہوں۔ ہر جگہ انھی کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے' ایک نہ ایک روز وہ ضرور مل جائیں گے۔ یہ تو مجھے پتہ ہے گھر والی بچوں کے ساتھ پاکستان پہنچ گئی تھی۔ اسے لہور کے والٹن کیمپ میں میرے کئی ملنے والوں نے دیکھا بھی تھا۔ میں ان دنوں منٹگمری کے مہاجر کیمپ میں تھا۔"

"توں یہ گل پہلے بھی بتا چکا ہے۔ پر یہ تو سوچ' اٹھ برس ہوگئے۔ وہ تجھے اب تک کیوں نہیں ملے؟ ویسے جو تیری مرضی' پر بیماری میں سیکل نہ چلایا کر۔ تیری طبیعت اور گڑبڑ ہوجائے گی۔ دیکھ تو کتنا کمزور اور بیمار لگ رہا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مجھے سیکل نہیں چلانی چاہیے۔ پر کیا کروں' جب سے سٹیشن ماسٹر سے بات ہوئی تھی' تب سے بے چین تھا۔ رات بھر نیند نہیں آئی۔ سویرے اٹھتے ہی سیکل اٹھائی اور قادر آباد روانہ ہوگیا پر واپسی میں بہت مشکل پڑی۔ جگہ جگہ ٹھیر کر آرام کرتا رہا۔ تبھی تو اتنی دیر ہوگئی۔"

چوہدری نور الٰہی نے گہری سانس بھری۔ "اب تو جا۔ میں ذرا دیر بعد روٹی کھاؤں گا۔ ابھی بھوک نہیں ہے۔"

جیناں چلی گئی۔ رحیم داد نے کوٹھری کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ نورالٰہی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلالیا۔ رحیم داد چپ چاپ کوٹھری سے باہر آگیا۔ اس کا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ کوٹھری میں سخت حبس تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی برس رہی تھی۔ وہ قریب آیا تو نورالٰہی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"حوصلے سے کام لے' جو ہونا تھا ہوگیا۔ فکر نہ کر' میرا گھر بہت محفوظ ٹھکانا ہے۔ پنڈ سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ یہاں کوئی آتا جاتا بھی نہیں۔ صرف جیناں روٹی لے کر آتی ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "میری طرف سے اطمینان رکھ۔ ویسے میں تیرے کپڑوں پر خون کے دھبے دیکھتے ہی تاڑ گیا تھا کوئی واردات کرکے آیا ہے۔ ۱۸ سال سے اوپر پولیس کی نوکری کی۔" اس نے آہ سرد کھینچی۔ "پر اب تو بیماری نے کھوکھلا کرکے رکھ دیا ہے۔" رحیم داد چپ کھڑا رہا۔ نورالٰہی ذرا دیر خاموش رہ کر



گویا ہوا۔ "یوں کب تک کھڑا رہے گا؟" اس نے مونڈھے پر رکھی ہوئی چنگیری کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ روٹی رکھی ہے۔ تو بھی کھا اور مجھے بھی کھلا دے۔" اس نے گردن موڑ کر باہر صحن میں دیکھا۔ "پہلے باہر جاکر دروازے کی زنجیر لگادے۔ اب دروازہ بند ہی رکھنا پڑے گا۔"

رحیم داد کمرے سے گیا اور باہر کھلنے والے دروازے کی کنڈی لگادی۔

☆

نورالٰہی بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے چنگیری اٹھائی اور نورالٰہی کے سامنے رکھ دی۔ چنگیری میں تین روٹیاں اور ساگ تھا۔ نورالٰہی نے دو روٹیاں اٹھائیں اور ان پر ساگ رکھ کر رحیم داد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میرے لیے ایک روٹی کافی ہے۔ بھوک ہی نہیں لگتی۔ منع بھی کرتا ہوں پر جیناں نہیں مانتی۔ کہتی ہے' چوہدری! خوب پیٹ بھر کر روٹی کھایا کر۔ بہت کمزور ہوگیا ہے مگر آج تو اس نے ٹھیک ہی کیا' تیرا بھی کام بن گیا۔ اب آرام سے بیٹھ کر روٹی کھا۔" اس نے نوالہ توڑا اور کھانا کھانے لگا۔

رحیم داد بھی مونڈھے پر بیٹھ گیا اور ہاتھ میں روٹیاں تھام کر کھانے میں مصروف ہوگیا۔ بھوکا بھی تھا۔ کھانا اسے مزے دار لگا۔

کھانے سے فارغ ہوکر نورالٰہی نے پوچھا۔ "یہ تو بتا' تجھے جانا کہاں ہے؟"

رحیم داد نے گردن جھکا کر جواب دیا۔ "چوہدری اپنا تو اب کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔"

"جب تک تیرا جی چاہے' یہیں رہ۔ میں گھر میں اکیلا پڑا پڑا گھبراتا ہوں۔ تیرے ساتھ بات چیت میں دل بہل جائے گا۔ توں میری کچھ مدد بھی کرسکے گا۔"

"ضرور کروں گا' تیرا ہر کام کروں گا۔" رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔ "تیری مہربانی ہے۔ کچھ دن یہیں ٹھیرا رہوں گا۔" اس نے قدرے تامل کیا' پھر دبی زبان سے بولا۔ "چوہدری! اب تجھے کیا بتاؤں' میں کیسے اس چکر میں پھنس گیا۔ بات یہ ہے جی۔"

نورالٰہی اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "مجھے کچھ نہ بتا۔ میں تیرا نام بھی نہیں پوچھوں گا اور تجھے یہی مشورہ دوں گا' آگے بھی کسی سے اپنے بارے میں بات نہ کرنا۔" وہ مسکرانے لگا۔ "ویسے بھی ابھی مجھے سچ بات نہیں بتائے گا۔ پر توں ہے حوصلے والا۔ واردات کے بعد ملزم جتنے گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں توں اتنا پریشان نہیں لگتا۔" اس نے طاق کی طرف ہاتھ اٹھا کر ایک شیشی کی جانب اشارہ کیا۔ "مجھے یہ دوائی پلا دے۔" رحیم داد نے شیشی اور اس کے ساتھ رکھی ہوئی مٹی کی پیالی اٹھائی اور نورالٰہی کو دے دی۔

دوا پینے کے بعد نورالٰہی بستر پر لیٹ گیا۔ کمرے میں ذرا دیر خاموشی رہی پھر نورالٰہی نے رحیم داد سے دریافت کیا۔ "تجھے نیند تو نہیں لگ رہی؟"

"نہیں، ابھی تو نہیں لگ رہی۔"

"میں تو دیر ہی سے سوتا ہوں۔ نیند بہت کم آتی ہے۔ تجھے نیند لگے تو کوٹھری سے چٹائی نکال لینا۔ باہر برآمدے میں بچھا کر سو جانا۔ یہاں کمرے میں تجھے گرمی لگے گی۔" اس نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔

"سویرے اٹھ کر اپنے کپڑے دھو لینا۔ کپڑوں پر اس طرح خون نہیں لگا رہنا چاہیے۔"

رحیم داد نے جھک کر قمیص اور شلوار پر خون کے دھبے دیکھے۔ "میں نے تو پہلے ان پر دھیان نہیں دیا تھا۔ تو نہ بتاتا تو مجھے پتہ ہی نہ چلتا۔"

"گھبراہٹ اور پریشانی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ویسے دھبے زیادہ نمایاں نہیں ہیں۔ غور سے دیکھنے پر نظر آتے ہیں۔" نورالٰہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "واردات کے بعد ملزم سے ایسی غلطی اور چوک نہ ہو تو پولیس کو جرم کا سراغ کیسے ملے۔"

"تجھے تو اب پتہ چل ہی گیا۔" رحیم داد نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ "میں تجھے سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔"

"سچ سچ بتا دے گا تو میں تجھے ٹھیک ہی مشورہ دوں گا۔ آگے تیرے کام آئے گا۔ پر مجھے اپنے بارے میں تب بتانا، جب تجھے، مجھ پر بھروسا ہو جائے۔"

"نہیں چوہدری! مجھے، تجھ پر بھروسا ہے۔" رحیم داد نے اعتماد کا اظہار کیا۔ "بات یہ ہے، تو بیمار ہے اور دکھی بھی۔ میں تیرا دکھ ٹھیک طرح سمجھتا ہوں۔ میری بھی گھر والی ہے، بچے ہیں۔ میں نے انھیں بہت دنوں سے نہیں دیکھا۔ میں تیری اور جیناں کی باتیں کوٹھری میں بیٹھا سن رہا تھا۔ مجھے اپنی گھر والی اور بچے اتنے یاد آئے کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" نورالٰہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ "میرا اور تیرا حال ایک ہی سا ہے۔"

"پر تو مجھ سے زیادہ دکھوں کا مارا ہوا ہے۔" رحیم داد نے اظہار ہمدردی کیا۔ "مجھے تو پتہ ہے میری گھر والی اور بچے کہاں ہیں، پر تجھے تو اپنے بال بچوں کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں۔ پر یہ بات سمجھ نہیں آئی، جب تو پاکستان پہنچ گیا تھا تو لہور میں ٹھہر کر انھیں تلاش کیوں نہیں کیا؟ منٹگمری کے کیمپ نہ جاتا۔"



"میں اپنی مرضی سے تو نہیں گیا تھا۔ کیمپ اتنا بھر گیا تھا کہ حکومت تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجروں کو دوسرے شہروں کے کیمپوں میں بھیجنے لگی۔ لیکن میں منٹگمری سے کئی بار لہور گیا۔ فیر کلیم اور الاٹمنٹوں کا چکر شروع ہو گیا۔ میں اس میں پھنس گیا۔"

"تیرے کلیم کا کیا بنا؟ کہیں زمین شمین بھی الاٹ کرائی؟"

"کلیم تو میرا منظور ہو گیا پر یہ نہ پوچھ اسے منظور کرانے کے لیے مجھے کتنی پریشانی اٹھانی پڑی۔ میں نے ۱۹۴۸ء میں تحصیل میلسی، ضلع ملتان سے اپنا کلیم داخل کیا تھا۔ میں نصیرپور میں سات مربعے اور پٹیالے میں اڑھائی مربعے سے زیادہ زرعی اراضی چھوڑ کر آیا تھا۔ نصیرپور میں اپنی پکی ماڑی تھی۔ پٹیالے میں بھی مکان تھا۔ میں اپنے پیو کا اکلوتا پتر تھا۔ وہ بھی پولیس میں تھا۔ اس نے ورثے میں میرے لیے بہت کچھ چھوڑا تھا۔ ویسے میری اپنی آمدنی بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔" چوہدری نورالٰہی نے قدرے توقف کیا۔ "مہینوں پر مہینے گزرتے گئے پر سنٹرل ریکارڈ آفس لہور سے میری اراضی کی تصدیق ہو کر نہیں آئی۔ میں دفتروں کے چکر کاٹتا رہا۔ دو سال بعد معلوم ہوا، کلیم فارم تصدیق کے لیے ریکارڈ آفس پہنچے ہی نہیں، رستے ہی میں کہیں گم ہو گئے۔ دوبارہ کلیم فارم اسی تحصیل سے داخل کیے۔ سات اٹھ مہینے اور گزر گئے.. ان کا بھی پتہ نہ چلا۔ فیر عذرداری کی، اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔"

رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "پر کہیں زمین پر تو کبضہ کر ہی لیا ہوتا۔ بہت سے پناہ گیروں نے ایسا ہی کیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کی لاکھوں ایکڑ زمین پڑی تھی۔ ملتان میں بھی ان کی چھوڑی ہوئی بہت زمین تھی۔"

"میں نے میلسی میں، موضع ٹہل چراغ میں متروکہ اراضی پر قبضہ کر لیا تھا۔ پنج سو روپے رشوت دے کر اس کا عارضی الاٹمنٹ بھی اپنے نام کرا لیا تھا۔ اسی لیے اس تحصیل سے میں نے اپنا کلیم داخل کیا تھا۔" چوہدری نورالٰہی نے بتایا۔ "دس ایکڑ کے لگ بھگ نہری زمین تھی۔ بہت مشکل سے قبضہ ملا تھا۔ ایک ہندو زمیندار کی زمین تھی۔ قبضہ حاصل کرنے کے بعد میں کلیم کے چکر میں الجھ گیا۔ ایک روز معلوم ہوا، پٹواری یہ زمین اپنے کسی رشتے دار کے نام الاٹ کروانا چاہتا ہے۔ میں اسے ملا۔ منت سماجت کی پر وہ کسی طرح نہ مانا بلکہ مجھے طرح طرح سے تنگ کرنے لگا۔ جب اس نے بہت تنگ کیا اور زمین ہاتھ سے جاتی نظر آئی تو میں نے اس کے خلاف اوپر درخواستیں دیں۔ گورنر، وزیر اعلیٰ، وزیر بحالیات، فنانشل کمشنر، سبھی کو لکھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ پٹواری کے خلاف ضرور کارروائی ہوگی اور معاملے کی پوری پوری تفتیش ہوگی۔ مگر ہوا یہ کہ ایک روز پٹواری

نے مجھے بلایا۔ گندی گندی گالاں نکالیں۔ اپنا بستہ کھول کر ایک مسل نکالی اور میرے منہ پر مار کر غصے سے بولا۔ لے اسے پڑھ۔ میں نے اسے اٹھا کر پڑھا تو میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مسل میں میری درخواست اور اس کی وہ تمام نقلیں موجود تھیں جو میں نے اوپر والوں کو بھیجی تھیں۔" نور الٰہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "مجھے حیرت زدہ دیکھ کر اس نے اور زیادہ ننگی ننگی گالاں نکالیں۔"

"توں خاموش بیٹھا رہا، کچھ نہیں کہا؟"

نور الٰہی خاموشی کے ساتھ چارپائی سے اترا۔ قریب رکھے ہوئے ٹرنک کے اندر سے کپڑے میں لپٹے ہوئے کاغذات کا پلندہ نکالا اور پھر بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے کپڑے کی گرہ کھول کر ایک فائل نکالی اور اس کے اوراق الٹ پلٹ کر ایک کاغذ توجہ سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ میری وہ درخواست ہے جو میں نے اوپر والوں کو بھیجی تھی۔" وہ اونچی آواز سے اسے پڑھنے لگا۔

رحیم داد نے درخواست سن کر کہا۔ "چوہدری! عرضی تو تیری زوردار لگتی ہے۔ پٹواری کا تو بیڑا گرک کر دیا۔"

"اس کا بیڑا تو کیا غرق ہوتا البتہ اس نے میرا بیڑا غرق کر دیا۔ ہوا یہ کہ اوپر والوں نے میری تمام درخواستیں ضروری کارروائی کے لیے ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو بھیج دیں۔" نور الٰہی نظریں جھکائے کاغذات دیکھتا رہا اور رحیم داد کو بتاتا رہا۔ "ڈپٹی کمشنر کے دفتر والوں نے میری درخواست اور اس کی تمام نقلیں نتھی کر کے حسب ضابطہ اس پر نوٹ لکھا، درخواست ہذا بہ طلب رپورٹ بخدمت جناب افسر مال صاحب مرسل ہوں۔ ڈپٹی کمشنر نے نوٹ کے نیچے اپنے دستخط لگا دیے۔ درخواست افسر مال کو بھیج دی گئی۔ افسر مال نے تحصیل دار کو لکھا، درخواست ہذا بہ طلب رپورٹ بخدمت جناب تحصیل دار صاحب مرسل ہوں۔ تحصیل دار نے اس پر اپنا نوٹ لگایا۔ درخواست ہذا بہ طلب رپورٹ بنام قانون گو مرسل ہوں۔ قانون گو کے پاس درخواست پہنچی تو اس نے اپنے حکم میں لکھا۔ درخواست ہذا بہ طلب رپورٹ بجانب پٹواری حلقہ مرسل ہوں۔" نور الٰہی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔

"اس طرح وہ درخواست جو میں نے گورنر صاحب، وزیر بحالیات اور فنانشل کمشنر کو بھیجی تھی، اوپر سے سیڑھی سیڑھی نیچے اترتی ہوئی آخری کارروائی کے لیے اسی پٹواری کے پاس پہنچی جس کے خلاف میں نے شکایت کی تھی۔"

"تب تو وہ بہت گرم ہوا ہوگا؟"



"بہت زیادہ۔ غصے سے لال پیلی آنکھیں نکال کر مجھ سے بولا۔ اب جا کر گورنر جنرل اور وزیراعظم کو میرے خلاف شکایت لگا۔ پر جس کو بھی لکھے گا، تیری ہر درخواست آخری کارروائی کے لیے میرے ہی پاس آئے گی۔ فیر اس نے سارے ہی اوپر والوں کی ماؤں اور بھینوں کو ننگی ننگی گالاں نکالیں اور درخواست اٹھا کر اپنے بستے میں رکھ لی۔"

"تبھی تو سب کہتے ہیں۔ اتے باری تھلے پٹواری۔" رحیم داد نے مسکرا کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "توں نے خاماخا اس سے جھگڑا کیا۔ اس کی مٹھی گرم کر دیتا، تیرا سب کام بن جاتا۔"

"مگر چوہدری! وہ پٹواری ہے تو میں بھی پولیس میں حوالدار رہ چکا ہوں۔" نور الٰہی نے کڑک کر کہا۔ "میں نے بھی ہار نہیں مانی۔ تحصیل اور ضلع کے دفتروں کے چکر کاٹتا رہا۔ کئی مہینے بعد ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے ایک کلرک نے مجھے اپنی درخواست اور اس کی تمام نقلیں ایک مسل میں دکھائیں۔ پٹواری نے درخواست پر جو رپورٹ لگائی تھی، وہ بھی دکھائی۔ نور الٰہی نے ہاتھ بڑھا کر درخواست رحیم کے داد کے حوالے کر دی۔ رحیم داد نے لالٹین کی روشنی میں پڑھا، پٹواری نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔

جناب عالی!

سائل مسمی چوہدری نور الٰہی کی جملہ درخواست ہذا کی مکمل پڑتال کی گئی۔ اس جانچ پڑتال سے ظاہر ہوا کہ سائل فضول درخواست دینے کا عادی ہے۔ اسے متعدد بار سرزنش کی جا چکی ہے کہ اس طرح حکام کا قیمتی وقت ضائع کرنا درست نہیں۔ لیکن سائل اپنی عادت سے مجبور ہے۔ سائل کا چال چلن بھی مشتبہ ہے۔ اس کا اصل ذریعہ معاش فرضی گواہیاں دینا ہے۔ مشرقی پنجاب میں اس کے پاس کوئی اراضی نہیں تھی۔ نہ کسی قسم کی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد تھی۔ اسی وجہ سے اس کے کلیم فارم بھی ابھی تک تصدیق نہیں ہوئے۔ سائل نے دو مرتبہ عذرداری بھی کی لیکن بے سود۔ متعدد مہاجرین اور گواہان کے بیانات قلم بند کیے گئے۔ تحقیق ہوا کہ گورداس پور اور ریاست پٹیالہ میں سائل کی ملکیت میں کوئی زمین نہیں تھی۔ چنانچہ کھیوٹ نمبر ۱۵، مقدمہ نمبر ۲۸، موضع ٹہل چراغ میں دس ایکڑ متروکہ اراضی، جس پر سائل کا ناجائز قبضہ تھا، اس کے نام سے منسوخ ہو کر مسمی فضل دین کے نام بہ رویت قانون رائج باضابطہ کنفرم ہو چکی ہے۔ مسمی فضل دین، ضلع جالندھر کا مہاجر اور سابق سفید پوش ہے۔ اس کے تصدیق شدہ کلیم بھی موصول ہو چکے ہیں۔ لہٰذا موضع ٹہل چراغ میں متروکہ اراضی ہذا الاٹ کر کے اس کی حق رسی کر دی گئی ہے۔

پٹواری کی رپورٹ پر گرداور اور قانون گو نے یہ نوٹ لگایا۔ "رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ بہ

مراد حکم مناسب بخدمت جناب نائب تحصیل دار صاحب پیش ہو۔" نائب تحصیل دار نے بھی اسی طرح درخواست پر اپنا نوٹ لگایا۔ "رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ بہ مراد حکم مناسب بخدمت صاحب مال افسر بہادر پیش ہو۔" افسر مال نے تحریر فرمایا۔ "رپورٹ مفصل ہے۔ بہ مراد حکم مناسب صدر میں پیش ہو۔" صدر کے مسل خواں نے حکم لکھا۔ "رپورٹ مفصل ہے۔ درخواست ہائے مسمی چوہدری نورالٰہی فضول ہیں۔ داخل دفتر کی جائیں۔"

رحیم داد نے درخواست نورالٰہی کو واپس کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ "چوہدری! تجھے اپنی درخواست اور اس پر کی گئی کارروائی اور پٹواری کی رپورٹ کہاں سے مل گئی؟"

"ارے یار! یہ کام بھی کوئی کام ہے۔ اڑھائی سو روپے کا خرچا اور ہوا۔" نورالٰہی نے ہنس کر بتایا۔ "اس پر افسر کے دستخط بھی نہیں ہوئے تھے۔ پٹواری نے تو میرا عارضی الاٹمنٹ منسوخ کرانے اور اپنے رشتے دار فضل دین کے نام پکا الاٹمنٹ کرانے کا پورا بندوبست کرا ہی لیا تھا' پر اس کا کسی پولیس والے سے ٹاکرا نہیں ہوا تھا۔"

"پٹواری آخر پٹواری ہوتا ہے۔ اس نے تجھے بعد میں تنگ کیا ہوگا؟"

"میں نے اسے یہ موقع ہی نہیں دیا۔ ہوشیار پور کا ایک مہاجر متروکہ اراضی کی تلاش میں تھا۔ اس کے پاس تصدیق شدہ کلیم بھی تھا۔ میں نے ساڑھے سات ہزار میں اس سے سودا کرلیا اور ٹہل چراغ کی دس ایکڑ زمین پر اسے قبضہ دے دیا۔ وہ صوبائی اسمبلی کے ممبر کا کچھ لگتا تھا۔ اس کی سفارش پر زمین کا اس کے نام اوپر ہی اوپر پکا الاٹمنٹ بھی ہوگیا۔" نورالٰہی مسکرانے لگا۔ "جب اس کا الاٹمنٹ پوری طرح ہوگیا تو میں پٹواری کے پاس گیا۔ اسے گریبان سے پکڑا۔ جتنی بھی گندی گندی گالاں معلوم تھیں' ساری ہی خالص پولیسوں کی زبان میں نکالیں اور اس سے کہا۔ توں پٹواری ہے تو میں نے بھی پولیس کی حوالداری کی ہے۔"

"چوہدری! توں نے اسے ٹھیک سبک سکھایا۔" رحیم داد نے ہنس کر کہا۔ "ویسے زمین کے ساڑھے سات ہزار لے کر گھاٹے میں نہیں رہا۔"

"ان ساڑھے سات ہزار کے علاوہ اسی زمین کی بنیاد پر میں مویشی اور بیج کی خریداری' مکان بنانے اور دوسرے اخراجات کے لیے سرکار سے ۵ ہزار روپے کا تقاوی قرضہ پہلے ہی وصول کرچکا تھا۔" نورالٰہی نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ "اس قرضے کی کچھ رقم میرے پاس موجود تھی۔ میں نے بھاول نگر سے نئے کلیم فارم داخل کیے۔ چھے ہزار روپے اوپر سے خرچ ہوئے۔ فیروز لہور کے سینٹرل ریکارڈ آفس سے تصدیق بھی ہوگئی۔ دو ہفتے کے اندر اندر کلیم منظور ہوگیا۔ تیں



نوں پتہ ہے کتنا وڈا کلیم منظور ہوا؟"

رحیم داد ہونق کی طرح اس کا چہرہ تکتا رہا۔ نورالٰہی نے بتایا۔ "۶۸ مربع اراضی اور دو حویلیوں کا کلیم منظور ہوکر آیا۔ جب سچا حلف نامہ لگایا تھا اور سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک تحریر کیا تھا تو صرف ساڑھے ۵ مربع اراضی اور ایک مکان کا کلیم اڑھائی تین برس کی بھاگ دوڑ اور تمام منت سماجت کے بعد بھی دفتروں کی فائلوں میں دبا رہا۔ عذرداری بھی کی' کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ چھے ہزار کے جادو سے ہر کام اوپر سے نیچے تک ایسے فٹافٹ ہوتا چلا گیا جیسے میرے کلیم کی فائل کو پہیے لگ گئے ہوں۔ لطف یہ کہ جھوٹا کلیم ایک دم سچا بن گیا۔ نہ زیادہ بھاگ دوڑ کرنی پڑی' نہ کسی کے سامنے جاکر فریاد کرنے کی ضرورت پیش آئی۔"

"تجھے کلیم کی منظوری کے ساتھ ساتھ الاٹمنٹ بھی فٹافٹ مل گئی ہوگی؟"

"تیں نوں پتہ نہیں' کلیم منظور کرانا تو ایسا مشکل کام نہیں پر الاٹمنٹ حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔" نورالٰہی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "الاٹمنٹ کے چکر میں فیر پٹواری سے ٹاکرہ ہوا اور اس بار مجھے سچ مچ اندازہ ہوا' پٹواری کتنا طاقت ور ہوتا ہے۔"

"اس بار کیا ہوا؟"

"یہ پوچھ کیا نہیں ہوا؟ تجھے ان کاموں سے واسطہ نہیں پڑا۔ تجھے کیا معلوم' الاٹمنٹ کے چکر میں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ٹہل چراغ میں تو ایک ملنے والے کی مدد سے زمین پر قبضے کے ساتھ ہی عارضی الاٹمنٹ بھی مل گئی تھی۔ ویسے اس وقت متروکہ اراضی بھی بہت تھی۔ اب تلاش کرنی پڑتی ہے۔ ساری عمدہ زمینیں تو اوپر ہی اوپر بھائی بھتیجوں' شریکوں اور یاروں دوستوں میں بٹ گئیں۔ ادھر وڈے زمیں داروں نے ہندوؤں اور سکھوں کے پرانے مسلمان مزارعوں سے معاملہ کرکے قبضہ کرلیا تھا۔ یہ الاٹمنٹ کا چکر بھی عجب چکر ہے۔" نورالٰہی کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ "اوپر والوں کے پاس جاؤ تو حکم ملتا ہے۔ تحصیل دار کے پاس جاؤ۔ تحصیل دار کے سامنے درخواست پیش کرو تو وہ اس پر لکھتا ہے' نائب تحصیل دار رپوٹ کریں۔ نائب تحصیل دار کے سامنے درخواست جاتی ہے تو وہ اپنا نوٹ لگاتا ہے 'گرداور حلقہ رپورٹ کریں' آیا کوئی اراضی برائے الاٹ موجود ہے؟ گرداور حلقہ اپنے حکم میں تحریر کرتا ہے' پٹواری حلقہ رپورٹ کرے آیا کوئی اراضی حلقہ مذکور میں برائے الاٹ پائی جاتی ہے؟ اس طرح اوپر سے جو فائل چلتی ہے' وہ پٹواری ہی کے پاس آکر ٹھیرتی ہے۔"

"یہ تو ویسا ہی چکر ہوا جو پٹواری نے ٹہل چراغ کی الاٹمنٹ ختم کرانے کے لیے تیرے خلاف

چلایا تھا۔"

"سچ تو یہ ہے جی' پٹواری الاٹمنٹ منسوخ بھی کرا سکتا ہے اور وہی الاٹمنٹ دلا بھی سکتا ہے۔" نورالٰہی نے گہری سانس بھری۔ "الاٹمنٹ کی منظوری یا منسوخی کی پوری عمارت پٹواری کی رپورٹ ہی پر کھڑی ہوتی ہے۔ الاٹمنٹ کی درخواست اوپر سے چلتی ہوئی جب پٹواری کے پاس پہنچتی ہے تو پہلے تو وہ اسے دبا کر بیٹھ جاتا ہے اور درخواست لگانے والے کا انتظار کرتا ہے۔ اگر وہ اس کے پاس نہیں پہنچتا اور اوپر ہی اوپر کارروائی کرانے کی کوشش کرتا ہے تو پٹواری درخواست پر لکھ دیتا ہے حلقہ مذکورہ میں کوئی اراضی برائے الاٹ موجود نہیں ہے۔ اور اگر درخواست لگانے والا صرف منت سماجت سے کام نکالنا چاہتا ہے تو پٹواری اسے ٹرخا دیتا ہے یا بنجر زمین دلا کر اپنا پیچھا چھڑا لیتا ہے۔ درخواست پر اپنی رپورٹ میں لکھ دیتا ہے۔ موضع فلاں فلاں میں کسی قدر بنجر قدیم اراضی برائے الاٹ موجود ہے۔ اگر سائل یہ زمین لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔ اب درخواست فیر الٹے پیروں چلتی ہوئی اوپر جاتی ہے۔"

"چوہدری! تو تحصیل دار' نائب تحصیل دار اور گرداور کے چکر میں پڑنے کی بجائے سیدھا پٹواری کے پاس کیوں نہیں پہنچا؟ سب کچھ تو اسی کی رپورٹ پر ہوتا ہے۔"

"ہاں جی' محکمہ مال کا سارا انتظام پٹواری ہی کے بل پر چلتا ہے۔ افسر تو صرف حکم چلاتے ہیں۔ بہت ٹھوکریں کھانے اور دفتروں کے چکر کاٹ کاٹ کر جب مجھے پٹواری کی اہمیت معلوم ہوئی تو میں اوپر والوں کے پاس جانے کی بجائے پٹواری کے پاس پہنچا۔ دو ہزار میں اس سے معاملہ طے کیا اور اسی پٹواری کے پاس عمدہ نہری زمین نکل آئی جسے اپنے حلقے میں بنجر اور کلر زمین بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے اپنے بستے سے نقشہ نکالا اور رپورٹ لکھ دی۔ لو جی' تحصیل دار تک درخواست فٹا فٹ پہنچ گئی اور زمین کی الاٹمنٹ بھی مل گئی۔"

"مجھے متروکہ اراضی کی الاٹمنٹوں کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں' پر اتنا میں نے بھی سنا ہے پٹواریوں نے تو یہاں تک کیا' جس نے ان کی مٹھی گرم کی' اسے الاٹمنٹ دے دی۔ ایک ہی زمین کئی کئی کے نام الاٹ ہوئی۔ بعد میں دنگے فساد ہوئے۔ مکدمہ بازی ہوئی۔ میرے نزدیک کے موضع میں ایک ہی زمین کے چار الاٹی ہیں۔ ان میں پچھلے اڑھائی سال سے زبردست مکدمہ بازی ہو رہی ہے۔"

"میرے ساتھ بھی دوبارہ یہی ہوا۔" نورالٰہی نے رحیم داد کو بتایا۔ "تحصیل منچن آباد میں مجھے ۷۶ کنال زمین الاٹ ہوئی۔ میں قبضہ لینے پہنچا تو پتہ چلا وہی زمین چھے دعویداروں کو پہلے ہی الاٹ



ہو چکی ہے اور ان میں سے چار نے نالش بھی کر دی ہے۔ مہینوں سے عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے۔ اسی تحصیل میں بعد میں میرے نام ۱۳۰ ایکڑ زمین کی الاٹمنٹ ہوئی۔ میں پہلے سے زیادہ زمین ملنے پر خوش تھا پر جلد ہی ساری خوشی جاتی رہی۔ پتہ چلا وہ زمین بھی کئی دعویداروں کو مجھ سے پہلے الاٹ کی جا چکی ہے۔ قبضہ حاصل کرنے کے چکر میں دو فریقوں نے تو بندوقوں اور کلہاڑیوں سے مسلح ہو کر ایک دوسرے پر حملہ کیا۔ پولیس نے دونوں گروہوں کے خلاف مقدمہ قائم کیا۔ کئی کو گرفتار بھی کر لیا۔ زمین کی بجائے انھیں قید کاٹنے کے لیے جیل کی کوٹھری الاٹ ہوئی۔ ان کا انجام دیکھ کر میں نے توبہ کی۔ فوراً اپنی الاٹمنٹ منسوخ کرائی۔ ویسے منچن آباد میں جعلی فرد حقیت اور بوگس کلیم فارموں کے ذریعے زبردست دھاندلی ہوئی۔ میں نے تو جی وہاں زمین الاٹ کرانے کا خیال ہی چھوڑ دیا تھا۔"

"فیر تجھے کہاں الاٹ ہوئی زمین؟"

"مجھے کئی مہینے بھاگ دوڑ کرنے کے بعد بھاول پور کے موضع نذر محمد جھلن میں پورے چار مربعے الاٹ ہو گئے۔" نورالٰہی کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خوشی کی ہلکی سی سرخی پھیل گئی۔ "جھلن میں ایک سکھ زمیں دار سردار کھڑک سنگھ کی ۲۷ مربع متروکہ اراضی تھی۔ اس پر کھڑک سنگھ کے پرانے مزارعے کاشت کرتے تھے۔ شروع میں انھوں نے ساری زمین پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی لیے اس زمین کی الاٹمنٹ بہت بعد میں ہوئی۔ اس طرح میرے حصے میں بھی ۱۰۰ ایکڑ زمین آ گئی۔"

"۱۰۰ ایکڑ تو بہت ہوئے۔" رحیم داد نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ "پر تیرا کلیم بھی تو ۶۸ مربعے کا منظور ہوا تھا۔ وہ زمین ابھی تک تیرے ہی پاس ہے نا؟"

"وہ زمین میرے پاس رہتی تو میں یہاں کیوں پڑا ہوتا۔" نورالٰہی کا چہرہ لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اور زیادہ زرد نظر آنے لگا۔ اس پر غم کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔ وہ بجھے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔

"موضع نذر محمد جھلن جس علاقے میں ہے اس علاقے کا سب سے وڈا زمیں دار مخدوم رحمان شاہ ہے۔ اس کے پاس بیس ہزار ایکڑ سے بھی زیادہ زمین ہے۔ وہ میران والی میں رہتا ہے جو صادق آباد کے نزدیک ہے۔ ویسے میران والی بھی وڈا قصبہ ہے۔ آبادی اس کی پنج ہزار سے اوپر ہی ہوگی۔ میران والی کے چاروں طرف اونچی اونچی فصیل ہے۔ فصیل کے دو بڑے پھاٹک ہیں۔ رات کو یہ پھاٹک بند کر دیے جاتے ہیں۔ میران والی سمجھو' بہت وڈا قلعہ ہے جہاں صرف مخدوم رحمان شاہ

کی حکومت ہے۔ بسیں اور لاریاں تک اس کی چلتی ہیں۔ ایسی واہیات اور کھٹارا کہ سیٹوں پر گدیاں تک نہیں ہوتیں، مگر میران والی کا رہنے والا کوئی بندہ اس کی لاریوں کے علاوہ کسی اور سے سفر نہیں کر سکتا۔ میران والی میں اس نے اپنی کپڑے کی دو کانیں بھی کھول رکھی ہیں۔ اس کے مزارعوں کو صرف انھی دکانوں سے کپڑا خریدنا پڑتا ہے۔ ورنہ سزا ملتی ہے۔"

نور الٰہی نے قدرے توقف کیا۔ چند لمحے گہری گہری سانسیں بھرتا رہا، پھر گویا ہوا۔ "میران والی کے رہنے والوں کو وہ اپنی رعایا کہتا ہے۔ روزانہ عدالت لگاتا ہے۔ سزائیں دیتا ہے۔ اس کی ذاتی جیل بھی ہے، حویلی کے ساتھ ہی ہے۔ جسے چاہتا ہے، سزا دے کر اپنی جیل میں ڈال دیتا ہے۔ اس نے ۱۰۰ کے لگ بھگ مسلح کرندے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کرندے رائفلوں اور پستولوں سے مسلح ہو کر پورے علاقے میں گشت کرتے رہتے ہیں۔ معمولی معمولی باتوں پر مزارعوں کو گرفتار کر کے رحمان شاہ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اگر کوئی اس کی کماد کی فصل سے ہاتھ بھر کا ٹوٹا بھی توڑ کر چوپ لے تو جیل میں بند کر دیا جاتا ہے۔"

رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ "چوہدری! تجھے میران والی اور مخدوم رحمان شاہ سے کیا لینا۔ تجھے تو موضع جھلن میں زمین الاٹ ہوئی تھی۔ یہی بتایا تھا نا؟"

"میں نے یہ بھی تو بتایا تھا جھلن اسی علاقے میں ہے۔ میں تجھے یہ بتانا چاہتا تھا مخدوم رحمان شاہ کتنا وڈا اور زور آور زمیں دار ہے۔ وہ جھلن کی متروکہ اراضی پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ نئے زمیں داروں اور الاٹیوں کو طرح طرح سے تنگ کرتا رہتا۔ میرے پاس دوسرے نئے زمیں داروں سے کچھ زیادہ ہی زمین تھی اس لیے وہ مجھے زیادہ ہی تنگ کرتا تھا۔ پہلے تو اس نے میرے مزارعوں کو سرکشی پر اکسایا۔ وہ اپنی مرضی کی فصل بوتے، فصل کی واڈھی پر راہ کی اور بٹائی میں زیادہ حصہ مانگتے۔ خاماخا کا جھگڑا ٹنٹا کھڑا کرتے۔"

"راہ کی میں جھگڑے ٹنٹے کی کون سی بات۔ وہ تو زمیں دار اور مزارع کے درمیان آدھی آدھی ہوتی ہی ہے بلکہ زمیں دار ہی کئی طرح کے ٹیکس لگا کر زیادہ حصہ وصول کرتے ہیں۔ چوہدری تو بالکل نئی گل کر رہا ہے۔ ظلم تو زمیں دار مزارعوں پر کرتے ہیں۔"

"پر جھلن میں مخدوم رحمان شاہ کے کرندوں کے ہشکانے اور شیری دینے پر مزارعے، مہاجر زمیں داروں کو بہت تنگ کرتے تھے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے ہتھکنڈوں سے گھبرا کر کئی الاٹی اپنی زمینیں چھوڑ کر چلے گئے۔ پر میں نے مزارعوں سے جھگڑا ٹنٹا نہیں کیا۔ انھیں راضی خوشی رکھنے کی ہر طرح کوشش کی۔ بات یہ تھی، زمین زرخیز تھی اور پانی بھی بہت تھا۔ میں نے اپنا اک مربع ایک



زارعے پیر بخش کے ہاتھ ۲۵ ہزار میں بیچ دیا۔ اس رقم سے تیس ایکڑ پر آم، اور مالٹے کے باغ ئے۔ مزارعوں کے بچوں کے لیے پرائمری اسکول بھی بنانے کی کوشش کی۔ یہ کام میں نے بخش کے پتر، امیر بخش کے کہنے پر کرنا چاہا۔ وہ کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اس نے مزارعوں کے ساتھ یل جول بنانے میں میری بہت مدد کی تھی۔"

چوہدری نور الٰہی سنبھل، سنبھل کر بولتا رہا۔ تھک جاتا تو دم لینے کو رک جاتا۔ رحیم داد توجہ سے س کی باتیں سنتا رہا۔ "سکول شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ رحمان شاہ نے ایک روز مجھے میران والی لایا۔ ایسے ہی شروع گرمیوں کے دن تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ شاہ جی اپنی حویلی کے باغ میں تھا۔ وہ لی شلوار اور قمیص پہنے ہوئے تھا۔ قمیص کے اوپر لمبا کوٹ تھا۔ گلے میں ٹائی بندھی تھی اور سر پر ال رومی ٹوپی تھی۔ وہ کرسی پر شان سے اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ ایک نوکر پیچھے کھڑا دھیرے دھیرے پنکھا جھل رہا تھا۔ اس نے عدالت لگا رکھی تھی۔ باری باری ہر ایک کی پیشی ہو رہی تھی۔ ویسے وہ انریری مجسٹریٹ بھی ہے۔ میری پیشی ہوئی تو اس وقت اس کے سامنے موضع شیخ بکھر کا ایک دکان دار سر جھکائے ملزموں کی طرح کھڑا تھا۔ مخدوم سید رحمان شاہ نے اس سے پوچھا۔ تو نے مسجد بنائی ہے؟ اس نے گردن ہلا کر ہامی بھری۔ مخدوم رحمان نے غصے سے آنکھیں نکال کر اسے ڈانٹا۔ کیوں مسجد بنائی؟ اور اس کے جواب دینے سے پہلے خود بول پڑا۔ تیں نوں پتہ ہے حاکم کی اجازت کے بغیر رعایا کو مسجد بنانے کا حکم نہیں۔ رحمان شاہ نے اسے چھ مہینے کی سزا بھی دے دی۔ اس کے مسلح کرندے دکان دار کو پکڑ کر اسی وقت جیل میں ڈالنے لے گئے۔"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "مسجد بنانے پر جیل میں بند کر دیا؟"

"مجھے بھی تیری طرح حیرت ہوئی تھی۔" نور الٰہی نے جواب دیا۔ "مخدوم رحمان شاہ نے مجھے دیکھتے ہی تیوری پر بل ڈال کر پوچھا، تو پناہ گیرا ہے؟ میں نے کہا۔ ہاں جی، میں گورداس پور کا مہاجر ہوں۔ موضع جھلن میں میری زمیں داری ہے۔ وہ کڑک کر بولا۔ میں نوں پتہ ہے، میں نوں یہ بھی پتہ ہے تو جھلن میں سکول بنانا چاہتا ہے۔ کیوں سکول بنانا چاہتا ہے؟ مزارعوں کے منڈوں کو بدمعاشی سکھانی ہے؟ تیں نوں پتہ ہے، وہ تیری.... کی چاٹی بنا کر اس میں مدھانی ڈالیں گے۔ اور ایسا رِڑکا لگائیں گے تیری ساری زمیں داری لسی بن کر نکل جائے گی۔ جا میریاں انکھیاں اگوں دور ہو جا۔ سکول شکول کے چکر میں نہ پڑ۔ اس بار وارننگ دے کر چھوڑے دیتا ہوں۔ اگے ایسی گل نہ سنوں۔ میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا پر یہ ضرور سمجھ گیا اس نے مسجد بنانے پر موضع شیخ بکھر کے دکاندار کو میرے سامنے چھ مہینے کی سزا کیوں سنائی تھی۔"

"فیر تو نے کیا کیا؟"

"میں تو سکول بنانے کا خیال چھوڑ دیتا' پر امیر بخش تیار نہیں ہوا۔ چنگا تکڑا جوان تھا اور جوش والا بھی۔ رحمان شاہ کو پتہ چلا تو بہت خفا ہوا' اس نے امیر بخش اور اس کے پیو پیر بخش کے خلاف ڈنگر چوری کا جھوٹا مقدمہ بنوا کر دونوں کو بند کروا دیا۔ ان کے گھر والوں اور رشتے داروں کو بھی پولیس نے بہت تنگ کیا۔ پیر بخش اتنا ڈرا کہ اس نے اپنی ۲۵ ایکڑ زمین مخدوم رحمان شاہ کے ہاتھوں صرف ۱۵ ہزار میں بیچ دی اور جھلن چھوڑ کر چلا گیا۔"

"تجھے تو مخدوم نے تنگ نہیں کیا؟"

"اس کے کرندے ایک رات بندوقوں سے مسلح ہو کر آئے۔ انھوں نے مجھے گرفتار کر لیا اور مخدوم رحمان شاہ کی ذاتی جیل میں لے جا کر ڈال دیا۔ جیل میں چھوٹی چھوٹی کئی تنگ و تاریک کوٹھڑیاں تھیں۔ مجھے بھی دوسرے قیدیوں کی طرح ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ اس میں نہ روشندان تھا' نہ ہوا آنے کا کوئی رستہ۔ اتنی گندگی اور بدبو تھی سانس بھی نہ لی جاتی۔ اوپر سے سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ کھٹمل اتنے تھے کہ دیواروں پر' زمین پر' جگہ جگہ رینگتے پھرتے۔ ساری رات بدن کھجاتے کٹتی۔ دو روز تو کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ بعد میں جو روٹی کھانے کو ملتی رہی اس میں آدھے سے زیادہ ریت ہوتی اور دال میں کنکر ہوتے' اوپر مکھیاں تیرتی ہوتیں۔"

رحیم داد نے پوچھا۔ "رحمان شاہ کو سکول سے اتنی نفرت کیوں تھی؟ اس کے بال بچے تو بالکل پڑھتے لکھتے نہیں ہوں گے۔"

"نہیں جی' اس کے خاندان کے صرف منڈے ہی نہیں' کڑیاں تک لندن اور امریکہ میں پڑھ رہی ہیں۔ بالکل میموں کی طرح رہتی ہیں۔ مخدوم رحمان شاہ کو نفرت تو مزارعوں کے بچوں کی پڑھائی سے ہے۔ پڑھ لکھ جائیں گے تو اس کی عمل داری کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔"

"تو کتنے دن جیل میں رہا؟"

"چار مہینے سے اوپر ہی رہا۔" نورالٰہی نے چند لمحے خاموش رہ کر بتایا۔ "وہیں مجھے کھانسی شروع ہوئی۔ فیر بلغم کے ساتھ خون بھی آنے لگا۔ بخار بھی رہنے لگا۔ یہ ٹی بی کی بیماری مجھے وہیں لگی۔ اس شرط پر مجھے رہائی ملی کہ پہلے الاٹمنٹ منسوخ کرانے کی درخواست لگائی۔ تب جیل سے رہائی ملی۔ میری خریف کی واڈھو فصل تھی۔ پھٹی تو چنائی کے لیے بالکل تیار تھی۔ پر رحمان شاہ کے کرندوں نے مجھے نذر محمد جھلن تک جانے بھی نہیں دیا۔"

"لگتا ہے رحمان شاہ بھی ملتان کے مخدوموں کی طرح کسی درگاہ کا گدی نشین



وڈی وڈی زمین داریاں اور جاگیریں ہیں۔" رحیم داد نے نورالٰہی کی باتیں سن کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ "انھوں نے بھی اسی طرح ہزاروں ایکڑ متروکہ اراضی دبا رکھی ہے۔ اپنی' اپنی زمین داریوں میں وہ بھی ایسے ہی حکومت کرتے ہیں۔ موج مستی کرتے ہیں۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہیں ہو سکتا۔"

"ویسے رحمان شاہ نہ گدی نشین ہے' نہ پیر ہے نہ سائیں' پر مخدوم الملک کہلاتا ہے۔" نورالٰہی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ "سنا ہے جب ریاست بہاول پور میں آیا تھا تو اس کا حال یہ تھا کہ رہنے کا ٹھکانا بھی نہ تھا۔ ملتان روڈ پر گدو مل کی سرائے میں رہنے کو ایک آنہ روز کرائے پر منجی لے رکھی تھی۔ بچوں کو کلام مجید پڑھاتا تھا۔ ان کے گھروں سے روٹی ٹکر کھانے کو مل جاتا۔ کبھی کبھار مردوں کی فاتحہ کا کچھ مل جاتا۔ اسی سے گزر بسر ہوتی تھی۔"

"گھر والی نہیں تھی؟"

"پتہ نہیں۔" نورالٰہی مسکرا کر بولا۔ "ویسے بھی فاتحہ کی روٹی کھانے والے ملاں سے کون اپنی کڑی کا ویاہ کرتا ہے۔"

"تب رحمان شاہ اتنا وڈا زمیں دار کیسے بن گیا؟"

"وہ ایسا ہوا کہ منت سماجت کر کے کسی کی سفارش پر نواب صاحب کو کلام مجید پڑھانے پر لگ گیا۔ فیر تو جی اس کے دن ہی بدل گئے۔ ایسا نصیب بدلا کہ نواب صاحب نے کسی بات پر خوش ہو کر میران والی کی پوری جاگیر ہی بخش دی۔ ساتھ ہی مخدوم الملک کا خطاب بھی دے دیا۔ ریاستوں میں ایسے ہی جاگیریں اور خطاب دیے جاتے تھے۔ میں تو ریاست پٹیالہ میں رہ چکا ہوں۔ ایسی بخششیں ہوتی بہت دیکھی ہیں۔"

"موضع نذر محمد جھلن سے نکل کر تو کہاں گیا؟"

"کئی مہینے تک الاٹمنٹ کے چکر میں ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتا پھرا۔" نورالٰہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ چند لمحے خاموش بیٹھا آہستہ آہستہ ہانپتا رہا۔ جب ذرا قرار آیا تو دل گرفتہ ہو کر بولا۔ "فیر یہاں آ گیا۔ یہاں الاٹمنٹ شلاٹمنٹ تو ابھی تک ہوئی نہیں۔ جیناں کے گھر والے اکبر نے بارہ ایکڑ متروکہ زمین پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ چاہتا ہے' میں یہ زمین اپنے نام الاٹ کروا لوں۔ وہ میرا مزارع بن کر رہے گا بلکہ وہ تو ابھی سے خود کو میرا مزارع سمجھنے لگا ہے۔"

"تو نے یہ زمین الاٹ کرانے کی کوشش نہیں کی؟"

"بیماری نے اس کا قابل نہیں رکھا۔" نورالٰہی نے کلیم کے کاغذات اور دوسری دستاویزات

کپڑے میں احتیاط سے لپیٹ کر گرہ لگائی۔ چارپائی سے اترا اور کاغذات کا بستہ ٹرنک میں رکھ کر تالا ڈال دیا۔ وہ دوبارہ بستر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "توں دل میں کہتا ہوگا' چوہدری باتیں بہت کرتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اس طرح دل کا بوجھ ہلکا کرلیتا ہوں۔ توں آگیا تو ذرا جی بہل گیا۔ ورنہ اکیلا پڑا کھانستا رہتا۔ نیند بھی تو کم آتی ہے۔" نورالٰہی بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے رحیم داد سے کہا۔

"لگتا ہے تجھے نیند آرہی ہے۔ چٹائی نکال لے اور باہر جاکر سوجا۔"

رحیم داد نے کوٹھری سے چٹائی نکال کر برآمدے میں بچھائی اور تھکا ہوا سا لیٹ گیا۔

☆

صبح بہت تڑکے رحیم داد بیدار ہوا۔ اس نے نورالٰہی کی دھوتی باندھی اور اپنے کپڑے دھونے بیٹھ گیا۔ اس نے قمیص اور شلوار رگڑ رگڑ کر خون کے دھبے صاف کرنے کی کوشش کی اور گیلے کپڑے دھوپ میں سوکھنے کے لیے آنگن میں ڈال دیے۔

دوپہر کو جیناں کھانا لے کر آئی۔ رحیم داد کمرے کے اندر دروازے کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ نورالٰہی برآمدے میں تھا۔ جیناں اسے کھانا دے کر چپ چاپ چلی گئی۔ نورالٰہی کھانا لے کر کمرے میں آیا۔ دونوں نے کھانا کھایا۔

نورالٰہی آدھی روٹی سے زیادہ نہ کھا سکا۔ وہ صبح سے مسلسل کھانس رہا تھا۔ کھانسی کے ساتھ خون بھی آیا۔ دن ڈھلے بخار تیز ہوگیا۔ وہ بستر پر لیٹا بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ نقاہت اتنی بڑھ گئی تھی کہ رحیم داد سے زیادہ بات چیت بھی نہیں کرسکا۔

کپڑے سوکھ چکے تھے۔ رحیم داد کپڑے پہن کر نورالٰہی کے قریب مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ شام کا دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ نورالٰہی آنکھیں بند کیے بستر پر نڈھال پڑا تھا۔ رحیم داد نے لالٹین روشن کی۔ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی پھیل گئی۔ ذرا دیر بعد بیرونی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ساتھ ہی جیناں کی آواز بھی ابھری۔

وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ رحیم داد مخمصے میں پڑ گیا۔ نورالٰہی نے آنکھیں کھول کر رحیم داد کو دیکھا۔ ہانپنے کے انداز میں سانس بھرتا ہوا اٹھا۔ رحیم داد کو کوٹھری میں جانے کا اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر گیا۔

رحیم داد کوٹھری کے بند دروازے کے پیچھے دم سادھے کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے جیناں کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"چوہدری! آج تیری طبیعت کچھ زیادہ ہی گڑبڑ ہے۔ توں کہے تو اکبر کو تخت ہزارے بھیج کر حکیم



سے دوائی منگوالوں؟"

"دوائی تو ہے۔ سویرے اکبر کو میرے پاس بھیج دینا۔ میں اسے حال بتادوں گا۔ وہ حکیم کے پاس چلا جائے گا۔ حکیم دوسری دوائی دے گا تو لے آئے گا۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "میں خود حکیم کے پاس چلا جاتا مگر کل اٹھ دس میل سائیکل چلائی تو طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ بخار بھی کچھ زیادہ ہی لگتا ہے۔ آج تو مجھ سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔"

"توں نے دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے؟ اسے کھولنے کے لیے تیں نوں بکھار میں اٹھنا پڑا۔ پہلے تو ایسا نہیں کرتا تھا۔" جیناں چند لمحے خاموش رہی۔ "کل رات تیرے پاس کوئی آیا تھا؟"

نورالٰہی نے صاف انکار کردیا۔ "میرے پاس تو کوئی نہیں آیا۔ تیں نوں کیسے پتہ چلا؟"

"اکبر رات تیرے پاس آیا تھا۔ وہ شام کو ساتھ کے پنڈ گیا تھا۔ واپسی پر ادھر آیا۔ تیرے بال بچوں کے بارے میں پتہ کرنا چاہتا تھا۔ اکبر کہتا تھا' تیرے کمرے سے دھیرے دھیرے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔"

"رات تو میرے سوا یہاں کوئی نہیں تھا۔ اکبر کو ویسے ہی شبہ ہوا ہوگا۔"

"شبہ تو مجھے بھی ہوا۔ میں دن میں تیرے پاس روٹی لے کر آئی تو باہر کپڑے بھی سوکھ رہے تھے۔ اب وہ کپڑے توں نے پہن بھی نہیں رکھے۔"

"میں نے دھوکر ٹرنک میں رکھ دیئے ہیں۔" نورالٰہی نے فوراً بات بنائی۔ "کپڑے دھونے ہی سے تو آج میری طبیعت اتنی گڑبڑ ہوگئی۔"

"توں نے کپڑے کیوں دھوئے؟ مجھے دے دیتا۔ کیا پہلے دھونے کو نہیں دیتا رہا ہے؟ تیں نوں بیماری میں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اکبر تیرا مزارع بھی تو ہے۔"

"ایسی گل بات نہ کر۔" نورالٰہی نے قدرے اونچی آواز سے کہا۔ "کوئی مزارع شزارع نہیں۔ وہ نیک بندہ ہے۔ اور تو بھی میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ صبح شام روٹی کھلاتی ہے' دوائی منگوا کر دیتی ہے۔ کیا نہیں کرتی؟ تو نہ ہوتی تو میں کب کا ختم ہوگیا ہوتا۔"

"لے میں تیرا کیا کام کرتی ہوں۔ چوہدری! کیسی گلاں کر رہا ہے۔ گھر کے دھندوں سے چھٹی ہی نہیں ملتی۔ چھوہری الگ بیمار ہے۔ اسے حکیم نے کالی کھانسی بتائی ہے۔ اسی لیے تیرے پاس زیادہ نہیں آتی۔"

"اب جا۔ اکبر تیرا انتظار کر رہا ہوگا۔ چھوہری بیمار ہے۔ روتی ہوگی۔"

نورالٰہی آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ جیناں چلی گئی۔

☆

رحیم داد کوٹھری سے باہر آگیا۔ اس نے آنگن میں جا کر بیرونی دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ واپس کمرے میں آیا تو نورالٰہی نے کہا۔ "سنا' جیناں کیا کہہ رہی تھی؟"

رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔ "لگتا ہے' اسے کچھ شبہ ہوگیا ہے۔"

"میں نے اسے مطمئن تو کردیا ہے۔ پر اب زیادہ احتیاط کرنی ہوگی۔"

دونوں نے مزید بات چیت نہیں کی۔ خاموشی سے کھانا کھایا۔ نورالٰہی نے اس وقت بھی تھوڑا کھانا کھایا اور کھاتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔

لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ مٹیالا لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نمایاں ہوگئے تھے۔ ڈاڑھی اور سر کے بال بے ترتیب تھے۔ ان پر ہلکی ہلکی گرد بھی نظر آتی تھی۔ قادر آباد سے آنے کے بعد اس نے اب تک غسل نہیں کیا تھا۔ وہ چت لیٹا تھا اور آنکھیں کھولے چھت کو تک رہا تھا۔

رحیم داد کچھ دیر اس کے قریب مونڈھے پر بیٹھا رہا اس نے اٹھ کر چٹائی نکالی اور برآمدے میں جا کر لیٹ گیا۔ آنکھ ذرا لگی ہی تھی کہ اس نے نورالٰہی کی آواز سنی۔ وہ اسے بلا رہا تھا۔ رحیم داد اس کے پاس گیا۔ نورالٰہی کہنے لگا۔ "ذرا مجھے پانی پلا دے۔ سخت پیاس لگی ہے۔" رحیم داد نے اسے پانی پلایا۔ پانی پی کر وہ بولا۔ "ذرا دیر میرے نزدیک بیٹھ جا۔ جی بہت گھبرا رہا ہے۔ نیند بھی نہیں آرہی ہے۔"

رحیم داد مونڈھا کھسکا کر اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اس کا ماتھا چھو کر بولا۔ "تجھے تو ابھی تک تیز بخار ہے۔ دوائی پلا دوں؟"

"دوائی تو میں نے شام ہی کو پی لی تھی۔"

رحیم داد ہاتھ بڑھا کر دھیرے دھیرے نورالٰہی کا سر دبانے لگا۔ کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ گاؤں پر سناٹا طاری تھا۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی میں نورالٰہی کی آواز ابھری۔ "ایسا محسوس ہوتا ہے' اب میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گا۔" اس کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ اس میں درد کی کسک تھی۔

رحیم داد نے اسے تسلی دی۔ "چوہدری! حوصلے سے کام لے۔ کچھ دنوں میں چنگا ہو جائے گا۔"

"میں نوں پتہ ہے' کیا ہونے والا ہے۔" نورالٰہی نے آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت موذی بیماری ہے۔ مشکل ہی سے کوئی اس سے بھلا چنگا ہوتا ہے۔ میرے پاس لاکھوں روپے کا کلیم



ہے پر کس کام کا۔ کسی کے بھی کام نہیں آسکتا۔"

"تیرے بال بچوں کے تو کام آہی سکتا ہے۔"

نورالٰہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پتہ نہیں وہ زندہ بھی ہیں کہ تریموں کے پتن ہی پر کرم الٰہی کی طرح شہید ہوگئے۔"

"توں بتاتا تھا' وہ پاکستان آگئے تھے اور لہور کے والٹن کیمپ میں ٹھیرے بھی تھے؟"

"سنا ہی سنا ہے۔ جانے ان کا کیا بنا۔ لگ بھگ ۸ سال ہوگئے انھیں ڈھونڈتے ہوئے۔" وہ خاموش ہوگیا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ "میرا دوسرا پتر ارشاد الٰہی اب ۱۸ برس کا ہوگا۔ وہ میرا بازو بن سکتا تھا۔" اس نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ "پر رب کو یہ منظور ہی نہیں۔"

رحیم داد نے اس کا کندھا ہولے ہولے تھپ تھپایا۔ "چوہدری! حوصلہ رکھ۔ تیرا پتر تجھے ضرور مل جائے گا۔ رب نے چاہا' تیری گھر والی اور کڑی بھی مل جائے گی۔ پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"توں مجھے نیک بندہ لگتا ہے۔" نورالٰہی نے رحیم داد کی ہمدردی سے متاثر ہو کر کہا۔ "پر قتل کی واردات میں کیسے پھنس گیا؟ مجھے جرائم پیشہ نہیں لگتا۔ تیرا چہرہ اور تیری بات چیت کا انداز یہی بتاتا ہے۔" اس نے قدرے تامّل کیا۔ "توں نے اپنے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔ کچھ اپنے بارے میں گل بات کر' خاموشی میں میرا جی بہت گھبراتا ہے۔ تبھی تو میں تیرے ساتھ کل رات دیر تک باتیں کرتا رہا۔ دل کا کچھ بوجھ ہلکا ہوا تو تیرے جاتے ہی نیند بھی آگئی۔"

"چوہدری! میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے کسی کا کتل شتل نہیں کیا۔" رحیم داد نے صاف جھوٹ بولا۔ "میں اس کے ساتھ سک نالے میں ایک جھاڑی کے نیچے کھڑا تھا۔ پاس ہی اونچے اونچے ٹبے تھے۔ فیر ایسا ہوا جی' اوپر سے ایک بھاری پتھر لڑھک کر نیچے گرا میں تو بچ گیا۔ پتھر ٹھیک اس کے سر پر گرا۔ وہ اسی وکت مر گیا۔ میں بہت ڈر گیا۔ وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ میں گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔"

نورالٰہی نے مشتبہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ "پر ادھر ویرانے میں گیا کس لیے تھا؟ ادھر تو کوئی نہیں جاتا۔ میں نے سنا ہے....." وہ اپنی بات پوری نہیں کرسکا۔ باہر درختوں تلے خشک پتوں پر چاپ ابھری۔ دونوں نے چونک کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔

رحیم داد جھپاک سے چارپائی کی اوٹ میں دبک گیا۔ ذرا دیر بعد کھڑکی پر ایک سایہ ابھرا۔ نورالٰہی آہستہ سے کھنکارا۔ سایہ فوراً غائب ہوگیا۔ نورالٰہی نے اونچی آواز سے پوچھا۔ "کون ہے؟" کوئی

جواب نہیں ملا۔ نورالٰہی کراہتا ہوا بستر پر بیٹھ گیا۔ نیچے اترا اور لڑکھڑاتے قدموں سے جا کر کھڑکی پر کھڑا ہو گیا۔

وہ واپس آکر بستر پر بیٹھا تو رحیم داد نے دھیرے سے پوچھا۔ "کون تھا؟"

اس نے بھی آہستہ سے جواب دیا۔ "مجھے تو کوئی نظر نہیں آیا۔" دونوں خاموش رہے۔ چند لمحے بعد نورالٰہی نے رحیم داد سے کہا۔ "اب جا کر لیٹ جا۔ بتی ذرا دھیمی کر دے۔"

نورالٰہی بستر پر لیٹ گیا۔ رحیم داد نے طاق میں رکھی ہوئی لالٹین کی لو دھیمی کی۔ کمرے سے نکلا اور چٹائی پر جا کے لیٹ گیا۔ مگر وہ سویا نہیں۔ جیناں نے نورالٰہی سے جس طرح شک کا اظہار کیا تھا' اسے سن کر رحیم داد گھبرا گیا تھا۔ بعد میں درختوں کے نیچے آہٹ ابھری اور پر اسرار سایہ بھی کھڑکی پر نظر آیا۔ رحیم داد اور خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اپنی صفائی میں اس نے جس حیلے کا سہارا لیا تھا' اس پر نورالٰہی نے یقین نہیں کیا۔ وہ اس سے کرید کر اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ رحیم داد نے سوچا' سویرے نورالٰہی اس سے مزید پوچھ گچھ کرے گا۔ وہ پولیس میں رہ چکا ہے' لہٰذا اسے غچا دینا آسان نہیں۔

رحیم داد نے طے کیا کہ سورج نکلنے سے پہلے ہی کہیں اور چلا جائے گا۔ وہ آنکھیں بند کئے خاموش لیٹا رہا۔ کمرے سے رک رک کر نورالٰہی کے کھانسنے اور آہستہ آہستہ کراہنے کی آواز ابھر رہی تھی۔ رات گہری ہوتی گئی۔ سناٹا بڑھ گیا۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ نورالٰہی کی کھانسی بند ہو گئی اور دیر تک سنائی نہیں دی۔ رحیم داد خاموشی سے اٹھا' دبے قدموں دروازے پر پہنچا۔ جھک کر کمرے میں دیکھا' نورالٰہی چارپائی پر سو رہا ہے۔ وہ کمرے میں چلا گیا۔

نورالٰہی آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چارپائی کے قریب ہی ٹرنک رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوئی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ اسے بستر پر ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا کہ نورالٰہی آنکھیں کھولے اس کی جانب دیکھ رہا ہے۔ وہ آہستہ سے کھنکار کر بولا۔ "ٹرنک میں کچھ نہیں ہے۔ میرے پاس جو تھوڑی بہت رقم تھی وہ ڈاک خانے میں جمع کرادی۔ صرف کلیم کے کاغذات ہیں' وہ تیرے کسی کام کے نہیں۔" اس نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر کنجی نکالی۔ "یہ چابی لے اور ٹرنک کھول کر دیکھ لے۔" اس نے کنجی رحیم داد کی جانب بڑھائی۔



رحیم داد گم صم کھڑا چودھری نورالٰہی کا چہرہ تکتا رہا۔ نورالٰہی کھانسنے لگا اور کھانستے کھانستے اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جھک کر چارپائی کے نیچے رکھی ہوئی مٹی کی کنالی میں تھوکا۔ بلغم کے ساتھ جیتا جیتا بہت سا خون نکلا۔ نورالٰہی لمبی لمبی سانس بھر کر ہانپنے لگا اور نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ کنجی اس کی انگلیوں سے چھوٹ کر بستر پر ایک طرف گر گئی۔

رحیم داد نے کنجی دیکھی پھر نورالٰہی پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دھندلی روشنی میں اس کے چہرے پر چھائی ہوئی زردی گہری ہو گئی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ رحیم داد آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا۔ اس کے سرہانے کھڑے ہو کر اس نے دونوں ہاتھ بڑھائے اور نورالٰہی کا گلا دبوچ لیا۔

نورالٰہی نے آنکھیں کھول دیں۔ رحیم داد نے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔ نورالٰہی نے بے بسی سے اپنی گردن ادھر ادھر ہلانے کی کوشش کی۔ اس کے حلق سے بلی کی طرح غرانے کی سی آوازیں نکلیں۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ منکا ڈھلک گیا۔ رحیم داد خاموش کھڑا اس کا بے جان چہرہ تکتا رہا۔ اس کے ہونٹوں کے ایک گوشے سے گاڑھے گاڑھے خون کی پتلی سی دھار نکل کر نیچے ٹھوڑی تک پھیل گئی تھی۔

اس نے نورالٰہی کی لاش کے قریب پڑی ہوئی کنجی اٹھائی' ٹرنک کا تالا کھولا۔ ٹرنک میں پہننے کے چند کپڑے رکھے تھے۔ اس نے کپڑے الٹ پلٹ کر دیکھے۔ نورالٰہی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ٹرنک میں کوئی رقم نہیں تھی۔

رحیم داد نے کلیم کے کاغذات کا بستہ باہر نکالا۔ شلوار اور قمیص نکالی۔ اپنے کپڑے اتارے اور نورالٰہی کی قمیص اور شلوار پہن لی۔ حکیم چشتی کے جو کپڑے اب تک اس کے جسم پر تھے' اس نے ٹرنک میں نہیں رکھے۔ بستہ کھولا' کپڑے لپیٹ کر کلیم کے کاغذات کے ساتھ رکھے اور ان کی گٹھری بنائی۔ اس نے ٹرنک کا ڈھکنا بند کیا' تالا لگایا اور کنجی نورالٰہی کی لاش کے سرہانے تکیے کے نیچے رکھ دی۔

وہ کمرے سے باہر گیا' چٹائی اٹھائی اور لپیٹ کر کوٹھری میں رکھ دی۔ اس نے نورالٰہی کی لاش پر گہری نظر ڈالی۔ بے جان آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں کے گوشے سے بہتا ہوا خون جم کر سیاہی مائل سرخ ہو گیا تھا۔

وہ کمرے سے نکل کر آنگن میں گیا۔ اس نے باہر جانے والے دروازے کی کنڈی کھولی مگر کچھ سوچ کر باہر نہیں گیا۔ کنڈی دوبارہ لگائی اور آنگن کی چار دیواری کا جائزہ لیا۔ دیواریں زیادہ اونچی

نہیں تھیں۔

اس نے گٹھری کندھے پر لٹکائی۔ آنگن میں گھوم پھر کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسے ایک ٹوٹی ہوئی گھڑونچی مل گئی۔ گھڑونچی اس نے دیوار سے ٹکائی اور اس کے سہارے اوپر پہنچ گیا۔ اس نے ایک پیر نیچے لٹکایا اور آہستہ سے ٹھوکر مار کر گھڑونچی نیچے گرا دی۔

وہ دھیرے سے باہر اتر گیا۔ آگے بڑھا اور درختوں کے نیچے اندھیرے میں دبے دبے قدموں چلنے لگا۔ گاؤں سے نکل کر کچے راستے پر آ گیا۔ وہ تخت ہزارہ کی جانب بڑھنے لگا۔ میل' ڈیڑھ میل کے بعد ویران اور بنجر میدان آ گیا۔

رحیم داد کچا راستہ چھوڑ کر ببول کی جھاڑیوں کی جانب بڑھا۔ جھاڑیوں کے نیچے اس نے نرم اور پولی زمین تلاش کی' چاقو نکالا اور خاصا گہرا گڑھا کھودا' گٹھری سے مقتول حکیم چشتی کے کپڑے نکالے اور گڑھے میں دبا کر زمین ہموار کر دی۔

رحیم داد نے کلیم کے کاغذات کا بستہ بغل میں دبایا اور کچے راستے پر چلنے لگا۔ تخت ہزارہ قریب آ گیا مگر وہ بستی میں نہیں گیا۔ داہنے ہاتھ کے ایک راستے پر مشرق کی طرف مڑ گیا۔



# ۱۷

رات کسی قدر گرم تھی' اور ہوا بھی ٹھہری ہوئی تھی۔ دور سے بیلوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد ان آوازوں کو سن کر ٹھٹکا اور گردن اٹھا کر اس سمت دیکھنے لگا جدھر سے گھنٹیوں کی جھنکار رات کے سناٹے میں بلند ہو رہی تھی۔

رحیم داد کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والے سنسان پی ہے پر کھڑا تھا۔ چند لمحے ٹھہر کر وہ آگے بڑھا اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا پی ہے پر چلنے لگا۔ پیہا ختم ہوا تو کچی سڑک آ گئی۔

اس نے دیکھا' سامنے سڑک پر ایک قطار میں کئی بیل گاڑیاں گزر رہی ہیں۔ رحیم داد نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ بیل گاڑیوں میں لاوے سوار ہیں۔ وہ اجرت پر فصل کی کٹائی کرنے والے مزدور تھے۔

چیت کا مہینہ ختم ہو چکا تھا' بیساکھ کے ابتدائی دن تھے۔ ربیع کی کٹائی کہیں کہیں شروع ہو چکی تھی۔ لاوے کام کی تلاش میں جا رہے تھے۔

رحیم داد نے ایک درخت کے نیچے رک کر بیل گاڑیوں کو غور سے دیکھا۔ ہمت سے کام لیا۔ آگے بڑھا' ایک بیل گاڑی کے قریب پہنچا اور اس میں بیٹھے ہوئے لاوے کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

"گل سن۔" اس نے قدرے تامل کیا۔

"تیں نوں کتھے جانا ہے؟"

لاوے نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم تو جی کریم کوٹ سے آ رہے ہیں اور گیمر ہوتے

ہیں بوہڑپور جائیں گے۔ اتھے جانا ہو تو گڈّے میں بہ جا۔"

"جانا تو میں نے آگے ہے۔ بوہڑپور ہی پہنچا دے۔"

لاوے نے بیل گاڑی روک لی۔ رحیم داد اس پر سوار ہو گیا۔ بیل گاڑی ہچکولے کھاتی ہوئی سڑک پر چلنے لگی۔ رحیم داد بہت تھکا ہوا تھا۔ کچھ دیر بیٹھا جھومتا رہا' آخر لڑھک کر سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ بیل گاڑیاں سڑک کے کنارے کھڑی تھیں۔ قریب ہی کوئی بستی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رات کے سناٹے میں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد نے آنکھیں ملتے ہوئے لاوے سے پوچھا۔

"بوہڑپور آ گیا؟"

"ابھی تو کوٹ عالم بھی نہیں آیا۔ بوہڑپور تو بہت آگے ہے۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "ادھر کیسے آ گیا؟"

"ادھر فصل کی واڈھی کا کام مل گیا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تیں نوں بوہڑپور نہیں جانا۔"

"ہاں جی' اب تو ادھر کا کام پورا کرنے کے بعد ہی آگے جانا ہو گا۔"

قریب کھڑے ہوئے دوسرے لاوے نے کہا۔ "ایسا کر' اس ٹرک میں بہ جا۔" اس نے کچھ دور سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ کھڑا ہے ٹرک۔ بوہڑپور سے بھی آگے جا رہا ہے۔ دو روپے ڈریور کو دینا۔ رستے میں جہاں کہے گا' وہیں پہنچا دے گا۔ چل' میں تیری ڈریور سے گل بات کرا دیتا ہوں' اپنا جاننے والا ہے۔"

رحیم داد بیل گاڑی سے نیچے اترا اور لاوے کے ساتھ ٹرک کی جانب بڑھا۔ قریب جا کر لاوے نے ٹرک ڈرائیور سے کہا۔ "جیونا! تو بوہڑپور ہی کی طرف جا رہا ہے ناں؟" اس نے رحیم داد کی جانب اشارہ کیا۔ "اسے اپنے ساتھ بٹھا لے۔ اسے بھی اتھے ہی جانا ہے' پہنچا دے۔ دو روپے اس سے لے لینا۔"

ڈرائیور نے رحیم داد سے کہا۔ "میں نے تو چک بیدی جانا ہے۔ تجھے ادھر جانا ہو تو اگلی سیٹ پر بیٹھ جا۔"

"ہاں جی' میں نے بھی ادھر ہی جانا ہے۔" رحیم داد نے ڈرائیور کو دو روپے دیئے۔ اور ٹرک میں بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد ٹرک اسٹارٹ ہوا اور سڑک پر دوڑنے لگا۔

رحیم داد نے ڈرائیور سے پوچھا۔ "ٹرک ادھر کیوں کھڑا کر رکھا تھا؟"



"انجن گرم ہو گیا تھا۔" ڈرائیور نے بتایا۔ "ریڈی ایٹر میں پانی بھی ڈالنا تھا۔" اس کے بعد کوئی بات چیت نہیں ہوئی' ٹرک سڑک پر دوڑتا رہا۔ رحیم داد کی پھر آنکھ لگ گئی۔

وہ بیدار ہوا تو ٹرک پختہ سڑک پر دوڑ رہا تھا۔ رات ختم ہو چکی تھی۔ مغربی افق پر ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔ رحیم داد نے صبح کی روشنی دیکھی تو گھبرا گیا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔

"جیونا! ٹرک روک لے۔ میں نوں ایہیں اترنا ہے۔"

ڈرائیور نے ٹرک روک لیا۔ رحیم داد نے اپنا بستہ بغل میں دبایا اور ٹرک سے نیچے اتر گیا۔ ٹرک آگے بڑھا اور تیزی سے دوڑتا ہوا کچھ ہی دیر بعد درختوں کی اوٹ میں اوجھل ہو گیا۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ دونوں طرف کھیت تھے' جن کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ اجالا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔

رحیم داد آہستہ آہستہ سڑک پر چلتا رہا۔ میل ڈیڑھ میل بعد وہ کھیتوں میں گھس گیا اور ایک پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

ربیع کی فصلیں تیار کھڑی تھیں۔ اپریل کا سورج شرینہ کے گھنے درخت کے پیچھے سے آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ دھوپ ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ گندم اور جو کے پودے دھوپ سے سنہرے پڑتے جا رہے تھے۔

ہوا چلتی تو کھیتوں میں سرسراہٹیں ابھرتیں' مدھم سروں میں جل ترنگ بجتے۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔ مگر دور سے ڈھول پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

رحیم داد آگے بڑھتا گیا۔ وہ ایسی جگہ پہنچ گیا' جہاں راستے کے ایک طرف کھیتوں میں گندم اور جو کی بالیاں ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہی تھیں۔ دوسری طرف اجاڑ کھیت تھے۔ فصل تازہ تازہ کٹی تھی۔ جگہ جگہ کٹی ہوئی فصل کے ٹرنڈے ابھرے ہوئے تھے۔ گندم کے خوشے اور سٹّے بکھرے تھے۔

پگڈنڈی سے ذرا ہٹ کر چھ سات سلّے بار عورتیں زمین پر جھکی ہوئی خوشے اٹھا اٹھا کر دوپٹوں کی جھولیوں میں ڈال رہی تھیں۔ ان کے بوسیدہ اور میلے کچیلے لباس صاف چغلی کھا رہے تھے کہ وہ مصلیوں اور کمّیوں کے گھروں کی عورتیں ہیں۔

اس نے ایک سرسری نگاہ سلّے بار عورتوں پر ڈالی۔ ان میں ایک سانولی سلونی مٹیار بھی تھی۔ وہ لمبی دھوتی کا ادھڑونچا باندھے ہوئے تھی اور پلو کندھے سے اتار کر اس میں گندم کے خوشے چن چن کر ڈال رہی تھی۔

چاپ سن کر اس نے گردن کو ذرا سا خم دے کر نظریں موڑیں۔ اس کی ناک میں فیروزے کا کوکا تھا۔ آنکھوں سے بھری جوانی کی دھوپ جھلکتی تھی۔

وہ رحیم داد کو دیکھ کر الھڑپن سے مسکرائی۔ وہ چند ہی قدم کے فاصلے پر تھی' اس قدر قریب کہ رحیم داد اس کے بھرے بھرے کولھوں کا ہر دائرہ اور ہر خم دیکھ سکتا تھا۔ رحیم داد لمحے بھر کو ٹھٹکا پھر جھٹ نظریں نیچی کر کے آگے بڑھ گیا۔

ڈھول بجنے کی آوازیں اب قریب آتی جا رہی تھیں۔ آوازیں دائیں ہاتھ کی کھڑی فصلوں کے پیچھے سے آ رہی تھیں۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا۔ لگ بھگ پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ایک اجاڑ کھیت کے اس پار گندم کی فصل کٹ رہی تھی۔ بھرائی اور ڈھولی زور زور سے ڈھول پر چوٹ لگا رہے تھے۔

فصل کی کٹائی کرنے والے ہاتھوں میں درانتیاں سنبھالے تیزی سے ہاتھ چلاتے' ڈھول کی تھاپ پر رک رک کر اونچی آواز سے بلے بلے کہتے۔ فصل کاٹنے والے لاوے نہیں تھے۔ وہ مزارعے تھے اور مانگی پر فصل کاٹنے آئے تھے۔

☆

دو سال پہلے ربیع کی فصل پر رحیم داد نے بھی انھی دنوں اسی طرح مانگی پر اپنی فصل کٹوائی تھی۔ واڈھی سے پہلے حسب دستور اس نے مانگی کے لیے سیپی کمیوں کے ذریعے گاؤں والوں کو پیغام بھیجا تھا۔ ان دنوں زمین کے مسئلے پر سیف اللہ سے اس کی لاگ ڈاٹ چل رہی تھی۔ معاملہ عدالت تک پہنچ چکا تھا۔

سیف اللہ گاؤں کا کھاتا پیتا زمیں دار تھا اور رحیم داد کے پاس صرف بارہ ایکڑ زمین تھی۔ مگر مقدمہ رحیم داد کے حق میں جا رہا تھا۔ گواہ بھی اس کے پکے تھے۔ پٹواری نے سو روپے اور چار من گندم رشوت میں لے کر رحیم داد کا مقدمہ اور مضبوط بنا دیا تھا۔

سیف اللہ اس کی کھلم کھلا مخالفت پر اتر آیا تھا۔ اس نے اور اس کے بھائیوں نے گاؤں والوں کو ورغلایا کہ رحیم داد کی مانگی پر فصل کاٹنے نہ جائیں۔ مگر صبح جب رحیم داد' بیوی بچوں کے ساتھ اپنے کھیتوں پر پہنچا اور ڈھولیوں نے ڈھولوں پر زور سے چوٹ لگائی تو گاؤں والے گھروں سے نکل نکل کر فصل کی کٹائی کے لیے پہنچنے لگے۔ سیف اللہ اور اس کے بھائیوں کی باتوں پر ان کے اپنے مزارعوں کے سوا کسی نے کان نہ دھرا۔

دھوپ تیز ہوئی اور اوس کی نمی ذرا خشک ہوئی تو سب درانتیاں سنبھال کر کٹائی پر جٹ گئے۔



انھوں نے رحیم داد کو کٹائی میں ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا۔ وہ الگ بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہا۔ ڈھول بجتے رہے' فصل کٹتی رہی۔

فصل کاٹنے والے سب مرد تھے۔ عورت صرف رحیم داد کی بیوی نوراں تھی۔ وہ کٹے ہوئے پودوں کے پولے باندھ باندھ کر ڈھیر لگاتی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ چہرہ پسینے سے تر تھا' تیز دھوپ اور سخت محنت سے گلابی پڑ گیا تھا۔ بچے بھی اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ننھی زینو ضد کرتی یا روتی تو نوراں غصے سے جھڑک دیتی۔ رحیم داد زینو سے بہت پیار کرتا تھا۔ تھی بھی وہ بہت بھولی بھالی اور ماں کی طرح خوب صورت۔ نوراں' جب اسے جھڑکتی یا غصے سے آنکھیں نکال کر چیختی تو وہ حقے کی نے منہ سے ہٹا کر بیوی کو نرمی سے سمجھاتا' کبھی ڈانٹتا' مگر فوراً ہی بے تکلفی سے مسکرانے بھی لگتا۔

اس روز وہ بہت موج میں تھا۔ عالم وارفتگی میں زور زور سے قہقہے لگاتا۔ بار بار کٹائی کرنے والوں کے پاس جاتا' ان کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا۔ جب ڈھولی' کٹائی کرنے والوں کا حوصلہ بڑھانے کی غرض سے ڈھول کی تھاپ تیز کرتے تو ہر طرف سے بلے بلے کی آوازیں ابھرتیں۔ رحیم داد بھی ان کے جوش و خروش میں شامل ہو کر ہاتھ اٹھا اٹھا کے اونچی آواز سے بلے بلے کی صدا لگاتا۔ کٹائی کرنے والوں کے ہاتھ اور تیزی سے چلتے۔

سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے فصل کٹ گئی۔ کٹائی کرنے والے مویشیوں کو چارہ دینے اور دوسرے کام کاج کرنے گھروں کو چلے گئے۔ مگر فصل کی اجتماعی کٹائی' مانگی' کے رواج کے مطابق رات کو وہ منگ کے لیے پھر رحیم داد کے گھر پر اکٹھا ہوئے۔ رحیم داد کے گھر پلاؤ کی دیگ چڑھی تھی۔ اس نے ایک ایک کو بڑی محبت اور چاؤ سے کھانا کھلایا۔ اس ضیافت کے لیے اس نے کھانے میں خاص اہتمام کیا تھا۔

اس رات مشعلوں کی روشنی میں ڈھولوں کی تھاپ پر بھنگڑا ڈالا گیا۔ بھنگڑا ڈالنے والوں نے ڈھولیوں کے گرد حلقہ بنا لیا تھا۔ رحیم داد نے اجلے کپڑے پہنے تھے۔ سر میں تیل ڈال کر بیچ سے مانگ نکالی تھی۔ دونوں طرف بالوں کی پٹیاں جمائی تھیں۔ مونچھیں مروڑ کر خوب نکیلی بنائی تھیں۔ اس کے قریب ہی نوراں کھڑی تھی۔

اس نے نہا دھو کر ٹرنک سے راکھواں کپڑے نکال کر پہنے تھے۔ سوتی دھوتی اتار کر ریشمی سلارا باندھا تھا' جس پر تلے کی دھاریاں تھیں اور تیز روشنی میں خوب جھلملا رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر دنداسا ملا تھا۔ آنکھوں میں گہرا کاجل ڈالا تھا۔ تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ جوان اور

دلکش لگ رہی تھی۔

رحیم داد نے بیوی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور سب کی نظریں بچا کر ہولے سے اس کے رخسار کی چٹکی بھری۔

وہ من چلے نوجوانوں کی طرح سینہ تان کر آگے بڑھا۔ ایک ڈھولی سے ڈھول لے کر گلے میں ڈالا۔ ایک ہاتھ سے ڈھول پر تھاپ دی اور دوسرا کان پر رکھ کر اونچے سر میں ڈھولے کا ایک ٹپّہ الاپنے لگا۔

وہ اپنے بالوں کے پٹّوں کو جھٹکا دے کر تیزی سے لہراتا اور جھوم جھوم کے ٹپّا الاپتا۔ دوسرے مل کر آخری بول دہراتے اور بانہیں الارالار کر تیز رقص کرتے۔

بھنگڑے کا مزا اس وقت سوا ہوا جب جمال دین بھی بڑھ کر آگے آگیا۔ وہ گبھرو جوان تھا۔ اس کا بدن گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔ اب رحیم داد اور جمال دین ایک دوسرے کو للکارتے اور ڈھول پر دھنگڑ کے ساتھ لہک لہک کر ٹپّا الاپتے۔ رحیم داد مسکرا مسکرا کر نوراں کو دیکھتا۔ وہ کبھی شرماتی، کبھی کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

رحیم داد ڈھول پر زور سے تھاپ دے کر زیادہ اونچی تان لگاتا۔ بول اونچے، اور اونچے ہوتے گئے۔ رقص تیز، اور تیز ہوتا گیا۔

رحیم داد بیتے دنوں کی یادوں میں مگن آگے بڑھتا گیا اور سوچتا رہا کہ اس بار اس کی فصل ابھی کٹی بھی ہوگی یا نہیں۔ وہ خود تو خریف کی فصل کے لیے بھی اپنے کھیتوں میں ہل نہیں چلا سکا تھا۔ حالانکہ ربیع کی فصل کی کٹائی کے کچھ ہی دنوں بعد وہ زمین کا مقدمہ جیت گیا تھا۔ رات کو مقدمہ جیتنے کی خوشی میں اس کے گھر خوب جشن رہا۔ پیٹرومکس کی تیز روشنی میں لڈّی ناچ ہوا۔ بیچ میں ڈھولی تھے اور ان کے گرد رقص کرنے والے باری باری پاؤں اٹھاتے، بانہیں سر کی سیدھ میں لہراتے اور ایک ایڑی پر بیٹھ کر ڈھولیوں کے چاروں طرف تیزی سے گھومتے۔

رقص کرنے والوں میں رحیم داد بھی شامل تھا۔ اس کے سر پر سرخ جیرا تھا جو پاک پتن میں بابا فرید گنج شکر کے مزار پر چادر چڑھانے کے بعد نیک شگون کے طور پر نوراں نے اپنے ہاتھ سے باندھا تھا۔ نوراں اس وقت عورتوں کے جھرمٹ میں سب سے آگے نظر آرہی تھی۔ وہ ریشمی پٹانگی پہنے، بنی سنوری ایسی سج دھج سے کھڑی تھی کہ اس کا حسن اور نکھر گیا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔

ناچتے ناچتے بیوی پر رحیم داد کی نظر پڑتی تو وہ ترنگ میں آکر ایڑی کے بل تیزی سے گھومتا اور



شیفتگی کے عالم میں زور زور سے نعرہ بلند کرتا۔

ہو ہو، علی علی، لڈّی گھم لڈّی

فتح کے اس جشن کے چند ہی روز بعد سیف اللہ اور اس کے بھائیوں نے اپنے حامیوں کے ساتھ، شام کے جھٹپٹے میں رحیم داد پر حملہ کیا۔ حملہ آور آٹھ تھے اور پوری طرح مسلح بھی تھے۔ رحیم داد کے ساتھ صرف جمال دین اور اللہ ورایو تھے۔ مگر وہ بھی نہتے نہیں تھے۔ رحیم داد کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ جمال دین اور اللہ ورایو کے پاس لمبی لمبی ڈانگیں تھیں۔ تینوں نے جم کر مقابلہ کیا، زخمی بھی ہوئے مگر پیچھے نہیں ہٹے۔

رحیم داد کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ رحیم داد نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ہاتھ میں بھرا ہوا اپنا جیتا جیتا خون دیکھا۔ وہ جوش سے تڑپ اٹھا۔ اس نے ہونٹ دانتوں میں بھینچے، بڑھ کے کلہاڑی کا بھرپور وار کیا۔ کلہاڑی سیف اللہ کا کندھا کاٹتی ہوئی پسلیوں تک اتر گئی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔

سیف اللہ کے گرتے ہی اس کے بھائی اور حمایتی بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعد میں سیف اللہ کو زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا۔ اسے تین دن بعد ہوش آیا۔ رحیم داد، جمال دین اور اللہ ورایو گرفتار کرلئے گئے۔

پولیس نے تگڑی رشوت لے کر سیف اللہ اور اس کے بھائیوں کی پوری طرف داری کی۔ رحیم داد اور اس کے ساتھیوں پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۷ کے تحت بلوے اور اقدام قتل کا مقدمہ قائم کرکے عدالت میں چالان پیش کردیا۔

تینوں ملزموں کو تفتیش کے لیے کچھ عرصہ ریمانڈ پر حوالات میں رکھا گیا۔ بعد میں منٹگمری جیل میں منتقل کردیا گیا۔ نوراں ملاقات کے دن جیل میں ملنے رحیم داد کے پاس آتی اور اس کے لیے میدے اور چینی سے بنا ہوا گھیور ضرور لاتی۔ گھیور رحیم داد بڑی رغبت سے کھاتا تھا۔ جب سے رحیم داد جیل گیا تھا نوراں نے رو رو کر برا حال کرلیا تھا۔ اس کا شگفتہ چہرہ مرجھا گیا تھا۔ وہ بیمار اور لاغر نظر آتی۔

مقدمے کی پیشیاں پڑتی رہیں۔ رحیم داد کی ضمانت بھی نہ ہوسکی۔ مقدمے کا فیصلہ ہوا تو جمال دین اور اللہ دینو بری ہوگئے۔ رحیم داد کو سزا ہوگئی۔ اب نوراں مہینے میں دوبار رحیم داد سے ملنے جیل پہنچتی۔

انہی دنوں رحیم داد کو نوراں کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے زمین، کھیتی باڑی کے لیے

جمال دین کو نصف پیداوار کے عوض ادھیارے پر دے دی۔ کرتی بھی کیا۔ دونوں لڑکے ابھی نو
تھے اور کسی طور کھیتی باڑی کا کام سنبھالنے کے قابل نہ تھے۔ ادھیارے پر زمین دینے کا مشورہ بھی رحیم داد ہی نے دیا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ نوراں نے اچانک جیل آنا بند کر دیا۔ جس وقت وہ لالی کے ساتھ جیل سے فرار ہوا، نوراں مہینے بھر سے نہیں آئی تھی۔ شاید بیمار پڑ گئی ہو۔ رحیم داد نے یہ سوچا تھا۔ لالی نے جب جیل سے فرار ہونے پر اکسایا تو تھوڑی سی حیل وحجت کے بعد اس لیے بھی آمادہ ہو گیا کہ وہ نوراں سے ملنے کے لیے بے قرار تھا اور بچوں کی یاد بھی ہر وقت ستاتی تھی۔

☆

رحیم داد آگے بڑھتا اور سوچتا رہا، نہ جانے نوراں اور بچے کس حال میں ہوں گے۔ نوراں اور بچوں سے ملنے اور انھیں دیکھنے کے لیے اس کا دل تڑپ اٹھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور آگے بڑھتا رہا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہاں جا رہا ہے؟ ڈھولوں کی آواز پیچھے رہ گئی تھی۔

راستے سے کچھ فاصلے پر بکائین کے ایک درخت کے نیچے جوہ میں لڑکے جمع تھے۔ وہ کیڑ کڑانگا کھیل رہے تھے۔

رحیم داد نے دیکھا، ایک کھلاڑی لڑکے نے اپنی ٹانگ کے نیچے سے ایک ٹیڑھی سی لکڑی پوری قوت کے ساتھ پھینکی۔ لکڑی سیدھی رحیم داد کی جانب آئی اور بچتے بچتے بھی رحیم داد کی پنڈلی سے ٹکرا گئی۔

وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا مگر رحیم داد کو دیکھ کر سہم گیا اور چند قدم کے فاصلے پر ٹھہر گیا۔ وہ اس وقت کھیل میں چھوتی تھا۔ اسے جلد سے جلد لکڑی اٹھا کر درخت کے نیچے بنے ہوئے دائرے میں رکھنا تھی اور دوسرے کھلاڑیوں کو درخت پر چڑھنے سے پہلے چھونے کی کوشش بھی کرنا تھی۔ مگر لکڑی اٹھانے کے بجائے لڑکا رحیم داد کے روبہ رو سہما ہوا کھڑا تھا۔ وہ سب سے کم عمر بھی نظر آتا تھا۔

اسے دیکھ کر رحیم داد کو اپنا بڑا بیٹا کریما یاد آ گیا۔ وہ لگ بھگ اتنا ہی بڑا تھا اور صورت شکل سے اسی کی طرح معصوم بھی لگتا تھا۔ رحیم داد اسے اس طرح زیادہ دیر پریشان نہ دیکھ سکا۔ اس نے جھک کر لکڑی اٹھائی اور مسکرا کر لڑکے کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لے پتر! فٹافٹ گھیرے میں جا کر رکھ دے۔"

لڑکے نے چپ چاپ لکڑی رحیم داد کے ہاتھ سے لی اور درخت کی جانب تیزی سے بھاگا۔ لیکن اس وقت تک تمام کھلاڑی درخت پر چڑھ چکے تھے اور شاخوں کے درمیان سے جھانک کر قہقہے لگا



رہے تھے۔

جوہ کے اس پار گاؤں کے مکانات نظر آ رہے تھے۔ مگر رحیم داد اس طرف نہیں گیا۔ راستہ ابھی سنسان تھا۔ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ کھیتوں کی منڈیر پھاند کر ایک شخص نکلا اور رحیم داد کے عین سامنے آ گیا۔ اس نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ لیکن رحیم داد نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ وہ پیہا عبور کر کے جوہ کی طرف جانے لگا اور مڑ مڑ کر رحیم داد کو دیکھتا بھی رہا۔ رحیم داد اس کی جانب دیکھے بغیر چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

سو سوا سو گز طے کرنے کے بعد اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ کچھ دور اسے چھوٹی سی مسجد نظر آئی۔ مسجد گاؤں کے آخری سرے پر تھی۔ آس پاس درختوں کا جھنڈ تھا۔ مگر وہاں بالکل خاموشی چھائی تھی۔

پہے سے نکل کر ایک تنگ پگڈنڈی کانگڑی کی فصلوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی مسجد کی سمت جاتی تھی۔ رحیم داد کہیں ٹھہر کر ستانا چاہتا تھا۔ ٹھہرنے کے لیے مسجد اسے مناسب جگہ معلوم ہوئی۔

وہ مسجد کی جانب بڑھا اور رفتہ رفتہ اس سے قریب ہوتا گیا۔ جب وہ چری کے کھیتوں سے نکل کر باہر آیا تو درختوں کے نیچے ایک ادھیڑ آدمی دکھائی دیا۔ وضع قطع سے وہ مسجد کا ملّا نظر آتا تھا۔ رحیم داد کی جیب میں ابھی تک مقتول حکیم چشتی کی عینک موجود تھی۔ اس نے اپنا حلیہ تبدیل کرنے کی غرض سے جھٹ عینک نکالی اور آنکھوں پر لگا لی۔

عینک لگا کر اسے ہر چیز بے ڈول اور دھندلی دھندلی نظر آنے لگی۔ مگر وہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ درختوں تلے کوئی زور سے کھنکارا۔ کھنکار سن کر رحیم داد کے قدم ڈگمگائے۔ وہ غڑاپ سے پانی سے بھرے ہوئے گڑھے میں گر گیا۔ عینک بھی آنکھوں سے ڈھلک کر پانی میں چلی گئی۔

گڑھا زیادہ گہرا نہیں تھا۔ پانی گھٹنوں سے کچھ اونچا تھا۔ رحیم داد نے گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا، ملّا اس کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ دبلا پتلا اور پستہ قد تھا۔ سر پر ململی پگڑی تھی۔ چہرے پر بالشت بھر سے زیادہ لمبی ڈاڑھی تھی جس میں جگہ جگہ سفید بال جھلک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں پر عینک تھی۔

ملّا نے غور سے رحیم داد کو دیکھا، مسکرا کر بولا۔ "تجھے اتنا بڑا پانی کا گڑھا نظر نہیں آیا؟"

رحیم داد نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملتے ہوئے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔ "مجھے جی کم نظر

آتا ہے۔ میری عینک بھی پانی میں گر گئی۔" وہ گڑھے سے نکل کر باہر آگیا اور جھک کر اپنی شلوار اور جوتے دیکھنے لگا۔

جوتے پانی اور کیچڑ سے لت پت تھے۔ شلوار بھی گڑھے کے مٹیالے پانی سے شرابور تھی۔ مگر کلیم کے کاغذات کا بستہ حفاظت سے بغل میں دبا ہوا تھا۔

ملّا نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "تیرے تو سارے کپڑے خراب ہوگئے۔ گڑھے کا پانی بھی نجس ہے۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ ملّا نے اسے خاموش پایا تو نرم لہجے میں بولا۔ "اس حالت میں کب تک یہاں کھڑا رہے گا؟ آ' میرے ساتھ۔" اس نے ہاتھ سے اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے بتایا۔ "مسجد کے نزدیک ہی میرا حجرہ ہے۔ اسی میں مدرسہ بھی ہے۔ آنگن ہے۔ آنگن میں کھوئی بھی ہے۔ اس سے پانی نکالنا اور اپنے کپڑے دھوکر دھوپ میں سکھانے کے لیے ڈال دینا۔ میں باندھنے کے لیے تجھے دھوتی دے دوں گا۔"

رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ "بہت مہربانی ہے جی۔" وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

دونوں مسجد کے سامنے سے گزر کر ایک کچے مکان کے بند دروازے کے سامنے ٹھہر گئے۔ ملّا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ "اندر آجا۔" رحیم داد اس کے ہم راہ گھر میں داخل ہوگیا۔

دروازے کے سامنے کشادہ آنگن تھا۔ آنگن میں ایک طرف کنواں تھا۔ قریب ہی پڑچھتی تھی۔ اس کی چھت کے نیچے مٹی کا بڑا سا چبوترا تھا۔ پڑچھتی خالی تھی۔ آنگن کے آگے دالان تھا۔ فرش پر کھجور کی شاخوں کی بنی ہوئی چٹائی بچھی تھی۔ دالان سے ملحق کوٹھری تھی۔ اس کے دروازے پر قفل پڑا تھا۔

ملّا نے آنگن میں پہنچ کر پوچھا۔ "میں نے تجھے یہاں پہلی بار دیکھا ہے۔ پنڈ میں تیرا کوئی شریکا یا عزیز دار ہے؟"

"نہیں جی' میرا یہاں کوئی جان پہچان کا نہیں۔ میں پہلی بار ادھر آیا ہوں۔"

"جبھی تو میں نے کہا کہ تجھے پہلی بار دیکھا ہے۔ تیرا چہرہ میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔" ملّا نے اسے تسلی دی۔ "فکر نہ کر۔" اس نے کنویں کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ رہی کھوئی۔ ڈول سے پانی نکال' کپڑے دھو اور غسل کر۔ میں تیرے لیے دھوتی لاتا ہوں۔"

وہ دالان میں گیا۔ جیب سے کنجی نکال کر قفل کھولا اور کوٹھری کے اندر چلا گیا۔



ایک دھوتی ہاتھ میں دبائے کوٹھری سے باہر آیا' رحیم داد کے قریب پہنچا اور دھوتی اس کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

"لے! یہ باندھ لے۔"

رحیم داد دھوتی سنبھال کر پڑچھتی کے نیچے گیا۔ شلوار اور قمیص اتاری۔ دھوتی باندھی اور اس کے ڈب میں ہمیانی' چاقو اور کھلے ہوئے روپے اڑس لیے۔ بستہ چبوترے پر سنبھال کر رکھا اور اپنے گندے کپڑے اٹھا کر کنویں پر پہنچ گیا۔

ملّا نے اسے دیکھا' قریب گیا اور اپنے بارے میں بتانے لگا۔ "میرا نام مولوی فضل احمد ہے۔ اس پنڈ میں آئے دو سال سے اوپر ہوگئے۔ میں پہلے ملتان میں ہوتا تھا۔ وہیں مدرسہ قاسم العلوم میں تعلیم پائی اور ایک مسجد میں پیش امام لگ گیا۔ وہاں سے حاجی صاحب مجھے یہاں لے آئے۔ حاجی صاحب پنڈ کے سب سے وڈے زمیں دار ہیں۔ بہت پرہیزگار اور نیک بندے ہیں۔" اس نے دالان کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ جگہ انھوں نے پنڈ کے سارے ہی بچوں کی دینی تعلیم کے لیے بنوائی ہے۔ لیکن اس پنڈ کے بچے سخت نالائق اور پاجی ہیں۔ مدرسے میں آتے ہی نہیں۔ دن بھر ادھر ادھر آوارہ گردی کرتے ہیں۔ کھیل کود میں وقت برباد کرتے ہیں۔ مشکل سے چند بچے پڑھنے کے لیے تیار ہوئے' وہ بھی بدبخت آئے دن ناغہ کرتے ہیں۔ میں خود ان کی تلاش میں جاتا ہوں' پکڑ کر مدرسے میں لاتا ہوں۔"

رحیم داد نے خالی دالان کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ "لگتا ہے' آج تو کوئی بھی منڈا پڑھنے نہیں آیا؟"

"آج میں نے انھیں چھٹی دے رکھی ہے' کل بھی مدرسہ بند رہے گا۔ بات یہ ہے جی' میں حاجی صاحب کے ہم راہ آج شہر جا رہا ہوں۔ کل عشا کی نماز سے پہلے واپس آجاؤں گا۔" اس نے چند لمحے تامل کیا' رحیم داد سے پوچھا۔ "تیرا کیسے ادھر آنا ہوا؟" رحیم داد خاموش کھڑا رہا۔ مولوی فضل احمد نے دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے' اتنا چپ چپ کیوں ہے؟"

"کیا بتاؤں ملاں جی۔" رحیم داد لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "یوں سمجھ لو' نصیب کا پھیر ہے۔ بستی بستی گھومتا پھرتا ہوں۔ یہاں بھی اسی چکر میں آگیا۔"

رحیم داد کی باتوں میں درد کی کسک تھی۔ مولوی فضل احمد خاصا متاثر ہوا۔ شفقت سے بولا۔

"توں مجھے دکھی اور غم زدہ معلوم ہوتا ہے۔ تیرا گھربار نہیں؟ بال بچے تو ہوں گے؟"

"گھربار بھی تھا' بال بچے بھی تھے۔" رحیم داد کو اپنا گھر اور بیوی بچے یاد آگئے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور تڑپ کر بولا۔ "سب کچھ اجڑ گیا۔ کچھ بھی نہ رہا۔"

"تیری گل سمجھ نہیں آئی۔" مولوی فضل احمد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "یہ جو گیمبر سٹیشن پر پچھلے دنوں ریل کا حادثہ ہوا تھا' تیرے بال بچے اس میں تو کام نہیں آگئے؟"

"نہیں جی' ایسی کوئی گل بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے جی۔" مولوی فضل احمد نے کرید کر پوچھا۔ "کسی سے پرانی دشمنی چل رہی تھی جس نے تیرا گھربار جلا دیا' بیوی بچوں کو اٹھوا لیا؟"

"ایسہ گل بھی نہیں۔" رحیم داد نے جھٹ کہا۔ "بات یہ ہے جی' جب پاکستان بنا تو میں گورداس پور کے موضع نصیر پور میں تھا۔ فسادات ہوئے تو سکھوں نے حملہ کر دیا۔ بہت تباہی مچائی۔ میں تو کسی نہ کسی طرح بچ نکلا اور پاکستان آگیا۔ میرے بعد گھر والی اور بچوں پر کیا گزری' میں نوں کچھ پتہ نہیں۔"

مولوی فضل احمد گویا ہوا۔ "ہاں جی مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر بہت ظلم و ستم ہوا۔" اس نے رحیم داد کے غم زدہ چہرے کی جانب دیکھا۔ "یہ بھی پتہ چلا' تیرے بال بچوں کا کیا بنا؟ زندہ بچے یا سب وہیں شہید ہو گئے؟"

"وڈا پتر تو راوی کے کنارے تریموں کے پتن پر سکھوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ جوان دھی تھی' سکھ اسے بھی اٹھا لے گئے۔" رحیم داد افسردہ لہجے میں مقتول چوہدری نور الٰہی کی دکھ بھری داستان اپنی ذات سے منسوب کر کے سنانے لگا۔ "گھر والی بچوں کو لے کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئی۔ لہور کے والٹن کیمپ میں کئی جاننے والوں نے اسے دیکھا بھی۔ میں ان دنوں منٹگمری کے مہاجر کیمپ میں تھا۔ یہ خبر ملتے ہی لہور پہنچا۔ والٹن کیمپ گیا مگر نہ گھر والی کا کھوج لگا' نہ بچوں کا۔ اب وہ کہاں ہیں؟ کس کے پاس ہیں؟ میں نوں کچھ نہیں معلوم۔" رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"۸ سال سے اوپر ہو گئے انھیں ڈھونڈتے ہوئے۔ جہاں کسی سے پتہ چلتا ہے' وہاں پہنچ جاتا ہوں' اسی چکر میں ادھر آگیا۔"

"میرے خیال میں تو نہ صرف اس پنڈ میں بلکہ پورے موضع میں ایسا کوئی مہاجر کنبہ نہیں ہے۔ میں انھیں جانتا بھی ہوں۔ گورداس پور کا تو کوئی نہیں۔" مولوی فضل احمد کچھ دیر خاموش کھڑا



سوچتا رہا پھر اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔

"حاجی صاحب سے پوچھوں گا' شاید انھیں کچھ خبر ہو۔ وہ اس موضع کے پرانے زمیں دار ہیں۔ سب کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔"

رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہاں سے بھی خالی ہاتھ چلا جاؤں گا۔ پہلی بار ایسا نہیں ہوا۔ بار بار ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔"

"مایوس نہ ہو۔ میں نے کہا نا' حاجی صاحب سے پوچھ لوں گا بلکہ خود تجھے ان کے ڈیرے پر لے چلوں گا۔"

"ان کے پاس بھی چلا جاؤں گا۔ ویسے تسیں خود ہی پوچھ لینا۔"

"مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ وہ تیری ضرور مدد کرے گا۔" مولوی فضل احمد نے رحیم داد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ایک بات سمجھ آتی ہے۔ میں جن دنوں ملتان میں تھا تو لدھیانے کے ایک مولوی صاحب ملے تھے۔ وہاں مشتاق گنج میں ہوزری کا کارخانہ چلاتے تھے۔ پاکستان بنا تو وہ بھی لدھیانے سے لٹ لٹا کر لہور آگئے۔ اپنے ساتھ بیس یتیم بچے بھی لائے۔ ان کا نام تو مجھے اس وقت یاد نہیں پر اتنا پتہ ہے کہ سکھر میں اب یتیم خانہ چلاتے ہیں۔ بتاتے تھے کہ وہ اور ان کے ساتھی کئی بار مشرقی پنجاب گئے اور کتنی ہی مسلمان زنانیوں اور بچوں کو سکھوں اور ہندوؤں کے قبضے سے نکال کر لے آئے۔ بہت نیک بندے ہیں۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے۔"

رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ان کے یتیم خانے کا کیا نام ہے ملاں جی؟"

"فیض الاسلام۔" مولوی فضل نے بتایا۔ "یہی نام یاد پڑتا ہے۔ ویسے سکھر میں سب اس یتیم خانے کو جانتے ہیں۔ میرا کہا مان تو سکھر چلا جا۔ امید ہے' وہاں سے تیرے بال بچوں کا سراغ مل جائے گا۔"

"چلا جاؤں گا۔ ضرور چلا جاؤں گا۔ اپنا تو برسوں سے یہی کام ہے۔ جہاں امید نظر آتی ہے' پہنچ جاتا ہوں۔" رحیم داد کا لہجہ اور افسردہ ہو گیا۔ "ملاں جی! میرے لیے دعا کرو' مجھے اپنے بال بچے مل جائیں۔ ان کے بغیر زندگی میں کوئی مزا نہیں۔ کچھ بھی چنگا نہیں لگتا۔"

"میں تیرے لیے ضرور دعا کروں گا۔ تیرے بچھڑے ہوئے بال بچے ضرور ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ تیری مشکل آسان کرے گا۔"

"ہاں ملاں جی۔" اس نے آسمان کی جانب انگلی اٹھا کر کہا۔ "اب تو اوپر والے ہی کا آسرا ہے۔

دیکھو، کب میری سنی جاتی ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "لوگ کہتے ہیں، کہاں تک انھیں تلاش کرے گا، دوسرا ویاہ کرکے گھر بسالے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر انکار میں ہلایا۔ "نہیں، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں اپنی گھروالی کے سوا کسی زنانی کو نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے اس سے بہت پیار ہے اور وہ بھی مجھ سے اتنا ہی پیار کرتی ہے۔ بچے تو میرے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ ان سب کو کیسے بھلادوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

رحیم داد نے اپنی آواز میں سوز پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر مولوی فضل اس کی باتوں سے زیادہ متاثر نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی نہ بیوی تھی نہ بچے تھے۔ شادی ہی نہیں کی تھی۔ بیوی کے انتظار میں سر اور ڈاڑھی کے بال کھچڑی ہوگئے۔ اسے مردوں کو نہلانے والا اور خیرات کی روٹی کھانے والا کمی قرار دے کر کوئی اس سے اپنی بیٹی بیاہنے کو تیار نہیں ہوا۔

مولوی فضل اس کی باتیں سن کر خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد بھی چپ رہا۔ ذرا دیر بعد مولوی فضل کی آواز ابھری۔ "مجھے اب حاجی صاحب کی حویلی جانا ہے۔ وہاں میرا انتظار ہوتا ہوگا۔" اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "شہر سے کچھ منگوانا ہو تو بتادے، لیتا آؤں گا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔

"پر تو کل تک یہاں ٹھیر سکے گا؟"

"ٹھیر جاؤں گا۔ حاجی سے بھی تو ملنا ہے۔ شہر سے میرے لیے ایک کمیص اور شلوار مل جائے تو لے آنا، یہ کپڑے بہت گندے ہوگئے ہیں۔ دھونے پر بھی ٹھیک سے صاف نہیں ہوں گے۔ سر پر باندھنے کے لیے پگڑی بھی خرید لینا۔"

مولوی فضل نے نہایت مستعدی سے کہا۔ "قمیص اور شلوار تیار تو نہیں ملے گی۔ جاتے ہی کپڑا خرید کر درزی کو دوں گا۔ کہوں گا، واپسی سے پہلے پہلے سی کر تیار کردے۔" اس نے رحیم داد کا قد وقامت غور سے دیکھا۔ بالشت سے قمیص اور شلوار کے لیے اس کے جسم کی ناپ لی۔ "شلوار تو لٹھے کی ٹھیک رہے گی۔ قمیص کس کپڑے کی ہو؟"

"دھاری دار کپڑا مل جائے تو اس کی ٹھیک رہے گی۔ ویسے جو تیں نوں پسند آئے، لے آنا۔ میں پہن لوں گا۔" رحیم داد اپنی بات کہتے کہتے رکا پھر اس نے پوچھا۔ "ملاں جی، وہاں عینک بھی مل جائے گی؟"

"مل تو جانی چاہیے۔ لیکن اس کے لیے تیرا موجود ہونا ضروری ہوگا۔"

"میں وہاں کیسے جا سکتا ہوں؟ عینک کے بغیر مجھے ٹھیک سے نظر بھی نہیں آتا۔" اس نے مولوی



کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "ذرا اپنی عینک تو دینا ملاں جی۔"

مولوی فضل نے اپنی عینک اتاری اور رحیم داد کو دیتے ہوئے حیرت سے بولا۔ "اس کا کیا کرے گا؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" رحیم داد نے عینک اپنی آنکھوں پر لگائی۔ ادھر ادھر نظریں گھما کر دیکھا پھر عینک اتار کر بولا۔ "یہ تو جی اونچے نمبروں کی ہے۔ کوئی بہت کم نمبر کی لے لینا۔ میں اسی سے کام چلا لوں گا۔ میری عینک تو گڑھے میں گرنے کے بعد پیر کے نیچے ایسی آئی کہ بالکل چکنا چور ہوگئی۔ اسے گڑھے سے نکال لیا جائے، تب بھی کسی کام کی نہیں۔"

رحیم داد نے عینک مولوی فضل کو دے دی۔ مولوی نے عینک آنکھوں پر لگائی۔ کوٹھری میں گیا، اندر سے پرانا رجسٹر اور پنسل نکال کر لایا۔ رحیم داد کے قریب آکر بولا۔ "مجھے ڈر ہے کہیں بھول نہ جاؤں۔ تجھے جو کچھ منگانا ہے، لکھ کر اپنے پاس رکھ لوں۔ یہ ٹھیک رہے گا نا؟"

"جیسی تیری مرضی۔"

مولوی فضل نے کچھ نہیں کہا۔ رجسٹر کھولا اور اس کے سادہ ورق پر پنسل سے لکھنے لگا۔ رک رک کر رحیم داد سے پوچھتا بھی جاتا۔ جب وہ رحیم داد کی ہر فرمائش لکھ چکا تو اس نے رجسٹر کا ورق پھاڑا، تہہ کیا اور قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔

رحیم داد نے کہا "پنسل اور کاغذ کی تو مجھے بھی ضرورت ہے۔ اپنا کچھ حساب کتاب لکھنا ہے۔ مجھے یہ پنسل اور کاغذ دے دے۔ تیرے جانے کے بعد اکیلا بیٹھا یہی کام کرتا رہوں گا۔" رحیم داد مسکرایا۔

"ایسا کر۔ اگر تیرے کام کا نہ ہو تو یہ رجسٹر بھی مجھے دے دے۔ شہر سے دو رجسٹر اور دو پنسلیں بھی خرید لینا۔"

"یہ تو بہت پرانا رجسٹر ہے۔ کبھی اس میں مدرسے کے بچوں کی حاضری لگاتا تھا مگر اب تو بیکار پڑا ہے۔ تجھے چاہیے ہے تو لے لے۔" مولوی فضل نے رجسٹر رحیم داد کے ہاتھ میں تھمادیا۔ پنسل بھی دے دی۔ رحیم داد نے دھوتی کے ڈب میں ہاتھ ڈال کر پچاس روپے کے نوٹ نکالے اور مولوی فضل کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اتنے روپوں سے کام چل جائے گا؟"

مولوی نے روپے لے کر گنے اور سر ہلا کر بولا۔ "ہاں جی، ان سے کام چل جائے گا۔" اس نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "چوہدری! توں کیا کام کرتا ہے؟" وہ لمحے بھر کے لیے ٹھٹکا۔ "توں

چوہدری ہی ہے نا۔"

"بالکل ہوں جی! گوجرانوالہ میں جی اپنا ڈھلائی کا کارخانہ ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے ٹھیک ٹھاک کام چل رہا ہے۔"

"بس جی' اللہ کی مہربانی ہے۔" رحیم داد نے مولوی کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ "پنڈ میں نائی تو ہوگا؟ سر اور داڑھی کے بال بڑھ گئے ہیں۔"

مولوی فضل نے اس کے چہرے کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ "بہت بڑھ گئے ہیں جی۔ میں ابھی جا کر نائی کو بھیجتا ہوں۔ تو فکر نہ کر۔"

"میں کپڑے دھو لیتا ہوں۔ داڑھی اور سر کے بال بنوا کر نہاؤں گا۔"

"جیسی تیری مرضی۔ تو نے صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ رات کی بچی ہوئی روٹی ہے' مرونڈے ہیں۔ ابھی تو اسی سے کام چلا لے۔ دوپہر کی روٹی مدرسے کا کوئی منڈا لے آئے گا تو کھا لینا۔"

مولوی فضل ایک بار پھر دالان میں گیا۔ کوٹھری میں داخل ہوا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹی کی پرات دبی تھی۔ اس میں رات کی دو باسی روٹیاں تھیں اور مٹی ہی کی ٹھوٹھی میں مرونڈے تھے۔ مولوی نے کوٹھری کی کنڈی لگائی' قفل ڈالا اور کھانے کی اشیاء دالان میں بچھی ہوئی چٹائی پر رکھ کر بولا۔

"لے' یہ کھالے۔ میں غریب بندہ ہوں۔ تیری اس وقت اور کوئی خاطر نہیں کر سکتا۔" مولوی فضل کے رویئے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ رحیم داد سے اب خاصا مرعوب ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ناداری اور پریشان حالی کا اظہار کرنے لگا۔

"چوہدری! اپنی تو ایسے ہی گزر بسر ہوتی ہے۔ حاجی نیک بندہ ہے۔ مدرسے کے نام پر میرے لیے اتنا وڈا حجرہ بنوا دیا۔ رات کی روٹی بھی روز اسی کے گھر سے آتی ہے۔ ویسے بھی مجھے کچھ نہ کچھ دیتا ہی رہتا ہے۔" اس نے تامّل کیا۔ "اب میں چلوں گا۔ دیر ہو رہی ہے۔ چوہدری! شام کو اندھیرا ہو جائے تو چراغ جلا لینا۔ دالان میں چراغ رکھا ہے۔ اس میں تیل بھی کافی ہے۔ ماچس بھی موجود ہے۔ نائی بھی تھوڑی دیر میں آجائے گا۔"

مولوی فضل احمد دروازے کی جانب بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ مولوی نے دروازہ عبور کرتے ہوئے کہا۔ "اب تجھ سے کل شام کو ملنا ہوگا۔ پریشان نہ ہونا۔" وہ اسے تسلی دیتا ہوا چلا گیا۔

☆

رحیم داد کنوئیں کے قریب گیا۔ ڈول سے پانی نکالا اور کیچڑ اور گندے پانی سے لتھڑے





کپڑے دھونے بیٹھ گیا۔ کپڑے بار بار رگڑنے کے باوجود صاف نہیں ہوئے۔ صابن تھا نہ سجّی۔ وہ ہاتھ بھر کے ڈنڈے سے پیٹ پیٹ کر کپڑے صاف کرنے کی دیر تک کوشش کرتا رہا۔ اس نے بھیگے ہوئے کپڑے نچوڑے اور کنوئیں کی پختہ منڈیر پر سوکھنے کے لیے ڈال دیے۔ اس کام سے نمٹ کر دالان میں پہنچا۔

اس نے روٹی کھائی اور مرونڈے بھی کھائے۔ مرونڈے ذائقے میں مزے دار تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے پانی پیا اور نائی کا انتظار کرنے لگا۔ مگر نائی نہیں آیا۔ دھوپ تیز ہو گئی۔ پہر دن گزر گیا۔

رحیم داد رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ رہ رہ کر غنودگی کا غلبہ ہوتا۔ کچھ دیر وہ جماہیاں لیتا رہا پھر اس نے کلیم کے کاغذات کا بستہ سرہانے رکھا اور چٹائی پر لیٹ گیا۔ وہ بار بار بند دروازے کی جانب دیکھتا۔ دروازے کی کنڈی اس نے نہیں لگائی تھی' مگر نہ دروازہ کھلا نہ کسی نے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سو گیا۔

رحیم داد کی آنکھ کھلی تو کوئی اسے آہستہ آہستہ جھنجوڑ رہا تھا۔ "میں رجب نائی ہوں۔ بال کاٹنے آیا ہوں۔"

رحیم داد نے نائی کو غور سے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رجب نے مسکرا کر کہا۔ "توں نے روٹی بھی نہیں کھائی۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ رحیم داد نے حیرت سے اس طرف دیکھا۔ چنگیری میں روٹیاں تھیں اور ان پر چنے کے نرم پتوں کی پکی ہوئی پلی رکھی تھی۔ رحیم داد ایسی گہری نیند سویا کہ اسے مطلق خبر نہ ہوئی' کون کھانا لایا اور کب رکھ کر چلا گیا؟ رجب اسے خاموش دیکھ کر بولا۔ "لگتا ہے' بہت بے خبر ہو کر سویا۔" اس نے چھت کی منڈیر کی طرف اشارہ کیا۔ "بنیرے پر دھوپ پہنچ گئی اور توں پڑا سوتا رہا۔"

رحیم داد نے بات بنائی۔ "رات ریل میں سو نہیں سکا تھا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ "اب دیری نہ کر۔ فٹافٹ سر اور داڑھی کے بال کاٹ دے۔"

"ایسا کر' کنارے آجا۔ چٹائی پر بال گرے تو ملاں ناراض ہوگا۔"

رحیم داد چپ چاپ اٹھا اور رجب کی ہدایت کے مطابق دالان کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ رجب نے اس کے بالوں میں انگلیاں ڈال کر پھرائیں۔ "توں نے کب سے بال نہیں کٹوائے؟ نہایا بھی نہیں۔ دیکھ تو بال کیسے میلے ہو رہے ہیں۔" وہ بال کنگھے سے سلجھانے لگا۔ "ریل کے سفر میں تو

بالوں اور کپڑوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ رجب قینچی سے بال کاٹنے لگا۔ رحیم داد ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔

"رجبے، بہت دیر لگا دی۔ کہاں رہا اب تک؟"

"وہ ایسا ہوا جی، میں ہفتے بھر سے احمد کوٹ گیا ہوا تھا۔ آج جیسے ہی واپس ہوا، گھر والی نے بتایا، ملاں جی نے اپنے مہمان کے بال کاٹنے کے لیے بلایا ہے۔ بس جی، میں فٹافٹ آ گیا۔"

احمد کوٹ کا نام سن کر رحیم داد کسی قدر گھبرا گیا۔ اس نے گردن ذرا سی جھکالی۔ اسے خدشہ پیدا ہوا کہ رجب کہیں اسے جانتا نہ ہو۔ مگر وہ اس کی گھبراہٹ سے بالکل بے نیاز تھا۔ اطمینان سے رحیم داد کی گدی کے بال مشین سے مونڈ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ بال کاٹتے کاٹتے اس نے کہا۔

"احمد کوٹ میں تو آج کل بہار آئی ہوئی ہے۔" رحیم داد سہا ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ رجب بتاتا رہا۔ "میں تو جی پہلی بار احمد کوٹ گیا تھا۔ ساتھ والے پنڈ کی ایک کڑی ادھر ویاہی ہے۔ میں پہلے اسی پنڈ میں ہوتا تھا۔ اس رشتے سے وہ میری انگ ہوتی ہے۔ اس کے ویاہ پر تو میں جا نہ سکا، بکھار میں پڑا تھا۔ اب اس کے یہاں پتر ہوا ہے۔ اس کی جھنڈ لہائی کے لیے اس نے مجھے بلوایا۔ کہتی تھی، میں اپنے کاکے کے سر کے بال رجبے کے سوا کسی اور سے نہیں اترواؤں گی۔ تو جی اس طرح ادھر جانا ہوا۔ چنگا وکت گزرا۔"

رحیم داد نے اس کی باتیں سن کر قدرے سکون محسوس کیا، آہستہ سے پوچھا۔ "ادھر کتنے روز رہا؟"

"آج نواں دن تھا۔"

رحیم داد کو رہ رہ کر احمد کوٹ یاد آ رہا تھا۔ احمد کوٹ اس کا آبائی گاؤں تھا۔ وہاں اس کی بیوی تھی، بچے تھے۔ وہ مدت سے ان سے مل نہیں سکا تھا۔ ان کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین بھی تھا۔

اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "احمد کوٹ میں اپنا ایک ملنے والا ہے۔ رحیم داد نام ہے اس کا۔ وہ بھی تجھے وہاں ملا؟"

"اس رحیم داد کی بات تو نہیں کر رہا جس نے سیف اللہ کو کتل کر دیا؟"

"یہ تو میں نوں پتہ نہیں۔" رحیم داد نے جھٹ بات بنائی۔ "کئی سال سے میں اسے ملا نہیں۔"

"تب تو یہ بھی پتہ نہ ہوگا، اسے جیل ہو گئی تھی۔ پر وہ جیل سے بھاگ نکلا۔"



"جیل سے بھاگ نکلا۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ "وہ ایسا لگتا تو نہیں تھا۔ سیدھا سادا نیک بندہ تھا۔ سمجھ نہیں آتی، اس نے یہ سب کیسے کیا؟"

"گل تو جی بہت لمی ہے۔" اس نے حجامت بناتے ہوئے کہا۔ "پر اتنا سن لے، پچھلے دنوں رحیم داد کو بھی کتل کر دیا گیا۔"

"تو سچ کہہ رہا ہے؟"

"میں نوں تجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "میں تو اس روز احمد کوٹ ہی میں تھا، جب اس کے کتل ہونے کی خبر وہاں پہنچی تھی۔"

"یہ تو نے بہت بری خبر سنائی۔ اس کے تو بال بچے بھی تھے۔ جانے اس خبر سے ان پر کیا بیتی ہوگی۔"

"پر اب تو اس کا وہاں گھر بار رہا، نہ بال بچے۔"

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔ "وہ گھر بار چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟"

"لگتا ہے، تیں نوں کچھ بھی پتہ نہیں۔ سیف اللہ کے مرنے کے بعد اس کے بھائیوں نے بدلہ لینے کے لیے رات کے اندھیرے میں رحیم داد کے گھر پر حملہ کیا اور آگ لگا دی۔ پورا گھر جل کر راکھ ہو گیا۔ سنا ہے سیف اللہ کے بھائی تڑا تڑ گولیاں چلاتے رہے۔ کوئی بھی ڈر کے مارے گھر سے باہر نہیں نکلا۔ انھوں نے رحیم داد کی کھڑی فصلیں بھی جلا دیں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "رحیم داد کے تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ چھوٹا تو آگ میں جل کر مر گیا۔ گھر والی دو کو لے کر کسی نہ کسی طرح پڑوس کے مکان میں جا کر چھپ گئی۔ حملہ آور تو پاگل ہو رہے تھے۔ اسے اور دونوں بچوں کو بھی کتل کر دینا چاہتے تھے۔ پر رحیم داد کی گھر والی ان کے ہاتھ نہیں آئی۔ ایندھن رکھنے کے اوٹے میں بچوں کے ساتھ چھپ کر بیٹھ گئی، سورج نکلنے سے پہلے پہلے اندھیارے میں بچوں کو لے کے احمد کوٹ سے بہت دور نکل گئی۔"

چھوٹے بیٹے کے جل کر ہلاک ہونے اور گھر بار کی تباہی پر رحیم داد کا دل بھر آیا۔ مگر اس نے خود کو کسی نہ کسی طرح سنبھالا اور آنکھوں میں امڈتے آنسو پی گیا۔

اسے خاموش پا کر رجب نائی نے کہا۔ "لگتا ہے تجھے یہ باتیں سن کر بہت دکھ ہوا۔"

"ہاں۔" رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ اس کی آواز گلوگیر ہو رہی تھی۔ آگے نہ بولا گیا۔ رجب بھی چپ رہا۔ وہ سر کے بال تراش چکا تھا۔ رحیم داد کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ "پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی؟"

”کچھ بھی نہیں ہوا جی۔ سیف اللہ کے بھائی شان سے بھڑکیں مارتے پھرتے ہیں۔ ان کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟ ان کا ایک شریکا وزیر جو لگا ہے۔ ان کی تو سمجھو‘ آج کل حکومت ہے۔ جب رحیم داد کے کتل کی خبر آئی تو سیف اللہ کے بھائی بہت خوش تھے۔ پنڈ میں اینڈتے پھرتے تھے۔“ رحیم داد خاموش رہا۔ رجب سر کے بال تراش کر سامنے آگیا۔ ”توں نے کب سے داڑھی کے بال نہیں کٹوائے۔ دیکھ تو بالوں کے کیسے جھبے ہوگئے ہیں۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”لگتا ہے‘ نئی نئی داڑھی چھوڑی ہے۔“ رحیم داد پھر بھی خاموش رہا۔ مگر رجب خاموش نہیں ہوا‘ پوچھنے لگا۔ ”کس سوچ میں پڑگیا۔“

”مجھے رحیم داد یاد آرہا ہے۔ مرنے والا برا بندہ نہیں تھا۔ رجبے تو اسے نہیں جانتا۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے‘ احمد کوٹ کے دوسرے بندے بھی یہی کہتے تھے۔ میں جس کے گھر جھنڈ لہائی پر گیا تھا‘ اس کا نام شیداں ہے۔ شیداں کا گھروالا بھی رحیم داد کی بہت تعریف کرتا تھا۔ پر جی‘ ابھی تو سبھی سیف اللہ کے بھائیوں سے ڈرتے ہیں۔ جسے جی چاہیں پکڑوا دیں‘ جسے چاہیں مکدمے میں پھنسوا دیں۔ تھانے دار‘ تحصیل دار سبھی ان کے کہنے پر چلتے ہیں۔ انھوں نے رحیم داد کی زمین پر بھی کبضہ کرلیا۔ کسی نے کچھ نہیں کیا۔ رحیم داد کی گھروالی ہوتی تو کوئی کنونی کارروائی کرتی۔ اب تو رحیم داد کا وہاں کوئی نہیں رہا۔“

رحیم داد نے بے قراری سے پوچھا۔ ”رجبے! تجھے یہ بھی خبر ملی‘ رحیم داد کے بال بچے اب کہاں ہوتے ہیں؟“

”سنا ہے جی‘ وہ اکال گڑھ میں ہیں۔“

”کس کے پاس رہتے ہیں؟“

”یہ تو میں نوں پتہ نہیں۔“ رجب نے ڈاڑھی کے بال تراشتے ہوئے بتایا۔ ”کسی شریکے یا رشتے دار ہی کے پاس رہتے ہوں گے۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”توں ان کے پاس جانا چاہتا ہے؟“

”ارادہ تو نہیں‘ تو کہتا ہے تو چلا جاؤں گا۔ ایک زمانے میں تو رحیم داد سے میری بہت یاری تھی۔“

”تب تو اس کی گھروالی بھی تجھے جانتی ہوگی۔ پر جانے اسے یہ بھی پتہ ہے‘ رحیم داد مرگیا۔ پچھلے ہی دنوں تو اس کا کتل ہوا ہے۔ اتنے تھوڑے دنوں میں اسے کیسے ملوم ہو جائے گا۔“ رجب نے قینچی چلاتے چلاتے ہاتھ روک لیا۔ ”ایسا کر‘ جا کر انھیں خبر کردے۔ اس کر سالے میں بھی



شریک ہوجائے گا۔ تسلی بھی دے دے گا۔“

”پر میں رحیم داد کے بال بچوں کا پتہ کیسے چلاؤں گا؟“

”احمد کوٹ میں مجھے کسی نے بتایا تھا‘ رحیم داد کی گھروالی اپنے بچوں کے ساتھ اکال گڑھ میں سکول کے پچھواڑے رہتی ہے۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”ضرور وہاں چلا جا۔ رحیم داد تیرا پرانا یار تھا۔ اس کی گھروالی اور بچوں کو اس کے مرنے کی خبر تو ہونی چاہئے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”کہہ تو ٹھیک ہی رہا ہے۔“ رحیم داد نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”پر جس نے تجھے اس کا ٹھکانا بتایا‘ اسی نے یہ خبر بھی اسے پہنچا دی ہوگی۔ میں اب جا کر کیا کروں گا؟ ویسے بھی میں نے بجھیتی لوٹنا ہے۔ کچھ دنوں بعد ان کے پاس چلا جاؤں گا۔“

”جیسی تیری مرضی۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ رجب نائی ڈاڑھی کے بال تراشتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے ڈاڑھی گول کتروں بنا دی۔ جب رجب حجامت بنا چکا تو رحیم داد نے آئینہ لے کر اپنا چہرہ دیکھا۔ ڈاڑھی رکھنے سے اس کا حلیہ خاصا تبدیل ہوگیا تھا۔ اس نے خوش ہو کر دھوتی کے ڈب سے ٹٹول کر ایک روپے کا نوٹ نکالا اور نائی کو دے دیا۔

روپیہ پا کر وہ ایسا نہال ہوا کہ فوراً بولا۔ ”لا‘ تیرے بدن کی مالش بھی کروں۔“ وہ بہت مسرور نظر آرہا تھا۔ بال اور ڈاڑھی بنانے کی اجرت اسے توقع سے بہت زیادہ ملی تھی۔ ”یہاں تو مالش کے لیے تیل نہیں۔ میں گھر سے سرسوں کا تیل لے کر آتا ہوں۔ مالش سے ساری تھکن دور ہو جائے گی۔“

مگر رحیم داد مالش کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔ ”نہیں رجبے! میں نوں اب نہاتا ہے۔“

”نہالینا۔ آرام سے نہالینا۔ ایسی بجھیتی کیا ہے؟ میرا کہا مان‘ مالش کے بعد نہا۔ دیکھ تو بدن میں کیسی چستی آجاتی ہے۔ جھڑپا لگانے کو جی کرے گا۔ اپنے پنڈ کے زمیں دار حاجی صاحب تو ہر جمعے کو پہلے مجھ سے مالش کرواتے ہیں‘ تب نہاتے ہیں۔“

رحیم داد اس کے اصرار کرنے پر بھی راضی نہ ہوا۔ جب سے اپنے چھوٹے بیٹے کی موت اور گھر بار کی تباہی کی خبر سنی تھی‘ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ رجب سے جلد سے جلد پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ”مجھے اب نہانا ہے‘ شام ہو رہی ہے۔“ وہ کنویں کی جانب بڑھا۔

رجب نے مزید اصرار نہیں کیا‘ چپ چاپ باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے دروازے کی کنڈی لگائی‘ دالان میں گیا اور چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل بے اختیار بھر آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دھوپ اب گہری زرد پڑ گئی تھی۔ دن کا چل چلاؤ تھا' سائے طویل ہوگئے تھے۔ رحیم داد سسکیاں بھرتا رہا۔ کھانا اس کے قریب ہی رکھا تھا۔ لیکن رحیم داد نے اس پر توجہ نہ دی۔ بھوک ہی نہیں تھی۔

جب رو دھو کر دل کی بھڑاس ذرا کم ہوئی تو اس نے طے کیا کہ وہ نوراں اور بچوں سے ملنے اکال گڑھ ضرور جائے گا۔ وہ انھیں دیکھنے اور ان سے ملنے کے لیے بے قرار تھا۔ اس نے آنسو پونچھے۔ اٹھ کر کنوئیں کے پاس گیا۔ پانی نکالا اور دھوتی اتار کر نہانے لگا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ رحیم داد کو اپنا جسم سلگتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد قدرے سکون ملا۔ اب اس کے کپڑے سوکھ چکے تھے۔

اس نے کپڑے پہنے اور دالان میں جا کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔ وہ دیر تک کھویا کھویا بیٹھا رہا۔ سورج ڈوب گیا۔ شام آنگن کے در و دیوار سے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔ دن کے ہنگامے سرد پڑ چکے تھے۔

ہر طرف شام کا سناٹا پھیلنے لگا تھا۔ گھروں کو لوٹتے ہوئے کسانوں اور مویشیوں کی آوازیں شام کی بڑھتی ہوئی خاموشی میں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔

جب اندھیرا بڑھ گیا تو رحیم داد اٹھا اور طاق میں رکھا ہوا چراغ روشن کر دیا۔ قریب ہی چٹائی پر کھانا رکھا تھا۔ اس نے ایک روٹی توڑ کر چنے کے ساگ کے ساتھ چند لقمے کھائے۔ روٹی خشک اور ٹھنڈی تھی۔ وہ پوری روٹی نہیں کھا سکا۔

اس نے اٹھ کر مٹی کے پیالے میں قریب رکھے ہوئے گھڑے سے پانی نکالا اور پورا پیالہ خالی کر دیا۔ رحیم داد کچھ دیر جاگتا رہا پھر چٹائی پر لیٹ کر سو گیا۔

سویرے سو کر اٹھا تو اس نے چنگیری میں رکھی ہوئی باسی روٹی کھائی' پانی پیا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا اس بستے کو گھورتا رہا جس میں کلیم کے کاغذات تھے۔

اس نے بستہ کھولا' کاغذات نکالے اور ان کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس نے چھٹی جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دو بہنیں تھیں مگر ایک بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ اسی لیے وہ ماں باپ کا بہت لاڈلا تھا۔ باپ معمولی زمیں دار ہونے کے باوجود اسے اچھی تعلیم دلانا چاہتا تھا۔ مگر رحیم داد نے پڑھنے لکھنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ اس واجبی تعلیم کے باوجود سرکاری اور قانونی دستاویزات نہ صرف پڑھ سکتا تھا بلکہ انھیں بخوبی سمجھ بھی سکتا تھا۔ اس کا سبب مقدمے بازی تھی۔ وہ دو سال سے اوپر سیف اللہ کے ساتھ مقدمے بازی کرتا رہا۔ اس سے پہلے



بھی وہ پانی کے جھگڑے پر کئی سال تک مقدمہ لڑتا رہا۔ وہ ہر مقدمے کے کاغذات بڑے غور سے پڑھتا۔ جو قانونی نکتہ سمجھ میں نہ آتا' اسے اپنے وکیل سے سمجھنے کی کوشش کرتا۔ مقدمے کے مختلف پہلوؤں پر وکیل سے بحث بھی کرتا اور اسے مشورہ بھی دیتا۔ مقدمے لڑتے لڑتے' اسے مقدمے بازی کا چسکا پڑ گیا تھا۔ وہ خود کو کسی وکیل سے کم ماہر قانون نہیں سمجھتا تھا۔ جیل میں لالی اور دوسرے قیدیوں سے بڑے جوش میں کہتا تھا کہ پولیس سیف اللہ کی کھلم کھلا طرف داری نہ کرتی تو اسے کبھی سزا نہ ہوتی۔ اس کا مقدمہ بہت مضبوط تھا۔ مقدمے کا فیصلہ اسی کے حق میں ہوتا۔

رحیم داد نے غیر ضروری دستاویزات اور درخواستیں علیحدہ کر لیں اور اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق وہ کاغذات اور دستاویزات محفوظ کر لیں جن کی بنیاد پر متروکہ جائیداد کا الاٹمنٹ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس نے ایسے تمام کاغذات اور دستاویزات کپڑے میں دوبارہ لپیٹ کر بستہ بنا لیا اور غیر ضروری کاغذات اور درخواستیں آنگن کے ایک کونے میں رکھ کر ماچس سے آگ لگا دی۔ انھیں جلا کر اس طرح تلف کر دیا کہ صرف راکھ رہ گئی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے وہ رجسٹر نکالا جو اسے مولوی فضل احمد نے دیا تھا۔ اس نے پینسل اٹھائی اور ایک ایسی سرکاری دستاویز سامنے رکھی جس پر چودھری نور الٰہی کے تصدیق شدہ دستخط تھے۔ وہ پینسل سے رجسٹر کے سادے ورق پر چودھری نور الٰہی کے دستخط کی ہوبہو نقل اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کوشش میں اس نے کئی ورق سیاہ کر دیے۔ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ سورج چڑھ کر بیچ آسمان پر آ گیا' دوپہر ہو گئی۔ گرمی بڑھ گئی۔ وہ سر جھکائے اپنے کام میں منہمک تھا کہ اسی اثنا میں دروازے پر آہٹ ہوئی۔

رحیم داد نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا' بستہ کھول کر اس میں دستاویز اور رجسٹر رکھا اور کپڑے میں گرہ لگا کر بستہ بند کر دیا۔ اٹھ کر دروازے پر گیا۔ کنڈی کھولی۔ گاؤں کا ایک لڑکا اس کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے کھانا لیا' دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ کھانا سنبھالے ہوئے دالان میں گیا۔ کھانے میں روٹیاں تھیں' سرسوں کا ساگ تھا اور پیاز کی گٹھی تھی۔

اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور پانی کا بھرا ہوا پیالہ چڑھا کر لیٹ گیا' مگر سویا نہیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اٹھ بیٹھا۔ بستہ کھولا' رجسٹر نکالا' پینسل نکالی' دستاویز سامنے رکھی اور مقتول چودھری نور الٰہی کے دستخط بنانے کی مشق کرنے لگا۔

☆

شام ہو گئی۔ رحیم داد نے چراغ روشن کیا۔ عین اسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی۔

رحیم داد دروازے پر پہنچا' کنڈی کھولی۔ توقع تھی کہ مولوی فضل احمد ہوگا مگر وہ مولوی فضل احمد نہیں تھا۔ اس کی سامنے ایک اجنبی کھڑا تھا۔ وہ تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کا چہرہ اور کپڑے گرد سے اٹے تھے۔ وہ نوجوان تھا۔ بدن مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ وہ ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے کا کرتا پہنے ہوئے تھا۔ اس کی دھوتی ملگجی تھی۔ سر برہنہ تھا۔ اس کے لمبے لمبے پٹے کانوں سے نیچے تک گئے ہوئے تھے۔ ان پر خاک کے ذرات بکھرے تھے۔ ہاتھ میں لمبی ڈانگ تھی۔ جسم سے پسینے کی بو اٹھ رہی تھی۔ وضع قطع سے وہ کسان لگتا تھا۔ اس نے شام کی دھندلی روشنی میں رحیم داد کو غور سے دیکھا اور حیرت سے بولا۔

"توں مجھے ملاں تو نہیں لگتا۔"

"ہاں' میں ملاں نہیں ہوں۔ ملاں شہر گیا ہے۔"

"ملاں جی کی کب تک واپسی ہوگی؟"

"کہتا تھا' آج عشاء کی نماز سے پہلے لوٹ آئے گا۔"

"ٹھیک ہے' تب تو وہ آتا ہی ہوگا۔ میں اس کا انتظار کرلوں گا۔" وہ آنگن میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "میرا نام نوردین ہے جی۔"

رحیم داد نے خاموشی سے دروازہ بھیڑ دیا۔ دونوں چپ چاپ دالان میں جا کر چٹائی پر بیٹھ گئے۔ نوردین تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ دالان کے تھم کا سہارا لیے بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے پوچھا۔

"ملاں جی کے پاس تیرا کیسے آنا ہوا؟"

"کیا بتاؤں جی! ایک چکر میں پڑ گیا ہوں۔" نوردین نے بیزاری سے کہا۔ "اسی کے لیے ملاں کے پاس آیا ہوں۔"

"ملاں سے تعویذ شویز لینا ہے؟ جھاڑ پھونک کرانی ہے؟"

"نہیں جی' ایسی کوئی گل نہیں؟ یہ دوسرا ہی چکر ہے۔"

رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "نورے! تو مجھے پریشان دکھائی دے رہا ہے۔"

نوردین نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "پانی ہو تو پلا دے۔ مجھے تو جیسے بھڑی لگ گئی ہے۔ جتنا پانی پیتا ہوں' اتنی ہی زیادہ پیاس لگتی ہے۔"

رحیم داد نے نرم لہجے میں کہا۔ "بھوکا بھی لگتا ہے۔ روٹی رکھی ہے' کھالے۔" اس نے دن کے بچے ہوئے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔



"نہیں' مجھے صرف پانی پلا دے۔"

رحیم داد خاموشی سے اٹھا' مٹکے سے پیالے میں پانی نکالا اور نوردین کے پاس گیا۔ پیالہ ہاتھ میں لے کر وہ ایک ہی سانس میں غٹاغٹ سارا پانی پی گیا۔ رحیم داد اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ باہر آنگن میں رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ دونوں چراغ کی دھندلی روشنی میں خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد نوردین نے پوچھا۔

"ملاں جی نے آج ہی رات آنے کو کہا تھا ناں؟"

"مجھ سے تو یہی کہہ کر گیا تھا۔ فکر نہ کر' ملاں آتا ہی ہوگا۔"

"میں ۱۲ میل سے زیادہ ہی پیدل چل کر آیا ہوں۔ ملاں سے مل کر ہی جاؤں گا۔ رات یہیں ٹھہر جاؤں گا۔ ملاں سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

"کوئی بہت ہی ضروری کام ہے؟"

"ہاں جی ضروری ہی کام ہے۔" نوردین نے رحیم داد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "تیں نوں کیہہ پتہ میں کس پریشانی میں ہوں۔" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں' چہرے پر جھنجلاہٹ آگئی۔ "اٹھ مہینے سے اوپر ہوگئے چکر کاٹتے ہوئے۔ اب کے میں دو ٹوک بات کرکے ہی جاؤں گا۔" وہ کندھے پر پڑی ہوئی چادر سے پسینہ پونچھنے لگا۔ اس کے چہرے پر بدستور جھنجلاہٹ تھی۔ وہ بے چین بھی نظر آرہا تھا۔

رحیم داد نے اسے اس قدر پریشان دیکھا تو دل جوئی کرنے کے انداز میں نرمی سے دریافت کیا۔

"نورے! بات کیا ہے؟ تو کہے تو میں ملاں جی سے تیرے لیے بات کروں۔ وہ میرا کہا مان لے گا۔"

رحیم داد کے نرم لہجے اور اظہار ہمدردی پر نوردین کسی قدر متاثر ہوا۔ "گل ایہہ ہے جی۔ میرا بازو اس پنڈ کے زمیں دار حاجی کے پاس ہے۔ یوں سمجھ' حاجی نے اسے دھرو رکھ چھوڑا ہے۔"

"حاجی یہ کام بھی کرتا ہے۔" رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ "حاجی سے ادھار شدھار لیا ہوگا' ورنہ وہ تیری گھروالی کو کیسے اپنے پاس دھرو یا گروی رکھ سکتا ہے۔"

"نہیں جی' میں نے اس سے کوئی ادھار شدھار نہیں لیا۔" نوردین نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "گل کچھ اور ہی ہے۔"

"گول مول بات نہ کر۔" رحیم داد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "بتانا ہے تو صاف صاف بتا۔"

"گل تو بہت لمی ہے۔ وہ ایسا ہے جی۔ میرے پیئو کے پاس تین کلا زمین ہے۔ وہ ہتھ راوہ ہے۔

خود ہی کھیتی باڑی کرتا ہے۔ بہت تنگی میں گزر بسر ہوتی تھی۔ میں جوان ہوا تو لاوی بار بن گیا۔ مزدوری پر دوسروں کی فصل کی واڈھی کرتا تھا۔ میں کئی سال لاوی بار رہا۔ فیر اپنے پنڈ کے لمبردار میاں داد سے ادھلاپی پر ۲۷ کنال زمین لے لی۔ بہت خراب اور بڑیلی زمین تھی۔ اس پر جھنگر تھا۔ میں نے زبردست محنت کی۔ جھاڑیاں کاٹ کے صاف کیں۔ زمین تیار کی۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "نہ پچھ' میں نے کتنی محنت کی۔ ادھار لے کر ہل پنجالی خریدی' بوائی کی۔ ہر فصل بہت چنگی ہوئی۔ انوہندا کے حساب سے فصل کا آدھا اور اوپر سے اٹھواں حصہ بھی زمیں دار کو دے کر میرے پاس اتنا بچنے لگا کہ میں نے ادھار ادا کر دیا۔ تیسرے سال ربیع کی فصل کی واڈھی کے بعد بپونے میرا ویاہ کر دیا۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ نوردین دالان کے تھم سے پیٹھ ٹکائے آہستہ آہستہ بتاتا رہا۔ "راجو میری گھر والی بن کر آئی تو فصل اور چنگی ہونے لگی۔ وہ محنت کرتی' روٹی پکاتی' دوپہر کو میرے لیے کھیت پر بھتا لے کر آتی۔ مویشیوں اور ڈنگروں کے لیے سویرے ہی سویرے دھتا بھتا کرتی۔ چاٹی میں دودھ بلو کر مکھن نکالتی۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔

"فصل تیار ہونے کے بعد میں راجو کو اس کی دیکھ بھال پر لگا دیتا۔ وہ کھیتوں میں پانی لگاتی اور نگرانی بھی کرتی۔ میں لاوی پر فصلیں کاٹنے نکل جاتا یا شہر میں محنت مزدوری کرتا۔ ہم دونوں مل کر محنت کرتے۔ آرام نال گزر بسر ہو رہی تھی۔ فیر ایسا ہوا جی' ایک رات پنڈ میں دھاڑا پڑا۔ شور مچا تو میں بھی نکل آیا۔ ہاتھ میں ڈانگ بھی تھی۔ ڈاکوؤں کو مار بھگایا۔ انھیں دور تک کھدیڑتا ہوا گیا۔"

رحیم داد نے نوردین کو غور سے دیکھا' مسکرا کر بولا۔ "دیکھنے میں بھی تو زور آور لگتا ہے۔"

نوردین اس کی بات نظر انداز کر کے بتاتا رہا۔ "لو جی' میں نے تو ڈاکوؤں کو بھگا کر اپنے تئیں نیک کام کیا پر یہی نیکی گلے پڑ گئی۔ میاں داد نے دوسرے ہی روز سویرے سویرے مجھے اپنی حویلی پر بلایا۔ میری پیٹھ ٹھونکی۔ بہت شاباش دی۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "کچھ ہی روز پہلے پنڈ میں میلہ لگا تھا۔ اس میں دنگل بھی ہوا۔ دوسرے پنڈ کے بھی پلوان اس میں کشتی لڑنے آئے تھے۔ میں نے اس دنگل میں اپنے سے تکڑے پلوان کو پچھاڑ دیا۔ بہت واہ واہ ہوئی جی۔ یار بیلیوں نے مجھے کندھے پر بٹھا کر پنڈ کا چکر لگایا۔ ڈھولیوں نے ڈھولوں پر زور زور سے چوٹیں لگائیں۔ میاں داد نے بھی میری جیت کا یہ جشن دیکھا۔ بہت خوش لگتا تھا۔"

"میاں داد کو تو خوش ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس کے پنڈ کا نام اونچا ہوا تھا۔"

"اب آگے کی سنو۔ میاں داد مجھ سے کچھ دیر ادھر ادھر کی گپ شپ کرتا رہا۔ فیر الگ لے جا کر



مجھ سے ایسا کام کرنے کو کہا کہ میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے مجھے رجھانے کی بہت کوشش کی پر میں تیار نہ ہوا۔ بس جی اس بات پر وہ مجھ سے سخت ناراض ہو گیا۔"

رحیم داد نے بے چینی اور حیرت سے پوچھا۔ "وہ تجھ سے کیا کام کروانا چاہتا تھا؟"

"گل ایہہ ہے جی۔ وہ زبردست رسا گیر ہے۔" نوردین نے تیکھے لہجے میں بتایا۔ "وہ مجھ سے ڈنگروں کی چوری کرانا چاہتا تھا۔ میں ایسا گندا دھندہ کیسے کرتا۔ پہلے تو اس نے مجھے تنگ کرنے کے لیے فصل کی بٹائی پر جھگڑا کیا۔ بٹائی کے لیے اپنے ونڈاوے لے کر آیا۔ مجھے کم راہ کی دی اور اپنے حصے سے زیادہ غلہ اٹھوا کر لے گیا۔ میں چپ رہا پر وہ مجھے تنگ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بے دخل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی کچھ نہ چلنے دی۔ بس مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ انھی دنوں لاوی کے لیے پنڈ سے باہر چلا گیا۔ میں نے اس دفعہ اپنی فصل کی پہلے ہی واڈھی کر لی تھی۔"

رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ "غلطی کی اس میں کون سی گل ہے۔ تو ہر فصل کی تیاری کے بعد لاوی پر جاتا ہی تھا۔"

"پر اس دفعہ مجھے پنڈ سے جانا نہیں چاہیے تھا۔ میاں داد سے دشمنی جو ہو گئی تھی۔" نوردین نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں ادھر لاوی پر دوسروں کی فصلوں کی واڈھی کر رہا تھا' ادھر ایک رات زمیں دار نے اپنے بدمعاشوں اور کرندوں کو میرے گھر بھیجا۔ وہ منہ پر منڈاسا باندھ کر آئے اور راجو کو اٹھا کر لے گئے۔ میں ہفتہ بھر بعد واپس آیا۔ راجو کو نہ پایا تو بہت پریشان ہوا۔ پڑوسیوں سے پوچھا۔ کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ میرے پیو کو بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ جن کو پتہ تھا وہ زمیں دار کے ڈر سے چپ رہے۔"

"تھانے میں پرچا چاک نہیں کرایا؟"

"خود تھانے گیا تھا۔ پر تھانے دار نے رپٹ نہیں لکھی۔ کئی بار تھانے کے چکر لگائے۔ کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ ایک پولسیا جاننے والا تھا۔ اس سے معلوم ہوا' تھانے دار کی میاں داد سے یاری ہے۔ اس لیے وہ کارروائی کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے اوپر درخواست لگائی۔ بہت بھاگ دوڑ کی پر کچھ بھی نہ ہوا۔" نوردین نے گہری سانس بھری۔

"جب میں راجو سے مایوس ہو چکا تو ایک شام زمیں دار نے مجھے اپنے ڈیرے پر بلایا۔ اس روز مجھے معلوم ہوا' راجو کو میاں داد نے اپنے پنڈ سے دور یہاں دیدار پور میں حاجی حبیب کے پاس پہنچا دیا ہے؟"

"راجو کو اس نے اپنی حویلی میں کیوں نہیں رکھا؟ حاجی کے پاس کیوں پہنچا دیا؟"

"گل اصلی ایسہ ہے جی' دونوں ہی رسا گیر ہیں۔" نوردین نے تلخی سے کہا۔ "دونوں چوری کے ڈھور ڈنگر اٹھوا کر ایک دوسرے کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ مانو پولیس چھاپا مارے بھی تو راجو اس کی حویلی سے برآمد نہ ہو۔" وہ چند لمحے خاموش رہ کر گویا ہوا۔

"میں نے زمیں دار کی بہت منت کی تو اس نے راجو کی واپسی کے لیے یہ شرط لگائی' میں اس کے لیے ڈنگروں کی چوری کروں۔ دس ڈنگروں کی چوری کے بعد اس نے راجو کو واپس کرنے کا وعدہ کیا۔"

"تو نے میاں داد کی یہ شرط مان لی؟"

"ہاں جی' مانی ہی پڑی۔ پولیس کو اور اوپر والوں کو سبھی کو آزما لیا۔ کسی نے میری کوئی مدد نہیں کی۔"

"تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔"

"سنتا جا۔ کیا کیا ہوا۔" نوردین بتانے لگا۔ "تو جی اس طرح میں مویشی چور بن گیا۔ رات کے اندھیرے میں میاں داد کی حویلی سے نکلتا۔ کبھی اکیلا ہوتا' کبھی دوسرے مویشی چور بھی ساتھ ہوتے۔ دور دور کے پنڈ سے ڈنگر چراتا۔ کھرے کے نشانات مٹانے کے لیے مویشیوں کے پیروں میں کھسّے ڈالتا۔ لادھ ہوتا تو پیچھا کرنے والوں پر پلٹ کر حملہ بھی کرتا۔ کبھی ان کو بھگانے کے لیے گولی چلائی' کبھی غلط رستے پر ڈالنے کے لیے وڑوچ سے بھی کام لیا۔ کئی بار پکڑے جانے سے بال بال بچا۔ چوری کے مویشی چھپانے کے لیے میاں داد نے اپنا اہر دور جھل میں بنایا ہے۔ چوری کے بعد مویشی وہاں پہنچاتا۔ فیر تو جی میں نے کسی نہ کسی طرح دس مویشی میاں داد کے لیے چرائے۔"

اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ "مویشیوں کی اس چوری میں سب سے زیادہ دکھ مجھے دو بار ہوا۔ میں نے دو مزارعوں کے ڈھگے چرائے اور اس لیے چرائے کہ میاں داد انھیں بے دخل کرنا چاہتا تھا۔ جب ڈھگے نہ رہے تو وہ ہل کیسے چلاتے۔ دونوں برباد ہو گئے۔ پنڈ چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک کے بارے میں تو سنا ہے ملتان میں بھیک مانگتا ہے۔ گھر والی بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ ایک پتر تھا' اسے بھی ساتھ لے گئی۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں نے یہ سب کچھ راجو کے لیے کیا۔ وہ تب بھی نہ ملی۔"

"ایسا کیوں ہوا؟" رحیم داد نے چونک کر سوال کیا۔ "تو نے تو زمیں دار کی شرط بھی پوری کر دی تھی۔"



"میں نے یہی بات زمیں دار سے کہی تھی۔ جب میں نے اس کے لیے دس مویشی چرا لیے تو اس نے مجھے کہا' دیدار پور چلا جا اور حاجی حبیب کی ماڑی سے راجو کو واپس لے آ۔ میں اس کے کہنے پر یہاں حاجی کے پاس آیا۔ وہ صاف مکر گیا۔ بگڑ کر بولا' میرے پاس کوئی راجو شاجو نہیں۔ میاں داد نے تجھے بہکا دیا۔ میں ایسا گندا کام نہیں کرتا۔ اس کی باتیں سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ واپس میاں داد کے پاس گیا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی۔ وہ شرمندہ ہونے کی بجائے ٹھٹھا مار کر ہنسا' میری پیٹھ ٹھونک کر کہنے لگا۔ مل جائے گی' تیری راجو ضرور مل جائے گی۔ پہلے میرا ایک کام کر دے۔ اس دفعہ اس نے بہت خطرناک کام بتایا۔"

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "مویشی چوری سے بھی زیادہ خطرناک؟"

"ہاں جی' اس سے بھی زیادہ خطرناک۔ ہوا یہ کہ ایک کھوجی نے میاں داد کے اہر کا کھوج نکال لیا۔ وہاں سے چوری کے کئی مویشی پکڑے گئے۔ میاں داد جیل جاتے جاتے بچا۔ کئی ہزار روپے رشوت میں دینے پڑے۔ خود میاں داد کے اپنے کرندے' بھولا نے مرخائی کے لالچ میں مخبری کی تھی۔ وہ بھاگ کر کریشیوں کے پاس چلا گیا۔ وہ جی بہت وڈے زمیں دار ہیں۔ ان کی ہزاروں کلّا زمین ہے۔ اوپر بھی ان کی پہنچ ہے۔ میاں داد کو جب بھولا کی غداری کا علم ہوا تو سخت ناراض ہوا۔ وہ چاہتا تھا میں بھولا کا خون کر دوں۔ میاں داد کی بات سن کر میں چپ رہا۔ دو روز تک سوچتا رہا۔ کریشیوں کے علاقے میں گولی چلانا آسان کام نہیں۔ وہاں تو مانو ان کی حکومت ہے۔ تھانہ' پولیس' سب کچھ ان کا ہے۔"

نوردین لمحے بھر خاموش رہ کر بتانے لگا۔ "ادھر میاں داد کو ملوم ہو گیا' میں بھولا کا خون کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ اس نے رات کو مجھے بلایا۔ بہت ناراض ہوا۔ کاربین میرے ہاتھ میں دے کر بولا۔ بھولا کو ختم کر کے آنا ورنہ مجھے اپنا منہ نہ دکھانا۔ تجھے رات بھر کی مہلت دیتا ہوں۔ کام نہ ہوا تو راجو تو تجھے ملے گی ہی نہیں اور تو بھی اس سے ملنے کے لیے زندہ نہیں رہے گا۔ ہاں' کام پورا کر کے آیا تو راجو کو اپنے ساتھ لے جانا۔ یہ میرا تجھ سے پکا وعدہ رہا۔ اس کے ناراض ہونے سے میں ڈر گیا۔ راجو کو بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں تیار ہو گیا۔ میاں داد کے کرندوں نے اسی رات مجھے کریشیوں کی زمینوں کے نزدیک پہنچا دیا۔"

"کرندے اس کام میں شریک نہیں ہوئے؟"

"توبہ کرو جی۔ وہ مجھے چھوڑ کر فوراً اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ میں آگے گیا اور رات بھر درختوں کے نیچے بھولا کی گھات میں بیٹھا رہا۔ ابھی صبح کا ذرا اجالا ہوا تھا' کیا دیکھتا ہوں' بھولا اپنے

گھر سے نکلا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا سامنے کے نیائین کی طرف بڑھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ سویرے سویرے ٹٹی کے لیے نیائین ضرور جائے گا۔ میں نیائین کے سامنے ہی اندھیرے میں دبکا بیٹھا تھا۔ جیسے ہی وہ دھوتی اٹھا کر بیٹھا' میں نے جھٹ اس پر گولی چلائی۔ نشانہ ٹھیک بیٹھا۔ وہ چیخ مار کر اٹھا۔ میں نے دوسری گولی چلائی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ میں نے اسے زمین پر تڑپتے دیکھا اور کھیتوں کے اندر اندر رستہ بناتا ہوا بھاگا۔ کریشیوں کی مسلح کرندے گولی کی آواز سنتے ہی شور مچاتے پہنچے۔ انھوں نے میرا پیچھا بھی کیا۔ بار بار گولیاں چلائیں' پر میں بچ کر صاف نکل آیا۔"

"تونے کمال کردیا۔" رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔ "کریشیوں کی زمیں داری سے اس طرح بچ کر نکل آنا معمولی بات نہیں۔"

"پر میرا کام تب بھی نہ بنا۔" نوردین نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میاں داد نے مجھے فیر حاجی حبیب کے پاس بھیجا۔ اس دفعہ حاجی نے یہ تو بتایا' راجو اس کی ماڑی میں ہے پر اس نے راجو کو دیا نہیں۔ کہنے لگا' کچھ دنوں بعد آنا۔ میں نے میاں داد کو بتایا۔ اس نے مجھے اپنے منشی کے ساتھ حاجی کے پاس بھیجا۔ حاجی نے فیر ٹال مٹول سے کام لیا۔" اس نے گہری سانس لی۔ "میں بار بار حاجی کے پاس جاتا' وہ مجھے لارے لپے دیتا۔ پچھلے دنوں اس کے پاس آیا تو اس نے نئی گل بات کہی۔"

"کیا نئی گل کہی؟"

"حاجی نے کہا' جو زنانی اٹھ مہینے تک دور رہی' وہ اب تیرے ساتھ کیسے رہ سکتی ہے۔ یہ شرعی مسئلہ ہے' مسجد کے ملاں سے پوچھنا پڑے گا۔"

"اس چکر میں پڑا ہی کیوں؟ میاں داد سے کہتا' وہ خود تیری گھر والی کو حاجی کے پاس سے واپس لائے اور تیرے حوالے کرے۔ تیری تو اس سے یہی بات طے ہوئی تھی نا؟"

"میں نے میاں داد سے پہلے ہی کہا تھا۔ مگر جب میں نے زیادہ زور دیا تو وہ ایک دم گرم ہوگیا۔ دھمکی دینے لگا کہ بھولا کے کتل کے الزام میں مجھے پولیس کے حوالے کردے گا۔ میں تو جی یہ بات سن کر ہی ڈر گیا۔ ویسے بھی ان دنوں بھولا کے کتل کے سلسلے میں پولیس نے زبردست بھاگ دوڑ مچا رکھی تھی۔ کریشیوں نے بہت زور ڈالا۔ پولیس تو مجھے پکڑ کر لے بھی جاتی پر میاں داد نے بچا رکھا تھا۔ وہ کریشیوں کے اتنا وڈا زمیں دار تو نہیں پر اس کے بھی شریکے اور رشتے ناتے دار وڈے سرکاری افسر لگے ہیں۔"

نوردین سر جھکا کر چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب تو جی' حاجی ہی میرا کام کرسکتا ہے۔ اسی لیے میں ملاں کے پاس آیا ہوں۔ پہلے بھی آیا تھا۔ ملاں کی منت سماجت کی تو



اس نے کہا اسے ملتان جانا ہوگا۔ شرعی مسئلہ ہے' وہاں کے مفتی سے فتویٰ لینا ہوگا۔ اب تک تو وہ فتویٰ لے آیا ہوگا۔"

اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں التجا تھی۔ "توں کہتا تھا' ملاں تیری بات مان لے گا۔ توں بھی ملاں سے کہنا' میرا بازو مجھے مل جائے' تیری بہت مہربانی ہوگی۔" رحیم داد گردن جھکائے اس طرح خاموش بیٹھا رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ نوردین نے اسے گہری سوچ میں غرق دیکھا تو کرید کر دریافت کیا۔

"کس سوچ میں پڑگیا؟"

"سوچ رہا ہوں' میاں داد تجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔"

"بے دخل کرنا چاہتا ہے تو کردے۔" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ "جب سے راجو گئی ہے' زمین کا ستیا ناس ہوگیا۔ میں اکیلا کیا کرسکتا ہوں؟ وہ میرے ساتھ برابر سے کام کرتی تھی۔ وہ میرا بازو ہے۔ اس کے بنا میں کیسے کھیتی باڑی کرسکتا ہوں۔" اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

"غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے بھی اس کی تائید کی۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے' میاں داد اور حاجی حبیب' دونوں نے اس معاملے میں مسکوٹ کر رکھی ہے۔ میاں داد تجھے بے دخل کرکے زمین ہتھیانا چاہتا ہے۔ حاجی تیری گھر والی کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ دونوں یہی چاہتے ہیں' رسا گیری کے دھندے میں تجھے استعمال کریں۔ تجھ سے مویشیوں کی چوری کرائیں' خون کرائیں' ڈکیتی کروائیں۔ تیں نوں پتہ نہیں' سارے ہی وڈے زمین دار یہی دھندا کرتے ہیں۔" اس نے انگلی سے سر کھجاتے ہوئے نوردین کی جانب نظریں اٹھائیں۔ "نورے! مجھے تو راجو کا واپس ملنا مشکل ہی نظر آتا ہے۔"

"ایسا نہ کہہ۔" نوردین تڑپ کر بولا۔ اس نے جھٹ دھوتی کے ڈب سے دیسی ساخت کا پستول نکالا۔ "میں حاجی اور میاں داد دونوں کو جان سے مار دوں گا۔"

"ایک تو یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا تو سمجھتا ہے۔" رحیم داد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "فیر یہ بھی تو سوچ' تو خود بھی پھانسی پر لٹک جائے گا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "راجو کا خیال اپنے دل سے نکال کیوں نہیں دیتا؟"

"نہیں جی ایسا نہیں ہو سکتا۔ راجو میرا بازو ہے' میں اسے نہیں بھول سکتا۔" نوردین نے بڑے

جوش سے کہا۔ ”ویسے مجھے راجو سے پیار بھی ہے۔ اب مجھے ویسی گھر والی کہاں ملے گی؟ وہ زبردست محنتی اور اہری ہے۔“

☆

آنگن کا دروازہ کھلا۔ دونوں نے چونک کر دیکھا‘ چراغ کی دھندلی روشنی میں ایک عورت سر پر کھانے کی چنگیر رکھے اندر داخل ہوئی۔ رحیم داد نظریں اٹھائے اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ نور دین نے پستول فوراً دھوتی کے ڈب میں رکھ لیا۔

عورت آہستہ آہستہ چلتی ہوئی قریب آتی گئی۔ وہ گداز بدن کی نوجوان عورت تھی۔ خوب گھیردار گھگھرا پہنے ہوئے تھی۔ اس کے اوپر ملگجا تنگ جھگا تھا۔ گردن میں بھی ملگجا دوپٹا پڑا تھا۔ لباس تو اس کا میلا کچیلا تھا مگر تھی الھڑ اور چلبلی۔ چلتی تو کولھوں کو خم دے کر قدم بڑھاتی۔

وہ دالان میں پہنچی‘ دوپٹے کے آنچل سے سر ڈھک کر چہرے پر بکل مارا اور جھک کر کھانا رکھتے ہوئے بولی۔ ”زمیں دار کے گھر سے ملاں جی کے لیے روٹی ٹکر لائی ہوں۔“

وہ واپس جانے کے لیے مڑی۔ نوردین نے ٹوکا۔ ”تیرا ناں کیہ ہے؟“

”ہے کچھ۔“ وہ تنک کر بڑے ناز سے بولی۔ ”توں میرا ناں کیوں پوچھتا ہے؟“

”اتنا ناراض کیوں ہوتی ہے؟“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”نام ہی تو پوچھا ہے‘ بتا دے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔“

”میرا ناں پھلی ہے جی۔ زمیں دار کی ماڑی میں کام کرتی ہوں۔“

نوردین نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”ایک گل پوچھوں‘ بتا دے گی؟“

اس نے گردن کو خم دے کر نوردین کی جانب دیکھا۔ ”بتانے کی ہوگی‘ بتا دوں گی۔“

”راجو کو جانتی ہے؟ وہ بھی تو حاجی کی ماڑی میں ہوتی ہے۔“

”راجو!“ پھلی نے نوردین کو مشتبہ نظروں سے دیکھا‘ بے رخی سے بولی۔ ”میں نوں کچھ پتہ نہیں۔“

رحیم داد نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ”اللہ تعالیٰ نے تجھے ایسی سوہنی شکل صورت دی ہے‘ بات بھی اسی طرح کیا کر۔“

پھلی کی شکل و صورت ایسی اچھی نہ تھی۔ گہرا سانولا رنگ تھا‘ ناک نقشہ بھی بھدا تھا۔ رحیم داد کی بات سن کر وہ خوش ہوئی۔ زیر لب مسکرائی۔ رحیم داد کو مخاطب کر کے بولی۔

”تیں نوں کچھ پوچھنا ہے؟“



”پہلے بیٹھ تو جا۔“ رحیم داد نے شفقت سے کہا۔ ”کھڑی کیوں ہے؟ چلی جانا‘ ایسی چھیتی کیا ہے۔“

پھلی نے اپنا گھگھرا سمیٹا اور دونوں سے ذرا ہٹ کر چٹائی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”بول‘ تیں نوں کیہ کہنا ہے؟“

”میں نوں تو کچھ نہیں کہنا۔“ رحیم داد نے نوردین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ جو کچھ پوچھتا ہے‘ بتا دے۔ بہت دور سے چل کر آیا ہے۔“

پھلی نے نگاہیں موڑ کر نوردین کو دیکھا۔ مسکرا کر بولی۔ ”تو راجو کا گھر والا نوردین تو نہیں ہے؟“

”ہاں‘ میں نوردین ہی ہوں۔ یہ بتا‘ راجو کیسی ہے؟ تیری مہربانی ہوگی۔“

”مہربانی کی کون سی گل ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”زمیں دار سے ڈر لگتا ہے۔ ویسے راجو ٹھیک ٹھاک ہے۔“

نوردین نے دریافت کیا۔ ”تجھ سے تو ملتی ہی ہوگی؟“

”روز ملتی ہے۔ میرے ساتھ ہی ماڑی میں کام کاج کرتی ہے۔ پر وہ ماڑی سے باہر نہیں نکلتی۔ زمیں دار کا اس کے لیے یہی حکم ہے۔“

”کبھی مجھے بھی یاد کرتی ہے؟“

”کرتی تو ہے۔“ پھلی نے جواب دیا۔ ”پر یاد کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تیرے پاس نہیں جا سکتی۔“

اس دفعہ رحیم داد نے سوال کیا۔ ”کیا اس کی مرضی اپنے گھر جانے کی نہیں ہے؟“

”اس کی مرضی سے کیا ہوتا ہے جی۔“ پھلی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”مرضی تو اصلی زمیں دار کی ہے۔“ اس نے چوکنا نظروں سے آنگن کے دروازے کی جانب دیکھا اور کھسک کر دونوں کے قریب ہوگئی۔ ”زمیں دار اسے رکھیل بنا کر اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ ویسے جی اس کی پہلے ہی دو گھر والیاں ہیں۔ دونوں ہی ماڑی میں رہتی ہیں۔ روز آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں۔ پر راجو سے دونوں ہی کھار کھاتی ہیں۔ اسے بہت تنگ کرتی ہیں۔ زمیں دار کا وڈا پتر کمال بھی راجو کو تنگ کرتا ہے۔ ویسے تو وہ ماڑی میں کام کرنے والی سبھی زنانیوں کو تنگ کرتا ہے۔ ایک نمبر حرام دا ہے۔“ اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

”ابھی میں روٹی لے کر ماڑی سے نکلی تو وہ بھی کہیں جا رہا تھا۔ اندھیرے میں میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ لگا نوچنے کھ ٹنے۔ روٹی ہاتھ میں نہ ہوتی تو ابھی پکڑ کر کھیتوں میں لے جاتا۔“ وہ شرما گئی۔

رحیم داد نے پوچھا۔ "تیرا گھر والا نہیں ہے؟"

"ہے تو جی۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ہم تو کمی کمین ہیں جی' ہماری کیا عزت' کیا آبرو۔ زمیں دار کے پتر کے خلاف ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ماڑی میں کام نہ کریں تو گزارہ کیسے ہو۔"

نوردین بے قرار ہو کر بولا۔ "پھلی! مجھے راجو سے ملوا دے' تیری بہت مہربانی ہوگی۔"

"نا جی نا' ایسی گل نہ کر۔" وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔ "زمیں دار کو پتہ چل گیا تو جان سے مار دے گا مجھے۔"

"اسے پتہ ہی کب چلے گا۔" رحیم داد نے سفارش کی۔ "تو بھی کسی کی گھر والی ہے' ذرا سوچ تو' اور اسے دیکھ۔" اس نے نوردین کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "کتنا پریشان اور دکھی ہے۔ اٹھ مہینے سے اوپر ہوگئے' اس نے اپنی گھر والی کو نہیں دیکھا۔"

وہ بے مروتی سے بولی۔ "میں کیا کر سکتی ہوں جی؟"

"تو حاجی کی دونوں گھر والیوں کو راضی کرنے کی کوشش کر۔" رحیم داد نے اسے ترکیب بتائی۔

"وہ تو راجو کو نورے کے ساتھ بھگانے پر بھی تیار ہو جائیں گی۔ اسے اپنی سوکن جو سمجھتی ہیں۔ اس کام میں وہ ضرور مدد کریں گی۔"

"نہیں جی' تیں نوں کچھ پتہ نہیں۔" پھلی نے انکار میں گردن ہلائی۔ "ویسے تو دونوں ہر وکت کڑ کڑ کرتی رہتی ہیں۔ پر زمیں دار سے بہت ڈرتی ہیں۔ باہر وہ جتنا نیک بندہ نظر آتا ہے' گھر کے اندر اتنا ہی ظلم کرتا ہے۔ تجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔" وہ اٹھنے کے لیے کسمسائی۔ "میں نوں اب جانا ہے' کام بھی کرنا ہے۔"

"زمیں دار تو ملاں جی کے ساتھ شہر گیا ہے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "فیر تو اتنا کیوں ڈرتی ہے۔"

وہ بولی۔ "زمیں دار اب آتا ہی ہوگا۔"

نوردین نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے راجو سے نہیں ملوا سکتی؟ ملوا دے' تیری بہت مہربانی ہوگی۔" اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"نہیں جی' میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "ناراض کیوں ہوتی ہے۔" اس نے دھوتی کا ڈب ٹٹولا اور دس روپے کا نوٹ نکال کر پھلی کی جانب بڑھایا۔ "لے اسے رکھ لے' نئے کپڑے لتے بنوا لینا۔ دیکھ تو تیرے کپڑے کتنے گندے ہو رہے ہیں۔"



پھلی نے ہچکچاتے ہوئے نوٹ تو لے لیا مگر خاموش بیٹھی رہی۔ رحیم داد نے کہا۔ "حوصلے سے کام لے' حوصلے سے۔" اس نے نوردین کی جانب مڑ کر دیکھا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "نورے! بتا تیرا کیا پروگرام ہے۔ کب اور کیسے راجو سے ملنا چاہتا ہے؟"

"ابھی تو جی جگار ہے۔ میں آدھی رات کو ماڑی کے پاس پہنچ جاؤں گا۔" اس نے پھلی کی طرف اشارہ کیا۔ "آگے یہ جیسا بتائے گی' ویسا کروں گا۔"

"ایسا کر۔" پھلی نے نوٹ گھگھرے کے نیفے میں اڑستے ہوئے کہا۔ "ماڑی کے کھبے ہتھ پہنچ جانا۔ وہاں ٹاہلی کے پیڑوں کا جھنڈ ہے' اندھیرا بھی ہے۔ ماڑی کا ایک دروازہ ادھر کھلتا ہے۔ میں راجو کو وہیں بھیج دوں گی۔ پر آدھی رات گزرنے کے بعد ہی آنا۔" اس نے خوف زدہ نظروں سے نوردین اور رحیم داد کو دیکھا۔ "کوئی گڑبڑ ہو جائے تو میرا ناں نہ لینا' ہرگز نہیں۔ ورنہ زمیں دار مجھے جان سے مار دے گا۔"

"پکا وعدہ۔ تیرا ناں ہرگز نہیں لوں گا۔ چاہے وہ مجھے جان سے مار دے۔" نوردین نے سینہ تان کر اسے یقین دلایا۔ "بالکل فکر نہ کر۔" اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ "میں آدھی رات کے بعد اس جگہ پہنچ جاؤں گا۔"

"کوئی گڑبڑ نہ ہو۔" پھلی کھڑی ہوگئی۔ "میں نوں بہت ڈر لگتا ہے۔"

وہ واقعی خوف سے گھبرائی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس نے مزید بات چیت نہیں کی۔ دالان سے نکل کر چپ چاپ آنگن میں پہنچی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی باہر چلی گئی۔ نوردین نے اٹھ کر دروازہ بند کیا مگر کنڈی نہیں لگائی۔

نوردین واپس آیا تو خوشی سے چہرہ دمک رہا تھا۔ رحیم داد کے قریب بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔ "توں نے اس وکت وہ کام کیا میا کوئی سگا بھی نہ کرتا۔ میں نوں پتہ نہ تھا' توں اتنا بھلا اور نیک بندہ ہے۔" اس کے انداز میں خوشامد تھی۔

"نورے! مجھے تو تب خوشی ہوگی' جب راجو تجھے مل جائے گی۔"

"میں تو کہتا ہوں جی' بس ایک بار راجو مل جائے' فیر میں اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔"

"ایسا ہو تو سکتا ہے۔ حاجی کی گھر والیاں مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو کام آسان ہو جائے گا۔"

"میری ایک گل مان لے گا؟"

"کیا؟" رحیم داد نے دریافت کیا۔

"میرے ساتھ ماڑی تک چل سکے گا؟" نوردین نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں، توں میرے ساتھ ہوتا۔ جیسے کہے گا، ویسا ہی کروں گا۔ راجو بھی تیری گل بات مان لے گی۔ وہ ضرور تیری گل مان لے گی۔ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ میری گھر والی ہے۔"

"مجھے نہ لے جا۔" رحیم داد اس کے ہم راہ جانے پر رضامند نہیں ہوا۔ وہ کوئی ایسا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا جس میں گرفتاری کا خدشہ ہو۔ "اکیلا ہی چلا جا۔"

"جیسی تیری مرضی۔" نوردین نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ویسے ساتھ رہتا تو ٹھیک تھا۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ نوردین بھی چپ تھا۔ دونوں چٹائی پر گم صم بیٹھے تھے۔ طاق میں چراغ روشن تھا مگر اس کی روشنی بہت کم تھی۔ باہر آنگن میں اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔

☆

مولوی فضل احمد دروازے پر نمودار ہوا۔ آگے بڑھا۔ خاموشی میں اس کے قدموں کی آہٹ ابھری۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا دالان میں پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی گٹھری دبی تھی۔ اس نے گٹھری رحیم داد کے سامنے ڈال دی۔

"لے بھئی، تیرا سامان آ گیا۔"

مولوی فضل ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے اور لباس پر خاک کے ذرات بکھرے ہوئے تھے۔ رحیم داد نے گٹھری کھولی۔ اندر سے پگڑی، شلوار اور قمیص نکلی۔ شلوار سفید لٹھے کی تھی۔ قمیص پر ہلکی ہلکی سبز دھاریاں تھیں۔ کپڑا بھی چکنا اور نرم تھا۔ ساتھ میں ایک پرنا اور دو رجسٹر تھے، پنسلیں بھی تھیں۔ رحیم داد نے ایک ایک چیز غور سے دیکھی، مسکرا کر بولا۔

"ملاں جی، تم نے تو کمال کر دیا۔ اتنی جلدی کمیض اور شلوار تیار کرالی۔"

"میں نے شہر پہنچتے ہی بازار سے کپڑا خریدا۔ درزی کو دے کر کہا، کل دوپہر بارہ بجے تک تیار کر دے۔ مزدوری کی فکر نہ کرنا۔" مولوی فضل آہستہ آہستہ بتاتا رہا۔ "بس جی، اس نے فٹافٹ کپڑے تیار کر دیئے۔ میں نے سوچا، کندھے پر ڈالنے کے لیے پرنا بھی چاہیے ہوگا۔ ہر دم منہ ہاتھ پونچھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ سو میں نے ایک پرنا بھی تیرے لیے خرید لیا۔" اس نے اپنے کرتے کی جیب سے عینک نکالی اور رحیم داد کے ہاتھ میں دے دی۔ "لے، یہ تیری عینک بھی آ گئی۔ پتہ نہیں، تیری آنکھوں پر ٹھیک بھی لگتی ہے کہ نہیں۔ ویسے میں نے عینک ساز کو بتا دیا تھا کہ کم نمبر کی ہو، جوان بندے کے لیے چاہیے ہے۔"



رحیم داد نے عینک دیکھی۔ اس کا فریم تھا تو استعمال شدہ مگر جدید وضع کا تھا۔ رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا۔ بات یہ تھی کہ حکیم چشتی کی عینک کا فریم چاندی کے پتلے تاروں کا تھا۔ رحیم داد حلیہ بدل کر اب رحیم داد نہیں رہا تھا۔ مگر وہ مقتول حکیم چشتی بھی بننا نہیں چاہتا تھا۔ دونوں صورتوں میں اس کے لیے خطرہ تھا۔

عینک پا کر وہ خوش ہوا۔ عینک کے شیشے ہلکے اور صاف تھے۔ اس نے عینک لگا کر ادھر ادھر نظریں گھمائیں۔ ہر چیز قدرے بڑی اور صاف نظر آئی۔

رحیم داد نے مسکرا کر اپنی پسند کا اظہار کیا۔ "بالکل فٹ بیٹھی ہے جی۔ مجھے ایسی ہی عینک چاہیے تھی۔"

"وہ تو میری طرح کا فریم لگا رہا تھا۔" مولوی فضل نے اپنی عینک کی طرف اشارہ کیا، اس کا فریم پرانی وضع کا تھا۔ "پر میں نے کہا، نہیں جی، یہ نہیں چلے گا۔ کوئی عمدہ فریم لگا۔ اپنا چوہدری جوان بندہ ہے۔ شہر کا رہنے والا ہے۔" وہ اپنی کارگزاری سناتا رہا۔ "خریداری کے معاملے میں، میں کبھی دوکاندار سے مار نہیں کھاتا۔"

اس نے جیب سے تین روپے نکالے اور رحیم داد کی جانب بڑھائے۔ "لے بھئی چوہدری! تیرا سب سامان بھی آ گیا اور ۵۰ میں سے یہ روپے بھی بچ گئے۔"

رحیم داد نے روپے نہیں لیے۔ مسکرا کر کہا۔ "ملاں جی! اسے اپنے ہی پاس رکھ لو۔ میری خوشی سمجھ کر رکھ لو۔"

"تیری یہی خوشی ہے تو رکھے لیتا ہوں۔" مولوی فضل نے روپے پھر جیب میں رکھ لیے۔ رحیم داد کی اس فراخدلی پر وہ بہت خوش ہوا۔ "اب پڑچھتی میں جا کر کپڑے بدل لو اور یہ دیکھ لو، ٹھیک سے فٹ آتے ہیں کہ نہیں۔ میں نے قمیص میں چار جیبیں لگوائی ہیں، دو نیچے ایک اوپر اور ایک روپے پیسے رکھنے کے لیے اندر۔ ٹھیک کیا نا میں نے؟" مولوی فضل نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔ رحیم داد نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ تو بہت چنگا کام کیا۔"

رحیم داد کپڑے اٹھا کر دالان سے باہر گیا اور آنگن عبور کر کے پڑچھتی میں پہنچا۔

☆

مولوی فضل احمد نے نوردین کی جانب توجہ دی، کسی قدر تلخ لہجے میں پوچھا۔ "نورے! تو کیسے آیا؟"

"یہ پوچھنے آیا تھا راجو کے معاملے میں توں نے کیا طے کیا؟ اب تک ملتان سے فتویٰ بھی منگوالیا ہو گا۔"

مولوی فضل نے بے رخی سے کہا۔ "میں ملتان گیا ہی کب۔ وہاں جانے پر خرچ آتا ہے۔ مجھے کچھ دے کر گیا تھا جو میں وہاں جاتا۔"

"میری حالت کا تیں نوں پتہ ہی ہے۔" نوردین نے عاجزی سے کہا۔ "میرا تو سب کچھ تباہ ہو گیا۔ نہ زمین پر ہل چلا سکا' نہ بوائی کی' نہ فصل ہوئی۔ زمین بنجر ہوتی جا رہی ہے۔ ادھیارے پر زمین دینی چاہی تو زمیں دار نے منع کر دیا۔"

"یہ سب کچھ میں نہیں جانتا۔" مولوی نے بے زاری کا اظہار کیا۔ "یہ تیرا اور تیرے زمیں دار کا معاملہ ہے' میں اس میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"پر راجو کا معاملہ تو طے کرا سکتا ہے۔" نوردین گڑگڑانے لگا۔ "تیری بہت مہربانی ہو گی۔ میں سارے چکروں سے بچ جاؤں گا۔ میں نوں کچھ اور نہیں چاہیے۔"

مولوی فضل چند لمحے خاموش رہا پھر اپنی ڈاڑھی کریدتے ہوئے مشورہ دیا۔ "میرا کہا مان' راجو کو تو اب بھول ہی جا۔ اب وہ تیرے کام کی نہیں رہی۔ مجھے پتہ چلا ہے وہ رات کو دیر تک حاجی صاحب کے کمرے میں اکیلی رہتی ہے۔ سبھی کچھ ہو سکتا ہے' شیطان کے بہکانے میں دیر نہیں لگتی۔"

"نہیں جی' ایسا نہیں ہو سکتا۔" نوردین تڑپ کر بولا۔ "راجو ایسی نہیں ہو سکتی۔ میں اسے ٹھیک طرح جانتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے' تو اسے جان کر بھی نہیں جان سکا۔" مولوی نے عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "میں نے تو یہاں تک سنا ہے' وہ تیرے ساتھ جانے پر بالکل رضامند نہیں۔"

"نہیں ملاں جی' یہ بالکل غلط ہے۔ راجو ایسا نہیں کر سکتی۔"

"میں کہتا ہوں تو ابھی نادان ہے۔ تجھے کچھ بھی پتہ نہیں۔" مولوی فضل احمد نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "آٹھ مہینے میں وہ بالکل بدل چکی ہے۔ وہ اب تیری پہلے جیسی راجو نہیں رہی۔ تو میری بات کیوں نہیں مانتا؟" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر نرم لہجے میں بولا۔ "میں تیری ایک ہی مدد کر سکتا ہوں۔"

نوردین نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "وہ کیا ہے؟"



"وہ یہ ہے کہ میں راجو کے عوض تجھے حاجی صاحب سے کچھ روپیہ دلوا دوں۔ تو راجو کو طلاق نامہ لکھ دے۔ میں تجھے ہزار روپے تک دلوا دوں گا۔ حاجی صاحب تو پانچ سو سے زیادہ دینے کو تیار نہیں تھے' میں نے منت سماجت کی تو ہزار پر تیار ہو گئے۔" مولوی فضل کھل کر مسکرایا۔ "ویسے تو حاجی کے بارے میں کچھ ہی کہہ' پر وہ دل کا برا نہیں۔ وہ چاہتا تو راجو کو یوں ہی رکھ لیتا' ایسے ہی جیسے دوسرے وڈے زمیں دار داشتہ بنا کر رکھ لیتے ہیں۔ پر وہ نیک اور صالح مسلمان ہے' برائی سے ہمیشہ بچتا ہے۔ وہ باقاعدہ نکاح پڑھوا کر' راجو کو حبالۂ عقد میں لانا چاہتا ہے۔ بات یہ ہے جی' راجو اس کی بہت خدمت کرتی ہے' اس سے پیار کرتی ہے۔ اسی کے پاس رہنا چاہتی ہے۔ اسے ماڑی میں بہت آرام ہے۔ عیش کرتی ہے۔ تیرے گھر میں اسے یہ عیش آرام کہاں ملے گا؟ تو اس سے ڈنگروں کی طرح کام لیتا ہے۔ ہر زنانی عیش آرام چاہتی ہے' راجو بھی ایسا ہی چاہتی ہے۔ اس میں کون سی نئی بات ہے۔ پر تو یہ باتیں نہیں سمجھتا۔"

نوردین نے بیل کی طرح گردن ہلائی۔ "سمجھ نہیں آتی راجو ایسی ہو سکتی ہے۔"

"اب تو الٹی سیدھی باتیں سوچ کر اپنا مغز خراب نہ کر۔ سیدھی سیدھی معاملے کی بات کر۔ ہزار روپے کم نہیں ہوتے۔ اس سے اپنا کام دھندا چلا سکتا ہے' دوسرا ویاہ کر سکتا ہے۔ ساتھ ہی میں تجھے یہ بھی بتا دوں۔ پچھلے دنوں تیرا زمیں دار میاں داد مویشیوں کا سودا کرنے حاجی صاحب کے پاس آیا تھا۔ میں بھی موجود تھا' تیرا ذکر بھی چلا۔ میاں داد تجھے زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ کہتا تھا' تو نے زمین کا ناس مار دیا۔ کھیتی باڑی میں دلچسپی نہیں لیتا۔ زمین بالکل بنجر پڑتی جا رہی ہے۔ وہ اس پر باغ لگانا چاہتا ہے۔ یہ بات اس نے میرے سامنے حاجی صاحب سے کہی تھی۔ ذرا یہ تو سوچ' زمین ہاتھ سے نکل گئی تو کیا ہو گا۔ بھوکا مرے گا یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جرائم پیشہ اور مویشی چور بن جائے گا۔" مولوی فضل احمد نے شفقت کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضامند کرنے کی کوشش کی۔ "میں نہیں چاہتا' تو چور اچکا بن جائے۔ یہ تباہی کا رستہ ہے۔ عذاب الٰہی سے ڈر۔ ایسے رستے پر نہ چل۔ میرا کہا مان' ہزار روپے لے لے اور راجو کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔ بول کیا کہتا ہے؟"

"کہنا کیا ہے جی۔" نوردین نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "کچھ سمجھ نہیں آتی۔"

"ایسی جلدی نہیں۔ گھر جا کر آرام سے سوچ لے۔ فیر مجھے آ کر جواب دے' پر زیادہ دیر نہ لگانا' ورنہ ہزار روپے بھی نہیں ملیں گے اور راجو تو تجھے مل ہی نہیں سکتی۔"

نوردین منہ لٹکائے چپ بیٹھا رہا۔

رحیم داد دالان میں داخل ہوا۔ وہ سر پر پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر سیاہ فریم کا چشمہ تھا۔ نئی قمیص اور شلوار چراغ کی روشنی میں جھلک رہی تھی۔

مولوی فضل نے اس کی یہ سج دھج دیکھی تو مسکرا کر بولا۔ "چوہدری! اس لباس میں بہت جچ رہا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا' دیکھنے میں سکول کا ہیڈ ماسٹر لگ رہا ہے۔ بھئی سچ کہہ رہا ہوں' تجھ پر بہت شان آ گئی۔"

رحیم داد اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تیری مہربانی ہے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "میرے معاملے میں حاجی سے تو بات نہیں کی؟"

"ضرور کی تھی۔" مولوی نے جواب دیا۔ "پر اس کا بھی یہی خیال ہے' اس پنڈ میں تیرے بال بچوں کی طرح کا کوئی کنبہ نہیں۔ پورے موضع میں صرف ایک مہاجر کنبہ ہے۔ وہ کرنال کے ہیں اور گھر والا' بیوی بچے' سب کے سب شروع ہی سے ایک کنبے کے چلے آ رہے ہیں۔ ویسے صبح حاجی صاحب سے مل لے۔ چاہے تو وہ ان کو اپنے ڈیرے پر بھی بلا لے گا۔ اپنا اطمینان کر لینا۔"

رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نہیں ملاں جی' اب اس کی ضرورت نہیں۔ سوچتا ہوں' آج ہی چلا جاؤں۔"

"جیسی تیری مرضی' ویسے میں تو چاہتا تھا آج رات یہیں ٹھہر جاتا۔"

"مجھے جانے ہی دے۔ کل کچھ ضروری کام بھی کرنے ہیں۔"

"ایسی گل ہے تو میں تجھے نہیں روک سکتا۔" مولوی نے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔ "روٹی تو کھا لے۔" اس نے نوردین کو مخاطب کیا۔ "نورے! تو بھی روٹی کھا لے۔ میں نہیں کھاؤں گا۔ شام کو رستے میں حاجی صاحب کے ساتھ کچھ کھا پی لیا تھا۔"

مولوی فضل احمد نے نوردین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "میں نے جو کچھ کہا ہے' اس پر گھر جا کر آرام سے سوچ اور تین چار روز بعد آ کر بتا دے۔ ویسے میری بات مان لے گا تو خوش و خرم رہے گا۔ مجھے دل سے دعا ہی دے گا۔"

مولوی فضل کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد اور نوردین کو مخاطب کر کے بولا۔ "تم دونوں روٹی کھاؤ۔ میں نے اب مسجد جانا ہے۔" وہ آگے بڑھا۔ دالان کے نکڑ پر پہنچ کر رکا۔ "جانا تو باہر سے دروازے کی زنجیر چڑھا دینا۔"

☆

رحیم داد نے کھانا کھسکا کر سامنے کیا اور نوردین کے ساتھ کھانے لگا۔



کھانا کھاتے ہوئے رحیم داد نے نوردین سے دریافت کیا۔ "ملاں سے راجو کے بارے میں بات کی تھی۔"

"ہاں۔" نوردین نے جواب دیا۔ "پر وہ دوسرا ہی چکر چلانا چاہتا ہے۔ کہتا ہے' ہزار روپے لے لے اور کاگذ لکھ دے' راجو اب تیرے کام کی نہیں رہی۔"

رحیم داد نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا' حاجی نے اسے خراب کر دیا۔"

"ملاں کے کہنے کا تو کچھ ایسا ہی مطلب ہے۔ پر مجھے اس کی باتوں پر اعتبار نہیں۔ راجو ایسی نہیں ہو سکتی۔"

"مان لے ملاں نے ٹھیک ہی کہا ہے' تب تو کیا کرے گا۔"

"تب بھی ساتھ لے جاؤں گا۔" نوردین نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "رہے گی تو میری ہی گھر والی۔"

"پر ایسی گھر والی کو کیسے رکھا جا سکتا ہے جو دوسرے کے ساتھ سو چکی ہو۔" رحیم داد نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ "صاف بات یہ ہے میں تو ایسی رن کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا۔"

"توں مجھے آباد کار لگتا ہے۔" نوردین نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "جبھی ایسی گل کر رہا ہے۔"

"یہ تو سوچ عزت آبرو بھی کچھ ہوتی ہے۔" رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔

"ٹھیک ہے۔ پر گھر والی مرد کا بازو بھی ہوتی ہے' ایسے ہی جیسے ہالی کے لیے ہل۔ توں ٹھہرا پیسے والا اور آباد کار۔ توں جس طرح گھر والی کے بارے میں سوچتا ہے' ہم جانگلی اس طرح نہیں سوچتے۔ یہ عزت آبرو کیا ہوتی ہے' پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملے تو کیسی عزت' کہاں کی آبرو؟ اب یہی دیکھ' راجو تھی تو میری فصل کیسی چنگی ہوتی تھی۔ میں لاوی پر بھی نکل جاتا تھا۔ دوسروں کی فصلوں کی واڈھی کر کے کمائی کر لیتا تھا۔ راجو جب سے گئی ہے' میں نہ ٹھیک سے کھیتی باڑی کر سکا' نہ لاوی پر جا سکا۔ میرے باہر رہنے پر فصل کی دیکھ بھال کون کرتا؟" کھیتوں کو پانی کون لگاتا۔؟ نوردین نے گہری سانس بھری۔ "ذرا سوچ تو' راجو میرے لیے کتنی ضروری ہے۔ اس کے بنا تو میرا بازو کٹ گیا۔"

"تو بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔" رحیم داد نے بحث میں الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ "یہ تو اپنی اپنی سوچ کی بات ہے۔ اب یہ بتا' ملاں کی باتیں سن کر کیا طے کیا؟"

"طے کیا کرنا ہے جی۔" نوردین نے گردن اونچی کر لی۔ "راجو سے تو آج رات ملنا ہی ہے۔ پچھلی

نے اسے ملوا دیا تو سمجھ لے کام بن گیا۔"

"پر اتنی دیر رہے گا کہاں؟ اگر آدھی رات کو یہاں سے اٹھ کر گیا تو مجھے ڈر ہے' ملاں کو شبہ نہ ہو جائے۔ ایسا نہ ہو' ادھر تو راجو سے ملنے نکلے' ادھر ملاں جا کر حاجی سے مخبری کر دے۔ تب تو معاملہ بہت گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"میں ایسا کروں گا' روٹی کھا کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ زمیں دار کی ماڑی کے پاس کہیں جھاڑیوں میں چھپ جاؤں گا اور آدھی رات ہونے کا انتظار کروں گا۔"

دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ کھانا کھا کر انھوں نے پیالے سے پانی پیا۔ نوردین کچھ دیر ٹھہر کر جانے لگا۔ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔

"نورے! ایک بات تو بتاتا جا۔"

"پوچھ' کیا پوچھنا چاہتا ہے؟"

"میں نے اکال گڑھ جانا ہے۔ تیں نوں ملوم ہے' اکال گڑھ کدھر ہوتا ہے؟"

"کیوں نہیں ملوم۔" نوردین نے مستعدی سے جواب دیا۔ "چک ۵۵ کے رستے میں پڑتا ہے۔ ادھر کچے رستے سے چلا جا۔" اس نے مغرب کی سمت ہاتھ اٹھایا۔ "پہلے چک بیدی آئے گا فیر نظام اولیا۔ اگے نہر ہے۔ نہر کے کنارے کنارے چلا جانا۔ اگے اکال گڑھ آجائے گا۔ یہاں سے ۹ میل سے زیادہ نہیں ہوگا۔"

"کوئی سڑک وہاں تک جاتی ہے؟"

"سب کچے رستے ہیں۔ نہر کے کنارے کا رستہ سب سے ٹھیک ہے۔"

"اب تو جا۔" رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "راجو مل جائے تو مجھے نہ بھولنا۔"

"کیسی گل کر رہا ہے چوہدری!" نوردین نے بڑے جوش سے کہا۔ "ایسا کیوں نہیں کرتا' میرے ساتھ ہی چل۔ میں نے تو چک ۵۵ جانا ہی جانا ہے۔ اکال گڑھ رستے ہی میں ہے۔ میں تجھے وہاں پہنچا دوں گا۔"

"نہیں' تو اب جا۔" رحیم داد آمادہ نہ ہوا۔ "میں جاؤں گا تو سویرے جاؤں گا اور یہ بھی طے نہیں کہ اکال گڑھ جاؤں بھی یا نہ جاؤں۔ ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔"

نوردین باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے مقتول چوہدری نورالٰہی کی قمیص اور شلوار سمیٹ کر گٹھری بنائی۔ دونوں رجسٹر اور پنسلیں' کلیم کے کاغذات کے بستے میں رکھے۔ مولوی فضل کے رجسٹر سے تین ورق پھاڑ کر علیحدہ کر لیے۔ ان پر اس نے چوہدری نورالٰہی کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کی



تھی۔

وہ اٹھا اور تینوں ورق چراغ کی لو سے جلا کر ضائع کر دیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر چٹائی پر لیٹ گیا مگر سویا نہیں۔ چپ چاپ لیٹا مولوی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ اس سے ملے بغیر جانا نہیں چاہتا تھا۔ بہت دیر ہو گئی' مولوی نہیں آیا۔

ساڑھے گیارہ کا عمل ہوگا' مولوی فضل واپس آیا۔ آہستہ سے کھنکارا۔ "چوہدری! جاگ رہا ہے؟"

"تیرا انتظار کر رہا تھا۔" رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "تجھ سے ملے بنا کیسے جا سکتا تھا۔"

مولوی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے دیر ہو گئی۔ پنڈ کے ایک مزارع کی گھر والی پر آسیب ہے۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر چیختی ہے۔ میں اس کا آسیب اتارنے گیا تھا۔ اسی میں اتنی دیر ہو گئی۔"

رحیم داد نے کپڑوں کی گٹھری سنبھالی' کلیم کے کاغذات کا بستہ بغل میں دبایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "ملاں جی! مجھے اب جانا ہے۔ تیری بہت بہت مہربانی۔"

"نہیں بھئی؟ مہربانی کی کون سی بات ہے۔ میں چاہتا تھا' رات کو یہیں رہتا' سویرے چلا جاتا۔" اس نے رحیم داد کو روکنے کے لیے اصرار کیا۔

"پنڈ کے ساتھ ہی تو سڑک ہے۔ ابھی تو جانے کے لیے لاری بھی مل جائے گی۔" رحیم داد ٹھہرنے پر رضامند نہ ہوا۔ "اس سڑک پر تو آدھی رات کے بعد بھی لاریاں چلتی ہیں۔" وہ زیر لب مسکرایا۔

"زندگی رہی تو فیر ملاپ ہوگا۔"

مولوی فضل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد سے بغل گیر ہوا' اسے چھوڑنے بیرونی دروازے تک گیا۔

☆

ہر طرف رات کا اندھیرا پھیلا تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ گاؤں کے گھروں میں کہیں کہیں روشنی جھلملا رہی تھی۔ رحیم داد' جھاڑیوں اور گڑھوں سے بچتا بچاتا کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والی ایک پگڈنڈی پر پہنچ گیا۔ مگر سڑک کی جانب نہیں گیا۔ چپ چاپ پگڈنڈی پر چلتا رہا۔ کچھ دور آگے جا کر پگڈنڈی کے ساتھ ایک جگہ زمین اس قدر پولی تھی کہ رحیم داد کا ایک پیر تھوڑا سا دھنس گیا۔ آس پاس خود رو پودوں کے جھرمٹ بھی تھے۔

رحیم داد اندھیرے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے چاقو نکالا اور خاصا گہرا گڑھا کھودا' کپڑوں کی گٹھڑی گڑھے میں ڈالی اور زمین ہموار کردی۔

وہ آگے بڑھا اور پگڈنڈی سے گزر کر گاؤں میں داخل ہوگیا۔ گاؤں بالکل سنسان تھا۔ وہ ایک گلی میں داخل ہوا۔ گلی کے نکڑ پر گاؤں کے زمیں دار حاجی حبیب کا دومنزلہ پختہ مکان تھا۔ وہ چوکنّا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا اندھیرے میں آگے بڑھنے لگا۔ زمیں دار کی ماڑی کے قریب سے گزرا۔ آگے کچا راستہ تھا۔ راستے کے ارد گرد کھیت اور جھاڑیاں تھیں۔ چلتے چلتے وہ ٹھٹکا اور متجسّس نظروں سے کھیت اور جھاڑیاں دیکھنے لگا۔

رحیم داد کو نوردین کی تلاش تھی۔ وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے ادھر آیا تھا۔ اس کے ہمراہ نوراں اور بچوں سے ملنے اکال گڑھ جانا چاہتا تھا۔

مگر نوردین کہیں نظر نہیں آیا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ گاؤں کی رڑی سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد کو اپنے ارد گرد خطرہ منڈلاتا محسوس ہوا۔ اس نے رفتار تیز کردی۔

وہ جلد سے جلد گاؤں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ قریب کی جھاڑیوں سے کسی نے ہولے سے سیٹی بجائی۔ رحیم داد نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے اس طرف دیکھا' وہاں کوئی نہیں تھا۔

ذرا دیر بعد جھاڑیوں میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔ ایک سایہ نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھنے لگا۔ رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر جھٹ چاقو نکال لیا۔ اسی وقت مدھم سی آواز آئی۔

"گھبرا نہیں' میں ہوں نوردین۔"

رحیم داد نے چاقو جیب میں ڈالا اور جہاں تھا وہیں رک گیا۔ نوردین نزدیک آگیا۔ رحیم داد نے سرگوشی کی۔ "تو یہاں چھپا تھا' حاجی کی ماڑی تو ادھر ہے۔" اس نے دومنزلہ مکان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"وہاں میں آدھی رات کے بعد جاؤں گا۔ چوہدری! تیں نوں یاد نہیں' پھلّی نے کیا کہا تھا۔"

"آدھی رات ہونے میں اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔"

"اب آہی گیا ہے تو میرے ساتھ چل۔"

"تو اکال گڑھ ہی کے رستے اپنے پنڈ جائے گا نا؟"



"ہاں' اسی رستے جاؤں گا۔ اکال گڑھ ہے تو رستے سے ذرا ہٹ کر پر میں تیرے ساتھ وہاں تک چلوں گا' فکر نہ کر۔" نوردین نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آ میرے ساتھ۔" وہ آگے بڑھا۔ "توں ماڑی سے دور کھڑا رہنا۔"

اس کے لہجے میں جوش و خروش پیدا ہوگیا۔ "تیں نوں پتہ ہے' میرے ڈب میں بھرا ہوا پستول ہے۔ فیر ڈرنا کیوں ہے؟ مرجاؤں گا پر تجھے پھنسنے نہیں دوں گا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔

دونوں دبے دبے قدموں ماڑی کی جانب بڑھے۔ نوردین آگے تھا۔ رحیم داد اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ دونوں اندھیرے میں چلتے ہوئے ماڑی کے بائیں جانب پہنچ گئے۔ قریب ہی شیشم کے درختوں کا جھنڈ تھا۔

پھلّی نے ٹھیک بتایا تھا۔ درختوں کے عین سامنے ماڑی کا چھوٹا دروازہ تھا۔ نوردین نے چاہا کہ رحیم داد دور ہی ٹھہر جائے' مگر وہ اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔

دونوں درختوں کے نیچے اندھیرے میں کھڑے ہوکر دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔ ماڑی پر خاموشی چھائی تھی۔ البتہ بالائی منزل کے کمرے میں روشنی تھی۔ کھڑکی کی شیشوں سے روشنی چھن چھن کر باہر بکھر رہی تھی۔

مویشیوں کا ڈھارا دوسری جانب تھا۔ وہاں کوئی رک رک کر کھانس رہا تھا۔ ہر بار جب کھانسی ابھرتی' دونوں چونک کر اس طرف دیکھتے۔ رحیم داد بہت سہما ہوا تھا۔ نوردین نے پستول نکال لیا تھا اور اسے ہاتھ میں دبائے چوکس کھڑا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی مگر ماڑی کا دروازہ نہیں کھلا۔

رحیم داد نے اکتا کر کہا۔ "مجھے تو راجو آتی معلوم نہیں ہوتی۔"

مگر نوردین مایوس نہیں ہوا۔ "اسے آنا تو چاہیے۔ پھلّی نے پکا وعدہ کیا تھا۔" اسی وقت دروازہ آہستہ سے کھلا۔ نوردین نے مسکرا کر رحیم داد سے کہا۔

"دیکھ' میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔"

دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا' لیکن کوئی باہر نہیں آیا۔ دونوں آنکھیں پھاڑے بے چینی سے ادھر دیکھتے رہے۔ ذرا دیر بعد کوئی باہر آیا۔ کھڑکی کے شیشوں سے پھوٹتی ہوئی دھیمی روشنی میں نوردین نے اسے پہچان لیا' آہستہ سے بولا۔ "راجو ہے' ہاں وہی ہے۔" اس کی آواز میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔

رحیم داد نے راجو کی جانب دیکھا۔ وہ چھریرے بدن کی نوجوان عورت تھی۔ اس کے عقب میں پھلّی بھی تھی۔ دونوں خوف زدہ نظروں سے دائیں بائیں دیکھتی ہوئی آگے بڑھیں اور جھپاک سے درختوں کے نیچے آگئیں۔ نوردین آگے بڑھا' اس نے بے قرار ہو کر راجو کو سینے سے لگا لیا۔ ہیجان انگیز لہجے میں بولا۔

"راجو! میں تیرا نورا ہوں۔"

راجو کچھ نہ بولی۔ اس کے سینے سے لگی کھڑی رہی۔ پھلّی نے قریب آکر مسکراتے ہوئے کہا۔ "دیکھ' میں تیری راجو کو لے آئی۔ تجھ سے جھوٹا وعدہ نہیں کیا تھا۔"

عین اس وقت اوپر کی منزل کے کمرے میں مردانہ کھنکار ابھری۔ نوردین اور رحیم داد نے پریشان ہو کر اوپر دیکھا۔ راجو ہٹ کر نوردین کے پیچھے چلی گئی مگر پھلّی اطمینان سے کھڑی رہی۔ اٹھلا کر بولی۔ "زمیں دار جاگ رہا ہے۔" وہ مسکرانے لگی۔

"پروا نہ کر' وڈی زمین دارنی اس کے پاس ہے۔ وہ اسے باہر نہیں آنے دے گی۔ زمیں دار نے راجو کو بلوایا تھا پر وہ خود پہنچ گئی۔"

رحیم داد نے دھیرے سے پوچھا۔ "اسے پتہ ہے' راجو یہاں ہے؟"

"بالکل پتہ ہے۔ تیرے کہنے پر میں نے ڈرتے ڈرتے چھوٹی زمیں دارنی سے بات کی۔ وہ بھی مجھ سے اپنے من کی ہر بات بتاتی ہے۔ پہلے تو وہ ڈری' میں نے اسے رجھانا شروع کیا۔ منت بھی کی۔ وہ تیار ہو گئی۔ وڈی کے پاس گئی۔ دونوں بند کمرے میں دیر تک مسکوٹ کرتی رہیں۔ فیر چھوٹی نے مجھے کہا۔ نورے اپنی گھر والی کو لے جانا چاہے تو خوشی سے لے جائے۔" پھلّی نے شوخی سے نوردین کو دیکھا۔

"بول کیا کہتا ہے؟"

"تو نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔" نوردین نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ "پھلّی! تو اتنی سوہنی ہے' جی کرتا ہے راجو کے ساتھ تجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤں۔"

"میں کیوں تیرے ساتھ جانے لگی۔" وہ منہ بگاڑ کر تیکھے لہجے میں بولی۔ "میرا گھر والا نہیں ہے؟" اس نے راجو کو مخاطب کیا۔

"سن رہی راجو! ابھی سے یہ بڑھکیں مارنے لگا۔"

راجو خاموش کھڑی رہی۔ وہ بہت سہمی ہوئی نظر آرہی تھی۔ رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے دو نوٹ نکالے اور پھلّی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔ "لے' یہ رکھ لے۔ گھر والے



کو نہ بتانا' ٹیڑی بنوا کر گلے میں پہننا' سوہنی لگے گی۔"

پھلّی نے دونوں نوٹ لے کر اپنے گھگھرے کے نیفے میں اڑس لیے۔ رحیم داد نے نوردین سے کہا۔ "چلنا ہے تو فٹافٹ نکل چل' کب تک یہاں کھڑا رہے گا؟ حاجی جاگ رہا ہے۔ آگیا تو سمجھ لے' سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"نہیں' وہ نہیں آسکتا۔" پھلّی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "وڈی زمیں دارنی اس کے پاس ہے اور چھوٹی دروازے پر کھڑی چوکی داری کر رہی ہے۔ دونوں نے پہلے ہی سے مسکوٹ کر رکھی ہے۔"

"نہیں جی' اب چلنا چاہیے۔ پھلّی! تیری بہت بہت مہربانی۔" نورے نے گردن موڑ کر راجو کو دیکھا۔ "چل راجو!"

تینوں آگے بڑھے۔ نوردین راجو کا ہاتھ تھام کر آگے آگے چل رہا تھا۔ رحیم داد دونوں کے پیچھے تھا۔ پھلّی درختوں کے پیچھے اندھیرے میں چپ چاپ کھڑی انھیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

تینوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دور ہوتے گئے۔ جب وہ ایک موڑ پر پہنچ کر مڑنے لگے تو رحیم داد نے گردن پیچھے کر کے دیکھا' شیشم کے درختوں کے نیچے دھندلی روشنی میں اسے پھلّی نظر نہیں آئی۔ وہ پہلے ہی جا چکی تھی۔ کچھ دور جا کر تینوں کچے راستے پر آگئے۔ راستے کے دونوں جانب تیار فصلیں کھڑی تھیں۔

انھوں نے رفتار تیز کر دی۔ وہ جلد سے جلد گاؤں کی حدود سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ نوردین پستول ہاتھ میں سنبھالے ہوئے تھا اور چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا جا رہا تھا۔

انھوں نے فرلانگ بھر سے زیادہ راستہ طے کیا ہو گا کہ رات کے سناٹے میں ٹاپیں سنائی دیں۔ آواز سامنے ہی سے آرہی تھی۔

تینوں خوف زدہ ہو گئے۔ گھوڑے کے دوڑنے کی آواز کے ساتھ ساتھ ہنہناہٹ بھی اب قریب آتی جا رہی تھی۔ نوردین نے راجو کو ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور قریب کے ایک کھیت میں گھستے ہوئے رحیم داد سے بولا۔

"چوہدری! اتھے آجا۔"

رحیم داد بھی ان کے ساتھ کھیت میں گھس گیا۔ مگر وہ زیادہ اندر نہ جا سکا۔ دیکھتے دیکھتے کوئی گھوڑا دوڑتا ہوا ان کے سامنے سے گزرا اور اپنے پیچھے گرد کے بادل چھوڑ گیا۔ راجو نے اسے پہچان لیا۔ جب وہ آگے نکل گیا تو اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہائے یہ تو کمال تھا۔"

نوردین نے پوچھا۔ "کون کمال؟"

"حاجی کا وڈا پتر۔" راجو نے جواب دیا۔ "چک بیدی سے آرہا ہوگا۔ وہاں جاکر جوا کھیلتا ہے، شراب پیتا ہے۔ روز رات کو دیر سے آتا ہے۔ کبھی کبھی تو سویرا ہو جاتا ہے۔"

"حاجی کچھ نہیں کہتا؟"

"کیوں نہیں کہتا؟ ناراض بھی ہوتا ہے، پر وہ اس کی کب پروا کرتا ہے۔ اب وہ ماڑی میں جائے گا تو جاگ ہوگی۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

رحیم داد پودوں میں پھنسا بیٹھا تھا۔ ایک پودے کا ڈنٹھل ٹوٹ کر اس کی کمر میں اڑا ہوا تھا۔ وہ بے چین ہو کر بولا۔ "اب باہر تو نکل، ساری باتیں یہیں بیٹھ کر کرے گا۔" یہ کہتا ہوا وہ کھیت سے باہر نکلا۔

نوردین اور راجو بھی کھیت سے باہر آگئے۔ تینوں خاموش تھے۔ اب انھوں نے اپنی رفتار بھی تیز کردی تھی۔ راجو بہت ڈری ہوئی تھی۔ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی جاتی۔ مگر عقب سے کوئی آہٹ نہیں ابھری۔

وہ کھیتوں سے نکل کر دور آگئے۔ آگے میدان تھا۔ زمین کھڈّل تھی، جگہ جگہ گڑھے تھے۔ ان میں چوہوں کے بل بھی تھے۔ ایک موٹا چوہا راجو کے پیر کے نیچے آگیا۔ وہ ننگے پیر تھی۔ چوہے سے ڈر کر اس کی چیخ نکلی۔ نوردین نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ڈپٹ کر بولا۔

"چپ کر۔ ایسے ڈرے گی تو کیسے کام چلے گا۔"

اسی وقت رحیم داد کا پیر ایک گڑھے میں پڑا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ بیزار ہو کر بولا۔ "یار، تو نے اندھیارے میں یہ کھڈّل کا رستہ کیوں پکڑا؟"

"چوہدری! یہ چھوٹا رستہ ہے۔ اگے ٹھیک ٹھاک رستہ مل جائے گا۔ اس کے کنارے گھنے پیڑ ہیں۔ ذرا سنبھل کے چل، زیادہ وڈا کھڈّل نہیں ہے۔"

واقعی میدان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ تینوں گڑھوں سے بچتے بچاتے میدان عبور کر کے ایک پہے پر آگئے۔ یہ خاصا کشادہ تھا۔ کچھ ہی دور آگے جاکر آم کے درختوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ رات سنسان تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

تینوں چپ چاپ چلتے رہے۔ انھوں نے دو ڈھائی میل فاصلہ طے کرلیا۔ وہ اب دیدار پور سے بہت دور آگئے تھے۔



رحیم داد نے نوردین سے پوچھا۔ "کیا راجو کو بھی اپنے ساتھ چک ۵۵ لے جائے گا؟"

"کیوں نہیں لے جاؤں گا۔" نوردین نے جھٹ کہا۔ "اسے لایا کس لیے ہوں۔" رحیم داد چپ رہا۔ نوردین نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔

"چوہدری! ایسی بات کیوں کہہ رہا ہے؟"

"میں اس لیے کہہ رہا ہوں، میاں داد فیر راجو کو اٹھوا لے گا اور حاجی کے پاس بھجوا دے گا۔" رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "وہ حاجی کو ناراض نہیں کرسکتا۔ دونوں رسا گیر ہیں اور اس دھندے میں ایک دوسرے کے شریک دار ہیں۔ یہ بات تو بھی جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے حاجی کے مقابلے میں میاں داد کے سامنے تیری کوئی حیثیت نہیں۔ تو اس کا مزارع ہی تو ہے۔"

"یہ بات تو ہے پر اب وہ کیا کرسکتا ہے؟"

"وہ یہ کرسکتا ہے، راجو کو اپنے کرندوں سے اٹھوا کر حاجی حبیب کے پاس دیدار پور پہنچا دے گا۔" رحیم داد نے اس کی سادہ لوحی پر جل کر کہا۔ "تجھے زمین سے بے دخل کر کے بھولا کے کتل یا مویشیوں کی چوری کے الزام میں پکڑوا دے گا۔"

"کہتا تو یہ ٹھیک ہے۔" راجو بیچ میں بول پڑی۔ اس نے رحیم داد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بھی ڈنگر چوری کرتا ہے؟"

"تیرا مگز تو نہیں چل گیا۔" نوردین نے اسے ڈانٹا۔ "چوہدری سے میرا آج ہی میل ملاپ ہوا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو پھّلی یہ کام کبھی نہ کرسکتی۔ چوہدری نے پورے دس روپے اسے دیے تب وہ تیار ہوئی۔ میری تو اس نے بات ہی نہیں مانی تھی۔ یہ نہ ہوتا تو تو مجھے کیسے ملتی۔" اس نے مڑ کر راجو کی جانب دیکھا۔

"۲۰ روپے تو چوہدری نے تیرے سامنے ہی پھّلی کو انعام کے دیے۔"

رحیم داد نے کسر نفسی سے کام لیا۔ "میں نے کیا کیا جی، سب اوپر والے کی مرضی تھی۔" اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔ "نورے! تیری گھر والی تو مل گئی، اب آگے کی سوچ۔"

"سمجھ نہیں آتی۔ بتا، اب کیا کروں؟"

رحیم داد ذرا دیر سر جھکائے سوچتا رہا پھر بولا۔ "میں تو یہ کہتا ہوں، اسے اپنے یا اس کے کسی شریکے کے گھر چھوڑ دے۔ اکیلا اپنے پنڈ چلا جا۔ میاں داد اگر راجو کے بارے میں پوچھے تو صاف انکار کر دینا۔ مگر راجو کے حاجی کی ماڑی سے غائب ہونے کی اطلاع چک ۵۵ پہنچنے سے پہلے پہلے تجھے وہاں پہنچ جانا چاہیے۔ کسی کو شبہ ہی نہ ہوگا۔" وہ لمحے بھر خاموش رہا۔ "ادھر کوئی ایسا پنڈ ہے جہاں

تو راجو کو چھوڑ دے؟"

"آگے تو چک بیدی ہے اور اس سے آگے نظام اولیا۔" راجو نے کہا۔ "وہاں میرا کوئی شریکا یا سگا نہیں، نورے کا بھی نہیں۔" وہ خاموش ہو گئی اور گردن جھکا کر سوچنے لگی۔ نوردین بھی سوچ میں غرق تھا۔ ذرا دیر بعد راجو گردن ہلا کر بولی۔

"ہاں کرتار پور میں میری ایک مسیر ویاہی ہے۔ میری سگی ماسی کی دھی ہے۔ ایک بار میں اس کے پاس گئی بھی تھی۔ اس کا گھر والا منصور بہت نیک بندہ ہے۔" اس نے نوردین کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔

"نورے! وہیں چلا چل۔ منصور کو جانتا ہے۔ فصل کی واڈھی پر کئی بار اس کے پاس جا چکا ہے۔ مجھے بھی اس کے پاس لے کر گیا تھا۔ یاد ہے، کیسے پیار سے دونوں ملے تھے۔"

"تب تو کرتار پور ہی ٹھیک رہے گا۔" رحیم داد گردن اٹھا کر آسمان دیکھنے لگا۔ "اب تو رات تھوڑی رہ گئی ہے۔ تو سویرا ہونے تک چک ۵۵ پہنچ جائے گا؟"

"مشکل ہے۔ دن نکلنے کے بعد ہی پہنچ سکوں گا۔ اب تو دو بج رہا ہوگا۔ یوں سمجھ لے جتنی دور یہاں سے کرتار پور ہے، اس سے کچھ دوری پر میرا پنڈ ہے۔ کرتار پور پہنچتے پہنچتے سویرے کی گیڑ پھیلنے لگے گی۔"

راجو نے کہا۔ "ذرا دم لے کر پنڈ روانہ ہو جانا۔"

رحیم داد نے راجو سے اتفاق نہیں کیا۔ "نہیں، اس کا دن میں جانا ٹھیک نہیں۔ ویسے نوردین تو سوچ لے۔"

"نہیں جی، دن ہی میں چلا جاؤں گا۔ تب تک حاجی بھی میاں داد کو خبر نہیں بھجوا سکے گا۔ حاجی کسی کو بھیجے گا بھی تو وہ شام ہونے سے پہلے نہیں پہنچ سکے گا۔"

"بات تو تیری بھی ٹھیک ہے۔" رحیم داد نے تائید کی۔ "تو فیر یہی پروگرام بنا۔ یہاں سے سیدھے کرتار پور چلتے ہیں۔"

نوردین اور راجو پہلے ہی تیار تھے۔ تینوں آگے بڑھے۔ کچھ ہی دور چلے تھے کہ چک بیدی نظر آیا۔ مکانوں میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ ادھر نہیں گئے اور پگڈنڈیوں اور پہیوں سے گزرتے ہوئے دور ہی سے نکل گئے۔ مویشی چوری کا دھندا کرنے کے باعث نوردین کو اس علاقے کی ہر بستی اور راستے کا بخوبی علم تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں ان راستوں سے بارہا گزرا تھا۔ لہٰذا اسے راستہ تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہ



آئی۔

تینوں نظام اولیاء کی بستی کے قریب پہنچ گئے۔ نظام اولیاء سے نکلتے ہی نہر آ گئی۔ وہ نہر کے کنارے کنارے چلتے رہے۔

رات ڈھل رہی تھی۔ راستے سنسان تھے۔ میل سوا میل راستہ طے کرنے کے بعد ایک پلیا آ گئی۔ تینوں پلیا سے گزر کر نہر کے اس پار چلے گئے۔ مگر نہر کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ چلتے چلتے نوردین نے رحیم داد سے پوچھا۔

"چوہدری! توں کرتا کیا ہے اور رہتا کہاں ہے؟"

"کیا کرے گا جان کر۔" رحیم داد نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "یوں سمجھ لے، نہ اپنا کوئی ٹھکانا ہے، نہ کوئی اپنا ہے۔"

نوردین نے پریشان ہو کر کہا۔ "تیری گل بات سمجھ نہیں آئی۔"

"سمجھ آ بھی نہیں سکتی۔ میں نے تجھے بتایا تھا میں گورداس پور کا مہاجر ہوں۔"

"کیا ہوا تھا تیرے ساتھ؟"

"یہ پوچھ، کیا نہیں ہوا۔" اس نے نوردین کو وہی باتیں بتائیں جو مولوی فضل احمد سے کل صبح بیان کی تھیں اور اس کی ہمدردی حاصل کی تھی۔

نوردین بھی اس کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوا۔ "توں اتنا دکھی ہے یہ میں نوں پتہ نہیں تھا۔ کیا تو اکال گڑھ بھی اپنے بال بچوں کی تلاش میں جا رہا ہے؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے صاف انکار کر دیا۔ "ادھر اپنا ایک پرانا ملنے والا ہے، اس کے پاس جا رہا ہوں۔"

راجو نے کہا۔ "اٹھ برس سے اوپر ہو گئے، توں نے اب تک اپنا گھر بھی نہیں بسایا۔ اس طرح کب تک کام چلے گا؟"

"بس جیسے چل رہا ہے، ایسے ہی چلتا رہے گا۔ میں اپنی گھر والی اور بچوں کو نہیں بھول سکتا۔"

"چوہدری توں ٹھیک کہہ رہا ہے۔" نوردین نے اس کی تائید کی۔ "بچہ تو اپنا کوئی ہے نہیں پر گھر والی کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔" اس نے مسکرا کر راجو کا چہرہ دیکھا۔ "جب تک تو نہیں ملی تھی، میں تیرے لیے پاگل رہتا تھا۔ پر تیں نوں کیہ پتہ؟"

راجو شرما کر خاموش ہو گئی۔ رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "ہاں جی، جس پر بیتتی ہے، وہی جانتا ہے۔ میں کسی کو اپنا دکھ کیسے بتاؤں۔ برسوں ہو گئے اس آگ میں جلتے ہوئے پر اب تک

ٹھنڈی نہیں پڑی۔"

نوردین اور راجو چپ رہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ رحیم داد سے کس طرح اظہار ہمدردی کریں۔ رحیم داد بھی خاموش ہو گیا۔



## 15

کرتار پور بڑا موضع تھا۔ اس میں کئی پختہ مکانات تھے اور دو منزلہ بھی تھے۔ چھوٹا سا بازار بھی تھا مگر رات کے پچھلے پہر ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ تینوں سنسان گلیوں اور راستوں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھے۔ کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ قریب کی گلی سے ایک شخص نکلا اور بالکل ان کے سامنے آگیا۔ اس نے راجو کو ایسی نظروں سے گھورا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

راجو کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا' گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "نورے! یہ زمین دار کا کرندہ فیدو لگتا ہے۔ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ ابھی جا کر حاجی سے مخبری کرے گا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

نوردین نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو اندھیرا ہے۔ اس نے تجھے کیسے پہچان لیا۔ اگر پہچان بھی لیا ہے تو پروا نہ کر' منصور کے گھر سے وہ تجھے نہیں اٹھوا سکتا۔"

تینوں آگے بڑھے۔ منصور کے مکان کے سامنے پہنچے۔ منصور کا مکان تھا تو کچا مگر کشادہ اور بڑا تھا۔ نوردین نے ہانک لگائی۔

منصور جھٹ دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ آتے ہی نوردین سے گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہوا اور جیسے ہی راجو پر نظر پڑی' خوشی سے چیخ پڑا۔ "ارے! تو اسے لے آیا۔" اس نے دروازے کے اندر جھانک کر بیوی کو آواز دی۔ "ساجاں! دیکھ تو کون آیا ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"سب باہر کیوں کھڑے ہو، اندر آجاؤ۔"

تینوں گھر میں داخل ہوئے۔ راجو کی خالہ زاد بہن ساجاں بھاگتی ہوئی آئی اور راجو سے چمٹ گئی۔ "ہائے، تو آگئی۔"

راجو، ساجاں کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ ساجاں اس کا بدن ٹٹولتے ہوئے بولی۔ "کتنی دبلی ہوگئی۔" وہ خود دوہرے بدن کی نوجوان عورت تھی۔ عمر میں راجو سے بڑی، رنگ کھلتا ہوا مگر ناک نقشہ کسی قدر بھدّا۔

سب آنگن میں پڑی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ منصور کے دونوں بچے بھی بیدار ہوگئے تھے اور قریب آکر حیرت سے راجو کو دیکھ رہے تھے۔ راجو بار بار دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اب اجالا خوب پھیل گیا تھا۔

رحیم داد نے اجالے میں راجو کو غور سے دیکھا۔ اس کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ چمپئی رنگت تھی، ناک سبک تھی، آنکھیں غزالی تھیں۔ وہ خوش شکل عورت تھی۔ ساجاں کے پہلو میں بیٹھی ہوئی وہ اور زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد منصور اٹھا۔ رحیم داد اور نوردین کو ڈیرے میں لے گیا۔ ڈیرا گھر کے برابر ہی تھا، اس میں کھلا صحن تھا۔ صحن کے دو طرف چھپر کی خمیدہ چھت کا برآمدہ تھا۔ اس کے پیچھے تین کمرے اور دو کوٹھریاں تھیں۔

تینوں ایک کمرے میں چلے گئے۔ کمرے میں کھڑکی تھی اور ایک دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا۔ کمرے میں چارپائی بچھی تھی۔ اس پر صاف ستھرا بستر لگا تھا۔ منصور صحن میں گیا اور ایک چارپائی اور اٹھا کر کمرے میں لے آیا۔ ایک چارپائی پر رحیم داد اور نوردین بیٹھ گئے۔ دوسری پر منصور بیٹھ گیا۔

منصور نے رحیم داد کے بارے میں پوچھا۔ نوردین کی زبانی جب یہ معلوم ہوا کہ راجو کو حاجی کی قید سے رہائی دلانے میں رحیم داد نے بڑی مدد کی ہے تو منصور بہت خوش ہوا۔ نوردین اسے ایک ایک بات تفصیل سے بتاتا رہا۔

منصور دلچسپی اور انہماک سے سنتا رہا۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اب ہلکی ہلکی دھوپ دیواروں کی بلندی پر جھلکنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر میں ساجاں پیتل کے تھال میں پراٹھے لے کر آئی۔ اس کے ساتھ کانسی کے گلاسوں میں لبالب بھری ہوئی لسی تھی۔ پراٹھوں پر مکھن کا مٹھرو تھا، تلے ہوئے انڈے اور اچار تھا۔



ساجاں نے تھال نوردین اور رحیم داد کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں ناشتا کرلو۔ رات بھر کے بھوکے اور تھکے ہوئے ہو۔" وہ منصور سے مخاطب ہوئی۔ "راجو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ انھیں کھانے دے، اتھے راجو کے پاس آجا۔ تیری تو اس سے کوئی گل بات ہی نہیں ہوئی۔ دیکھ تو اس کا کیا حال ہوگیا ہے۔"

منصور چپ چاپ بیوی کے ساتھ چلا گیا۔ نوردین اور رحیم داد ناشتا کرنے لگے۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی نوردین چلنے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ اس وقت تک منصور واپس آگیا تھا۔ اس نے نوردین کو روکنا چاہا۔ "نورے! تو رات بھر کا جاگا ہوا ہے، لمبا سفر بھی کیا ہے، ذرا آرام کرلے۔ دوپہر کو روٹی ٹکر کھا کر چلا جانا۔ ایسی چھیتی کیہہ ہے؟ میری سیکل لے جا۔" مگر نوردین راضی نہیں ہوا۔

"مجھے اب جانے دے۔ سیکل دے دے تو فٹافٹ پنڈ پہنچ جاؤں گا۔"

رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ "منصور کی سیکل لے کر نہ جا۔ میاں داد کو شبہ ہوگا، تو پیدل ہی جا۔"

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔" نوردین نے اتفاق کیا۔ "آگے تانگا بھی مل جائے گا۔ ویسے میں پیدل بھی جا سکتا ہوں۔ شام تک واپس آجاؤں گا۔"

"شام کو واپس نہ آنا۔" رحیم داد نے منع کیا۔ "کیوں خاماخا شبہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تین چار روز بعد آنا جب معاملہ ذرا دب جائے۔ ابھی تو میاں داد اور حاجی، دونوں تجھ پر شبہ کریں گے۔ تیری نگرانی بھی کریں گے۔ تو دیدار پور حاجی کے پنڈ جا چکا ہے۔ رستے میں حاجی کا کرندہ فیدو ملا تھا، تجھ پر انھیں شبہ ہونا بھی چاہیے۔ راجو یہاں ہر طرح ٹھیک ہے، آرام سے بھی رہے گی۔"

"بالکل آرام سے رہے گی۔" منصور نے رحیم داد کی تائید کی۔ "چوہدری ٹھیک کہہ رہا ہے۔ جیسا کہتا ہے، ویسا ہی کر۔ فکر نہ کر، راجو یہاں ہر طرح ٹھیک ٹھاک رہے گی۔"

نوردین نے کچھ نہیں کہا۔ ڈیرے سے نکل کر اپنے گاؤں، چک ۵۵ کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی منصور بیٹھا رہا۔ مگر جلد ہی کھڑا ہوگیا۔

"چوہدری! تو ساری رات کا جاگا ہوا ہے۔ تھکا ہوا بھی بہت ہے، اب سو جا۔ تجھ سے بعد میں گپ شپ رہے گی۔ میری فصلوں کی واڈھی ہونے والی ہے۔ لاوے آئے ہوئے ہیں، ان سے واڈھی کے بارے میں بات چیت کرنی ہے۔"

رحیم داد بھی یہی چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی، تھکن سے جسم میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ منصور کی باتیں سن کر وہ خاموش رہا۔ منصور باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے آنکھوں سے

عینک اتاری۔ عینک سے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ سر میں ہلکا ہلکا درد بھی تھا۔ وہ خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔

دوپہر کو منصور نے اسے بیدار کیا اور کھانا کھانے کے لیے کہا۔ مگر رحیم داد کو مطلق بھوک نہیں تھی۔ منصور نے اصرار بھی کیا' وہ کھانا کھانے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ بیدار ہونے کے بعد وہ سویا بھی نہیں۔ باتیں کرنے لگا۔

منصور کی باتوں سے جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ موروثی مزارع ہے۔ اس کے پاس تیس ایکڑ سے اوپر مزروعہ نہری زمین ہے۔ منصور کے ساتھ اس کا منجھلا بھائی خالد بھی رہتا تھا۔ دونوں مل جل کر کھیتی باڑی کرتے تھے۔

مزارع ہونے کے باوجود منصور کھاتا پیتا کسان تھا۔ اس کا ڈھارا بھی بڑا تھا۔ اس میں بیلوں کی دو جوڑیوں کے علاوہ دو بھینسیں اور ایک گائے بھی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی شاکر' کرتارپور ہی میں تھا مگر علیحدہ رہتا تھا۔ ماں زندہ تھی۔ کبھی بڑے کے پاس رہتی' کبھی چھوٹے کے پاس۔ مگر زیادہ وقت شاکر کے پاس گزرتا تھا۔

☆

رحیم داد نے باہر نکل کر گاؤں کا چکر لگایا اور ٹہلتا ہوا کرتارپور کے بازار میں چلا گیا۔ بازار سے اس نے ایک چادر' صابن اور کنگھی خریدی۔ بازار ہی میں پیپل کے ایک درخت کے نیچے موچی بیٹھا تھا۔ اس کے پاس جوتے کا ایک جوڑا تیار رکھا تھا۔ رحیم داد نے پہن کر دیکھا۔ اس کے پیروں میں بالکل فٹ تھا۔

وہ ابھی تک مقتول حکیم چشتی کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ جوتے تنگ تھے اور پرانے ہو کر جگہ جگہ سے پھٹنے لگے تھے۔ ویسے بھی وہ حکیم کی کوئی نشانی اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں سراسر خطرہ تھا۔ اس نے جوتا خرید لیا۔

خریدی ہوئی ساری اشیاء اس نے چادر میں لپیٹ لیں مگر منصور کے گھر نہیں گیا۔ نہر کی طرف چلا گیا۔ نہر گاؤں سے نصف میل کے فاصلے پر تھی۔ نہر کی جانب جاتے ہوئے اس نے پرانے جوتے گندے پانی کے ایک گڑھے میں ڈال کے نئے جوتے پہن لیے۔ اب اس کے جسم پر حکیم چشتی اور نورالٰہی کی کوئی نشانی باقی نہیں تھی۔

نہر پر پہنچ کر رحیم داد نے کپڑے اتارے اور صابن سے جسم رگڑ رگڑ کر نہانے لگا۔ گرمی اس روز کچھ بڑھ گئی تھی۔ وہ دیر تک نہر میں نہاتا رہا۔ نہا دھو کر اس نے چادر سے جسم خشک کیا۔ کپڑے



پہنے اور گیلی چادر نہر کے کنارے ایک جھاڑی پر سوکھنے کے لیے پھیلا دی۔ کنگھی سے سر کے بال جمائے' ڈاڑھی اور مونچھیں سنواریں اور اس وقت تک نہر کے کنارے بیٹھا رہا جب تک گیلی چادر دھوپ میں سوکھ نہ گئی۔

وہ واپس ڈیرے میں آیا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ منصور کھیتوں پر تھا۔ راجو نے رحیم داد کو گلاس میں لسی لا کر دی۔ وہ بھی نہا دھو کر' اجلے کپڑے پہن کر آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ بالوں میں تیل چمک رہا تھا۔ اجلے لباس اور ہلکے سنگھار میں وہ خاصی نکھر گئی تھی' زیادہ شگفتہ اور دلربا نظر آ رہی تھی۔ وہ بھرپور جوان اور دل کش عورت تھی۔

راجو کے جانے کے بعد رحیم داد کو اپنی بیوی نوراں یاد آ گئی۔ بچے بھی یاد آئے۔ وہ بستر پر لیٹ گیا مگر نیند نہیں آئی۔ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اس نے سوچا' نوراں کو اپنے بارے میں ہر بات صاف صاف بتا دے گا۔ وہ اس پر پورا اعتماد کر سکتا تھا۔ وہ اس کی شریک حیات تھی' اس کے بچوں کی ماں تھی' ہمدرد اور غم گسار تھی۔ اس سے ٹوٹ کر محبت بھی کرتی تھی۔ رحیم داد کو کبھی بخار ہو جاتا تو وہ ساری رات اس کے سرہانے بیٹھی رہتی۔ بار بار کہنے پر بھی نہ سوتی۔ اس کا سر' کمر اور پیر دباتی' پیشانی ہولے ہولے سہلاتی' دوا پلاتی' طبیعت کا حال پوچھتی۔ اس کی محبت اور شیفتگی ایک ایک انداز اور ہر رویے سے صاف جھلکتی تھی۔

رحیم داد نے بستر پر لیٹے لیٹے طے کیا کہ نوراں اور بچوں کو لے کر سندھ چلا جائے گا۔ لالی کی دی ہوئی تین ہزار سے زیادہ رقم اس کے پاس تھی۔ اس رقم سے وہ رشوت دے کر مرحوم چوہدری نورالٰہی کے کلیم کی بنیاد پر خاصی بڑی اور عمدہ زمین الاٹ کرا سکتا تھا۔ گورداس پور کا مہاجر چوہدری نورالٰہی بن کر خوشحال زندگی بسر کر سکتا تھا۔ نوراں سخت محنتی اور سلیقہ مند تھی۔ دونوں مل کر زندگی کا نیا سفر شروع کر سکتے تھے۔ اپنا اجڑا ہوا گھر ایک بار پھر آباد کر سکتے تھے۔

رحیم داد سوچتے سوچتے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سر پر پگڑی باندھی' عینک لگائی' جوتے پہنے' کلیم کے کاغذات کا بستہ حفاظت سے تکیے کے نیچے رکھا۔ کمرے سے باہر آیا اور دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔

وہ ڈیرے سے ایک بار پھر باہر نکلا اور کرتارپور کے بازار پہنچ گیا۔ اس نے سنار سے نوراں کے لیے جھمکے اور اپنی لاڈلی بیٹی زینو کے لیے چاندی کی بگتیاں خریدیں۔ کریما کے لیے بازار میں کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ چھوٹا سا قصباتی بازار تھا' چند دکانیں تھیں۔ اس نے بازار کے کئی چکر لگائے۔ حلوائی سے آدھ سیر مٹھائی خرید کر کندھے پر پڑے ہوئے پرنے کے ایک پلو میں باندھی اور واپس

آ گیا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ شام کے سائے گاؤں کے درو دیوار پر پھیلتے جا رہے تھے۔ کمرے کے اندر بھی اندھیرا ہو گیا۔ رحیم داد بستر پر لیٹا تھا۔ منصور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ البتہ راجو کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اس نے لالٹین طاق میں رکھی اور ماچس جلا کر اسے روشن کرنے لگی۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ راجو نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

"چوہدری! یہاں گرمی میں کیوں لیٹا ہے۔ باہر وہڑے میں منجی پر جا کر بیٹھ جا۔ میں تیرے لیے روٹی لے کر آتی ہوں۔"

راجو چلی گئی۔ رحیم داد کمرے سے نکل کر صحن میں گیا۔ منہ دھویا اور برآمدے کے سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا' رات کا پہلا پہر تھا۔ راجو کھانا لے آئی اور رحیم داد کے سامنے چارپائی پر رکھ دیا۔ وہ کمرے کے اندر گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں لالٹین لٹک رہی تھی۔

اس نے لالٹین برآمدے کے ایک کھمبے پر لگی ہوئی کیل سے لٹکا دی۔ رحیم داد لالٹین کی روشنی میں کھانا کھانے لگا۔ بھوکا بھی تھا' اس نے رغبت سے کھانا کھایا۔ راجو کچھ دیر ٹھہر کر گھر کے اندر چلی گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر رحیم داد کمرے میں گیا۔ اس نے کنگھی سے سر کے بال جمائے' ڈاڑھی سنواری' جھمکے اور بگتیاں کاغذ کے ٹکڑے میں لپیٹ کر احتیاط سے قمیص کی اندرونی جیب میں رکھیں۔ مٹھائی پرنے سے نکال کر رومال میں باندھی۔ بغل میں کلیم کے کاغذات کا بستہ دبایا' کمرے سے نکل کر باہر سے دروازے کی کنڈی لگائی اور آہستہ آہستہ ڈیرے سے باہر جانے لگا۔

آنگن میں راجو مل گئی' اس نے پوچھا۔ "چوہدری! اکال گڑھ تو نہیں جا رہا؟"

رحیم داد نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہاں' میں اکال گڑھ ہی جا رہا ہوں۔"

"کب تک لوٹے گا؟"

"کچھ پتہ نہیں۔ جس سے ملنے جا رہا ہوں' مل گیا تو دیر سے واپسی ہو گی۔ تو منصور کو بتا دینا۔"

راجو خاموش رہی۔ رحیم داد ڈیرے سے باہر چلا گیا۔ گاؤں کی گلیوں سے نکل کر کھیتوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نہر کی جانب چل دیا۔

اندھیرا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ نہر پر پہنچا تو ہر طرف سناٹا پھیل چکا تھا۔ اس نے پلیا عبور کی اور نہر کے اس پار پہنچ گیا۔ کچھ دور تک نہر کے کنارے کنارے چلتا رہا پھر کچا را-



خاصا کشادہ تھا۔ بیل گاڑیوں اور ریڑھوں کے پہیوں نے راستے میں جگہ جگہ گڑھے ڈال دیے تھے۔

وہ چپ چاپ کچے راستے پر چلنے لگا۔ آگے بڑھا تو سامنے سے ایک سائیکل سوار آتا نظر آیا۔ رحیم داد نے اسے روک کر اکال گڑھ کا راستہ پوچھا۔ وہ وہیں سے آ رہا تھا' کہنے لگا۔ "یہ سدھا رستہ اکال گڑھ ہی جاتا ہے۔"

رحیم داد نے اکال گڑھ کے پرائمری اسکول کا پتہ دریافت کیا۔ اس نے وہ بھی بتا دیا۔ دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ سائیکل سوار نے پیڈل پر پیر مارا اور آگے بڑھ گیا۔ دیکھتے دیکھتے دور نکل گیا۔

☆

راستہ سنسان تھا۔ دونوں طرف کھیت تھے۔ کہیں فصلیں تیار کھڑی تھیں' کہیں کٹ چکی تھیں۔ جگہ جگہ درختوں کے جھنڈ تھے۔ رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ نوراں اور بچوں کے بارے میں سوچتا رہا اور یادوں کی دھندلی پگڈنڈیوں پر بھٹکتا رہا۔ بیتے دنوں کے خوشگوار لمحات' جو اس نے نوراں اور بچوں کے ساتھ گزارے تھے' روشن چراغوں کی طرح نظروں میں جھلملاتے رہے۔ وہ جتنا آگے بڑھتا گیا بیوی بچوں سے ملنے کا شوق ہیجان انگیز ہوتا گیا۔

رحیم داد اکال گڑھ میں داخل ہوا۔ بستی کی رونق اجڑ چکی تھی۔ گلی کوچے سنسان تھے۔ کہیں کہیں گھروں سے باتیں کرنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ایک گلی سے نکل کر وہ کھلی جگہ پہنچا تو دھندلی روشنی میں کچھ فاصلے پر اسے ایک راہ گیر نظر آیا۔

رحیم داد ٹھٹکا۔ اسے شبہ ہوا کہ وہ اس کا پرانا یار جمال دین ہے۔ رحیم داد نہ تو اس سے ملنا چاہتا تھا' نہ قطعی طور پر فیصلہ کر سکا کہ وہ کون ہے؟ ویسے جمال دین کے وہاں ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اسے تو احمد کوٹ میں ہونا چاہئے تھا۔

راہ گیر اندھیرے میں اوجھل ہو گیا۔ رحیم داد چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا اسکول کی جانب بڑھا۔ اکال گڑھ بھی بڑا موضع تھا۔ اس میں کئی گاؤں شامل تھے۔ کرتار پور سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ آبادی بھی زیادہ تھی۔ پختہ مکانات بھی تعداد میں زیادہ تھے۔ رحیم داد گلی کوچوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ وہ اسکول کی عمارت کے قریب پہنچ گیا۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ مگر اسکول کا چوکیدار جاگ رہا تھا۔ سامنے کھلا میدان تھا۔ چوکیدار اسکول کی عمارت کے باہر چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ وہ ادھیڑ اور دبلا پتلا تھا۔ بار

بار کھانستا اور کھنکار کر اونچی آواز سے بلغم تھوکتا۔

رحیم داد اس کے قریب پہنچا۔ اس نے چونک کر پوچھا۔ "کون ہے؟" وہ نظریں اٹھا کر رحیم داد کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

رحیم داد نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "میرا نام چوہدری نوراللہ ہے۔"

"اتنی رات گئے ادھر کیسے آنا ہوا؟"

رحیم داد ایسے سوالوں کے جواب کے لیے خود کو پہلے ہی سے تیار کر چکا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "چاچا! تجھ سے یہ پوچھنا تھا' تیرے سکول میں چن واٹ کے سکول ماسٹر عبدالشکور کا تبادلہ ہونے والا تھا' وہ آگیا کہ نہیں؟ اگر آگیا تو اس کا مکان کون سا ہے؟"

رحیم داد کی بات سن کر چوکیدار سوچ میں پڑ گیا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ "نہیں جی' اس نام کا اپنے سکول میں کوئی ماسٹر نہیں اور نہ ادھر کوئی نیا ماسٹر تبدیل ہو کر آیا ہے۔ تبدیلی کا اگر حکم جاری ہو چکا ہے تو اس کا اپنے کو پتہ نہیں۔" وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ ذرا قرار آیا تو اس نے بتایا۔ "اس بات کا پتہ تو ہیڈ ماسٹر ہی سے چلے گا اور وہ یہاں ہے نہیں۔ پاک پتن گیا ہے۔ دو تین روز میں واپسی ہوگی۔ ادھر اس کے کسی شریکے کے گھر میں موت ہو گئی ہے۔" وہ آہستہ آہستہ حقے کے کش لگانے لگا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا تیں نوں عبدالشکور کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔"

"ہاں جی' میں نوں کچھ پتہ نہیں۔" چوکیدار نے نرمی سے کہا۔ "کھڑا کیوں ہے' بیٹھ جا۔ لگتا ہے' دور سے چل کر آیا ہے۔"

رحیم داد اس کے برابر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چوکیدار نے حقہ رحیم داد کی جانب بڑھا دیا۔ حقہ لے کر رحیم داد کش لگانے لگا۔ مگر اسے حقے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے چند کش لگانے کے بعد حقہ چوکیدار کو واپس دے دیا۔

رحیم داد نے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ چوکیدار باتوں میں لگ گیا۔ وہ حقہ گڑگڑاتا رہا اور رک رک کر بولتا رہا۔

رحیم داد اپنے بڑے بیٹے کریما کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا تاکہ اس مکان کا سراغ مل جائے جس میں نوراں بچوں کے ساتھ مقیم تھی۔ مگر یہ پوچھتے ہوئے وہ جھجک رہا تھا۔ اسی اثنا میں ایک عورت' باہر آئی' چوکیدار نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"جیراں! تو ابھی تک جاگ رہی ہے؟"



"تیں نوں تو کچھ پتہ نہیں۔ بیٹھا حقہ پیتا رہتا ہے یا کھانستا رہتا ہے۔" وہ کڑوے لہجے میں بولی۔ "میں ابھی کیسے سو سکتی ہوں۔ حیدر کے ہاتھ میں درد ہے۔ ہائے ہائے کر رہا ہے۔ اس پر تیل مل رہی تھی۔"

چوکیدار نے بیوی سے پوچھا۔ "کیا ہوا حیدر کو؟ اس کے ہاتھ میں درد کیوں ہے؟"

"کریمے نے آج فیر اسے مارا ہے۔ ایسا ہاتھ مروڑا اب تک درد کر رہا ہے۔" اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ چھا گئی۔ غصے سے بولی۔ "میں نے کریمے کی ماں سے آج صاف صاف کہہ دیا' سنبھال کر رکھ اسے۔ اب جو اس نے میرے پت کو مارا تو اس کا ہاتھ پتھر پر رکھ کر توڑ دوں گی۔"

کریمے کا نام سن کر رحیم داد چونکا۔ اسے یقین ہو گیا کہ رجب نائی نے غلط اطلاع نہیں دی۔ مگر وہ بالکل خاموش رہا۔

چوکیدار نے بیوی کو نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ "جیراں! تیں نوں ایسی گل نہیں نکالنی چاہئے۔ یہ چھوہرے تو لڑتے جھگڑتے ہی رہتے ہیں۔ ساتھ کھیلیں گے تو آپس میں لڑائی جھگڑا بھی کریں گے۔"

جیراں بگڑ کر بولی۔ "تو کچھ ہی کہہ' میں اب نہیں ماننے کی۔ دیکھ لینا' اس کا ہاتھ نہ توڑ دیا تو میرا ناں جیراں نہیں۔"

چوکیدار نے ایک بار پھر نرمی سے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "اللہ سے ڈر جیراں! یہ تو سوچ کریما بن پیو کا بچہ ہے۔ یتیم مسکین ہے۔"

رحیم داد تڑپ کر بیچ میں بول پڑا۔ "کہاں رہتا ہے کریما؟"

"سکول کے برابر والی گلی میں جاؤ تو پچھواڑے سجے ہتھ کو تیسرا مکان ہے۔" چوکیدار نے بتایا۔

"پر اس کا پتہ کیوں پوچھ رہا ہے۔ اسے جانتا ہے؟"

"نہیں جی! میں اسے نہیں جانتا۔" رحیم داد صاف مکر گیا۔ "میں نے تو یوں ہی پوچھ لیا۔ تیرے تو پڑوس کا چھوہرا ہے۔ پڑھتا بھی تیرے سکول ہی میں ہوگا؟"

"نا جی نا' وہ سکول شکول میں نہیں پڑھتا۔" جیراں نے منہ بگاڑ کر حقارت سے کہا۔ "وہ تو دن بھر شور شرابا کرتا ہے۔ لڑائی جھگڑے کرتا ہے۔ اسے اور کام ہی کیا ہے۔"

چوکیدار نے مسکرا کر کہا۔ "اب تو جا کر سو' رات بہت ہو گئی۔ تیں نوں سویرے پوہ پھٹالے اٹھنا ہوتا ہے۔"

جیراں نے ایک بار پھر منہ بگاڑا۔ شوہر کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور بڑبڑاتی ہوئی گھر کے اندر

چلی گئی۔

رحیم داد نے کریما کے بارے میں مزید کچھ نہیں پوچھا اور نہ چوکیدار نے اس کا ذکر چھیڑا۔ رحیم داد نے ہیڈ ماسٹر اور اسکول کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ چوکیدار بہت باتونی تھا اور اسے نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ وہ اطمینان سے باتیں کرتا رہا اور حقہ گڑگڑاتا رہا۔ رحیم داد مزید رات گزر جانے کا انتظار کرتا رہا۔

رات اور کالی ہو گئی۔ گاؤں کا سناٹا زیادہ گہرا ہو گیا۔ چوکیدار جماہیاں لینے لگا۔ اسے اب نیند آرہی تھی۔ رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ بوڑھے سے رخصت ہوا اور اندھیرے میں ایک طرف چل دیا۔

میدان سے گزر کر وہ اس گلی میں چلا گیا جو اسکول کے پچھواڑے تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا عین اس جگہ پہنچ گیا جہاں اسکول کے برابر سے گزرنے والی گلی ملتی تھی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا' پھر آہستہ آہستہ تیسرے مکان پر پہنچا۔ خاصی ویران جگہ تھی۔ مکان بھی کم تھے' کچے اور چھوٹے تھے۔

☆

رحیم داد دروازے کے عین سامنے کھڑا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل سے دروازے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ چند لمحے گم صم کھڑا رہا۔ اس نے دروازہ آہستہ آہستہ کھٹکھٹایا اور بے قراری سے کنڈی کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

اس نے سوچا کہ دروازے کا ایک پٹ دھیرے سے چرچراتا ہوا کھلے گا۔ اس کی آڑ سے نوراں کا خوبصورت چہرہ نمودار ہوگا۔ وہ نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھے گی۔ "کون ہے؟" وہ جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دے گا۔ اسے چمٹا کر ہولے سے پیار کرے گا۔ اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر سرگوشی کرے گا۔ نوراں! میں ہوں تیرا رحیمے۔ اور جھپاک سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر گھر کے اندر چلا جائے گا۔

مگر اندر سے نہ کوئی آواز ابھری' نہ دروازہ کھلا۔

رحیم داد بے چینی کے عالم میں کھڑا رہا۔ وہ اس ڈر سے دروازہ زور زور سے کھٹکھٹانا نہیں چاہتا تھا مبادا پڑوسیوں کی آنکھ کھل جائے۔ وہ خاموشی سے گھر میں داخل ہونا چاہتا تھا تاکہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو' وہ نوراں سے تنہائی میں ملے اور اسے اپنے بارے میں ساری باتیں بتا دے۔ پھر دونوں سر جوڑ کر بیٹھتے اور آئندہ کا منصوبہ بناتے۔



اس نے دروازے پر مزید دستک دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ گھر کے برابر گلی تھی وہ گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی تنگ تھی' اندھیرا بھی زیادہ تھا۔ اس طرف گھر کا آنگن تھا۔ دیواریں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔

رحیم داد کو جیل میں لالی دیوار پھاندنے اور دیوار پر چڑھنے کے گر بتا چکا تھا۔ جیل سے فرار ہونے سے پہلے تو وہ ہر روز ایسے ہی ہتھکنڈے اور گر بتاتا تھا۔ اس نے لالی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اچھل کر دیوار کا بالائی حصہ پکڑنے اور اسے پکڑ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

اس کی دونوں ہتھیلیاں دیوار کی رگڑ سے چھل گئیں۔ وہ گھپ اندھیرے میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر آگے بڑھا۔

گھر کے آنگن میں شیشم کا درخت تھا۔ درخت کی ایک ڈال دیوار چھوتی ہوئی گلی میں نکل آئی تھی۔ ڈال مضبوط اور خاصی نیچی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گلی کے بچوں نے لٹک لٹک کر اسے نیچے جھکا دیا ہے۔

رحیم داد نے درخت کی جھکی ہوئی شاخ دیکھی اور اس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اس نے پیروں سے جوتے اتارے اور دیوار کے ساتھ اندھیرے میں اس طرح رکھ دیے کہ صاف نظر نہ آئیں۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ بھی وہیں رکھ دیا۔ مٹھائی کی پوٹلی دانتوں میں دبائی۔ گردن اٹھا کر ڈال دیکھی۔ اچھلا اور دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لیا۔ اس نے اپنے پیر دیوار سے ٹکائے اور ڈال کے سہارے کھسکتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ڈال اس کے بوجھ سے آہستہ آہستہ ہلنے لگی۔ مگر رحیم داد دیوار پر چڑھ گیا۔ اس نے آنگن میں نظر ڈالی۔ وہاں سناٹا تھا۔

وہ کچھ دیر دیوار پر بیٹھا درخت کی آڑ سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ وہ دیوار سے لٹک کر دھیرے سے آنگن میں اتر گیا۔

اس نے اندر جا کر دیکھا۔ آنگن خاصا مختصر تھا۔ اس کے ایک طرف دیوار پر چھپر پڑا تھا۔ چھپر کے ساتھ ہی کوٹھری جیسا چھوٹا کمرہ تھا۔ رحیم داد دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ آنگن میں صرف ایک چارپائی تھی۔ اس پر چادر اوڑھے کوئی سو رہا تھا۔ وہ چارپائی کے قریب پہنچا۔ اس کا بیٹا کریما لیٹا تھا۔ ساتھ ہی اس کی بیٹی زینو سکڑی سکڑائی پڑی تھی۔ رحیم داد نے پہلی ہی نظر میں دونوں کو پہچان لیا۔

دونوں گہری نیند سو رہے تھے۔ مگر نوراں وہاں نہیں تھی۔ اس نے گردن موڑ کر چھپر کے نیچے

دیکھا' وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اس کی ایک جھری سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔

رحیم داد نے سوچا' نوراں کمرے میں ہوگی۔ وہ بچوں کے سرہانے اندھیرے میں بت بنا کھڑا تھا۔ دونوں بچے ستاروں کی روشنی میں آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔ رحیم داد نے غور کیا' کریمے کا قد کچھ لمبا ہوگیا ہے۔ زینو کے چہرے پر وہی پہلی سی معصومیت ہے' وہی بھولپن۔ اس نے دھیرے سے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا۔ زینو کے بال چھوئے۔ اس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ زینو کے بال خاک اور میل سے چیکٹ ہو رہے تھے۔

اسے دکھ ہوا کہ نوراں نے بچوں پر توجہ دینا چھوڑ دی ہے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری' جھکا اور زینو کے ایک رخسار پر اپنے لرزتے ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ بے خبر سوتی رہی۔ اس نے آہستہ سے کریمے کی پیشانی چومی۔ وہ بے چین ہو کر کلبلایا۔ رحیم داد جھٹ چارپائی کے سرہانے دبک کر بیٹھ گیا۔ کریمے نے کروٹ بدلی اور پھر گہری نیند سو گیا۔

رحیم داد چارپائی کی آڑ میں بیٹھا رہا اور گردن اٹھائے حسرت بھری نظروں سے بچوں کو تکتا رہا۔ اسے بے اختیار اپنا چھوٹا بیٹا یاد آگیا۔ وہ بھی دونوں بچوں کے ساتھ چارپائی پر لیٹا ہوتا۔ مگر اسے تو سیف اللہ کے بھائیوں نے جلا کر ختم کردیا تھا۔ اس کی یاد کے ساتھ ہی رحیم داد کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا روتا رہا اور گھر کی بے سروسامانی دیکھ کر اپنی مجبوری اور بے بسی پر کڑھتا رہا۔

رحیم داد نے آنسو پونچھے۔ اٹھا اور دبے دبے قدموں چلتا ہوا چھپر کے نیچے پہنچ گیا۔ وہ چپ چاپ کھڑا کمرے کا بند دروازہ تکتا رہا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ اس نے قمیص کی اندرونی جیب کے اندر ہاتھ ڈال کر کاغذ میں لپٹے ہوئے جھمکے انگلیوں سے ٹٹولے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ نوراں کو جھمکے بہت پسند ہیں۔ اس کے پاس کانوں میں پہننے کے لیے مندرے تھے۔ مگر وہ ہر فصل کی کٹائی کے بعد رحیم داد سے جھمکوں کی فرمائش کرتی۔ وہ اس کے لیے جھمکے نہیں بنوا سکا تھا۔ اس نے سوچا' جھمکے دیکھ کر نوراں کا چہرہ پھول کی طرح کھل جائے گا۔ وہ اپنے ہاتھ سے اس کے کانوں میں جھمکے پہنائے گا۔ اس کا دل کش چہرہ نظر بھر کر دیکھے گا اور بے اختیار اسے گلے لگا لے گا۔ وہ ہانپنے کے سے انداز میں رک رک کر گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

وہ آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا۔ دروازے میں خاصی چوڑی جھری تھی۔ اس نے جھری سے ایک آنکھ لگا کر اندر نظر دوڑائی۔ مگر اندر جھانکتے ہی اس کے [illegible] کا جھٹکا



لگا۔ وہ لرز کر رہ گیا۔

اس نے دیکھا' کمرے کے اندر چارپائی پر نوراں لیٹی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی مرد تھا جس کے سینے پر ایک ہاتھ پھیلائے وہ کروٹ کے بل سو رہی تھی۔ مرد کا چہرہ وہ نہیں دیکھ سکا۔ اس کا صرف ماتھا اور سر کے بال نظر آرہے تھے۔ چہرہ نوراں کے بازو کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔ یہ ہولناک منظر وہ زیادہ دیر نہیں دیکھ سکا' الگ ہٹ گیا۔ غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا۔ وہ ذرا دیر چپ چاپ کھڑا رہا۔

اس نے جھری سے پھر اندر دیکھا۔ اس کا غصہ اور شدید ہوگیا۔ اس نے نظریں ہٹالیں۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکالا۔ اسے آہستہ سے کھولا۔

وہ دونوں کو سوتے ہی میں قتل کردینا چاہتا تھا۔ دل میں یہ ٹھان کر اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازہ چرچراتا ہوا ذرا سا کھل گیا۔ مگر دروازے کی چرچراہٹ کے ساتھ ہی نوراں کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ رحیم داد دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں خون خوار ہو رہی تھیں۔ چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ نوراں نے پہلے تو اسے حیرت سے دیکھا' پھر اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

رحیم داد جھٹ دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ چھپر سے باہر نکلا۔ قریب ہی گھاس پھوس کا مٹھا تھا اور خاصا بڑا تھا۔

فرار ہونے کی گنجائش نہیں تھی۔ رحیم داد مٹھے کی آڑ میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس نے چاقو مضبوطی سے ہاتھ میں تھام لیا۔ ذرا دیر بعد کوئی دھوتی باندھتا ہوا دروازے سے نکل کر چھپر کے نیچے آگیا۔

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ وہ جمال دین تھا۔ ہاں وہی تھا۔ وہ کمرے کے اندر سے نکلتی ہوئی چراغ کی روشنی میں کھڑا دھوتی باندھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے نوراں تھی' دروازے کی دہلیز سے ذرا آگے بڑھ کر سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ رحیم داد دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

جمال دین نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ "یہاں تو کوئی نہیں۔ جانے تو کیا دیکھ کر ڈر گئی۔"

وہ آہستہ سے بولی۔ "میں نے اسے خود دیکھا تھا۔"

"ہمارے پاس دھرا ہی کیا ہے جو کوئی چوری کرنے آئے۔"

"وہ چور تو نہیں لگتا تھا۔"

"فیر کیا لگتا تھا؟"

"اس کی داڑھی تھی۔ مونچھیں تھیں۔ اجلا کرتا اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔"

"چور تو وہ نہیں ہو سکتا۔" جمال دین نے قیاس آرائی کی۔ "چور تو منہ پر منڈاسا باندھ کر آتے ہیں۔ ان کی تو صرف آنکھیں نظر آتی ہیں۔ جانے تو نے کیا دیکھا۔ تیری بات سمجھ نہیں آئی۔"

"نہیں دینے' میں نے اسے ٹھیک طرح دیکھا ہے۔ بیچ دروازے میں کھڑا مجھے لال لال آنکھوں سے گھور رہا تھا۔" اس نے ذرا رک کر کہا۔ "ہائے کیسی ڈراؤنی آنکھیں تھیں۔ ڈر کے مارے میری تو چیخ بھی نہ نکل سکی۔"

جمال دین جھٹ اندر گیا اور لمبی لاٹھی نکال کر لایا۔ وہ زور زور سے کھنکارتا ہوا آنگن میں آیا۔ شیشم کے درخت کی طرف گیا۔ بچوں کی چارپائی کے پاس پہنچا۔ وہ ابھی تک بے خبر سو رہے تھے' جب وہ گھاس پھوس کے ڈھیر کی طرف بڑھا تو رحیم داد سکڑ کر اور دبک گیا۔ اس نے چاقو مضبوطی سے انگلیوں میں بھینچ لیا۔

جمال دین قریب آگیا۔ جب تک وہاں کھڑا رہا رحیم داد سانس روکے رہا۔ جمال دین چند لمحے ٹھہرا۔ اسے جمال دین کے صرف پیر نظر آرہے تھے۔ جمال دین مڑا اور بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ قریب جا کر اس نے دروازہ کھولا اور گھر سے باہر چلا گیا۔

نوراں چھپر کے نیچے دھندلی روشنی میں تنہا کھڑی تھی۔ رحیم داد دکھ اور نفرت کے ملے جلے احساسات کے ساتھ ٹکٹکی باندھے اسے تکتا رہا۔ وہ گردن اٹھائے دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے جمال دین کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اس کی خوش نما لمبی گردن میں اس وقت بھی وہی خم تھا جسے دیکھ کر وہ وارفتہ ہو جاتا تھا۔ اس کے لمبے چمکیلے بال پیٹھ پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کا نصف حصہ روشنی میں تھا جو خوب صورت بھی تھا اور دل آویز بھی۔ اس کے ہونٹ ذرا سے کھلے تھے اور ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جمال دین واپس آگیا۔ اس نے دروازے کی کنڈی لگائی اور لاٹھی اٹھائے سیدھا نوراں کی جانب بڑھا۔ قریب گیا اور سینہ تان کر بولا۔ "کوئی بھی تو نہیں۔ میں نے ہر طرف دیکھا۔ کوئی نظر نہیں آیا۔ تو ایں ویں ڈر گئی۔"

"تجھے کیسے بتاؤں' میں نے اسے دیکھا تھا۔" نوراں کی آنکھوں سے خوف صاف جھلک رہا تھا۔



"مجھے تو ایسا لگا جیسے وہ رحیمے ہو۔"

"حد کر دی تو نے۔ رحیما اب کیسے آسکتا ہے۔" نوردین نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "اسے تو کتل کر دیا گیا۔ تجھے کتنی بار بتاؤں۔ میں احمد کوٹ میں سیف اللہ کے چھوٹے بھائی بلّے سے خود ملا تھا۔ بلّے نے اپنی آنکھوں سے رحیمے کی لاش دیکھی تھی۔ جیل کی وردی اس کے بدن پر تھی۔" اس نے اپنی لاٹھی دیوار سے ٹکا دی۔ "اب تو رحیمے کی لاش بھی دفن کر دی گئی۔ وہ کبر سے اٹھ کر تو یہاں آنے سے رہا۔" وہ ایک بار پھر بے نیازی سے ہنسا۔

"تو نے سفنہ دیکھا ہو گا۔"

"میں تجھے کیسے بتاؤں۔" نوراں نے دروازے کی دہلیز کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ اس جگہ آنکھیں نکالے مجھے گھور رہا تھا۔" وہ چند لمحے خاموش کھڑی سوچتی رہی' پھر بڑبڑانے کے سے انداز میں دھیرے دھیرے بولنے لگی۔ "رحیمے کے داڑھی نہیں تھی پر لگتا وہی تھا۔"

"اس کا بھوت آیا ہو گا۔" جمال دین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے تو اسے بھولی نہیں!"

نوراں نے کچھ نہیں کہا۔ جمال دین نے اسے خاموش پا کر چھیڑنے کی کوشش کی۔ "لگتا ہے ابھی تک اسی کے چکر میں رہتی ہے۔ یاد تو آتا ہو گا؟"

"یاد تو آتا ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "سات برس اس کا ساتھ رہا ہے۔ ذرا سوچ' سات برس تھوڑے نہیں ہوتے' فیر یہ بچے موجود ہیں۔" اس نے آنگن میں پڑی ہوئی چارپائی کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ اسی کے تو ہیں۔ وہ میرے بچوں کا پیو تھا۔"

"فضول باتیں چھوڑ۔" جمال دین نے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔ "اب تو رحیما آنے سے رہا۔ ٹھیک ہی ہوا۔ جب تک زندہ تھا' ہر دم اس کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔" وہ انگلی سے سر کے بال کریدنے لگا۔ "میں نے اپنی مسجد کے ملّا سے بات کی تھی۔ کہتا تھا' عدّت کے چار مہینے دس دن پورے کر لینے دے۔ اس سے پہلے نکاح حرام ہے۔ عدّت ختم ہونے کے بعد تیرا نکاح پڑھا دوں گا۔ فیر تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری ہو جائے گی۔ نہ کسی کا ڈر' نہ کسی کا خوف۔"

"یہ تو ٹھیک ہے پر تو کوئی ٹھیک ٹھاک دھندا تو کر۔" نوراں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دیکھ تو گھر کی کیا حالت ہو رہی ہے۔"

"کرلوں گا' کرلوں گا۔ اب تو ضرور کوئی ٹھیک سا دھندا کرنا پڑے گا۔"

"ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔" نوراں نے گلہ کیا۔ "تیری انھی باتوں میں آکر میں نے اپنا خانہ خراب کیا ہے۔"

"کرماں بھری! بیکار میں اپنا مُنہ خراب نہ کر۔" جمال دین نے نرم لہجے میں اسے منانے کی کوشش کی۔ "پروا نہ کر' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ایسا کر' احمد کوٹ والی زمین واپس لینے کی کوشش کر۔ اب تو سیف اللہ کے بھائیوں کا غصہ ختم ہو گیا ہو گا۔ رحیمے بھی نہیں رہا جس سے ان کی دشمنی تھی۔ اب انھیں ہم سے کیا لینا۔ انھوں نے تو زبردستی ہماری زمین دبا رکھی ہے۔"

"کہتی تو ٹھیک ہے۔" جمال دین نے اتفاق کیا۔ "میں تجھے اور دونوں بچوں کو احمد کوٹ لے جاؤں گا۔ تو سیف اللہ کی ماں کے پاس جانا۔ اس کے سامنے رونا پیٹنا۔ سنا ہے' غصہ تو اس کا تیز ہے پر دل کی بری نہیں۔ تجھ پر اور بچوں پر ترس کھا کے زمین واپس کر دے تو کوئی تعجب کی گل نہیں۔"

"ویسے بھی تو ان کا کبنہ غیر کنونی ہے۔ ان کے خلاف تو مکدمہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"مکدمے سکدمے کے چکر میں نہ پڑ۔ ان کی اوپر تک پہنچ ہے۔ مکدمہ سے کچھ نہیں بنے گا۔ بہت لمّا چکر ہے۔" جمال دین اسے سمجھانے لگا۔ "اور سب سے زیادہ مشکل یہ کہ مکدمہ لڑنے کے لیے' روپیہ بھی چاہیے۔ یہ تو سوچ۔"

"پکّی باراں کلّا زمین ہے۔ باراں کلّا زمین کم نہیں ہوتی۔"

"میں کب کہتا ہوں' کم ہوتی ہے۔" جمال دین نے مسکرا کر کہا۔ "پر جیسا میں کہتا ہوں' ویسا کر۔ اس طرح کام آسان ہو جائے گا۔ بول کیا کہتی ہے؟"

"جیسا تو کہتا ہے' وہی کروں گی۔ پہلے بھی تیری بات میں نے کب نہیں مانی۔" اس نے ایک خاص ادا سے جمال دین کو دیکھا اور زیر لب مسکرانے لگی۔ "رحیمے جیل میں تھا تبھی تیری بن گئی تھی۔ تو نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔"

"میں نے جادو کر دیا تھا یا تو نے؟ ذرا اپنی موٹی موٹی آنکھیں دیکھ۔" جمال دین ہنس کر بولا۔ "میں نے تیرے لیے' پنڈ چھوڑا۔ گھر والوں سے جھگڑا کیا۔ سب کو چھوڑ دیا' تیرا بن گیا۔"

"اور بھی باتیں ہیں۔" نوراں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اس رات مجھے احمد کوٹ سے نکال کر یہاں نہ لاتا تو سیف اللہ کے بھائی مجھے اور میرے ان دو بچوں کو بھی ختم کر دیتے۔"

"تجھے کیا پتہ' تیرے لیے' تو میں جان کی بازی لگا سکتا ہوں۔" جمال دین نے بڑے جوش سے کہا۔ "تجھ میں بات ہی ایسی ہے۔"

"کیا بات ہے مجھ میں' کچھ بھی تو نہیں۔" وہ بڑے ناز سے مسکرائی۔ اس کے [illegible]



تھی۔ "پر اتنا ضرور ہے' میں اب تیری ہو گئی۔ تجھے نہیں چھوڑوں گی۔ کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ تو مجھے چھوڑ دے' یہ دوسری بات ہے۔"

"میں تجھے چھوڑ دوں' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس نے سینے پر داہنا ہاتھ رکھا اور گہری سانس بھر کر بولا۔ "ہائے میں کرباں! تجھے پانے کے بعد بھی کوئی چھوڑ سکتا ہے' ایسی چاندنی کی طرح لشکارے مارتی ہوئی سوہنی کو۔" اس نے شوخی سے نوراں کی کمر میں چٹکی بھری۔ وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ اس کی کمر بل کھا کر دہری ہو گئی۔ جمال دین نے جھپاک سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ نوراں نے پیار سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور سینے سے چمٹ گئی۔ رحیم داد اندھیرے میں بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہا۔

جمال دین آگے بڑھا۔ وہ نوراں کے چہرے پر جھکا ہوا پیار سے کہہ رہا تھا۔ "دل جانی! منجی پر لیٹ کر آرام نال گلاں ہوں گی۔" جمال دین اسے اٹھائے ہوئے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

نوراں کمرے کے اندر تھی۔ اس کے بچے آنگن میں کھلے آسمان کے نیچے چارپائی پر بے خبر سو رہے تھے اور رحیم داد گھاس کے ڈھیر کی آڑ میں دبکا بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ کمرے سے نوراں اور جمال دین کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے اور ہنسنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد کے دل پر آرے چل رہے تھے۔ کمرے میں زوردار قہقہہ ابھرا۔ غصے اور نفرت سے رحیم داد کا خون کھول اٹھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ اس نے چاقو مضبوطی سے تھام لیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چاقو ہاتھ میں سنبھالے دھیرے دھیرے چھپر کی جانب بڑھا۔ اس کی نظریں کمرے کے دروازے کی جانب تھیں۔

یکایک کمرے میں جلتا ہوا چراغ بجھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی گہری خاموشی چھا گئی۔ رحیم داد کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ جسم کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ واپس مڑا اور ڈگمگاتے قدموں سے چلتا ہوا آنگن میں آ گیا۔ سامنے چارپائی پر اس کے دونوں بچے بے خبر سو رہے تھے مگر وہ اس طرف نہ گیا۔

اس نے کھلا ہوا چاقو بند کر کے احتیاط سے جیب میں رکھا۔ شیشم کے درخت کے نیچے پہنچ کر ڈال پر چڑھا' دیوار پار کر کے باہر گلی میں آ گیا۔ دیوار کے قریب اندھیرے میں رکھے ہوئے جوتے پہنے۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ اٹھا کے بغل میں دبایا اور دبے دبے قدموں چلتا ہوا اندھیری گلی سے نکل کر اسکول کے پچھواڑے پہنچا۔ میدان عبور کیا اور سنسان گلی کوچوں سے گزرتا ہوا اکال گڑھ

کی حدود سے باہر نکل گیا۔

☆

رحیم داد دل گرفتہ اور نڈھال تھا۔ نوراں کی بے وفائی نے اس کے وجود میں غم و غصے کا جوالاؤ بھڑکایا تھا' اس آگ میں سلگتے سلگتے اب وہ راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا' سب کچھ لٹا چکا تھا۔

رات دم بخود کھڑی تھی۔ ہوا درختوں میں سسکیاں بھر رہی تھی۔ رحیم داد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے ماضی کا لاشہ اٹھائے بوجھل قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ آگے جا کے اس نے نہر کی پلیا عبور کی۔ سامنے کرتارپور کی بستی اندھیرے میں لپٹی اونگھ رہی تھی۔

اس نے نظر بھر کر اس طرف دیکھا۔ ٹھٹکا اور دوسری طرف مڑ گیا۔ کرتارپور نہ گیا۔ اب اسے کرتارپور سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اکال گڑھ جانے سے پہلے اس نے بیوی بچوں کے ساتھ ایک نئی زندگی بسر کرنے کے جو منصوبے باندھے تھے' سب ملیامیٹ ہو چکے تھے۔ اس کے ذہن پر ابھی تک نوراں اور جمال دین بھیانک خواب بن کر چھائے ہوئے تھے۔ اس نے اندرونی جیب سے کاغذ میں لپٹے ہوئے جھمکے نکالے۔ ان پر نظریں جمائے دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں غصے سے دہکنے لگیں۔ چہرے پر وحشت برسنے لگی۔ اس نے جھمکے نہر میں پھینک دیئے۔ پرنا کھول کر مٹھائی نکالی اور اسے بھی حقارت سے پھینک دیا۔ وہ نوراں اور بچوں سے اب کوئی رشتہ کوئی واسطہ رکھنا نہ چاہتا تھا۔

وہ نہر کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ رات تاریک اور بوجھل تھی۔ رحیم داد تھکن اور ذہنی کرب سے نڈھال تھا۔ دل ڈوب رہا تھا۔ آگے جانے کی سکت رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی۔ کھیتوں کا سلسلہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔

نہر سے ہٹ کر جھنگر تھا' ویران اور جنگلی جھاڑیوں سے بھرا ہوا۔ وہ جھنگر میں داخل ہوا۔ لیکن زیادہ دور نہ گیا۔ مٹی کے ایک تودے کے قریب بے حال ہو کر بیٹھ گیا اور گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

رات اس نے جھنگر میں بسر کی۔ تاروں کی چھاؤں میں اٹھا۔ نہر پر جا کے منہ ہاتھ دھویا۔ نسیم سحر کے نرم نرم جھونکوں میں فرحت اور تازگی تھی۔ زندگی کی ہلچل تھی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ میں ریت کے ذرے جگمگا رہے تھے۔

رحیم داد راہ گیروں کی نظروں سے بچتا بچاتا ویران اور سنسان راستوں سے گزرتا ڈھولا امیر خاں کی جانب گامزن تھا۔ دھوپ کی تمازت میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے



ے جھلملا رہے تھے۔

جمال دین خطرہ بن کے اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ اسی کے خوف سے رحیم داد نے کرتارپور کو باد کہا تھا۔ وہاں سے چلتے وقت اسے ایک ہی محفوظ ٹھکانا نظر آیا تھا' اور وہ تھا ڈھولا امیر خان' ں اس کی چھوٹی بہن بیگماں کا گھر تھا۔ ماں باپ بہت پہلے مر چکے تھے۔ بیگماں کے سوا رحیم داد کی وئی بہن تھی' نہ بھائی۔

بیگماں کی شادی چچا زاد بھائی مولا داد سے ہوئی تھی۔ رحیم داد کا چچا ابھی زندہ تھا۔ وہ ڈھولا امیر ں میں رہتا تھا۔ خاصا کھاتا پیتا زمیں دار تھا۔ اس کے پاس چالیس ایکڑ سے اوپر نہری زمین تھی ں پر وہ اپنے دو بیٹوں کے ساتھ کاشت کرتا تھا۔

بیگماں کی شادی کے کچھ ہی عرصے بعد چچا سے رحیم داد کے تعلقات خراب ہو گئے۔ سبب یہ تھا لہ بیگماں کی شادی کے وقت رحیم داد کنوارا تھا۔ جب رحیم داد کی شادی کا سلسلہ چھڑا تو چچا نے چاہا ہ رحیم داد کا بیاہ اس کی منجھلی بیٹی بیدی سے ہو جائے۔ مگر رحیم داد وٹے سٹے کی شادی پر رضامند میں ہوا۔

اس نے نوراں سے بیاہ کر لیا۔ نوراں پر وہ بہت پہلے سے فریفتہ تھا۔ یہ بات بیگماں کو معلوم تھی ور مولا داد کو بھی۔ چچا اس قدر ناراض ہوا کہ نہ تو شادی میں خود شریک ہوا' نہ بیٹے اور بہو کو شریک ہونے دیا۔ تعلقات اس قدر کشیدہ ہو گئے کہ شادی کے بعد بیگماں اور اس کی سسرال سے کوئی بھی رحیم داد کے گھر نہیں آیا۔

رحیم داد بھی نہیں گیا۔ سالہا سال گزر گئے۔ مگر جن دنوں رحیم داد منٹگمری جیل میں تھا' ایک روز بیگماں سسر اور شوہر سے چھپ کر اس سے ملنے آئی۔ اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کے روئی۔ وہ بے قرار ہو کے سلاخوں سے سر ٹکراتی تھی اور تڑپ کر کہتی تھی۔ "ہائے ویرا! تو نے یہ کیا کر لیا؟" رحیم داد اسے تسلی دیتے دیتے خود بھی رونے لگتا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ بیگماں اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔ لیکن بیگماں اس سے ملنے دوبارہ جیل نہیں آئی۔ آنے کا موقع ہی نہیں ملا ہو گا۔

رحیم داد کو یقین تھا کہ اس کے مرنے کی خبر سن کر بیگماں احمد کوٹ ضرور پہنچی ہو گی اور اب تک اسے یاد کر کے آنسو بہاتی ہو گی۔ وہ اگر اس کے پاس پہنچ جائے تو وہ بھائی کو زندہ دیکھ کر خوشی سے دیوانی ہو جائے گی۔ اسے اپنے گھر میں ضرور پناہ دے گی۔ مولا داد بھی نیک اور بھلا مانس تھا۔ بیوی کو چاہتا بھی بہت تھا۔ لہٰذا رحیم داد سے خلوص اور ہمدردی رکھتا۔ خفگی صرف چچا کی تھی۔

شام کا دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد خاموش کھڑا سوچ رہا تھا کہ آیا اسے فوراً بیگماں کے پاس

پہنچ جانا چاہیے یا نہیں۔ اس تذبذب کی وجہ اس کا چچا تھا۔ وہ بڑا ضدی اور سخت گیر تھا۔ رحیم داد کو خدشہ تھا کہ اسے دیکھ کر کہیں وہ بھڑک نہ اٹھے' ایسا ہنگامہ نہ برپا کردے کہ اس کا راز فاش ہو جائے' گاؤں والوں کو پتہ چل جائے کہ وہ کون ہے۔

وہ ایسا کوئی خطرہ ہرگز مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اب وہ رحیم داد کے بجائے چوہدری نور الٰہی کے روپ میں زندہ رہنا چاہتا تھا جس کے کلیم کے کاغذات کا بستہ وہ نہایت احتیاط سے سنبھالے ہوئے تھا۔

رحیم داد نے بہت سوچ بچار کے بعد طے کیا کہ گھر جانے کے بجائے اسے پہلے کسی نہ کسی طرح بگماں سے ملنا چاہیے اور اس کے مشورے سے ڈھولا امیر خاں میں ٹھہرنے کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ وہ ہر خطرے سے بچنا چاہتا تھا۔



# ١٦

ڈھولا امیر خاں پرانا گاؤں تھا۔ عام رواج کے مطابق گاؤں کے شروع میں قبرستان تھا۔ جھٹ پٹے میں قبرستان بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اونچی نیچی قبریں خود رو جنگلی جھاڑیوں کے درمیان دھندلے دھندلے دھبّوں کے مانند نظر آرہی تھیں۔

رحیم داد ٹھٹکا اور قبرستان سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ وہ مخمصے میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا کہ اسے ڈھولا امیر خاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ فی الحال کرتارپور ہی میں ٹھہرنا چاہیے تھا۔ مگر کرتارپور اب اس کے لیے' محفوظ ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ اکال گڑھ نزدیک ہی تھا اور وہاں جمال دین موجود تھا جو کسی بھی وقت کرتارپور پہنچ سکتا تھا۔ اگر جمال دین نے اسے پہچان لیا تو ذرا بھی مروت نہیں کرے گا' جھٹ پولیس سے مخبری کردے گا۔ اب وہ اس کا جگری دوست نہیں' رقیب بن چکا تھا۔ نوراں ان کی دوستی کے درمیان دیوار بن کے حائل ہوگئی تھی۔

رحیم داد نے گاؤں کی طرف جانے کا ارادہ ترک کردیا' مڑا اور کھیتوں کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ پہلے بھی کئی بار ڈھولا امیر خاں آچکا تھا۔ لہٰذا راستوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد چاپ سنائی دی۔ رحیم داد نے رفتار سست کرلی اور چوکنا نظروں سے چاپ کی سمت دیکھنے لگا۔ اندھیرا دھیرے دھیرے نیچے اتر رہا تھا۔ گاؤں کے گھروں سے مویشیوں اور انسانوں کی ملی جلی آوازیں شام کے بڑھتے ہوئے سناٹے میں آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں۔

ایک شخص اچانک جھاڑیوں کے عقب سے نکل کر رحیم داد کے سامنے آگیا۔ اسے دیکھ کر رحیم داد لمحے بھر کے لیے' پریشان ہوا مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ قریب آیا تو رحیم داد نے

پوچھا۔ ”میں نے کہا جی! ڈھولا امیر خاں یہی ہے نا؟؟“

”ہاں جی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تیں نوں کسے ملنا ہے؟؟“

رحیم داد اس کا سوال صاف نظر انداز کر گیا۔ لہجے میں کسی قدر رقت پیدا کر کے بولا۔ ”سخت پیاس لگی ہے۔ پانی ہو تو پلا دے۔“

”فکر نہ کر‘ تجھے ابھی پینے کو پانی مل جائے گا۔“ اس نے رحیم داد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”پر میں نے تجھے اس پنڈ میں پہلے نہیں دیکھا۔“ اس نے رحیم داد کا گرد سے اٹا ہوا چہرہ اور لباس غور سے دیکھا۔ ”بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لگتا ہے‘ سویرے سے روٹی بھی نہیں کھائی۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”پانی بھی پی لینا۔ روٹی ٹکر بھی کھا لینا۔ آ میرے ساتھ۔“

وہ آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ رحیم داد کچھ دور تک چپ چاپ چلتا رہا پھر اس نے کسی قدر حیرت سے دریافت کیا۔

”تو مجھے اڈے سے پانی پلائے گا؟؟“

”نا جی‘ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ دھیرے سے ہنسا۔ ”ادھر منا ہے۔“ اس نے ایک طرف ہاتھ اٹھایا۔ ”وہاں پانی ہے‘ روٹی ٹکر بھی ہے۔“ اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ ”دوپہر سے مروڑ ہو رہی ہے۔ میں اسی لیے‘ ادھر آیا تھا۔ روٹی نہیں کھاؤں گا‘ توں کھا لینا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھلی جگہ پہنچے۔ سامنے مٹی کا بنا ہوا کسی قدر اونچا چبوترا تھا جس پر چڑھ کر کھیتوں کی رکھوالی کی جاتی ہے۔ یہ منا تھا۔ اس کے ارد گرد تیار فصلیں کھڑی تھیں۔ رحیم داد نے فصلیں دیکھ کر کہا۔

”فصلیں تو پک کر بالکل تیار ہو چکی ہیں۔ ابھی ان کی واڈھی نہیں ہوئی؟؟“

”بس جی ہونے ہی والی ہے۔“ وہ چبوترے کی جانب بڑھا جس پر ایک طرف پانی کا گھڑا رکھا تھا۔ اس کے ڈھکنے پر کپڑے میں لپٹا ہوا کھانا دھرا تھا۔ وہ چبوترے پر چڑھ کر اوپر گیا۔ رحیم داد بھی اوپر چلا گیا۔ اس شخص نے کھانا اٹھایا اور رحیم داد کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لے‘ یہ روٹی پکڑ۔“

کھانا رحیم داد کے سپرد کر کے اس نے قریب رکھا ہوا مٹی کا پیالہ اٹھایا۔ اس میں گھڑے سے پانی ڈالا اور رحیم داد کے حوالے کیا۔ ”پہلے پیاس بجھا لے۔ پر زیادہ پانی نہ پینا۔ الٹی ہو جائے گی۔ روٹی بھی ٹھیک سے نہیں کھا سکے گا۔“

رحیم داد نے بھرا ہوا پیالہ ہاتھ میں سنبھالا۔ اسے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے



پیالہ ہونٹوں سے لگایا اور آدھا خالی کر دیا۔ پانی پی کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھانا سامنے رکھ لیا۔ وہ شخص بھی قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے کپڑا کھول کے روٹیاں نکالیں۔ روٹیوں کے ساتھ پلّی کی چٹنی تھی۔ ایک گٹھی پیاز کی بھی تھی۔ رحیم داد نے روٹی توڑ کر لقمہ بناتے ہوئے کہا۔

”دو روٹیاں ہیں۔ میں دونوں نہیں کھا سکوں گا‘ تو بھی تھوڑی سی روٹی کھا لے۔“

”مجھے نہ کھلا‘ میری طبیعت کچھ گڑبڑ ہے۔“

”رات بھر بھوکا رہے گا؟؟“

”ایسا کر‘ آدھی روٹی میرے لیے‘ چھوڑ دے۔“ اس نے پیاز کی گٹھی اٹھا کر رحیم داد کے سامنے کی۔ ”یہ گنڈا بھی جی چاہے تو چھوڑ دے۔ تو پلّی سے روٹی کھا لے۔ رات کو بھوک لگی تو آدھی روٹی گنڈے کے ساتھ کھا لوں گا۔ اپنا کام چل جائے گا۔ ویسے تو میری فکر نہ کر۔ مجھے بالکل بھوک نہیں۔“

رحیم داد دھندلی روشنی میں چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔ صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ روٹی اور پلی کی چٹنی مزے دار لگی۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے کھاتا رہا پھر اس نے پوچھا۔

”تو راکھا ہے؟؟“

”ہاں جی‘ راکھا ہی ہوں۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

رحیم داد نے اس کے لہجے کی کسک محسوس کی۔ ”کتنے دنوں سے یہ کام کر رہا ہے؟؟“

”دو برس تو ہو گئے ہوں گے۔ پر ڈھولا امیر خاں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ پہلے میں چک ۲۲ میں ہوتا تھا۔“

”ادھر کیا کرتا تھا؟؟“

”کرنا کرانا کیا ہے جی!“ وہ بیزاری سے بولا۔ ”کبھی مویشی چرانے لگ گیا تو چاک بن گیا۔ کبھی گڑ بنانے والا گڑالا۔ کبھی راکھا۔ جو کام مل گیا‘ کرنے لگا۔“

”کسی زمیں دار کا مزارع کیوں نہیں بن جاتا؟؟“

”مزارع بھی رہ چکا ہوں۔“

”زمیں دار نے بے دخل کر دیا؟؟“

”ہاں جی‘ پہلے میں بھی زمیں دار ہوتا تھا۔“

”اسی ضلع میں تیری زمیں داری تھی؟؟“

”نہیں جی۔“ اس نے انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”ملتان کی تحصیل وہاڑی میں اپنا پنڈ

کوڑا نجیب تھا۔ متاجری پر ۲۵ کلا زمین لے رکھی تھی۔ نہری زمین تھی۔ پانی بھی پورا پورا ملتا تھا۔ ساتھ میں گھر والی کے بھائی ادریس کو بھی لگا رکھا تھا۔ آرام سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ پنڈ کا وڈا زمیں دار عارف سلدیرا تھا۔ وہ میری زمین ہتھیانا چاہتا تھا۔ طرح طرح سے تنگ کرتا۔ کبھی مویشی اٹھوا لیے، کبھی پانی کاٹ دیا۔ فیر ایسا ہوا جی، ایک دن اس نے مجھے اپنی حویلی میں بلوایا۔ ادریس میرے ساتھ تھا۔ سلدیرے نے مجھ سے صاف صاف کہا۔ ولدار اپنی زمین میرے حوالے کر دے ورنہ پچھتائے گا۔"

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "تیرا نام ولدار ہے؟"

"ہاں جی، کبھی میرا یہی نام ہوتا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "اب تو سب دارا کہتے ہیں، کمّی کمین سمجھتے ہیں۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "ہاں تو جی، میں بتا رہا تھا۔ عارف سلدیرا نے مجھے سیدھی سیدھی دھمکی دی۔ میں تو چپ رہا پر ادریس گرمی میں آ گیا۔ وہ تھا بھی تکڑا اور زور آور جوان۔ سلدیرے سے ذرا نہ ڈرا۔ جب زیادہ گرما گرمی ہوئی تو میں نے ادریس کو منع کیا اور اپنے ساتھ لے آیا۔ کچھ دنوں بعد سلدیرے کے پتر کا ویاہ ہوا۔ اس نے پورے پنڈ پر ٹیکس لگایا کہ ہر گھر سے دو بھیڑ بکریاں دی جائیں۔ اس کے کرندے زبردستی بھیڑ بکریاں وصول کرتے۔ وہ میرے گھر آئے تو ادریس نے صاف انکار کر دیا۔ کرندے چپ کر کے چلے گئے، پر رات کو انھوں نے میری چار بھیڑیں اٹھانے کی کوشش کی۔ ادریس پہلے ہی چوکس تھا۔ اس کے ساتھ کئی یار دوست بھی تھے۔ اس نے کرندوں کو ٹوکا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ادریس اور اس کے ساتھیوں نے پیچھا کیا اور دو کرندوں کو پکڑ لیا۔ ان میں سے ایک نے بھیڑ بھی کندھے پر اٹھا رکھی تھی۔"

رحیم داد نے لقمہ چباتے ہوئے پوچھا۔ "دونوں کو پولیس کے حوالے کر دیا ہوگا؟"

"ہاں جی، ارادہ تو یہی تھا۔" دارا نے بتایا۔ "پر سویرے سویرے سلدیرے نے پنچایت بھیجی۔ منت سماجت کی۔ ادریس پنچایت پر تیار نہیں تھا، پر میں نے معافی دے دی۔ کرندوں کو چھوڑ دیا۔ گل ایسہ ہے جی، میں سلدیرے سے جھگڑا بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بہت وڈا زمیں دار ہے۔ اور جی، ادھر سلدیروں کا زور بھی بہت ہے۔ خاکوانیوں، صاحب زادوں، دولتانوں اور گدّی نشینوں سے سلدیروں کا بہت میل جول ہے۔ وہ اتنے طاقت ور ہیں، سمجھو حکومت ہی ان کی ہے۔ تھانیدار ہو یا تحصیل دار، کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ سارے سرکاری افسر اور حاکم ان کے بندے ہیں۔"

رحیم داد نے مٹی کا پیالہ دارا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ٹھوٹھے میں گھڑے



دے۔"

دارا نے پیالے میں پانی انڈیل کر رحیم داد کو دے دیا۔ رحیم داد نے پانی پیا، گیلی مونچھیں ہاتھ سے پونچھیں، مسکرا کر بولا۔ "ہاں، اب آگے کی بتا۔"

"بتانا کیا ہے جی، سلدیرے نے وہی کیا جو چاہتا تھا۔"

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "کیا کیا اس نے؟"

"سلدیرے نے گرداور اور پٹواری کے ساتھ جوڑ توڑ کر کے بندوبست اراضی کے کاغذات میں انتقالات منسوخ کرا دیے۔ شاملات دیہہ کی شکل بدلوا کر میری زمین کی متاجری اپنے نام کرا لی۔ ویسے متاجری میں میرے لگ بھگ تین سال رہتے تھے۔"

"متاجری تو سرکاری ٹھیکا ہوتا ہے۔ ٹھیکے کی مدت ختم ہونے سے پہلے متاجری سلدیرے کے نام کیسے ہو گئی؟"

"اب کیا بتاؤں، یہ سب کیسے ہو گیا۔" دارا نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "ویسے میری ربیع کی فصلیں واڈھی کے لیے، تیار کھڑی تھیں۔ فصلوں کی واڈھی سے پہلے تو مزارعے کی بھی بے دخلی نہیں ہوتی۔ متاجری ختم ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تو نے عدالتی چارہ جوئی نہیں کی؟"

"میرا تو ایسا ارادہ نہیں تھا پر ادریس نے مکدمہ دائر کر دیا۔"

"مکدمے کا کیا بنا؟"

"مکدمہ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ سلدیرا ایک روز اپنے کرندوں کو لے کر پہنچا۔ پولیس بھی اس کی ساتھ تھی۔ اس نے میری زمین اور اس پر کھڑی ہوئی فصلوں پر کبضہ کر لیا۔ میرے وکیل نے سلدیرا کا کبضہ رکوانے کے لیے، عدالت سے حکم امتناعی بھی لے لیا تھا۔ میں اور ادریس عدالت سے خوش خوش لوٹ رہے تھے۔ ادھر سلدیرے نے دوسرا ہی منصوبہ بنایا۔ تمام سڑکیں جو عدالت سے لاریوں کے اڈے کی طرف جاتی تھیں، ان کی ناکابندی کی جا چکی تھی۔ ایک سڑک کے ناکے پر سلدیرے اور دین دار، زمین دار بیٹھے تھے۔ دوسری پر منگھیرے اور دولتانے تھے اور تیسری پر خاکوانی اور گھنانے رسا گیر مورچا لگائے ہوئے تھے۔" دارا نے لمبی سانس بھری۔ "ادھر تو پوری تیاری تھی ادھر کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ ادریس آگے آگے چل رہا تھا۔ مجھ سے کوئی تیس چالیس گز کے فاصلے پر تھا۔ اچانک شفیع سلدیرا، سکندر کھنڈ اور نادر دین دار ایک گلی سے نکلے اور ادریس پر کلہاڑیوں اور گنڈاسوں سے حملہ کر دیا۔ ادریس خون میں لت پت پڑا تھا اور قاتل ہوائی فیر کرتے،

کلہاڑیاں لہراتے صاف نکل گئے۔"

"ادریس کا کیا بنا؟" رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"اس نے وہیں سڑک پر دم توڑ دیا۔" دارا نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ "اس کی لاش لے کر پنڈ پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ سلدیرے کے کرندے میرے گھر کے سامنے موجود تھے۔ انھوں نے مجھ پر ڈانگیں برسانی شروع کر دیں۔ میں چوٹ کھا کر نزدیک کے کھیتوں میں گھس کر دبک گیا۔ وہ ادریس کی لاش اٹھا کر لے گئے۔ سلدیرے کے حکم پر اسے پنڈ کے بیچوں بیچ ایک درخت سے لٹکا دیا گیا۔"

"تھانے جا کر تو نے پرچہ چاک کرایا ہوتا۔"

"وہ تو جی' میں پہلے ہی کرا چکا تھا۔ پر تھانے دار تو اس رات عارف سلدیرا کے ساتھ حویلی میں بیٹھا شراب پی رہا تھا اور ادریس کی لاش درخت سے لٹک رہی تھی۔ اس کے قاتل بھی نشہ کر کے پنڈ میں بڑھکیں مارتے پھر رہے تھے۔ خوشی سے بانہیں الارلار کے بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ ٹپے الاپ رہے تھے۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "میں آدھی رات کے بعد اندھیرے میں چھپتا لکتا کسی طرح اپنے گھر میں گیا۔ پر سویرا ہوتے ہی کرندے مجھے پکڑ کر سلدیرے کے سامنے لے گئے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی ننگی ننگی گالاں نکالیں۔"

رحیم داد کھانا کھا چکا تھا۔ اس نے بچی ہوئی روٹی اور پیاز کپڑے میں لپیٹ کر ایک طرف رکھی۔ مٹی کے پیالے سے پانی پیا۔ دارا سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔"

"سلدیرے نے پہلے تو اپنے کرندوں سے پٹوایا۔" دارا نے آہ سرد بھر کر بتایا۔ "میرا چہرہ کالا کروایا' منہ میں جوتا دیا اور پورے پنڈ میں گھمایا۔ ایک ڈھولی میرے پیچھے پیچھے ڈھول بجاتا تھا۔ میری کمر میں رسی کا پھندا پڑا تھا جسے ایک کرندے نے پکڑ رکھا تھا۔ منہ میں جوتا دبائے' گردن جھکائے میں پنڈ کے ایک ایک گھر کے سامنے سے گزرتا تھا۔"

"ادریس کی لاش کا کیا بنا؟"

"لاش ساری رات اور سارا دن درخت سے لٹکی رہی۔" دارا نے جواب دیا۔ "ایسے ہی گرمی کے دن تھے۔ لاش سے سخت بدبو نکلنے لگی۔ پنڈ کے کچھ بوڑھے سلدیرے کے پاس پہنچے اس کی منت سماجت کی۔ سارے پنڈ میں بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ سلدیرے کی حویلی میں بھی بدبو پہنچ رہی تھی۔ اس لیے' اس نے لاش دفن کرنے کی اجازت دے دی۔"

"تو نے پنڈ چھوڑ دیا ہو گا؟"



"نہیں' ادریس کو دفن کرنے کے بعد میں گھر میں جا کر بیٹھ گیا۔ کسی کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ ویسے بھی سلدیرے نے پورے پنڈ میں ایسا خوف بٹھا دیا تھا کہ اس کی ناراضی کے ڈر سے کوئی میرے گھر کے سامنے سے بھی نہ گزرتا۔ اپنا حال یہ تھا کہ گھر والی بھائی کی موت پر ہر دم روتی رہتی۔ میں چپ بیٹھا اسے دیکھتا رہتا۔ کئی دن ایسے ہی گزر گئے۔ ادھر سلدیرے کے منشی نے میری فصل کی واڈھی کرالی۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا؟ تو تو گھر میں بند بیٹھا تھا۔"

"گھر والی نے فصلوں کی واڈھی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ وہ ادریس کی کبر پر گئی تھی۔ واپس آئی تو رو رو کر مجھے یہ بات بتائی۔"

"تو نے کوئی کارروائی نہیں کی؟"

"تو بھی کیسی گلاں کرتا ہے۔ کارروائی میں نے کیا کرنی تھی۔" دارا کے ہونٹوں پر زہر خندہ تھا۔ "میں نے صرف یہ کیا' ایک رات چادر سے منہ چھپا کر سلدیرے کی حویلی پر گیا۔ پگڑی اتار کر سامنے ڈالی اور اس کے پیر پکڑ لیے۔ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ سلدیرا ایک دم بھڑک اٹھا۔ ٹھوکر مار کر چیخا۔ یہاں کیوں آیا ہے؟ تھانے جا کر میرے خلاف پرچہ کرا۔ عدالت میں کیس چلا۔ حکم امتناعی نکلوا۔ میں نے اس کی ناراضی کا ذرا برا نہ منایا۔ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ نمبردار معافی دے دے۔ غلطی ہو گئی۔ جو تو کہے گا وہی کروں گا۔ مکدمہ سکدمہ بھی واپس لے لوں گا۔ زمین بھی تیری' فصلیں بھی تیری۔ میں تیرا مزارع بن کر کام کروں گا۔"

"تب تو وہ راضی ہو گیا ہو گا۔ وہ یہی تو چاہتا تھا۔"

"میں نوں پتہ تھا' وہ یہی چاہتا ہے۔ تبھی تو میں اس کے پاس گیا تھا۔ میری منت سماجت پر وہ تھوڑی دیر چپ کر کے بیٹھا سوچتا رہا۔ فیر بولا۔ "تجھے سٹامپ پیپر پر راضی نامہ کرنا ہو گا۔ میں اپنے وکیل سے کاغذ تیار کروا لوں گا۔ تجھے اس پر انگوٹھا لگانا ہو گا۔ اب تو جا' میں بعد میں بلوا لوں گا۔ میں چپ کر کے چلا آیا۔"

"بعد میں اس نے تجھے بلایا؟"

"ہاں جی' اس نے مجھے بلایا۔" دارا نے رحیم داد کو بتایا۔ "وہ اونچی رنگیل کھٹ پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ اپنے پاس بٹھایا۔ محبت سے پوچھا۔ حال سنا اڈّا! میں خیر صلّا ہے سئیں کہتا ہوا اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے نوکر سے لسّی کا گلاس منگوا کر پینے کو دیا۔ حقہ تازہ کر کے سامنے رکھوایا۔ تھوڑی دیر بعد سلدیرے نے اپنے منشی کو بلایا۔ اس نے سٹامپ پیپر

میرے سامنے نکال کر رکھ دیا۔ سلدیرے نے ہنس کر کہا۔ یہ راضی نامہ وہی ہے جو اس روز تیرے ساتھ طے ہوا تھا۔ اس نے میری پیٹھ تھپکی اور بولا۔ دیکھ کیا رہا ہے۔ انگوٹھا لگا دے۔ منشی نے میرے انگوٹھے پر فاؤنٹ روشنائی لگائی اور دو کاغذوں پر مجھ سے انگوٹھا لگوا لیا۔"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ "دوسرا کاغذ کس لیے تھا؟"

"وہ راضی نامے کی نقل تھی۔ منشی تو نقل دینے کو تیار نہیں تھا پر میرے مانگنے پر سلدیرا ہنس کر بولا۔ کوئی گل نہیں، دے دے اسے نقل۔ منشی نے مجھے نقل دے دی۔" دارا نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ "راضی نامے پر انگوٹھا لگوانے کے ذرا ہی دیر بعد سلدیرے کے ہونٹوں سے مسکراہٹ اڑ گئی۔ مونچھ پر ہاتھ پھیر کر کڑک دار آواز سے بولا۔ دارا! اب تو نیچے زمین پر بیٹھ۔ آج سے تو میرا مزارع بن گیا۔ تیں نوں پتہ ہے مزارع، زمیں دار کے برابر نہیں بیٹھ سکتا۔ میں چپ کر کے اٹھا اور سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔"

"مزارع بننے کی گل تو نے ہی کہی تھی نا؟"

"کیا کرتا، کوئی اور راستہ بھی نہ تھا۔ وہ پہلے ہی مجھے ذلیل کر چکا تھا۔" دارا کے لہجے میں درد کی چبھن تھی۔ "پر وہ مجھے ابھی اور ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ کہنے لگا، کل شام میرے پتر کی جنج چڑھے گی۔ تیری گھر والی جنج کے آگے آگے جھومر ڈالے گی۔ میں نے سنا ہے، وہ بہت زبردست ناچتی ہے اور ہاں، یہ بھی سن لے، میں جیسا کہتا ہوں، ویسا ہی کرنا ہوگا۔ میں انکار شنکار سننا نہیں چاہتا۔ اب تو ٹر جا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور گھر واپس آگیا۔ پر گھر والی کو کچھ نہیں بتایا۔ دوسرے روز بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ پر جب دن ڈھلنے لگا تو میں نے گھر والی کو ہمت کر کے پوری بات بتائی۔ مجھے جو ڈر تھا وہی ہوا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ بگڑ کر بولی۔ سلدیرے نے پہلے ہی جنج کے آگے ناچنے کے لیے کنجریاں بلا رکھی ہیں۔ اس نے کیا مجھے بھی کنجری سمجھا ہے جو مجھ سے جھومر ڈلوانا چاہتا ہے؟ پر جب میں نے اس کی بہت منت سماجت کی تو وہ رونے لگی۔ چپ چاپ اٹھی، نہائی، کپڑے بدلے اور شام ہونے سے پہلے پہلے سلدیرے کی حویلی پر پہنچ گئی۔"

"واپسی پر نراض تو نہیں ہوئی؟" رحیم داد نے اس کی روداد میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ نہ پوچھ، جب وہ واپس آئی تو کیا ہوا۔" دارا نے تڑپ کر بتایا۔ "تیسرے روز وہ لوٹی تو اس کا منہ لال ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی زور زور سے چیخنے لگی، میں نے تیرے ایسے بے غیرت کے ساتھ نہیں رہنا۔ توں نے سلدیرے کے پت کی جنج میں مجھے کنجریوں کے ساتھ نچوایا۔ اب مـ کنجری



ہی بن کے رہنا ہے۔ اس نے میرے منہ پر تھوکا، ننّے کو گود میں دبایا اور گھر سے چلی گئی۔"

"اسے روکا نہیں؟"

"روکتا بھی تو نہ رکتی۔ غصّے سے پاگل ہو رہی تھی۔ گھر والی کے اس طرح چلے جانے پر مجھے بہت شرم آئی۔ سلدیرے پر سخت غصّہ آیا۔ جی چاہا حویلی میں جا کر اسے قتل کر دوں۔ پر میں سلدیرے کی حویلی نہیں گیا۔ گھر سے نکلا اور سیدھا اپنے وکیل کے پاس پہنچا۔ اسے راضی نامے کی نقل دکھائی۔ اس نے کئی بار اسے پڑھا۔ متّھے پر ہاتھ مار کر بولا، یہ کیا کیا۔ راضی نامہ کرنے سے پہلے مجھ سے تو صلاح مشورہ کر لیا ہوتا۔ سلدیرے نے تیری زمین بھی اپنے قبضے میں کر لی اور تجھے اس طرح باندھ دیا ہے کہ اس کے خلاف کچھ بھی کارروائی نہیں کر سکتا۔ وہ جب چاہے گا تجھے بے دخل کر دے گا۔ مزارع بن کر بھی زیادہ دن نہیں رہ سکتا۔ راضی نامے میں اس نے ایسی ہی شرطیں ڈالی ہیں۔ اس کی باتیں سن کر میں بہت پریشان ہوا۔"

"وکیل ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ پکے کاغذ پر انگوٹھا لگانے سے پہلے تجھے وکیل سے ضرور گل کر لینی چاہیے تھی۔"

"گل ایہہ ہے جی، میں سلدیرے سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ ادریس کے قتل کے بعد میں بالکل بے سہارا ہو گیا تھا۔ پنڈ میں ہر بندہ مجھ سے بات کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔" دارا نے صفائی پیش کی۔ "اب آگے کی سن۔ وکیل نے میرا حوصلہ بڑھایا تو میں سلدیرے کے خلاف ایک بار فیر عدالتی چارہ جوئی کرنے پر تیار ہو گیا۔ میں نے وکیل کے ساتھ تھانے جا کر رپٹ لکھائی کہ سلدیرے نے ڈرا دھمکا کر زبردستی مجھ سے راضی نامے کے سٹامپ پر انگوٹھا لگوا لیا۔ اس کے بعد وکیل نے میری طرف سے عدالت میں نئی عرضی لگائی۔ یہ توہین عدالت کا مکدمہ تھا جس میں کہا گیا تھا کہ سلدیرے نے حکم امتناعی نہیں مانا اور میری زمین پر ابھی تک کبضہ کیے ہوئے ہے۔ فصلوں کی واڈھی کرائی اور اسے اٹھا کر بھی لے گیا۔ وکیل نے زور دار مکدمہ بنایا تھا۔ عدالت نے فوراً سلدیرے کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے۔"

"لگتا ہے، تگڑا وکیل کیا تھا۔ وارنٹ دیکھ کر سلدیرے کے بھی ہوش اڑ گئے ہوں گے۔ حوالات میں بھی بند رہا ہو گا۔"

"سلدیرا گرفتار کر لیا گیا تھا پر ضمانت پر اسی روز چھوٹ گیا۔ نہ حوالات میں رہا، نہ جیل گیا۔" دارا نے بتایا۔ "وکیل نے مجھے اپنے ایک ملنے والے کے پاس ٹھیرا دیا تھا۔ اس کا پنڈ کوٹ نجیب کے نزدیک ہی تھا۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک رات پولیس مجھے گرفتار کر کے تھانے لے گئے۔

بہت مارا پیٹا اور حوالات میں بند کر دیا۔ پولیس نے سلدیرے کے ایک کرندے کی رپٹ پر میرے خلاف مُج کی چوری کا مکدمہ بنایا تھا۔ وکیل نے ضمانت کی درخواست لگائی پر وہ منظور نہ ہوئی۔ مجھے حوالات سے جیل بھیج دیا گیا۔"

"سلدیرے کی ضمانت ہو گئی اور تیری نہ ہو سکی؟ یہ عجب گل سنائی۔" رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔

"سلدیرا وڈا زمیں دار ہے۔ صاحب زادوں اور مخدوموں سے اس کی یاری بھی ہے۔" دارا گہری سانس بھر کر بولا۔ "اس کی ضمانت کیسے نہ ہوتی۔ میں مستاجر زمیں دار سے گھٹ کر مزارع رہ گیا تھا۔ مجھے حوالاتی بنا کر پولیے جیل لے گئے۔ وہاں پہنچا تو حکم دیا گیا' گھنٹی گھر جاؤ۔ گھنٹی گھر گیا تو حکم ہوا' سکول جاؤ۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا' سکول شکول تو کہیں تھا نہیں' بہت سے کیدی مونج کی رسیاں بٹتے تھے۔ مجھے بھی ان کے ساتھ مشکّت پر لگا دیا گیا۔ میں نے انکار کیا تو سڑاک سڑاک چھتر لگائے گئے۔ گندی گندی گالاں نکالی گئیں۔ میں جھٹ مونج بٹنے لگا۔ روز ایسی مشکّت کرنی پڑتی۔ میں نے یہ بھی دیکھا جو حوالاتی کھاتا پیتا ہوتا' جیل کے حکام کو خوش رکھتا' اسے ذرا مشکّت نہ کرنی پڑتی۔ ادھر میں مشکّت کرتے کرتے آدھا رہ گیا۔ ڈاکٹری کے لیے بھیجا گیا۔ گھنٹوں کڑی دھوپ میں بیٹھا رہا' تب ڈاکٹری ہوئی۔ وزن لیا گیا تو مشین نے اتنا ہی وزن بتایا جتنا جیل میں داخل ہوتے وکت تھا۔ مشین میں کچھ ایسا بگاڑ پیدا کیا گیا تھا' جب چاہو وزن بڑھا دو جب چاہے گھٹا دو۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے لیے' یہ انوکھی باتیں نہیں تھیں۔ وہ بھی حوالاتی کے طور پر مہینوں ایسی مصیبتیں اسی جیل میں بھگت چکا تھا۔ دارا بتاتا رہا۔ "حوالاتیوں کو چکیوں اور بارکوں سے باہر نکال کر ہر روز سویرے سویرے گنتی کی جاتی۔ مشکّت پر لے جانے کے لیے' ان کی چھانٹی کی جاتی۔ وہ اس طرح ہوتی۔ گھر خوراکی الگ کر دیئے جاتے۔ صاحب بہادر کے علیحدہ کر دیئے جاتے۔ دوسرے افسروں کے سفارشی الگ کر دیئے جاتے۔ جن حوالاتیوں نے مشکّت سے بچنے کے لیے ماہانہ بھتّا باندھ رکھا تھا' وہ بھی الگ کر دیئے جاتے۔ صرف میرے ایسے بے سہارا حوالاتیوں کو مشکّت خانوں میں لے جایا جاتا اور دبا کے کام لیا جاتا۔ نہ پوچھ' جیل میں کیسی زبردست رشوت چلتی ہے۔ آزادی سے چلنے پھرنے تک کے لیے مٹھی گرم کرنی پڑتی۔ پر وڈے لوگاں کے عیش ہوتے۔ اول تو ایسا کوئی بندہ جیل جاتا نہیں اور جاتا بھی ہے تو سرداری کرتا ہے۔ حکم ماننے کی بجائے الٹا حکم چلاتا ہے۔ تجھ سے کیا کیا بتاؤں۔"



اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "ہر ۸ روز بعد وڈے جیلر کا دورہ ہوتا۔ اس روز اور مصیبت پڑتی۔ حوالاتیوں کو کمبل پریڈ لگا کر تین تین گھنٹے سخت دھوپ میں بٹھایا جاتا۔ دورہ شروع ہوتے ہی حوالاتیوں کو بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں۔ اگر کوئی حوالاتی نظریں اٹھا کر اوپر دیکھتا یا حاکم اعلیٰ کے سامنے فریاد کرنے کی کوشش کرتا تو سڑاک سے چھتر پڑتا۔ دورہ ختم ہونے کے بعد بھی ایسے حوالاتی کی زبردست پٹائی ہوتی۔"

رحیم داد نے ان جان بن کر تبصرہ کیا۔ "جیل میں بہت ظلم ہوتا ہے جی۔"

"یوں سمجھ لے' کون سا ظلم نہیں ہوتا۔ بیمار پڑ جاؤ تو خطرناک بیماریوں تک کا کوئی علاج نہیں۔ اوپر سے سخت مشکّت کرنی پڑتی ہے۔ گندی روٹی کھانی پڑتی ہے۔ بات بات پر پٹائی ہوتی ہے۔ ایک تکلیف ہو تو بتائی جائے۔" دارا نے قدرے تامّل کیا۔ "بارک کے اندر سب حوالاتی بند کر دیئے جاتے ہیں۔ ٹٹی کرنے کے لیے' صرف ایک ٹٹی خانہ ہے جس میں دو بندے بیٹھ سکتے ہیں۔ ایک بارک میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ حوالاتی اور کیدی ہوتے ہیں۔ انھیں بارک کے ٹٹی خانے کا پانی ڈولوں سے نکالنا پڑتا ہے۔ کچی جیل ہے' اسی گندے پانی سے روز حوالاتیوں سے ہر جگہ لیپا پوتی کا کام بھی کرایا جاتا ہے۔ میں نے تجھے بتایا تھا نا کہ رشوت تو ہر معاملے میں چلتی ہے۔ مٹھی گرم کر دو تو گندے بدبو دار پانی سے لیپنا پوتنا نہ پڑے۔ رشوت کی خاطر ملاکاتیوں کو طرح طرح سے تنگ کیا جاتا۔ دو دو منٹ بعد حوالاتیوں اور کیدیوں کو ملاکاتیوں سے بات چیت ختم کرنے کو کہا جاتا۔ ملاکاتی تھوڑی تھوڑی دیر بعد روپے دو روپے دیتے تو بات کر سکتے تھے۔" اس نے بڑی ٹھنڈی سانس بھری۔ "پر اپنا تو کوئی ملاکاتی ہی نہیں تھا۔"

"تیری گھر والی ملاکات کے لیے' نہیں آئی؟"

دارا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے چپ چاپ زمین پر انگلیوں سے آڑی ترچھی لکیریں بناتا رہا۔

رحیم داد نے چند لمحے خاموش رہ کر دریافت کیا۔ "تیری گھر والی کیا دوبارہ نہیں آئی؟"

"ہاں جی۔" دارا نے مختصر جواب دیا۔

"پتہ کیا' اب وہ کہاں ہے؟"

دارا نے رحیم داد کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "جب میں نے تجھ سے ساری ہی باتیں بتا دیں تو یہ بھی سن لے۔ وہ جیسا کہہ کر گھر سے نکلی تھی' اس نے وہی کیا۔"

"کیا وہ سچ مچ کنجری بن گئی؟" رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہاں جی' وہ کنجری بن گئی ہے۔" دارا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے اسے پچھلے سال ملتان کے حرم گیٹ میں دیکھا تھا۔ خوب بناؤ سنگھار کیے چبکلے میں بیٹھی تھی۔ میں دوبارہ ادھر نہیں گیا اور نہ کبھی اسے دیکھا۔ پتہ نہیں اب کہاں ہے۔ کس کے پاس ہے؟ نکّے کا بھی کچھ پتہ نہیں' زندہ ہے یا مرگیا؟"

"تیری زمین کا کیا بنا؟"

"اس پر تو سلدیرے کا پہلے ہی کبضہ تھا۔ جیل میں حوالاتی کے طور پر تین مہینے سے زیادہ گزرے تو ایک روز پنڈ کا لوہار مجھے ملنے جیل آیا۔ اس کے ذریعے میں نے ایک بار فیر سلدیرے کی منت سماجت کی۔ لگتا ہے' اسے سلدیرے ہی نے بھیجا تھا۔ پر سلدیرے نے مجھے اس شرط پر معافی دے دی کہ میں اس کے خلاف سارے مکدمے واپس لے لوں۔ میں نے اس کی شرط مان لی۔ سلدیرے کا وکیل جیل میں آیا۔ اس نے جس کاغذ پر کہا' میں نے انگوٹھا لگا دیا۔ اس کے بعد پولیس نے میرے خلاف مج کی چوری کا مکدمہ ختم کردیا۔ میں جیل سے نکلا تو کوڑا نجیب کی طرف جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ سلدیرے نے کہلوا دیا تھا' اگر پنڈ میں گیا تو مجھے گولی سے اڑا دے گا' میری لاش بھی ادریس کی طرح درخت سے لٹکا دے گا۔" اس نے گردن اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ "میں نے تبھی سے ملتان چھوڑ دیا' ادھر آگیا۔"

"تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ تو تو بالکل تباہ ہوگیا۔"

دارا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رحیم داد بھی چپ رہا۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔

☆

شام تاریک ہوکر رات کے اولین مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے گندم اور جو کی تیار فصلوں میں سرسراہٹ ابھر رہی تھی۔ دارا اور رحیم داد گم صم بیٹھے تھے اور اپنی اپنی سوچ میں مگن تھے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔

دارا نے پہلو بدلا اور رحیم داد کی جانب دیکھا۔ "ادھر کیسے آیا؟ بتایا نہیں' تیں نوں کس سے ملنا ہے؟"

رحیم داد نے آہستہ سے پوچھا۔ "مولا داد کو جانتا ہے؟"

"کیوں نہیں جانتا۔" وہ مستعدی سے بولا۔ "اسے جانتا ہوں۔ اس کے بھائی اللہ داد کو جانتا ہوں۔ دونوں کے پیئو کو بھی جانتا ہوں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "تجھے مولا داد سے ملنا ہے؟"

"مولا داد اور اللہ داد اپنے پیو کے ساتھ ہی رہتے ہیں نا؟"



"سمجھو' ساتھ ہی ساتھ رہتے ہیں۔" دارا نے جواب دیا۔ "مکان تو ایک ہی ہے پر وہڑے کے بیچ میں دیوار اٹھا کر دو گھر بنالیے ہیں۔ اللہ داد اور اس کا پیو ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔"

رحیم داد کو اس اطلاع سے کسی قدر تقویت ملی۔ اس نے دبی زبان سے پوچھا۔ "تب تو مولا داد کی گھر والی بیگماں کو بھی تو جانتا ہوگا؟"

"بالکل جانتا ہوں۔ تجھے بیگماں سے ملنا ہے؟"

"ہاں' میں نے اسی سے ملنا ہے۔"

"تیں نوں پہلے مولا داد سے ملنا چاہئے۔" دارا نے مشورہ دیا۔ "یہ ٹھیک رہے گا۔"

"اسے بھی ملوں گا۔ پر مجھے پہلے بیگماں ہی سے ملنا ہے۔"

"کوئی ایسی ویسی گل تو نہیں۔" دارا نے رحیم داد کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "بیگماں سے یاری تو نہیں لگا رکھی؟ مجھے سچ سچ بتا دے۔"

"رب سونہہ' ایسی کوئی گل بات نہیں۔" رحیم داد نے قبلے کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر قسم کھائی۔

دارا نے اس کی بات پر یقین کرتے ہوئے کہا۔ "پر یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ پہلے بیگماں سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔"

"گل ہی کچھ ایسی ہے۔ مجھے پہلے بیگماں سے ملنا ہوگا اور اس طرح ملنا ہوگا' کسی کو پتہ نہ چلے۔ تو میرا یہ کام کرسکتا ہے۔"

"تیری گل ابھی تک سمجھ نہیں آئی۔" اس نے ایک بار پھر رحیم داد کو شبے سے دیکھا۔

"میں تجھے بعد میں سب کچھ بتا دوں گا۔" رحیم داد نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

دارا نے پھر شک ظاہر کیا۔ "یہ تو سوچ' میں ایسی بات بیگماں سے کیسے کہہ سکتا ہوں؟ وہ برا نہیں منائے گی؟ تیرے بارے میں پوچھے گی تو میں کیا بتاؤں گا؟ اس طرح تو وہ میرے کہنے پر ہرگز تجھے ملنے نہیں آئے گی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رحیم داد نے سخن سازی سے کام لیا۔ "پر تو نے میری پوری گل کہاں سنی۔ وہ ایسا ہے جی' بیگماں کا ایک بھائی تھا' رحیم داد۔ احمد کوٹ میں رہتا تھا۔ پچھلے دنوں اس کا کتل ہوگیا۔ وہ میرا گھرا یار تھا۔ اسے ایک جھگڑے میں سزا ہوگئی تھی۔ میں اسے جیل ملنے گیا تھا۔ اس نے مجھ سے ایک بات کہی تھی' وہ میں نے بیگماں کو بتانی ہے۔ اس نے مجھے سونہہ دی تھی کہ میں یہ بات بیگماں کے سوا کسی کو ہرگز نہ بتاؤں۔" رحیم داد نے نظر بھر کر دارا کو دیکھا۔ "اب مرنے والے

کی گل کا تو مجھے لحاظ کرنا ہی پڑے گا۔"

"تیری گل کچھ کچھ سمجھ تو آتی ہے۔" دارا نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "ویسے مجھے بیگماں کے بھائی رحیم داد کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ میں نے تجھے کہا تھا' مجھے اس پنڈ میں آئے زیادہ مدت نہیں ہوئی۔"

"بیگماں سے ملنا تو اسے بتانا' تیرے مرحوم بھائی کا بہت پرانا یار احمد کوٹ سے آیا ہے اور تجھے اس کی ضروری گل بتانا چاہتا ہے۔"

دارا تذبذب میں پڑ گیا۔ "ایسا کر' مولا داد سے مل لے۔ اگر وہ تجھے مہمان بنا کر ٹھیرا لے تو جب وہ گھر پر نہ ہو' بیگماں کو اس کے بھائی کی بتائی ہوئی گل بتا دینا۔"

رحیم داد رضامند نہ ہوا۔ "میں چاہتا ہوں بیگماں سے ملنے سے پہلے' مولا داد' اس کے بھائی یا پنڈ کو بالکل پتہ نہ چلے' میں ڈھولا امیر خاں میں ہوں۔ گل ہی کچھ ایسی ہے' جسے تو نہیں سمجھ سکتا اور میں تجھے بتا بھی نہیں سکتا۔" رحیم داد نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا۔ "دارا! میرا یہ کام کر دے' تیری مہربانی ہوگی۔" اس نے نوٹ دارا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "لے' اسے رکھ لے' نئی کمیص اور دھوتی لے آنا۔ تیرے کپڑے بہت گندے ہو گئے ہیں۔" اس نے دارا کا بوسیدہ لباس گہری نظروں سے دیکھا۔

دارا نے چپ چاپ نوٹ لے کر دھوتی کے ڈب میں رکھ لیا۔ اس کا رویّہ اب بدل گیا تھا۔ مسکرا کر بولا۔ "میں بیگماں کے پاس چلا جاؤں گا۔ پر تو نے مجھے اب تک اپنا نام نہیں بتایا۔ بیگماں پوچھے گی تو کیا بتاؤں گا۔"

"کیا کرے گا جان کر۔" رحیم داد نے مسکرا کر بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ "بیگماں پوچھے تو اسے کہہ دینا' تجھے نام یاد نہیں رہا۔ بس اتنا کہہ دینا احمد کوٹ سے تیرے بھائی رحیم داد کا پرانا یار آیا ہے اور تجھے اکیلے میں کوئی ضروری گل بتانا چاہتا ہے۔ اسے منع کر دینا وہ کسی کو اس بارے میں کچھ نہ بتائے۔ مولا داد کو بھی نہیں۔"

"کام تو ٹیڑھا لگتا ہے۔ پر اب تو کرنا ہی پڑے گا۔ تجھ سے وعدہ جو کر لیا۔"

رحیم داد نے گرم جوشی سے دارا کا ہاتھ پکڑ کر بھینچ لیا۔ "تو بہت نیک بندہ ہے۔ میرا یہ کام کرا دے تو میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ آرام سے رہے گا۔ پروا نہ کر' یہاں سے زیادہ آرام سے رہے گا۔"

دارا پر رحیم داد کی باتوں کا خوش گوار اثر پڑا۔ جوش سے بولا۔ "فکر نہ کر' میں بیگماں سے تجھے



ضرور ملواؤں گا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا اور گردن جھکا کر سوچنے لگا' پھر اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ "تیرا اب یہاں ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔ کوئی اتھے آ گیا تو معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ جیسا تو نے کہا' میں ویسا ہی چاہتا ہوں۔ کسی کو تیرے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلنا چاہئے۔"

"مجھے کہاں لے جائے گا۔" رحیم داد نے پوچھا۔ "پنڈ میں جانا تو ٹھیک نہیں۔ بیگماں کو یہاں بلا کر نہیں لا سکتا؟"

اس ٹیم تو مولا داد گھر پر ہو سکتا ہے۔" دارا نے قیاس آرائی کی۔ "بیگماں سے ایسی بات میں کیسے کر سکتا ہوں اور اسے یہاں کیسے لا سکتا ہوں؟ میرے گھر چل۔ میرا ٹھکانا ادھر پنڈ سے الگ جھنگر کے پاس ہے۔ ادھر کوئی نہیں جاتا۔ میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ وہیں ٹھیر جانا۔ میں موکع لگتے ہی بیگماں سے بات کر لوں گا اور اسے تیرے پاس لے آؤں گا۔ یہ سب کیسے ہوگا؟ یہ مجھ پر چھوڑ دے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "آ میرے ساتھ۔"

رحیم داد خاموشی سے اس کے ہم راہ چلا گیا۔

☆

ہر طرف سناٹا تھا۔ دارا اور رحیم داد نے جوہ عبور کیا اور ویرانے کی طرف بڑھنے لگے۔ گاؤں کے گھروں میں ٹمٹماتے چراغ دور ہوتے گئے۔ جھنگر نظر آنے لگا۔ وہ اس سے قریب ہوتے گئے۔ مگر جھنگر میں داخل نہیں ہوئے۔ جھنگر سے پہلے ہی درختوں تلے دھندلی دھندلی روشنی میں ایک مکان نظر آیا۔

دارا آگے بڑھ کر مکان کے دروازے پر پہنچا۔ باہر سے کنڈی لگی تھی۔ دارا نے کنڈی کھولی۔ دروازے کا ایک پٹ سرکایا اور رحیم داد کے ساتھ اندر چلا گیا۔ سامنے مختصر صحن تھا۔ ایک طرف مٹی سے بنی ہوئی کوٹھری تھی۔ اس کے ساتھ ہی چھپر تھا۔ اس کے نیچے کھانا پکانے کے لیے چولھا تھا۔

مکان کی دیواریں بھی کچی تھیں اور زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ مکان پر ویرانی برس رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا تھا۔ دارا نے صحن میں ایک بوسیدہ چارپائی ڈال دی۔ کوٹھری کے اندر گیا' گندا سا کھیس نکال کر لایا۔ اسے چارپائی پر بچھایا اور رحیم داد سے گویا ہوا۔

"اب آرام کر۔ میں مولا داد کی طرف جاتا ہوں۔ اگر وہ گھر پر نہ ہوا اور بیگماں اکیلی ہوئی تو ابھی تیرے بارے میں بات کروں گا۔ تیار ہو گئی تو ساتھ لیتا آؤں گا۔ ویسے رات کو مشکل ہی لگتا ہے۔ دن کو تو اس سے گل بات کرنے کا ضرور کوئی بہانہ مل جائے گا۔"

"میں تیری واپسی کا انتظار کروں گا۔"

"نہیں' میرا انتظار نہ کرنا۔ میں نے کہا نا' اس ٹیم مشکل ہی ہو گا۔ اگر بیگماں سے تیرے بارے میں بات نہ ہوئی تو میں ادھر نہیں آؤں گا' مولا داد کے گھر سے سیدھا منھا چلا جاؤں گا۔ مجھے فصلوں کی رکھوالی کرنی ہے۔"

"بیگماں سے بات کرنے کا موقع مل جائے تو ادھر ادھر دیکھ لینا۔ بہت ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ کسی کو میرے بارے میں بالکل پتہ نہ چلے۔" رحیم داد نے اسے ایک بار پھر خبردار کیا۔

"فکر نہ کر۔ میں کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔" وہ دروازے کی جانب بڑھا۔ "اب میں چلوں گا۔ دروازہ بند کر لے اور منجی پر آرام کر۔"

دارا باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ سرہانے رکھا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک دارا کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہیں آیا۔ رحیم داد سو گیا۔

سویرے بہت تڑکے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ باہر سے دارا کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے دروازہ کھول دیا۔ دارا اندر آ گیا۔ وہ اکیلا تھا۔

"رات مولا داد کے گھر گیا تھا؟"

"یہاں سے نکل کر اسی طرف گیا تھا۔" دارا نے جواب دیا۔ "مولا داد گھر پر ہی تھا۔ بیگماں بھی جاگ رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور وہاں سے منھا کی طرف چلا گیا۔ وہیں سے آ رہا ہوں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے' کام نہیں بنا۔" رحیم داد نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔

"اب یہ مجھ پہ چھوڑ دے۔" دارا نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "یہاں آرام سے رہ۔ میں آج کسی نہ کسی طرح بیگماں سے ضرور تیرے بارے میں بات کر لوں گا۔"

رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔ "آج اس سے ملاقات ہو جائے گی؟"

"ٹھیک سے نہیں بتا سکتا۔ وہ مان گئی تو خود تیرے پاس پہنچ جائے گی۔ میں اسے بتا دوں گا تو میرے گھر ٹھیرا ہے۔"

رحیم داد اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ صحن کے ایک گوشے میں کنواں تھا۔ رحیم داد نے پانی نکالا۔ غسل کیا۔ اپنے گرد آلود کپڑے دھوئے اور سوکھنے کے لیے پھیلا دیئے۔ وہ دارا کی دھوتی باندھے ہوئے تھا۔



رحیم داد نہا دھو کر کوٹھری میں گیا۔ وہاں مونج کی چٹائی بچھی تھی۔ دارا نے اس عرصے میں روٹی پکالی تھی۔ گاؤں کے کسی گھر سے لسی بھی لے آیا تھا۔ اس نے روٹی اور لسی رحیم داد کے سامنے چٹائی پر رکھ دی۔ دونوں نے ناشتا کیا۔ دارا ناشتے کے بعد لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ ذرا دیر بعد گہری نیند سو گیا۔ رحیم داد کو نیند نہیں آئی' وہ لیٹا بھی نہیں۔ صحن میں بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ پہر دن گزرا تو اس نے باہر کھلنے والے دروازے کی کنڈی لگائی اور چٹائی پر لیٹ کر کروٹیں بدلتا رہا' پھر وہ بھی سو گیا۔

دوپہر کو دارا نے رحیم داد کو بیدار کیا۔ کھانے کے لیے اصرار کیا۔ مگر رحیم داد کو مطلق بھوک نہ تھی۔ دارا نے اکیلے ہی کھانا کھایا۔ بچی ہوئی روٹی چنگیری میں رکھ کر چھت سے لٹکے ہوئے چھینکے میں رکھ دی۔

دارا نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ "میں مولا داد کے گھر جا رہا ہوں۔ اس ٹیم بیگماں اکیلی ہو گی۔ اس سے تیرے بارے میں بات کروں گا۔"

"واپسی پر ادھر ہی آئے گا نا؟"

"ہاں جی' ادھر ہی آؤں گا۔" دارا نے جواب دیا۔ "پر تو آرام کر۔ بھوک لگے تو روٹی کھا لینا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر چھینکے کی طرف اشارہ کیا۔ "روٹی کے ساتھ سرسوں کا ساگ بھی ہے۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "میں باہر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دوں گا۔"

دن ڈھلے دارا واپس آیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ سے رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دارا بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ دھوپ میں چل کر آیا تھا' پسینے سے اس کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔ "بیگماں سے تیری بات ہوئی؟"

"ہاں جی' ہوئی تھی۔" دارا نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے بتایا۔ "مولا داد گھر پر نہیں تھا۔ وہ فصل کی واڈھی کی تیاری میں لگا ہے۔ بیگماں اکیلی تھی۔"

"تب تو آرام سے گل بات کرنے کا موقع ملا ہو گا۔"

"ہاں' بات تو اس سے آرام ہی سے ہوئی۔" دارا کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔

رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ "تیری بات سن کر وہ کیا بولی؟ لگتا ہے' کام بنا نہیں؟"

"بات تو اس نے میری پوری سنی پر وہ تجھے پہچان نہیں سکی۔ کچھ دیر سوچتی رہی پھر کہنے لگی' مجھے کچھ پتہ نہیں۔ جانے کون ہے۔ میں اس کے پاس کیسے جا سکتی ہوں۔"

"لگتا ہے اسے پوری طرح سمجھا نہیں سکا۔"

"تجھے کیا پتہ' میں نے اسے کس کس طرح سمجھانے کی کوشش کی۔" دارا نے اپنی کارگزاری سنائی۔ "وہ تو اپنے بھرا کو یاد کرتی رہی اور روتی رہی۔"

"اسے یہاں لانے کی کوشش نہیں کی؟"

"میں نے تو بار بار کہا۔" دارا نے صفائی پیش کی۔ "یہاں تک کہا' ایک بار چل کر مل تو لے۔ اس نے کوئی ضروری گل بتانی ہے۔ پر اس نے صاف انکار کردیا۔ کسی طرح یہاں آنے پر راضی نہیں ہوئی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیگماں سے ملنا نہیں ہو سکتا۔" رحیم داد کے لہجے میں مایوسی اور افسردگی تھی۔

"کیوں پریشان ہوتا ہے۔" دارا نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "تو اس کے بھلے ہی کی کوئی گل بتانا چاہتا ہوگا۔ وہ نہیں سننا چاہتی تو چھوڑ اسے۔ خاما خاہ جی خراب کرنے سے کیا فائدہ۔"

"بات اس طرح نہیں ہے جیسے تو سوچ رہا ہے۔" رحیم داد نے بیگماں سے ملاقات کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "مرنے والے سے میں نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنا چاہتا تھا۔ بیگماں سے گل بات ہو جاتی تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔"

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" دارا نے اس کی تائید کی۔ "اب میں تجھے اصلی گل بتاتا ہوں۔ ہوا یوں کہ پہلے تو وہ یہاں آنے کو کچھ کچھ تیار تھی۔ اچانک اس نے تیرا نام پوچھا۔ میں نے وہی کہا جو تو نے بتایا تھا۔ بس جی تیرا نام نہ بتانے پر وہ ایک دم اکھڑ گئی۔ کہنے لگی' جانے کون ہے۔ میں اس کے پاس نہیں جاتی۔ اس نے انکار کردیا اور مجھے شک بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔"

چند لمحے بعد رحیم داد نے بیزاری سے کہا۔ "اب اس کا ذکر چھوڑ۔ آگے کی سوچ۔"

"آگے کی تو تجھے سوچنا ہے۔ مجھے کیا سوچنا۔ کہہ تو دوبارہ بیگماں سے بات کرلوں؟ شاید مان جائے۔"

"تیرا خیال ہے وہ مان جائے گی؟"

"مشکل ہی لگتا ہے۔" دارا نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ویسے کوشش کر کے تو دیکھنا ہی چاہئے۔ بول کیا کہتا ہے؟"

"ایک بار اور کوشش کرلینے میں حرج ہی کیا ہے۔" رحیم داد نے اس سے اتفاق کیا۔ "میں یہاں ایک روز اور ٹھیر جاؤں گا۔"

"آج تو اس کے پاس جانا ٹھیک نہیں۔ کل دوپہر کو جاؤں گا۔ دوپہر کو وہ گھر میں اکیلی ہوتی ہے۔"



رحیم داد نے ایک بار پھر دارا کو سمجھایا کہ وہ بیگماں سے کس ڈھب سے بات کرے۔ دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ رحیم داد نے کھانا کھایا۔ کپڑے اب سوکھ گئے تھے۔ رحیم داد نے لباس تبدیل کیا۔

شام ہوگئی۔ دارا فصلوں کی رکھوالی پر چلا گیا۔ رحیم داد اکیلا رہ گیا۔

☆

دوسرے روز دوپہر کو دارا ایک بار پھر بیگماں کے گھر گیا۔ رحیم داد بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر دارا جب واپس آیا تو سورج ڈوب چکا تھا۔ شام دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی۔ دارا کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھ کر رحیم داد کو اندازہ ہوگیا کہ اس دفعہ بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ دارا تھکا ہوا سا رحیم داد کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے بات چیت نہیں کی۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اندھیرا بڑھتا رہا۔ کچھ دیر بعد رحیم داد کی آواز خاموشی میں ابھری۔

"لگتا ہے' بیگماں نے آج بھی تیری بات نہیں مانی۔"

"ہاں جی' بالکل نہیں مانی۔" دارا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کہتی تھی' اسے مجھ سے کوئی بات کہنی ہے تو وہ میرے پاس کیوں نہیں آتا۔ تجھے بار بار کیوں بھیجتا ہے؟"

"تو نے کیا کہا؟"

"مجھے کیا کہنا تھا جی! اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔"

"لگتا ہے ٹھیک سے سمجھا نہیں سکا۔" رحیم داد گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔

"ایسا نہ کہہ۔" اس دفعہ دارا کے لہجے میں قدرے تیکھا پن تھا۔ "تجھے کیا پتہ' میں نے اسے کس کس طرح سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔"

"پر ایسی کیا بات ہے کہ وہ یہاں آنے پر تیار نہیں ہوئی؟"

"مجھے تو ایسا لگا وہ مجھ پر شبہ کرنے لگی ہے۔"

"تو برا بندہ تو نہیں لگتا۔ اس نے تیرے بارے میں ایسا کیوں سوچا؟"

"ویسے تو پنڈ میں سبھی مجھے نیک بندہ سمجھتے ہیں۔" دارا نے صفائی پیش کی۔ "اسے کیوں شبہ ہوا؟ یہ تو وہی جانتی ہوگی۔"

"اب تک بیگماں کے پاس بیٹھا تھا؟"

"نا جی! اس نے زیادہ بات ہی نہیں کی۔ میں نے کئی بار اپنی بات دہرائی تو ایک دم بھڑک اٹھی۔ نراض ہو کر بولی' تو نے منع کیا تھا اس لیے میں نے گھر والے سے تیرے بارے میں بات نہیں کی۔

پر اب ایسی بات کہنے میرے پاس آیا تو اسے صاف صاف کہہ دوں گی۔ تجھے پتہ ہے اس کا غصہ کتنا خراب ہے۔ ویسے وہ دیکھنے میں سیدھا سادہ لگتا ہے پر جب غصہ آجائے تو پاگل ہو جاتا ہے۔ میں یہ بات سن کر گھبرا گیا۔ چپ کر کے اپنے زمیں دار کے پاس چلا گیا۔ وہیں سے آرہا ہوں۔ تیرے لیے روٹی بھی وہیں سے لایا ہوں۔"

دارا نے کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں نکال کر رحیم داد کے سامنے رکھ دیں۔ اٹھا اور ماچس جلا کر چراغ روشن کر دیا۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ وہ اس قدر دل گرفتہ تھا کہ آدھی روٹی کھانے کے بعد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ دارا کے اصرار کے باوجود اس نے اور کھانا نہیں کھایا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔

"جس کام کے لیے آیا تھا' وہ تو بنا نہیں۔ مجھے اب واپس جانا ہے۔"

"اب تو اندھیرا ہو گیا۔ جانا ہے تو سویرے چلا جانا۔"

"تو کہتا ہے تو سویرے چلا جاؤں گا۔"

دارا کھانے سے فارغ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ "اب آرام سے سو' میں نوں جاتا ہے۔"

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ دارا چلا گیا۔ رحیم داد اٹھ کر آنگن میں گیا۔ چارپائی پر کھیس بچھایا۔ چراغ بجھایا اور لیٹ گیا۔

وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور رات کے تاریک ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے رات ہی کو دارا کے گھر سے جانا تھا۔ دن کے اجالے میں نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا' مگر سوال یہ درپیش تھا کہ وہ ڈھولا امیر خاں سے جاتا کہاں؟ صرف بیگماں کا گھر ہی محفوظ ٹھکانا تھا جہاں وہ روپوش رہ سکتا تھا۔ حالات نے ایسے دھارے پر ڈال دیا تھا کہ وہ اپنی اکلوتی بہن سے بھی نہیں مل سکتا تھا۔ اپنی مجبوری اور بے بسی پر اس کا دل بھر آیا۔ بے قرار ہو کر وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کے سینے سے غم کا غبار دھواں بن کر اٹھا' آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور رخساروں پر ٹپکنے لگے۔

وہ سسکیاں بھرتا رہا۔ رات کا اندھیرا بڑھ کر پھیلنے لگا۔ رحیم داد نے قمیص کے دامن سے آنسو پونچھے' چارپائی سے نیچے اترا۔ گھڑے سے پیالے میں پانی انڈیلا اور ہونٹوں سے لگا کر غٹاغٹ چڑھا گیا۔

اس کے دل کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو چکا تھا۔ وہ صحن میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے اس نے سوچا کہ دارا کے بجائے اسے خود بیگماں کے پاس جانا چاہئے تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوتا کہ مولا داد سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔ مولا داد اپنے باپ کی طرح نہ ضدی ہے نہ اس سے شدید نفرت کرتا ـ



ری کے ساتھ شادی نہ کرنے کا مولا داد کو ملال ضرور تھا۔ رحیم داد سے اس کا اظہار بھی کر چکا تھا رده پولیس سے مخبری کر کے اس کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کا بڑا سبب بیگماں ی جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔

رحیم داد نے طے کیا کہ اسے بیگماں کے پاس جانا چاہئے۔ مولا داد مل جائے تو اسے اپنے بارے ں صاف صاف بتا دینا چاہئے۔ رحیم داد کو امید تھی کہ وہ اس کی ضرور مدد کرے گا۔ باپ کے ڈر ے اگر اپنے پاس نہ ٹھہرا سکے گا تو کسی قابل اعتماد دوست کے پاس بندوبست کر دے گا۔ اسے مولا اد سے خیر کی توقع تھی' شر کی نہیں۔ رحیم داد نے بہت غور و فکر کے بعد اسی وقت بیگماں کے گھر انے کا منصوبہ بنایا۔ آگے بڑھا اور دروازے پر پہنچ گیا۔

اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر باہر سے کنڈی چڑھی تھی۔ رحیم داد چند لمحے جھنجلایا ہوا کھڑا رہا پھر اس نے چارپائی اٹھا کر دیوار سے ٹکائی۔ اس کے سہارے دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف اتر گیا۔ قریب ہی جھنگر تھا۔ جھاڑیوں میں جھینگر بول رہے تھے۔ رات جاگ رہی تھی۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے چل رہے تھے۔

☆

رحیم داد بستی کی جانب بڑھا۔ وہ راستوں سے بخوبی واقف تھا۔ بارہا ڈھولا امیر خاں آچکا تھا' کئی کئی روز قیام کر چکا تھا۔ سنسان گلیوں سے گزرتا ہوا وہ بیگماں کے گھر کے دروازے پر بے کھٹکے پہنچ گیا۔ گلی ویران تھی۔ قریب ہی کسی گھر میں کوئی بچہ رو رہا تھا۔ لیکن بیگماں کے گھر پر گہری خاموشی طاری تھی۔

رحیم داد دم بخود اور سہما ہوا تھا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور دستک دینے کی غرض سے ایک ہاتھ بڑھا کر دروازے پر رکھا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ ہاتھ رکھتے ہی دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ اسی وقت گلی میں چاپ ابھری۔ رحیم داد نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جھٹ اندر داخل ہو گیا اور دروازہ بھیڑ دیا۔ سامنے کشادہ صحن تھا۔ دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ ایک چارپائی پر دو بچے گہری نیند سو رہے تھے۔ دوسری خالی تھی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ رحیم داد نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

باورچی خانے میں چراغ روشن تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی صحن تک پھیلی ہوئی تھی۔ باورچی خانے سے ملا ہوا برآمدہ تھا۔ باورچی خانے اور برآمدے کے درمیان دیوار کے ساتھ کھرا تھا۔ یہ پختہ چبوترا تھا۔

رحیم داد نے دیکھا‘ بیگماں سر جھکائے کھرے پر بیٹھی برتن دھو رہی ہے۔ اس کی پیٹھ رحیم داد کی جانب تھی۔ وہ دبے دبے قدموں بیگماں کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا تو اس کا سایہ دیوار پر لہرایا۔ بیگماں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔

"کون ہے؟"

اس کے لہجے میں گھبراہٹ اور سراسیمگی تھی۔ رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیگماں کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ بیگماں نے دھندلی روشنی میں رحیم داد کا چہرہ دیکھا اور ایک دم پریشان ہو کر بولی۔ "توں‘ توں....." اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرے پر خوف چھایا تھا۔

رحیم داد نے رسان سے کہا۔ "میں رحیمے ہوں‘ تیرا ویر۔"

"نہیں‘ نہیں۔" اس نے انکار کرنے کے انداز میں جلدی جلدی گردن ہلائی۔ "توں رحیمے کیسے ہو سکتا ہے۔ میرا ویر تو مر چکا ہے۔ توں....." اس کے چہرے سے اور زیادہ وحشت برسنے لگی۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ پھاڑا۔ رحیم داد نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "ڈر نہیں‘ میں رحیمے ہی ہوں۔ میں مرا نہیں‘ زندہ ہوں۔ تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "بیگماں! تو بھی مجھے نہیں پچھان سکی۔ میرے منہ کی طرف دیکھ۔ میں تجھے رحیمے نہیں لگتا؟" اس نے بیگماں کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ اس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔

وہ بدستور خوف زدہ تھی۔ الجھے ہوئے لہجے میں اٹک اٹک کر بولی۔ "لگتا تو رحیمے ہی ہے پر....."

رحیم داد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "پہلے یہ بتا‘ مولا داد کہاں ہے؟"

"وہ چک ۱۹ گیا ہے۔" اس دفعہ بیگماں کا لہجہ قدرے سنبھلا ہوا تھا۔ "مجھے یکین نہیں آتا تو رحیمے ہے۔"

رحیم داد نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "تیرے سر کی سونہہ‘ میں رحیمے ہی ہوں۔ تیرا ماں جایا‘ تیرا ویر۔ میری آواز نہیں پچھانتی؟ میں مرا نہیں۔ جو مرا ہے‘ وہ کوئی اور تھا۔ وہ کسی اور کی لاش تھی۔ ایسا ہوا تھا کہ....." اچانک گلی سے آواز ابھری۔

"بھابو! او بھابو۔"

بیگماں نے رحیم داد کو آہستہ سے دھکا دیا اور کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی جانب اشارہ کر کے بولی۔ "اندر چلا جا۔" رحیم داد تیزی سے لپکا اور کمرے میں چلا گیا۔

بیدی دروازہ کھول کر صحن میں داخل ہوئی۔ اس کی نگاہیں بیگماں کی طرف تھیں۔ بیگماں اسے



دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بیدی اس وکت کیسے آ گئی۔ سوئی نہیں ابھی؟"

اس نے بیگماں کی بات نظر انداز کرتے ہوئے مولا داد کے بارے میں پوچھا۔ "کیا ویر لوٹ آیا؟"

"نہیں۔" بیگماں نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ "وہ تو سویرے لوٹے گا۔ یہی کہہ کر گیا تھا۔"

بیدی اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔ "فیر تو کس سے گل کر رہی تھی؟"

"لے‘ میں نے کس سے گل کرنی تھی۔" بیگماں نے اپنی گھبراہٹ کی پردہ پوشی کے لیے مسکرانے کی کوشش کی۔ "وہم تو نہیں ہو گیا؟"

"میں تو سو گئی تھی۔ ایسا لگا‘ تو کسی سے گل بات کر رہی ہے۔" بیدی نے وضاحت کی۔ "میں نے سوچا‘ ویرن آ گیا ہے۔ اس سے کہنا تھا‘ سویرے مجھے کوٹ بہادر پہنچا دے۔ گھر والے کی طبیعت گڑ بڑ ہے۔ میں نوں کل واپس جانا ہے۔"

"تیرا بھرا تو اب سویرے ہی آئے گا۔ تیں نوں تو پتہ ہی ہے۔ اللہ داد بھی اس کے ساتھ ہی گیا ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی کل تیرے گھر پہنچا دے گا۔ اب تو جا کر آرام سے سو۔ ویسے میں مولا داد کو بتا دوں گی۔ تیں نوں واپس گھر جانا ہے۔"

بیدی خاموش رہی۔ اس نے نظریں اٹھا کر برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی جانب دیکھا جس کے پیچھے رحیم داد اندھیرے میں سہما ہوا کھڑا تھا۔ وہ چند لمحے چپ چاپ کھڑی رہی پھر مڑی اور آہستہ آہستہ بیرونی دروازے کی جانب بڑھی۔

بیگماں نے اسے روکنے کی کوشش کی نہ کوئی بات کی۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی گھبراہٹ چھائی تھی۔ بیدی باہر چلی گئی۔ بیگماں نے ہاتھ دھوئے اور اپنی دھوتی سے پونچھے‘ چبوترے سے اتری۔ اس نے گلی میں کھلنے والا دروازہ بند کیا۔ باورچی خانے میں گئی‘ لالٹین روشن کی اور اسے ایک ہاتھ میں لٹکائے ہوئے کمرے میں گئی۔ رحیم داد دروازے کے قریب خاموش کھڑا تھا۔ بیگماں نے لالٹین اٹھا کر رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے اب تک شبہ ہے میں تیرا ویر رحیمے نہیں ہوں؟"

"دیکھنے میں تو رحیمے ہی لگتا ہے۔" بیگماں نے دبی زبان سے بے یقینی اور تذبذب کا اظہار کیا۔ "میں مولا داد کے ساتھ احمد کوٹ گئی تھی۔ لاش تو دیکھی نہیں پر سب تیرا ہی نام لیتے تھے۔ پولیسے بھی یہی کہتے تھے رحیم داد کو کتل کر دیا گیا۔ بھابی تو وہاں تھی نہیں۔ جانے کہاں چلی گئی۔ پنڈ والوں

نے لاش دفن کی' کبر بتائی۔ میں کبر پر گئی' اسے دیکھا اور چیخیں مار کر روئی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"توں نہیں تھا تو وہ کس کی لاش تھی؟ کسے دفن کیا گیا تھا؟"

"میں تجھے یہی بتا رہا تھا کہ بیدی آ گئی۔ وہی تھی نا؟"

"ہاں وہی تھی۔ وہ کئی روز سے یہیں ہے۔"

"وہ کسی اور بندے کی لاش تھی۔" رحیم داد نے بیگماں کو مطلع کیا۔ "وہ ادھر نہر پاری دو آب کے پاس ٹبوں میں مر گیا تھا۔ میں نے اس کے کپڑے اتار کر پہن لیے' اپنی جیل کی وردی اسے پہنا دی۔ تجھے یہ تو پتہ ہی ہو گا' میں جیل سے فرار ہو گیا تھا۔ پولیس سے چھپتا لکتا پھرتا تھا۔" اس نے قدرے تامل کیا۔ "میں نے لاش کا منہ پتھر سے اس طرح کچل دیا تھا کوئی پہچان نہ سکے۔ جیل کی وردی سے سب کو یہی دھوکا ہوا وہ میری لاش ہے۔"

"سچ کہہ رہا ہے؟" بیگماں نے تڑپ کر پوچھا۔ "ہاں' تو رحیم ہی ہے۔ وہی آنکھیں' ویسی ہی آواز' ہائے ربّا' میرا ویر زندہ ہے۔" وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر بے اختیار رونے لگی۔ رحیم داد کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ اس کے سر پر شفقت سے آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ دونوں سسکیاں بھرتے رہے۔

کچھ دیر بعد رحیم داد نے آنسو پونچھے۔ آہستہ سے بولا۔ "رونا دھونا بند کر بیگماں! مجھے تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

بیگماں نے علیحدہ ہوتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا دارا کو توں نے ہی میرے پاس بھیجا تھا؟"

"ہاں' میں نے ہی بھیجا تھا۔"

"ہائے' میں مر گئی۔" بیگماں نے پشیمانی کا اظہار کیا۔ "میں نے سوچا' جانے کون ہے؟ کیوں بلاتا ہے؟ تیرا یار بیلی بتا کر اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ میں تو واپسی پر مولا داد کو بھی بتانا چاہتی تھی۔"

"یہ ٹھیک کیا کہ مولا داد کو نہیں بتایا۔" رحیم داد نے وضاحت کی۔ "بات یہ ہے' میں ابھی تک پولیس سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ اگر پولیس نے مجھے پہچان لیا تو میں فیر جیل میں بند کر دیا جاؤں گا۔ اس بار میرے خلاف جیل سے فرار ہونے کے علاوہ کتل کا مکدمہ بھی چلے گا۔"

"جس کی لاش کو توں نے اپنی جیل کی وردی پہنائی تھی۔" بیگماں نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا اسے توں نے کتل بھی کیا تھا؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے حکیم نذر محمد چشتی کے قتل کا اعتراف نہیں کیا۔ "پر سیف اللہ' جس کے ساتھ جھگڑے میں مجھے جیل ہوئی تھی' تجھے پتہ ہے' بعد میں اسپتال میں مر گیا۔ پولیس اسے کتل



ہتی ہے۔ اس نے میرے خلاف کتل کا مکدمہ بھی بنا لیا ہے۔"

"اب کیا ہو گا؟" بیگماں کی آنکھوں میں خوف تھا۔

"میں تیرے گھر چھپنے آیا ہوں۔ مولا داد تو مان جائے گا پر چاچا سے ڈر لگتا ہے۔ وہ مجھ سے بہت ناراض ہے۔"

"چاچا سے بھی زیادہ بیدی ناراض ہے۔ ہمیشہ تجھے برا بھلا کہتی ہے۔ میرا کتنی بار اس سے جھگڑا ہوا۔ وہ سمجھتی ہے' توں نے ویاہ نہ کر کے اس کی بے عزتی کی۔ تیرا ذکر آتا ہے تو اس کا منہ لال ہو جاتا ہے۔"

"میں نے اس سے ویاہ نہ کر کے برا کیا۔" رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ "نوراں کے لیے میں نے بیدی اور چاچا کو اتنا ناراض کیا پر وہ میری نہ بن سکی۔ بے وفا اور دھوکے باز نکلی۔"

بیگماں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر استفسار کیا۔ "کیا بھابی کے پاس گیا تھا؟"

"ہاں' پہلے میں اسی کے پاس گیا تھا۔" رحیم داد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ جمال دین کے ساتھ رہتی ہے۔ جب میں جیل میں تھا' تبھی سے اس نے جمال دین سے یاری لگا لی تھی۔"

"تب تو وہ پولیس سے تیرے خلاف مخبری کر سکتی ہے۔"

"نہیں' میں رات کے اندھیرے میں چھپ کر اس کے پاس گیا تھا۔ نہ میں اسے ملا' نہ بات کی۔ اس نے مجھے دیکھا بھی نہیں۔"

"اب وہ کہاں رہتی ہے؟"

"اکال گڑھ میں جمال دین کے ساتھ رہتی ہے۔" رحیم داد کے لہجے میں تلخی پیدا ہو گئی۔ "اس کنجری کو پتہ چل گیا تو مجھے پکڑوا دے گی۔" وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "تیرے گھر کے علاوہ مجھے چھپنے کا کوئی ٹھکانا نظر نہیں آتا۔ چھپا چھپا پھرتا ہوں۔ ہر دم خطرہ سر پر منڈلاتا ہے۔ جب ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو تیرے پاس آ گیا۔"

قریب کے گھر سے رات کے سناٹے میں کوئی رک رک کر کھانسنے لگا۔ بیگماں نے پریشان ہو کر کہا۔ "لگتا ہے' چاچا جاگ رہا ہے۔ وہ ادھر بھی آ سکتا ہے۔"

"تب تو مجھے چلا جانا چاہئے؟"

"دارا ہی کے گھر جائے گا ناں؟" بیگماں نے دریافت کیا۔ "وہ بتاتا تھا' توں اس کے گھر میں ٹھیرا ہے؟"

"ہاں' میں اسی کے گھر میں ہوں۔"

"وہاں جاکر سو۔ میں سویرے مولا داد سے تیرے بارے میں بات کروں گی۔ وہ میرا کہنا نہیں ٹالے گا۔ اللہ داد بھی مان جائے گا۔ وہ برا بندہ نہیں ہے صرف چاچا کو منانا پڑے گا۔ بیوی کا کیا ہے' وہ تو کل اپنے گھر جا رہی ہے۔ مہینوں بعد آتی ہے۔"

"میں کل رات کو آجاؤں گا۔"

"نہیں' تیرا آنا ٹھیک نہیں۔" بیگماں نے منع کردیا۔ "میں مولا داد کو تیرے پاس بھیجوں گی۔ ویسے وہ آج کل فصل کی واڈھی کی فکر میں لگا ہے۔ وہ واڈھی کے لیے لاوے لانے اللہ داد کے ساتھ چک ۱۹ گیا ہے۔"

"میں دارا کے گھر میں مولا داد کا انتظار کروں گا۔"

بیگماں خاموش رہی۔ رحیم داد آگے بڑھا۔ بیگماں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دونوں کمرے سے نکل کر صحن میں پہنچے۔ بیگماں نے آگے بڑھ کر کنڈی کھولی' گردن باہر نکال کر گلی میں جھانکا اور رحیم داد کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

رحیم داد گلی میں آگیا۔ اس نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

رات گہری ہوگئی تھی۔ گاؤں سنسان تھا۔ دور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد اس سمت نہیں گیا۔ گلیوں سے گزرتا ہوا کھیتوں کی طرف نکل گیا مگر دارا کے پاس جانے کے بجائے اس کے گھر پہنچا۔ کنڈی باہر سے لگی ہوئی تھی۔ رحیم داد اندر گیا' دروازہ بند کیا اور زنجیر چڑھا دی۔

سویرے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دارا سامنے کھڑا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ دروازے کی کنڈی لگائی۔ وہ حیرت زدہ اور پریشان نظر آرہا تھا۔ اس نے رحیم داد سے پوچھا۔

"رات تیرے پاس کوئی آیا تھا؟"

"نہیں۔" رحیم داد نے انکار میں گردن ہلائی۔

"باہر سے دروازے کی کنڈی کیسے کھل گئی؟ میں شام کو کنڈی چڑھا کر گیا تھا۔ مجھے صاف صاف بتا۔"

"میں رات بیگماں کے گھر گیا تھا۔ باہر سے دروازہ بند تھا۔ مجھے دیوار پھاند کر باہر جانا پڑا۔"

"توں دیوار بھی پھاند سکتا ہے؟" دارا نے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔



رحیم داد نے اس کا شبہ دور کرنے کی غرض سے وضاحت کی۔ "میں نے منجی دیوار سے لگائی۔ ا پر چڑھا اور باہر کود گیا۔ واپسی پر میں کنڈی کھول کر اندر آیا تھا۔ پر مجھ سے ایسی باتیں کیوں پوچھ ہے؟"

دارا نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "بیگماں کے گھر گیا تھا' کوئی گڑبڑ تو ں ہوئی؟"

"نہیں۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ میں نے جو کچھ کہنا تھا' کہہ دیا۔"

"یہ تو بہت ہی ٹھیک ہوا۔ بیگماں نے تجھے ملنے سے انکار کیا تو مجھے بڑا دکھ ہوا تھا۔" دارا نے یم داد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ "اب تیرا کیا ارادہ ہے؟"

"میں ابھی یہیں ٹھیروں گا۔" رحیم داد نے اسے آگاہ کیا۔ "مولا داد میرے پاس آئے گا۔"

"مولا داد تیرے پاس آئے گا۔" دارا کے لہجے میں تعجب تھا۔ "وہ کیوں آرہا ہے؟ تجھے اس سے لینا؟" وہ لمحے بھر خاموش رہا۔ "تیرے پاس تو بیگماں کو آنا چاہیے۔ تجھے تو اسی سے ملنا ہے۔" ا نے شوخی سے آنکھ ماری۔ "تو مجھ سے چھپا رہا ہے پہلے کچھ اور ہی گل کی تھی۔"

"تجھے ابھی تک میرے بارے میں شبہ ہے؟" رحیم داد نے اسے ایک بار پھر مطمئن کرنے کی شش کی۔ "میں نے تجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دیا' تجھے میری باتوں پر بار نہیں آتا؟ اگر کوئی ایسی ویسی گل ہوتی تو مولا داد میرے پاس کیوں آتا؟ اپنے دل سے شبہ نکال دے۔"

"تو ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔" دارا نے مطمئن ہونے کے انداز میں کہا۔ "میں نوں کیہ لینا ہے۔ مجھے خوشی ہے تیرا کام بن گیا۔ توں جو چاہتا تھا وہ ہوگیا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ دارا روٹی پکانے جھلیانی میں چلا گیا۔

دونوں نے ناشتا کیا۔ دارا رات بھر کا جاگا ہوا تھا ناشتے سے فارغ ہوتے ہی سوگیا۔ رحیم داد نے کے کاغذات کا بستہ کھولا۔ ایک سادہ کاغذ نکالا۔ چوہدری نور الٰہی مرحوم کے دستخط سامنے رکھے ان کی نقل بنانے کی مشق کرنے لگا۔ فرصت کے لمحات میں وہ چوہدری نور الٰہی کے جعلی دستخط نے کی کوشش کرتا تھا۔ جب سے نور الٰہی کے کلیم کے دستاویزات اس کے قبضے میں آئی تھیں' ن کاٹنے کے لیے یہ اس کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔

دارا سہ پہر کو بیدار ہوا۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ا۔ رحیم داد سے اس نے کہا۔ "تجھے روٹی کھانی ہو تو چھینکے سے اتار لینا۔ سویرے کی بچی ہوئی

روٹی اس میں رکھی ہے۔"

"تجھے روٹی نہیں کھانی؟"

"نہیں، میں زمیں دار کی حویلی جاؤں گا۔ اس نے مجھے بلایا ہے۔ وہیں روٹی کھالوں گا۔"

"شام کو تو واپس آئے گا نا؟"

"اب کل سویرے ہی تجھ سے ملنا ہوگا۔ مجھے زمیں دار کے یہاں کچھ کام کرنا ہے۔ حویلی سے سیدھا رکھوالی کے لیے کھیتوں کی طرف چلا جاؤں گا۔" دارا نے توقف کیا۔ "تجھے رات کو تو یہاں سے جانا نہیں۔ جائے گا تو سویرے ہی جائے گا نا؟"

"رات کو جاؤں یا سویرے۔" رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے مل کر ہی جاؤں گا۔"

دارا بھی مسکرایا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے کنڈی لگائی، بستے سے کاغذات نکالے اور ایک بار پھر چوہدری نورالٰہی مرحوم کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کرنے لگا۔

دن ڈھلا، سائے طویل ہوگئے۔ اپریل کے صاف ستھرے نیلے آسمان کی رنگت دھندلی ہوتی گئی۔ رحیم داد بار بار نظریں اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھتا۔ اس کے کان آہٹ پر لگے تھے۔ دن ختم ہوا۔ شام نیچے اترنے لگی۔ مگر دروازے پر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ گھر میں اندھیرا پھیل گیا۔ رحیم داد نے چراغ روشن نہیں کیا۔ روشنی دور سے نظر آتی تھی جو صاف چغلی کھاتی کہ گھر میں کوئی موجود ہے۔ رحیم داد یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بیگماں سے ملنے کے بعد اسے خوشی حاصل تھی، اطمینان ملا تھا۔ مگر ساتھ ہی خطرہ بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ ہر خطرے سے بچنے کے لیے پوری پوری احتیاط برتنا چاہتا تھا۔

☆

شام تاریک ہوگئی۔ رات آگئی۔ رحیم داد اندھیرے گھر میں خاموش بیٹھا رہا۔ یکایک دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ رحیم داد نے چونک کر اس طرف دیکھا، اٹھا اور آہستہ آہستہ دروازے پر پہنچا۔ آہٹ رک رک کر ابھرتی رہی۔

اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے؟" کوئی جواب نہ ملا۔ چند لمحے تک خاموشی رہی۔ رحیم داد نے پگڑی کھولی۔ چہرہ چھپانے کے لیے ڈھاٹا باندھا۔ جیب سے چاقو نکالا، کھول کر ہاتھ میں ہوشیاری سے سنبھالا۔ کنڈی آہستہ سے کھولی اور پوری طرح چوکس ہو کر کھڑا ہوگیا۔

دروازہ کھلا مگر وہ مولا داد نہیں تھا۔ بیگماں دہلیز پر کھڑی تھی۔ وہ اندر آگئی۔ رحیم داد نے پھر کنڈی لگادی۔ بیگماں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔



"یہاں تو بہت اندھیرا ہے۔ تو نے روشنی بھی نہیں کی؟"

"یہ بتا، تو کیسے آگئی؟ مولا داد کیوں نہیں آیا؟"

"وہ آج بھی لاوے لینے چک ۱۹ گیا ہے۔ پر تو نے منہ پر منڈاسا کیوں باندھ رکھا ہے؟ ہاتھ میں چاکو بھی دبا ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

"تجھے کیا پتہ، مجھے ہر دم کتنا ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔" وہ مسکرایا اور ڈھاٹا کھولتے ہوئے بولا۔
"اتھے منجی پر بیٹھ جا۔"

دونوں چارپائی کے پاس گئے اور ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ بیگماں کے ہاتھ میں پوٹلی دبی تھی۔ رحیم داد نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"تیرے لیے روٹی لائی ہوں۔" اس نے پوٹلی کھول کر کھانا نکالا۔ "تیز خوشبو ابھری۔ بیگماں نے گرم گرم پراٹھے اور تلا ہوا مرغ رحیم داد کے آگے رکھ دیا۔ پیار بھرے لہجے میں بولی۔ "پہلے روٹی کھالے، بعد میں گل بات ہوگی۔"

رحیم داد آلتی پالتی مار کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بھوکا بھی تھا۔ کئی روز بعد اتنا اچھا کھانا ملا تھا۔ پراٹھے کے لقمے توڑ توڑ کر جلدی جلدی کھانے لگا۔ بیگماں ہنس کر بولی۔

"بہت بھوکا لگتا ہے۔"

رحیم داد نے مرغ کی ٹانگ سے گوشت نوچتے ہوئے کہا۔ "پرونٹھے بہت مزے دار ہیں، ککڑ بھی زوردار تلا ہے۔" اس نے گھڑے کی طرف اشارہ کیا۔ "پینے کو پانی دے دے۔"

بیگماں اٹھی، اس نے پیالے میں پانی انڈیلا۔ پیالہ لا کر رحیم داد کو دیا۔ اس نے چند گھونٹ پیئے اور پیالہ سامنے رکھ دیا۔

رحیم داد نے بیگماں کی جانب دیکھا۔ وہ زمیں داروں کی عورتوں کی طرح ریشمی قیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹا بھی ریشمی تھا۔ بالوں میں خوشبودار تیل پڑا تھا، آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ وہ غسل کر کے عمدہ لباس پہن کر آئی تھی۔ بیگماں نے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہا ہے؟"

"تو نے بہت بناؤ سنگھار کر رکھا ہے۔"

"تجھے کیا پتہ، میں رات سے کتنی خوش ہوں۔ یہ جان کر، تو زندہ ہے، مجھے اتنی خوشی ہوئی، اتنی خوشی ہوئی، بس کیا بتاؤں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "میرا ایک ہی ویر ہے۔ تیرے سوا میرا اور کون

ہے؟ میں نہ خوش ہوں گی تو کون ہوگا؟" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

"لے' تونے تو رونا بھی شروع کردیا۔" رحیم داد نے گفتگو کا رخ بدلا۔ "یہ بتا' مولاداد کیوں نہیں آیا؟ میرے بارے میں اس سے بات کی تھی؟"

"نہیں۔" بیگماں نے جواب دیا۔ "تیرے بارے میں ابھی تک اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ سویرے وہ آیا تو اللہ داد بھی اس کے ساتھ تھا۔ اللہ داد کے سامنے تو ایسی بات کر نہیں سکتی تھی۔"

"بعد میں کرلیتی۔"

"دونوں ساتھ ساتھ آئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ چلے گئے۔ مولا داد دوپہر کو روٹی کھانے آیا تھا پر تھوڑی دیر ٹھیرا۔ روٹی کھاتے ہی باہر چلا گیا۔ وہ اپنے پیو کے پاس گیا تھا۔ دن ڈھلے تک وہیں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ سب فصلوں کی واڈھی کی تیاری میں لگے ہیں۔ کل سویرے نہیں تو پرسوں سے واڈھی شروع ہوجائے گی۔ اب زیادہ دیر نہیں کی جاسکتی۔ بیساکھی شروع ہوچکی ہے۔ ہر طرف فصلوں کی واڈھی ہو رہی ہے' جبھی تو واڈھی کرنے والے لاوے مل نہیں رہے۔ مولا اور اللہ داد اسی لیے تو روز روز لاؤوں کو بلانے کے لیے ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔"

"جب مولا داد روٹی کھانے آیا تھا' تب تو وہ اکیلا تھا۔ میرے بارے میں بات چھیڑ کر تو دیکھی ہوتی۔"

"نہیں ابھی نہیں۔ میں نے جان کر اس سے کوئی بات نہیں کی۔" بیگماں نے وضاحت کی۔ "بیدی کو آج سویرے اپنے گھر والے کے پاس کوٹ بہادر جانا تھا پر وہ گئی نہیں۔ جب تک وہ موجود ہے' میں تیرے بارے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے بیدی سے ڈر لگتا ہے۔ تجھے پتہ نہیں' وہ کتنی کمینی اور چنڈال ہے۔ تیرے تو نام ہی سے اسے آگ لگ جاتی ہے۔ ذرا بھی پتہ چل گیا تو وہ ضرور اپنا کمینہ پن دکھائے گی۔"

"وہ کب تک اور ٹھیرے گی؟"

"کل سویرے جانے کو کہتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ہی مولاداد سے تیرے بارے میں بات کرنا ٹھیک رہے گا۔"

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "بیدی کو میرے بارے میں کوئی شبہ تو نہیں ہوا؟"

"پتہ نہیں۔ کل تو بالکل اچانک گھس آئی تھی۔ دروازہ بھی تو کھلا رہ گیا تھا' پر میں نے اسے اپنے طور پر سمجھا بجھا دیا تھا۔ ویسے وہ ہے بہت مکّار۔"

"ٹھیک ہے' اس کے جانے کے بعد ہی مولاداد سے بات کرنا۔ میں دو ایک روز اد[illegible] ٹھیرا



ں گا۔ ویسے یہ گھر چھپنے کے لیے ٹھیک ہے۔ پنڈ سے الگ ہے اور جھنگر کے پاس ویرانے میں ہے۔ ادھر دن میں بھی کوئی نہیں آتا۔"

"پر دیوا تو جلالیا ہوتا۔ تجھے اندھیرے سے گھبراہٹ نہیں ہوتی؟"

"میں نے جان کے دیوا نہیں جلایا۔ اس سے شبہ پیدا ہوسکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں' کوئی دیکھے تو سمجھے گھر بالکل خالی ہے۔"

"اور جو کوئی چور شور آگیا؟"

"یہاں دھرا ہی کیا ہے جو کوئی چوری کرنے آئے گا۔"

رحیم داد نے کٹورا اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر پانی پینے لگا۔ بیگماں نے کہا۔ "میں تو تجھے یاد کرکے رات روتی تھی۔ کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ پر توں نے بھی کبھی مجھے یاد کیا؟"

"کیوں نہیں یاد کیا؟ تجھے یاد نہ کرتا تو تیرے پاس آتا کیوں؟ کسی اور طرف نکل جاتا۔" رحم داد نے پانی کا خالی کٹورا رکھتے ہوئے اس کی دل جوئی کی۔ "تجھے پتہ ہی ہے۔ ماں اور پیو کا مرن ہوا تب تو ت چھوٹی تھی۔ میں نے تجھے اولاد کی طرح پالا ہے۔ ویسے میں بھی چھوٹا ہی تھا۔ چاچا تجھے اپنے اتھ لے جانا چاہتا تھا پر میرا جی نہ چاہا تجھے اپنے سے دور رکھوں۔ جب تیرا ویاہ ہوا تو میں کتنا رویا ا۔ تجھے یاد ہے نا؟"

"ہاں' مجھے یاد ہے۔ بار بار روتا تھا۔ سب تجھے سمجھاتے تھے۔ پر میں بھی تو بہت روئی تھی۔"

"میں برابر تیرے گھر آتا تھا۔ تجھے اپنے ساتھ لے آتا تھا۔ تیرے آنے سے ایسا لگتا جیسے میرے مرمیرے گھر میں اجالا ہوگیا۔" رحیم داد بیتے دنوں کی راکھ کریدنے لگا۔ "پر نوراں سے ویاہ کے بعد ا جانے مجھے تجھ سے جدا کردیا۔ میں ان دنوں چھپ چھپ کر روتا تھا۔" رحیم داد کی آنکھوں میں نسو آگئے۔ اس نے قمیص کی آستین سے آنسو پونچھے۔ بیگماں بھی رونے لگی۔ دونوں خاموش بیٹھے دوں کی پگڈنڈیوں پر بھٹکتے رہے۔

کچھ دیر بعد بیگماں کی آواز ابھری۔ "پر نوراں بھابی تو تجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ اس نے تجھ ے دھوکا کیوں کیا؟ وہ ایسی تو نہیں تھی اور جمال دین تو تیرا بہت گہرا یار تھا۔ ہر دم تیرے ساتھ اتھ رہتا تھا۔ سیف اللہ اور اس کے بھائیوں سے جھگڑا ہوا تو وہ تیرے ساتھ جم کر لڑا۔ زخمی ہوا۔ بل میں بھی بند رہا۔ چھوٹ گیا تب بھی جیل میں تجھے ملنے جاتا تھا۔ جب میں تجھے ملنے جیل گئی تھی' ں روز وہ بھی موجود تھا۔ بعد میں اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"یہی تو مجھے دکھ ہے۔ نوراں نے میرے ساتھ ایسا دھوکا کیا کہ مجھے بچوں سے بھی گھن آنے

لگی۔ میں نے سب کو بھلا دیا۔ نوراں کو بھی‘ بچوں کو بھی۔ اب تیرے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں رہا۔“

رحیم داد کی آواز بھرا گئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ دونوں اندھیرے میں چپ بیٹھے رہے۔ ذرا دیر بعد بیگماں نے کہا۔ ”روٹی تو کھا‘ تو نے روٹی بھی چھوڑ دی۔“

”نہیں‘ اب میں نہیں کھاؤں گا۔“

”اب میں تجھے جانے نہیں دوں گی۔ اپنے ساتھ ہی رکھوں گی۔“

”چاہتا تو میں بھی یہی ہوں پر چاچا بھی راضی ہو جائے گا؟“

”مولاداد اسے راضی کر لے گا۔“ بیگماں نے اسے تسلی دی۔ ”فکر نہ کر۔ مولاداد میری بات ضرور مان لے گا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ کہے گا تو چاچا بھی ضرور مان جائے گا۔ ویسے بھی اب وہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ چاچی کے مرنے کے بعد تو زیادہ ہی کمزور ہو گیا۔ طبیعت میں پہلی جیسی گرمی بھی نہیں رہی۔“

”پر بیدی جو موجود ہے۔ وہ ضرور رولا ڈالے گی۔“ رحیم داد نے خدشہ ظاہر کیا۔

”وہ روز روز تھوڑا ہی آتی ہے‘ مہینوں بعد آتی ہے۔ اب اس کا پورا ٹبر ہو گیا۔ گھر والا ہے‘ چار بچے ہیں۔ انھیں چھوڑ کر کیسے آ سکتی ہے؟ سب کو ساتھ لانا بھی آسان نہیں۔ ویسے بھی اس کا گھر والا روز ہی بیمار رہتا ہے۔“ بیگماں نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”کل سویرے وہ جا رہی ہے۔ کئی مہینے بعد آئے گی۔ تب تک کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ اتنے دنوں میں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“

رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ ”کہتی تو ٹھیک ہے۔ تین چار مہینے مل جائیں‘ تب تک میں کہیں زمین بھی الاٹ کرا لوں گا۔“

”زمین الاٹ کرا لے گا؟ کیسے؟ تو پناہ گیر تو ہے نہیں۔“ بیگماں نے حیرت ظاہر کی۔

”دیکھ لینا‘ میں کیسے زمین الاٹ کراتا ہوں۔“ اس نے سرہانے رکھے ہوئے بستے کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس میں کلیم کے کاغذ ہیں۔ بہت وڈا کلیم ہے‘ ہزاروں کلّا زمین کا۔“

”کیسی باتیں کر رہا ہے؟“ وہ اور زیادہ حیرت زدہ ہو گئی۔ ”تیری باتیں سمجھ نہیں آئیں۔“

”ابھی تیری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ پر جب میں زمین الاٹ کرا لوں گا تب خود دیکھ لے گی۔ میں تجھے اور مولاداد کو بھی اپنے پاس بلا لوں گا۔“

”ایسا ہو جائے تو بیدی کا بیچ سے کانٹا ہی نکل جائے۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”پر — کچھ ہوگا



سے؟“

”میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا پر ابھی نہیں۔ مجھے چند مہینے اطمینان سے رہنے کا ٹھکانا مل جائے‘ پر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔“

”بھابی نے برا کیا ورنہ وہ تیرے ساتھ عیش کرتی۔“

”اس کی گل نہ کر۔“ رحیم داد نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں اب اس کا نام بھی نہیں سننا چاہتا۔ یوں سمجھ لے‘ میرے لیے وہ مر گئی۔ اس کے ساتھ بچے بھی مر گئے۔“

”ویرا ایسا نہ کہہ۔“ بیگماں تڑپ کر بولی۔ ”بچے تیرے ہی ہیں۔ ان کا تو کوئی کسور نہیں۔“

”پتہ نہیں وہ میرے بچے ہیں یا جمال دین کے۔“ رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں نے اپنے کانوں سے نوراں کو یہ کہتے سنا‘ جمال دین سے اس کی بہت پرانی یاری تھی۔“

”یہ گل اس نے تجھ سے کہی تھی؟“

”مجھے کہتی تو میں اسے زندہ کب چھوڑتا۔ مجھے اتنا بے غیرت سمجھتی ہے؟“ رحیم داد نے تلخ لہجے میں بتایا۔ ”میں رات کو اس کے گھر چھپ کر گیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا نہیں۔ وہ تو جمال دین سے باتیں کر رہی تھی۔“

”سمجھ نہیں آتی۔ وہ ایسی لگتی تو نہیں تھی۔“

”میں بھی تیری طرح دھوکے میں رہا۔ وہ کیسی ہے؟ تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس رات کی باتیں یاد کرتا ہوں تو سینے میں آگ جل اٹھتی ہے۔“ رحیم داد کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔

بیگماں نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”تیری احمد کوٹ کی زمین کا کیا بنے گا؟“

”گولی مار اس زمین کو۔ تھی ہی کتنی۔“ رحیم داد نے جوش سے کہا۔ ”اب تو میں مربعے الاٹ کراؤں گا اور بہت عمدہ زمین دیکھ بھال کر لوں گا۔ الاٹمنٹ ہو جانے دے۔ تب تو دیکھنا‘ زمیں داری کیا ہوتی ہے۔ باراں چوداں کلّا زمین کی بھی کوئی زمیں داری ہوئی۔“

رحیم داد نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔ رحیم داد نے جھٹ ایک بار پھر منہ پر ڈھاٹا باندھا۔ دروازے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا تو باہر سے آواز آئی۔

”دروازہ کھول‘ میں ہوں دارا۔“

رحیم داد نے کنڈی کھولی‘ دارا اندر داخل ہوا۔ رحیم داد نے تعجب سے کہا۔ ”تو نے تو سویرے آنے کا کہا تھا‘ اب کیسے آ گیا؟“

"میں تیرے لیے روٹی لایا تھا۔" اس نے کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں اس کی طرف بڑھائیں۔ رحیم داد نے کھانا نہیں لیا۔ "میں تو روٹی کھا چکا۔ اسے اپنے ساتھ ہی لے جا۔ مجھے اب کچھ نہیں کھانا۔"

دارا نے دھندلی روشنی میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی بیگماں کو غور سے دیکھا اور پہچان بھی لیا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔ چند لمحے گم صم کھڑا رہا پھر رحیم داد سے باہر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"میرے ساتھ باہر آ۔ تجھ سے بات کرنی ہے۔"

رحیم داد اس کے ہم راہ چلا گیا۔ باہر گہرا سناٹا تھا۔ اندھیرا ہر طرف پھیلا تھا۔ دارا نے رازداری کے انداز میں دبی زبان سے کہا۔

"توں نے تو کہا تھا' مولا داد تیرے پاس آئے گا۔ پر یہ تو بیگماں ہے' وہی ہے نا؟"

"ہاں' وہی ہے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "میرے لیے روٹی لے کر آئی تھی۔ پرونٹھے تھے' تلا ہوا ککڑ تھا۔ میں نے ساری روٹی نہیں کھائی۔ تیرے لیے رکھ چھوڑی ہے۔ جی چاہے تو ابھی کھا لے نہیں تو سویرے کھا لینا۔"

"میں روٹی کھا کر آیا ہوں۔ اب بالکل بھوک نہیں ہے پر مولا داد تیرے پاس کیوں نہیں آیا؟"

"وہ دن ڈھلے اپنی فصلوں کی واڈھی کے لیے لاوے لینے چک ۱۹ چلا گیا۔ رات دیر سے لوٹے گا اس لیے نہیں آیا۔"

"تجھے کس نے بتایا' مولا داد چک ۱۹ گیا ہے۔" دارا نے حیرت کا اظہار کیا۔ "میں نے تھوڑی دیر پہلے اسے اپنے زمیں دار کی حویلی میں دیکھا تھا۔ توں کہتا ہے' وہ دن ڈھلے چک ۱۹ چلا گیا۔"

"مجھے تو یہی معلوم ہوا تھا۔" رحیم داد بھی حیرت زدہ ہو گیا۔ "تیری اس سے کوئی گل بات تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔" دارا نے انکار میں گردن ہلائی' دبی زبان سے بولا۔ "مجھے سچ سچ بتا دے' اصل معاملہ کیا ہے؟ بیگماں سے تیری یاری ہے' تب بھی میں نے کیا لینا۔"

"ہر بار ایسی گل کیوں کرتا ہے۔" رحیم داد جھنجلا گیا۔ "میری بات کا اعتبار کیوں نہیں کرتا؟ تو کیسا بندہ ہے؟"

"نراض نہ ہو۔" دارا نرم پڑ گیا۔ "میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ اگر کوئی ایسی گل ہے تو میں تیری مدد ہی کروں گا۔" اس نے تامل کیا۔ "مجھے تو یہ ڈر ہے کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے' توں کسی مشکل میں نہ پڑ جائے۔"



"دارا! میں نے تجھے اپنا یار کہا ہے' تجھ سے کچھ چھپاؤں گا نہیں۔ سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا پر جو توں سوچ رہا ہے' ایسا بالکل نہیں ہے۔" رحیم داد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"توں ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔" اس نے رحیم داد سے الجھنے کی کوشش نہیں۔ "اب میں چلوں گا سویرے آؤں گا۔"

رحیم داد خاموش رہا۔ دارا آگے بڑھ گیا۔ رحیم داد گھر میں واپس آ گیا۔ اس نے کنڈی لگائی اور بیگماں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"دارا باہر گلی میں تجھے کیا کہتا تھا؟"

"اس نے عجب گل بتائی۔ تو کہتی ہے' مولا داد چک ۱۹ چلا گیا۔ دارا کہتا ہے وہ اسے زمین دار کی حویلی میں تھوڑی ہی دیر پہلے ملا تھا۔"

بیگماں بھونچکا ہو کر بولی۔ "مجھ سے تو وہ یہی کہہ کر گیا تھا۔ تب تک سورج بھی نہیں ڈوبا تھا۔ میں نے تیرے لیے روٹی تیار کی' نہائی' کپڑے بدلے اور اندھیرا ہوتے ہی یہاں آ گئی۔"

"مولا داد نے تجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟"

"پتہ نہیں۔" وہ بدستور حیرت زدہ تھی۔ "وہ مجھ سے جھوٹ تو نہیں بولتا۔ ہو سکتا ہے' چک ۱۹ جاتے ہوئے کوئی کام یاد آ گیا اور وہ زمیں دار کے پاس چلا گیا۔"

"ایسا ہی ہوگا۔ اب تجھے جانا چاہیے۔ مولا داد گھر پہنچا اور تجھے وہاں نہ پایا تو جانے کیا سوچے۔"

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔" بیگماں بھی جانے پر آمادہ ہو گئی۔ "میں آج ہی رات مولے سے گل بات کروں گی۔ فکر نہ کر' وہ میری بات مان جائے گا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی ہوگا۔"

☆

رحیم داد نے بچا ہوا کھانا کپڑے میں لپیٹا اور اسے چنگیری میں رکھ کر چھینکے پر لٹکا دیا۔ واپس آیا تو بیگماں کھڑی ہو چکی تھی۔ رحیم داد نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

"مولا داد اور چاچا کو راضی کر لیا تو میں تیرے ساتھ ہی رہنے کو آ جاؤں گا۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" بیگماں نے اسے یقین دلایا۔ "آگے جو کچھ کرنا ہے' وہ مجھ پر چھوڑ دے۔"

"ہاں تجھے یہ کام کرنا ہے۔"

"میں تو ہر طرح کوشش کروں گی میرا بچھڑا ہوا ویر میرے پاس آ جائے۔" بیگماں نے مسکرا کر کہا۔ "میں کتنی خوش ہوں' تجھے بتا نہیں سکتی۔ بچے بھی اپنے ماماں کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

کبھی کبھی تو تجھے بہت یاد کرتے ہیں۔ تیرے آنے سے میرے گھر میں جیسے روشنی آجائے گی۔ ہائے کتنا چنگا لگے گا۔"

دونوں دروازے کی جانب بڑھے۔ رحیم داد نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ مگر دروازہ کھولتے ہی وہ سٹپٹا کے رہ گیا۔ سامنے مولا داد کھڑا تھا۔ دھندلی روشنی میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہاتھ میں لمبی کلہاڑی دبی تھی۔ وہ جھپاک سے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے اللہ داد بھی اندر آگیا۔ مولا داد ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانس بھر رہا تھا۔ اس نے بیگماں کو خوں خوار نظروں سے دیکھا۔

بیگماں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں مولا داد سے پوچھا۔ "یہاں کیسے آگیا؟"

مولا داد نے چند لمحے خاموش رہ کر تیکھے لہجے میں کہا۔ "مجھے پتہ چل گیا تھا تو یہاں اپنے یار سے ملنے آئی ہے۔" اس نے رحیم داد کی جانب قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ "یہ کل رات بھی میرے جانے کے بعد چھپ کر تیرے پاس آیا تھا۔"

بیگماں نے مڑ کر اللہ داد کو دیکھا پھر اٹکتے ہوئے مولا داد سے کہا۔ "کیسی گل کر رہا ہے؟ مولے تجھے پتہ ہے، یہ کون ہے؟"

"مجھے سب پتہ ہے۔ بیدی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس نے تیرے یار کو کل رات ہی دیکھ لیا تھا۔" مولا داد نے ترش روئی سے کہا۔ "تو نے اسے کمرے میں چھپا دیا تھا۔"

"وہ جھوٹ بولتی ہے۔" بیگماں نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "آرام سے بیٹھ، میں تجھے سب کچھ بتا دوں گی۔"

"بیدی جھوٹ بولتی ہے، دارا بھی جھوٹ بولتا ہے، سب جھوٹ بولتے ہیں۔ صرف تو سچی ہے۔" وہ غصے سے چیخنے لگا۔

رحیم داد نے کہا۔ "مولے! تجھے کچھ پتہ نہیں۔"

اللہ داد نے اسے ڈانٹا۔ "بکواس نہ کر۔"

مولا داد تیزی سے جھپٹا۔ اس نے بیگماں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اس زور سے دھکا دیا کہ وہ چارپائی پر جا کر گری۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، گڑگڑا کر بولی۔ "میری گل تو سن مولے۔" اس نے رحیم داد کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "یہ، یہ۔" مگر مولا داد نے اسے پوری بات نہیں کہنے دی۔ غضب ناک ہو کر کلہاڑی چلائی۔ ہاتھ بھرپور پڑا۔ کلہاڑی بیگماں کی گردن کاٹتی ہوئی اندر اتر گئی۔ بیگماں کے منہ سے دل دوز چیخ نکلی۔



مولا داد ایک کے بعد دوسرا وار کرتا رہا۔ کلہاڑی نے بیگماں کے جسم کے ٹکڑے کر دیئے۔ رحیم داد ہکا بکا کھڑا رہا۔ پھر تیزی سے لپکا اور مولا داد کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ مولا داد اس کی جانب پلٹا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ اس نے رحیم داد پر بھی کلہاڑی سے وار کیا۔ مگر رحیم داد جھکائی دے کر صاف بچ گیا۔ مولا داد نے دوسرا وار کرنے کے لیے کلہاڑی اٹھائی۔ رحیم داد نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"مولے! تو نے بہت برا کیا۔ میری گل سن۔"

مگر مولا داد نے ایک نہ سنی۔ اس نے کلہاڑی سے وار کرنا چاہا۔ رحیم داد نے جھپٹ کر کلہاڑی پکڑلی، جھٹکا دیا اور کلہاڑی چھین لی۔ اسی وقت اللہ داد نے اس پر ڈانگ سے وار کیا۔ رحیم داد نے سر اس طرح جھکایا کہ وار خالی گیا۔ مگر مولا داد نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے تڑاق سے رحیم داد کے منہ پر تھپڑ مارا اور کلہاڑی چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔

اب رحیم داد بھی غصے سے بے قابو ہو چکا تھا۔ وہ پیچھے ہٹا۔ کلہاڑی سنبھالی، مولا داد پر وار کیا۔ کلہاڑی کندھا کاٹتی ہوئی اندر اتر کر پھنس گئی۔ مولا داد کے منہ سے ہائے کی آواز نکلی۔ وہ خون میں لت پت ہو کر زمین پر تڑپنے لگا۔

رحیم داد اس کی جانب متوجہ ہوا تو اللہ داد نے پھر ڈانگ سے وار کیا۔ رحیم داد نے بچنے کی کوشش کی مگر بچتے بچتے بھی ڈانگ اس کے بائیں بازو پر لگی۔ رحیم داد تلملا کے رہ گیا۔ اس نے اچھل کر اللہ داد کے سینے پر لات ماری۔ وہ دور جا گرا۔ ڈانگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ رحیم داد نے اسے جھپٹ کر اٹھا لیا۔

اللہ داد اٹھ کر رحیم داد پر جھپٹا مگر رحیم داد نے اسے قریب نہیں آنے دیا۔ گھما کر ڈانگ کا ہاتھ چلایا۔ ڈانگ اللہ داد کے سر پر لگی۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ خون بہہ کر چہرے پر آگیا، وہ زمین پر گر گیا۔

رحیم داد بڑھ کر بیگماں کے پاس گیا مگر وہ دم توڑ چکی تھی۔ مولا داد زمین پر پڑا سسک رہا تھا اور اللہ داد بے ہوش تھا۔ رحیم داد خاموش کھڑا زور زور سے ہانپتا رہا، تینوں کو جلتی بجھتی نظروں سے دیکھتا رہا۔

مگر اب وہاں ٹھہرنا خطرناک تھا۔ رحیم داد نے کلیم کے کاغذات کا بستہ اٹھایا۔ بیگماں کی لاش کے پاس گیا۔ جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو ابل پڑے۔ وہ ہاتھ سے آنسو پونچھتا ہوا گھر سے باہر آیا۔

رحیم داد تیزی سے ایک طرف بڑھا مگر اس سمت سے آہٹ سنائی دی۔ اس نے راستہ بدل

دیا۔ اندھیرے میں اسے دارا کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ٹھیر جا۔ میری گل سن لے۔"

مگر رحیم داد نہیں ٹھہرا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا جھنگر کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا کہ اسے اپنی پشت پر چاپ سنائی دی۔ کوئی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر راستہ بدلا، کھیتوں کی جانب بڑھا اور ان میں گھس کر ایک پگڈنڈی پر دوڑنے لگا۔

ڈھولا امیر خاں کی حدود سے نکل کر باہر آیا تو وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ لیکن وہ رکا نہیں، آگے، اور آگے بڑھتا گیا۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے نیم پختہ سڑک پر چل رہا تھا۔ سڑک سنسان تھی اور رات کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کدھر جا رہا ہے، کہاں جا رہا ہے؟ نہ اس کی کوئی منزل تھی، نہ ٹھکانہ۔

کراچی، ستمبر ۱۹۷۸ء